

فہرست مضامین معارف القرآن جلد پنجم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
			سُورَةُ يُوسُفَ
۴۱	تقدیر کے اسباب خفیہ سے مربوط ہوتا ہے	۱۴	
۴۲	آیات ۲۱ تا ۲۳	۱۶	تاریخ و قصص میں قرآن کا خاص انداز
۴۵	یوسفؑ کا ورودِ مصر اور تقدیری انتظامات	۱۸	خواب کی حقیقت اور درجہ اور اس کی قسمیں
۴۶	گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ اللہ سے پناہ مانگنا ہے	۲۰	خواب کے جزء نبوت ہونے کے معنی
۴۷	غیر اللہ کو رب کہنا	۲۱	قادیانی و قبائل کے ایک مغالطہ کی تردید
۴۸	واقعہ زلیخا اور عصمت پیغمبرانہ کا مفصل واقعہ	۲۲	کبھی فاسق بلکہ کافر کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے
۵۱	اور شبہات کا جواب	۲۳	خواب ہر شخص سے بیان کرنا درست نہیں
۵۲	آیات ۲۵ تا ۲۹	۲۴	خواب کے تابع تعبیر ہونے کا مطلب
۵۳	برأتِ یوسفؑ کا تقدیری انتظام	۲۵	یوسفؑ کے خواب سے متعلق اہم مسائل
۵۵	واقعہ مذکورہ سے حاصل شدہ اہم مسائل	۲۶	آیات نمبر ۲۰ تا نمبر ۲۰
۵۹	آیات ۳۰ تا ۳۵	۲۷	یہودیوں کے بتلائے ہوئے چند سوالات
۶۲	یوسفؑ کا رجوع الی اللہ	۲۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
۶۳	آیات ۳۶ تا ۴۲	۳۱	انخوانِ یوسفؑ انبیاء نہیں تھے، مگر ان کی
۶۴	یوسفؑ کے قصہ میں عبرتیں اور ہدایات	۳۲	خطائیں معاف ہو گئیں
۶۸	فائدہ عجیبہ	۳۳	خدمت عامہ اور امدادِ باہمی کا اسلامی اصول
۶۹	پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال	۳۴	جائز تفریحات اور کھیل کود کی اجازت
۷۰	واقعہ سے حاصل شدہ مسائل و احکام	۳۵	تفریح کے لئے جانے کا تفصیلی واقعہ
۷۲	آیات ۴۳ تا ۵۰	۳۶	بچپن میں یوسف علیہ السلام پر وحی کی حقیقت
۷۵	تعبیر خواب کے متعلق تحقیق	۳۷	مصر پہنچنے پر بھی والد کو اپنے حالات کی اطلاع
۷۸	آیات ۵۱ تا ۵۲	۳۸	نہ دینے بلکہ چھپانے کے اہتمام کی حکمت
۸۳	آیات ۵۳ تا ۵۷	۳۹	مسابقت اور گھوڑ دوڑ کا حکم شرعی
۸۵	اپنی پاکبازی کا اظہار بضرورت جائز ہے	۴۰	پیراہنِ یوسفؑ کی چند کرامات
۸۶	نفسِ امارہ کی تحقیق	۴۱	جس چیز کو عرفاً اتفاقی امر کہا جاتا ہے وہ بھی
۸۷	یوسف علیہ السلام شاہی دربار میں	۴۲	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲۶	آیات ۸۳ تا ۸۷	۸۹	یوسف علیہ السلام سے زلیخا کا نکاح
۱۲۹	یوسفؑ کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کی زیادہ	۹۰	واقعہ مذکورہ سے حاصل شدہ احکام و مسائل
	محبت و شفقت کی وجہ		حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنا
۱۳۲	احکام و مسائل	۹۱	حضرت یوسف علیہ السلام کا طلبِ عہدہ
	آیات ۸۸ تا ۹۲		خاص حکمت پر مبنی تھا
۱۳۶	یعقوبؑ کا خط عزیز مصر کے نام		کافر حکومت کا عہدہ قبول کرنا
۱۳۷	متعلقہ احکام و ہدایات	۹۲	آیات ۵۸ تا ۶۲
۱۳۸	صبر و تقویٰ ہر مصیبت کا علاج ہے	۹۶	یوسف علیہ السلام تختِ سلطنت پر اور غذائی انتظامات
۱۳۹	آیات ۹۳ تا ۱۰۰	۹۹	حکومت کا غذائی کنٹرول
۱۴۲	پیراہنِ یوسفؑ کی خصوصیات		حکومت پر آنے کے بعد بھی یوسف علیہ السلام کا
۱۴۵	احکام و مسائل		والد کو اپنے حال سے اطلاع نہ دینا بامرِ الہی تھا
۱۴۷	زمانہ مفارقت کے حالات اظہار میں پیغمبرؐ شکر گزاری	۱۰۰	آیات ۶۳ تا ۶۶
۱۴۸	آیت ۱۰۱	۱۰۳	برادرانِ یوسف کی مصر سے واپسی
۱۴۹	والدین سے اظہارِ حال کے بعد بارگاہِ الہی	۱۰۴	متعلقہ ہدایات و مسائل
	میں دعا و التجا پر قصہ کا اختتام		خطا کار اولاد سے قطعِ تعلق نہ کرنا
۱۵۱	متعلقہ ہدایات اور احکام	۱۰۵	بقیہ ہدایات
۱۵۲	آیات ۱۰۲ تا ۱۰۹	۱۰۶	آیات ۶۷ تا ۶۹
۱۵۸	علمِ غیب اور اخبارِ غیب میں فرق	۱۰۹	نظرِ بد کا اثر حق ہے
۱۵۹	کوئی عورت رسول و نبی نہیں ہوتی	۱۱۲	آیات مذکورہ سے متعلق چند مسائل
۱۶۰	آیات ۱۱۰ تا ۱۱۱	۱۱۳	آیات ۷۰ تا ۷۶
۱۶۵	سُورَةُ رَعْدٍ	۱۱۶	یوسف علیہ السلام کی طرف سے بھائیوں پر
۱۶۵	آیات ۱ تا ۴		جھوٹے الزام و غیرہ کاراز
۱۶۶	حدیثِ رسول بھی قرآن کی طرح وحیِ الہی ہے	۱۱۸	متعلقہ مسائل
۱۶۷	کیا آسمان کا جرم آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے؟	۱۱۹	آیات ۷۷ تا ۸۲
۱۶۸	ہر کام میں اصلی تدبیر اللہ کی ہے	۱۲۲	یوسفؑ پر چوری کے الزام کی حقیقت
۱۷۱	آیات ۵ تا ۸	۱۲۵	چند مسائل متعلقہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۲	ہر رسول کا اپنی قوم کی زبان کے ساتھ آنا	۱۷۳	مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت
۲۲۵	قرآن کریم عربی زبان میں کیوں ہے	۱۷۶	کیا ہر قوم اور ملک میں نبی آنا ضروری ہے؟
۲۲۶	عربی زبان کی کچھ خصوصیات	۱۷۷	آیات ۹ تا ۱۵
۲۲۹	آیات ۵ تا ۸	۱۸۱	انسان کے محافظ فرشتے
۲۳۱	ایک نکتہ	۱۸۲	آیات ۱۶ تا ۱۷
"	ایام اللہ	۱۸۶	معارف و مسائل
۲۳۲	صبر کے بعض فضائل	۱۸۷	آیات ۱۸ تا ۲۲
۲۳۳	شکر اور ناشکری کے نتائج	۱۸۹	اللہ والوں کی خاص صفات
۲۳۴	آیات ۹ تا ۱۵	۱۹۳	آیات ۲۵ تا ۳۰
۲۳۶	خلاصہ تفسیر	۱۹۶	معارف و مسائل
۲۳۸	آیات ۱۶ تا ۱۷ مع خلاصہ تفسیر	۱۹۷	احکام و ہدایات
۲۳۹	آیات ۱۸ تا ۲۲	۲۰۰	آیات ۳۱ تا ۳۳
۲۴۲	آیات ۲۳ تا ۲۵	۲۰۳	معارف و مسائل
۲۴۴	آیات ۲۶ تا ۲۹	۲۰۶	ایک بستی پر عذاب قریبی بستیوں کیلئے تنبیہ ہوتی ہے
۲۴۵	معارف و مسائل	۲۰۷	آیات ۳۴ تا ۳۷
۲۴۶	شجرہ طیبہ سے کیا مراد ہے	۲۰۹	آیات ۳۸ تا ۴۳
۲۴۷	کفار کی مثال	۲۱۳	انبیاء عموماً بیوی بچوں والے ہوئے ہیں
"	ایمان کا خاص اثر	۲۱۴	تقدیر مہرم و معلق
۲۴۸	قبر کا عذاب و ثواب از قرآن و سنت	۲۱۷	سُورَةُ اِبْرٰهٖمَ
۲۵۰	احکام و ہدایات	"	آیات ۱ تا ۳
"	آیات ۳۰ تا ۳۴	۲۱۸	مضامین سورۃ
۲۵۱	تفسیر و شرح	۲۱۹	احکام و ہدایات
۲۵۲	احکام و ہدایات	۲۲۰	قرآن کریم کی تلاوت مستقل مقصد ہے
۲۵۵	تسخیر شمس و قمر کا مطلب	۲۲۱	خلاصہ مفہوم
۲۵۶	آیات ۳۵ تا ۴۱	۲۲۲	قرآن فہمی میں بعض غلطیوں کی اصلاح
۲۵۹	ابراہیم کی عمارت اولاد کو بت پرستی سے بچائی اور عرب کی بت پرستی	۲۲۳	آیت نمبر ۴

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۹۲	آیات ۲۶ تا ۲۴	۲۶۱	احکام و ہدایات
۲۹۴	بدن انسانی میں نفع و روح اور اس کو مسجود بنانے کی مختصر تحقیق	"	دعائے ابراہیمی کی عجیب جامعیت و حکمت
۲۹۸	روح اور نفس کے متعلق قاضی شہارشر کی تحقیق	۲۶۲	دعائے ابراہیم کے اسرار و حکم
۲۹۹	فرشتوں کو حکم سجدہ میں ابلیس نے بغاوت داخل تھا	۲۶۸	بعض آداب دعاء
۳۰۰	اللہ کے خاص بندوں پر شیطان کے تسلط نہ ہونے کی معنی	"	آیات ۴۲ تا ۵۲
"	جہنم کے سات دروازے	۲۷۱	معارف و مسائل
"	آیات ۴۵ تا ۵۰	۲۷۳	قیامت میں زمین و آسمان کی تبدیلی
۳۰۱	معارف و مسائل	۲۷۶	ایک اطلاع اور یادداشت
۳۰۲	آیات ۵۱ تا ۷۷	۲۷۸	سُورَةُ الْحَجَر
۳۰۷	معارف و مسائل	۲۷۸	آیات ۱ تا ۵
"	رسول کریم کا خصوصی اعزاز و اکرام	۲۸۰	طول اہل کے متعلق ابوالدرداء کی نصیحت
"	غیر اللہ کی قسم کھانا	"	آیات ۶ تا ۸
۳۰۸	جن بستیوں پر عذاب آیا ان سے عبرت	۲۸۱	خلیفہ مامون رشید کے دربار کا ایک خاص واقعہ
۳۰۹	آیات ۷۸ تا ۸۶ مع خلاصہ تفسیر	۲۸۲	حفاظتِ قرآن کا وعدہ اور اس میں حفاظتِ حدیث
"	قصہ اصحاب ایکہ و اصحاب حجر	"	کا بھی داخل ہونا
۳۱۱	آیات ۸۷ تا ۹۹ مع خلاصہ تفسیر	۲۸۳	مطلقاً احادیث کو غیر محفوظ کہنے والا
۳۱۳	سورۃ فاتحہ پوسے قرآن کا خلاصہ اور متن ہے	"	آیات ۱۰ تا ۱۵
"	محشر میں سوال کس چیز کا ہوگا	۲۸۵	آیت ۱۶
۳۱۴	تبلیغ و ارشاد میں تدریج بقدر استطاعت	۲۸۶	آسمان میں بروج کے معنی
"	ایذار دشمن سے تنگدلی کا علاج	"	آیات ۱۷ و ۱۸
۳۱۵	سُورَةُ النَّجْلِ	۲۸۷	شہاب شاقب کیا چیز ہے؟
۳۱۵	آیات ۱ و ۲ مع خلاصہ تفسیر	۲۸۹	آیات ۱۹ تا ۲۵
۳۱۶	سورت کا شروع و عید شدید سے	۲۹۰	ضروریات میں موزونیت کی رعایت
۳۱۷	آیات ۳ تا ۸	۲۹۱	تمام مخلوق کے لئے آبِ رسانی اور آبِ پاشی
۳۱۸	معارف و مسائل	"	کا عجیب و غریب نظامِ الہی
۳۱۹	قرآن میں ریل، موٹر، جہاز کا ذکر	۲۹۲	نیک کاموں میں آگے پیچھے رہنے کا فرق

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲۱	دنيا کا عذاب بھی ایک طرح کی رحمت ہے	۳۲۱	جمال اور زینت کا جواز
۳۵۲	آیات ۲۸ تا ۵۷ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۲	آیت نمبر ۹
۳۵۴	آیات ۵۸ تا ۶۰ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۲	معارف و مسائل
۳۵۵	معارف و مسائل	۳۲۳	آیات ۱۰ تا ۱۶
۳۵۶	آیات ۶۱ تا ۶۵	۳۲۴	معارف و مسائل
۳۵۸	آیت ۶۶ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۵	آیات ۱۷ تا ۲۲
۳۵۹	معارف و مسائل	۳۲۶	معارف و مسائل
۳۶۰	آیت ۶۷ مع خلاصہ تفسیر	۳۲۷	آیات ۲۳ تا ۲۹
۳۶۱	شراب کی حرمت پہلے بھی اسکی برائی کی طرف اشارہ	۳۲۸	معارف و مسائل
۳۶۲	آیات ۶۸ تا ۶۹	۳۲۹	آیات ۳۰ تا ۳۴ مع خلاصہ تفسیر
۳۶۳	معارف و مسائل	۳۳۰	آیات ۳۵ تا ۴۰
۳۶۴	شہد کی مکھوں کی خصوصیات اور احکام	۳۳۱	معارف و مسائل
۳۶۵	شہد کا شفا ہونا	۳۳۲	کیا ہندوستان و پاکستان میں بھی کوئی رسول آیا ہے
۳۶۶	فوائد	۳۳۳	آیات ۴۱ و ۴۲
۳۶۸	آیت ۷۰ مع خلاصہ تفسیر	۳۳۴	معارف و مسائل
۳۶۹	ارذل عمر کی تفسیر	۳۳۵	ہجرت دنیا میں بھی فراخی عیش کا سبب ہو سکتی ہے
۳۷۰	آیت ۷۱ معارف و مسائل	۳۳۶	ہجرت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام
۳۷۱	معاشی میں اختلاف درجات رحمت ہے	۳۳۷	آیات ۴۳ تا ۴۴
۳۷۲	ارتکاز دولت کے انسداد کا قرآنی نظام	۳۳۸	معارف و مسائل
۳۷۳	آیات ۷۲ تا ۷۶	۳۳۹	ائمہ مجتہدین کی تقلید غیر مجتہد پر واجب ہے
۳۷۴	معارف و مسائل	۳۴۰	قرآن فہمی کیلئے حدیث فہمی ضروری ہے، حدیث
۳۷۵	آیات ۷۷ تا ۸۳	۳۴۱	کا انکار قرآن کا انکار ہے
۳۷۶	معارف و مسائل	۳۴۲	آیات ۴۵ تا ۴۷
۳۷۷	گھر بنانے کا اصلی مقصد قلب و جسم کا سکون ہے	۳۴۳	معارف و مسائل
۳۷۸	آیات ۸۴ تا ۸۹	۳۴۴	قرآن فہمی کیلئے معمولی عربی دانی کافی نہیں
۳۷۹	معارف و مسائل	۳۴۵	اشعار جاہلیت کی تعلیم قرآن فہمی کی غرض سے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۸۷	معارف و مسائل	۳۸۷	آیت ۹۰
۳۸۷	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ملت ابراہیمی	۳۸۷	قرآن کی جامع ترین آیت اور اس کی تشریح
۳۸۷	آیات ۱۲۵ تا ۱۲۸	۳۸۹	تین چیزوں کا حکم، تین کی ممانعت
۳۸۹	معارف و مسائل	۳۹۲	آیات ۹۱ تا ۹۶
۳۹۵	دعوت و تبلیغ کے اصول اور مکمل نصاب	۳۹۵	عہد شکنی حرام ہے
۳۹۶	دعوت کے اصول و آداب	۳۹۶	دھوکہ دینے کیلئے قسم کھانا ایمان کا خطرہ ہے
۳۹۷	دعوت الی اللہ کے سچے پیروں کے آداب کی تفصیل	۳۹۷	رشوت لینا اللہ سے عہد شکنی اور حرام ہے
۳۹۷	مروجہ مجادلات کی دینی اور دنیوی مضرتیں	۳۹۷	رشوت کی جامع تعریف
۳۹۷	داعی حق کو ایذا کا انتقام لینا جائز مگر صبر بہتر ہے	۳۹۷	دنیا کی راحت و کلفت دوستی و دشمنی سب فانی ہیں
۳۹۸	آیات مذکورہ متعلقہ دعوت کا شان نزول	۳۹۷	آیت ۹۷ مع معارف و مسائل
۳۹۸	سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِیْل	۳۹۷	حیاتِ طیبہ کیا چیز ہے؟
۳۹۹	آیت ۱ مع خلاصہ تفسیر	۳۹۸	آیت ۹۸ تا ۱۰۰ مع خلاصہ تفسیر
۴۰۰	معارف و مسائل	۴۰۰	معارف و مسائل
۴۰۲	معراج کے جسمانی ہونے پر قرآن و سنت کے دلائل اور اجماع	۴۰۲	اللہ پر ایمان و توکل تسلطِ شیطانی کا علاج ہے
۴۰۲	مختصر واقعہ معراج بروایت ابن کثیر	۴۰۲	آیات ۱۰۱ تا ۱۰۵
۴۰۲	واقعہ معراج کے متعلق ایک غیر مسلم کی شہادت	۴۰۳	نبوت پر کفار کے شبہات کا جواب
۴۰۲	اسرار و معراج کی تاریخ	۴۰۵	آیات ۱۰۶ تا ۱۰۹
۴۰۲	مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ	۴۰۶	معارف و مسائل
۴۰۲	مسجد اقصیٰ اور ملک شام کی برکات	۴۰۷	اکراہ کی تعریف
۴۰۲	آیات ۲، ۳، ۴ تا ۸	۴۰۹	آیات ۱۱۰ تا ۱۱۳
۴۰۲	بنی اسرائیل کے چند واقعات	۴۱۱	معارف و مسائل
۴۰۲	معارف و مسائل	۴۱۱	آیات ۱۱۴ تا ۱۱۹
۴۰۲	بنی اسرائیل کے واقعات آجکل کے حالات	۴۱۲	معارف و مسائل
۴۰۲	میں مسلمانوں کے لئے عبرت ہیں	۴۱۲	محرمات مذکورہ میں حصر
۴۰۲	ایک عجیب معاملہ	۴۱۲	توبہ سے گناہ کی معافی
۴۰۲	کافر بھی اللہ کے بندے مگر مقبول نہیں	۴۱۲	آیات ۱۲۰ تا ۱۲۴

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴۶۹	معارف و مسائل	۴۵۲	آیات ۹ تا ۱۱
"	عام رشتہ داروں کے حقوق	۴۵۳	معارف و مسائل ، معتدل راستہ
۴۷۰	تنبذیر یعنی فضول خرچی کی ممانعت	۴۵۴	آیات ۱۲ تا ۱۵
۴۷۱	آیت ۲۸ مع خلاصہ تفسیر	۴۵۵	معارف و مسائل
"	معارف و مسائل	۴۵۶	نامہ اعمال نگلے کا ہار ہونے کا مطلب
۴۷۲	آیت ۲۹ تا ۳۰	"	بعثت رسل کے بغیر عذاب نہ ہونیکی تشریح
"	معارف و مسائل	۴۵۷	اولاد مشرکین نابالغ کو عذاب نہ ہوگا
"	خرچ میں اعتدال کی ہدایت	"	آیات ۱۶ تا ۱۸
۴۷۳	الشہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بھی اعتدال	۴۵۸	معارف و مسائل
"	خرچ میں بد نظمی ممنوع ہے	"	ایک شبہ اور جواب
۴۷۴	آیت ۳۱	۴۵۹	مالداروں کا قوم پر اثر ہونا طبعی امر ہے
"	معارف و مسائل	"	آیات ۱۸ تا ۲۱
۴۷۵	آیت ۳۲ لا تقربوا الزنا	۴۶۰	معارف و مسائل
"	معارف و مسائل	۴۶۱	بدعت اور خود رائی کا عمل کتنا ہی اچھا نظر آئے
۴۷۶	آیت ۳۳	"	مقبول نہیں
۴۷۷	قتل ناحق کی تفسیر	"	آیات ۲۲ تا ۲۵
"	قصاص لینے کا حق کس کو ہے ؟	۴۶۲	معارف و مسائل
"	ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے	۴۶۳	والدین کے احترام و اطاعت کی اہمیت
۴۷۸	یاد رکھنے کے قابل ایک حکایت	"	اطاعت والدین کے فضائل و برکات
"	آیات ۳۴ و ۳۵	۴۶۴	والدین کی حق تلفی کی سزا اکثر دنیا میں بھی ملتی ہے
۴۷۹	معارف و مسائل	"	والدین کی اطاعت کس حالت میں واجب نہیں
"	یتیموں کے مال میں احتیاط	"	والدین کی خدمت و حسن سلوک کیلئے ان کا مسلمان
"	معاهدات کی پابندی کا حکم	"	ہونا ضروری نہیں
۴۸۰	ناپ تول میں کمی حرام ہے	۴۶۶	والدین کے ادب کی رعایت خصوصاً بڑھاپے میں
۴۸۱	آیات ۳۶ تا ۳۸	۴۶۷	ایک عجیب واقعہ
"	معارف و مسائل	۴۶۹	آیات ۲۶ تا ۲۷ مع خلاصہ تفسیر

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۰۹	آیات ۷۳ تا ۷۷	۴۸۲	کان آنکھ اور دل کے متعلق قیامت میں سوال
۵۱۰	معارف و مسائل	۴۸۴	یہ پند و آیتیں پوری تورات کا خلاصہ ہیں
۵۱۲	آیات ۷۸ تا ۸۲	۴۸۵	آیات ۳۹ تا ۴۴
۵۱۴	معارف و مسائل	۴۸۶	معارف و مسائل
"	دشمنوں کے شر کا بہترین علاج نماز ہے	۴۸۷	زمین و آسمان وغیرہ کی تسبیح کا مطلب
"	نماز پنجگانہ	۴۸۹	آیات ۴۵ تا ۴۸
۵۱۵	نماز تہجد کا وقت اور مسائل	۴۹۰	معارف و مسائل، پیغمبروں پر جادو کا اثر
۵۱۶	نماز تہجد فرض ہے یا نفل	۴۹۱	دشمنوں کی نظر سے مستور رہنے کا ایک عمل مجرب
۵۱۷	نماز تہجد نفل ہے یا سنت مؤکدہ	۴۹۲	آیات ۴۹ تا ۵۲
۵۱۸	تعداد رکعات تہجد	۴۹۴	معارف و مسائل
"	نماز تہجد کی کیفیت	"	محشر میں کفار بھی اللہ کی حمد کرتے اٹھیں گے
"	مقام محمود	۴۹۵	آیات ۵۳ تا ۵۵
۵۱۹	انبیاء و صلحاء امت کی شفاعت مقبول ہے	۴۹۶	معارف و مسائل
"	ایک سوال و جواب	"	بذر بانی کفار کے ساتھ بھی جائز نہیں
"	فائدہ	۴۹۷	آیات ۵۶ تا ۵۸
۵۲۰	تہجد کا خاص دخل مقام شفاعت میں	۴۹۸	معارف و مسائل
۵۲۱	اہم مقاصد کے لئے مقبول دعا	۴۹۹	آیات ۵۹ و ۶۰
"	رسوم کفر و باطل کا مٹانا واجب ہے	۵۰۰	معارف و مسائل
۵۲۲	آیات ۸۳ و ۸۴	۵۰۱	آیات ۶۱ تا ۶۵
۵۲۳	معارف و مسائل	۵۰۲	معارف و مسائل
"	آیات ۸۵ تا ۸۹ یسٹونک عن الروح	۵۰۳	آیات ۶۶ تا ۷۰
۵۲۵	معارف و مسائل	"	معارف و مسائل
"	روح سے کیا مراد ہے	۵۰۵	تکرم بنی آدم کی حکمت
۵۲۶	روح کے سوال کا واقعہ مکہ میں ہوا یا مدینہ میں	۵۰۷	آیات ۷۱ تا ۷۲
۵۲۷	سوال روح کا جواب	۵۰۸	معارف و مسائل
"	ہر سوال کا مطلوب جواب بیاض وری نہیں	"	نامہ اعمال

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۵۷	جدید مؤرخین کی تحقیق	۵۲۷	سائل کی دینی مصلحت کی رعایت ضروری ہے
۵۵۸	واقعہ اصحاب کہف کا زمانہ اور غار میں جانے کے اسباب	۵۲۸	روح کی حقیقت کا علم کسی کو ہو سکتا ہے یا نہیں
۵۵۹	قومیت اور اجتماعیت کی اصل بنیاد	"	سوال روح کا مفصل واقعہ
۵۶۱	کیا اصحاب کہف اب بھی زندہ ہیں	۵۳۰	آیات ۹۰ تا ۹۵
۵۶۲	آیات ۱۳ تا ۱۶	۵۳۲	معارف و مسائل
۵۶۳	معارف و مسائل	"	معاندانہ سوالات کا پیغمبرانہ جواب
"	آیات ۱۷ تا ۱۸ مع خلاصہ تفسیر	۵۳۳	رسول انسان ہی ہو سکتا ہے فرشتہ نہیں
۵۶۷	اصحاب کہف کی طویل نیند	۵۳۴	آیات ۹۶ تا ۱۰۰
"	ان کا گناہ اور نیک صحبت سے اس کا اعزاز	۵۳۶	معارف و مسائل
۵۶۸	نیک صحبت کے برکات	۵۳۷	آیات ۱۰۱ تا ۱۰۹
"	اصحاب کہف کا رعب و جلال	۵۳۹	معارف و مسائل
۵۶۹	آیات ۱۹ تا ۲۰ مع خلاصہ تفسیر	۵۴۰	موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات
۵۷۳	چند مسائل	۵۴۱	آیات ۱۱۰ تا ۱۱۱
"	آیت ۲۱	۵۴۲	معارف و مسائل، سورت کا شان نزول
۵۷۴	اصحاب کہف کی خبر شہر میں پھیل گئی	۵۴۳	ختم سورہ بنی اسرائیل و عرض مؤلف
۵۷۶	ان کی وفات کے بعد لوگوں میں اختلاف	۵۴۵	سورۃ کہف
۵۷۷	آیات ۲۲ مع خلاصہ تفسیر	"	آیات ۸ تا ۸
۵۷۸	اختلافی بحثوں میں گفتگو کے آداب	۵۴۶	سورہ کہف کی خصوصیات اور فضائل
۵۷۹	اسماں اصحاب کہف	"	شان نزول
"	اختلافی معاملات میں طویل بحث	۵۴۸	خلاصہ تفسیر
۵۸۰	آیات ۲۳ تا ۲۶	۵۴۹	معارف و مسائل
۵۸۲	آئندہ کام کرنے پر انشاء اللہ کہنا	"	آیات ۹ تا ۱۲
۵۸۴	آیات ۲۷ تا ۳۱	۵۵۰	معارف و مسائل
۵۸۶	دعوت و تبلیغ کے خاص آداب	"	فقہ اصحاب کہف و رفیق
۵۸۷	اہل جنت کے لئے زیور	۵۵۳	غار اصحاب کہف جیسے غار دنیا میں متعدد ہیں
۵۸۸	آیات ۳۲ تا ۴۴	"	اصحاب کہف کی جگہ اور ان کا زمانہ

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۶۲۱	والدین کی نیکی کا فائدہ اولاد تک	۵۹۲	آیات ۴۵ تا ۴۹
۶۲۲	اللہ والوں کا وجود پورے شہر کیلئے امان ہے	۵۹۶	قیامت میں قبروں سے اٹھنے کے وقت
۶۲۳	پیغمبرانہ بلاغت اور رعایت ادب	۵۹۷	جزا ر عین عمل ہے
۶۲۴	حضرت علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات ہو گئی	۵۹۸	آیات ۵۰ تا ۵۹
۶۲۶	آیات ۸۳ تا ۸۸	۶۰۱	ابلیس کی اولاد اور ذریت بھی ہے
۶۲۸	ذوالقرنین کی تعریف اور تاریخ و وطن	۶۰۲	آیات ۶۰ تا ۷۰
۶۳۵	آیات ۸۹ تا ۹۱ و ۹۲ تا ۹۸	۶۰۵	اسلام میں نوکروں کا بھی ادب ہے
۶۳۸	یاجوج و ماجوج کون، کہاں ہیں، اور سید	۶۰۶	حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا قہقہہ
۶۳۹	ذوالقرنین کہاں ہے؟	۶۰۹	سفر کے بعض آداب اور پیغمبرانہ عزم کا نمونہ
۶۴۰	یاجوج ماجوج کے متعلق روایات حدیث	۶۱۱	موسىٰ علیہ السلام کی افضلیت خضر علیہ السلام پر
۶۴۱	اور ان کے حالات و واقعات	۶۱۲	حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے یا نہیں
۶۴۲	روایات حدیث سے حاصل شدہ نتائج	۶۱۳	کسی ولی کو ظاہر شریعت کی خلاف ورزی
۶۵۰	محدث عصر حضرت شاہ صاحب کشمیری کی تحقیق	۶۱۵	حلال نہیں
۶۵۲	سید ذوالقرنین اس وقت تک موجود ہے	۶۱۸	شاگرد کے لئے استاد کا اتباع
۶۵۵	آیات ۹۹ تا ۱۰۱ و ۱۰۲ تا ۱۰۸	۶۲۰	عالم شریعت کو خلاف شرع امر پر صبر
۶۵۹	قیامت میں اعمال کا اعتبار وزن سے ہوگا	۶۲۱	جائز نہیں
۶۶۰	تعداد یا پیمائش سے نہیں	۶۲۲	علم موسیٰ و خضر میں بنیادی فرق
۶۶۱	آیات ۱۰۹ تا ۱۱۰	۶۲۳	آیات ۷۱ تا ۷۸
۶۶۲	اخلاص عمل اور ریاکاری	۶۲۴	آیات ۷۹ تا ۸۲
۶۶۳	ریا کاری کے نتائج بد	۶۲۵	مسکین کی تعریف
۶۶۴	سورہ کہف کے بعض فضائل اور خواص	۶۲۶	بعض ظاہری خرابی حقیقی اصلاح ہوتی ہے
۶۶۵	ایک اہم نصیحت	۶۲۷	ایک قدیم نصیحت نامہ



سورۃ یوسف

مَكِّيَّةٌ نَزَّلَتْ فِي مِائَةِ آيَةٍ وَاجْزَى عَشْرَةَ آيَةٍ وَاثْنَا عَشَرَ مِائَةً

سورۃ یوسف مکیہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الْوَاقِعُ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ (۱) إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا

یہ آیتیں ہیں واقع کتب کی ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۲) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ

کہ تاکہ تم سمجھ لو ہم بیان کرتے ہیں تم سے پاس بہت اچھا بیان اس

بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ

واسطے کہ بھیجا ہم نے تمہیں طوف یہ قرآن اور تو تھا اس سے پہلے

لَمِنَ الْغَافِلِينَ (۳) إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ

البتہ بے خبروں میں اس وقت کہایوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا

أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ (۴)

نواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا میں نے ان کو اپنا واسطے سجدہ کرتے ہوئے

قَالَ يَبْنِي سَا لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۚ

کہا کہ بیٹے مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے پھودہ بنائیں گے تیرے واسطے کھدائی

إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ (۵) وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ

البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن اور اسی طرح برگزیدہ کرتے گا تجھے کو

رَبِّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ

تیرا رب اور سکھائے گا تجھ کو تمھارے پرانے باتوں کا اور پورا کریگا اپنا انعام تجھ پر

وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ

اور یعقوب کے گھر پر جیسا پورا کیا ہو تیرے باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم

وَإِسْحٰقَ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝۶

اور اسحاق البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر

الکرام (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ آیتیں ہیں ایک واضح کتاب کی (جس کے الفاظ اور معانی اذلیہ بہت صاف ہیں) ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم (اہل زبان ہونے کی وجہ سے دوسروں سے پہلے) سمجھو (بکھر بکھارے واسطے سے دوسرے لوگ سمجھیں)۔ ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس بھیجا ہے اس کے ذریعہ سے ہم آپ سے ایک بڑا عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں اور اس سے پہلے آپ (اس قصہ سے) بالکل بے خبر تھے (کیونکہ نہ آپ نے کوئی کتاب پڑھی تھی، نہ کسی معلم سے کچھ سیکھا تھا) اور قصہ کی شہرت بھی ایسی نہیں تھی کہ عوام جانتے ہوں (آخر قصہ) وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد یعقوب (علیہ السلام) سے کہا کہ آبا میں نے (خواب میں) گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، انھوں نے (جواب میں) فرمایا کہ بیٹا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا (کیونکہ وہ خاندان نبوت میں سے ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر جانتے ہیں کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی اور سورج والد اور چاند ماں ہے، اور سجدہ کرنے سے مراد ان سب کا تمھارے لئے مطیع و فرمانبردار ہونا ہے) تو وہ تمھارے (ایذا رسانی کے) لئے کوئی خاص تدبیر کریں گے (یعنی بھائیوں میں سے اکثر، کیونکہ دش بھائی علاتی تھے، ان سے خطرہ تھا، صرف ایک بھائی تحقیقی بنیامین تھے جن سے کسی خلاف کا تو اندیشہ نہ تھا، مگر یہ احتمال تھا کہ ان کے منہ سے بات نکل جائے) بلاشبہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے (اس لئے بھائیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالے گا) اور جس طرح اللہ تعالیٰ تم کو یہ عزت دے گا کہ سب تمھارے تابع و مطیع ہوں گے، اسی طرح تمھارا رب تمکو (دوسری عزت نبوت کیلئے بھی) منتخب کریگا اور تمکو خواہو بخواہی تعبیر کا علم دے گا اور دوسری نعمتیں دیکر بھی ہنم پر اور اولاد یعقوب پر اپنا انعام کامل کریگا جیسا کہ اس سے پہلے تمھارے دادا ابراہیم و اسحاق (علیہما السلام) پر اپنا انعام کامل کر چکا ہے واقعی تمھارا رب بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔

معارف و مسائل

سورۃ یوسف چار آیتوں کے سوا پوری مکی سورۃ ہے، اس سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے، اور یہ قصہ صرف اسی سورۃ میں آیا ہے، پورے قرآن میں دو بار اس کا کہیں ذکر نہیں، یہ خصوصیت صرف قصہ یوسف علیہ السلام ہی کی ہے، ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پورے قرآن میں جس حکمت کے تحت احسن اور اجزاء کر کے لائے گئے ہیں اور بار بار لائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم اور ماضی کے تجربات میں انسان کی آئندہ زندگی کے لئے بڑی سبق ہوتے ہیں جن کی فرت رفتی تاثیر کا رنگ انسان کے قلب و دماغ پر عام تعلیمات سے بہت زیادہ گہرا اور بے غمت ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم جو تمام اقوام عالم کے لئے آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے، اس میں پوری اقوام عالم کی تاریخ کا وہ منتخب حصہ لے لیا گیا ہے، جو انسان کے حال اور مآل کی اصلاح کے لئے نسخہ یکمیا ہے، مگر قرآن کریم نے تاریخ عالم کے اس حصہ کو بھی اپنے مخصوص و بے مثال انداز میں اس طرح لیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا نہ صرف نہیں کر سکتا کہ یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ہر مقام پر جس قصہ کا کوئی تذکرہ عبادت و مہمذلت کیلئے ضروری سمجھا گیا وہ اتنا ہی حصہ وہاں بیان کیا گیا، اور پھر کسی دوسرے موقع پر اس حصہ کی ضرورت سمجھی گئی تو پھر اس کا اہل و دہ کر دیا گیا، اسی لئے ان قصوں کے بیان میں واقعاتی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی، بعض جگہ قصہ کا ابتدائی حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے ذکر کر دیا گیا ہے، اس خاص اسلوب قرآنی میں یہ مستقل ہدایت ہے، کہ دنیا کی تاریخ اور اس کے گزشتہ واقعات کا پڑھنا یاد رکھنا خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ انسان کا مقصد ہر قصہ و خبر سے کوئی عبرت و نصیحت حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

اسی لئے بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ انسان کے کلام کی جو دو قسمیں خبر اور انشاء مشہور ہیں ان دونوں قسموں میں سے مقصود اصلی انشاء ہی ہے، خبر بحیثیت خبر کبھی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دانشمند انسان کا مقصد ہر خبر اور واقعہ کو سننے اور دیکھنے سے صرف اپنے حال اور عمل کی اصلاح ہونی چاہئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تاریخ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے، اس میں اس فن والوں کے لئے خاص ہدایات ہیں، کہ بیان میں نہ اتنا اختصار ہونا چاہئے جس سے بات ہی پوری نہ سمجھی جاسکے

اور نہ اتنا طویل ہونا چاہئے کہ اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا مشکل ہو جائے جیسا کہ اس قصہ کے قرآنی بیان سے واضح ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ یہود نے آرائش کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو ہمیں بتلائیے کہ آل یعقوب ملک شام سے مصر کیوں منتقل ہوتے، اور یوسف علیہ السلام کا واقعہ کیا تھا؟ ان کے جواب میں بذریعہ وحی یہ پورا قصہ نازل کیا گیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور آپ کی نبوت کا بڑا شاہد تھا، اگر آپ امی محض تھے اور علم سحر مکہ میں مقیم رہے، کسی تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کوئی کتاب پڑھی، پھر وہ تمام واقعات جو تورات میں مذکور تھے، صحیح صحیح بتلا دیتے، بلکہ بعض وہ چیزیں بھی بتلا دیں جن کا ذکر تورات میں نہ تھا، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام اور ہدایات ہیں جو آگے بیان ہوں گی۔

سب سے پہلی آیت میں حروف الکر مقطعات قرآنیہ میں ہے، جن کے متعلق جہود سلف صحابہ و تابعین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ متکلم اور مخاطب جنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے جس کو کوئی تیسرا آدمی نہیں سمجھ سکتا، اور نہ اس کے لئے مناسب ہے کہ اس کی تحقیق کے درپے ہو۔

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ، یعنی یہ ہیں آیتیں اس کتاب کی جو احکام حلال و حرام اور ہر کام کی حدود و قیود بتلا کر انسان کو ہر شعبہ زندگی میں ایک معتدل سیدھا نظام حیات بخشتی ہیں جن کے نازل کرنے کا وعدہ تورات میں پایا جاتا ہے، اور یہود اس سے واقف ہیں۔

إِذَا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا تَعْلَمُونَهُ، یعنی ہم نے نازل کیا اس کو قرآن عربی بنا کر کہ شاید تم سمجھ بوجھ حاصل کر لو۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قصہ یوسف علیہ السلام کا سوال کرنے والے عرب کے یہودی تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی کی زبان میں یہ قصہ نازل فرمادیا تاکہ وہ غور کریں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و حقانیت پر ایمان لائیں اور اس قصہ میں جو احکام و ہدایات ہیں ان کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔

اس لئے اس جگہ لفظ نَعْلَمُ بمعنی شاید لایا گیا ہے، کیونکہ ان مخاطبوں کا حال معلوم تھا کہ ایسی واضح آیات و بینات سامنے آنے کے بعد بھی ان سے قبول حق کی توقع مشکوک تھی۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الْغَافِلِينَ، یعنی ہم بیان کرتے ہیں آپ کے لئے بہترین قصہ اس قرآن کو بذریعہ وحی آپ پر نازل کر کے بیشک آپ اس سے پہلے ان تمام واقعات کا ناواقف تھے۔

اس میں یہود کو تنبیہ ہے کہ تم نے جس طرح ہمارے رسول کی آزمائش کرنا چاہی اس میں بھی رسول کا کمال واضح ہو گیا، کیونکہ وہ پہلے سے اُچی اور نایک عالم سے ناواقف تھے، اب اس واقفیت کا کوئی ذریعہ بجز تعلیم الہی اور وحی نبوت کے نہیں ہو سکتا۔

اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۚ یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان
میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔
یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب تھا جس کی تعبیر کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس
نے فرمایا کہ گیارہ ستاروں سے مراد یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور سورج اور چاند سے
مراد ماں باپ تھے۔

قرطبی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ اگرچہ اس واقعہ سے پہلے وفات
پا چکی تھیں، مگر ان کی خالہ والدہ ماجدہ کے نکاح میں آگئی تھیں، خالہ خود بھی ماں کے قائم مقام
سمجھی جاتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ والد کی زوجیت میں آجائے تو عرفاً اس کو ماں ہی کہا جائے گا۔
قَالَ يَبْنَىٰ لَا تَقْعَبُهُنَّ رُجُيَاكَ عَلَىٰ اِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۚ اِنَّ
الشَّيْطَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ، یعنی بیٹا تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا،
ایسا نہ ہو کہ وہ یہ خواب سن کر تمہاری عظمتِ شان معلوم کر کے تمہیں ہلاک کرنے کی کوئی تدبیر
کریں، کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، وہ دنیا کے جاہ و مال کی خاطر انسان کو ایسے کاموں میں
بتلا کر دیتا ہے۔

ان آیات میں چند مسائل قابل ذکر ہیں :-

خواب کی حقیقت اور درجہ | سب سے اوّل خواب کی حقیقت اور اس سے معلوم ہونے والے
اور اس کی قسمیں ؛ ؛ واقعات و اخبار کا درجہ اور مقام ہے، تفسیر منظر میں حضرت
قضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حقیقت خواب کی یہ ہے کہ نفسِ انسان جس وقت نیند
یا بیہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کو اس کی قوتِ خیالیہ کی
راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں، اسی کا نام خواب ہے، پھر اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے
دو بالکل باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی، اور ایک اپنی ذات کے اعتبار
سے صحیح و صادق ہے، مگر اس صحیح قسم میں بھی کبھی کبھی عوارض شامل ہو کر اس کو فاسد و ناقابل اعتبار
کر دیتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خواب میں جو انسان مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا

کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا رہتا ہے وہی خواب میں مشکل ہو کر نظر آجاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے، کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے یہ دونوں قسمیں باطل ہیں جن کی نہ کوئی حقیقت و اصلیت ہے نہ اس کی کوئی واقعی تعبیر ہو سکتی ہے، ان میں پہلی قسم کو حدیث النفس اور دوسری کو تسوکل شیطانی کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو اپنے بندہ کو متنبہ کرنے یا خوش خبری دینے کے لئے کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب و دماغ میں ڈال دیتے ہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے رب سے شرف گفتگو حاصل کرتا ہے، یہ حدیث طبرانی نے بسند صحیح روایت کی ہے (منظری)۔

اس کی تحقیق صوفیائے کرام کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں وجود میں آنے والی ہیں، اس وجود سے پہلے ہر چیز کی ایک خاص شکل عالم مثال میں ہوتی ہے، اور اس عالم مثال میں جس طرح جو اہر اور حقائق ثابتہ کی صورتیں نکلیں ہوتی ہیں، اسی طرح معانی اور احوال کی بھی خاص شکلیں ہوتی ہیں، خواب میں جب نفس انسانی ظاہر بدن کی تدبیر سے فانی ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کا تعلق عالم مثال سے ہو جاتا ہے اور بالجو کائنات کی شکلیں ہیں وہ اس کو نظر آجاتی ہیں، پھر یہ صورتیں عالم غیب دکھائی جاتی ہیں، بعض اوقات ان میں بھی کچھ عوارض ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اصل حقیقت کے ساتھ کچھ تخیلات باطلہ شامل ہو جاتے ہیں، اس لئے اہل تعبیر کو بھی اس کی تعبیر سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ تمام عوارض سے پاک صاف رہتی ہیں تو وہ اصل حقیقت ہوتی ہیں، مگر ان میں بھی بعض خواب محتاج تعبیر ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں حقیقت واقعہ واضح نہیں ہوتی، ایسی صورت میں بھی اگر تعبیر غلط ہو جائے تو واقعہ مختلف ہو جاتا ہے، اس لئے صرف وہ خواب صحیح طور پر الہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہوگی جو اللہ کی طرف سے ہو اور اس میں کچھ عوارض بھی شامل نہ ہوں، اور تعبیر بھی صحیح دی گئی ہو۔

انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں، اس لئے ان کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں، عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کے احتمال رہتے ہیں، اس لئے وہ کسی کے لئے حجت اور دلیل نہیں ہوتے، ان کے خوابوں میں بعض اوقات طبعی اور نفسانی صورتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات گناہوں کی ظلمت و کدورت صحیح خواب پر چھا کر اس کو

نا قابل اعتماد بنادیتی ہے، بعض اوقات تعبیر صحیح سمجھ میں نہیں آتی۔

خواب کی یہ تین قسمیں جو ذکر کی گئی ہیں یہی تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے آپ نے فرمایا کہ خواب کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم شیطانی ہے جس میں شیطان کی طرف سے کچھ صورتیں ذہن میں آتی ہیں، دوسری وہ جو آدمی اپنی بیداری میں دیکھتا رہتا ہے وہی صورتیں خواب میں سامنے آجاتی ہیں، تیسری قسم جو صبح اور حق ہے وہ نبوت کے اجزاء میں سے چھیا لیسواں جز ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہے۔

خواب میں جو نبوت ہونے کے | یہ قسم جو حق اور صحیح ہے اور صحیح احادیث نبویہ میں نبوت کا ایک معنی اور اس کی تشریح | جزء قرار دی گئی ہے، اس میں روایات حدیث مختلف ہیں بعض

میں چالیسواں جز اور بعض میں چھیا لیسواں جز بتلایا، اور بعض روایات میں انچاس اور پچاس اور ستر واں جز ہونا بھی منقول ہے، یہ سب روایتیں تفسیر قرطبی میں جمع کر کے ابن عبد البر کی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ان میں کوئی تضاد و تخالف نہیں، بلکہ ہر ایک روایت اپنی جگہ صحیح و درست ہے، اور تعدد اجزاء کا یہ اختلاف خواب دیکھنے والوں کے مختلف حالات کی بناء پر ہے، جو شخص سچائی، امانت، دیانت اور کمال ایمان کے ساتھ متصف ہے اس کا خواب نبوت کا چالیسواں جز ہوگا، اور جو ان اوصاف میں کچھ کم ہے اس کا چھیا لیسواں یا پچاسواں جز ہوگا، اور جو اور کم ہے اس کا خواب نبوت کا ستر واں جز ہوگا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ سچے خواب کے جزء نبوت ہونے سے کیا مراد ہے، تفسیر منطہری میں اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نبوت کا سلسلہ تینیس سال جاری رہا، ان میں سے پہلی ششماہی میں یہ وحی الہی خوابوں کی صورت میں آتی رہی، باقی پینتالیس ششماہیوں میں جبرئیل امین کی پیغام رسانی کی صورت میں آئی، اس حساب سے سچی خوابیں وحی نبوت کا چھیا لیسواں جزء ہوا، اور جن روایات میں کم و بیش عدد مذکور ہیں ان میں یا تقریبی کلام کیا گیا ہے یا وہ سندر کے اعتبار سے ساقط ہیں۔

اور امام قرطبی نے فرمایا کہ اس کے جزء نبوت ہونے سے مراد یہ ہے کہ خواب میں بعض اوقات انسان ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو اس کی قدرت میں نہیں، مثلاً یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اڑ رہا ہے، یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھے جن کا علم حاصل کرنا اس کی قدرت میں نہ تھا، تو اس کا ذریعہ بجز امداد و الہام خداوندی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا، جو اصل میں خاصہ نبوت ہے، اس لئے اس کو ایک جزء نبوت قرار دیا گیا۔

قادیانی دجال کے ایک مخالفہ کی تردید | یہاں کچھ لوگوں کو ایک عجیب مغالطہ لگتا ہے کہ اس جزء نبوت

کے دنیا میں باقی رہنے اور جاری رہنے سے نبوت کا باقی اور جاری رہنا سمجھ لیجئے جو قرآن مجید کی نصوص قطعیہ اور بے شمار احادیث صحیحہ کے خلاف اور پوری امت کے اجماعی عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے، اور یہ نہ سمجھے کہ کسی چیز کا ایک جز موجود ہونے سے اس چیز کا موجود ہونا لازم نہیں آتا، اگر کسی شخص کا ایک ناخن یا ایک بال کہیں موجود ہو تو کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں وہ شخص موجود ہے، مثیلین کے بہت سے نکل پرزدوں ہیں اگر کسی کے پاس ایک پرزہ یا ایک سکر موجود ہو اور وہ کہنے لگے کہ میرے پاس فلاں مشین موجود ہے تو دنیا بھر کے انسان اس کو یا جھوٹا سمجھیں گے یا بیوقوف۔

سچے خواب حسب تصریح حدیث بلاشبہ جز نبوت ہیں مگر نبوت نہیں، نبوت تو ختم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **لَا مَبْشَرَاتٍ** یعنی آئندہ نبوت کا کوئی جز سب مبعثرات کے باقی نہ رہے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ مبعثرات سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ ”سچے خواب“، جس سے ثابت ہوا کہ نبوت کسی قسم یا کسی صورت سے باقی نہیں، صرف اس کا چھوٹا جز باقی ہے جس کو مبعثرات یا سچے خواب کہا جاتا ہے۔

کبھی کبھی فرنا سق آدمی کا خواب | اور یہ بات بھی قرآن و حدیث سے ثابت اور تجربات سے معلوم ہو سکتی ہے کہ سچے خواب بعض اوقات فاسق فاجر بلکہ کافر کو بھی آسکتے ہیں سورۃ یوسف ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے دو ساتھیوں کے خواب اور ان کا سچا ہونا، اسی طرح بادشاہ مصر کا خواب اور اس کا سچا ہونا قرآن میں مذکور ہے، حالانکہ یہ تینوں مسلمان نہ تھے، حدیث میں کسری کا خواب مذکور ہے، جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق دیکھا تھا، وہ خواب صحیح ہوا حالانکہ کسری مسلمان نہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی عاتکہ نے بحالت کفر آپ کے بارے میں سچا خواب دیکھا تھا نیز کافر بادشاہ بخت نصر کے جس خواب کی تعبیر حضرت دانیال علیہ السلام نے دی وہ خواب سچا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض اتنی بات کہ کسی کو کوئی سچا خواب نظر آجائے اور واقعہ اس کے مطابق ہو جائے، اس کے نیک صالح بلکہ مسلمان ہونے کی بھی دلیل نہیں ہو سکتی، ہاں یہ صحیح ہے کہ عام عادۃ اللہ یہی ہے کہ سچے اور نیک لوگوں کے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں، فاسق و فجار کے عموماً حدیث النفس یا تسویل شیطانی کی قسم باطل سے ہوا کرتے ہیں، مگر کبھی اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔

بہر حال سچے خواب عام امت کے لئے حسب تصریح حدیث ایک بشارت یا تنبیہ سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتے، نہ خود اس کے لئے کسی معاملہ میں بہت ہیں نہ دوسروں کے لئے، بعض نادان لوگ ایسے خواب دیکھ کر طرح طرح کے دس دس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کوئی ان کو اپنی ولایت کی علامت سمجھنے لگتا ہے، کوئی ان سے حاصل ہونے والی باتوں کو شرعی احکام کا درجہ دینے لگتا ہے یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں، خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سچی خوابوں میں بھی بکثرت نفسانی یا شیطانی یادوں قسم کے تصورات کی آمیزش کا احتمال ہے۔

خواب ہر شخص سے بیان | مسئلہ: آیت ثانیہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف کو
کرنا درست نہیں | علیہ السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا،
اس سے معلوم ہوا کہ خواب ایسے شخص کے سامنے بیان نہ کرنا چاہئے جو اس کا خیر خواہ اور بہرہ
نہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے سامنے جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو۔

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے، اور خواب معلق رہتا ہے جب تک کسی سے بیان نہ کیا جاتا ہے جب بیان کر دیا گیا اور سننے والے نے کوئی تعبیر دیدی، تو تعبیر کے مطابق واقع ہو جاتا ہے اس لئے چاہئے کہ خواب کسی سے بیان نہ کرے، بجز اس شخص کے کہ جو عالم و عاقل ہو یا کم از کم اس کا دوست اور خیر خواہ ہو۔

نیز ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے، ایک اللہ کی طرف سے بشارت، دوسرے نفسانی خیالات، تیسرے شیطانی تصورات، اس لئے جو شخص کوئی خواب دیکھے اور اسے بھلا معلوم ہو تو اس کو اگر چاہے لوگوں سے بیان کر دے، اور اگر اس میں کوئی بُری بات نظر آئے تو کسی سے نہ کہے، بلکہ اٹھ کر نماز پڑھ لے، اور صحیح مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر خواب دیکھے تو بائیں طرف تین مرتبہ نفث کرے اور اللہ سے اس کی بُرائی سے پناہ مانگے، اور کسی سے ذکر نہ کرے، تو یہ خواب اس کو کوئی نقصان نہ دے گا، وجہ یہ ہے کہ بعض خواب تو شیطانی تصورات ہوتے ہیں وہ اس عمل سے دفع ہو چکے اور اگر سچا خواب ہو تو اس عمل کے ذریعہ اس کی بُرائی دور ہو جانے کی بھی امید ہے۔

مسئلہ: خواب کی تعبیر خواب پر موقوف رہنے کا مطلب تفسیر منطقی میں یہ بیان فرمایا ہے کہ بعض تقدیری امور تقدیر مہرہم یعنی قطعی نہیں ہوتے، بلکہ معلق ہوتے ہیں کہ فلاں کام ہو گیا تو یہ مصیبت ٹل جائے گی، اور نہ ہو تو پڑ جائے گی، جس کو قصائے معلق کہا جاتا ہے، ایسی صورت میں بُری تعبیر دینے سے معاملہ بُرا اور اچھی تعبیر سے اچھا ہو جاتا ہے، اسی لئے

ترندی کی حدیث مذکور میں ایسے شخص سے خواب بیان کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو عقلمند نہ ہو یا اس کا خیر خواہ ہمدرد نہ ہو، اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ خواب کی کوئی بری تعبیر سُنکر انسان کے دل میں یہی خیال جمتا ہے کہ اب مجھ پر مصیبت آنے والی ہے، اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي يَتِي، یعنی بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہو میں اس کے حق میں ایسا ہی ہو جاتا ہوں۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آنے پر یقین کر بیٹھا تو اس عادت اللہ کے مطابق اس پر مصیبت آنا ضرور ہو گیا۔

مَسْئَلہ ۱۔ اس آیت سے جو یہ معلوم ہوا کہ جس خواب میں کوئی بات تکلیف و مصیبت کی نظر آئے وہ کسی سے بیان نہ کرے روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت محض شفقت اور ہمدردی کی بناء پر ہے، شرعی حرام نہیں، اس لئے اگر کسی سے بیان کر دے تو کوئی گناہ نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ میں ہو کہ غزوۃ اُحد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی، اور دیکھا کہ کچھ گناہیں ذبح ہو رہی ہیں، جس کی تعبیر حضرت حمزہؓ کی شہادت اور بہت سے مسلمانوں کی شہادت تھی جو بڑا حادثہ ہے، مگر آپ نے اس خواب کو صحابہ سے بیان فرما دیا تھا۔ (قرطبی)

مَسْئَلہ ۲۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کو دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے اُس کی کسی بری خصلت یا نیرت کا اظہار کر دینا جائز ہے، یہ غیبت میں داخل نہیں، مثلاً کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی کسی دوسرے آدمی کے گھر میں چوری کرنے یا اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ اس شخص کو باخبر کر دے، یہ غیبت حرام میں داخل نہیں، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کر دیا کہ بھائیوں سے ان کی جان کا خطرہ ہے۔

مَسْئَلہ ۳۔ اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کے متعلق یہ احتمال ہو کہ ہماری خوش حالی اور نعمت کا ذکر سنے گا تو اس کو حسد ہو گا، اور نقصان پہونچانے کی فکر کرے گا تو اس کے سامنے اپنی نعمت، دولت و عزت وغیرہ کا ذکر نہ کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے ان کو راز میں رکھنے سے مدد حاصل

کر، کیونکہ دنیا میں ہر صاحبِ نعمت سے حسد کیا جاتا ہے۔“

مَسْئَلہ ۴۔ اس آیت اور بعد کی آیات سے جن میں حضرت یوسف علیہ السلام

کو قتل کرنے یا کنویں میں ڈالنے کا مشورہ اور اس پر عمل مذکور ہے، یہ بھی واضح ہو گیا کہ

یوسف علیہ السلام کے بھائی اللہ کے نبی اور پیغمبر نہ تھے، ورنہ قبل یوسف کا مشورہ اور پھر ان کو
فناج کرنے کی تدبیر اور باپ کی ناسرمانی کا عمل ان سے نہ ہوتا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا
سب گناہوں سے پاک ہونا اور محسوس ہونا ضروری ہے، کتاب طبری میں جو ان کو انبیاء کہا گیا
ہے وہ صحیح نہیں (قرطبی)

چھٹی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام سے چند انعامات عطا کرنے کا وعدہ
فرمایا ہے اول گنہگاروں کی توبہ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے انعامات و احسانات کے لئے
آپ کا انتخاب فرمائیں گے، جس کا ظہور ملک مصر میں حکومت اور عزت و دولت ملنے سے ہوا،
دوسرے وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ، اس میں احادیث سے مراد لوگوں کے خواب
ہیں، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تعبیر خواب کا علم سکھادیں گے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ
تعبیر خواب ایک مستقل فن ہے، ہوا اللہ تعالیٰ کسی کسی کو عطا فرمادیتے ہیں، ہر شخص اس کا اہل نہیں۔
مَسْئَلَةٌ۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ عبد اللہ بن شداد بن الہاد نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام
کے اس خواب کی تعبیر چالیس سال بعد ظاہر ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا
کوئی ضروری نہیں۔

تیسرا وعدہ وَيُتِمُّ بِكَ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ یعنی اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی نعمت پوری فرمادیں گے
اس میں عطا ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور اسی کی طرف اشارہ بعد کے جملوں میں ہے كَمَا آتَيْنَاكَ
عَلَىٰ آبَائِكَ مِنْ قَبْلُ ابراہیم واسحق، یعنی جس طرح ہم اپنی نعمت نبوت
تمہارے باپ دادا ابراہیم اور اسحق علیہم السلام پر آپ سے پہلے پوری کر چکے ہیں، اس میں اس طرف
بھی اشارہ ہو گیا کہ تعبیر خواب کا فن جیسا کہ یوسف علیہ السلام کو دیا گیا، اسی طرح ابراہیم واسحق
علیہم السلام کو بھی سکھایا گیا تھا۔

آخر آیت میں فرمایا إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ یعنی تمہارا پروردگار بڑا علم والا بڑی
حکمت والا ہے، نہ اس کے لئے کسی کو کوئی فن سکھانا مشکل ہے، اور نہ از روئے حکمت وہ یہ
فن ہر شخص کو سکھاتا ہے، بلکہ اپنی حکمت کے ماتحت انتخاب کر کے کسی کو یہ ہنر دیدیتا ہے

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٍ لِلِّسَّائِلِينَ (۱۰) إِذْ قَالُوا

البتہ ہیں یوسف کے قصہ میں اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں پوچھنے والوں کیلئے، جب کہنے لگے

لِيُؤْثِرَ يَوْسُفَ وَآخُوهُ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِمَّا نَحْنُ عَصَبَةٌ (۱۱) إِنَّا

البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہمارے باپ کو ہم سے اور ہم ان زیادہ قوت والے لوگ ہیں، البتہ

آبَا نَالِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۸ اِقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوْ اَطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَحْنُلْ

ہمارا باپ صریح خطا پرست ہے ، مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ نکالیں رہے

لَكُمْ وَجْہٌ اَبٰیكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْ اٰبَعْدِہٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ۝۹

تم پر توجہ تمھارے باپ کی ، اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ

قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَالْقَوَّہُ فِیْ غِیْبَتِ الْجُبِّ

بولا ایک بولنے والا ان میں مت مار ڈالو یوسف کو اور ڈال دو اس کو گناہ کنویں میں

یَسْتَقِطُّ بِعَصْرِ السَّیَّارَةِ اِنْ کُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝۱۰ قَالُوْا یٰۤاَبَا نَا

کہ اٹھالے جائے اس کو کوئی مسافر اگر تم کو کرنا ہے ، بولے اے باپ

مَا لَکَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ وَاِنَّا لَکَ لَنَصِیْحُوْنَ ۝۱۱ اَرْسِلْہٗ

کیا بات ہو کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر اور ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں ، بھیج اس کو

مَعَنَا غَدًا یَّرْتَمِ وَیَلْعَبُ وَاِنَّا لَکَ لَحٰفِظُوْنَ ۝۱۲ قَالَ اِنِّیْ

ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اس کے نگہبان ہیں ، بولا مجھ کو

لِیَحْزَنُنِیْ اَنْ تَذٰہِبُوْا بِہٖ وَاَخَافُ اَنْ یَّاکُلَہُ الذِّئْبُ وَ

غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اس کو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں اس سے کہ کھا جائے اس کو بھیڑیا اور

اَنْتُمْ عَنْہٗ غٰفِلُوْنَ ۝۱۳ قَالُوْا الذِّئْبُ اَکَلَہُ الذِّئْبُ وَتَحْنُ

تم اس سے بے خبر رہو ، بولے اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا اور ہم ایک

عَصَبَہٗ اِنَّا اِذَا الْخِیْرُ وُنَ ۝۱۴ فَلَمَّآ ذٰہَبُوْا بِہٖ وَاَجْمَعُوْا

جاعت میں قوت در تو تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا ، پھر جب لیکر چلے اس کو اور متفق ہوئے

اَنْ یَّجْعَلُوْہٗ فِیْ غِیْبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحٰیۡنَا اِلَیْہِ لَنَبْدُوْہُمْ

کہ ڈالیں اس کو گناہ کنویں میں ، اور ہم نے اشارہ کر دیا اس کو کہ تو جتائے گا ان کو

بَاْمْرِہِمۡ ہٰذَا وَہُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۱۵ وَجَآءُ وَاَبَاہُمۡ عِشَآءٌ

ان کا یہ کام اور وہ سمجھ کو نہ جانیں گے ، اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑ کر

یَبْکُوْنَ ۝۱۶ قَالُوْا یٰۤاَبَا نَا اِنَّا ذٰہِبْنَا نَسْتَبِیْ وَتَرٰکُنَا یُوْسُفَ

روتے ہوئے ، کہنے لگے اے باپ ہم گئے دوڑنے آگے بچنے کو اور چھوڑا یوسف کو ،

عِنْدَ مَا عَنَّا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا

اپنے سبب کے پاس پھر اس کو کھا گیا بھیڑیا، اور تو باور نہ کریگا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم

صَبْرًا قِينٌ ⑭ وَجَاءُوا عَلَى قَيْصِصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ قَالَ بَلْ

چپے ہوں، اور لائے اس کے کرتے پر ہونے لگا کر جھوٹ، بولا یہ ہرگز نہیں

سَوَّلْتُ لَكُمْ أَنْفُسَكُمْ أَمْ رَأَوْا فَصَبْرًا جَمِيلًا وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ

جگہ بنادی کہ تم کو تمہارے ہیوں نے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے، اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں

عَلَى مَا تَصِفُونَ ⑮ وَجَاءَتْ سَيَّاسَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ

اس باہر جو تم ظاہر کرتے ہیں، اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا، اس نے

فَادَّيَّ دُلُوكَ قَالَ يَبْنَشُرِي هَذَا غُلْمٌ وَأَسْرُوءَ بَضَاعَةٍ

لڑکا دیا اپنا ڈول کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہر ایک لڑکا، اور چھپا لیا اس کو تجارت کا مال سمجھ کر

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ⑯ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ

اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں، اور بیچ آئے اسکو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی

مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ⑰

چونیاں، اور ہو رہے تھے اس سے بیزار۔

خلاصہ تفسیر

یوسف (علیہ السلام) کے اور ان کے (علاقائی) بھائیوں کے قصہ میں (خدا کی قدرت اور آپ کی نبوت کے) دلائل موجود ہیں ان لوگوں کے لئے جو آپ سے ان کا قصہ پوچھتے ہیں، کیونکہ یوسف علیہ السلام کو ایسی بے گسی اور بے بسی سے سلطنت و حکومت تک پہنچا دینا یہ خدا ہی کا کام تھا، جس سے مسلمانوں کے لئے عبرت اور قوتِ ایمان حاصل ہوگی، اور یہود جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قہر پوچھا تھا ان کے لئے اس میں دلیلِ نبوت مل سکتی ہے) وہ وقت قابلِ ذکر ہے جبکہ ان (علاقائی) بھائیوں نے (باہمی مشورہ کے طور پر) یہ گفتگو کی کہ (یہ کیا بات ہو کہ) یوسف اور ان کا (حقیقی) بھائی (نبی) ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں حالانکہ (وہ دونوں کم عمری کی وجہ سے ان کی خدمت کے قابل بھی نہیں اور ہم ایک جماعت کی جماعت ہیں، کہ اپنی قوت و کثرت کی وجہ سے ان کی ہر طرح

کی خدمت بھی کرتے ہیں) واقعی ہمارے باپ کھلی غلطی میں ہیں (اس لئے تدبیر یہ کرنی چاہئے کہ ان دونوں میں بھی زیادہ پیار یوسف سے ہے اس کو کسی طرح ان کے پاس سے ہٹانا چاہئے جس صورت یہ ہو کہ) یا تو یوسف کو قتل کر ڈالو، یا اس کو کسی (دور دراز) سرزمین میں ڈال دو (پھر تمھارے باپ کا رخ خاص تمھاری طرف ہو جاوے گا اور تمھارے سب کام بن جاویں گے، انہی میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو کہ وہ بڑا جرم ہے) اور ان کو کسی اندھیرے کنوئیں میں ڈال دو (جس میں اتنا پانی نہ ہو جس میں ڈوبنے کا خطرہ ہو کیونکہ وہ تو قتل ہی کی ایک صورت ہے، البتہ بستی اور رہگذر سے بہت دور بھی نہ ہو) تاکہ ان کو کوئی راہ چلتا مسافر نکال لے جائے، اگر تم کو (یہ کام) کرنا ہی ہے (تو اس طرح کرو، اس پر سب کی رائے متفق ہو گئی اور) سب لے (مل کر باپ سے) کہا کہ ابا اس کی کیا وجہ ہے کہ یوسف کے بارے میں آپ ہمارا اعتبار نہیں کرتے کہ کہیں کہیں ہمارے ساتھ نہیں بھیجتے) حالانکہ ہم اس کے (دل و جان سے) خیر خواہ ہیں (ایسا نہ چاہتے بلکہ آپ اس کو کل ہمارے ساتھ (جنگل) بھیجتے، کہ ذرا دھکا دیں گیلیں اور ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے، یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ مجھے ساتھ بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں ایک حزن اور ایک خوف، حزن تو یہ کہ مجھ کو یہ بات غم میں ڈالتی ہے کہ اس کو تم (میری نظروں کے سامنے سے) لے جاؤ اور (خوف یہ کہ) میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اس کو کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم (اپنے مشاغل میں) اس سے بے خبر رہو (کیونکہ اس جنگل میں بھیڑیے بہت تھے) وہ بولے اگر اس کو بھیڑیا کھا لے اور ہم ایک جماعت کی جماعت (موجود) ہوں تو ہم بالکل ہی گمراہ ہوئے (غرض کہ نہ سن کر یعقوب علیہ السلام سے یہ ان کو لے کر چلے) تو جب ان کو (اپنے ساتھ جنگل) لے گئے اور (قرارداد سابق کے مطابق) سب نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان کو کسی اندھیرے کنوئیں میں ڈال دیں (پھر اپنی تجویز پر عمل بھی کر لیا) اور اس وقت یوسف کی تسلی کے لئے ہم نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ (تم مغموم نہ ہو ہم تم کو یہاں سے خلاصی دے کر بڑے رتبہ پر پہنچا دیں گے اور ایک دن وہ ہو گا کہ) تم ان لوگوں کو یہ بات بتلاؤ گے اور وہ تم کو (اس وجہ سے کہ غیر متوقع طور پر شاہانہ صورت میں دیکھیں گے) پہچانیں گے بھی نہیں (چنانچہ واقعہ اسی طرح پیش آیا کہ بھائی مصر پہنچے اور آخر کار یوسف علیہ السلام نے ان کو بتلایا اِنِّیْ عَلِمْتُ مَا فَعَلْتُمْ بِیُوسُفَ، یوسف علیہ السلام کا تو یہ قصہ ہوا) اور (ادھر) وہ لوگ اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت روتے ہوئے پہنچے (اور جب باپ نے رونے کا سبب پوچھا تو) کہنے لگے ابا ہم سب تو آپس میں دوڑ لگانے میں (کہ کون آگے نکلے) لگ گئے اور یوسف کو ہم نے ایسی جگہ جہاں بھیڑیا آنے کا گمان نہ تھا) اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، بس (اتفاقاً) ایک بھیڑیا

آیا اور ان کو کھانگیا اور آپ تو ہمارا کاہن کو یقین کرنے لگے گو ہم کیسے ہی چپے ہوں اور جب یعقوب علیہ السلام کے پاس آنے لگے تھے تو یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگالائے تھے کہ کس جانور کا خون ان کی قمیص پر ڈال کر اپنی قول کی سند کے لئے پیش کیا (یعقوب نے دیکھا تو گرتا کہیں سے پھٹا نہیں تھا، کنار واہ الطبری عن ابن عباس، تو فرمایا یوسف کو بھڑیے نے ہرگز نہیں کھایا، بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، سو میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (صبر جمیل کی یہ تفسیر کہ اس کے ساتھ کوئی حرف شکایت نہ ہو طبری نے مرفوع حدیث کے حوالہ سے بیان کی ہے) اور جو باتیں تم بتاتے ہو ان میں اللہ ہی مدد کرے (کہ اس وقت مجھے اپنے صبر آجائے اور آئندہ تمہارا جھوٹ کھل جائے، بہر حال حضرت یعقوب صبر کر کے بیٹھ رہے) اور یوسف علیہ السلام کا یہ قصہ ہوا کہ اتفاق سے اُدھر ایک قافلہ آنکلا (جو مصر کو جا رہا تھا) اور انہوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے واسطے (یہاں کنویں پر) بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے ڈول کچ پکڑ لیا، جب ڈول باہر آیا اور یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگا بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا (قافلہ والوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی خوش ہوئے) اور ان کو مال (تجارت) قرار دے کر اس خیال سے (چھپا لیا کہ کوئی دعویدار نہ کھڑا ہو جائے تو پھر اس کو مصر لے جا کر بڑی قیمت پر فروخت کریں گے) اور اللہ کو ان سب کی کارگزاریاں معلوم تھیں (ادھر وہ بھائی بھی آس پاس لگے رہتے، اور کنویں میں یوسف کی خبر گیری کرتے کچھ کھانا بھی پہنچاتے جس سے مقصد یہ تھا کہ یہ ہلاک بھی نہ ہوں اور کوئی آکر انہیں کسی دوسرے ملک میں لے جائے اور یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہو، اس روز جب یوسف کو کنویں میں نہ دیکھا اور پاس ایک قافلہ پڑا دیکھا تو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، یوسف علیہ السلام کا پتہ لگ گیا تو قافلہ والوں سے کہا کہ ہمارا غلام ہے بھاگ کر آگیا تھا اور اب ہم اس کو رکھنا نہیں چاہتے) اور (یہ بات بنا کر) ان کو بہت ہی کم قیمت پر (قافلہ والوں کے ہاتھ) بیچ ڈالا یعنی گنتی کے چند درہم کے بدلے میں اور (وجہ یہ تھی کہ) یہ لوگ کچھ ان کے قدردان تو تھے ہی نہیں (کہ ان کو عمدہ مال سمجھ کر بڑی قیمت سے بیچتے، بلکہ ان کا مقصد تو ان کو یہاں سے مٹانا تھا) :

معارف و مسائل

سورۃ یوسف کی مذکورہ بالا آیتوں میں سے پہلی آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس سورۃ میں آنے والے قصہ یوسف علیہ السلام کو محض ایک قصہ نہ سمجھو، بلکہ اس میں سوال کرنے والوں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں اور ہدایتیں ہیں۔

اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کے لئے یہ قصہ آپ سے پوچھا تھا ان کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں، روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے، اور آپ کی خبر مذنبہ طیبہ میں پہنچی تو یہاں کے یہودیوں نے اپنے چند آدمی اس کام کے لئے مکہ معظمہ بھیجے کہ وہ جا کر آپ کی آزمائش کریں، اسی لئے یہ سوال ایک مبہم انداز میں اس طرح کیا کہ اگر آپ خدا کے سچے نبی ہیں تو یہ بتلایئے کہ وہ کونسا پیغمبر ہے جس کا ایک بیٹا ملک شام سے مصر لے جایا گیا اور باپ اس کے غم میں روتے روتے نابینا ہو گئے۔

یہ واقعہ یہودیوں نے اس لئے انتخاب کیا تھا کہ نہ اس کی کوئی عام شہرت تھی، نہ مکہ میں کوئی اس واقعہ سے واقف تھا، اور اس وقت مکہ میں اہل کتاب میں سے بھی کوئی نہ تھا جس سے بوالہ تورات و انجیل اس قصہ کا کوئی جز معلوم ہو سکتا، ان کے اس سوال پر ہی پوری سورۃ یوسف نازل ہوئی جس میں حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کا پورا قصہ مذکور ہے، اور اتنی تفصیل سے مذکور ہے کہ تورات و انجیل میں بھی اتنی تفصیل نہیں، اس لئے اس کا بیان کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ تھا۔

اور اس آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قطع نظر سوال یہود کے خود یہ واقعہ ایسے امور پر مشتمل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی ہدایتیں اور احکام و مسائل موجود ہیں، کہ جس بچہ کو بھائیوں نے ہلاکت کے غار میں ڈال دیا تھا اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچایا، اور کس طرح اس کی حفاظت کی، اور اپنے خاص بندوں کو اپنے احکام کی پابندی کا کس قدر گہرا رنگ عطا فرمایا، کہ نوجوانی کے زمانے میں تعیش کا بہترین موقع ملتا ہے، مگر وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے نفس کی خواہشات پر کیسا قابو پاتے ہیں کہ صاف اس بلا سے نکل جاتے ہیں، اور یہ کہ جو شخص نیکی اور تقویٰ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے مخالفین کے مقابلہ میں کیسی عزت دیتے ہیں، اور مخالفین کو اس کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں، یہ سب عبرتیں اور نصیحتیں اور قدرت الہیہ کی عظیم نشانیاں ہیں، جو ہر تحقیق کرنے والے اور غور کرنے والے کو معلوم ہو سکتی ہیں (قرطبی و مظہری)

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ذکر ہے، ان کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے یوسف علیہ السلام سمیت بارہ لڑکے تھے، ان میں سے ہر لڑکا صاحبِ لالہ ہوا، سب کے خاندان پھیلے، چونکہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اس لئے یہ سب بارہ خاندان بنی اسرائیل کہلاتے۔

ان بارہ لڑکوں میں دس بڑے لڑکے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پہلی زوجہ محترمہ

حضرت لیا بنت لیان کے بطن سے تھے، ان کی وفات کے بعد یعقوب علیہ السلام نے لیا کی بہن رحیل سے نکاح کر لیا، ان کے بطن سے دو لڑکے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے، اس لئے یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی صرف بنیامین تھے، باقی دس بھائی علاقائی یعنی باپ شریک تھے، یوسف علیہ السلام کی والدہ راحیل کا انتقال بھی ان کے بچپن ہی میں بنیامین کی ولادت کے تھا ہو گیا تھا، قرطبی (دوسری آیت میں یوسف علیہ السلام کا قصہ شروع ہوتا ہے، کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ یوسف علیہ السلام سے غیر معمولی محبت رکھتے ہیں جو ان کے بڑے بھائیوں کو حاصل نہیں، اس لئے ان پر حسد ہوا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کس طرح ان کو یوسف علیہ السلام کا خواب بھی معلوم ہو گیا ہو جس سے انھوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ ان کی بڑی شان ہونے والی ہے اس سے حسد پیدا ہوا، اور آپس میں گفتگو کی کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے والد کو بہ نسبت ہمارے یوسف اور اس کے حقیقی بھائی بنیامین سے زیادہ محبت ہے، حالانکہ ہم دہل ہیں اور ان سے بڑے ہیں، مگر کے کام کا ج سنبھالنے کی قوت رکھتے ہیں، اور یہ دونوں چھوٹے بچے ہیں جو کچھ کام نہیں کر سکتے، ہمارے والد کو اس کا خیال کرنا اور ہم سے زیادہ محبت کرنا چاہئے تھا، مگر انھوں نے کسی ہونی بے انصافی کر رکھی ہے، اس لئے یا تو تم یوسف کو قتل کر ڈالو، یا پھر کسی دوزخ میں پھینک دو جہاں سے واپس نہ آسکے۔

اس آیت میں ان بھائیوں نے اپنے متعلق لفظ عُصْبَة استعمال کیا ہے، یہ لفظ عربی زبان میں پانچ سے لے کر دس تک کی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے، اور اپنے والد کے بارے میں جو یہ کہا کہ اِنَّ آبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ، اس میں لفظ ضَلَال کے لغوی معنی گمراہی کے ہیں، مگر یہاں گمراہی سے مراد دینی گمراہی نہیں، ورنہ ایسا خیال کرنے سے یہ سب کے سب کافر ہو جاتے، کیونکہ یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر اور نبی ہیں، ان کی شان میں ایسا خیال قطعی کفر ہے۔

اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق خود قرآن کریم میں مذکور ہے، کہ بعد میں انھوں نے اپنے جرم کا اعتراف کر کے والد سے دعا، مغفرت کی درخواست کی، جس کو ان کے والد نے قبول کیا، جس سے ظاہر یہ ہوا کہ ان سب کی خطا معاف ہوئی، یہ سب اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ سب مسلمان ہوں، ورنہ کافر کے حق میں دعا، مغفرت جائز نہیں، اسی لئے ان بھائیوں کے انبیاء ہونے میں تو علماء کا اختلاف ہے، مگر مسلمان ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ضَلَال اس جگہ صرف اس معنی میں بولا گیا ہے کہ بھائیوں کے حقوق میں برابری نہیں کرتے۔

تیسری آیت میں یہ بیان ہے کہ ان بھائیوں میں مشورہ ہوا، بعض نے یہ رائے دی کہ یوسف

کو قتل کر ڈالو، بعض نے کہا کہ کسی غیر آباد کنویں کی گہرائی میں ڈال دو، تاکہ یہ کانٹا درمیان سے بھگ جائے اور تمھارے باپ کی پوری توجہ تمھاری ہی طرف ہو جائے، رہا یہ گناہ جو اس کے قتل یا کنویں میں ڈالنے سے ہو گا سو بعد میں توبہ کر کے تم نیک ہو سکتے ہو، آیت کے جملہ وَتَكُونُوا مِنَ الْبَاقِينَ قَوْمًا ضَالِّينَ کے یہ معنی بھی بیان کئے گئے ہیں، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف کے قتل کے بعد تمھارے حالات درست ہو جائیں گے، کیونکہ باپ کی توجہ کا یہ مرکز ختم ہو جائے گا، یا کہ قتل کے بعد باپ سے عذر معذرت کر کے تم پھر دیے ہی ہو جاؤ گے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی انبیاء نہیں تھے، کیونکہ انھوں نے اس واقعہ میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا، ایک بے گناہ کے قتل کا ارادہ، باپ کی نافرمانی اور ایذا رسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی، پھر چھوٹی سازش وغیرہ، انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت بھی جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایسے گناہ سرزد نہیں ہو سکتے۔

چوتھی آیت میں ہے کہ انہی بھائیوں میں سے ایک نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا کہ یوسف کے قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو کنویں کی گہرائی میں ایسی جگہ ڈال دو جہاں یہ زندہ رہے، اور راہِ ردِ مسافر جب اس کنویں پر آئیں تو وہ اس کو اٹھا کر لے جائیں، اس طرح تمھارا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور اس کو لے کر تمہیں خود کسی دور مقام پر جانا بھی نہ پڑے گا، کوئی قافلہ آئے گا وہ خود اس کو اپنے ساتھ کسی دور مقام پر پہنچا دے گا۔

یہ رائے دینے والا ان کا سب سے بڑا بھائی یہودا تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ روہیل سب سے بڑا تھا، اسی نے یہ رائے دی، اور یہ وہ شخص ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے کہ جب مصر میں یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی بنیامین کو روک لیا گیا تو اس نے کہا کہ میں جا کر باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا، اس لئے میں واپس کنعان نہیں جاتا۔

اس آیت میں لفظ غِيَابَةَ الرَّجُلِ، فرمایا ہے، غیابہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپالے اور غائب کر دے، اسی لئے قبر کو بھی غیابہ کہا جاتا ہے، اور رجُل ایسے کنویں کو کہتے ہیں جس کی من بنی ہوئی نہ ہو۔

يَنْقُطُ بِحُضْنِ الشَّيْءِ، لفظ التقاط نقطہ سے بنا ہے، نقطہ اس گری پٹری چیز کو کہتے ہیں جو کسی کو بغیر طلب مل جائے، غیر جان دار چیز ہو تو اس کو نقطہ اور جان دار کو فقہاء کی اصطلاح میں انقطاع کہا جاتا ہے، انسان کو لقیط اسی وقت کہا جائے گا جبکہ وہ بچہ ہو، عاقل بالغ نہ ہو، قرطبی نے اسی لفظ سے استدلال کیا ہے کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تھا اس وقت وہ نابالغ بچہ تھے، نیز یعقوب علیہ السلام کا یہ فرمانا بھی ان کے

بچہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، کہ مجھے خوف ہے کہ اس کو بھیڑ یا کھا جائے، کیونکہ بھیڑیے کا کھا جانا بچوں ہی کے معاملہ میں متصور ہے، ابن جریر ابن المنذر ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر سات سال تھی۔ (منظری)

امام شریعتی نے اس جگہ لفظ اور لفظ کے شرعی احکام کی تفصیل دی ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ اس کے متعلق ایک اصولی بات یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلامی نظام میں عام لوگوں کے جان و مال کی حفاظت راستوں اور سڑکوں کی صفائی وغیرہ کو صرف حکومت کے محکموں کی ذمہ داری نہیں بنایا بلکہ ہر شخص کو اس کا مکلف بنایا ہے، راستوں اور سڑکوں میں کھڑے ہو کر یا اپنا کوئی سامان ڈال کر چلنے والوں کے لئے تنگی پیدا کرنے پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے، فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کے راستہ تنگ کر دے اس کا جہاد مقبول نہیں، اسی طرح اگر راستہ میں کوئی ایسی چیز پڑی ہے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچ جانے کا خطرہ ہے جیسے کانتے یا کاچخ کے ٹکڑے یا پتھر وغیرہ ان کو راستہ سے ہٹانا صرف میونسپل بورڈ کی ذمہ داری نہیں بنایا بلکہ ہر مسلمان کو تربیعی انداز میں اس کا ذمہ دار بنایا ہے، اور ایسا کرنے والوں کے لئے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اسی اصول پر کسی شخص کا گم شدہ مال کسی کو مل جائے تو اس کی شرعی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں کہ اس کو پھیراے نہیں، بلکہ یہ بھی اس کے ذمہ ہے کہ اس کو حفاظت سے اٹھا کر رکھے اور اعلان کر کے مالک کی تلاش کرے وہ مل جائے اور علامات وغیرہ بیان کرنے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ مال اسی کا ہے تو اس کو دیدے، اور اعلان و تلاش کے باوجود مالک کا پتہ نہ چلے اور مال کی حیثیت کے مطابق یہ اندازہ ہو جائے کہ اب مالک اس کو تلاش نہ کرے گا اس وقت اگر خود غیب مفلس ہے تو اپنے صرف میں لے آئے ورنہ مساکین پر صدقہ کر دے، اور بہرہ و صورت یہ مالک کی طرف سے صدقہ قرار دیا جائے گا، اس کا ثواب اس کو ملے گا، گویا آسمانی بیت المال میں اس کے نام پر جمع کر دیا گیا۔

یہ ہیں خدمت عامہ اور امدادِ باہمی کے وہ اصول جن کی ذمہ داری اسلامی معاشرہ کے ہر فرد پر عائد کی گئی ہے، کاشتِ مسلمان اپنے دین کو جیسے اور اس پر عمل کرنے لگیں تو دنیا کی آنکھیں کھل جائیں، کہ حکومت کے بڑے بڑے محکمے کروڑوں روپیہ کے خرچ سے جو کام انجام نہیں دے سکتے، وہ اس آسانی کے ساتھ کس شان سے پورا ہو جاتا ہے۔

پانچویں اور چھٹی آیت میں ہے کہ ان بھائیوں نے والد کے سامنے درخواست ان لفظوں میں پیش کر دی کہ ابا جان، یہ کیا بات ہے کہ آپ کو یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں، حالانکہ ہم

اس کے پورے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں اکل اس کو آپ ہمارے ساتھ (سیر و تفریح کے لئے) بھیج دیجئے کہ وہ بھی آزادی کے ساتھ کھائے پیئے اور کھیلے، اور ہم سب اس کی پوری حفاظت کریں گے۔ بھائیوں کی اس درخواست سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی اس سے پہلے بھی ایسی درخواست کر چکے تھے جس کو والد بزرگوار نے قبول نہ کیا تھا، اس لئے اس مرتبہ ذرا تاکید اور اصرار کے ساتھ والد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے سیر و تفریح اور آزادی سے کھانے پینے کھیلنے کودنے کی اجازت مانگی گئی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو اس کی کوئی ممانعت نہیں فرمائی، صرف یوسف علیہ السلام کو ساتھ بھیجنے میں تردد کا اظہار کیا، جو اگلی آیت میں آئیگا اس سے معلوم ہوا کہ سیر و تفریح کھیل کود جائزہ و د کے اندر جائز و مباح ہیں، احادیث صحیحہ سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، مگر یہ شرط ہے کہ اس کھیل کود میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو اور کسی ناجائز فعل کی اس میں آمیزش نہ ہو (قرطبی وغیرہ)

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب والد سے یہ درخواست کی کہ یوسف کو اکل ہمارے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیجئے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو بھیجنا دو وجہ سے پسند نہیں کرتا، اول تو مجھے اس نور نظر کے بغیر چین نہیں آتا، دوسرے یہ خطرہ ہے کہ جنگل میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کے وقت اس کو بھیڑ یا کھا جائے۔

یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیے کا خطرہ یا تو اس وجہ سے ہوا کہ کنعان میں بھیڑیوں کی کثرت تھی، اور یا اس وجہ سے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے اوپر ہیں، اور یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں، اچانک دنل بھیڑیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان پر حملہ کرنا چاہا، مگر ایک بھیڑیے ہی نے مدافعت کر کے ٹھکڑا دیا، پھر یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے۔

جس کی تعبیر بعد میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ دنل بھیڑیے یہ دنل بھائی تھے اور جس بھیڑیے نے مدافعت کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا وہ بڑے بھائی یہوداد تھے، اور زمین میں چھپ جانا کنوئیں کی گہرائی سے تعبیر تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بناء پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انہی کو بھیڑیا کہا تھا، مگر بمصلحت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی (قرطبی)

بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کی یہ بات سن کر کہا کہ آپ کا یہ خوف و خطر عجیب ہے

ہم دش آدمیوں کی قوی جماعت اس کی حفاظت کے لئے موجود ہے، اگر ہم سب کے ہوتے ہوئے اسکو بھیڑ یا کھا جائے تو ہمارا تو وجود ہی بے کار ہو گیا، اور پھر ہم سے کسی کام کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ شان سے اولاد کے سامنے اس بات کو نہیں کھولا کہ مجھے خطرہ خود تم ہی سے ہے کہ اول تو اس سے سب اولاد کی دل شکن تھی، دوسرے باپ کے ایسا کہنے کے بعد خطرہ یہ تھا کہ بھائیوں کی دشمنی اور بڑھ جائے گی، اور اس وقت چھوڑ بھی دیا تو دوسرے کسی وقت کسی بہانہ سے قتل کر دیں گے، اس لئے اجازت دیدی، مگر بھائیوں سے کھل عہد و پیمان لیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دیں گے، اور بڑے بھائی روئیل یا یہود اکو خدہ وصیت سے پہلے دیکھا کہ تم ان کی بھڑک پیاس اور دوسری ضرورتوں کی پوری طرح خبر گیری کرنا اور جلد واپس لانا، بھائیوں نے والد کے سامنے یوسف علیہ السلام کو اپنے مؤثر حصوں پر اٹھایا، اور باری باری سب اختلافاتے رہے، کچھ دو تک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ان کو نصرت کرنے کے لئے باہر گئے۔

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس وقت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مؤثر حصے پر تھے اس نے ان کو زمین پر پٹک دیا، یوسف علیہ السلام پیراں چلنے لگے، مگر کم عمر تھے، ان کے ساتھ دوڑنے سے عاجز ہوئے تو دوسرے بھائی کی پناہ لی، اس نے بھی کوئی بہرہ رومی نہ کی تو تیسرے چوتھے ہر بھائی سے امداد کو کہا مگر سب نے یہ جواب دیا کہ تو نے جو گیارہ ستائے اور چاند سورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکارا، وہی تیری مدد کریں گے۔

قرطبی نے اسی وجہ سے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہو گیا تھا وہ خواب ہی ان کی شدت غیظ و غضب کا سبب بنا۔ آخر میں یوسف علیہ السلام نے یہود اسے کہا کہ آپ بڑے ہیں آپ میری کمزوری اور غرضی اور اپنے والد ضعیف کے حال پر رحم کریں، اور اس عہد کو یاد کریں جو جو والد سے آپ نے کئے ہیں، آپ نے کتنی جلدی اس عہد و پیمان کو نبھلا دیا، یہ سن کر یہود اگور رحم آیا اور ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ بھائی تجھے کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں گے۔

یہودا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور صبر عمل کی توفیق ڈال دی، تو یہودا نے اپنے دوسرے بھائیوں کو خطاب کیا کہ بے گناہ کا قتل انتہائی جرم عظیم ہے، خدا سے ڈرو، اور اس بچہ کو اس کے والد کے پاس پہنچا دو، البتہ اس سے یہ عہد لے لو کہ باپ سے تمہاری کوئی شکایت نہ ہو۔ بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم جانتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے، تم یہ چاہتے ہو کہ باپ کے دل میں اپنا مرتبہ سب سے زیادہ کر لو، اس لئے جس لوگ اگر تم نے ہمارے ارادہ میں مزا سمیت کی تو ہم تمہیں بھی

قتل کر دیں گے، یہود والے دیکھا کہ نور بھائیوں کے مقابلہ میں تہنا کچھ نہیں کر سکتے، تو کہا کہ اچھا اگر تم یہی ملے کر چکے ہو کہ اس بچہ کو ضائع کرو تو میری بات سنو، یہاں قریب ہی ایک پڑانا کنواں ہے جس میں بہت سے بھارڈ نکل آتے ہیں، سانپ، بچھو اور طرح طرح کے موذی جانور اس میں رہتے ہیں، تم اس کو کنویں میں ڈال دو، اگر اس کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس کر ختم کر دیا تو تمھاری مراد حاصل ہے، اور تم اپنے ہاتھ سے اس کا خون بہانے سے بری رہے، اور اگر یہ زندہ رہا تو کوئی قافلہ شاید یہاں آئے اور پانی کے لئے کنویں میں ڈال ڈالے اور یہ نکل آئے، تو وہ اس کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ملک میں پہنچا دے گا، اس صورت میں بھی تمھارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

اس بات پر سب بھائیوں کا اتفاق ہو گیا، جس کا بیان آیات مذکورہ میں سے تیسری آیت میں اس طرح آیا ہے، فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاجْتَمَعُوا أَنَّىٰ يُجْعَلُ لَهُ فِي غَيْبَتِ النُّجُوبِ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ، ”یعنی جب یہ بھائی یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے، اور اس پر سب متفق ہو گئے کہ اس کو کنویں کی گہرائی میں ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اطلاع دی کہ ایک دن ایسا آئے گا جب تم اپنے بھائیوں کو ان کے اس کر توت پر تنبیہ کر دو گے اور وہ کچھ نہ جانتے ہوں گے۔“

یہاں لفظ وَأَوْحَيْنَا، فَلَمَّا ذَهَبُوا کی جزا اور جواب ہے، حرف وَأَوْ اس جگہ زائد ہو (قرطبی) مطلب یہ ہے کہ بھائیوں نے مل کر کنویں میں ڈالنے کا عزم کر ہی لیا، تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی تسلی کے لئے وحی بھیج دی جس میں کسی آئندہ زمانے میں بھائیوں سے ملاقات کی اور اس کی خوش خبری دی گئی ہے کہ اُس وقت آپ ان بھائیوں سے مستغنی اور بالادست ہوں گے، جس کی وجہ سے ان کے اس ظلم و ستم پر مواخذہ کریں گے، اور وہ اس سارے معاملہ سے بچ رہیں گے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ وحی ان کو کنویں میں ڈالنے کے بعد ان کی تسلی اور یہاں سے نجات کی خوش خبری دینے کے لئے آئی ہو، دوسرے یہ کہ کنویں میں ڈالنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو پیش آنے والے حالات و واقعات سے بذریعہ وحی باخبر کر دیا، جس میں یہ بھی بتلادیا کہ آپ اس ہلاکت سے سلامت رہیں گے، اور ایسے حالات پیش آئیں گے کہ آپ کو ان بھائیوں پر سرزنش کرنے کا موقع ملے گا جب کہ وہ آپ کو پہچانیں گے بھی نہیں، کہ ان کے بھائی یوسف ہیں۔

یہ وحی جو حضرت یوسف علیہ السلام پر زمانہ طفولیت میں نازل ہوئی، تفسیر منظر می میں ہے کہ یہ وحی نبوت نہ تھی کیونکہ وہ چالیس سال کی عمر میں عطا ہوتی ہے، بلکہ یہ وحی ایسی ہی تھی جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بذریعہ وحی مطلع کیا گیا، یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا سلسلہ

مصر پہنچے اور جوان ہونے کے بعد شروع ہوا، جیسا کہ ارشاد ہے وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُسْنًا وَعَلَّمْنَاهُ اُورَاقَ حِسْرِ بْنِ اِلٰی حَتَّمٍ وَغَيْرِهِ لَیْسَ اِسَی کُوْهُسْتَنَانِی طو پر دہی نبوت ہی قرار دیا ہے، جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت عطا کی گئی (منظہری)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مصر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ دسی اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے حال کی خبر اپنے گھر بھائیوں (قمرطی) پہنچے و جب تک کہ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبر خدا نے جیل سے رہائی اور ملک مصر کی حکومت ملنے کے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جس کے ذریعہ والد ضعیف کو اپنی سلامتی کی خبر دے کر مطمئن کر دیتے۔

اللہ جل شانہ کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہو جو اس طرز میں مخفی تھیں، شاید یہ بھی منظور ہو کہ یعقوب علیہ السلام کو غیر اللہ کے ساتھ اتنی محبت کے ناپسند ہونے پر متنبہ کیا جائے، اور یہ کہ بھائیوں کا حاجتمند بن کر یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کر کے ان کے عمل کی کچھ سزا تو ان کو بھی دینا مقصود ہو۔

ام قمرطی وغیرہ محنت پرین نے اس جگہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ جب ان کو ڈالنے گئے تو وہ کنویں کی مٹی سے چمٹ گئے، بھائیوں نے ان کا گرتے نکال کر اس سے ہاتھ باندھے، اُس وقت پھر یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے رحم کی درخواست کی، مگر وہی جواب ملا کہ گیارہ ستارے جو تجھے سجدہ کرتے ہیں ان کو بلا دے، تیری مدد کریں گے، پھر ایک ڈول میں رکھ کر کنویں میں لٹکایا، جب نصف تک پہنچے، تو اس کی رسی کاٹ دی، اللہ تعالیٰ نے اپنے یوسف کی حفاظت فرمائی، پانی میں گرنے کی وجہ سے کوئی چوٹ نہ آئی، اور قریب ہی ایک پتھر کی چٹان نکلی ہوئی نظر آئی، صبح سالم اس پر بیٹھ گئے، بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا، انھوں نے چٹان پر بٹھا دیا۔

یوسف علیہ السلام تین روز اس کنویں میں رہے، ان کا بھائی یہوداد دوسرے بھائیوں سے چھپ کر روزانہ ان کے لئے کھانا پانی لاتا اور ڈول کے ذریعہ ان تک پہنچا دیتا تھا۔

وَجَاءَتْ اَبَا هٰٓؤُلَآءِ عِشَآءٌ یَّبْکُوْنَ، یعنی عشاء کے وقت یہ بھائی روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس پہنچے، حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے رونے کی آواز سن کر باہر آئے پوچھا کیا حادثہ ہے؟ کیا تمہاری بکریوں کے گلہ پر کسی نے حملہ کیا ہے؟ اور یوسف کہاں ہے؟ تو بھائیوں نے کہا:-

یَا بَا نَا اِنَّا ذٰہِبُنَا لَنَسْتَبِیْٓ وَنَرَ کُنَّا یُؤَسِّفُ عَلٰی مَتَاعِنَا ذَا کَلَمَۃٍ الذِّلَّیْتُ وَمَا اَنْتَ بِمُرْشِدٍ لَّنَا وَ لَوْ کُنَّا صٰدِقِیْنَ، یعنی ہم نے آپس میں دوڑ لگائی اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا اس درمیان میں یوسف کو بھیڑیا کھا گیا، اور ہم کہتے ہی پہنچے ہوں آپکو ہمارا یقین تو آئے گا نہیں۔

ابن عربی نے احکامِ احقرآن میں فرمایا کہ ہاتھی مسابقت ردوٹر، شریعت میں مشروع اور ابھی خصلت ہی جو جنگ و جد میں کام آتی ہے، اسی نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بنفس نفیس نو دہائی مسابقت کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے، اور گھوڑوں کی مسابقت کرنا (یعنی گھوڑ دوڑ) بھی ثابت ہے، صحابہ کرام میں سے سلمہ بن اکوع نے ایک شخص کے ساتھ ردوٹر میں مسابقت کی تو سلمہ غالب آگئے۔

آیت مذکورہ اور ان روایات سے اصل گھوڑ دوڑ کا جائز ہونا ثابت ہے اور گھوڑ دوڑ کے علاوہ دوڑ میں تیر اندازی کے نشانے وغیرہ میں بھی یا بھی مقابلہ اور مسابقت جائز ہے، اور اس مسابقت میں غالب آنے والے فریق کو کسی تیسرے کی طرف سے انعام دیدینا بھی جائز ہے، لیکن آپس میں ہار جیت کی کوئی رقم بطور شرط ٹھہرانا جوا اور قمار ہے، جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، آجکل جتنی صورتیں گھوڑ دوڑ کی رائج ہیں وہ کوئی بھی جوائے اور قمار سے خالی نہیں، اس لئے سب حرام و ناجائز ہیں۔

پچھلے آیتوں میں مذکور تھا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپس کی گفت و شنید کے بعد بالآخر ان کو ایک غیر آباد کنویں میں ڈال دیا اور والد کو آکر یہ بتایا کہ ان کو بھیڑیا کھا گیا، مذکورہ آیتوں میں اگلا قصہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَجَاءَتْ عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ، یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسف کے کمرے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیے کے کھانے کا یقین دلائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لئے ان کو اس سے غافل کر دیا، کہ کمرے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے جس سے بھیڑیے کا کھانا ثابت ہوتا، انہوں نے صبحِ صبح کمرے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا، یعقوب علیہ السلام نے کمرے میں صبحِ صبح دیکھ کر فرمایا، میرے بیٹا! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کمرے کہیں سے نہیں پھٹا۔

اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام پر ان کی جعل سازی کا راز فاش ہو گیا، اور فرمایا بَلْ سَوَّيْتُ لَكَ أَنْفُسَكَ أَمْراً فَصْبِرْ بَصِيلاً، وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ، یعنی یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا، بلکہ تمھارے ہی انفس نے ایک بات بنائی ہے، اب میرے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگوں۔

مسئلہ :- یعقوب علیہ السلام نے کمرے میں صبحِ صبح سالم ہونے سے برادرانِ یوسف کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کیسے

حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہئے (قرطبی)

ماردردی نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی بجانب روزگار میں سے ہے، تین عظیم الشان قانع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں۔

پہلا واقعہ بہ خون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے اور کرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔ دوسرا واقعہ زلیخا کا کہیں میں بھی یوسف علیہ السلام کا کرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے۔ تیسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کی بیٹائی واپس آنے کا، اس میں بھی اُن کا کرتہ ہی اعجاز کا منظر ثابت ہوا ہے۔

مسئلہ :- بعض علماء نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے جو بات اپنے صاحبزادوں سے اُس وقت کہی تھی کہ **لَنْ يَسُوْا لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْوَالًا**، یعنی تمہارے نفوس نے ایک بات بتائی ہے، یہی بات اس وقت بھی کہی جبکہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین ایک چوری کے الزام پر پکڑ لئے گئے اور ان کے بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر کی تو فرمایا **يٰۤاَبٰی اِنَّكَ لَكُنتُمْ اَنْفُسُكُمْ**، یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں اپنی رائے سے کہی تھیں ان میں سے پہلی بات صحیح نکلی دوسری صحیح نہیں تھی، کیونکہ اس میں بھائیوں کا قصور نہ تھا اس سے معاذم ہوا کہ رائے کی غلطی پیغمبروں سے بھی ابتداء ہو سکتی ہے، اگرچہ بعد میں ان کو یوحنا الہی غلطی پر قائم رہنے نہیں دیا جاتا۔

نیز قرطبی میں ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے ہو سکتی ہے، اس پر صاحب رائے کو چاہئے کہ اپنی رائے کو متہمم سمجھے اس پر ایسا جمود نہ کرے کہ دوسروں کی بات سننے ماننے کو تیار نہ ہو۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدًا لَهُمْ خَاذِلًا ذَاتَ نُوْجٍ، سیارہ کے معنی قافلہ، وارد سے مراد وہ لوگ ہیں جو قافلہ سے آگے رہتے ہیں، قافلہ کی ضروریات پانی وغیرہ جتیا کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، اِذْ لَاحَظَ كُنُوزَ مِیْنِ الدُّوْلِ ڈالنے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اتفاقاً ایک قافلہ اس سہریل پر آنکلا، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ قافلہ ملک شام سے مخرجار ہا تھا، راستہ بھول کر اس غیر آباد جنگل میں پہنچ گیا، اور پانی لانے والوں کو کنویں پر بھیجا۔

لوگوں کی نظر میں یہ اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ رستہ بھول کر یہاں پہنچا، اور اس غیر آباد کنویں سے سابقہ پڑا، لیکن راز کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی تدریجی کڑیاں ہیں، یوسف کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہی قافلہ رہا۔ راستہ سے ہٹا کر یہاں لاتا ہے، اور اس کے آدمیوں کو اس غیر آباد کنویں پر بھیجتا ہے، یہی حال ہر

ان تمام حالات و واقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں، اور فلسفہ والے ان کو بخت و اتفاق کہا کرتے ہیں، جو درحقیقت نظام کائنات سے نادر واقفیت پر مبنی ہوتا ہے، ورنہ مسلسلہ ممکن میں کوئی بخت و اتفاق نہیں، حق سبحانہ و تعالیٰ جس کی شان **فَعَالٌ لِّمَآ یُرِیدُ** ہے مہفلی حکمتوں کے تحت ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ ظاہری وقائع سے ان کا جو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، تو انسان ان کو اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہر حال ان کا آدمی جس کا نام مالک بن زعیر بتلایا جاتا ہے اس کنویں پر پہنچا، ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے قدرت کی امداد کا مشاہدہ کیا، اس ڈول کی رسی پکڑ لی، پانی کے بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی بستی کا چہرہ سامنے آ گیا جس کی آئندہ ہونے والے عظمت شان سے بھی قطع نظر کی جاتے تو موجود حالات میں بھی اپنے حسن جمال اور خوبی کمالات کے درخشاں نشانات ان کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے، ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے، اس کم سن حسین اور نہ ہمارے بچہ کو دیکھ کر پکار اٹھا، **یَبْنَیٰ هٰذَا غَلَامٌ**، ارے بڑی خوشی کی بات ہے، یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکلی آیا ہے، صبح مسلم میں شب ہجرات کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن جمال میں آدھا ان کو عطا فرمایا ہے، اور باقی آدھا سارے جہان میں تقسیم ہوا ہے۔

وَاسْتَوٰی وَکَانَ بِضَاعَکَ، یعنی چھپا لیا اس کو ایک مال تجارت سمجھ کر، مطلب یہ ہے کہ مشروع میں تو مالک بن زعیر یہ لڑکا دیکھ کر تعجب سے پکارا اٹھا، مگر پھر معاملہ پر غور کر کے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے، اس کو چھپا کر رکھے، تاکہ اس کو فروخت کر کے رقم وصول کرے، اگر پورے قافلہ میں اس کا چرچا ہو گیا تو سارا قافلہ اس میں شریک ہو جاتے گا۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حقیقت واقعہ کو چھپا کر ان کو ایک مال تجارت بنایا، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہ دروازہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں کھانا پہنچانے کے لئے جاتے تھے، تیسرے روز جب ان کو کنویں میں نہ پایا تو واپس آ کر بھائیوں سے واقعہ بیان کیا، یہ سب بھائی جمع ہو کر وہاں پہنچے، تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے پاس یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے، تو ان سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے، بھاگ کر یہاں آ گیا ہے، تم نے بہت برا کیا، کہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھا، مالک بن زعیر اور ان کے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور کچے جائیں گے، اس لئے بھائیوں سے ان کے خریدنے کی بات چیت ہونے لگی۔

نواہت کے معنی یہ ہے کہ برادران یوسف نے خود ہی یوسف کو ایک مال تجارت بنالیا اور فروخت کر دیا، **وَاللّٰہُ عَلَیْہِمْ لَیْسَ یَعْلَمُوْنَ**، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کی سب کارگزاریاں معلوم ہیں

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کو سب معلوم تھا کہ برادرانِ یوسف کیا کریں گے، اور ان سے خریدنے والا قافلہ کیا کرے گا، اور وہ اس پر پوری قدرت رکھتے تھے کہ ان سب کے منصوبوں کو خاک میں ملادیں، لیکن بخوبی حکمتوں کے، تحت اللہ تعالیٰ نے ان منصوبوں کو چلنے دیا۔

ابن کثیر نے فرمایا کہ اس جملہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ آپ کی قوم جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہی ہے یا کرے گی وہ سب ہمارے علم و قدرت سے باہر نہیں، اگر ہم چاہیں تو ایک آن میں سب کو بدل ڈالیں، لیکن تعاضاتِ حکمت یہی ہے کہ ان لوگوں کو اس وقت اپنی قوت آزمائی کرنے دی جائے، اور انجام کار آپ کو ان پر غالب کر کے حق کو غالب کیا جائے گا، جیسا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ آسِفٍ كَذَرَاهِمَ مَعْدُونٍ ۚ لَفْظٌ شَرِيعٌ عَرَبِيٌّ زَبَانٌ مِّنْ خَرِيدٍ ۚ
اور فروخت کرنے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے، ضمیر اگر برادرانِ یوسف کی طرف عائد کی جائے تو فروخت کرنے کے معنی ہوں گے، اور قافلہ والوں کی طرف عائد کی جائے تو خریدنے کے معنی ہوں گے، مطلب یہ ہے کہ بیچ ڈالو برادرانِ یوسف نے یا خرید لیا قافلہ والوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت تھوڑی قیمت یعنی گنتی کے چند دراهم کے معاوضہ میں۔

قرطبی نے فرمایا کہ عرب تجارت کی عادت یہ تھی کہ بڑی رقموں کے معاملات وزن سے کیا کرتے تھے، اور چھوٹی رقمیں جو چنانچس سے زیادہ نہ ہوں ان کے معاملات گنتی سے کیا کرتے تھے، اس لئے دراهم کے ساتھ معدودہ کے لفظ نے یہ تبادلا یا کہ دراهم کی مقدار چنانچس سے کم تھی، ابن کثیر نے بروایت عبداللہ بن مسعود لکھا ہے کہ بنیٰ قریظہ کے بدلہ میں سودا ہوا اور دس بھائیوں نے دو درہم آپس میں تقسیم کر لئے، تعداد درہم میں بائیس اور چالیس درہم کی بھی مختلف روایتیں منقول ہیں۔ (ابن کثیر)

وَكَاثُوفٍ مِّنَ الْمَرْحُومِينَ ۚ زَاهِدِينَ ۚ زَاهِدٌ كِيَانٌ ۚ زَاهِدٌ كِيَانٌ ۚ زَاهِدٌ كِيَانٌ ۚ
زہد کے لفظی معنی بے رغبتی اور بے توجہی کے آتے ہیں، محاورات میں دنیا کی مال و دولت کے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ برادرانِ یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہش مند نہ تھے، ان کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا، اس لئے تھوڑے سے دراهم میں معاملہ کر لیا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لَا مِرَآئِيهِ أَكْرَمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ

اور کہا جس شخص نے خرید کیا اس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو دے رکھ اس کو شاید

أَنْ يَنْقَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَكَ وَلَدًا وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي

ہمارے کام آئے یا ہم کر لیں اس کو بیٹا اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو

الْأَرْضِ مِنْ تَحْتِ الْأَعْدَابِ وَاللَّهُ غَالِبٌ

اس ملک میں، اور اس واسطے کہ اس کو سکھائیں کچھ نمکھانے پر بچانا باتوں کا اور اللہ زور آور رہتا ہے

عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ

اپنے کام میں، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، اور جب پہنچ گیا

أَشُدَّكَ الْأَتِينَ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۲۲﴾

اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیک والوں کو

وَرَأَوْا ذَنَّةَ الْاِثْنِي هُوَ فِي بَيْتِهِمَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَقَتِ الْاَبْوَابُ

اور پھسلایا اس کو اس عورت نے جس کے گھر میں تھا اپنا ہی تھاٹھنے سے اور بند کر دیئے دروازے

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهُ رَبِّيْٓ اَحْسَنُ مَثْوَايَ

اور بولی سنبالی کر، کہا خدا کی پناہ وہ سرزمین ملک جو میرا ابھی طرح رکھا ہے، نہ کہ

اِنَّهُ لَا يَفْلَحُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۳﴾

بیشک بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں۔

خلاصہ تفسیر

د قافلہ والے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے خرید کر مصر لے گئے، وہاں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا، اور جس شخص نے مصر میں ان کو خرید لیا تھا (یعنی عزیز) اس نے ان کو اپنے گھر لاکر اپنی بیوی کے سپرد کیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ میں کو خاطر سے رکھنا کیا خوب ہو کہ (بڑا ہو کر) ہمارے کما آؤ گے، یا ہم اس کو بیٹا بنالیں (مشہور یہ ہے کہ یہ اس لئے کہا کہ ان کے اولاد نہ تھی) اور ہم نے (جس طرح یوسف علیہ السلام کو اپنی خاص عنایت سے اس اندھیرے کنویں سے نجات دی) اسی طرح یوسف کو اس سرزمین (مصر) میں خوب قوت دی (مراد اس سے سلطنت ہے) اور یہ نجات دینا اس غرض سے بھی تھا، تاکہ ہم ان کو خوابوں کی تعبیر دینا بتلا دیں (مطلب یہ تھا کہ نجات دینے کا مقصد

ان کو ظاہری اور باطنی دولت سے مالا مال کرنا تھا اور اللہ تعالیٰ اپنے دریا ہے ہوئے ان کا پر غلبہ (اور قادر) ہے (جو چاہے کرے) لیکن اکثر آدمی جانتے نہیں کہ چونکہ اہل ایمان و یقین کم ہی ہوتے ہیں، یہ مضمون قصہ کے درمیان بطور ہلکا محترمہ کے اس لئے لایا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی موجودہ حالت یعنی غلام بن کر رہنا بظاہر کوئی اچھی حالت نہ تھی، مگر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ حالت چند روزہ بطور ذریعہ کے ہے، اصل مقصد ان کو اونچا مقام عطا فرماتا ہے اور اس کا ذریعہ عزیز مصر کو اور اس کے گھر میں پرورش پانے کو بنایا گیا، کیونکہ امراء کے گھر میں پرورش پانے سے سلیقہ و تجربہ بڑھتا ہے، امور سلطنت کا علم ہوتا ہے، اسی کا اخیہ آگے یہ ہے) اور جب وہ اپنی جوانی (یعنی سن بلوغ یا کمال شباب) کو پہنچے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا (مراد اس سے علوم نبوت کا عطا کرنا ہے، اور کنوئیں میں ڈالنے کے وقت جو ان کی طرف وحی بھیجنا کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ وحی نبوت نہیں تھی، بلکہ ایسی وحی تھی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی بھیجی گئی تھی) اور ہم نیک لوگوں کو اس طرح بدلہ دیا کرتے ہیں (جو قصہ یوسف علیہ السلام پر قہمت لگانے کا آگے بیان ہوگا، اس سے پہلے ان باتوں میں بتلادیا گیا ہے کہ وہ سراسر محنت اور جھوٹ ہوگا، کیونکہ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و حکمت عطا ہو اس سے ایسے کام سادہ ہو ہی نہیں سکتے، آگے اس قہمت کے قصہ کا بیان ہے کہ یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں آرام و راحت کے ساتھ رہنے لگے) اور اسی درمیان میں یہ ابتلا پیش آیا کہ جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ (ان پر مغتول ہو گئی اور) ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی اور ان کے (سارے دروازے بند کر دیئے اور ان سے) کہنے لگی آجائے تم ہی سے کہتی ہوں، یوسف (علیہ السلام) نے کہا کہ اول تو یہ خود بڑا بھاری گناہ ہے، اللہ بچاتے (دوسرے) وہ (یعنی تیرا شوہر) میرا مرنی (اور محسن) ہے کہ مجھے کو کیسی اچھی علاج رکھا (تو کیا میں اس کے ناموس میں خلل انداز ہی کر دوں، ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی) (بلکہ اکثر تو دنیا ہی میں ذلیل اور پریشان ہوتے ہیں ورنہ آخرت میں تو عذاب یقینی ہے)۔

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ابتدائی سرگزشت بیان ہو چکی جو کہ قافلہ والوں نے جب ان کو کنوئیں سے نکال لیا تو برادران یوسف نے ان کو اپنا غلام کر ختم بنا کر تنہا رکھ دیا، اول تو اس لئے کہ ان کو اس بزرگ مہر کی قدر معلوم

نہ تھی، دوسرے اس لئے کہ ان کا اصل مقصد ان سے پیسہ کمانا نہیں بلکہ باپ سے دور کر دینا تھا، اس لئے صرف فروخت کر دینے پر بس نہیں کی، کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں قافلہ والے ان کو یہیں نہ چھوڑ جائیں اور یہ پھر کسی طرح والہ کے پاس پہنچ کر ہماری سازش کا راز فاش کر دے، اس لئے اہم تفسیر مجاہد کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ قافلہ ان کو لے کر مصر کے لئے روانہ ہو جائے اور جب قافلہ روانہ ہوا تو کچھ دوڑ تک قافلہ کے ساتھ چلے، اور ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو اس کو جگہ جانے کی عادت ہے، کھلا نہ چھوڑو، بلکہ باندھ کر رکھو، اس دُرُ شہوار کی قدر و قیمت سے ناواقف قافلہ والے ان کو اسی طرح مصر تک لے گئے (تفسیر ابن کثیر)

آیات مذکورہ میں اس کے بعد کا قصہ اس طرح مذکور ہے، اور قرآنی ایجاز کے ساتھ قصہ کے جتنے اجزاء خود بخود سمجھ میں آسکتے ہیں اُن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مثلاً قافلہ کا مختلف منزلوں سے گذر کر مصر تک پہنچنا، اور وہاں جا کر یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا وغیرہ، سب کو چھوڑ کر یہاں سے بیان ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لَا مِرَآةَ آكُومِي مَثْوًى لِي، یعنی کہا اس شخص نے جس نے

یوسف علیہ السلام کو مصر میں خریدا اپنی بیوی سے کہ یوسف کے ٹھہرانے کا اچھا انتظام کرو۔ مطلب یہ ہے کہ قافلہ والوں نے ان کو مصر لے جا کر فروخت کرنے کا اعلان کیا تو تفسیر طبری میں ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا، یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے وزن کی برابر سونا اور اسی کی برابر مشک اور اس وزن کے ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی یہ دولت اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے لئے مقدر کی تھی اس لئے یہ سب چیزیں قیمت میں ادا کر کے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

جیسا کہ پہلے ارشاد قرآنی سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ رب العزت کی بنائی ہوئی مستحکم تدبیر کے اجزاء ہیں، مصر میں یوسف کی خریداری کے لئے اس ملک کے سب سے بڑے عزت والے شخص کو مفت در فرمایا، ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ شخص جس نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا وہ ملک مصر کا وزیر خزانہ تھا، جس کا نام تظفیر یا اظفیر بتلایا جاتا ہے، اور بادشاہ مصر اس زمانہ میں قوم عمالقہ کا ایک شخص ریان بن انسیر تھا، (جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام لایا اور مسلمان ہو کر یوسف علیہ السلام کی زندگی میں انتقال کر گیا) مظہری، اور عزیز مصر جس نے خریدا تھا اس کی بیوی کا نام ریحیل یا زلیخا بتلایا گیا ہے، عزیز مصر تظفیر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اچھا ٹھکانا ہے، عام غلاموں کی طرح نہ رکھے، ان کی ضروریات کا اچھا انتظام کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دنیا میں تین آدمی بڑے عقلمند اور قیافہ شناس ثابت ہوئے، اول عزیز مصر جس نے ان کے کمالات کو اپنے قیافہ سے معلوم کر کے بیوی کو یہ ہدایت دی، دوسرے شعیب علیہ السلام کی وہ صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے کہا یَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ، ”یعنی آبا جان! ان کو ملازم رکھ لیجئے، اس لئے کہ بہترین ملازم وہ شخص ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی“ تیسرے حضرت صدیق اکبرؓ ہیں جنہوں نے اپنے بعد فاروق اعظمؓ کو خلافت کے لئے منتخب فرمایا (ابن کثیر)

وَكَذَٰلِكَ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ مُوسَىٰ فِي الْآيَاتِ، یعنی اس طرح حکومت دیدی ہم نے یوسف کو زمین کی و اس میں آئندہ آنے والے واقعہ کی بشارت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر عزیز مصر کے گھر میں اس وقت بحیثیت غلام داخل ہوتے ہیں عنقریب یہ ملک مصر کے سب سے بڑے آدمی ہوں گے، اور حکومت کا اقتدار ان کو ملے گا۔

وَلِنُعَلِّمَهُ مِمَّا رَزَقْنَاهُ يُعْلَمُ، یہاں شروع میں حرف وَاو کو اگر غطف کیلئے مانا جائے تو ایک جملہ اس معنی کا اخذ ہوتا ہے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو زمین کی حکومت اس لئے دی کہ وہ دنیا میں عدل و انصاف کے ذریعہ امن و امان قائم کریں، اور باشندگان ملک کی راحت کا انتظام کریں، اور اس لئے کہ ہم ان کو باتوں کا ٹھکانے لگانا سکھادیں، باتوں کا ٹھکانے لگانا ایک ایسا عام مفہوم ہے جس میں وحی الہی کا سمجھنا اور اس کو بروئے کار لانا بھی داخل ہے، اور تمام ضروری علوم کا حاصل ہونا بھی اور خیالوں کی تعبیر صحیح بھی۔

وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ، یعنی اللہ تعالیٰ غالب اور قادر ہے اپنے کام پر جو اس کا ارادہ ہوتا ہے تمام عالم کے اسباب ظاہرہ اس کے مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، جیسا ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو دنیا کے سارے اسباب اس کے لئے تیار کر دیتے ہیں، وَتَكُنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، اور اسباب ظاہرہ ہی کو سب کچھ سمجھ کر انہی کی فکر میں لگے رہتے ہیں، مسبب الاسباب اور قادر مطلق کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ رَزَقْنَاهُ حُسْنًا وَعِلْمًا، یعنی جب پہنچ گئے یوسف علیہ السلام اپنی پوری قوت اور جوانی پر تو دیدی ہم نے ان کو حکمت اور علم،

یہ قوت اور جوانی کس عمر میں حاصل ہوئی، اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؓ، قتادہؓ نے فرمایا کہ ۳۳ سال عمر تھی، ضحاکؓ نے بیس سال اور حسن بصریؓ

نے پچیس سال بتلائی ہو، اس پر سب کا اتفاق ہو کہ حکمت اور علم عطا کرنے سے مراد اس جگہ عطاء نبوت ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو نبوت مقرر ہو پہنچنے کے بھی کافی عرصہ مل چکا ہے، اور کنیز کی گہرائی میں جو وہی ان کو بھیجی گئی وہ وہی نبوت نہ تھی، بلکہ اخوی وہی تھی جو غیر انبیا کو بھی بھیجی جاسکتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم کے باپ میں وارد ہوا ہے۔

وَكُنْ لِلَّهِ تَجَرِبِي الْمَعْسِنِينَ، اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو، مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے نجات دلا کر حکومت و عزت تک پہنچانا یوسف علیہ السلام کی نیک چلنی، خداترسی اور اعمال صالحہ کا نتیجہ تھا، یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں، جو بھی ایسے عمل کرے گا ہمارے انعامات اسی طرح پائے گا۔

وَرَأَوْا دَنَّهُ الَّتِي تَكُونُ فِي بَيْتِنَا عَنْ نَفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ، انہیں جس عورت کے گھر میں یوسف علیہ السلام رہتے تھے وہ ان پر مفتون ہو گئی، اور ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلانے لگی، اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیئے، اور ان سے کہنے لگی کہ جلد آ جاؤ ہمیں سے کہتی ہوں،

پہلی آیت میں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ عورت عزیز مصر کی بیوی تھی، مگر اس جگہ قرآن کریم نے زوجہ عزیز کا مختصر لفظ چھوڑ کر الَّتِي تَكُونُ فِي بَيْتِنَا کے الفاظ ختم کیا، اس میں اشارہ اس کی طرف ہو کہ یوسف علیہ السلام کے گناہ سے بچنے کی شکایات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا کہ وہ اسی عورت کے گھر میں اسی کی پناہ میں رہتے تھے، اس کے کہنے کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔

گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ اور اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے خود اللہ سے پناہ مانگنا ہی آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر بے پہلے خدا کی پناہ مانگی قَالِ مَعَاذَ اللَّهِ، محض اپنے عزم و ارادہ پر بھروسہ نہیں کیا، اور یہ ظاہر ہو کہ جس کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون جیسے ہتھکڑیاں بٹا سکتا ہے، اس کے بعد پیغمبرانہ حکمت و مواعظت کے ساتھ خود زینف کو نصیحت کرنا شروع کیا، کہ وہ بھی خدا سے ڈرے اور اپنے ارادے باز آجائے، فرمایا:

إِنَّ رَبِّيَ أَحْسَنُ مَشْوَايَ، إِنَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ، وہ میرا پالنے والا ہے

اس نے مجھے آرام کی جگہ دی، خوب سمجھ لو کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہوتی، بظاہر مراد یہ ہے کہ تیرے شوہر عزیز مصر نے میری پرورش کی اور مجھے اچھا لکھا نادیا،

میں امن ہو میں اس کے حرم پر دست اندازی کروں۔ بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے اس کے ضمن میں خود زانیہ کو بھی یہ سبق دیا کہ جب میں اس کی چند روزہ پرورش کا امتحان پہنچاتا ہوں تو تجھے مجھ سے زیادہ پہچانتا چاہئے۔

اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو اپنا رب فرمایا، حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ جو ہم شرک اور مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اس لئے شریعت محکمہ میں ایسے الفاظ استعمال کرنا بھی ممنوع کر دیا گیا۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے، مگر یہ جو حیثیت شریعت محکمہ کی ہے جس میں شرک کی نجات کے ساتھ الٰہی پیروں کی بھی حالت کرہی گئی ہے جن میں ذریعہ شرک بننے کا احتمال ہو، انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرک سے توسیعی کے ساتھ روکا گیا ہے، مگر اسباب و ذرائع پر کوئی پابندی نہ تھی، اسی وجہ سے کچھ شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی، مگر شریعت محکمہ میں چونکہ قیامت تک کے لئے آئی ہے، اس کو شرک سے پہلے ہی طرح محفوظ کرنے کے لئے ذرائع شرک، تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو جو ہم شرک ہو سکیں، بہر حال یوسف علیہ السلام کا اثناء ربی فرمانا اپنی جگہ درست تھا۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بڑا کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اسی کو اپنا رب فرمایا اور اچھا لگا کر بھی درحقیقت اسی نے دیا، اس کی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے، اور ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں۔

بعض مفسرین میں اور اسحاق وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ اس خلوت میں زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو مائل کرنے کے لئے ان کے حسن و جمال کی تعریف شروع کی، کہا کہ تمھارے بال کس قدر حسین ہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بال موت کے بعد سب سے پہلے میرے جسم سے علیحدہ ہو جائیں گے، پھر کہا تمھاری آنکھیں کتنی حسین ہیں تو فرمایا موت کے بعد یہ سب پانی ہو کر میرے چہرے پر بہ جائیں گی، پھر کہا تمھارا چہرہ کتنا حسین ہے تو فرمایا کہ یہ سب آبی کی غذا ہے، اللہ تعالیٰ نے فکر آخرت آپ پر اس طرح مسلط کر دی کہ نوجوانی کے عالم میں دنیا کی ساری لذتیں ان کے سامنے گرد ہو گئیں، صحیح ہے کہ فکر آخرت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو ہر جگہ ہر شے سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا اِيَّاهُ

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهَا وَلَا أَنْ تَرَاهَا أَنْ رَيْتَ كَذَلِكَ

اور اس عورت نے فکر کیا اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کو اگر نہ ہوتا کہ دیکھے قدرت پروردگار کی برکات چاہے

لِنَصْرِفَ عَنْهُ الشُّوْءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ﴿۲۴﴾

تاکہ ہٹائیں ہم اس سے بُرائی اور بے حیائی البتہ وہ ہم سے ہمارے برگزیدہ بندوں میں۔

خلاصہ تفسیر

اور اس عورت کے دل میں ان کا خیال (عزم کے درجہ میں) بجم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال (امریطہ ہی کے درجہ میں) ہو چلا تھا (جو کہ خستیاں سے باہر ہے جیسے گرمی کے روزہ میں پانی کی طرف میلان طبعی ہوتا ہے۔ گو روزہ توڑنے کا سو سو سال تک بھی نہیں آتا۔ البتہ اگر اپنے رب کی دلیل کو (یعنی اس فعل کے گناہ ہونے کی دلیل کو جو کہ حکیم شرعی ہے) انہوں نے نہ دیکھا ہوتا (یعنی ان کو شریعت کا علم مع قوت عملیہ کے وصل نہ ہوتا) تو زیادہ خیال ہو جانا عجیب نہ تھا کیونکہ اس کے ذرا سی اور اسباب سب قوی تھے مگر ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں (یعنی ارادہ سے بھی بچالیا اور فعل سے بھی) کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

معارف و مسائل

پہلے آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا عظیم ابتلا، و امتحان مذکور تھا کہ عورت مصر کی عورت نے گھر کے دروازے بند کر کے ان کو گناہ کی طرف بلانے کی کوشش کی، اور اپنی طرف راغب کرنے اور مبتلا کرنے کے سامنے ہی اسباب جمع کر دیئے، مگر رب اعزیز نے اس نوجوان صالح کو ایسے شدید ابتلا میں ثابت قدم رکھا، اس کی مزید تفصیل اس آیت میں ہے کہ زینا تو گناہ کے خیال میں لگی ہوئی تھی، یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی انسانی فطرت کے تقاضے سے کچھ کچھ غیر خستیاں ہی میلان پیدا ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے عین اُس وقت میں اپنی حجت و برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دی، جس کی وجہ سے وہ غیر اختیاری میلان آگے بڑھنے کے بجائے بالکل ختم ہو گیا، اور وہ پیچھا چھڑا کر بھاگے۔

اس آیت میں لفظ ہم بمعنی خیال زینا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهَا وَهَمَّ بِهَا اذہم معلوم ہے کہ زینا کا ہم بمعنی خیال گناہ

کانتھا، اس سے یوسف علیہ السلام کے متعلق بھی ایسے ہی خیال کا وہم ہو سکتا تھا، اور یہ باجماع امت شان نبوت و رسالت کے خلاف ہے، کیونکہ جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہو سکتا ہے نہ ہود خطا کی راہ سے ہو سکتا ہے، البتہ صغیرہ گناہ ہود و خطا کے طور پر سرزد ہو جانے کا امکان ہے مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے (مسلم) اور یہ مسئلہ حضرت قرآن و سنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہو جانے کا امکان و احتمال رہے تو ان کے لئے ہوئی دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا، اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا۔ اس لئے اجمالی طور پر یہ تو متعین ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کے درجہ کا خیال نہ تھا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ ہم دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عدم کر لینا دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہو جانا، پہلی صورت گنہ میں داخل اور قابل مواخذہ ہے، ہاں اگر قصد و ارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو اختیار نہ دھڑکے تو عریض میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نیک اعمال میں ایک نیکی درج فرمادے گا۔ اور دوسری صورت کہ محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے، اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف تھیں میلان غیر اختیاری سب کو ہو جاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا، اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کر دیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے (قرطبی) اور صحیحین میں بروایت ابو ہریرہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے تو صرف ارادہ کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور جب وہ یہ نیکی عمل کرے تو دس نیکیاں لکھ دو، اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر خدا کے خوف سے چھوڑ دے تو گناہ کے بجائے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور اگر وہ گناہ کر ہی گزرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھ دو (ابن کثیر)

تفسیر قرطبی میں لفظ ہم کا ان دونوں معنی کے لئے استعمال عرب کے محاورات اور

اشعار کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت میں لفظ ہم زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کے لئے بولا گیا مگر ان دونوں کے ہم یعنی خیال میں بڑا فرق ہے، پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیار سیاری و سوسہ کی حیثیت رکھتا ہے جو گناہ میں داخل نہیں، قرآن کریم کا اسلوب بیان بھی خود اس پر شاہد ہے کیونکہ دونوں کا ہم و خیال اگر ایک ہی طرح کا ہوتا تو اس جگہ بصیغہ تشبیہ و تلمیح تھا کہہ دیا جاتا، جو مختصر بھی تھا، اس کو چھوڑ کر دونوں کے ہم و خیال کا بیان الگ الگ فرمایا **هَمَّ زَلِيخًا** اور زلیخا کے ہم و خیال کے ساتھ تاکید کے الفاظ **لَعَنَهُ** کا اضافہ کیا، یوسف علیہ السلام کے ہم کے ساتھ لام اور قد کی تاکید نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعبیر خاص کے ذریعے یہی جتانامہ ہے کہ زلیخا کا ہم کسی اور طرح کا تھا اور یوسف علیہ السلام کا دوسری طرح کا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ ابتلا پیش آیا تو فرشتوں نے اللہ جل شانہ سے عرض کی کہ آپ کا یہ خاص بندہ گناہ کے خیال میں ہے، حالانکہ وہ اس کے وبال کو خوب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انتظار کرو، اگر وہ یہ گناہ کر لے تو جیسا کیا ہو وہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو، اور اگر وہ اس کو چھوڑ دے تو گناہ کی بجائے اس کے نامہ اعمال میں نیکی درج کرو، کیونکہ اس نے صرف میرے خوف سے اپنی خواہش کو چھوڑا ہے، جو بہت بڑی نیکی ہے، (قرطبی)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ نفس غیر اختیار سیاری و سوسہ کے درجہ میں تھا، جو گناہ میں داخل نہیں، پھر اس و سوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو گیا۔

اور بعض حضرات مغتہبین نے اس جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر واقع ہوئی ہے **لَوْ لَا أَن تَرَا بُرْهَانَ رَبِّهِ** جو بعد میں مذکور ہو رہا اسل میں مقدم ہے، اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو بھی خیال پیدا ہو جاتا اگر اللہ کی حجت و برہان کو نہ دیکھ لیتے، لیکن برہان رب کو دیکھنے کی وجہ سے وہ اس ہم و خیال سے بھی بچا گئے، مضمون یہ بھی درست ہے مگر بعض حضرات نے اس تقدیم و تاخیر کو قواعد زبان کے خلاف قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے بھی پہلی ہی تفسیر راجح ہے کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی شان تقویٰ و طہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے، کہ طبعی اور بشری تقاضہ کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

اس کے بعد جو یہ ارشاد فرمایا **لَوْ لَا أَن تَرَا بُرْهَانَ رَبِّهِ** اس کی جزا محذوف ہے، اور معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے رب کی برہان اور حجت کو نہ دیکھتے تو اس خیال میں مبتلا رہتے مگر

برہان رب دیکھ لینے کی وجہ سے وہ غیر خستہ کاری خیال اور دوسو سو بھی قلب کے بکھل گیا۔

قرآن کریم نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ وہ برہان ربی جو یوسف علیہ السلام کے سامنے آئی، کیا چیز تھی؟ اس لئے اس میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ مجاہد، سعید بن جبیر، محمد بن سیرین، حسن بصری وغیرہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس خلوت گاہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت اس طرح ان کے سامنے کر دی کہ وہ اپنی اٹھلی دانتوں میں دبا دے ہوئے ان کو متنبہ کر رہے ہیں، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ عزیز مصر کی صورت ان کے سامنے کر دی گئی، بعض نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نظر چھت کی طرف اٹھی تو اس میں یہ آیت قرآن لکھی ہوئی دیکھی، لَا تَنْفَرُوا بِاللَّيْلِ إِنَّا نَكُنَّ قَابِجِينَ ۖ وَسَاءَ مَا يَسْبِيحُونَ، یعنی زنا کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ وہ بڑی بے حیائی (اور فہر خداوندی کا سبب) اور معاشرہ کے لئے بہت برا راستہ ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ زینا کے مکان میں ایک بٹ بٹ تھا، اس نے اس بٹ پر پردہ ڈالا تو یوسف علیہ السلام نے وجہ پوچھی، اس نے کہا کہ یہ میرا معبود ہے، اس کے سامنے گناہ کرنے کی جرأت نہیں، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا معبود اس سے زیادہ حیا کا مستحق ہے، اس کی نظر کو کوئی پردہ نہیں روک سکتا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت اور معرفت الہیہ خود ہی برہان رب تھی۔

اہم تفسیر ابن جریر نے ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ سب اہل تحقیق کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور بے غبار ہے، وہ یہ ہے کہ جتنی بات قرآن کریم نے بتلا دی ہے صرف اسی پر اکتفا کیا جائے، یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام نے کوئی ایسی چیز دیکھی جس سے دوسو سو ان کے دل سے جاتا رہا، اس چیز کی قمیص میں وہ سب احتمال ہو سکتے ہیں جو حضرات مفسرین نے ذکر کئے ہیں، لیکن قطعی طور پر یہ کہ ان میں سے کوئی نہیں کیا جاسکتا، (ابن کثیر)

كَذَلِكَ لِنُضْهِرَكَ مِنَ الشَّوْهِ وَالْفَحْشَاءِ ۖ إِنَّكَ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ
یعنی ہم نے یوسف علیہ السلام کو یہ برہان اس لئے دکھائی کہ ان سے بُرائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں
بُرائی سے اور صغیرہ گناہ اور بے حیائی سے کبیرہ گناہ سے (مظہری)

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ بُرائی اور بے حیائی کو یوسف علیہ السلام سے ہٹا دینے کا ذکر فرمایا ہے، یوسف علیہ السلام کو بُرائی اور بیحیائی سے ہٹانا نہیں فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام تو اپنی شانِ نبوت کی وجہ سے اس گناہ سے خود ہی ہٹے ہوئے تھے، مگر بُرائی اور بے حیائی نے اُن کو گمیر لیا تھا، ہم نے اس کے جال کو توڑ دیا، قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی اس پر شاہد ہیں کہ یوسف علیہ السلام کسی ادنیٰ گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوتے، اور انکے

دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا وہ گناہ میں داخل نہ تھا اور نہ یہاں تعبیر اس طرح ہوتی کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچا دیا نہ یہ کہ گناہ کو ان سے ہٹا دیا۔

کیونکہ یوسف علیہ السلام ہماری برگزیدہ بندوں میں سے ہیں، لفظ مُخْلِصِينَ اس جگہ بفتح لام مخلص کی جمع ہے، جس کے معنی منتخب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے ہیں، جن کو خود حق تعالیٰ نے اپنے کار و رسالت اور اصلاح خلق کے لئے انتخاب فرمایا ہے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت پورہ ہوتا ہے، کہ وہ کسی بُرائی میں مبتلا نہ ہو سکیں، خود شیطان نے بھی اپنے بیان میں اس کا امتیاز کیا کہ اللہ کے منتخب بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا، اس نے کہا فَبَعْضُ رَبِّكَ رَخِيمٌ أَعْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْخَالِصِينَ، یعنی قسم ہوتی ہے عزت و قوت کی کہ میں ان سب انسانوں کو گمراہ کروں گا، لیکن ان بندوں کے جن کو آپ نے منتخب فرمایا ہے۔

اور بعض مترجموں میں یہ لفظ بکسر لام مُخْلِصِينَ بھی آیا ہے، اور مخلص کے معنی یہ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و فرمانبرداری اخلاص کے ساتھ کرے، اس میں کسی دنیاوی اور نفسانی غرض و شہرت و جاہ وغیرہ کا دخل نہ ہو، اس صورت میں مراد اس آیت کی یہ ہوگی کہ جو شخص بھی اپنے عمل اور عبادت میں مخلص ہو اللہ تعالیٰ گناہوں سے بچنے میں اس کی امداد فرماتے ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دو لفظ سور اور فتناء کے استعمال فرمائے ہیں، سور کے لغوی معنی بُرائی کے ہیں، اور مراد اس سے صغیرہ گناہ ہے، اور فتناء کے معنی بے حیائی کے ہیں، اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کبیرہ اور صغیرہ دونوں قسم کے گناہوں سے محفوظ رکھا۔

اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف قرآن میں جس مہتم یعنی خیال کو منسوب کیا ہے وہ محض غیر خستیا رسی و سوسہ کے درجہ کا ہتم تھا جو نہ کبیرہ گناہ میں داخل نہ صغیرہ میں، بلکہ معاف ہے۔

وَأَسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصُهُ مِنْ دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا

اور دونوں دروازے دروازہ کو اور عورت نے چمڑا اس کا کرتہ پیچھے سے اور دونوں مل گئے سوئے کا خانہ

كَرَّا الْبَابَ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ

دردانہ کے پاس، بولی اور کچھ عزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں بُرائی، مگر یہی کہ

يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٍ أَلِيمٌ ۝۲۹ قَالَ هِيَ رَأُودَ تَنِي عَنْ نَفْسِي وَشَرِيكَ

قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک ، یوسف بولا اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تمہاروں اپنی بیوی کو اور

شَهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ

گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے ، اگر ہے اس کا کرتہ پھٹا آگے سے تو عورت سچی ہے اور

هُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝۳۰ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَّابَتْ

وہ ہے جھوٹا ، اور اگر ہے کرتہ اس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے

وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝۳۱ فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ

اور وہ سچا ہے ، پھر جب دیکھا عزیز نے کرتہ اس کا پھٹا پیچھے سے کہا

إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ۝۳۲ يُوَسَّسُ أَخْرَضَ

بیشک یہ ایک فریب برہنہ عورتوں کا ، البتہ تمہارا فریب بڑا ہے ، یوسف جانے لے اس

عَنْ هَذِهِ أَعْتَدَ وَاسْتَغْفِرِي لِإِثْمِكِ إِذْ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ۝۳۳

ذکر کو ، اور عورت تو جھوٹا اپنا گناہ ، بیشک تو ہی گنہگار تھی ۔

خلاصہ تفسیر

(اور جب اس عورت نے پھر وہی اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور وہ ان کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے چلی ، اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف دوڑے اور دوڑنے میں جو ان کو پکڑنا چاہا تو اس عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا لیکن اس نے کرتہ پکڑ کر کھینچنا چاہا اور یوسف علیہ السلام آگے کی طرف دوڑے تو کرتہ پھٹ گیا ، مگر یوسف علیہ السلام دروازے سے باہر نکل گئے ، اور عورت بھی ساتھ تھی تو دونوں نے اتفاقاً اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس رکھڑا پایا ، عورت (خاوند کو دیکھ کر سٹپٹائی اور فوراً بات بنا کر) بولی کہ جو شخص تیری بی بی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جیل خانے بھیجا جائے یا اور کوئی دردناک سزا ہو (جیسے ضرب جسمانی) یوسف علیہ السلام نے کہا کہ یہ جو میری طرف الزام کا اشارہ کرتی ہے بالکل جھوٹی ہے ، بلکہ معاملہ برعکس ہے ، یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجھ کو پھنسلاتی تھی اور (اس موقع پر) اس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے (جو کہ شیرخوار بچہ تھا اور یوسف علیہ السلام کے معجزے

ہے بول پڑا اور آپ کی برادری پر شہادت دی (اس بچہ کا بولنا ہی حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک معجزہ تھا، اس پر دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ اس شیعہ خوار بچہ نے ایک محفل علامت بنا کر عاقلانہ فیصلہ بھی کیا اور کہا کہ ان کا کرتہ (دیکھو کہاں سے پھٹا ہے) اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت تھی اور یہ بھرتے اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچے ہیں، سو جب عزیز نے ان کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا (عورت سے) کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کی چالاکي ہے، بیشک تمہاری چالاکیاں بھی غضب کی ہوتی ہیں (پھر یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا) اے یوسف اس بات کو جانے دو (یعنی اس کا چرچا یا خیال مت کرو) اور (عورت سے کہا کہ ہلے عورت تو (یوسف سے) اپنے تصور کی معافی مانگ بیشک ستر اسے تو ہی تصور دار ہے۔

معارف و مسائل

پچھلی آیات میں یہ بیان آیا ہے کہ جس وقت عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مشغول تھی، اور یوسف علیہ السلام اس سے بچ رہے تھے مگر فطری اور غیر ہستیاری خیال کی کشمکش بھی تھی، تو حق تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی اعانت کیلئے بطور معجزہ کے کوئی ایسی چیز سامنے کر دی جس نے دل سے وہ غیر ہستیاری خیال بھی نکال ڈالا خواہ وہ چیز اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت ہو یا دجی الہی کی کوئی آیت۔

آیت مذکورہ میں یہ بتلایا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس خلوت گاہ میں اس برہانِ باری کا مشاہدہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور باہر نکلنے کے لئے دروازہ کی طرف دوڑا عزیز کی بیوی اُن کو پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑی، اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ کر ان کو باہر جانے سے روکنا چاہا، وہ عزم کے مطابق نہڑ کے تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازہ سے باہر نکل آئے، اور ان کے پیچھے زلیخا بھی، تاریخی روایتوں میں مذکور ہے کہ دروازہ پر قفل لگا دیا تھا، جب یوسف علیہ السلام دوڑ کر دروازہ پر پہنچے تو خود بخود یہ قفل کھل کر گر گیا۔

جب یہ دونوں دروازے سے باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں، انکی بیوی سہم گئی اور بات یوں بنائی کہ الزام اور تہمت یوسف علیہ السلام پر ڈالنے کے لئے کہا کہ جو شخص آپ کی بیوی کے ساتھ بڑے کام کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید میں ڈالا جائے، یا کوئی دوسری جسمانی سخت سزا دی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بنا پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انھوں نے

حقیقت کا اظہار کیا کہ **ہَیْ رَاوَدَ تَغٰی عَنِ نَفْسِیْ** یعنی یہی جگہ اپنا مطالب نکالنے کے لئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

معاذ بڑا نازک اور عزیز مصر کے لئے اس کا فیصلہ سخت دشوار تھا کہ ان میں سے کسے سے بچا سمجھ، شہادت اور ثبوت کا کوئی موقع نہ تھا، مگر اللہ جل شانہ جس طرح اپنے برگزیدہ بندوں کو گناہ سے بچا لیتے ہیں اور ان کو معصوم و محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی ان کو رسوائی سے بچانے کا انتظام مجبوزانہ انداز سے فرمادیتے ہیں، اور عموماً ایسے مواقع پر ایسے چھوٹے بچوں سے کام لیا گیا ہے جو عادتاً بولنے بات کرنے کے قابل نہیں ہوتے، مگر بطور مجبوزانہ ان کو گویائی عطا فرما کر اپنے مقبول بندوں کی برائت کا اظہار فرمادیتے ہیں، جیسے حضرت مریمؑ پر جب لوگ ہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن اور راجہ قول کے مطابق چالیس کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر انہی زبان سے والد کی پاکی ظاہر فرمادی، اور قریب خداوندی کا ایک خاص منظر سامنے کر دیا، بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جسے ریچ پر اسی طرح کی ایک ہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نورانیہ بچہ نے ان کی برائت کے لئے شہادت دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو مشتبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرمادی، اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی، یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا کہ جس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا، اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا، مگر قادر مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے کے لئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے، جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے، اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے، میدانِ حشر میں حساب کتاب کے وقت انسان اپنی دنیا کی قدیم عادت کی بناء پر جب اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کرے گا تو اسی کے ہاتھ پاؤں اور رکھال اور درود دیوار کو اس کے خلاف گواہ بنا کر کھڑا کر دیا جائے گا، وہ اس کی ایک حرکت کو محشر کے عظیم الشان مجمع کے سامنے کھول کر رکھ دے گا، اُس وقت انسان کو پتہ لگے گا کہ ہاتھ پاؤں اور گھر کے درود دیوار اور حفاظتی انتظامات میں سے کوئی بھی میرا نہ تھا، بلکہ یہ سب رب العزت کے خفیہ کارندے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا بچہ جو گہوارہ میں بظاہر اس دنیا کی ہر چیز سے غافل بے خبر پڑا تھا وہ

یوسف علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر عین اس وقت بول اٹھا جب کہ عزیز مصر اس واقعہ سے کشمکش میں مبتلا تھا۔

پھر یہ بچہ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ یوسف علیہ السلام بری پس زلیخا کا قصور ہے تو وہ بھی ایک معجزہ کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں برائت کی بڑی شہادت ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کی زبان پر ایک کیمانہ بات کہلوائی، کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پٹا ہے تب تو زلیخا کا کہنا سچا اور یوسف علیہ السلام جیسے ہو سکتے ہیں، اور اگر وہ پیچھے سے پٹا ہے تو اس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو روکنا چاہتی تھی۔

یہ ایک ایسی بات تھی کہ بچہ کی گویائی کے اعجاز کے علاوہ خود بھی ہر ایک کی سمجھ میں آسکتی تھی، اور سب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق گرتے کا پیچھے سے شق ہونا مشاہدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کی برائت ظاہری علامات سے بھی ظاہر ہو گئی۔

شاہد یوسف کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ گویائی عطا فرمادی، یہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کو امام احمد نے اپنے مسند میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں نقل کر کے حدیث صحیح قرار دیا ہے، اس حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بچوں کو گویا رہ میں گویائی عطا فرمائی ہے، یہ چاروں وہی ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں، (مظہری) اور بعض روایات میں شاہد کی دوسری تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں، مگر ابن جریر ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔

احکام و مسائل | آیات مذکورہ سے چند اہم مسائل اور احکام نکلتے ہیں :-

اول: آیت: **وَاسْتَبَقَا الْبَابَ** سے یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہئے، جیسا یوسف علیہ السلام نے دہانے سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ: یہ کہ احکام الہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد نہ ہو تا نظر نہ آئے، نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازے سب بند ہونے اور تاریکی روایت کے مطابق مفضل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑنے میں اپنی پوری قوت خرچ فرمادی

ایسی صورت میں اللہ جل شانہ کی طرف سے امداد و اعانت کا جس اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی دیا فرمادیتے ہیں، مولانا رومیؒ نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے ۵

گرچہ رخنہ نیست عالم را پریدہ و شیرہ یوسف وارمی باید دید
ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں ۵

گر مرادت را مذاق شکرست و نامرادی نے مراد دلبرست
ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جمعہ کے روز اپنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھو لیتے اور چہرہ جمعہ کے لئے تیار ہو کر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہنچ کر عرض کرتے کہ یا اللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ سے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی کرامت سے جیل کا دروازہ کھل جاتا، اور یہ نماز جمعہ ادا کر لیتے، لیکن اس نے اپنی حکمت سے اس بزرگ کو وہ مقام عالی عطا فرمایا، جس پر ہزاروں کرامتیں قربان ہیں کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جیل کا دروازہ نہ کھلا، مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے کام میں ہمت نہیں ہاری، ہر جمعہ کو مسلسل یہی عمل جاری رکھا، یہی وہ ہستقامت ہے، جس کو اکابر صوفیاء نے کرامت سے بالا تر فرمایا ہے۔

تیسرا مسئلہ :- اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص پر کوئی غلط ہمت باندھو تو اپنی صفائی پیش کرنا سنتِ انبیاء ہے، یہ کوئی توکل یا بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دیدے۔

چوتھا مسئلہ :- اس میں شاہد کتاب ہے، یہ لفظ جب عام فقہی معاملات اور مقدمات میں بولا جاتا ہے، تو اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو زیر نزاع معاملہ کے متعلق اپنا چشم دید کوئی واقعہ بیان کرے، اس آیت میں جسکو شاہد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس نے کوئی واقعہ یا اس کے متعلق اپنا کوئی مشاہدہ بیان نہیں کیا، بلکہ فیصلہ کرنے کی ایک طرف کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کو اصطلاحی طور پر شاہد نہیں کہا جاسکتا۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ اصطلاحات سب بعد کے علماء و فقہاء نے افہام و تفہیم کے لئے اختیار کر لی ہیں، قرآن حکیم کی نہ یہ اصطلاحیں ہیں نہ وہ ان کا پابند ہے، قرآن کریم نے یہاں اس شخص کو شاہد اس معنی کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ جس طرح شاہد کے بیان سے معاملہ کا تصفیہ آسان ہو جاتا ہے، اور کسی ایک فریق کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے اس بچہ کے

بیان سے بھی یہی فائدہ حاصل ہو گیا، کہ اصل تو اس کی معجزانہ گویائی ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی برائے
کے لئے شاہد تھی اور پھر اس نے جو علامات بتلائیں ان کا حاصل بھی انجام کار یوسف علیہ السلام ہی کی
برائے ثابت کا ثبوت ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی
دی، حالانکہ اس نے یوسف علیہ السلام کو سچا نہیں کہا، بلکہ دونوں احتمالوں کا ذکر کر دیا تھا،
اور زلیخا کے سچے ہونے کو ایک ایسی صورت میں بھی فرضی طور پر تسلیم کر لیا تھا، جس میں ان کا
سچا ہونا یقینی نہ تھا، بلکہ دوسرا بھی احتمال موجود تھا، کیونکہ کرتے کا سامنے سے پھٹنا دونوں
صورتوں میں ممکن ہے، اور یوسف علیہ السلام کے سچے ہونے کو صرف ایسی صورت میں
تسلیم کیا تھا، جس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں ہو سکتا، لیکن انجام کار نتیجہ
اس حکمت عملی کا یہی تھا کہ یوسف علیہ السلام کا بری ہونا ثابت ہو۔

پانچواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ مقدمات اور خصوصیات کے فیصلوں میں قرائن
اور علامات سے کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ اس شاہد نے کرتے کے پیچھے سے پھٹنے کو اس کی
علامت قرار دیا کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے، زلیخا پکڑ رہی تھی، اس معاملہ میں
اتنی بات پر تو سب فقہاء کا اتفاق ہے کہ معاملات کی حقیقت پہچاننے میں علامات اور
قرائن سے ضرور کام لیا جائے جیسا کہ یہاں کیا گیا، لیکن متسن علامات و قرائن کو کافی ثبوت
کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، واقعہ یوسف علیہ السلام میں بھی درحقیقت برائے کا ثبوت تو
اس سچے کی معجزانہ انداز سے گویائی ہے، علامات و قرائن جن کا ذکر کیا گیا ہے ان سے اس معاملہ
کی تائید ہو گئی۔

بہر حال یہاں تک یہ ثابت ہوا کہ جب زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر شہمت
والزام لگایا تو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے بچہ کو خلاف عادت گویائی دے کر اس کی زبان سے
یہ کیا نہ فیصلہ صادر فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو، اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہو
تو یہ اس کی صاف علامت ہے کہ وہ بھاگ رہے تھے، اور زلیخا پکڑ رہی تھی، یوسف علیہ السلام
بے قصور ہیں۔

مذکورہ آیات میں سے آخری دو آیتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ عزیز مصر بچے کے اس طرح
بولنے ہی سے یہ سمجھ چکا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی برائے ظاہر کرنے کے لئے یہ مافوق العاد
صورت پیش آئی ہے، پھر اس کے کہنے کے مطابق جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کا
کرتہ بھی پیچھے سے ہی پھٹا ہے تو یقین ہو گیا کہ قصور زلیخا کا ہے، یوسف علیہ السلام بری
ہیں، تو اس نے پہلے تو زلیخا کو خطاب کر کے کہا اِنَّكَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ، یعنی یہ سب تمہارا کفر جلیلہ

کہ اپنی خطا دوسرے کے سر ڈالنا چاہتی ہو، پھر کہا کہ جو قوں کا کمرہ حیلہ بہت بڑا ہے کہ اس کو سمجھنا اور اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ ظاہر ان کا نرم و نازک اور ضعیف ہوتا ہے، دیکھنے والے کو ان کی بات کا یقین جلد آجاتا ہے، مگر عقل و دیانت کی کمی کے سبب بسا اوقات وہ فریب ہوتا ہے۔ (منقول)

تفسیر قرطبی میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو رتوں کا کید اور بکر شیطان کے کید و مکر سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے شیطان کے کید کے متعلق تو یہ فرمایا ہے کہ وہ ضعیف ہوا اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا اور رتوں کے کید کے متعلق یہ فرمایا کہ اِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيْمًا یعنی تمہارا کید بہت بڑا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد سب عورتیں نہیں بلکہ وہ ہی ہے جو اس طرت کے مکر و حیلہ میں مبتلا ہوں، عزیز مصر نے زلیخا کو اس کی خطا بتلانے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا اِنَّكَ لَمَّا كُنْتَ اَعْرَضَ عَنْ هٰذَا یعنی اے یوسف تم اس واقعہ کو نظر انداز کرو، اور کسی سے نہ کہو، تاکہ رسوائی نہ ہو، پھر زلیخا کو خطاب کر کے کہا وَاسْتَغْفِرْ لِيْ اِنَّ نُبَاتٍ اَنْتَ كُنْتَ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ، یعنی خطا سر اسر تمہاری ہے، تم اپنی غلطی کی معافی مانگو، اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے معافی مانگے، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے، کہ خود خطا کی اور تہمت ان کے سر ڈالی۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور جھوٹی فائدہ ثابت ہو جانے پر اس کا شتعل نہ ہونا اور پوسے سکون و اطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابل تعجب ہے، اہم قرطبی نے فرمایا کہ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عزیز مصر کوئی بے غیرت آدمی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچا رسوائی سے بچانے کا فوق العادہ انتظام فرمایا، اسی انتظام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا، ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی ہاتھ پھوڑ بیٹھتا ہے اور زبان سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے، اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو مشتعل ہو جاتا تو ممکن ہو کہ اس کے ہاتھ سے یازان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہو جاتی، یہ قدرت حق کے کرشمہ ہیں کہ اطاعت حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے، فقبار اللہ حسن الخالقین۔

بعد کی آیتوں میں اور واقعہ ذکر کیا گیا ہے جو پچھلے قسط سے ہی وابستہ ہے۔

وہ یہ کہ یہ واقعہ چھپانے کے باوجود درباری لوگوں کی عورتوں میں پھیل گیا، ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو لعن ملانے کرنا شروع کیا، بعض خبیثہ رین نے فرمایا کہ یہ پانچ عورتیں عزیز مصر کے فتنہ پر افسوسوں کی بیویاں تھیں۔ (قرطبی، منظری)

یہ عورتیں آپس میں کہنے لگیں کہ دیکھو کیسی حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ عزیز مصر کی بیوی اتنے بڑے مرتبہ پر ہوتے ہوئے اپنے نوجوان غلام پر فریفتہ ہو کر اس سے اپنی مطلب رازی چاہتی ہے، ہم تو اس کو بڑی گراہی پر سمجھتے ہیں، آیت میں لفظ فَتَاهَا فرمایا ہے، فتا کے معنی نوجوان کے ہیں، عرف میں ملوک غلام جب چھوٹا ہو تو اس کو غلام کہتے ہیں، جوان ہو تو لڑکے کو فتا اور لڑکی کو فتاة کہا جاتا ہے، اس میں یوسف علیہ السلام کو زلیخا کا غلام یا تو اس وجہ سے کہا گیا کہ شوہر کی چیز کو بھی عادت بیوی کی چیز کہا جاتا ہے، اور یا اس لئے کہ زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو اپنے شوہر سے بطور مہر اور تحفہ لے لیا تھا (قرطبی)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں عزیز کی عورت خواہش کرتی ہو اپنے غلام سے اس کے جی

نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرِيهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۱﴾ فَلَمَّا

کو، فریفتہ ہو گیا اس کا دل اسکی محبت میں ہم تو دیکھتے ہیں اس کو صریح خطا پر پھر جب

سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَ

سنا اُس نے ان کا فریب بلوا بھیجا ان کو اور تیار کی ان کے واسطے ایک مجلس اور

أَتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا

ہی ان کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک پتھری اور بولی یوسف محل آ ان کے سامنے، پس جب

رَأَيْنَهُ أَكْبَرْتَهُ وَقَطَعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّذِي ظَهَرَ لَهُنَّ

دیکھا ان کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ اور کہنے لگیں ماشاء اللہ! نہیں یہ شخص

بَشَرًا إِنَّ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿۳۲﴾ قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الْيَزَىٰ

آدمی یہ تو کوئی فرشتہ ہے بزرگ، بول یہ وہی ہے کہ طعن دیا تھا تم نے

لَمُسْتَنَّىٰ فِيهِ وَلَقَدْ رَاودَتْهُ عَنِ نَفْسِهِ فَأَسْتَعْصِمَ وَلَئِنْ لَّمْ

بھوکو اس کے واسطے، اور میں نے لینا چاہا تھا اس سے اس کا جی پھر اس نے تھا رکھا اور بیشک اگر

يَفْعَلْ مَا أَمُرُهُ لَيْسَ جَنًّا وَلَيْكُونَا مِنَ الصَّغِيرِينَ ۝۳۲ قَالَ رَبِّ

نہ کرے گا بڑوں میں اس کو کہتی ہوں تو قید میں پڑ گیا اور ہو گا بے عزت ، یوسف بولا اور

السَّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي

بجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف مجھ کو بلائی ہیں، اور اگر توفیق نہ کرے گا مجھ سے

كَيْدَ هُنَّ أَصْأَبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝۳۳ فَاسْتَجَابَ

ان کا فریب تو مال ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل ، سو مستجاب کر لی

لَهُ رَبُّهُ فَصَرَ فَكَيدَهُ هُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝۳۴

اس کی دعا اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب ، البتہ وہی ہی سننے والا خبر دار ،

ثُمَّ بَدَأَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا آيَاتِ لَيْسَ جَنًّا حَتَّىٰ حِينَ ۝۳۵

پھر یوں سمجھیں آیا لوگوں کی ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھیں اس کو ایک مدت ۔

خلاصہ تفسیر

اور چند عورتوں نے جو کہ شہر میں رہتی تھیں یہ بات کہی کہ عزیز کی بی بی اپنے غلام کو اس سے اپنا (نا جائز) مطلب حاصل کرنے کے لئے پھسلاتی ہے (کیسی کینہ حرکت ہو کہ غلام پر گرتی ہے) اس غلام کا عشق اس کے دل میں جگہ پکڑ گیا ہے۔ ہم تو اس کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں سو جب اس عورت نے ان عورتوں کی بد گوئی (کی خبر) سنی تو کسی کے ہاتھ ان کو بلا بھیجا (کہ تمہاری دعوت ہے) اور ان کے واسطے مسند تکیہ لگایا اور (جب وہ آئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں اجمن چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے) ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چاقو (بھی) دیدیا (جو ظاہر میں تو پھل تراشنے کا بہانہ تھا، اور اصل مقصد وہ تھا جو آگے آتا ہو کہ یہ جو اس باختم ہو کر اپنے ہاتھوں کو زخمی کر لیں گی، اور یہ سب سامان درست کر کے یوسف علیہ السلام کو جو کسی دوسرے مکان میں تھے کہا کہ ذرا ان کے سامنے تو آ جاؤ (یوسف علیہ السلام یہ سمجھ کر کہ کوئی صبح غرض ہوگی باہر آ گئے) سو عورتوں نے جب ان کو دیکھا تو ان کے جمال سے حیران رہ گئیں اور اس حیرت میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے (چاقو سے پھل تراش رہی تھیں) یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ایسی بدحواسی چھائی کہ چاقو ہاتھ پر چل گیا، اور کہنے لگیں حاش بش! یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، وہ عورت بولی تو (دیکھ لو) وہ شخص

یہی ہے جس کے بارے میں تم مجھ کو بُرا بھلا کہتی تھیں (کہ اپنے غلام کو چاہتی ہے) اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا اور پھر یوسف علیہ السلام کے دھمکانے اور مسنانے کو کہا کہ (اگر آئندہ میرا کہنا نہ مانے گا) جیسا کہ اب تک نہیں مانا، تو بیشک جیل خانہ بھیج دیا جاوے گا اور بے عزت بھی ہوگا (وہ عورتیں بھی یوسف علیہ السلام سے کہنے لگیں کہ تم کو اپنی عورت سے ایسی اعتدائی مزاج نہیں جو یہ کہے اس کو ماننا چاہئے، یوسف علیہ السلام نے) یہ باتیں سنی کہ یہ تو سب کی سب اس کی موافقت کرنے لگیں تو حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے میرے رب جس دنیا جائز کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں، اس سے توجیلنا میں جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ ان کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور نادانی کا کام کر بیٹیوں کا، سو ان کی دعا، ان کے رب نے قبول کی اور ان عورتوں کے داؤ پیچ کو ان سے دور رکھا، بیشک وہ (دعاؤں کا) بڑا سننے والا اور ان کے احوال کا خوب جاننے والا ہے (پھر یوسف علیہ السلام کی پاک دامن کی مختلف نشانیوں کی دیکھنے کے بعد) جن سے خود تو اس کا پورا یقین ہو گیا، مگر عوام میں چرچا ہو گیا تھا اس کو قطع کرنے کی غرض سے، ان لوگوں کو (یعنی عزیز اور اس کے متعلقین کو) یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ ان کو ایک وقت تک قید میں رکھیں۔

معارف و مسائل

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ ۖ يُعْنِي جَب زلیخا نے ان عورتوں کے مکہ کا حال سنا تو ان کو ایک کھانے کی دعوت پر بلا بھیجا ۖ یہاں ان عورتوں کے تذکرہ کرنے کو زلیخا نے مکہ کہا ہے، حالانکہ بظاہر انہوں نے کوئی مکہ نہیں کیا تھا، مگر چونکہ خفیہ خفیہ اس کی بدگوئی کرتی تھیں، اس لئے اس کو مکہ سے تعبیر کیا۔

وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكًا ۖ یعنی ان کے لئے مسند بیکیوں سے مجلس آراستہ کی، وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا ۖ یعنی جب یہ عورتیں آگئیں اور ان کے سامنے مختلف قسم کے کھانے اور پھل حاضر کئے جن میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں اس لئے ہر ایک کو ایک ایک تیز چاقو بھی دیدیا، جس کا ظاہری مقصد تو پھل تراشنا تھا، مگر دل میں وہ بات پوشیدہ تھی جو آگے آتی ہے، کہ یہ عورتیں یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر جو اس باختہ ہو جائیں گی اور چاقو سے اپنے ہاتھ زخمی کر لیں گی۔

وَقَالَتْ أَخْرِجْ عَلَيَّ مِصْرًا، یعنی یہ سب سامان درست کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام سے جو کسی دوسرے مکان میں تھے دلچا نے کہا کہ ذرا باہر آ جاؤ، یوسف علیہ السلام کو چونکہ اس کی غرض فاسد معلوم نہ تھی اس لئے باہر اس مجلس میں تشریف لے آئے۔

فَنَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرُ ذُنُوبِهِ وَتَوَلَّى وَفُتِنَ بِهِنَّ مَاهُنَ ابْتِغَاءَ
إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ، یعنی ان عورتوں نے جب یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے جمال سے حیران رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے، یعنی پھل تراشے وقت جب یہ حیرت انگیز واقعہ سامنے آیا تو چاقو ہاتھ پر چل گیا جیسا کہ دوسری طرف خیال بٹ جانے سے اکثر ایسا اتفاق ہو جاتا ہے اور کہنے لگیں کہ خدا کی پناہ یہ شخص آدمی ہرگز نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے، مطلب یہ تھا کہ ایسا ذرا الی تو فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

قَالَتْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ لَكُمْ فِيهِ وَقَدْ دَخَلْتُمُوهُ فَاسْتَعْصَمَ
وَلَقَدْ لَعَنَّكُمْ لِيُذَكِّرَ أَهْلَ مَدْيَنَ وَفِيكُمْ فَاسِقٌ ثَمَرٌ، اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی، مگر یہ پاک صاف رہا، اور آئندہ یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو بیشک جیلخانے بھیجا جائے گا، اور بے عزت بھی ہوگا۔

اس عورت نے جب یہ دیکھا کہ میرا زبان عورتوں پر فاش تو ہوئی چکا ہی، اس لئے ان کے سامنے ہی یوسف علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے لگی، بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس وقت یہ سب عورتیں بھی یوسف علیہ السلام کو کہنے لگیں کہ یہ عورت تمہاری محسن ہے اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔

اور قرآن کریم کے بعض الفاظ جو آگے آتے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے
مَثَلًا لِّمَنْ لَّمْ يَجِدْ سَبِيلًا، جن میں چند عورتوں کا قول بھیجئے جمع ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عورتیں بھی اس کی موافقت اور تائید کر رہی ہیں اور ان کے مکر و کید سے بچنے کی ظاہری کوئی تدبیر نہ رہی تو پھر اللہ جل شانہ کی طرف ہی رجوع فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں عرض کیا رَبِّ السَّجُنِ احْبَبْ إِلَيَّ مِثْلَ مَوْجِبِ
الْبَيْتِ وَارْأَا تَصْرِفَ عَنِّي كَيْتَ مَحْنٍ أَصْنَبَ إِلَيَّ مَحْنٍ وَأَكُنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ، یعنی اے میرے پالنے والے یہ عورتیں مجھے جس کام کی طرف دعوت دیتی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے اور اگر آپ ہی ان کے دائرہ بچاؤ کو مجھ سے دفع نہ کریں تو ممکن ہو کہ میں ان کی طرف نکل ہو جاؤں، اور نادانی کا کام کر بیٹھوں، یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ جیل خانہ مجھے پسند ہے

کوئی قید و بند کی طلب یا خواہش نہیں بلکہ گناہ کے مقابلہ میں اس دنیوی مصیبت کو آسان سمجھنے کا اظہار ہے، اور بعض روایات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام قید میں ڈالے گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ نے قید میں اپنے آپ کو خود ڈالا ہے، کیونکہ آپ نے کہا تھا اَلَيْسَ جَنَّتْ اَحَبُّ اِلَيَّ یعنی اس کی نسبت مجھ کو جیل خانہ زیادہ پسند ہے، اور اگر آپ عافیت مانگتے تو آپ کو مکمل عافیت مل جاتی، اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لئے دعا میں یہ کہنا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ فلاں چھوٹی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دے مناسب نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہر مصیبت اور بلا کے وقت عافیت ہی مانگنی چاہئے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی دعا مانگنے سے ایک شخص کو منع فرمایا کہ صبر تو بلا و مصیبت پر ہوتا ہے تو اللہ سے صبر کی دعا مانگنے کے بجائے عافیت کی دعا مانگو (ترمذی) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ نے عرف کیا کہ مجھے کوئی دعا تلقین فرمادیجئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنے رب سے عافیت کی دعا مانگا کریں، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد پھر میں نے آپؐ سے تلقین دعا کا سوال کیا، تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی عافیت مانگا کریں (مظاہر العارفین) اور یہ فرمانا کہ اگر آپؐ ان کے مکر و کید کو دفع نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ میں انکی طرف مائل ہوں یہ عصمت نبوت کے خلاف نہیں، کیونکہ عصمت کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو گناہ سے بچانے کا اسکو یہی طور پر انتظام فرما کر اس کو گناہ سے بچالیں، اور گو بمقتضا نبوت یہ مقصد پہلے ہی سے حاصل تھا، مگر پھر بھی غایت خوفِ ادب اس کی دعا کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص بغیر خدا تعالیٰ کی امداد و اعانت کے گناہ سے نہیں بچ سکتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کا کام جہالت سے ہوتا ہے، علم کا تقاضا گناہوں سے اجتناب ہے (رقیبی) فَاَسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَّفَ عَنْهُ سُلَيْمَانَ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، یعنی ان کی دعا ان کے رب نے قبول فرمائی، اور ان سورتوں کے مکر و میلہ کہ ان سے دور رکھا، بیشک وہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں کے جال سے بچانے کے لئے یہ سامان فرمادیا کہ عزیز مصر اور اس کے دوستوں کو اگرچہ یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور تقویٰ و طہارت کی کھلی نشانیاں دیکھ کر ان کی پاکی کا یقین ہو چکا تھا، مگر شہر میں اس واقعہ کا چرچا ہونے لگا، اس کو ختم کرنے کے لئے ان کو مصیبت اس میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بند کر دیا جائے، تاکہ اپنے گھر میں ان شبہات کا کوئی موقع بھی باقی نہ رہے، اور لوگوں کی زبانوں سے اس کا یہ چرچا ختم ہو جائے، ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوْا الْآيَاتِ لَيْسَ بِجُنْدٍ اَوْ حَيٍّ، یعنی پھر

عزیز اور اس کے مشیروں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ کچھ غرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو قید میں رکھا جائے، چنانچہ جیل خانہ میں بھیج دیئے گئے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ

اور داخل ہوئے قید خانہ میں اس کے ساتھ دو جوان، کہنے لگا ان میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں پتہ لگاتا ہوں

خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَانِي أُفْرِقُ رَأْسِي بِخَبْزٍ أَتَاكُلُ

شراب اور دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ اٹھارہا ہوں اپنے سر پر روٹی کے بانو، کھاتے

الطَّيْرُ مِنْهُ نَبَأَ بَأْوِيلِهِ إِذَا ذُكِرَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝۳۶ قَالَ

ہیں اس میں سے ابتلا ہم کو اس کی تعبیر ہم دیکھتے ہیں بخیر کو نیکی والا، بولا

لَا يَأْتِيَكُمُ طَعَامٌ تَرْزُقُونَ إِلَّا نَبَأَ ذِكْمَا بَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ

نہ آنے پائے تم کو کھانا ہو روز تم کو بتا دے مگر بتا چکوں کہ تم کو اس کی تعبیر اس کے آنے سے

يَأْتِيَكُمَا ذِكْرًا مِمَّا عَمِلْتُمَا رَبِّيَ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ

ہوئے یہ قوم ہے کہ نبی کو دکھایا میرے رب نے، میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ

لَا يُوَفُّونَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝۳۷ وَاتَّبَعْتُ

ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں، اور پکڑا میں نے

مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَنْ

دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کا، ہمارا کام نہیں کہ شریک

نَشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى

کریں اللہ کا کسی چیز کو یہ فضل ہو اللہ کا ہم پر اور سب لوگوں

النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝۳۸ يٰصَاحِبِ

پر لیکن بہت لوگ احسان نہیں مانتے، اے رفیقو!

السِّجْنِ ۚ أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۳۹

قید خانہ کے، علا کہی مجبور جدا جدا بہتر یا اللہ اکبلا، زبردست،

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمِيُمَةٌ مَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ

کچھ نہیں پوجتے جو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے

مَا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا

نہیں اتاری اللہ نے بھی کوئی سند حکومت نہیں ہو کسی کی سوائے اللہ کے اس نے فرمادیا کہ نہ پوجو

إِلَّا آيَاتِهِ ذَٰلِكَ الَّذِي يَنْفَعُ الْفَقِيرَ وَلَا كُنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

مگر اسی کو یہی ہو رہتا سیدھا، پر بہت لوگ نہیں جانتے۔

لِيَصْرَجِيَ السَّجَنَ أَمَّا أَحَدُ كَمَا فَيَسْقِي رَبِّهِ خَمْرًا وَأَمَّا الْآخَرُ

لے رفیقہ! قید خانہ کے! ایک جو ہم روزوں میں سوچا ہے گاپنے ملک کو شراب اور دوسرا جو ہے سر

فَيَصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَأْسِهِ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ

سولی دیا جاتے گا پھر کھائیں گے جانور اس کے سر میں سے، فیصل ہوا وہ کام جس کی حقیقت

تَسْتَفْتِينَ ﴿۴۱﴾ وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي

تم چاہتے تھے۔ اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں میرا ذکر کرنا

عِنْدَ رَبِّكَ زَاوَا نَسْتَدْرِكُكَ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السَّجَنِ

اپنے ملک کے پاس، سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے ملک سے پھر۔ باقیہ میں

لِضْمِ سِنِينَ ﴿۴۲﴾

کئی برس۔

خلاصہ تفسیر

اور یوسف (علیہ السلام) کے ساتھ (یعنی اسی زمانے میں) اور بھی دو غلام (بادشاہ کے) جیل خانے میں داخل ہوئے جن میں ایک ساتھی تھا، دوسرا دولی پکانے والا بادشہ کی قیاس کا سبب یہ شبہ تھا کہ انہوں نے کھانے میں اور شراب میں زہر ملا کر بادشاہ کو دیا ہے، ان کا مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے قید کر دیئے گئے، انہوں نے جو حضرت یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پائے تو ان میں سے ایک نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ (جیسے) شراب (بنانے کے لئے) انگور کا شیرہ، بچوڑا ہوں (اور بادشاہ کو وہ شراب پلا رہا ہوں) اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ (جیسے) اپنے سر پر دو ٹیاں لٹے جاتا ہوں (اور) اس میں سے پرندے (نوح نوح کر) نکلتے ہیں، تم کو اس خواب کی (جو ہم دونوں نے دیکھا ہے) تعبیر بتلائیے، آپ ہم کو نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں یوسف علیہ السلام، نے (جب

یہ دیکھا کہ یہ لوگ اعتقاد کے ساتھ میری طرف مائل ہوئے ہیں تو چاہا کہ ان کو سب سے پہلے ایمان کی دعوت دی جائے، اس لئے اول اپنا نبی ہونا ایک معجزہ سے ثابت کرنے کے لئے (فرمایا کہ) (دیکھو) جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے میں) ملتا ہے، میں اس کے آنے سے پہلے اس کی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آوے گی اور ایسی ایسی ہوگی اور) یہ بتلا دینا اس علم کی بدولت ہے جو مجھ کو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی مجھ کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے) تو یہ ایک معجزہ ہے جو دلیلِ نبوت ہے اور اس وقت یہ معجزہ خاص طور پر اس لئے مناسب تھا کہ جس واقعہ میں قیدیوں نے تعبیر کے لئے ان کی طرف رجوع کیا، وہ واقعہ بھی کھانے ہی سے متعلق تھا، اثباتِ نبوت کے بعد آگے اثباتِ توحید کا مضمون بیان فرمایا کہ میں نے تو ان لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور وہ لوگ آخرت کے بھی مستکر ہیں اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ دادوں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے (ابراہیمؑ کا اور اسحاقؑ کا اور یعقوبؑ کا) (علیہم السلام) اور اس مذہب کا رکنِ عظیم یہ ہے کہ ہم کو کسی طرح زیبا نہیں ہو کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک (عبادت) قرار دیں یہ (عقیدہ توحید) ہم پر اور (دوسرے) لوگوں پر (بھی) خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے (کہ اس کی بدولت دنیا و آخرت کی فلاح ہے) لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر (ادا) نہیں کرتے (یعنی توحید کو اختیار نہیں کرتے) اے قید خانہ کے رفیقو! (ذرا سوچ کر بتلاؤ کہ عبادت کے واسطے) متفرق مجبور اچھے ہیں یا ایک مجبور برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا، تم لوگ تو خدا کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) مظہر الیا ہے، خدا تعالیٰ نے تو ان (کے مجبور ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھی نہیں (اور) حکم خدا ہی کا ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ بجز اس کے اور کسی کی عبادت مت کرو یہی (توحید اور عبادت صرف حق تعالیٰ کے لئے مخصوص کرنا) سیدھا طریقہ ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، ایمان کی دعوت و تبلیغ کے بعد اب ان کے خواب کی تعبیر بتاتے ہیں کہ) اے قید خانہ کے رفیقو! تم میں ایک تو (جرم سے بری ہو کر) اپنے آقا کو (بدستور) شراب پلایا کرے گا، اور دوسرا (مجرم قرار پا کر) سولی دیا جائے گا اور اس کے سر کو پرندے (نوح نوح کر) کھا دیں گے، اور جس بائے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقدر ہو چکا (چنانچہ مقدمہ کی تنقیح کے بعد اسی طرح ہوا کہ ایک بری ثابت ہوا اور دوسرا مجرم دونوں جیل خانہ سے بلائے گئے، ایک رہائی کیلئے دوسرا سزا کے لئے) اور (جب وہ لوگ جیل خانہ سے جانے لگے تو) جس شخص پر رہائی کا حکم تھا اس سے یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کرنا کہ ایک

شخص بے تصور قید میں ہو، اس نے دعرہ کر لیا، پھر اس کو اپنے آقا سے (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ کرنا شیطان نے بھلا دیا تو (اس وجہ سے) قید خانہ میں اور بھی چند سال ان کا رہنا ہوا:

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا ایک ذیلی واقعہ مذکور ہے، یہ بات آپ بار بار معلوم کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم نہ کوئی تاریخی کتاب ہو، نہ قصہ کہانی کی، اس میں جو تاریخی واقعہ یا قصہ ذکر کیا جاتا ہے اس سے مقصود صرف انسان کو عبرت و موعظت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق اہم ہدایات ہوتی ہیں، پورے قرآن اور بے شمار انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں صرف ایک ہی قصہ یوسف علیہ السلام ایسا ہے جس کو قرآن نے مسلسل بیان کیا ہے، ورنہ ہر مقام کے مناسب تاریخی واقعہ کا کوئی ضروری جزء ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

قصہ یوسف علیہ السلام کو اول سے آخر تک دیکھتے تو اس میں سینکڑوں عبرت و موعظت کے مواقع اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار کے لئے اہم ہدایتیں ہیں، یہ ذیلی قصہ بھی بہت سی ہدایات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی براءت اور پاکی بالکل واضح ہو جانے کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا، جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دغا اور خواہش کی تکمیل تھی، کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عجمت بچانا ایک سخت مشکل معاملہ ہو گیا تھا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں پہنچے تو ساتھ در مجرم قیدی اور بھی داخل ہوئے، ان میں سے ایک بادشاہ کا ساتھی اور دوسرا باورچی تھا، ابن کثیر نے بحوالہ ائمہ تفسیر لکھا ہے کہ یہ دونوں اس الزام میں گرفتار ہوئے تھے کہ انھوں نے بادشاہ کو کھانے وغیرہ میں زہر دینے کی کوشش کی تھی، مقدمہ زیر تحقیق تھا، اس لئے ان دونوں کو جیل میں رکھا گیا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت و شفقت کے سبب سب قیدیوں کی دلداری اور خبر گیری کرتے تھے، جو بیمار ہو گیا اس کی عیادت اور خدمت کرتے، جس کو غم گین پریشان پایا اس کو تسلی دیتے، صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے، خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے، اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے، اُن کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی

آپ کی بزرگی کے مستند ہو گئے، جیل کا افسر بھی متاثر ہوا، اس نے کہا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا، اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

جیل کے افسر نے یا قیدیوں میں سے بعض نے حضرت یوسف علیہ السلام سے **فائدہ عجیبہ** اپنی عنایت و محبت کا اظہار کیا، کہ ہمیں آپ سے بہت محبت ہے، تو یوسف

علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کے لئے مجھ سے محبت نہ کرو، کیونکہ جب کسی نے مجھ سے محبت کی ہے تو مجھ پر آفت آتی ہے، بچپن میں میری بھوپلی کو مجھ سے محبت تھی اس کے نتیجہ میں مجھ پر چوری کا الزام لگا، پھر میرے والد نے مجھ سے محبت کی تو بھائیوں کے ہاتھوں کنوئیں کی قید پھر غلامی اور جلا وطنی میں مبتلا ہوا، عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو اس جیل میں پہنچا (ابن کثیر، منظری)

یہ دو قیدی جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں گئے تھے ایک روز انھوں نے کہا کہ آپ ہمیں نیک صالح بزرگ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے آپ سے ہم اپنی خواب کی تعبیر دریافت کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ یہ خواب انھوں نے حقیقت دیکھے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا، محسن یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کے لئے خواب بنایا تھا۔

بہر حال ان میں سے ایک یعنی شاہی ساتی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر دوٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے، اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، اور در خواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے خوابوں کی تعبیر دریافت کی جاتی ہے، مگر وہ پیغمبرانہ انداز پر اس سوال کے جواب سے پہلے تبلیغ و دعوتِ ایمان کا کام شروع فرماتے ہیں اور اصول دعوت کے ماتحت حکمت و دانمندی سے کام لے کر سب سے پہلے ان لوگوں کے قلوب میں اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لئے اپنے اس معجزے کا ذکر کیا کہ تمھارے لئے جو کھانا تمھارے گھروں سے یا کسی دوسری جگہ سے آتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا، اور وہ ٹھیک اس طرح نکلتا ہے، **ذَٰلِكُمْ مِمَّا عَلَّمَنِی رَبِّیْ**، اور یہ کوئی رمل، جفر کافن یا ہمانت، وغیرہ کا شعبہ نہیں، بلکہ میرا رب بذریعہ وحی مجھے بتلا دیتا ہے، میں اس کی اطلاع دیدیتا ہوں، اور یہ ایک کھلا معجزہ تھا جو دلیل نبوت اور اعتماد کا بہت بڑا سبب ہے، اس کے بعد اول کفر کی بُرائی اور ملتِ کفر سے اپنی بیزاری بیان کی، اور پھر یہ بھی بتلا دیا کہ میں خاندانِ نبوت ہی کا ایک فرد اور انہی کی

ملت حق کا پابند ہوں، میرے آباء واجداد ابراہیم واسحق و یعقوب ہیں، یہ خاندانی شرافت بھی عادتاً انسان کا اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، اس کے بعد بتلایا کہ ہمارے لئے کسی طرح جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی صفات میں شریک سمجھیں، پھر فرمایا کہ یہ دین حق کی توفیق ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے سلامت فہم عطا فرما کر قبول حق ہمارے لئے آسان کر دیا، مگر بہت سے لوگ اس نعمت کی قدر اور شکر نہیں کرتے، پھر انہی قیدیوں سے سوال کیا کہ اچھا تم ہی بتلاؤ کہ انسان بہت سے پروردگاروں کا پرستار ہو یہ بہتر ہو یا یہ کہ صرف ایک اللہ کا بندہ بنے جس کا ہر وقت سب پر غالب ہے، پھر بت پرستی کی بُرائی ایک دوسرے طریقہ سے یہ بتلائی کہ تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے کچھ بتوں کو اپنا پروردگار سمجھا ہوا ہے، یہ تو صرف نام ہی نام کے ہیں جو تم نے گھڑ لئے ہیں، نہ ان میں ذاتی صفات اس قابل ہیں کہ ان کو کسی ادنیٰ قوت و طاقت کا مالک سمجھا جائے، کیونکہ وہ سب جس حرکت میں ہیں، یہ بات تو آنکھوں سے مشاہدہ کی ہے، دوسرا راستہ ان کے معبود حق ہونے کا یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی پرستش کے لئے احکام نازل فرمائے، تو اگرچہ مشاہدہ اور ظاہر عقل ان کی خدائی کو تسلیم نہ کرتے، مگر حکم خداوندی کی وجہ سے ہم اپنے مشاہدہ کو چھوڑ کر اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے، مگر یہاں وہ بھی نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کی عبادت کیلئے کوئی نعمت و دلیل نازل نہیں فرمائی، بلکہ اس نے یہی بتلایا کہ حکم اور حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کا حق نہیں اور حکم یہ دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی وہ دین قیم ہے جو میرے آباء واجداد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا، مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یوسف علیہ السلام اپنی تبلیغ و دعوت کے بعد ان لوگوں کے خوابوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے ایک تو رہا ہو جائے گا، اور پھر اپنی ملازمت پر بھی برقرار رہ کر بادشاہ کو شراب پلائے گا، اور دوسرے پر جرم ثابت ہو کر اس کو سولی دی جائے گی، اور جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

پیغمبرانہ شفقت | ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی عجیب مثال | کی تعبیر متعین تھی، اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا، اور باورچی کو سولی دی جائے گی، مگر پیغمبرانہ شفقت و رافت کی وجہ سے متعین کر کے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کو سولی دی جائے گی، تاکہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بلکہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا، اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔ آخر میں فرمایا کہ میں نے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتادی ہے محض شکل اور تخیل سے نہیں

بلکہ یہ خدائی فیصلہ ہو جو نمل نہیں سکتا، جن حشرات مفسرین نے ان لوگوں کے خوابوں کو غلط اور بنا دئی کہا ہے انہوں نے یہ بھی فرمایا ہو کہ جب یوسف علیہ السلام نے خوابوں کی تعبیر بتلائی تو یہ دونوں بول اٹھے کہ ہم نے تو کوئی خواب دیکھا نہیں محض بات بنائی تھی، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ، چاہے تم نے یہ خواب دیکھا یا نہیں دیکھا اب واقعہ یوں ہی ہو گا، جو بیان کیا گیا ہے، مقصد یہ ہو کہ جھوٹا خواب بنانے کے گناہ کا جو ارتکاب تم نے کیا تھا اب اس کی سزا یہی ہے جو تعبیر خواب میں بیان ہوئی۔

پھر جس شخص کے متعلق یوسف علیہ السلام تعبیر خواب کے ذریعہ یہ سمجھے تھے کہ وہ رہا ہو گا اس سے کہا کہ جب تم آزاد ہو کر جیل سے باہر جاؤ اور شاہی دربار میں رسائی ہو تو اپنے بادشاہ سے میرا بھی ذکر کر دینا کہ وہ بے گناہ قید میں پڑا ہوا ہے، مگر اس شخص کو آزاد ہونے کے بعد یوسف علیہ السلام کی یہ بات یاد نہ رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی آزادی کو اور دیر لگی، اور اس واقعہ کے بعد چند سال مزید قید میں رہے، یہاں قرآن میں لفظ بِضْعَ سِنِينَ آیا ہے، یہ لفظ تین سے لے کر نو تک صادق آتا ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد سات سال مزید قید میں رہنے کا اتفاق ہوا۔

احکام و مسائل آیات مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور فوائد و ہدایات حاصل ہوتے ہیں، ان میں غور کیجئے۔

پہلا مسئلہ۔ یہ ہو کہ یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بد معاشرین کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق، حسن معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہو گئے، جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہو کہ مجرموں، خطاکاروں سے شفقت و ہمدردی کا معاملہ کر کے ان کو اپنے سے مانوس و مربوط کریں کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

دوسرا مسئلہ۔ آیت کے جملے إِنَّا نُرِيكَ مِنَ الْكَافِرِينَ سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہئے جن کے نیک، صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

تیسرا مسئلہ۔ یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاح خلق کی نیت کرنے والوں کا طرز عمل یہ ہونا چاہئے کہ پہلے اپنے حسن اخلاق اور علمی و عملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں، خواہ اس میں اُن کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندان نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا

یہ اظہارِ کمال اگر اصلاحِ خلق کی نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لئے نہ ہو تو یہ وہ تزکیہ نفس نہیں جسکی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، لہذا تَزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ، یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو (تفسیر مظہری)

چوتھا مسئلہ: تبلیغ و ارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کافر صحرانورد کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفہ دعوت و تبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھٹولے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس یہ قیدی تعبیرِ خواب دریافت کرنے کے لئے آئے تو یوسف علیہ السلام نے تعبیرِ خواب کے جواب کے پہلے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ان کو رشد و ہدایت کا تحفہ عطا فرمایا، یہ نہ سمجھے کہ دعوت و تبلیغ کسی جلسہ کسی منبر یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے، شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ: یہ بھی اسی ارشاد و اصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دلنشین ہو سکے، جیسا یوسف علیہ السلام نے ان کو یہ دکھلایا کہ مجھے جو کوئی کمال حاصل ہوا وہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں نے ملتِ کفر کو چھوڑ کر ملتِ اسلام کو اختیار کیا، اور پھر کفر و شرک کی خرابیاں و لنشیں انداز میں بیان فرمائیں۔

چھٹا مسئلہ: یہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے، جیسے تعبیرِ خواب میں ایک شخص کی ہلاکت متعین تھی مگر یوسف علیہ السلام نے اس کو مبہم رکھا، یہ متعین کر کے نہیں کہا کہ تم سو لی چڑھائے جاؤ گے (ابن کثیر، مظہری)

ساتواں مسئلہ: یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لئے اس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا، کہ وہ بے تصور جیل میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کے لئے کسی شخص کو کوشش کا واسطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں۔

آٹھواں مسئلہ: یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لئے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں، کہ کسی انسان کو اپنی صلاحیت کا ذریعہ بنائیں، ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے، شاید اسی لئے یہ قیدی یوسف علیہ السلام کے اس کہنے کو بھول گیا اور انکو مزید کئی سال جیل میں رہنا پڑا، ایک حدیث میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلْنَ سَبْعَ عِجَافٍ

اور کہا بادشاہ نے میں نے خواب میں دیکھا سات بولہ سات گائیں موی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں بلی

وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي

اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، اے دربار والو! تعبیر کہو مجھ سے میرے

رُءْيَايَ إِنَّ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ ﴿۴۲﴾ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ

خواب کی اگر ہو تم خواب کی تعبیر دینے والے، بولے یہ خیالی خواب ہیں،

وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعِلْمَيْنِ ﴿۴۳﴾ وَقَالَ الَّذِي نَحَبَا

اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں، اور بولا وہ جو بچا تھا ان دونوں

مِنْهُمْ إِذَا كَرِهْتَ أُمَمَةً أَنَا أَنْبِئُكَ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿۴۴﴾

میں سے اور یاد آگیا اس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو،

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلْنَ

جا کر کہائے یوسف اے سچے! حکم دے ہم کو اس خواب میں سات گائیں موی ان کو کھاتیں

سَبْعَ عِجَافٍ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَّعَلِّي

سات بلی اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی، تاکہ

أَرْجِعَ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۴۵﴾ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ

بیجاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو، کہا تم کھیتی کر دو گے سات

سِنِينَ دَابَّاءَ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذُرْوَةٌ فِي سُنْبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا

برس ہم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا

مِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿۴۶﴾ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعُ شِدَادٍ يَأْكُلْنَ

جو تم کھاؤ، پھر آئیں گے اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو

مَا قَدَّمْتُمْ لَهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَحْصُونَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَأْتِي

رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بچ کے واسطے، پھر آئے گا اس کے

مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصَرُونَ ﴿۴۸﴾

پچھے ایک برس اس میں میں سے گھاؤگوں پر اور اس میں رس پھوڑیں گے۔

وَقَالَ السِّلْكُ اتَّوْنِي يَدًا فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس، پھر جب پہنچا اس کے پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا

رَبِّكَ فَسَأَلَ مَا بِالْأُنثَىٰ الَّتِي قَطَعْتَ آيِدِي عَنْهَا إِنَّا

اپنے خاوند کے پاس اور پوچھا اس سے کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنھوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنی، میرا

رَبِّي بِكَذِّبَتْ هُنَّ عَلَيَّ ۖ

رب تو ان کا فریب سب جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور بادشاہ مصر نے بھی ایک خواب دیکھا اور ارکانِ دولت کو جمع کر کے ان سے کہا کہ

میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں فرہ ہیں جن کو سات لاغر گائیں کھا گئیں، اور

سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور ہیں جو کہ خشک ہیں (اور خشک بالوں نے اسی

طرح ان سات سبز پر لپٹ کر ان کو خشک کر دیا) اے دربار والو اگر تم (خواب کی) تعبیر دیکھتے

ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں مجھ کو جواب دو وہ لوگ کہنے لگے کہ (اول تو یہ کوئی خواب

ہی نہیں جس سے آپ فکر میں پڑیں) یونہی پریشان خیالات ہیں اور (دوسرے) ہم لوگ رکھو

سلطنت میں ماہر ہیں، خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے (دو جواب اس لئے دیئے کہ اول جواب

سے بادشاہ کے قلب پریشانی اور دوسوا اس دور کرنا ہے، اور دوسرے جواب سے اپنا عذر

ظاہر کرنا ہے، خلاصہ یہ کہ اول تو ایسی خواب قابلِ تعبیر نہیں دوسرے ہم اس فن سے واقف

نہیں) اور ان (مذکورہ) رد قیدیوں میں سے جو رہا ہو گیا تھا (وہ مجلس میں حاضر تھا) اس نے کہا

اور مدت کے بعد اس کو (یوسفؑ کی وصیت کا) خیال آیا میں اس کی تعبیر کی خبر لائے دیتا ہوں،

آپ لوگ مجھ کو ذرا جانے کی اجازت دیجئے (چنانچہ دربار سے اجازت ہوئی اور وہ قید خانہ

میں یوسفؑ کے پاس پہنچا اور جا کر کہا) اے یوسفؑ اے صدق مجسم آپ ہم لوگوں کو اس (خواب)

کا جواب (یعنی تعبیر) دیجئے کہ سات گائیں موتی ہیں ان کو سات ڈبلی گائیں کھا گئیں اور سات

بالیں ہری ہیں اور اس کے علاوہ (سات) خشک بھی ہیں (کہ ان خشک کے لپٹنے سے وہ ہری

بھی خشک ہو گئیں آپ تعبیر بتلائیے تاکہ میں (جنھوں نے مجھ کو بھیجا ہے) ان لوگوں کے پاس

لوٹ کر جاؤں (اور بیان کروں) تاکہ اس کی تعبیر اور اس سے آپ کا حال) ان کو بھی معلوم ہو جائے

(تعبیر کے موافق عمل درآمد کریں اور آپ کی خلاصی کی کوئی صورت نکلے) آپ نے فرمایا کہ (ان سات

فرہ گایوں اور سات سبز بالوں سے مراد پیداوار اور بارش کے سال ہیں پس (تم سات سال متواتر خوب غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں ہی میں رہنے دینا تاکہ گھن نہ لگ جاوے) ہاں مگر تھوڑا سا جو بٹھارے کھانے میں آوے وہ بالوں میں سے نکالا ہی جاوے گا پھر اس (سات برس) کے بعد سات برس ایسے سخت (در قحط کے) آویں گے جو کہ اس (تمام تر) ذخیرہ کو کھا جاویں گے جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کر کے رکھا ہوگا، ہاں مگر تھوڑا سا جو بیج کے واسطے (رکھ چھوڑو گے) وہ البتہ بیج جاوے گا، اور ان خشک بالوں اور ڈبلی گایوں سے اشارہ ان سات سال کی طرف ہے، پھر اس (سات برس) کے بعد ایک برس ایسا آوے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی اور اس میں رواجہ اس کے کہ انگو ر کثرت سے پھیلیں گے، شیرہ بھی پھوڑیں گے اور شرابیں پییں گے غرض وہ شخص تعبیر لیکر دربار میں پہنچا، اور (جا کر بیان کیا) بادشاہ نے (جو سنا تو آپ کے علم و فضل کا محقق ہوا اور) حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ (چنانچہ یہاں سے قاصد چلا) پھر جب ان کے پاس قاصد پہنچا اور پیغام دیا تو آپ نے فرمایا کہ (جب تک میرا اس تہمت سے بری ہونا اور بے قصور ہونا ثابت نہ ہو جائے گا میں نہ آؤں گا) تو اپنی سرکار کے پاس لوٹ جا پھر اس سے دریافت کر کہ (کچھ تم کو خبر ہے) ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے (مطلب یہ تھا کہ ان کو بلا کر اس واقعہ کی جس میں مجھ کو قید کی گئی تفتیش و تحقیق کی جاوے، اور عورتوں کے حال سے مراد ان کا واقف یا ناواقف ہونا ہے حال یوسف سے اور ان عورتوں کی تخصیص شاید اس لئے کی ہو کہ ان کے سامنے زلیخانے اقرار کیا تھا، وَ لَقَدْ زَاوَدْتُهُمْ نَفْسُهُمْ فَاِشْتَقَقْتُمْ) میرا یہ ان عورتوں کے فرقہ کے فریب کو خوب جانتا ہے (یعنی اللہ کو تو معلوم ہی ہے کہ زلیخانہ کا بھٹ پر تہمت لگانا گنہگار تھا، مگر عند الناس بھی اس کی نتیجہ ہو جانا مناسب ہے، چنانچہ بادشاہ نے ان عورتوں کو حاضر کیا) :

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں یہ بیان ہے کہ پھر حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی رہائی کے لئے پردہ غیب سے ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ بادشاہ مصر نے ایک خواب دیکھا جس سے پریشان ہوا، اپنی مملکت کے تعبیر دینے والے اہل علم اور کاہنوں کو جمع کر کے تعبیر خواب دریافت کی، وہ خواب کسی کی سمجھ میں نہ آیا سب نے یہ جواب دیدیا کہ اَضْغَاثٌ اَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَاوِيلِ اَلْاَحْلَامِ بِعِلْمِنَا، اضغاث، ضغث کی جمع ہے، جو ایسی گٹھڑی کو کہا جاتا ہے جس میں مختلف قسم کے خس و خاشاک گھاس پھوس جمع ہوں، معنی یہ تھے کہ یہ خواب کچھ مبالغہ پر

جس میں خیالات وغیرہ شامل ہیں، اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے، کوئی صحیح خواب ہوتا تو تعبیر بیان کر دیتے۔

اس واقعہ کو دیکھ کر مدت مدید کے بعد اس رہا شدہ قیدی کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی اور اس نے آگے بڑھ کر کہا کہ میں آپ کو اس خواب کی تعبیر بتلا سکوں گا، اس وقت اس نے یوسف علیہ السلام کے کمالات اور تعبیر خواب میں مہارت اور پھر مظلوم ہو کر قید میں گرفتار ہونے کا ذکر کر کے یہ چاہا کہ مجھے جیل خانہ میں ان سے ملنے کی اجازت دی جائے، بادشاہ نے اس کا انتظام کیا وہ یوسف علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا، قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو صرف ایک لفظ **فَاذْكُرُونِي** فرما کر بیان کیا ہے، جس کے معنی ہیں مجھے بھیج دو، یوسف علیہ السلام کا تذکرہ پھر سرکاری منظوری اور پھر جیل خانہ تک پہنچنا یہ واقعات خود ضمنی طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں، اس لئے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ بیان شروع کیا:

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ، یعنی اس شخص نے جیل خانہ پہنچ کر حضرت یوسف علیہ السلام سے واقعہ کا اظہار اس طرح شروع کیا کہ پہلے یوسف علیہ السلام کے صدیق یعنی قول و فعل میں سچا ہونے کا اقرار کیا، پھر درخواست کی کہ مجھے ایک خواب کی تعبیر بتلائیے، خواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ دیکھا ہے کہ سات بیل فرہ تندرست ہیں جن کو دوسرے سات بیل کھا رہے ہیں اور یہ کھانے والے بیل لاغر و کمزور ہیں، نیز یہ دیکھا کہ سات خوشے گندم کے سر سبز مرے بھرے ہیں اور سات خشک ہیں۔

اس شخص نے خواب بیان کرنے کے بعد کہا، **لَعَلِّي آسَجِّعُ إِلَى النَّاسِ كَقَدَرِهِمْ يَحْكُمُونَ**، یعنی آپ تعبیر بتلا دیں گے تو ممکن ہو کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کو تعبیر بتلاؤں اور ممکن ہے کہ وہ اس طرح آپ کے فضل و کمال سے واقف ہو جائیں۔

تفسیر منہری میں ہے کہ واقعات کی جو صورتیں عالم مثال میں ہوتی ہیں وہی انسان کو خواب میں نظر آتی ہیں، اس علم میں ان صورتوں کے خاص معنی ہوتے ہیں، فرق تعبیر خواب کا سارا مدار اس کے جاننے پر ہے کہ فلاں صورت مثالی سے اس علم میں کیا مراد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ فن مکمل عطا فرمایا تھا، آپ نے خواب سن کر سمجھ لیا کہ سات بیل فرہ اور سات خوشے ہرے بھرے سے مراد سات سال ہیں، جن میں پیداوار حسب دستور خوب ہوگی، کیونکہ بیل کو زمین کے ہموار کرنے اور غلہ اگھانے میں خاص دخل ہے، اسی طرح سات بیل لاغر و کمزور اور سات خشک خوشوں سے مراد یہ ہے کہ پہلے سات سال کے بعد سات سال سخت قحط کے آئیں گے، اور کمزور سات بیلوں کے فرہ بیلوں کے کھا لینے سے یہ مراد ہے کہ پہلے

سات سال میں جو ذخیرہ غلہ وغیرہ کا جمع ہو گا وہ سب ان قحط کے سالوں میں خرچ ہو جائے گا ہر بیج کے لئے کچھ غلہ بچے گا۔

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ سات سال ابھی پیداوار کے ہونگے پھر سات سال قحط کے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا، اس کا علم یوسف علیہ السلام کو یا تو اس سے ہوا کہ جب قحط کے سال مکمل سات ہی ہیں تو عادتہ اللہ کے مطابق آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا، اور حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کر دیا، تاکہ تعبیر خواب سے بھی کچھ زیادہ خبر ان کو پہنچے، جس سے یوسف علیہ السلام کا فضل و کمال ظاہر ہو کر ان کی رہائی کا سبب بنے، اور اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر خواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک حکیمانہ اور ہمدانہ مشورہ بھی دیا، وہ یہ کہ پہلے سات سال میں جو زیادہ پیداوار ہو اس کو گندم کے خوشوں ہی میں محفوظ رکھنا، تاکہ گندم کو پڑانا ہونے کے بعد کیرا نہ لگ جائے، یہ تقریب کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشہ کے اندر رہتا ہے غلہ کو کیرا نہیں لگتا۔

ثُمَّ يَأْتِي سَبْعٌ مِّنْ أَشْيَافٍ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ، یعنی پہلے سات سال کے بعد پھر سات سال سخت خشک سالی اور قحط کے آئیں گے، جو پچھلے جمع کئے ہوئے ذخیرہ کو کھا جائیں گے خواب میں چونکہ یہ دیکھا تھا کہ ضعیف کمزور بیلوں نے فریبہ اور قوی بیلوں کو کھا لیا، اس لئے تعبیر خواب میں اس کے مناسب یہی فرمایا کہ قحط کے سال پچھلے سالوں کے جمع کردہ ذخیرہ کو کھا جائیں گے، اگرچہ سال تو کوئی کھانے والی چیز نہیں، مراد یہی ہے کہ انسان اور جانور قحط کے سالوں میں پچھلے ذخیرہ کو کھا لیں گے۔

قصہ کے سیاق سے ظاہر ہے کہ یہ شخص تعبیر خواب یوسف علیہ السلام سے معلوم کر کے لڑتا اور بادشاہ کو خبر دی وہ اس سے مطمئن اور حضرت یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کا محقق ہو گیا، مگر قرآن کریم نے ان سب چیزوں کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ یہ خود بخود مفہوم ہو سکتی ہیں، اس کے بعد کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا:

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي رَأَيْتُ سَبْعَ بَنِي إِسْرَءِيلَ سَاجِدِينَ، یعنی بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ سے نکالا جائے، اور دربار میں لایا جائے، چنانچہ بادشاہ کا کوئی قاصد بادشاہ کا یہ پیغام لے کر جیل خانہ پہنچا۔

موقع بظاہر اس کا تھا کہ یوسف علیہ السلام جیل خانہ کی طویل مدت سے عاجز آرہے تھے

اور خلاصی چاہتے تھے، جب بادشاہ کا پیغام بلانے کے لئے پہنچا تو فوراً تیار ہو کر ساتھ چل دیئے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو جو مقام بلند عطا فرماتے ہیں اس کو دوسرے لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے، اس قاصد کو جواب یہ دیا:

قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسَأَلَهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي قُطِّعْنَ عَنِّي إِنْ رَجِئْتُ بَنَاتِي هُنَّ عَلَيَّ ۖ يَعْنِي يُوسُفُ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَعْمَ قَالَ قَدْ جَاءَكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ ۚ بَلَّغْ رَأْيَكَ إِلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنَّكَ إِذَا عَمَدْتَ إِلَيْهِ تَهْتَكُ ۖ إِنَّكَ خَفِيفُ الْوِزْرِ ۚ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسَأَلَهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي قُطِّعْنَ عَنِّي إِنْ رَجِئْتُ بَنَاتِي هُنَّ عَلَيَّ ۖ يَعْنِي يُوسُفُ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَعْمَ قَالَ قَدْ جَاءَكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ ۚ بَلَّغْ رَأْيَكَ إِلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنَّكَ إِذَا عَمَدْتَ إِلَيْهِ تَهْتَكُ ۖ إِنَّكَ خَفِيفُ الْوِزْرِ ۚ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَسَأَلَهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي قُطِّعْنَ عَنِّي إِنْ رَجِئْتُ بَنَاتِي هُنَّ عَلَيَّ ۖ يَعْنِي يُوسُفُ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَعْمَ قَالَ قَدْ جَاءَكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ ۚ بَلَّغْ رَأْيَكَ إِلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنَّكَ إِذَا عَمَدْتَ إِلَيْهِ تَهْتَكُ ۖ إِنَّكَ خَفِيفُ الْوِزْرِ ۚ

اور ایک بات یہ بھی ہو کہ اصل مقصود اپنی برادرت کا ثبوت تھا، وہ ان عورتوں سے بھی ہو سکتا تھا، اور اس میں عورتوں کی بھی کوئی زیادہ رسوائی نہ تھی، اگر وہ سچی بات کا اقرار بھی کر لیتیں تو صرف مشورہ ہی کی مجرم ٹھہرتیں، بخلاف عزیز کی بیوی کے کہ اس کو تحقیقات کا ہدف بنایا جانا، تو اس کی رسوائی زیادہ تھی، اور اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ، یعنی میرا پروردگار تو ان کے جھوٹ اور مکر و فریب کو جانتا ہی ہو میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ بھی حقیقت واقف ہو جائیں، جس میں ایک لطیف انداز سے اپنی برادرت کا اظہار بھی ہے۔

اس موقع پر مسیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کے لئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔

اور امام طبرسی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسفؑ کا صبر و تحمل اور مکارمِ حسنہ قابلِ تعجب ہیں، جب اُن سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی گئی اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکالو پھر تعبیر بتلاؤں گا، پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو فوراً جیل کے دروازے کی طرف چل دیتا (قرطبی) اس حدیث میں یہ بات قابلِ غور ہو کہ منشاء حدیث کا یوسف علیہ السلام کے صبر و تحمل اور مکارمِ اخلاق کی تعریف و مدح کرنا ہے، مگر اس کے بالمقابل جس صورت حال کو

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا کہ میں ہوتا تو دیر نہ کرتا، اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کے اس طرز عمل کو افضل فرما رہے ہیں اور اپنی شان میں فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو اس افضل پر عمل نہ کر پاتا، بلکہ اس کے مقابلہ میں مفضول کو اختیار کر لیتا، جو بظاہر افضل الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان نہیں، تو اس کے جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں، مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

اس کے علاوہ جیسا تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریق کار میں ان کے صبر و تحمل اور مکارم اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہو، اور وہ اپنی حسیہ قابل تعریف ہے، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیم امت اور خیر خواہی عوام کے لئے وہی مناسب اور افضل ہو، کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، ایسے موقع پر شرطیں لگانا یادیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا، احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جاتے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے، یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسول خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہو سکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا، لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں، رحمتہ للعالمین کے مزاج و مذاق میں عامۃ خلایق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔ واللہ اعلم۔

قَالَ مَا خَطْبُكَ إِذْ رَأَوْنِي بِنُفْسٍ كَافَّةٍ قُلْتُ هِيَ نَفْسِي وَانْتَصَفْتُ مِنْهَا نَفْسِي قُلْتُ هِيَ نَفْسِي وَانْتَصَفْتُ مِنْهَا نَفْسِي قُلْتُ هِيَ نَفْسِي وَانْتَصَفْتُ مِنْهَا نَفْسِي

کہا بادشاہ نے عورت کو کیا حقیقت ہو تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو اس کے نفس کی حفاظت، بولیں

لِيَدَّعِيَنَّ عَلَيَّ مِنْ مِّمِّي قَالَتْ أَمْرٌ أَتَى الْأَعْرِيزَ النَّفْسِ

جیسا اللہ ہم کو معلوم نہیں اس پر کچھ برائی، بولی عورت عزیز کی اب کھل گئی تھی

حَصَّتْ مِنَ الْحَقِّ أَنْ رَأَوْنَاهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ

بات، میں نے پھسلایا تھا اس کو اس کے جی سے اور وہ

الصِّدِّيقِينَ ۝ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ

سچا ہے، یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کر لے کہ میں نے اس کی چوری نہیں کی

اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝

چھکرا دے کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغا بازوں کا۔

خلاصہ تفسیر

کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف (علیہ السلام) سے اپنے مطلب کی خواہش کی یعنی ایک نے خواہش کی اور بقیہ نے اس کی مدد کی، کہ اعانتِ فعل بھی مثل فعل کے ہی، اس وقت تم کو کیا تحقیق ہوا، شاید بادشاہ نے اس طور پر اس لئے پوچھا ہو کہ مجرم کُن لے کہ بادشاہ کو اتنی بات معلوم ہے کہ کسی عورت نے اُن سے اپنا مطلب پورا کرنے کی بات کی تھی، شاید اس کا نام بھی معلوم ہو، اس حالت میں انکار نہ چل سکے گا، پس اس طرح شاید خود اقرار کر لے، عورتوں نے جواب دیا کہ حاشِ اللہ ہم کو ان میں ذرا بھی تو بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوتی ردہ بالکل پاک صاف ہیں، شاید عورتوں نے زلیخا کا وہ اقرار اس لئے ظاہر نہ کیا ہو کہ مقصود یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کا ثبوت تھا اور وہ حاصل ہو گیا، یا زلیخا کے رد برد ہونے سے حیا مانع ہوئی کہ اس کا نام لیں، عزیز کی بی بی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ اب تو حق بات (سب سے) ظاہر ہو ہی گئی (اب اخفاء بریکار ہرچ پہی ہے) میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی (نہ کہ انہوں نے جیسا میں نے الزام لگا دیا تھا، ماجرا من المیز) اور بیشک وہی سچے ہیں (اور غالباً ایسے امر کا اقرار کر لینا مجبوری کی حالت میں زلیخا کو پیش آیا، غرض تمام صورت مقدمہ اور انظہارات اور یوسف علیہ السلام کی برارت کا ثبوت ان کے پاس کہلا کر بھیجا اس وقت) یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تھا تاکہ عزیز کو (زائد) یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو میں دست اندازی نہیں کی اور یہ (بھی معلوم ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا (چنانچہ زلیخا نے عزیز کی حرمت میں خیانت کی تھی کہ دوسرے پر نگاہ کی، خدا نے اس کی قلعی کھول دی، پس میری غرض یہ تھی) :

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب شاہی قاصد رہائی کا پیغام دے کر بلانے کے لئے آیا اور انہوں نے قاصد کو یہ جواب دیا کہ پہلے ان عورتوں سے میرے معاملہ کی تحقیق کر لو جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، اس میں بہت سی حکمتیں مضمر تھیں، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جیسے دین کامل عطا فرماتے ہیں ایسے ہی عقل کامل اور معاملات و حالات کی پوری بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں، یوسف علیہ السلام نے شاہی پیغام سے یہ اندازہ کر لیا کہ اب جیل سے رہائی کے بعد بادشاہ مصر مجھے کوئی

اعزاز دیں گے، اس وقت دشمنوں کی تقاضا یہ تھا کہ جس عیب کی تہمت ان پر لگائی گئی تھی اور جس کی وجہ سے جیل میں ڈالا گیا تھا اس کی حقیقت بادشاہ اور سب لوگوں پر پوری طرح واضح ہو جائے۔ ان کی برائت میں کسی کو شبہ نہ رہے، ورنہ اس کا انجام یہ ہو گا کہ شاہی اعزاز سے لوگوں کی زبانیں تو بند ہو جائیں گی، مگر ان کے دلوں میں یہ خیالات کھٹکتے رہیں گے کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اپنے آقا کی چوڑی پر دست درازی کی تھی، اور ایسے حالات کا پیدا ہو جانا بھی شاہی درباروں میں کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت بادشاہ بھی لوگوں کے ایسے خیالات سے متاثر ہو جائے، اس لئے رہائی سے پہلے اس معاملہ کی صفائی اور تحقیق کو ضروری سمجھا، اور مذکورہ صدر روایتوں میں سے دوسری آیت میں خود یوسف علیہ السلام نے اپنے اس عمل اور رہائی میں تاخیر کرنے کی دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔

اول یہ کہ ذَلِكْ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخْلُفْ بِالْغَيْبِ، یعنی یہ تاخیر میں نے اس لئے کی کہ عزیز مصر کو یقین ہو جائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے جس میں کوئی خیانت نہیں کی۔ عزیز مصر کی یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوتی کہ یہ بہت بُری صورت ہو گی کہ عزیز مصر کے دل میں میری طرف سے شبہات رہیں، اور پھر شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں، تو ان کو میرا اعزاز بھی سخت ناگوار ہو گا، اور اس پر سکوت ان کے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہو گا وہ چونکہ ایک زمانہ تک آقا کی حیثیت میں رہ چکا تھا، اس لئے یوسف علیہ السلام کی شرافت نفس نے اس کی اذیت کو گوارا نہ کیا، اور یہ بھی ظاہر تھا کہ جب عزیز مصر کو برائت کا یقین ہو جائے تو دوسرے لوگوں کی زبانیں خود بند ہو جائیں گی۔

دوسری حکمت یہ ارشاد فرمائی کہ اِنَّ اِلٰهَ لَا يَهْدِي الْغٰثِرَيْنِ، یعنی یہ تحقیقات اس لئے کرائی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تحقیقات کے ذریعہ خیانت کرنے والوں کی خیانت ظاہر ہو کر سب لوگ متنبہ ہو جائیں کہ خیانت کرنے والوں کا انجام آخر کار رسوائی ہوتا ہے، تاکہ آئندہ سب لوگ ایسے کاموں سے بچنے کا اہتمام کریں، دوسرے یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اسی اشتباہ کی حالت میں یوسف علیہ السلام کو شاہی اعزاز مل جاتا تو دیکھنے والوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایسی خیانت کرنے والوں کو بڑے بڑے رتبے مل سکتے ہیں اس سے ان کے اعتقاد میں فرق آتا، اور خیانت کی بُرائی دلوں سے نکل جاتی، بہر حال مذکورہ بالا حکمتوں کے پیش نظر یوسف علیہ السلام رہائی کا پیغام پا ہی فوراً نکل جانا پسند نہیں کیا، بلکہ شاہی انداز تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

مذکور الصدر پہلی آیت میں اس تحقیقات کا خلاصہ مذکور ہے، قَالَ مَا خَطْبُكُمْ إِذْ رَأَوُكُمْ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ، یعنی بادشاہ نے اُن عورتوں کو جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے حاضر کر کے سوال کیا، کہ کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسفؑ سے اپنے مطلب کی خواہش کی؟ بادشاہ کے اس سوال سے معلوم ہوا کہ اس کو اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ قصور یوسف علیہ السلام کا نہیں ان عورتوں ہی کا ہے، اسی لئے یہ کہا تم نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی، اس کے بعد عورتوں کا جواب یہ مذکور ہے:-

وَلَمَّا حَاشَ يَدَهُ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ ۖ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ لَنُصْطَفِيَ الْفَحْشَ أَنْفَارًا وَذَكَرْتُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ۖ، یعنی سب عورتوں نے کہا کہ حاش! ہمیں ان میں ذرا بھی کوئی بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی، عزیز کی بیوی کہنے لگی کہ اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی، میں نے ان سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی، اور بیشک وہی سچے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیقات میں عزیز مصر کی بیوی کا نام نہ لیا تھا مگر اللہ جل شانہ جب کسی کو عزت عطا فرماتے ہیں تو خود بخود لوگوں کی زبانیں ان کے صدق و صفاتی کے لئے کھل جاتی ہیں، اس موقع پر عزیز کی بیوی نے ہمت کر کے اظہار حق کا اعلان خود کر دیا، یہاں تک جو حالات و واقعات یوسف علیہ السلام کے آپ نے سنے ہیں، ان میں بہت سے فوائد اور مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ مسائل پہلے بیان ہو چکے ہیں، مذکور الصدر آیات سے متعلق مزید مسائل اور ہدایات یہ ہیں:-

نَوَافِلُ مَسْئَلَةٍ:- یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقصد پورا کرنے کے لئے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنونِ حسن کرنا پسند نہیں فرماتے، یہی وجہ ہوتی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اس کو تو بھلا دیا گیا، اور پھر پردہ غیب کے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی کے ممنون بھی نہ ہوں، اور پوری عزت و شان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہو جائے۔

اس کا یہ سامان کیا کہ بادشاہ مصر کو ایک پریشان کن خواب دکھلایا، جس کی تعبیر سے اس کے درباری اہل علم و فن عاجز ہوئے، اس طرح ضرورت مند ہو کر یوسف علیہ السلام کی طرف رجوع کرنا پڑا (ابن کثیر)

دسواں مسئلہ : اس میں حنلاق حسنہ کی تعلیم ہو کہ وہا ہونے والے قیدی نے یوسف علیہ السلام کا اتنا کام نہ کیا کہ بادشاہ سے ذکر گردیتا اور ان کو مزید سات سال قید کی مصیبت میں گزارنے پڑے، اب سات سال کے بعد جب وہ اپنا مطلب تعبیر خواب کالے کر حاضر ہوا تو عام انسانی عادت کا تقاضا تھا کہ اس کو ملامت کرتے اس پر خفا ہوتے کہ تجھ سے اتنا کام نہ ہو سکا مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ اخلاق کا اظہار فرمایا، کہ اس کو ملامت تو کیا اس قصہ کا ذکر تک بھی نہیں کیا (ابن کثیر و قرطبی)

گیارہواں مسئلہ : اس میں یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء اہل امت کا یہ فریضہ ہو کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے، اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنا چاہیے کہ وہ پریشان نہ ہوں جیسے یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر صرف تعبیر خواب بتا دیئے کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ چسکیا نہ اور نیز خوابانہ مشورہ بھی دیا، کہ پیداوار کے تمام گہیوں کو غور سے اندر رہتے دیں، اور بقدر ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں، تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جا۔

بارہواں مسئلہ : یہ ہو کہ عالم مقتدار کو اس کی بھی فکر رہنی چاہئے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو، اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہئے، کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب ہو بہر حال ان کی دعوت و ارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے، لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا، (قرطبی)، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمہمت کے مواقع سے بھی بچو، یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تمہمت لگانے کا موقع ہاتھ آئے، یہ حکم تو ہم مسلمانوں کے لئے ہے، خواص اور علماء کو اس میں وہ ہر جہت سیاط لازم ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام محبوب اور گناہوں سے معصوم ہیں، آپ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا ایک مرتبہ ازواج مطہرات میں سے ایک بی بی آپ کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گذر رہی تھیں کوئی صحابی سامنے آگئے، تو آپ نے ڈر ہی سے بتلا دیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں۔ یہ اس لئے کیا کہ ہمیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا مشبہ نہ ہو جائے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دور ہو جائیں۔

تیسراں مسئلہ : اس میں یہ ہو کہ جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ ہوں اور اس حیثیت سے وہ واجب الاحترام ہو، اگر ناگزیر حالات میں اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی بھی پڑے

تو اس میں بھی معتدور و مجرحتوق و احترام کی رعایت کرنا شرافت کا مظہر تھی ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے اپنی برائت کے لئے معاملہ کی تحقیقات کے واسطے عزیز یا اس کی بیوی کا نام لینے کے بجائے ان عورتوں کا ذکر کیا جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، (قرطبی) کیونکہ مقتدر اس سے بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ چودہ ہواں مسئلہ: مکارم اخلاق کی تعلیم ہے، کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سات سال یا بارہ سال جیل خانہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، وہ اپنی کئی وقت اُن سے کوئی انتقام لینا تو کیا اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ ان کو کوئی ادنیٰ تکلیف ان سے پہنچے، جیسے آیت لِيُعْطَمَ آتِي تَمَّ آخِثُهُ بِالْغَيْبِ میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

وَمَا أَبرِيْ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَا مَآسِرَةَ بِالسُّوْرِ اِلَّا

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو، بیشک جی تو مسکلاتا ہی ہے۔ برائی

مَا سَرَّحِمَ رَبِّيْ اِنْ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۳ وَقَالَ الْمَلِكُ اَتُونِيْ

جو رحم کر دیا میرے رب نے بیشک میرا رب بخشنے والا ہے مہربان اور کہا بادشاہ نے اے آؤ اس کو میرے

بِہِ اسْتَخْلَصْهُ لِنَفْسِيْ ۝۵۴ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا

پاس میں خاص کر رکھوں اس کو اپنے کالمیں پھر جب بات چیت کی اس سے کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے پاس

مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝۵۵ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰۤی خَزَاۤئِنِ الْاَرْضِ ۝۵۶ اِلٰی

جگہ پائی معتبر ہو کر، یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان

حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝۵۷ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ اٰتِيْتَبَوْا

ہوں خوب جاننے والا، اذریوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا

مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۝۵۸ نَصِيْبٌ بِرَحْمَتِنَا مِنْ نَّشَآءٍ وَّلَا نُنْصِيْعُ

اس میں جہاں چاہتا، پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں، اور ضائع نہیں کرتے ہم

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۹ وَلَا جُرْ اٰلَا خِرَةٌ خَيْرٌ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بدلہ بھلائی والوں کا، اور ثواب آخرت کا بہتر ہی ان کو جو ایمان لائے

وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۶۰

اور رہے پرہیزگاری میں۔

خلاصہ تفسیر

اور میں اپنے نفس کو (بھی بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو ہر ایک کا بری ہی بات بتلاتا ہے بجز اس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے (اور اس برائی کا مادہ نہ رکھے جیسا انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں) مصلحتاً جن میں یوسف علیہ السلام کا نفس بھی داخل ہے، خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ میری تربیت و محبت میرے نفس کا ذاتی کمال نہیں، بلکہ رحمت و عنایتِ الہیہ کا اثر ہے، اس لئے میرا نفس برائی کا حکم نہیں کرتا، ورنہ جیسے اوروں کے نفوس ہیں ویسا ہی میرا ہوتا، بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے، لیکن اوپر جو نفس کی دو قسمیں معلوم ہوئیں آثارہ اور مصلحتاً، سو آثارہ اگر توبہ کر لے تو اس کی مغفرت فرمائی جاتی ہے، اور درجہ توبہ میں وہ توبہ کہلاتا ہے، اور جو مصلحتاً ہے کمال اس کا لازم ذات نہیں، بلکہ عنایت و رحمت کا اثر ہے، پس آثارہ کے توبہ ہونے پر صفتِ غفور کا ظہور ہوتا ہے اور مصلحتاً میں صفتِ رحیم کا۔

یہ تمام تر مضمون ہوا یوسفؑ کی تقریر کا باقی یہ امر کہ یہ صورت اثبات نراہت کی بعد ربانی کے بھی تو ممکن تھی پھر ربانی پر اس کو مفت رحم کیوں رکھا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہو کہ جتنا یقین اس ترتیب میں ہو سکتا ہے اس کے خلاف میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ دلائل کی دلائل تو مشترک ہی، لیکن اس صورت مجوزہ میں یہ امر زائد ہے کہ بادشاہ اور عزیز سمجھ سکتے ہیں کہ جب بد دن تبر یہ کے یہ رہا ہونا نہیں چاہتے، حالانکہ ایسی حالت میں ربانی قیدی کی انتہائی تمنا ہوتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی نراہت و ہمارت کا کامل یقین ہو اس لئے اس کے ثابت ہو جانے کا پورا اطمینان ہو، اور ظاہر ہے کہ ایسا کامل یقین بری ہی ہو سکتا ہے نہ کہ ملوث کو یہ ساری باتیں بادشاہ نے سنیں، اور (یہ سن کر اس) بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا اور عزیز سے ان کو لیلوں گا کہ اس کے ماتحت نہ رہیں گے چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لائے، پس جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں (اور باتوں سے زیادہ فضل و کمال آپ کا ظاہر ہوا) تو بادشاہ نے (ان سے) کہا کہ تم ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور محترم ہو (اب اس کے اس خواب کی تعبیر کا ذکر آیا اور بادشاہ نے کہا کہ اتنے بڑے قسط کا اہتمام بڑا بھاری کام ہے، یہ انتظام کس کے سپرد کیا جائے) یوسفؑ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ ملکی خزانوں پر مجھ کو مامور کر دو، میں ران کی حفاظت (بھی) رکھوں گا اور درآمد و خرچ کے انتظام اور اس کے حساب کتاب کے طریقہ سے بھی (خواب واقف ہوں) چنانچہ جج اس کے

کہ ان کو کوئی خاص منصب دیتا مثل اپنے پورے اختیارات ہر قسم کے دیدیے، گویا حقیقت میں بادشاہ یہی ہو گئے، گو برائے نام وہ بادشاہ رہا، اور یہ عزیز کے عہدہ سے مشہور ہو گئے، چنانچہ ارشاد ہے) اور ہم نے ایسے (عجیب) طور پر یوسف (علیہ السلام) کو ملک (مصر) میں باختیار بنا دیا کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں ہمیں (جیسا کہ بادشاہوں کو آزادی ہوتی ہے، یعنی یا تو وہ وقت تھا کہ کنوئیں میں مجوس تھے، پھر عزیز کی ماتحتی میں مقید رہی، اور یا آج یہ خود مختاری اور آزادی عنایت ہوئی، بات یہ ہے کہ) ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کر دیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر صالح نہیں کرتے (یعنی دنیا میں بھی نیکی کا اجر ملتا ہے، کہ حیات طیبہ عطا فرماتے ہیں، خواہ مال دینا کر جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے لئے تھا، اور خواہ بغیر مال داری کے قناعت و رضا عطا کر کے جس سے عیش لذت میسر ہوتا ہے یہ تو آج دنیا میں ہوا) اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہوا ایمان اور تقویٰ والوں کے لئے ۵

معارف و مسائل

اپنی پاکبازی بیان کرنا درست | اس سے پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول مذکور تھا کہ جو الزام مجھ پر عائد کیا تھا اس کی صفائی اور معاملہ کی مکمل تحقیق سے پہلے میں قید سے رہائی کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ عزیز اور بادشاہ مصر کو پورا یعتین ہو جائے کہ میں نے کوئی خیانت نہیں کی تھی، بلکہ الزام سراسر جھوٹا تھا، اس میں چونکہ اپنی برأت اور پاکبازی کا ذکر ایک ناگزیر ضرورت سے ہو رہا تھا جو بظاہر اپنے نفس کے تزکیہ اور پاکی کا اظہار ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند نہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے اَلَّذِينَ يَبْذُلُونَ أَنْفُسَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَرْجُوا ثَوَابًا كَثِيرًا ۖ يَتَذَكَّرُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَنَّانُ ۚ يَتَذَكَّرُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَنَّانُ ۚ یعنی کیا اپنے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے کہ وہ جس کو چاہیں پاک قرار دیں ۵۔ اور سورۃ یحکم میں بھی اسی مضمون کی ایک آیت ہے: فَلَا تَكْفُرْ بِاللَّهِ الْمَنَّانِ ۚ الَّذِي أَنفَقَ مِنْ نَفْسِهِ فَتَبَسُّوا لَهُ ۖ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کے مدعی نہ بنو، اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کون واقعی پرہیزگار و متقی ہے ۵

اس لئے آیت مذکورہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی برأت کے اظہار کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا کہ میرا یہ کہنا کچھ اپنے تقویٰ اور پاکبازی کا جھٹلانا نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کا نفس جس کا خمیر چار عنصر آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے بنا ہے وہ تو اپنی فطرت سے ہر شخص کو بُرے ہی کاموں کی طرف مائل کرتا رہتا ہے، مجسز اس کے جس پر میرا رب اپنی رحمت فرما کر اس کے نفس کو بُرے تقاضوں سے پاک

کر دے جیسے انبیاء علیہم السلام کے نفوس ہوتے ہیں اور ایسے ہی نفوس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کا لقب دیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ ایسے ابتلاءِ عظیم کے وقت میرا گناہ سے بچ جانا یہ کوئی میرا ذاتی کمال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت اور دستگیری کا نتیجہ تھا، اگر وہ میرے نفس سے رذیل خواہشات کو نہ نکال دیتے تو میں بھی ایسا ہی ہو جاتا جیسے عام انسان ہوتے ہیں کہ خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کہ ایک قسم کا خیال تو بہر حال ان کے دل میں بھی پیدا ہو ہی گیا تھا، گو وہ غیر خستہ کاری و سوسے کی حد تک تھا، مگر شانِ نبوت کے سامنے وہ بھی ایک لغزش اور بُرائی ہی تھی، اس لئے اس کا اظہار فرمایا کہ میں اپنے نفس کو بھی بالکل ہی بری اور پاک نہیں سمجھتا۔

نفسِ انسانی کی تین حالتیں | اس آیت میں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ اس میں ہر نفسِ انسانی کو آمارۃٌ بالسوء یعنی بُرے کاموں کا حکم کرنے والا فرمایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز و اکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلاء اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا نہ کھاؤ، کھیت نہ کھائے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس سے زیادہ بُرا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا، آپؐ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے (قرطبی) اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں بُرے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل و خوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔

بہر حال آیت مذکورہ اور ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی بُری ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے، لیکن سورۃ قیامہ میں اسی نفسِ انسانی کو لَوَامہ کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے لَا أُقْسِمُ بِتَوْبَتِ الْقِيَمَةِ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ الْوَّامَةِ، اور سورۃ النجم میں اسی نفسِ انسانی کو نفسِ مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے، يَا بَتُّكَ النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ اُرْجِي اِلٰی رَبِّكَ، اس طرح نفسِ انسانی کو ایک جگہ آمارۃٌ بالسوء کہا گیا، دوسری جگہ لَوَامہ، تیسری جگہ مطمئنہ۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر نفسِ انسانی اپنی ذات میں تو آمارۃٌ بالسوء یعنی بُرے کاموں کا

تقاضا کرنے والا ہے، لیکن جب انسان خدا و آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لڑا اٹھ بن جاتا ہے، یعنی بُرے کاموں پر ملاکت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنے والا جیسے عام صلحاء اُمت کے نفوس ہیں اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت میں پہنچا دے کہ بُرے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے، تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے، صلحاء اُمت کو یہ حال مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے، اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطا و خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے، اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں

إِنِّي لَخَفِيفٌ خِشْيُومٌ ۖ آخِرَ آيَاتٍ فِي فِرَاقِ رَبِّكَ ۚ مَغْفِرَتُكَ لِي ۚ وَاللَّهِ أَعْلَمُ ۚ

کرنے والا ہے، لفظ خفیر میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس امارۃ یا سویر جب اپنی خطا پر نادم ہو کر توبہ کرے، اور نفس لڑا اٹھ بن جائے، تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت بڑی ہی ہے، وہ معاف فرما دیں گے اور لفظ رحیم میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے، کہ جس شخص کو نفس مطمئنہ نصیب ہو وہ بھی اللہ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ الْتَوَيْتُ بِالْحَقِّ ۚ بَدِئْتُ مِصْرَ ۚ جَبَّ يُوْسُفُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۚ

فرمانے کے مطابق عورتوں سے واقعہ کی تحقیق فرمائی اور زلیخا اور دوسری سب عورتوں نے حقیقت واقعہ کا اقرار کر لیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو میرے پاس لایا جائے تاکہ میں ان کو اپنا مشیر خاص بنالوں، حکم کے مطابق یوسف علیہ السلام کو اعزاز کے ساتھ جیلخانے سے دربار میں لایا گیا، اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا پورا اندازہ ہو گیا، تو بادشاہ نے کہا کہ آپ آج ہمارے نزدیک بڑے محرز زاد و محمد ہیں۔

امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ پہنچا، اور بادشاہ کی دعوت پہنچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں کے لئے دعا کی، اور غسل کر کے نئے کپڑے پہنے، جب دربار شاہی پر پہنچے تو یہ دعا کی

حَسْبِيَ رَبِّي مِنْ دُنْيَايَ وَحَسْبِيَ رَبِّي مِنْ خَلْقِهِ عَزَّ جَارُهُ وَجَلَّ ثَنَائُهُ وَلَا إِلَهَ غَيْرُهُ ۚ

یعنی میری دنیا کے لئے میرا رب مجھے کافی ہے، اور ساری مخلوق کے بدلے میرا رب میرے لئے کافی ہے، جو اسکی پناہ میں آگیا وہ بالکل محفوظ ہے، اور اسکی بڑی تعریف ہے اور اسکی سو کوئی معبود نہیں ہے۔

جب دربار میں پہنچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف جو رخ ہو کر اسی طرح دعا کی اور عربی زبان میں سلام کیا، اَللّٰمُ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُكَ اللّٰہِ اور بادشاہ کیلئے دعا عبرانی زبان میں کی

بادشاہ اگرچہ بہت سی زبانیں جانتا تھا، مگر عربی اور عبرانی زبانوں سے واقف نہ تھا، یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعا عبرانی زبان میں۔

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کی، یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا، اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں مزید سنائیں، جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کر دی۔

پھر شاہ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلا واسطہ سُنوں یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتلائیں جو اب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں، پھر تعبیر بتلائی۔

شاہ مصر نے کہا کہ مجھے تعبیر سے زیادہ اس پر حیرت ہے کہ یہ تفصیلات آپ کو کیسے معلوم ہوئیں، اس کے بعد شاہ مصر نے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے، تو یوسف علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ پہلے سات سال جن میں خوب بارشیں ہونے والی ہیں ان میں آپ زیادہ سے زیادہ کاشت کر اگر غلہ اگانے کا انتظام کریں، اور سب لوگوں کو ہدایت کریں کہ اپنی اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں، اور جتنا غلہ حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ اپنے پاس ذخیرہ کرتے رہیں۔

اس طرح اہل مصر کے پاس قحط کے سات سال کے لئے بھی ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوں گے، حکومت کو جس قدر غلہ سرکاری محاسن سے یا سرکاری زمینوں سے حاصل ہو اس کو باہر کے لوگوں کے لئے جمع رکھیں، کیونکہ یہ قحط دور دراز تک پھیلے گا باہر کے لوگ اُس وقت آپ کے محتاج ہوں گے اس وقت آپ غلہ دے کر خلق خدا کی امداد کریں اور معمولی قیمت بھی رکھیں گے تو سرکاری خزانہ میں اتنا مال جمع ہو جائے گا، جو اس کے پہلے کبھی نہیں ہوا، شاہ مصر اس مشورہ سے بیحد مسرور و مطمئن ہوا، مگر کہنے لگا، کہ اس عظیم منصوبہ کا انتظام کیسے ہو اور کون کرے، اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْكُمْ، یعنی ملک کے خزانے (جن میں زمین کی پیداوار بھی شامل ہو) آپ میرے سپرد کر دیں میں ان کی حفاظت بھی پوری کر سکتا ہوں، اور خرچ کرنے کے مواقع اور مقدار خرچ کے اندازہ سے بھی پورا واقف ہوں (قرطبی و مظہری) ان دو لفظوں میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا، جو ایک وزیر خزانہ میں ہونے چاہئیں، کیونکہ پہلی ضرورت تو این خزانہ کے لئے اس کی ہے کہ

وہ سرکاری اموال کو ضائع نہ ہونے دے، بلکہ پوری حفاظت سے جمع کرے، پھر غیر مستحق لوگوں اور غلط قسم کے مصارف میں خرچ نہ ہونے دے اور دوسری ضرورت اس کی ہے کہ جہاں جس قدر خرچ کرنا ضروری ہے، اس میں نہ کوتاہی کرے اور نہ مقدار ضرورت سے زائد خرچ کرے، لفظ ”حفیظ“ پہلی ضرورت کی پوری ضمانت ہے اور لفظ ”علیم“ دوسری ضرورت کی۔

شاہ مصر اگرچہ یوسف علیہ السلام کے کمالات کا گرویدہ اور ان کی دیانت اور عقل کامل کا پورا محقق ہو چکا تھا، مگر بالفصل وزارت خزانہ کا منصب ان کو سپرد نہیں کیا، بلکہ ایک سال تک ایک معزز مہمان کی طرح رکھا۔

سال بھر پورا ہونے کے بعد نہ صرف وزارت خزانہ بلکہ پورے امور مملکت ان کے سپرد کر دیے، شاید مقصد یہ تھا کہ جب تک گھر میں رکھ کر ان کے اخلاق و عادات کا پورا تجربہ نہ ہو جائے اتنا بڑا منصب سپرد کرنا مناسب نہیں، جیسا کہ سعدی شیرازی نے فرمایا ہے ۷

چو یوسف کسے در صلاح و تمیز و بیک سال باید کہ گردد عسزیز
بعض مغسّرین نے لکھا ہے کہ اسی زمانہ میں زلیخا کے شوہر قبطیہ کا انتقال ہو گیا تو شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی شادی کر دی، اس وقت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں، زلیخا نے اعترافِ قصور کے ساتھ اپنا عذر بیان کیا۔

اللہ تعالیٰ اجل شانہ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ ان کی مراد پوری فرمائی، اور عیش و نشاط کے ساتھ زندگی گذری، تاریخی روایات کے مطابق دوا لڑ کے بھی پیدا ہوئے، جن کا نام افراتیم اور منشا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد یوسف علیہ السلام کے دل میں زلیخا کی محبت اس سے زیادہ پیدا کر دی جتنی زلیخا کو یوسف علیہ السلام سے تھی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے شکایت کی کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم مجھ سے اب اتنی محبت نہیں رکھتیں جتنی پہلے تھی، زلیخا نے عرض کیا کہ آپ کے وسیلہ سے مجھے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو گئی، اس کے سامنے سب تعلقات اور خیالات مضمحل ہو گئے، یہ واقعہ بعض دوسری تفصیلات کے ساتھ تفسیر قرطبی اور منہری میں بیان ہوا ہے۔

قصہ یوسف علیہ السلام کے ضمن میں جو عام انسانوں کی صلاح و فلاح کے لئے بہت سی ہدایات اور تعلیمات آئی ہیں، ان کا ذکر کچھ پہلے ہو چکا ہے، مذکورہ روایات میں مزید مسائل اور ہدایات حسبِ فیل ہیں:

پہلا مسئلہ :- حضرت یوسف علیہ السلام کے قول وَمَا أُبْرِي نَفْسِي مِنْ نَبِيٍّ اور متقی پر ہمیشہ گزار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہو کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہو جائے تو اس پر ناز نہ کریں، اور اس کے بالمقابل گناہ نگاروں کو حقیر نہ سمجھیں، بلکہ ارشاد یوسفی کے مطابق اس بات کو اپنے دل میں جاتیں کہ یہ ہمارا کوئی ذاتی کمال نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہو کہ اس نے نفسِ امارہ کو ہم پر غالب نہیں آنے دیا، ورنہ ہر انسان کا نفس اس کو طبعی طور پر بُرے ہی کاموں کی طرف کھینچتا ہے۔

دوسرا مسئلہ :- اَجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا ناجائز نہیں مگر چند شرائط کے ساتھ اجازت ہے۔

ارض کا انتظام اور ذمہ داری طلب فرمائی۔

مگر اس میں یہ تفصیل ہو کہ جب کسی خاص عہدہ کے متعلق یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا آدمی اس کا اچھا انتظام نہیں کر سکے گا اور اپنے بارہ میں یہ اندازہ ہو کہ عہدہ کے کام کو اچھا انجام دے سکے گا، اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو، ایسی حالت میں عہدہ کا خود طلب کر لینا بھی جائز ہے بشرطیکہ تحتِ جاہ و مال اس کا سبب نہ ہو، بلکہ خلقِ اللہ کی صحیح خدمت اور انصاف کے ساتھ ان کے حقوق پہنچانا مقصود ہو جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے صرف یہی مقصد تھا، اور جہاں یہ صورت نہ ہو تو حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کا کوئی عہدہ خود طلب کرنے سے منع فرمایا ہے، اور جس نے خود کسی عہدہ کی درخواست کی اس کو عہدہ نہیں دیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن سمرقہ سے فرمایا کہ کسی کوئی امارت طلب نہ کرو، کیونکہ تم نے خود سوال کر کے عہدہ امارت حاصل بھی کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو، اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کر سکو گے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا اِنَّا لَنْ نَسْتَعِیلَ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَسَادَا، یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا مطلب | مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ اس سے مختلف ہی کیونکہ
عہدہ خاص حکمت پر مبنی تھا | وہ جانتے تھے کہ بادشاہ مصر کا فرہے، اس کا عملہ بھی ایسا ہی ہو
اور ملک پر ایک طوفانی قحط آنے والا ہے، اس وقت خود غرض لوگ عام خلق اللہ پر رحم نہ کھائیں گے
اور لاکھوں انسان بھوک سے مرجائیں گے، کوئی دوسرا آدمی ایسا موجود نہ تھا جو غریبوں کے حقوق
میں انصاف کر سکے، اس لئے خود اس عہدہ کی درخواست کی، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ اپنے کمال
کا اظہار بھی بضرورت کرنا پڑا، تاکہ بادشاہ مطمئن ہو کر عہدہ ان کو سپرد کر دے۔

اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہی جس کے فرائض کو
کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ انداز ہو کہ میں صحیح انجام
دے سکتا ہوں، تو اس کے لئے جائز ہی بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی خود درخواست کرے، مگر اپنے بڑے
مال کے لئے نہیں بلکہ خدمت خلق کے لئے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ
پر خوب روشن ہے (قرطبی)

حضرات خلفائے راشدین کا خلافت کی ذمہ داری اٹھالینا اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے
تھے کہ کوئی دوسرا اس وقت اس ذمہ داری کو صحیح انجام نہ دے سکے گا، صحابہ کرام حضرت علی اور
معاویہ و حضرت حسین اور عبداللہ ابن زبیر وغیرہم کے جو اختلافات پیش آئے وہ سب اس
پر مبنی تھے، کہ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس وقت فرائض خلافت کو میں اپنے مقابل
سے زیادہ حکمت و قوت کے ساتھ پورا کر سکوں گا، جاہ و مال کی طلب کسی کا مقصد اصلی نہ تھا۔
کیا کسی کا فر حکومت کا عہدہ | تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر
مقبول کرنا جائز ہے | کی ملازمت قبول فرمائی، حالانکہ وہ کافر تھا، جس سے معلوم ہوا کہ
کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے۔

لیکن امام جصاص نے آیت کریمہ فَاتَّقُوا اللَّهَ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ کے تحت
لکھا ہے کہ اس آیت کی رو سے ظالموں کافروں کی اعانت کرنا جائز نہیں، اور ظاہر ہے انکی حکومت
کا عہدہ مقبول کرنا ان کے عمل میں شریک ہونا اور اعانت کرنا ہے، اور ایسی اعانت کو قرآن کریم
کی بہت سی آیتوں میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جو اس ملازمت کو نہ صرف قبول فرمایا بلکہ درخواست
کر کے حاصل کیا، اس کی خاص وجہ امام تفسیر مجاہد نے تو یہ قرار دی ہے کہ بادشاہ مصر اس وقت
مسلمان ہو چکا تھا، مگر چونکہ قرآن و سنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے عام
مفسرین نے اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ مصر کے معاملہ

سے یہ معلوم کر چکے تھے کہ وہ ان کے کام میں دخل نہ دے گا، اور کسی خلافت شرع قانون جاری کرنے پر ان کو مجبور نہ کرے گا، بلکہ ان کو مکمل اختیار دے گا جس کے ذریعہ وہ اپنی صوابدید اور قانون حق پر عمل کر سکیں گے، ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلافت شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کر لے تو اگرچہ اس کا فرظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہو، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو اور اس کا عہدہ قبول کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم و جور کا اندیشہ قوی ہو تو مجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہو جاتی ہے جس میں خود کسی خلافت شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، مگر سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اس کی اعانت کا فائدہ حاصل ہو جائے، اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے، جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے، سلف صالحین صحابہ و تابعین میں بہت حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم و جائر حکمرانوں کا عہدہ قبول کر لینا ثابت ہے (قرطبی وغیرہ) علامہ ماردی نے سیاست شرعیہ سے متعلق اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل کی بنا پر کافر اور ظالم حکمرانوں کا عہدہ قبول کرنا اس شرط کے ساتھ جائز رکھا ہے کہ خود اس کو کوئی کام خلافت شرع نہ کرنا پڑے، اور بعض حضرات نے اس شرط کے ساتھ بھی اس کو اس لئے جائز نہیں رکھا کہ اس میں بھی اہل ظلم و جور کی تقویت اور تائید ہوتی ہے، یہ حضرات یوسف علیہ السلام کے فعل کی مختلف توجہات بیان کرتے ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ یہ عمل حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات یا ان کی شریعت کے ساتھ مخصوص تھا، اب دوسروں کے لئے جائز نہیں، مگر جمہور علماء فقہاء نے پہلے ہی قول کو اختیار فرما کر جائز قرار دیا ہے۔ (شرطی)

تفسیر مجیط میں ہے کہ یہاں یہ معلوم ہو کہ علماء صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے، انصاف نہ ہو سکے گا، وہاں ایسا عہدہ قبول کر لینا جائز بلکہ ثواب ہے، بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلافت شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔

پھر تمہا مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلَیْکُمْ سے یہ ثابت ہوا کہ ضرورت کے موقع پر اپنے کسی کمال یا فضیلت کا ذکر کر دینا تزکیہ نفس یعنی پاکبازی جتلانے میں داخل نہیں، جس کی قرآن کریم میں ممانعت آئی ہے، بشرطیکہ

اس کا ذکر کرنا کبر و غرور اور فخر و تعلیٰ کی وجہ سے نہ ہو۔

وَكَذَٰلِكَ مَكِّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَخْتَارُ ۖ آمَنَّا بِهِ نَبُشَاءُ ۖ نَحْنِيبِ
بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ یعنی جس طرح ہم نے یوسفؑ کو
بادشاہ مصر کے دربار میں عزت و منزلت عطا کی اسی طرح ہم نے ان کو پورے ملک مصر پر اقتدار عطا
کر دیا کہ اس کی زمین میں جس طرح چاہیں احکام جاری کریں، ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت و
نعمت سے یوں ہی نوازا کرتے ہیں، اور ہم نیک کام کرنے والوں کا اجر کبھی منہایں نہیں کرتے یہ
تفصیل اس کی یہ ہو کہ بادشاہ مصر نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد دربار میں ایک
جشن منایا جس میں تمام عمال دولت اور محسنین حکومت کو جمع کیا، اور یوسف علیہ السلام
کے سر پر تاج رکھ کر اس مجلس میں لایا گیا، اور صرف خزانہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے امور مملکت
کو عملاً ان کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا (قرطبی و مظہری وغیرہ)۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے امور سلطنت کو ایسا سنبھالا کہ کسی کو کوئی شکایت
باقی نہ رہی، سارا ملک آپ کا گردیدہ ہو گیا، اور پورے ملک میں امن اور خوش حالی عام ہو گئی،
خود حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی حکومت کی اس تمام ذمہ داری میں کوئی دشواری یا بوج
و تکلیف پیش نہیں آتی۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے پیش نظر چونکہ اس ساری جاہ و جلال
سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کا رواج اور اس کے دین کی اقامت تھی، اس لئے وہ کسی وقت
بھی اس سے غافل نہیں ہوئے، کہ شاہ مصر کو اسلام و ایمان کی دعوت دیں، یہاں تک کہ
مسلل دعوت و کوشش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بادشاہ مصر بھی مسلمان ہو گیا۔

وَلَا جُرَآئِلَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ یعنی اور آخرت کا
اجر و ثواب اس دنیا کی نعمت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے، ان لوگوں کے لئے جو مومن ہوئے، اور
جھٹوں نے تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کی۔

مطلب یہ ہو کہ دنیا کی دولت و سلطنت اور ممالی حکومت تو عطا ہوتی ہی تھی، اس کے
ساتھ آخرت کے درجات عالیہ بھی ان کے لئے تیار ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ یہ
درجات دنیا و آخرت یوسف علیہ السلام کی خصوصیت نہیں، بلکہ صلائے عام ہے ہر اس شخص
کے لئے جو ایمان اور تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کر لے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زمانہ حکومت میں عوام کی راحت رسانی کے وہ
کام کئے جن کی نظیر ملنا مشکل ہے، جب تعبیر خواب کے مطابق سات سال خوش حالی کے

گذرگئے اور قحط شروع ہوا تو یوسف علیہ السلام نے پیٹ بھر کر کھانا چھوڑ دیا، لوگوں نے کہا کہ ملک مصر کے سامنے خزانے آپ کے قبضہ میں ہیں اور آپ بھوکے رہتے ہیں، تو فرمایا کہ میں یہ اس لئے کرتا ہوں تاکہ عام لوگوں کی بھوک کا احساس میرے دل سے غائب نہ ہو، اور شاہی باورچیوں کو بھی حکم دیدیا کہ دن میں صرف ایک مرتبہ دوپہر کو کھانا پکا کرے تاکہ شاہی محل کے سب افراد بھی عوام کی بھوک میں کچھ حصہ لے سکیں۔

وَجَاءَ إِخْوَتَهُ يُوسُفَ قَدْ خَلَوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس تو اس نے پہچان لیا ان کو اور وہ

مَنْكُرُونَ ﴿٥٠﴾ وَلَمَّا أَخْبَرَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ أَتُنُونِي بِأَنْتُمْ لَكُمْ

میں نہیں پہچانتے، اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب، کہا لے آئیو میرے پاس ایک بھائی جو

مَنْ أَبْيَكُمْ أَلا تَتَرُونَ إِلَىٰ أُوْىٰى الْكَيْلِ وَأَنَا خَيْرُ

تمہارا بپا کی طرف ہے، تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا دیتا ہوں ناپ اور خوب طرح اتارتا ہوں

الْمَنْزِلَيْنِ ﴿٥١﴾ فَإِنْ لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي

ہمانوں کو، پھر اگر اسکو نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لئے بھرتی نہیں میرے نزدیک

وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٥٢﴾ قَالُوا سَنُرَاوِدُّكَ عَنْهُ أَبَاكَ وَإِنَّا فَاعِلُونَ ﴿٥٣﴾

اور میرے پاس نہ آئیو، بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ اور ہم کو یہ کام کرنا ہے،

وَقَالَ لِفَتَاتِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِجَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ

اور کہہ دیا اپنے خدمتگاروں کو رکھ دو ان کی پونجی ان کے اسباب میں شاید

يَعْرِفُوهُمْ إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهم يَرْجِعُونَ ﴿٥٤﴾

اس کو پہچانیں جب پھر کر پہنچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں۔

خلاصہ تفسیر

درغرض یوسف علیہ السلام نے باختیار ہو کر غلہ کاشت کرانا اور جمع کرانا شروع کیا اور سات برس کے بعد قحط شروع ہوا، یہاں تک کہ دورِ دور سے یہ خبر سن کر کہ مصر میں سلطنت کی طرف سے غلہ فروخت ہوتا ہے جو قحطوں کو لوگ آنا شروع ہوئے، اور (کنعان میں بھی قحط ہوا) یوسف (علیہ السلام) کے بھائی (بھی بجز بنیامین کے غلہ لینے مصر میں)

آئے پھر یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے سو یوسف (علیہ السلام) نے (تو) اُن کو پہچان لیا اور انھوں نے یوسف (علیہ السلام) کو نہیں پہچانا کیونکہ ان میں تغیر کم ہوا تھا، نیز یوسف (علیہ السلام) کو ان کے آنے کا خیال اور قوی احتمال بھی تھا، پھر نووارد سے پوچھ بھی لیتے ہیں کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اور شناسا لوگوں کو متھوڑے پتہ سے اکثر پہچان بھی لیتے ہیں بخلاف یوسف (علیہ السلام) کے کہ ان میں (چونکہ مفارقت کے وقت بہت کم عمر تھے) تغیر بھی زیادہ ہو گیا تھا اور ان کو یوسف (علیہ السلام) کے ہونے کا احتمال بھی نہ تھا، پھر حکام سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا، کہ آپ کون ہیں؟ یوسف (علیہ السلام) کا معقول تھا کہ ہر شخص کے ہاتھ غلہ بہت در حاجت فروخت کرتے تھے، چنانچہ ان کو بھی جب فی آدمی ایک ایک اونٹ غلہ قیمت دے کر ملنے لگا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا ایک علاقائی بھائی اور ہے، اس کو باپ نے اس وجہ سے کہ ان کا ایک بیٹا گم ہو گیا تھا اپنی تسلی کے لئے رکھ لیا ہے، اس کے حصہ کا بھی ایک اونٹ غلہ زیادہ دیدیا جائے، یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ یہ قانون کے خلاف ہے، اگر اس کا حصہ لینا ہو تو وہ خود آکر لے جائے، غرض اُن کے حصہ کا غلہ اُن کو دلوادیا، اور جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ کا) تیار کر دیا تو (چلتے وقت) فرمادیا کہ (اگر یہ غلہ خرچ کر کے اب کے آنے کا ارادہ کر دو تو) اپنے علاقائی بھائی کو بھی (ساتھ) لانا (تاکہ اس کا حصہ بھی دیا جائے) تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب زیادہ بہانہ بازی کرتا ہوں پس اگر تمھارا وہ بھائی آئے گا اس کو بھی پورا حصہ دوں گا، اور اس کی خوب خاطر داشت کروں گا جیسا تم نے اپنے ساتھ دیکھا، غرض آنے میں تو نفع ہی نفع ہے) اور اگر تم (دوبارہ آئے اور) اس کو میرے پاس نہ لائے تو (میں سمجھوں گا کہ تم غلہ کو دھوکہ دے کر غلہ زیادہ لینا چاہتے تھے تو اس کی سزا میں) نہ میرے پاس تمھارے نام کا غلہ ہوگا، اور نہ تم میرے پاس آنا (پس اس کے نہ لانے میں یہ نقصان ہوگا کہ تمھارے حصہ کا غلہ بھی سوخت ہو جاوے گا) وہ بولے (دیکھتے) ہم (اپنی حد امکان تک تو) اس کے باپ سے اس کو مانگیں گے اور ہم اس کا کو (یعنی کوشش اور درخواست) ضرور کریں گے (آگے باپ کے اختیار میں ہے) اور (جب وہاں سے بالکل چلنے لگے تو) یوسف (علیہ السلام) نے اپنے نوکروں سے کہدیا کہ ان کی جمع پونجی جس کے عرصہ انھوں نے غلہ بول لیا ہے (ان (ہی) کے اسباب میں (چھپا کر) رکھ دو تاکہ جب اپنے گھر جائیں تو اس کو (جب وہ اسباب میں سے نکلے) پہچانیں، شاید یہ احسان و کرم دیکھ کر) پھر دوبارہ آئیں (چونکہ یوسف (علیہ السلام) کو ان کا دوبارہ آنا اور ان کے بھائی کا لانا منظور تھا اس لئے کسی طرح سے اس کی

تربیر کی اول وعدہ کیا کہ اگر اس کو لاؤ گے تو اس کا بھی حصہ ملے گا، دوسرے وعید سنائی کہ اگر نہ لاؤ گے تو اپنا حصہ بھی نہ پاؤ گے، تیسرے دام جو کہ نقد کے علاوہ کوئی اور چیز تھی واپس کر دی، در خیال سے ایک یہ کہ اس سے احسان و کرم پر استدلال کر کے پھر آئیں گے، دوسرے اس لئے کہ شاید ان کے پاس اور دام نہ ہوں اور اس لئے پھر نہ آسکیں، اور جب یہ دام ہوں گے انہی کو لیکر پھر آتے ہیں) :-

معارف و مسائل

پہلی آیتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کا کامل اقتدار اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہو جانے کا بیان تھا، مذکورہ صدر آیات میں برادران یوسف کا غلہ لینے کے لئے مصر آنا بیان ہوا ہے، اور یہ بھی ضمناً آگیا کہ دس بھائی مصر آئے تھے، یوسف علیہ السلام کے حقیقی چھوٹے بھائی ساتھ نہ تھے۔

درمیان قصہ کی تفصیل قرآن نے اس لئے نہیں دی کہ پچھلے واقعات سے وہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ائمہ تفسیر میں سے سدی اور محمد بن اسحاق وغیرہ کے حوالہ سے جو تفصیل بیان کی ہے وہ اگر تاریخی اور اسرائیلی روایات سے بھی لی گئی ہو تو اس لئے کچھ قابل قبول ہے کہ نسبِ قرآنی میں خود اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔

ان حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کی وزارت حاصل ہونے کے بعد ابتدائی سات سال تعبیر خواب کے مطابق پورے ملک کیلئے بڑی خوش حالی اور رفاهیت کے آئے، پیداوار خوب ہوئی، اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد اسی خواب کا دوسرا جزو سامنے آیا کہ قحط شدید پڑا، جو سات سال تک جاری رہا اس وقت یوسف علیہ السلام چونکہ پہلے سے باخبر تھے کہ یہ قحط سات سال تک مسلسل رہے گا اس لئے قحط کے ابتدائی سال میں ملک کے موجودہ ذخیرہ کو بڑی احتیاط سے جمع کر لیا، اور پوری حفاظت سے رکھا۔

مصر کے باشندوں کے پاس بقدران کی ضرورت کے پہلے سے جمع کرادیا گیا، اب قحط عام ہوا اور اطراف و اکناف سے لوگ سمٹ کر مصر آنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے غلہ فروخت کرنا شروع کیا، کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے جس کی مقدار قریباً ایک و سن یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دو سو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

اور اس کام کا اتنا اہتمام کیا کہ غلہ کی فروخت خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے، یہ قحط صرف ملک مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور دور کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، ارض کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ ہے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے اور آج بھی اس کا شہر بنام خلیل ایک پر رونق شہر کی صورت میں موجود ہے، یہیں حضرت ابراہیم واسحق اور یعقوب و یوسف علیہم السلام کے مزارات معروف ہیں، یہ خطہ بھی اس قحط کی زد سے نہ بچا، اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی، ساتھ ہی ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہو گئی تھی کہ وہاں غلہ قیمتاً بل جاتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام تک بھی یہ خبر پہنچی کہ مصر کا بادشاہ کوئی صالح رحم دل آدمی ہے وہ سب خلق خدا کو غلہ دیتا ہے تو اپنے صاحبزادوں سے کہا کہ تم بھی جاؤ، مصر سے غلہ لے کر آؤ۔

اور چونکہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ایک آدمی کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلہ نہیں دیا جاتا، اس لئے سب ہی صاحبزادوں کو بھیجنے کی تجویز ہوئی، مگر سب کے چھوٹے بھائی بنیامین جو یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے، اور یوسف علیہ السلام کی گم شدگی کے بعد سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت و شفقت ان کے ساتھ زیادہ متعلق ہو گئی تھی، ان کو اپنے پاس اپنی تسلی اور خبر گیری کے لئے روک لیا۔

دن بھائی کنعان سے سفر کر کے مصر پہنچے، یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت و تاج کے مالک ہونے کی حیثیت میں سامنے آئے، اور بھائیوں نے ان کو بچپن کی سات سالہ عمر میں قافلہ والوں کے ہاتھ بیچا تھا جس کو اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق پچیس سال ہو چکے تھے (قرطبی، مظہری)۔

ظاہر ہے کہ اتنے عرصہ میں انسان کا علیہ بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، اور ان کا یہ وہم و خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ جس بچہ کو غلام بنا کر بیچا گیا تھا، وہ کسی ملک کا وزیر یا بادشاہ ہو سکتا ہے اس لئے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا، مگر یوسف علیہ السلام نے پہچان لیا آیت مذکورہ میں فَحَسَّ قُلُوبُهُمْ وَهَمُّوْا لَمْ يَمْنِكُوْا کے یہی معنی ہیں، عربی زبان میں انکا کے اصل معنی اجنبی سمجھنے ہی کے آتے ہیں، اس لئے مَنِكُوْا کے معنی نادان قف اور انخبان کے ہو گئے۔

یوسف علیہ السلام کے پہچان لینے کے متعلق ابن کثیر نے بحوالہ مَدَنی یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب یہ دن بھائی دربار میں پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے مزید اطمینان کے لئے ان سے ایسے سوالات کئے، جیسے مشتبہ لوگوں سے کئے جاتے ہیں، تاکہ وہ پوری حقیقت واضح

کر کے بیان کر دیں، اول تو ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مصر کے رہنے والے نہیں آپ کی زبان بھی عبرانی ہے، آپ یہاں کیسے پہنچے، انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں قحط عظیم ہے، اور ہم نے آپ کی تعریف سنی، اس لئے غلہ حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، یوسف علیہ السلام نے پھر پوچھا کہ ہمیں یہ کیسے اطمینان ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو، اور تم کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہو، تو ان سب بھائیوں نے عرض کیا کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم تو اللہ کے رسول یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو کنعان میں رہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا ان سوالات سے مقصد یہ تھا کہ یہ ذرا کھل کر پورے واقعات بیان کر دیں، تب یوسف علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تمہارے والد کے اور بھی کوئی اولاد تمہارے سوا ہے، تو انھوں نے بتلایا کہ ہم بارہ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹا بھائی جنگل میں گم ہو گیا، اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اسی سے محبت تھی، اس کے بعد سے اس کے چھوٹے حقیقی بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے، اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا، تاکہ وہ اس کی تسلی کا سبب بنے۔

یوسف علیہ السلام نے یہ سب باتیں سن کر حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائیں، اور قاعدہ کے موافق غلہ دیدیں۔

تقسیم غلہ میں یوسف علیہ السلام نے ضابطہ کار یہ بنایا تھا کہ ایک مرتبہ میں کسی ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ نہ دیتے، مگر جب حساب کے موافق وہ ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ دیدیتے تھے۔

بھائیوں سے ساری تفصیلات معلوم کر لینے کے بعد ان کے دل میں یہ خیال آنا طبعی امر تھا کہ یہ پھر دوبارہ بھی آئیں، اس کے لئے ایک انتظام تو ظاہر آیا کہ خود ان بھائیوں سے کہا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ بِاَیِّہِ تَکُم مِّنْ اَبْنِکُمْ اَلَا تَرَوُنَّ اَنِّیْ اَدْرِیْ اَلْکَیْلَ وَاَذْخِیْرَ الْمُنَزِّلِیْنَ، یعنی جب تم دوبارہ آؤ تو اپنے سوتیلے بھائی باپ شریک کو بھی لے کر آنا، تم دیکھ رہے ہو کہ میں کس طرح پورا پورا غلہ دیتا ہوں اور کس طرح مہمانی کرتا ہوں،

اور پھر ایک دھمکی بھی دیدی فَاِنْ لَّمْ تَأْتُوْنِیْ بِہِ فَلَا کَیْلَ لَکُمْ عِندِیْ وَاَلَا تَحْشُرُوْنَ، یعنی اگر تم اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لاؤ گے تو پھر میں تم میں سے کسی کو بھی غلہ نہ دوں گا، کیونکہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے، اس طرح تم میرے پاس نہ آنا۔

دوسرا انتظام خفیہ یہ کیا کہ جو نقد یا زیور وغیرہ ان بھائیوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر

اداکیا تھا اس کے متعلق کارندوں کو حکم دیدیا کہ اس کو چھپا کر انہی کے سامان میں اس طرح
باندھ دو کہ انکو اس وقت پتہ نہ لگے تاکہ جب گھر پہنچ کر سامان کو لیں اور اپنا نقد زریروں کو واپس تو بچھو دوبارہ لینے کیلئے آسکیں۔

ابن کثیر نے یوسف علیہ السلام کے اس عمل میں کتنی احتمال بیان کئے ہیں، ایک یہ کہ یوسف
علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ شاید ان کے پاس اس نقد وزریروں وغیرہ کے سوا اور کچھ موجود ہی نہ ہو
تو پھر دوبارہ غلہ لینے کے لئے نہیں آسکیں گے، دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ اپنے والد اور
بھائیوں سے کھانے کی قیمت لینا گوارا نہ ہو، اس لئے شاہی خزانہ میں اپنے پاس سے جمع کر دیا
ان کی رقم ان کو واپس کر دی، اور ایک احتمال یہ بھی ہو کہ وہ جانتے تھے کہ جب ان کا سامان
ان کے پاس واپس پہنچ جائے گا اور والد ماجد کو علم ہوگا تو وہ اللہ کے رسول ہیں، اس واسطے
سامان کو مصری خزانہ کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیجیں گے، اس لئے بھائیوں کا دوبارہ
آنا اور یقینی ہو جائے گا۔

بہر حال یوسف علیہ السلام نے یہ سب انتظامات اس لئے کئے کہ آئندہ بھی بھائیوں
کے آنے کا سلسلہ جاری رہے اور چھوٹے حقیقی بھائی سے ملاقات بھی ہو جائے۔

مسائل و فوائد | یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے اس کا جواز معلوم ہوا
کہ جب کسی ملک میں اقتصادی حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ
اگر حکومت نظام قائم نہ کرے تو بہت سے لوگ اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہو جائیں
تو حکومت ایسی چیزوں کو اپنے نظم اور کنٹرول میں لے سکتی ہے، اور غلہ کی مناسب
قیمت مقرر کر سکتی ہے، حضرات فقہاء امت نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

یوسف علیہ السلام کا اپنے حالات سے والد کو اطلاع نہ دینا باہر آہی تھا
یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں ایک بات انتہائی ہیروئنیک
ہو کہ ایک طرف تو ان کے والد ماجد پیغمبر خدا یعقوب علیہ السلام
ان کی مفارقت سے اتنے متاثر کہ روتے روتے نابینا ہو گئے،

اور دوسری طرف یوسف علیہ السلام جو خود بھی نبی و رسول ہیں، باپ سے فطری اور
طبعی محبت کے علاوہ ان کے حقوق سے بھی پوری طرح باخبر ہیں، لیکن چالیس سال کے
حلول زمانہ میں ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ میرے والد میری جدائی سے بے چین ہیں
اپنی خیریت کی خبر کسی ذریعہ سے ان تک پہنچا دوں، خبر پہنچا دینا تو اس حالت میں بھی کچھ
بعید نہ تھا جب وہ غلامی کی صورت میں مصر پہنچ گئے تھے، پھر عزیز مصر کے گھر میں تو
ہر طرح کی آزادی اور آسائش کے سامان بھی تھے، اس وقت کسی ذریعہ سے مگر تک خط یا خبر
پہنچا دینا کچھ مشکل نہ تھا، اسی طرح جیل کی زندگی میں دنیا جانتی ہے کہ سب خبریں اذہم

کی ادھر پہنچتی ہی رہتی ہیں، خصوصاً جب اللہ تعالیٰ نے عزت کے ساتھ جیل سے رہا فرمایا اور ملک مصر کا اقتدار ہاتھ میں آیا اس وقت تو خود چل کر والد کی خدمت میں حاضر ہونا سب سے پہلا کام ہونا چاہیے تھا، اور یہ کسی وجہ سے مصلحت کے خلاف ہوتا تو کم از کم قاصد بھیج کر والد کو مطمئن کر دینا تو معمولی بات تھی۔

لیکن پیغمبر خدا یوسف علیہ السلام سے کہیں منقول نہیں کہ اس کا ارادہ بھی کیا ہوا اور خود کیا ارادہ کرتے جب بھائی غلہ لینے کے لئے آئے تو ان کو بھی اصل واقعہ کے اظہار کے بغیر رخصت کر دیا۔

یہ تمام حالات کسی ادنیٰ انسان سے بھی متصور نہیں ہو سکتے، اللہ کے برگزیدہ رسول سے یہ صورت کیسے برداشت ہوئی۔

اس حیرت انگیز خاموشی کا ہمیشہ یہی جواب مل میں آیا کرتا تھا کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت یوسف علیہ السلام کو اپنے اظہار سے روک دیا ہوگا، تفسیر قرطبی میں اس کی تصریح مل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو ہی جانتے ہیں، انسان ان کا کیا احاطہ کر سکتا ہے، کبھی کوئی چیز کسی کے سمجھ میں بھی آجاتی ہے، یہاں بظاہر اس کی اصل حکمت اس امتحان کی تکمیل تھی جو یعقوب علیہ السلام کا لیا جا رہا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کی ابتداء ہی میں جب یعقوب علیہ السلام کو یہ انداز ہو چکا تھا کہ یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا، بلکہ بھائیوں کی کوئی شرارت ہے، تو اس کا طبعی اقتضایہ یہ تھا کہ اسی وقت جگہ پر پہنچتے تحقیق کرتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا دھیان اس طرف نہ جانے دیا، اور پھر مدتوں کے بعد انھوں نے بھائیوں سے یہ بھی فرمایا کہ "جاء یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو" جب اللہ تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع فرمادیتے ہیں۔

فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مَنَّا الْكَافِرُ

پھر جب پیچھے اپنے باپ کے پاس لوٹے اے باپ روک دی گئی، ہم سے بھرتی،

فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَانَا ذَكَتْلَ وَإِنَّا لَكِهِ لَحَفِظُونَ ﴿۶۶﴾ قَالَ هَلْ

سو بھیج ہم سے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں، کہا میں کیا

اَمِّنْكُمْ عَلٰی اِلٰٰكِكُمْ اَمِّنْكُمْ عَلٰی اَخِيَّتِهِ مِنْ قَبْلِ ط وَاللّٰهُ خَيْرٌ

اعتبار کر دوں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا اس کے بھائی پر اس سے پہلے سو اللہ بہتر

حِفْظًا مَّ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحِمِيْنَ ۝۱۲ وَلَمَّا فَتَحُوا مَسَاعِيْرَهُمْ

ہر گھسان اور وہی ہر سب ہر بانوں سے ہر بان اور جب کھولی اپنی چیز بست

وَجَدُوْا اَيْضًا عَتَمَهُمْ رَدَّتْ اِلَيْهِمْ ط اَلَوْ اَيَّا بَا نَا مَا نَبْغِيْ ط

پائی اپنی پونجی کہ پھردی گئی آن کی طرف ، بولے اے باپ ہم کو اور کیا چاہتے ،

هٰنِ اَيْضًا عَتَمَارَدَّتْ اِلَيْنَا وَنَسِيْرُ اَهْلِنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا

یہ پونجی ہماری پھردی ہے ہم کو ، اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر کو اور شہر داری کریں گے اور

وَنَزِدَا اَدْكِيْلَ بَعِيْرٍ ط ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ۝۱۳ قَالَ لَنْ اُرْسِلَ

بھائی کی اور زیادہ لیں بھرتی ایک اونٹ کی وہ بھرتی آسان ہو ، کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اس کو

مَعَكُمْ حَتّٰى تَوْتُوْنَ مَوْثِقًا مِّنْ اِلٰهٍ لَّمَّا تَنَبَّيْ بِهٖ اِلَّا اَنْ

تمھارے ساتھ یہاں تک کہ دو تھو کو عہد خدا کا البتہ پہنچا دوں گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ ۱۳

يَحَاطُّ بِكُمْ فَلَمَّا اتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اِلٰهُهُ عَلٰى مَا نَقُولُ وَكِيلٌ

گھیرے جاؤ تم سب ، پھر جب یہاں اس کو سب نے عہد بولا اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے۔

حُلاۃ تفسیر

غرض جب لوٹ کر اپنے باپ (یعقوب علیہ السلام) کے پاس پہنچے کہنے لگے کہ اے باپ! ہماری بڑی خاطر ہوئی اور غلہ بھی ملا مگر بنیامین کا حصہ نہیں ملا، بلکہ بدوان بنیامین کے ساتھ لے جائے ہوئے آئندہ بھی، ہمارے لئے (مطلقاً غلہ کی بندش کر دی گئی سو اس صورت میں ضروری ہو کہ) آپ ہمارے بھائی (بنیامین) کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ (دوبارہ مسئلہ لانے سے جو امر مانع ہو وہ مرتفع ہو جاوے اور) ہم (پھر) غلہ لاسکیں اور اگر ان کے بھیجنے سے آپ کو کوئی اندیشہ ہی مانع ہے تو اس کے متعلق یہ عرض ہو کہ) ہم ان کی پوری حفاظت رکھیں گے، (یعقوب علیہ السلام) نے فرمایا کہ بس (رہنے دو) میں اس کے بارے میں بھی تمہارا ویسا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تمہارا اعتبار کرتا تھا، چکا ہوں (یعنی دل تو میرا اگر اسی دیت نہیں مگر تم کہتے ہو کہ بدوان اس کے گئے ہوئے آئندہ

غلہ نہ ملے گا، اور عادی زندگی کا مدار غلہ ہی پر ہی اور جان بچانا فرض ہے) سو (خیر اگر لے ہی جاؤ گے تو) اللہ (کے سپرد ہی) سب سے بڑھ کر نگہبان ہو (میری نگہبانی سے کیا ہوتا ہے) اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (میری محبت اور شفقت سے کیا ہوتا ہے) اور (اس گفتگو کے بعد جب انھوں نے اپنا اسباب کھولا تو اس میں) ان کی جمع پونجی (بھی) ملی کہ ان ہی کو وہاں کر دی گئی، کہنے لگے کہ اے آبا (بیٹے) اور ہم کو کیا چاہئے یہ ہماری جمع پونجی بھی تو ہم ہی کو لوٹا دی گئی (ایسا کریم بادشاہ ہی، اور اس سے زیادہ کس عنایت کا انتظار کریں، یہ عنایت بس ہو اس کا مقتضی بھی یہی ہو کہ ایسے کریم بادشاہ کے پاس بچ جائیں، اور وہ موقوف ہو کھانی کے ساتھ لیجانے پر اس لئے اجازت ہی دینا چکے ان کو ساتھ لے جائیں گے) اور اپنے گھر والوں کی واسطے (اور) رہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی خوب حفاظت رکھیں گے، اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ اور زیادہ لائیں گے، (کیونکہ جس قدر اس وقت لائے ہیں) یہ تو تھوڑا سا غلہ ہی (جلدی ختم ہو جائے گا) پھر اور ضرورت ہوگی، اور انکا ملنا موقوف ہے انکے بیجانے پر (یعقوب علیہ السلام) نے فرمایا کہ (خیر اس حالت میں بھیجنے سے انکار نہیں، لیکن) اس وقت تک ہرگز اسکو تمہارے ہمراہ نہ بھیجونا جب تک کہ اللہ کی قسم کھا کر مجھ کو پکا قول نہ دو گے کہ تم اسکو ضرور لے ہی آؤ گے ہاں اگر نہیں کھڑی ہو تو مجبوری ہے (چنانچہ سب نے اس پر قسم کھالی) سو جب وہ قسم کھا کر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جو بات چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ کے حوالے ہے (یعنی وہی ہمارے قول و اقرار کا گواہ ہے، کہ سن رہا ہے اور وہی اس قول کو پورا کر سکتا ہے، پس اس بحث سے وہ غرض ہوئیں، اداں انکو اپنے قول کے خیال رکھنے کی ترغیب اور تنبیہ کہ اللہ کو حاضر و ناظر سمجھنے سے یہ بات ہوتی ہی اور دوسرے اس تدبیر کا منتہی تقدیر کو قرار دینا کہ تو تمہارا حاصل ہے، اور اس کے بعد بنیامین کو ہمراہ جانے کی اجازت دیدی، بنیامین دوبارہ مصر کے سفر کو موح بنیامین سب تیار ہو گئے) :

معارف مسائل

آیات مذکورہ میں واقعہ کا بقیہ حصہ اس طرح مذکور ہے کہ جب برادران یوسف علیہ السلام مصر سے غلہ لے کر گھر واپس آئے تو مصر کے معاملہ کا تذکرہ والد ماجد سے کرتے ہوئے یہ بھی بتلایا کہ عزیز مصر نے آئندہ کے لئے ہمیں غلہ دینے کے لئے یہ شرط کر دی ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لاؤ گے تو ملے گا ورنہ نہیں، اس لئے آپ آئندہ بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیا تاکہ ہمیں آئندہ بھی غلہ مل سکے، اور ہم اس بھائی کی تو پوری حفاظت کرنے والے ہیں، ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔

والد ماجد نے فرمایا کہ کیا ان کے بارے میں تم پر ایسا ہی اطمینان کروں جیسا اس سے پہلے ان کے بھائی یوسف کے بارے میں کیا تھا، غلط فہمی ہو کہ اب تمہاری بات کا اعتبار کیا ہے، ایک مرتبہ تم پر اطمینان کر کے مصیبت اٹھا چکا ہوں تم نے یہی الفاظ حفاظت کرنے کے اس وقت بھی بولے تھے یہ تو ان کی بات کا جواب تھا، مگر پھر خاندان کی ضرورت کے پیش نظر پیغمبرانہ توہین اور اس حقیقت کو اصل قرار دیا کہ کوئی نفع نقصان کسی بندہ کے ہاتھ میں نہیں جب تک اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت و ارادہ نہ ہو، اور جب ان کا ارادہ ہو جائے تو پھر اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اس لئے مخلوق پر بھروسہ بھی غلط ہے، اور ان کی شکایات پر معاملہ کا مدار رکھنا بھی نامناسب ہے۔

اس لئے فرمایا فَالْتَمَسْتُ حِفْظًا، یعنی تمہاری حفاظت کا نتیجہ تو پہلے دیکھ چکا ہوں، اب تو میں اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت پر بھروسہ کرتا ہوں وَكَلِمَاتُ اللَّهِ حُسْنٌ، اور وہ سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے، اسی سے امید ہے کہ وہ میری ضعیفی اور موجودہ غم و اندوہ پر نظر فرما کر مجھ پر دوسرے صدمے نہ ڈالے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ظاہری حالات اور اپنی اولاد کے عہد و بیان پر بھروسہ نہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر چھوٹے بیٹے کو بھی ساتھ بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے۔
وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي هَذِهِ بِضَاعُ غُلَامٍ دَنَسَ إِلَيْنَا وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَا ذَاوَنُودَ إِذْ كُنَّا كَافِرِينَ
بَعِيرٌ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيرٌ

یعنی اب تک تو برادران یوسف علیہ السلام کی یہ ابتدائی گفتگو حالات سفر بیان کرنے کے دوران میں ہو رہی تھی، اب بھی سامان کھولا نہ تھا، اس کے بعد جب سامان کھولا اور دیکھا کہ ان کی وہ پونجی ہو غلہ کی قیمت میں ادا کر کے آئے تھے وہ بھی سامان کے اندر موجود ہے تو اس وقت انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ کام سہرا نہیں ہوا بلکہ قصداً ہماری پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اسی لئے رُدَّتْ إِلَيْنَا کہا، یعنی یہ پونجی ہمیں واپس کر دی گئی ہے، اور پھر والد منترم سے عرض کیا مَا نَبْغِي یعنی ہمیں اور کیا چاہئے کہ غلہ بھی آگیا اور اس کی قیمت بھی واپس آئی گئی، اب تو ہمیں ضرور دوبارہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر اطمینان سے جانا چاہئے، کیونکہ اس معاملہ سے معلوم ہوا کہ عزیز مصر ہم پر بہت مہربان ہے، اس لئے کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم اپنے خاندان کے لئے غلہ لائیں اور بھائی کو بھی حفاظت سے رکھیں، اور بھائی کے حصہ کا غلہ مزید مل جائے، کیونکہ ہم جو کچھ لئے ہیں یہ تو ہمارے اخراجات کے مقابلہ میں بہت کم ہے، چند روز میں ختم ہو جائے گا۔

برادرانِ یوسف نے جو یہ جملہ مانتے تھے کہ اس کا ایک مہموم تو وہی ہے جو ابھی بتلایا گیا کہ ہمیں اس سے زیادہ کیا چاہئے، اور اس جملہ میں حرف م کو نفی کے معنی میں لیا جائے تو یہ مہموم بھی ہو سکتا ہے کہ اولاد یعقوب علیہ السلام نے اپنے والد سے عرض کیا کہ اب تو ہمارے پاس غلہ لانے کے لئے قیمت موجود ہے ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے، آپ صرف بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔
 والد فرم نے یہ سب باتیں سن کر جواب دیا، لَنْ اُرْسِلَکُمْ مَعًا حَتّٰی تَوْتُوا مَوْتَہُمْ اِنَّکُمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْ اٰیٰتِیْ ہِیَہُ، یعنی میں بنیامین کو تمہارے ساتھ اس وقت تک بھیجوں گا جب تک تم اللہ تعالیٰ کی قسم اور یہ عہد و پیمان مجھے نہ دیدو کہ تم اس کو ضرور اپنیساتھ واپس لاؤ گے۔ مگر چونکہ حقیقت میں نظاروں سے یہ بات کسی وقت غائب نہیں ہوتی کہ انسان بچہ پر ظاہری قوت و قدرت کتنی ہی رکھتا ہو پھر بھی برجز میں مجبور اور قدرت حق جل شانہ کے سامنے عاجز ہو وہ کسی شخص کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کا عہد و پیمان ہی کیا کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اس کے مکمل قدرت نہیں رکھتا، اس لئے اس عہد و پیمان کے ساتھ ایک ہتھیار بھی لگا دیا، اِلَّا اَنْ یَّحَاطَ بِکُمْ، یعنی بجز اس صورت کے کہ تم سب کسی گہرے میں آ جاؤ، امام تفسیر مجاہد نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ، اور قتادہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تم بالکل عاجز اور مغلوب ہو جاؤ۔

فَلَمَّا اتُّوۡا مَوْتَہُمْ قَالَ اللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُولُ وَکَیۡلٌ، یعنی جب صابراؤں نے منظر بہ طریقہ پر عہد و پیمان کر لیا، یعنی سب نے قسمیں کھائیں اور والد کو اطمینان دلانے کیلئے بڑی شدت سے حلف کئے، تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بنیامین کی حفاظت کے لئے تم سب دینے اور حلف اٹھانے کا جو کام ہم کر رہے ہیں اس سب معاملہ کا بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہے اس کی توفیق سے کوئی کسی کی حفاظت کر سکتا ہے، اور اپنے عہد کو پورا کر سکتا ہے، ورنہ انسان بے بس ہے، اس کے ذاتی قبضہ قدرت میں کچھ نہیں۔

مذکورہ آیات میں انسان کے لئے بہت سی ہدایات اور احکام ہدایات و مسائل ہیں ان کو یاد رکھئے،

اولاد سے گناہ بظاہر جاتے	پہلی ہدایت: برادرانِ یوسف علیہ السلام سے جو ظالم اس سے پہلے سرزد ہوئی وہ بہت سے کبیروں اور شدید گناہوں پر مشتمل تھی،
تو قطع تعلق کے جواب انکی	مشق اول: جھوٹ ہوان کر والد کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ یوسف
اصلاح کی مشورہ کرنا چاہئے	علیہ السلام کو ان کے ساتھ تفریق کے لئے بھیج دیں، دوسرے والد سے عہد کر کے اس کی خدمت و رزی، تیسرے چھوٹے حسین بنی سے بے رحمی اور شدت کا براؤ، چوتھے ضعیف

والد کی انتہائی دل آزاری کی پروا نہ کرنا، پانچویں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانا
چھٹے ایک آزاد انسان کو جبراً اور ظلماً فروخت کر دینا۔

یہ ایسے انتہائی اور شدید جرائم تھے کہ جب یعقوب علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ انہوں
نے جھوٹ بولا ہے اور دیدہ و دانستہ یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا ہے تو اس کا مقتضی انظار
یہ تھا کہ وہ ان صاحبزادوں سے قطع تعلق کر لیتے، یا ان کو نکال دیتے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام
نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بدستور والد کی خدمت میں رہی یہاں تک کہ انہیں کو مصر سے غلہ لانے
کے لئے بھیجا، اور اس پر مزید یہ کہ دوبارہ پھر ان کو چھوٹے بھائی کے متعلق والد سے عرض سرون
کرنے کا موقع ملا اور بالآخر ان کی بات مان کر چھوٹے صاحبزادہ کو بھی اُن کے حوالہ کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد سے کوئی گناہ و خطا سرزد ہو جائے تو باپ کو چاہیے کہ تربیت
کے ان کی اصلاح کی فکر کرے، اور جب تک اصلاح کی امید ہو قطع تعلق نہ کرے، جیسا کہ
حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، اور بالآخر وہ سب اپنی خطاؤں پر نادم اور
گناہوں سے تائب ہوئے، ہاں اگر اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور ان کے ساتھ تعلق قائم
رکھنے میں دوسروں کے دین کا ضرر محسوس ہو تو پھر قطع تعلق کر لینا انسب ہے۔

دوسری ہدایت: اس حسن معاملہ اور حسن خلق کی ہے جو یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام
سے ظاہر ہوا، کہ صاحبزادوں کے اتنے شدید جرائم کے باوجود ان کا معاملہ ایسا رہا کہ دوبارہ چھوٹے
بھائی کو ساتھ لے جانے کی درخواست کرنے کی جرأت کر سکے۔

تیسری ہدایت یہ بھی ہو کہ ایسی صورت میں بغرض اصلاح خطا کار کو جتلا دینا بھی
مناسب ہو کہ محتالے معاملہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہاری بات نہ مانی جاتی، مگر ہم اس سے درگزر کرتے
ہیں، تاکہ وہ آئندہ شرمندہ ہو کر اس سے کلی طور پر تائب ہو جائے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے
اول جتلا یا، کہ کیا بنیائیں کے معاملہ میں بھی تم پر ایسا ہی اطمینان کیوں جیسا یوسفؑ کے معاملہ
میں کیا تھا، مگر جتلانے کے بعد غالب احوال سے ان کا تائب ہونا معلوم کر کے اللہ پر توکل
کیا، اور چھوٹے صاحبزادے کو ان کے حوالہ کر دیا۔

چوتھی ہدایت یہ ہو کہ کسی انسان کے وعدہ اور حفاظت پر حقیقی طور سے بھروسہ
کرنا غلطی ہے، اصل بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیے، وہی حقیقی کارساز اور مہربان سبب
ہیں، اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے، اسی لئے یعقوب
علیہ السلام نے فرمایا **فَاِنَّ اللَّهَ مُخَيِّرٌ حَفِظًا**۔

کعب احبار کا قول ہے کہ اس مرتبہ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صرف اولاد کے

کہنے پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قسم ہو میری عزت و جلال کی کہ اب میں آپ کے دونوں بیٹوں کو آپ کے پاس واپس بھیجوں گا۔

سوال مسئلہ اس میں یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص کا مال یا کوئی چیز اپنے سامان میں نکلے اور قرآن قویہ اس پر شاہد ہوں کہ اس نے بالقصد یہیں دینے ہی کے لئے ہمارے سامان میں باندھ دیا ہے، تو اس کو اپنے لئے رکھنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے، جیسے یہ پونجی جو برادرانِ یوسف کے سامان سے برآمد ہوئی، اور قرآن قویہ اس پر شاہد تھے کہ کسی بھول یا لسیان سے ایسا نہیں ہوا بلکہ قصداً اس کو واپس دیدیا گیا ہے، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس رستم کی واپسی کی ہدایت نہیں فرمائی، لیکن جہاں یہ اشتباہ موجود ہو کہ شاید بھولے سے ہمارے پاس آگئی وہاں مالک سے تحقیق اور دریافت کئے بغیر اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

چھٹا مسئلہ اس میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہئے جس کا پورا کرنا بالکل اس کے قبضہ میں نہ ہو، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح سالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنیٰ کر دیا کہ یہ بالکل عاجز و مجبور ہو جائیں یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائیں۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرامؓ سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگا دی، یعنی جہاں تک ہماری قدرت و استطاعت میں داخل ہے ہم آپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

سوال مسئلہ اس میں یہ ہے کہ برادرانِ یوسف سے عہد و پیمان لینا کہ وہ بنیامین کو واپس لائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفالت بنفس جائز ہے، یعنی کسی مقدمہ میں ماخوذ انسان کو مقدمہ کی تاریخ پر حاضر کرنے کی ضمانت کر لینا درست ہے۔

اس مسئلہ میں اہم مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے، وہ صرف مالی ضمانت کو جائز رکھتے ہیں، نفس انسانی کی ضمانت کو جائز نہیں رکھتے۔

وَقَالَ يَبْنَى لَا تَدْخُلُوا مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَاَدْخُلُوا مِن

اور کہائے بیٹوں! نہ داخل ہونا ایک دروازے سے اور داخل ہونا کئی دروازوں

أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَا أَغْنَىٰ عَنْكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ

سے بھڑا جدا، اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے،

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر بھروسہ کرو اور اسی پر بھروسہ چاہئے۔ بھروسہ

الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٦٨﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ

کرنے والوں کو ، اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے

مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ

کچھ نہیں بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے نہ تو ایک غواہش تھی یعقوب کے

يَعْقُوبَ قَضَاهُ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِن أَكْثَرِ

جی میں سوچوری کر چکا ، اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے سکھایا اس کو لیکن بہت لوگوں کو

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٩﴾ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَى

خبر نہیں ، اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس

إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا

رکھا اپنے بھائی کو کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے

يَعْبَثُونَ ﴿٧٠﴾

جو انھوں نے کئے ہیں۔

حُلاصہ تفسیر

اور رچلتے وقت (یعقوب علیہ السلام) نے (ان سے) فرمایا کہ اے میرے بیٹو !

رجب مصر میں پہنچو تو سب کے سب ایک ہی دروازہ سے مت جانا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں

سے جانا اور (یہ فصل ایک تدبیر ظاہری ہے بعض مکروہات مثل نظر بد وغیرہ سے بچنے کی باقی)

خدا کے حکم کو تم پر سے میں ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا (چلتا) ہے (باد جو اس تدبیر

ظاہری کے دل سے) اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ

رکھنا چاہئے، (یعنی تم بھی اسی پر بھروسہ رکھنا تدبیر پر نظر مت کرنا، غرض سب رخصت ہو کر

چلے) اور جب مصر پہنچ کر جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا (اسی طرح شہر کے اندر داخل ہوؤ تو

باپ کا ارمان پورا ہو گیا (باقی) ان کے باپ کو ان سے یہ تدبیر بتلا کر خدا کا حکم ماننا مقصود نہ تھا (تاکہ ان پر کسی قسم کا غم نہ پڑے)

اس تدبیر کے نافع نہ ہونے پر شبہ لازم آئے چنانچہ خود انھوں نے ہی فرمایا تھا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ إِنِّي لَكِن يَعْقُوبَ (علیہ السلام) کے جی میں

(درجہ تدبیر میں) ایک ارباب (آبا) تھا جسکو انھوں نے ظاہر کر دیا اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے با ایں وجہ کہ ہم نے انکو علم دیا تھا اور وہ علم کے خلاف تدبیر کو اعتقاد موثر حقیقی کب سمجھ سکتے تھے، صرف ان کے اس قول کی وجہ وہی علم ایک تدبیر کا ارتکاب تھا جو کہ مشروع و محمود ہے، لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے (بلکہ جہل سے تدبیر کو موثر حقیقی اعتقاد کر لیتے ہیں) اور جب یہ لوگ (یعنی برادران یوسف) یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے اور بنیامین کو پیش کر کے کہا کہ ہم آپ کے حکم کے موافق ان کو لائے ہیں انھوں نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا اور تہناتی میں ان سے کہا کہ میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں سو یہ لوگ جو کچھ (بدسلوکی) کرتے رہے ہیں اس کا رنج مت کرنا کیونکہ اب تو اللہ نے ہم کو ملا دیا اب سب غم بھلا دینا چاہئے، یوسف علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی تو ظاہر اور مشہور ہے، رہا بنیامین کے ساتھ، سو یا تو ان کو بھی کچھ تکلیف دی ہو، ورنہ یوسف علیہ السلام کی جبرکی کیا ان کے حق میں کچھ کم تکلیف تھی، پھر دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ بنیامین یوسف علیہ السلام کے پاس رہیں کیونکہ یہ رہیں تو اور بھائیوں کا بوجہ عہد سوگند کے اصرار ہو گا نا ہی جھگڑا ہو گا، اور پھر اگر وجہ بھی ظاہر ہو گئی تو راز کھلا، اور اگر مخفی رہی تو ایجاب علیہ السلام کا بیچ بڑھے گا، کہ بلا سبب کیوں رکھے گئے، یا کیوں رہی، یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تدبیر تو ہے مگر ذرا تمھاری بدنامی ہے، بنیامین نے کہا کچھ پرداہ نہیں، غرض ان میں یہ امر قرار پا گیا، اور ادھر سب کو غلہ دے کر ان کی رخصت کا سامان درست کیا گیا: ۶۹

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں برادران کا یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دوسری مرتبہ سفر مصر کا ذکر ہے، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت یہ فرمائی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جا رہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازہ سے سب داخل نہ ہونا، بلکہ شہر سپاہ کے پاس پہنچ کر متفرق ہو جانا اور شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

سبب اس وصیت کا یہ اندیشہ تھا کہ یہ سب نوجوان اور ماشاء اللہ صحت مند قادر و صاحب جمال و صاحب وجاہت ہیں، ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بد نظر کی نظر لگ جائے، جس سے ان کو کوئی تکلیف پہنچے، یا اجتماعی طور سے داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، اور تکلیف پہنچائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی، اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ تھا، مگر پہلے ہی سفر میں ملک مصر نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا، جس سے عام ارکان دولت اور شہر کے لوگوں میں تعارف ہو گیا، تو اب یہ خطرہ قوی ہو گیا کہ کسی کی نظر لگ جائے، یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا۔

نظر بد کا اثر حق ہے | اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی نظر لگ جانا اور اس سے کسی دوسرے انسان یا جانور وغیرہ کو تکلیف ہو جانا یا نقصان پہنچ جانا حق ہے، محض جابہلانہ وہم و خیال نہیں، اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی فکر ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصدیق فرمائی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نظر بد ایک انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی، اور اُمت کو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے، ان میں من کلّ عین لا غنّہ بھی مذکور ہے، یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظر بد سے (قرطبی)۔

صحابہ کرام میں سہل بن خنیف کا واقعہ معروف ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر غسل کرنے کے لئے کپڑے اتارے تو ان کے سفید رنگ تندرست بدن پر عامر بن ربیعہ کی نظر پڑ گئی، اور ان کی زبان سے نکلا کہ میں نے تو آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا، یہ کہنا تھا کہ فوراً سہل بن خنیف کو سخت بخار چڑھ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ علاج تجویز کیا کہ عامر بن ربیعہ کو حکم دیا کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں، یہ پانی سہل بن خنیف کے بدن پر ڈالا جائے، ایسا ہی کیا گیا، تو فوراً بخار اتر گیا، اور وہ بالکل تندرست ہو کر جس مہم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے اس پر روانہ ہو گئے، اس واقعہ میں آپ نے عامر بن ربیعہ کو یہ تنبیہ بھی فرمائی:

علام یقتل احدکم انھا	کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل
الّا بترکت انّ العین حقّ	کرتا ہی، ہم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب

ان کا بدن تمہیں خوب نظر آیا تو برکت کی دعا کر لیتے، نظر کا اثر ہو جانا حق ہے،

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی دوسرے کی جان و مال میں کوئی اچھی بات تعجب انگیز نظر آئے تو اس کو چاہئے کہ اس کے واسطے یہ دعا کرے کہ

اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماویں، بعض روایات میں ہے کہ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہ اس سے نظر بد کا اثر جاتا رہتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی نظر بد کسی کو لگ جائے تو نظر لگانے والے کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ کا غسل اس کے بدن پر ڈالنا نظر بد کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

قرطبی نے فرمایا کہ تمام علماء امت اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نظر بد لگ جانا اور اس سے نقصان پہنچ جانا حق ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک طرف تو نظر بد یا حسد کے اندیشہ سے اولاد کو یہ وصیت فرمائی کہ سب مل کر ایک دروازہ سے شہر میں داخل نہ ہوں، دوسری طرف ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھا جس سے غفلت کی بنا پر ایسے معاملات میں بہت سے عوام جاہلانہ خیالات و ادہام کے شکار ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ نظر بد کی تاثیر کسی انسان کے جان و مال میں ایک قسم کا سمرنیزم ہے، اور وہ ایسا ہی ہے جیسے مضر دوا یا غذا انسان کو بیمار کر دیتی ہے، گرمی، سردی کی شدت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح نظر بد یا سمرنیزم کے تصرفات بھی انہی سبب عادیہ میں سے ہیں کہ نظر یا خیال کی قوت سے اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں، ان میں خود کوئی تاثیر حقیقی نہیں ہوتی، بلکہ سب سبب عالم حق جل شانہ کی قدرت کاملہ اور مشیت و ارادہ کے تابع ہیں، تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی مفید تدبیر مفید ہو سکتی ہے، نہ مضر تدبیر کی مضرت اثر انداز ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا:

وَمَا أَغْنَىٰ عَنْكَ مِثْرُكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَتَوَكَّلْ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ جَعَلْنَا لَكُمُ الشَّيْءَ وَمَا تَدْبِيرُكَ لِلنَّاسِ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ
میں جانتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کو نہیں ٹال سکتی، حکم تو صرف اللہ ہی کا چلتا ہے، البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے، اس لئے یہ وصیت کی گئی، مگر میرا بھروسہ اس تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ ہی پر اعتماد ہے اور ہر شخص کو یہی لازم ہے کہ اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرے، ظاہری اور مادی تدبیروں پر بھروسہ نہ کرے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا، اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کر لینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہو گئیں، اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا، جس کے نتیجے میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا، ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر کا

ہو گئی، اگرچہ نظر بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی، کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، مگر بتقدیر الہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کر سکے، مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا، اور بڑی عافیت و عروت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

اسی مضمون کا بیان اس کے بعد کی آیت میں اس طرح آیا کہ صاحبزادوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی، شہر کے متفرق دروازوں سے مصر میں داخل ہوئے، تو باپ کا ارمان پورا ہو گیا، ان کی یہ تدبیر اللہ کے کسی حکم کو ٹال نہ سکتی تھی، مگر یعقوب علیہ السلام کی پدرانہ شفقت و محبت کا تقاضا تھا جو انھوں نے پورا کر لیا۔

اس آیت کے آخر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے
وَإِنَّكَ لَنَازِلٌ عَلَيْنَا مَعَلَّمٌ وَلَئِكَ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ، یعنی یعقوب علیہ السلام بڑے علم والے تھے، کیونکہ ان کو ہم نے علم دیا تھا، مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں کی طرح ان کا علم کتابی اور اکتسابی نہیں بلکہ بلا واسطہ عطا و خداوندی اور وہی علم تھا، اسی لئے انھوں نے ظاہری تدبیر جو شرعاً مشروع اور محمود ہو رہی تو کر لی، مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا، مگر بہت لوگ اس بات کی حقیقت کو نہیں جانتے اور نادانیت سے یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ایسے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کہ یہ تدبیریں پیغمبر کی شان کے شایاں نہ تھیں۔ بعض حضرات مغترین نے فرمایا کہ پہلے لفظ علم سے مراد علم کے مقتضی پر عمل کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو علم ان کو عطا کیا وہ اس پر عامل اور اس کے پابند تھے، اسی لئے ظاہری تدبیروں پر بھروسہ نہیں فرمایا، بلکہ اعتماد اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پر فرمایا۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، یعنی جب شہر مصر پہنچنے کے بعد یہ سب بھائی یوسف علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہ وعدہ کے مطابق ان کے حقیقی بھائی کو بھی ساتھ لے آئے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خاص اپنے ساتھ ٹھہرایا، امام تفسیر قتادہؒ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ ددو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا، تو بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کے لئے فرمایا، جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام

نے حقیقی بھائی پر راز فاش کر دیا، اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں، اب تم کوئی فکر نہ کرو، اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

احکام و مسائل | مذکورہ دو آیتوں سے چند مسائل اور احکام معلوم ہوئے:

اول یہ کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا۔

دوسرے یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کے لئے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا

لوگوں سے چھپانا درست ہے۔

تیسرے یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لئے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا تو مکمل اور

شانِ انبیاء کے خلاف نہیں۔

چوتھے یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارہ میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہو کہ اس کو آگاہ کر دے، اور اندیشہ سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلا دے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا۔

پانچویں یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظر بد لگ جائے گی تو اس پر واجب ہو کہ اس کو دیکھ کر باریک بینی سے دیکھ کر کہہ لے، تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

چھٹے یہ کہ نظر بد سے بچنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنا جائز ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہو کہ کسی دعاء اور تعویذ وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دو لڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویذ وغیرہ کے ذریعہ ان کا علاج کیا جائے۔

ساتھ تو اس یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ تو اللہ تعالیٰ پر رکھے، مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے، جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس کے اختیار میں ہوں ان کو بردے کا دلانے میں کوتاہی نہ کرے، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہو واناے ردتم نے فرمایا ہے ”بر توکل زانوے اشتر بہ بند“۔

یہی پیغمبرانہ توکل اور سنتِ رسولؐ ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو تو بتلانے کے لئے بھی کوشش اور تاکید کی، اور پھر جب وہ آگے تو ان پر اپنا راز بھی

ظاہر کر دیا، مگر والد محترم کے نہ بلانے کی فکر فرمائی اور نہ ان کو اپنے خیریت سے مطلع کرنے کا کوئی اقدام کیا، اس کی وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے کہ اس پورے چالیس سال کے عرصہ میں بہت سے مواقع تھے کہ والد ماجد کو اپنے حال اور خیریت کی اطلاع دیدیتے، لیکن یہ جو کچھ ہوا وہ حکیم قصار و قدر باشارات وحی ہوا، ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اجازت نہ ملی ہوگی، کہ والد محترم کو حالات سے باخبر کیا جائے، کیونکہ ابھی ان کا ایک اور امتحان بنیامین کی مفارقت کے ذریعہ بھی ہونے والا تھا، اس کی تکمیل ہی کے لئے یہ سب صورتیں پیدا کی گئیں۔

فَلَمَّا جَهَنَّهُمْ بِجَهَنَّمَ جَعَلَ التَّسْقِيَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ

پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب ان کا رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے

ثُمَّ آذَنَ مُوْذِنٌ آيَتَهُمَا الْعِثْرَ انْكُمْ لَسْرِقُونَ ﴿٤٠﴾ قَالُوا وَ

پھر پکارا پکارنے والے نے اسے قافلہ والو تم تو البتہ چور ہو، کہنے لگے مگر

أَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٤١﴾ قَالُوا تَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ

کر کے ان کی طرف تھکادی کیا چیز کم ہو گئی، بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیالہ

وَلَمِنَ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٤٢﴾ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ

اور جو کوئی اس کو لائے اس کوٹ ایک بوہڑ اونٹ کا اندر میں ہوں اس کا ضامن، بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْتُمُ بِالسَّفِيدِ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿٤٣﴾

تم کو معلوم ہو ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے مگر میں اور نہ ہم کبھی چورتے،

قَالُوا أَفَمَا جَزَاءُ مَا كُنْتُمْ كَذِبِينَ ﴿٤٤﴾ قَالُوا جَزَاءُ مَا

بولے یہ کیا سزا ہے اس کی اگر تم نکلے جھوٹے، کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے

مَنْ وَجَدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاءُ مَا كُنَّا لَكَ تَجَرِي

کہ جس کے اسباب میں سے اتنے آئے وہی اس کے بدلے میں جائے، ہم یہی سزا دیتے ہیں

الظَّالِمِينَ ﴿٤٥﴾ قَبْلَ آيَاتِ رَبِّهِمْ قَبْلَ وَعَاؤِ أَخِيهِ ثُمَّ

ظالموں کو، پھر شروع کی یوسف نے انکی خرجیاں دیکھنی اپنے بھائی کی خرجی سے پہلے آخر کو وہ

اسْتَخْرَجَهَا مِنْ رَحْلِهِ أَخِيهِ ط كُنَّا لَكَ نَالِیْوُ سَعَطَ

برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے، یوں داتا بتایا ہم نے یوسف کو،

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے، مگر جو چاہے اللہ

تَرَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ نَّشَأِهِ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ ۝۷۶

ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جانتے والا۔

خلاصہ تفسیر

پھر جب یوسف (علیہ السلام) نے ان کا سامان (غلہ اور روانگی کا) تیار کر دیا تو (خود یا کسی معتد کی معرفت) پانی پینے کا برتن (کہ وہی پیانا غلہ دینے کا بھی تھا) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا پھر جب یہ لاد پھاند کر چلے تو یوسف (علیہ السلام) کے حکم سے پیچھے سے ایک بچالنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم ضرور چور ہو وہ ان (تلاش کرنے والوں) کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے (جس کی چوری کا ہم پر شبہ ہوا) انھوں نے کہا کہ ہمکو بادشاہی پیانا نہیں ملتا (وہ غائب ہوا) اور جو شخص اس کو (لا کر) حاضر کرے اس کو ایک بار شتر غلہ (بطور انعام کے خزانہ سے) ملے گا اور یا یہ مطلب ہو کہ اگر خود چور بھی مال دیکھ تو عفو کے بعد انعام پائے گا) اور میں اس (کے دلوانے) کا ذمہ دار ہوں (غالباً یہ ندا اور یہ وعدہ انعام بحکم یوسف (علیہ السلام) ہوگا) یہ لوگ کہنے لگے کہ بخدا تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم ملک میں فساد پھیلانے (جس میں چوری بھی داخل ہے) نہیں آتے اور ہم لوگ چوری کرنے والے نہیں (یعنی ہمارا یہ شیوہ نہیں ہے) ان (ڈھونڈنے والے) لوگوں نے کہا اچھا اگر تم جھوٹے نکلے (اور تم میں سے کسی پر سرقہ ثابت ہو گیا) تو اس (چور) کی کیا سزا ہو انھوں نے (موافق شریعت یعقوب علیہ السلام کے) جواب دیا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی اپنی سزا ہے (یعنی چوری کی عوض میں خود اس کی ذرا کو صاحب مال اپنا غلام بنالے) ہم لوگ ظالموں (یعنی چوروں) کو ایسی سزا دیا کرتے ہیں (یعنی ہماری شریعت میں یہی مسئلہ اور عمل ہے) غرض یہ امور باہم ٹھہرنے کے بعد اسباب اتر دیا گیا (پھر تلاشی کے وقت) یوسف (علیہ السلام) نے (خود یا کسی معتد کی معرفت) اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے قبل تلاشی کی ابتدا یا اول دوسرے بھائیوں کے (اسباب کے) تھیلوں سے کی پھر (انیس میں) اس (برتن) کو اپنے بھائی کے (اسباب کے) تھیلے سے برآمد کیا، ہم نے یوسف (علیہ السلام) کی خاطر سے اس طرح (بنیائین کے رکھنے کی) تدبیر فرمائی (وجہ اس تدبیر کی یہ ہوتی کہ) یوسف اپنے بھائی کو اس بادشاہ (مصر)

کے قانون کی رو سے نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اس کے قانون میں کچھ نادیدہ و جرم نامہ تھا (ردی النظرانی عن متمر والاول فی روح المعانی) مگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو منظور تھا اس لئے یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ تدبیر آئی، اور ان لوگوں کے غم سے یہ فتویٰ نکلا، اور اس مجموعہ سے تدبیر راست آگئی اور چونکہ یہ حقیقت غلام بنانا نہ تھا بلکہ بنیامین کی خوشی سے صورت غلامی کی اختیار کی تھی، اس لئے استرقاق محرک مشبہ لازم نہیں آیا، اور گو یوسف علیہ السلام بڑے عالم و قیل تھے، مگر کچھ بھی ہماری تدبیر سکھانے کے محتاج تھے، بلکہ ہم جسکو چاہتے ہیں (علم میں) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں، اور تمام علم و اول سے بڑھ کر ایک بڑا علم والا ہے، (یعنی اللہ تعالیٰ) جب مخلوق کا علم ناقص ٹھہرا اور علم خالق کا مل کو لا محالہ ہر مخلوق اپنے علم میں اور تدبیر میں محتاج ہوگی خالق کی، اس لئے کہنا اور الا ان یشاء اللہ کہا گیا، جس میں یہ کہ جب اُن کے اسباب کے وہ برتن برآمد ہو گیا اور بنیامین روک لئے گئے تو وہ سب بڑے شرمندہ ہوئے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کے لئے یہ حیلہ اور تدبیر اختیار کی کہ جب سب بھائیوں کو قاعد کے موافق غلہ دیا گیا تو ہر بھائی کا غلہ ایک مستقل اونٹ پر علیحدہ علیحدہ نام بنام بار کیا گیا۔ بنیامین کے لئے جو غلہ اونٹ پر لاد گیا اس میں ایک برتن چھپا دیا گیا، اس برتن کو قرآن کریم نے ایک جگہ بلفظ سقایہ اور دوسری جگہ صواع المذکب کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، سقایہ کے معنی پانی پینے کا برتن اور صواع بھی اسی طرح کے برتن کو کہتے ہیں، اس کو ملک کی طرف منسوب کرنے سے اتنی بات اور معلوم ہوئی کہ یہ برتن کوئی خاص قیمت اور حیثیت رکھتا تھا، بعض روایات میں ہے کہ زہر جگہ بنا ہوا تھا، بعض نے سونے کا بعض نے چاندی کا بتلایا ہے، بہر حال یہ برتن جو بنیامین کے سامان میں چھپا دیا گیا تھا خاصہ قیمتی برتن ہونے کے علاوہ ملک مصر سے کوئی اختصاص بھی رکھتا تھا، خواہ یہ کہ وہ خود اس کو استعمال کرتے تھے یا یہ کہ ملک نے بامر خود اس برتن کو غلہ ناپنے کا پیمانہ بنا دیا تھا۔

ثُمَّ أَذِنَ مُؤَدِّنَ أَيُّهَا الْعَبْدُ أَنْ تَكُونَ كَسِيرَ قَوْلِكَ، یعنی کچھ دیر کے بعد ایک منادی

کرنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو۔

یہاں لفظ شتم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منادی فوراً ہی نہیں کی گئی، بلکہ کچھ مہلت دی گئی

یہاں تک کہ قافلہ روانہ ہو گیا، اس کے بعد یہ منادی کی گئی تاکہ کسی کو جلسہ سازی کا شبہ نہ ہو جائے

بہر حال اس منادی کرنے والے نے برادرانِ یوسف کے قافلہ کو چور قرار دے دیا۔

قَالُوا اِذَا قُبِلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ، یعنی برادرانِ یوسف منادی کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تم ہمیں چور بنا رہے ہو، یہ تو کہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟
قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ التَّمْلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ قَدْ آتَانَا بِهِ زَعِيمٌ، ”منادی کرنے والوں نے کہا بادشاہ کا صواع یعنی برتن گم ہو گیا ہے اور جو شخص اس کو کہیں سے برآمد کرے گا اس کو ایک اونٹ بھرغلہ انعام میں ملے گا، اور میں اس کا ذمہ دار ہوں“

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کا یہ حیلہ بھی کیوں کیا، جبکہ ان کو معلوم تھا کہ والد ماجد پر خود ان کی مفارقت کا صدمہ ناقابلِ برداشت تھا، اب دوسرے بھائی کو روک کر ان کو دوسرا صدمہ دینا کیسے گوارا کیا؟
دوسرا سوال اس سے زیادہ اہم یہ ہو کہ بے گناہ بھائیوں پر چوری کا الزام لگانا اور اس کے لئے یہ مجلسِ سازی کہ ان کے سامان میں خفیہ طور سے کوئی چیز رکھ دی، اور پھر علانیہ ان کی رسوائی ظاہر ہو، یہ سب کام ناجائز ہیں، اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام نے ان کو کیسے گوارا کیا؟

بعض مفسرین قرطبی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ جب بنیامین نے یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور وہ مطمئن ہو گئے، تو بھائی سے یہ درخواست کی کہ اب آپ مجھے ان بھائیوں کے ساتھ واپس نہ بھیجئے، مجھے اپنے پاس رکھئے، یوسف علیہ السلام نے اول یہی عذر کیا، کہ اگر تم یہاں رک گئے تو والد کو صدمہ شدید ہوگا، دوسرے تمہیں اپنے پاس روکنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ میں تم پر چوری کا الزام لگاؤں، اور اس الزام میں گرفتار کر کے اپنے پاس رکھ لوں، بنیامین ان بھائیوں کی معاشرت سے کچھ ایسے دل تنگ تھے کہ ان سب باتوں کے لئے تیار ہو گئے۔

لیکن یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو والد کی دل آزاری اور سب بھائیوں کی رسوائی اور ان کو چور کہنا صرف بنیامین کے راضی ہو جانے سے تو جائز نہیں ہو سکتا، اور بعض حضرات کی یہ توجیہ کہ منادی کا ان کو چور کہنا یوسف علیہ السلام کے علم و اجازت سے نہ ہوگا، ایک بے دلیل دعویٰ اور صورتِ واقعہ کے لحاظ سے بے جوڑ بات ہے، اسی طرح یہ تاویل کہ ان بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو والد سے چرایا اور فروخت کیا تھا اس لئے ان کو چور کہا گیا، یہ بھی ایک تاویل ہے، اس لئے ان سب سوالوں کا صحیح جواب وہی ہے جو قرطبی اور مظہری وغیرہ نے دیا ہے، کہ اس واقعہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے وہ نہ بنیامین کی خواہش کا نتیجہ تھا،

کَذٰلِكَ يَكُوْنُ مَثَلٌ لِّمَنْ كَفَرَ بَعْدَ اٰمَانٍ مِّنْ دِيْنِهِۦٓ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ
 اللّٰهُ۔ یعنی اس طرح ہم نے توبہ کی یوسف کے لئے، وہ اپنے بھائی کو شاہ مصر کے قانون کے
 ماتحت گرفتار نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ مصر کا قانون چور کے متعلق یہ تھا کہ چور کو مار پیٹ کی سزا دی جائے
 اور مال مسروقہ سے دو گنی قیمت وصول کر کے چھڑ دیا جائے، مگر انہوں نے یہاں برادرانِ یوسف ہی سے چور
 کا حکم شریعتِ ایتھوپیا کے مطابق دریافت کر لیا تھا، اس کی رو سے بنیامین کو اپنے پاس روک لیا
 صحیح ہو گیا، اس طرح اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت سے یوسف علیہ السلام کی یہ مراد بھی پوری ہو گئی
 نَزَّلْنَاهُ مِنْ رَّحْمَتِنَا وَلَقَدْ كَلَّمْنَا ذٰلِكَ عَلَيْهِ عَلَيْنَا ۖ ”یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں
 درجات بلند کر دیتے ہیں، جیسا اس واقعہ میں یوسف علیہ السلام کے درجات ان کے بھائیوں
 کے مقابلہ میں بلند کر دیئے گئے، اور ہر علم والے کے اوپر اس سے زیادہ علم والا موجود ہے،“
 مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں ہم نے علم کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے،
 بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص
 ایسا ہو کہ پوری مخلوقات میں کوئی اس سے زیادہ علم نہیں رکھتا تو پھر رب العزت جل شانہ
 کا علم تو سبک بالا تر ہے ہی۔

آیات مذکورہ سے چند احکام و مسائل حاصل ہوئے:

احکام و مسائل

اوّل: آیۃ وَلَقَدْ كَلَّمْنَا ذٰلِكَ عَلَيْهِ عَلَيْنَا سے ثابت ہوا کہ کسی مین
 کام کے کرنے پر کوئی اجرت یا انعام مقرر کر کے اعلان عام کر دینا کہ جو شخص یہ کام کرے گا اس کو اس قدر
 انعام یا اجرت ملے گی، جیسے شہزادی بزموں کے گرفتار کرنے پر یا گمشدہ چیزوں کی واپسی پر اس طرح
 کے انعامی اعلانات کا نام طور پر رواج ہے، اگرچہ اس صورتِ معاملہ پر فقہی اجارہ کی تعریف صادق
 نہیں آتی، مگر اس آیت کی رو سے اس کا بھی جواز ثابت ہو گیا (قرطبی)

دوسرے: آئۃ نَزَّلْنَاهُ مِنْ رَّحْمَتِنَا سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے
 حق مالی کا ضامن بن سکتا ہے، اور اس صورت کا حکم جمہور فقہائے امت کے نزدیک یہ ہے کہ
 صاحب حق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال اصل مدیون سے یا ضامن سے جس سے بھی چاہے وصول
 کر سکتا ہے، ہاں اگر ضامن سے وصول کیا گیا تو ضامن کو حق ہو گا کہ جس قدر مال اس سے لیا گیا
 وہ اصل مدیون سے وصول کرے (قرطبی خلافاً لما لک)

تیسرے: کَذٰلِكَ يَكُوْنُ مَثَلٌ لِّمَنْ كَفَرَ بَعْدَ اٰمَانٍ مِّنْ دِيْنِهِۦ سے معلوم ہوا کہ کسی شرعی مصلحت کی بنا پر معاملہ کی
 صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائیں جس کو فقہاء کی اصطلاح میں
 حیلہ شرعیہ کہا جاتا ہے، یہ شرعاً جائز ہے، بشرط یہ ہے کہ اس سے شرعی احکام کا ابطال لازم

نہ آتا ہو، ورنہ ایسے حیلے باتفاق فقہاء حرام ہیں جیسے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے کوئی حیلہ کرنا یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اس لئے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نکل آئے۔ باتفاق حرام ہے، ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض اقوام پر عذاب الہی آیا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے، اور باتفاق امت حرام ہیں، ان پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ہر گناہ لازم آتا ہے، ایک اصل ناجائز کام کا دوسرے یہ ناجائز حیلہ جو ایک حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ چابازی کا مراد ہے، اسی طرح کے حیلوں کے ناجائز ہونے کو امام بخاری نے کتاب البیہل میں ثابت کیا ہے۔

قَالُوا اِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهِ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاسْتَغَايَا يُوسُفَ

کہنے لگے اگر اس نے چور کیا تو جوڑی کی تھی اس کا ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے تب آہستہ سے کہا یوسف

فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا ۚ وَاللّٰهُ

نے اپنے ہی میں اور ان کو نہ بتایا، کہا ہی میں کہ تم بدتر ہو درجہ میں، اور اللہ

اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ﴿۵۸﴾ قَالُوا اَيُّهَا الْعَزِيزُ اِنَّ لَكَ اَبًا شَيْخًا

غوب جانتا ہی ہو تم بیان کرتے ہو، کہنے لگے اے عزیز اس کا ایک باپ ہے بہت بوڑھا

كَبِيرًا فَخُذْ اَحَدًا مِّنْ مَّكَانَهِ ۚ اِنَّا نُرِيكَ مِنَ الْمُنْشِينَ ﴿۵۹﴾

بڑی عمر کا، سو رکھ لے ایک کو ہم میں سے اس کی جگہ، ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنے والا،

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّأْخُذَ اِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعًا عِنْدَ كٰلَا

بولو اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پھڑپھڑیں مگر جس کے پاس پانی ہم نے اپنی چیز

اِنَّا اِذَا الظَّالِمُوْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۚ

تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوتے، پھر جب نالامید ہوئے اس سے ایلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو،

قَالَ كَبِيرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا

بولو ان میں کا بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے تم سے عہد

مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرِطْنَا فِيْ يُّوسُفَ ۚ فَسَنَ اُبْرَحَ

اللہ کا اور پہلے جو تصور کر چکے ہو یوسف کے حق میں سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا

اَلْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذُنَ لِيْ اَبْنٰى اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ

اس ملک جب تک کہ حکم دے مجھ کو میرا باپ یا قضیہ پکا دے اللہ میری طرف اور وہ سب بہتر

الْحَكِيمِينَ ۝۸۰ اِرجِعُوا اِلٰی اٰبِیْکُمْ فَقُولُوْا اِیَّا بَا نَا اِنْ اَبْتَکَ

چکانے والا ، پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے تو

سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَا اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا کُنَّا لِلْغَیْبِ حَافِظِیْنَ ۝۸۱

چوری کی ، اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور ہم کو غیب کی بات کا وحشیان نہ تھا

وَسَّأَلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ کُنَّا فِیْہَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْ اَقْبَلْنَا فِیْہَا

اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں ،

وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۸۲

اور ہم بیشک سچ کہتے ہیں ۔

حکایت تفسیر

کہنے لگے کہ (صاحب) اگر اس نے چوری کی تو (تجربہ نہیں کیونکہ) اس کا ایک بھائی
(معاذہ) بھی (اسی طرح) اس کے پہلے چوری کر چکا ہے (جس کا قصہ درمنثور میں اس طرح لکھا
ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ان کی بھینچھی پرورش کرتی تھیں، جب ہوشیار ہوئے تو یعقوب علیہ السلام
نے لینا چاہا، وہ ان کو چاہتی بہت تھیں، انھوں نے ان کو رکھنا چاہا، اس لئے انھوں نے ان کی بکر
میں ایک پٹکا کپڑوں کے اندر باندھ کر منہ پر کر دیا کہ پٹکا گم ہو گیا، اور سب کی تلاشی لی تو ان کی
کمر میں نکلا، اور اس شریعت کے قانون کے موافق ان کو بھینچھی کے قبضہ میں رہنا پڑا، یہاں تک کہ
ان کی بھینچھی نے وفات پائی، پھر یعقوب علیہ السلام کے پاس آگئے، اور ممکن ہو یہ صورت
استرقاق کی بھی یوسفؑ کی رضامندی سے ہوئی ہو، اس لئے یہاں بھی آزاد کا غلام بنانا لازم نہیں آیا اور
ہر چند کہ قرآن و اخلاق یوسفیہ میں ذراتا مل کر نے سے آپ کی برأت اس فعل سے یقیناً معلوم
تھی مگر بنیامین پر جو بھائیوں کو غصہ تھا اس میں یہ بات بھی کہہ دی، پس یوسف (علیہ السلام)
نے اس بات کو (جو آگے آتی ہے) اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اس کو ان کے سامنے (زبان سے)
ظاہر نہیں کیا یعنی (دل میں) یوں کہا کہ اس (چوری کے) درجہ میں تم تو اور بھی زیادہ بڑی
ہو (یعنی ہم دونوں بھائیوں سے تو حقیقت سرقہ صادر نہیں ہوا، اور تم نے تو اتنا بڑا کام
کیا کہ کوئی مال غائب کرنا ہے تم نے آدمی غائب کر دیا، کہ مجھ کو باپ سے بچھڑا دیا، اور ظاہر ہی
کہ آدمی کی چوری مال کی چوری سے زیادہ سخت جرم ہے) اور جو کچھ تم (ہم دونوں بھائیوں

کے متعلق) بیان کر رہے ہو کہ ہم چور ہیں اس (کی حقیقت) کا اللہ ہی کو بخیر معلوم ہے اور ہم چور نہیں ہیں جب بھائیوں نے دیکھا کہ انہوں نے بنیامین کو، خود کر لیا اور اس پر ان میں جھگڑا تو براہِ خوشنادر کہنے لگے اے عزیز اس (بنیامین) کا ایک بہت بڑا صاحبِ پاس ہے اس کی بہت چاہتا ہے اس کے غم میں خدا جانے کیا حال ہو، اور ہم سے اس قدر رغبت نہیں ہے کہ اس کی جگہ سے اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لیجئے، (اور اپنا مملوک بنا لیجئے) یہ آجیہ کیسے دیکھتے ہیں (امیر) کہ اس درخواست کو منظور فرمالیں گے (یوسف علیہ السلام)۔

ابے انصافی کی بات سے خدا بچائے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز لائی ہو اس کے سوا دوسرے شخص کو کچھ کر رکھ لیں (اگر ہم ایسا کریں تو) اس حالت میں تو ہم بڑے بے انصاف بنے جائیں گے (کسی آزاد آدمی کو غلام بنالینا اور غلاموں کا معاملہ کرنا اس کی رضا مندی سے بھی حرام ہے) پھر جب ان کو یوسف (علیہ السلام) سے تو ان کے صاف جواب کے سبب بالکل امید نہ رہی کہ بنیامین کو دیں گے (تو اس جگہ سے) علیحدہ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے (کہ کیا کرنا چاہتے ہیں)۔

یاد کی یہ رائے ہوئی کہ مجبوری ہے سب کو واپس چلنا چاہئے، مگر ان سب میں جو بڑا غم میں ہے کہ اس کے (متم جو سب کے سب واپس چلنے کی صلاح کر رہے ہو تو) کیا تم کو محال ہے کہ تم سے باپ تم سے خدا کی قسم بھلا کر نچا قول لے چکے ہیں کہ تم اس کو اپنے ہمراہ لانا، لیکن اگر نکھ جاؤ تو مجبوری ہو، سو ہم سب کے سب تم کو نہیں کہہ سکتے کہ تم اس کی کوشش نہ رہتی، اس لئے حتی الامکان کچھ تدبیر کرنا چاہئے) اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں کس قدر کوتاہی کر چکے، تو کہ ان کیساتھ جو کچھ برتاؤ ہوا اس باپ کے حقوق بالکل ضائع ہوئے سو وہ پرانی ہی شرمندگی کیا کم ہو جائیگی (فرزند لیکر جائیں) مگر ان میں ملتا نہیں، تا وقتیکہ میرے باپ مجھ کو (حاضری کی) اجازت نہ دیں، یا اللہ رحمہ

اس شکل کو ملحوظ رکھئے اور وہی خوب سلجھانے والا ہے (یعنی کسی تدبیر سے بنیامین چھوٹ جائے غرض میں یا اس کو لے کر جاؤں گا یا بلایا ہوا جاؤں گا، سو مجھ کو تو یہاں چھوڑ دو اور تم واپس اپنے باپ کے پاس جاؤ اور (جا کر ان سے) کہو کہ اے ابا آپ کے صاحبزادے (بنیامین) نے چوری کی (اس لئے گرفتار ہوئے) اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو تم کو (مشاہدہ سے) معلوم ہوا ہے اور ہم (قول و قرار دینے کے وقت) غیب کی باتوں کے تو حافظ تھے نہیں کہ یہ چوری کرے گا، ورنہ ہم کبھی قول نہ دیتے) اور اگر ہمارے کہنے کا یقین نہ ہو تو (اس سبق یعنی مہر والوں سے) کسی اپنے معتمد کی معرفت (پوچھ لیجئے جہاں ہم (اس وقت) موجود تھے، (جب چوری برآمد ہوئی ہے) اور اس قافلہ والوں سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہو کر یہاں آئے ہیں) (معلوم ہوتا ہے اور بھی کنعان کے یا اس پاس کے لوگ غلط لینے گئے ہوں گے) اور یقین جانتے ہم بالکل سچ کہتے ہیں (چنانچہ سب بڑے کو وہاں چھوڑا اور خود آکر سارا ماجرا بیان کیا)۔

معارف و مسائل

ان سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین کے سامان میں ایک شاہی برتن چھپا کر اور پھر ان کے سامان سے تدبیر کے ساتھ برآمد کر کے اُن پر چوری کا جبرم عائد کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ ہے کہ جب برادرانِ یوسف کے سامنے بنیامین کے سامان سے مال مسروقہ برآمد ہو گیا اور پھر اُس سے اُن کی آنکھیں بھٹک گئیں تو جھنجھلا کر کہنے لگے:

اِنْ لَّيْسَ لِي سِرٌّ فَقَدْ سَرَقَ آخَرٌ لِّدُنِي مِنْ قَبْلُ، یعنی اگر اس نے چوری کر لی تو کچھ زیادہ تعجب نہیں اس کا ایک بھائی تھا اُس نے بھی اسی طرح اس سے پہلے چوری کی تھی، مطلب یہ تھا کہ یہ ہمارا حقیقی بھائی نہیں، علاتی ہے، اس کا ایک حقیقی بھائی تھا اس نے بھی چوری کی تھی۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس وقت خود یوسف علیہ السلام پر بھی چوری کا الزام لگا دیا، جس میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بچپن میں پیش آیا تھا، جس میں ٹھیک اسی طرح جیسے یہاں بنیامین پر چوری کا الزام لگانے کی سازش کی گئی ہے، اس وقت یوسف علیہ السلام پر ان کی بے خبری میں ایسی ہی سازش کی گئی تھی، اور یہ سب بھائیوں کو پوری طرح معلوم تھا کہ یوسف علیہ السلام اس الزام سے بالکل بری ہیں، مگر اس وقت بنیامین پر غصہ کی وجہ سے اُس واقعہ کو بھی چوری کا قرار دے کر اس کا الزام ان کے بھائی یوسف پر لگا دیا ہے۔

وہ واقعہ کیا تھا اس میں روایات مختلف ہیں، ابن کثیرؒ نے بحوالہ محمد بن اسحاق مجاہدؒ اہم تفسیر سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بنیامین پیدا ہوئے تو یہ ولادت ہی والدہ کی موت کا سبب بن گئی، یوسفؒ اور بنیامین دونوں بھائی بغیر ماں کے رہ گئے، تو ان کی تربیت و حضانت ان کی پھوپھی کی گود میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بچپن سے ہی کچھ ایسی شان عطا فرمائی تھی کہ جو دیکھتا ان سے بے حد محبت کرنے لگتا تھا، پھوپھی کا بھی یہی حال تھا کہ کسی وقت اُن کو نظروں سے غائب کرنے پر قادر نہ تھیں، دوسری طرف والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا، مگر بہت چھوٹا ہونے کی بنا پر ضرورت اس کی تھی کہ کسی عورت کی نگرانی میں رکھا جائے، اس لئے پھوپھی کے حوالے کر دیا تھا، اب جبکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام کا ارادہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھیں، پھوپھی سے کہا تو انھوں نے عذر کیا، پھر زیادہ اصرار پر مجبور ہو کر یوسف علیہ السلام کو ان کے

والد کے حوالے تو کر دیا مگر ایک تدبیر ان کو واپس لینے کی یہ کر دی کہ بھوپتی کے پاس ایک پٹکا تھا، جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی طرف سے ان کو پہنچا تھا اور اس کی بڑی قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی، یہ پٹکا بھوپتی نے یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے لکر پر باندھ دیا۔

یوسف علیہ السلام کے جانے کے بعد یہ شہرت دی کہ میرا پٹکا چوری ہو گیا، پھر تلاشی لگتی تو وہ یوسف کے پاس نکلا، شریعت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے مطابق اب بھوپتی کو یہ حق ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو اپنا مملوک بنا کر رکھیں، یعقوب علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ شرعی حکم کے اعتبار سے بھوپتی یوسف کی مالک بن گئی، تو ان کے حوالے کر دیا، اور جب تک بھوپتی زندہ رہیں یوسف علیہ السلام انہی کی تربیت میں رہے۔

یہ واقعہ تھا جس میں چوری کا الزام حضرت یوسف علیہ السلام پر لگا، اور پھر ہر شخص پر حقیقت حال روشن ہو گئی، کہ یوسف علیہ السلام چوری کے ادنیٰ شبہ سے بھی بری ہیں، بھوپتی کی نجات نے ان سے یہ سازش کا جال پھیلوایا تھا، بھائیوں کو بھی یہ حقیقت معلوم تھی، اس کی بناء پر کسی طرح زبیا نہ تھا کہ ان کی طرف چوری کو منسوب کرتے، مگر ان کے حق میں بھائیوں کی جو زیادتی اور بے راہ روی اب تک ہوتی چلی آئی تھی یہ بھی اسی کا ایک آخری جز تھا۔

فَاسْتَرْهَقُوا يَوْسُفَ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبَيِّنْ هَذَا لَهُمْ "یعنی یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی یہ بات سن کر اپنے دل میں رکھی کہ یہ لوگ اب تک بھی میرے درپے ہیں کہ چوری کا الزام لگتا رہے ہیں، مگر اس کا اظہار بھائیوں پر نہیں ہونے دیا کہ یوسف علیہ السلام نے ان کی یہ بات سنی ہے اور اس سے کچھ اثر لیا ہے۔

قَالَ أَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا وَاللَّهِ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ، "یوسف علیہ السلام نے اپنے دل میں کہا کہ تم لوگ ہی بُرے درجہ اور بُرے حال میں ہو کہ بھائی پر چوری کی تہمت جان بوجھ کر لگاتے ہو، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جاننے والے ہیں، کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہے یا غلط۔" پہلا جملہ تو دل میں کہا گیا ہے، یہ دوسرا جملہ ممکن ہے کہ بھائیوں کے جواب میں اعلانا کہہ دیا ہو۔

ثُمَّ زَايَا بِهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدًا مَكَانَهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ، بردارانِ یوسف نے جب دیکھا کہ کوئی بات چلتی نہیں اور بنیامین کو یہاں چھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تو عزیز مصر کی خوشامد شروع کی، اور یہ درخواست کی کہ اس کے والد بہت بوڑھے ہیں اور ضعیف ہیں (اس کی مفارقت ان سے برداشت نہ ہوگی)، اس لئے آپ اس کے بدلے میں ہم سے کسی کو گرفتار کر لیں، یہ درخواست آپ سے ہم اس مسد پر

کر رہے ہیں کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بہت احساس کرنے والے ہیں، یا یہ کہ آپ نے اس سے پہلے بھی ہمارے ساتھ احسان کا سلوک فرمایا ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ تَأْخُذَ إِلَّا مِنْ وَجْدٍ نَامَتًا عِنْدَكَ إِنَّا آذَاءُ الظَّالِمِينَ
یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی درخواست کا جواب مضابطہ کے مطابق یہ دیا کہ یہ بات تو ہمارے اختیار میں نہیں کہ جس کو چاہیں پکڑ لیں، بلکہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہوا اگر اس کے سوا کسی دوسرے کو پکڑ لیں تو ہم تمہارے ہی فتوے اور فیصلے کے مطابق ظالم ہو جائیں گے، کیونکہ تم نے ہی یہ کہا ہو کہ جس کے پاس مال مسروقہ برآمد ہو وہ ہی اس کی جزاء ہے۔

فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا، یعنی جب برادرانِ یوسف بنیامین کی رہائی سے مایوس ہو گئے تو باہم مشورہ کے لئے کسی علیحدہ جگہ میں جمع ہو گئے۔

قَالَ كَبِيرُهُمْ هَذَا الَّذِي انْجَىٰ نَفْسَهُ يَوْمَكَ يَكْفُلُكَ اللَّهُ وَالْأُخَرَاءُ مُتَّبِعُونَكَ مِنْ تَحْتِ الْكُرْسِيِّ وَلَا جِئَكَ مِنْ يَدِ أَحَدٍ مِنْهُمْ بَعْضُهُمْ فِي يَدِ آخَرٍ يَوْمَكَ يَخْلَقُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُخْلِقُ مَا يَشَاءُ يَوْمَ تَأْتِي السُّحُبُ بِالْمَاءِ يَوْمَ تَخْرُجُ الْبُحْرَىٰ سَائِجًا يَوْمَ تَخْرُجُ الْبُحْرَىٰ سَائِجًا
تم سے بنیامین کے واپس لانے کا پختہ ہمد لیا تھا، اور یہ کہ تم اس سے پہلے بھی یوسفؑ کے معاملہ میں ایک کوتاہی اور غلطی کر چکے ہو، اس لئے میں تو اب مصر کی زمین کو اس وقت تک نہ چھوڑ دوں گا جب تک میرے والد خود ہی مجھے یہاں سے واپس آنے کا حکم نہ دیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی مجھے یہاں سے نکلنے کا حکم ہو، اور اللہ تعالیٰ ہی بہترین حکم کرنے والے ہیں۔

یہ بڑے بھائی جن کا کلام بیان ہوا ہے بعض نے فرمایا کہ یہودا ہیں، اور اگرچہ عمر میں سب بڑے نہیں مگر علم و فضل میں بڑے تھے، اور بعض مغسیرین نے کہا کہ روبیل ہیں جو عمر میں سب بڑے ہیں، اور یوسف علیہ السلام کے قتل نہ کرنے کا مشورہ انھوں نے ہی دیا تھا، اور بعض نے کہا کہ یہ بڑے بھائی شمعون ہیں جو جابہ و رتبہ کے اعتبار سے سب بھائیوں میں بڑے سمجھے جاتے تھے۔

ارْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ، یعنی بڑے بھائی نے کہا کہ میں تو یہیں رہوں گا، آپ سب لوگ اپنے والد کے پاس واپس جائیں اور ان کو بتلائیں کہ آپ کے صاحبزادہ نے چوری کی، اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنے چشم دید حالات ہیں کہ مال مسروقہ ان کے سامان میں سے ہمارے سامنے برآمد ہوا۔

وَمَا كُنَّا لِنُغَيِّبَ خَفِظَاتِنَ، یعنی ہم نے جو آپ سے عہد کیا تھا کہ ہم بنیامین کو ضرور واپس لائیں گے یہ عہد ظاہری حالات کے اعتبار سے تھا، غیب کا حال تو ہم نہ جانتے تھے کہ یہ راز کس گرفتار اور عیبور ہو جائیں گے، اور اس جملے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی عہد شکنی کی ایک حفاظت کی کہ کوئی ایسا کام ان سے نہ ہو جائے جس کے باعث وہ تکلیف

میں پڑیں، مگر ہماری یہ کوشش ظاہری احوال ہی کی حد تک ہو سکتی تھی، ہماری نظروں سے غائب لاء علمی میں ان سے یہ کام ہو جائے گا ہم کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔

چونکہ برادرانِ یوسف اس سے پہلے ایک فریب اپنے والد کو دے چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہمارے مذکور الصدر بیان سے والد کا ہرگز اطمینان نہ ہوگا، اور وہ ہماری بات پر یقین نہ کرینگے اس لئے مزید تاکید کے لئے کہا کہ آپ کو ہمارا یقین نہ آئے تو آپ اس شہر کے لوگوں سے تحقیق کر لیں جس میں ہم تھے، یعنی شہر مصر، اور آپ اس قافلہ سے بھی تحقیق کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہی مصر سے کنعان آیا ہے، اور ہم اس بات میں بالکل سچے ہیں۔

تفسیر منظری میں اس جگہ اس سوال کا اعادہ کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے والد کے ساتھ اس قدر بے رحمی کا معاملہ کیسے گوارا کر لیا، کہ خود اپنے حالات سے بھی اطلاع نہیں دی، پھر چھوٹے بھائی کو بھی روک لیا، جبکہ بار بار یہ بھائی مصر آتے رہے، نہ ان کو اپنا راز بتایا نہ والد کے پاس اطلاع بھی، ان سب باتوں کا جواب تفسیر منظری نے یہی دیا ہے: اِنَّهُ عَمِلَ ذٰلِكَ بِاَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی لِیُزِیِّنَ فِیْ بَآلَاہِ یَعْقُوْبَ، یعنی یوسف علیہ السلام نے یہ ساری کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کئے جن کا منشاء حضرت یعقوب علیہ السلام کے امتحان اور ابتلا کی تکمیل تھی

احکام و مسائل وَمَا شِئْنَا فَاِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا سَے ثابت ہوا کہ انسان جب کسی سے کوئی معاملہ اور معاہدہ کرتا ہو تو وہ ظاہری حالات ہی پر معمول ہوتا ہے، ایسی

چیزوں پر عادی نہیں ہوتا جو کسی کے علم میں نہیں، برادرانِ یوسف نے والد سے جو بھائی کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ اپنے اختیاری امور کے متعلق تھا، اویہ معاملہ کہ ان پر چوری کا الزام آگیا اور اس میں پکڑے گئے اس معاہدہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

دوسرا مسئلہ تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ نکالا گیا ہے کہ اس جملہ سے ثابت ہوا کہ شہادت کا مدار علم پر ہے، علم خواہ کسی طریق سے حاصل ہو، اس کے مطابق شہادت دی جا سکتی ہے اس لئے کسی واقعہ کی شہادت جس طرح اس کو پیشہ خود دیکھ کر دی جا سکتی ہے اسی طرح کسی محتر ثقہ سے سن کر بھی دی جا سکتی ہے، شرط یہ ہے کہ اصل معاملہ کو چھپائے نہیں، بیان کر دے، کہ یہ واقعہ خود نہیں دیکھا، فلاں ثقہ آدمی سے سنا ہے، اسی اصول کی بناء پر فقہار مالکیہ نے نابینا کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ: آیات مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص حق اور راستی پر ہو مگر موقع ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کو ناحق یا گناہ کا شبہ ہو سکتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ اس ہشتباہ کو دور کر دے تاکہ دیکھنے والے بدگمانی کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، جیسے اس واقعہ مبیا بین میں

پچھلے واقعہ یوسف علیہ السلام کی بنا پر موقع بہمت اور شبہ کا پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اسکی صفائی کے لئے اہل بستی کی گواہی اور قافلہ والوں کی گواہی پیش کی گئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، جبکہ آپ حضرت صفیہ ام المؤمنین کے ساتھ مسجد سے ایک کوچہ میں تشریف لے جا رہے تھے تو اس کوچہ کے سرے پر دو شخص نظر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے فرمادیا کہ میرے ساتھ صفیہ بنت حبی ہیں، ان دو حضرات نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے بارے میں کسی کو کوئی بدگمانی ہو سکتی ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں شیطان انسان کی رگ رگ میں سرایت کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں شبہ ڈال دے (بخاری، مسلم)

(مترجم)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبِّرُوا جَمِيلًا ط عَسَى اللَّهُ أَنْ

بولے کوئی نہیں بنالی ہو تمھارے ہی نے ایک بات ابھری بہتر ہو، شاید اللہ نے آئے

يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝۸۳ وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَ

میرے پاس ان سب کو، وہی ہر خبردار حکمتوں والا، اور الٹا پھرا ان کے پاس سے

قَالَ يَا سَفَى عَلَى يَوْسُفَ وَأَبْيَضَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۝۸۴

اور بولا اے افسوس یوسف پر! اور سفید ہو گئیں آنکھیں اس کی غم سے، سرودہ آپکو گھونٹ رہا تھا،

قَالَ أَتَدْرِي تَفْتَوُ أَتَنْ كَرِيْهُوْسَفَ حَتَّى تَكُوْنَ حَرَضًا أَوْ تَكُوْنَ

کہنے لگے قسم ہر اللہ کی تو نہ پھوڑ بچا یوسف کی یاد کو جب تک کہ گھل جائے یا ہو جائے

مِنَ الْهَلِكَيْنِ ۝۸۵ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَ

مردہ، بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے اور

أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝۸۶ لِيَبْنِيَ أَذْهَبُوا فَتَحَسَّوْا مِّنْ

جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے، اے بیٹرا جاؤ اور تلاش کرو

يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَأْيِسُوا مِّنْ رَّوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَأْيِسُ

یوسف کی، اور اس کے بھائی کی اور نا امید مت ہو اللہ کے فیض سے بیشک نا امید نہیں

مَنْ رَوَّحَ اللَّهُ إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ ﴿۸۷﴾

ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔

خلاصہ تفسیر

یعقوب (علیہ السلام) یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان سب سے غیر مطمئن ہو چکے تھے کہ سابق پر قیاس کر کے فرمائے لگے (کہ بنیامین چوری میں مایوز نہیں ہوا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنائی ہے سو (خیر مثل سابق) صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہو گا (مجھ کو) اللہ سے امید ہو کہ ان سب کو (یعنی یوسفؑ اور بنیامین اور جو بڑا بھائی اب مصر میں رہ گیا ہو) ان تینوں کو (مجھ تک پہنچا دے گا کیونکہ وہ) (حقیقت حال سے) خوب واقف ہو (اس لئے اس کو سب کی خبر ہو کہ کہاں کہاں اور کس کس حال میں ہیں اور وہ) بڑی حکمت والا ہے (جب ملانا چاہے گا تو ہزاروں اسباب و تدابیر درست کر دے گا) اور (یہ جواب دے کر بوجہ اس کے کہ ان سے بچ پہنچا تھا) ان سے دوسری طرف رخ کر لیا اور (بوجہ اس کے کہ اس نے غم سے وہ پرانا غم اور تازہ ہو گیا) یوسفؑ کو یاد کر کے (کہنے لگے) یوسف افسوس! اور غم سے (روتے روتے) ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں (کیونکہ زیادہ رونے سے سیاہی آنکھوں کی کم ہو جاتی ہے اور آنکھیں بے رونق یا بالکل بے نور ہو جاتی ہیں) اور وہ (غم سے جی ہی جی میں) گھٹا کرتے تھے (کیونکہ شدت غم کے ساتھ جب شدت ضبط ہو گا جیسا کہ صابرین کی شان ہے تو کلم کی کیفیت پیدا ہوگی) بلیے کہنے لگے بخدا (معلوم ہوتا ہے) تم ہمیشہ ہمیشہ یوسف کی یادگاری میں لگے رہو گے، یہاں تک کہ گھل گھل جاں بہ لب ہو جاؤ گے، یا یہ کہ بالکل مر ہی جاؤ گے (تو اتنے غم سے فائدہ کیا) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (تم کو میرے رونے سے کیا بحث) میں تو اپنے رنج و غم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں (تم سے تو کچھ نہیں کہتا) اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں حسانتا ہوں تم نہیں جانتے (باتوں سے مراد یا تو لطف و کریم و رحمت اتم ہے اور یا مراد الہام ہے ان سب کے ملنے کا جو بلا واسطہ ہو یا بواسطہ ثواب یوسفؑ کے جس کی تعبیر اب تک واقع نہیں ہوئی تھی، اور واقع ہونا اس کا ضرور ہے) اے میرے بیٹو! انہما غم تو صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں، سبب اسباب وہی ہے، لیکن ظاہری تدبیر تم بھی کرو کہ ایک بار پھر سفر میں جاؤ اور یوسفؑ اور ان کے بھائی کی تلاش کرو (یعنی اس فکر و تدبیر کی جستجو کرو جس سے یوسفؑ کا نشان ملے، اور بنیامین کو رہائی ہو) اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید مت ہو بیشک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

معارف و مسائل

یہ عقوب علیہ السلام کے چھوٹے صاحبزادے بنیامین کی مصر میں گرفتاری کے بعد ان کی
ہوئی بنیاد واپس آنے اور یعقوب علیہ السلام کو یہ ماجرہ سنایا، اور یقین دلانا چاہا کہ ہم اس واقعہ
میں بالکل سچے ہیں، آپ اس بات کی تصدیق مصر کے لوگوں سے بھی کر سکتے ہیں، اور جو قافلہ ہمارے
ساتھ مصر سے کنعان آیا ہے اس سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بنیامین کی چوری کیڑی گئی، اس لئے
وہ گرفتار ہو گئے، یعقوب علیہ السلام کو چونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان صاحبزادوں
کا جھوٹ ثابت ہو چکا تھا، اس لئے اس مرتبہ بھی یقین نہیں آیا، اگرچہ فی الواقع اس وقت انھوں
نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا، اس لئے اس موقع پر بھی وہی کلمات فرمائے جو یوسف علیہ السلام
کی گم شدگی کے وقت فرمائے تھے: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً، فَصَبْرٌ جَمِيلٌ، یعنی
یہ بات جو تم کہہ رہے ہو، تم نے خود بات بنائی ہے، مگر میں اب بھی صبر کرتا ہوں، وہی
میرے لئے بہتر ہے۔

قرطبی نے اسی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجتہد جو بات اپنے اجتہاد سے کہتا ہے اس میں
غلطی بھی ہو سکتی ہے یہاں تک کہ پیغمبر بھی جو بات اپنے اجتہاد سے کہیں اس میں ابتداء غلطی ہو جانا
مکن ہے۔ اس معاملہ میں پیش آیا، کہ بیشوں کے سچ کو جھوٹ قرار دیدیا، مگر انبیاء کی خصوصیت
یہ ہے کہ ان کو منجانب اللہ غلطی پر متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے، اور انجام کار وہ حق کو
پالیتے ہیں۔

یہاں یہ بھی نکتہ ہو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذہن میں بات بنانے سے مراد
وہ بات بنانا ہو جو مصر میں بنائی گئی کہ ایک خاص غرض کے ماتحت جعلی چوری دکھلا کر بنیامین
کو گرفتار کیا گیا، جس کا انجام آئندہ بہترین صورت میں کھل جانے والا تھا، اس آیت کے اگلے جملے
سے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں فرمایا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا
یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ جو صاحبزادوں کی بات کو تسلیم
نہیں کیا، اس کا حاصل یہ تھا کہ درحقیقت نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ بنیامین گرفتار ہونے
میں، بات کچھ اور ہے، یہ اپنی جگہ صحیح تھا، مگر صاحبزادوں نے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ
کہا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔

وَأَوَّلَىٰ عَلَيْهِمْ وَقَالَ يَا سَعْدُ عَلَىٰ يَوْسُفَ وَأَبِصْرَتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزَنِ

قَالُوا كَذِبٌ عَظِيمٌ ۖ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اس دوسرے صدمے کے بعد عاجزادوں سے اس معاملہ میں گفتگو کو چھوڑ کر اپنے رب کے سامنے فریاد شروع کر دی، اور فرمایا کہ مجھے سخت رنج و غم ہو یوسف پر اور اس رنج و غم میں روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں، یعنی بینائی جاتی رہی یا بہت ضعیف ہو گئی، مفاصل امام تفسیر نے فرمایا کہ یہ کیفیت یعقوب علیہ السلام کی چھ سال رہی کہ بینائی تقریباً جاتی رہی تھی، قَوْلُ كَذِبٌ عَظِيمٌ یعنی چہرہ خاموش ہو گئے، کسی سے اپنا دکھ نہ کہتے تھے کَظِيمٌ کَظْم سے بنا ہے جس کے معنی بند ہو جانے اور بھر جانے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ غم و اندوہ سے ان کا دل بھر گیا، اور زبان بند ہو گئی، کہ کسی سے اپنا رنج و غم بیان نہ کرتے تھے۔

اسی لئے کَظْم کے معنی غصہ کو پی جانے کے آتے ہیں کہ غصہ دل میں بھرے ہوئے ہونے کے باوجود زبان یا ہاتھ سے کوئی چیز غصہ کے مقتضی کے مطابق سرزد نہ ہو، حدیث میں ہے وَمَنْ يَكْظِمُ الْخَطِيئَةَ يَأْجُرْهُ اللَّهُ یعنی جو شخص اپنے غصہ کو پی جائے اور اس کے تقاضے پر باوجود قدرت کے عمل نہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کو بڑا اجر دیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مجمع عام کے سامنے لا کر جنت کی نعمتوں میں خستیاں دیں گے جو چاہیں لیں۔

امام ابن جریر نے اس جگہ ایک حدیث نقل کی ہے کہ مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُونَ، پڑھنے کی تلقین اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ کلمہ انسان کو رنج و غم کی تکلیف سے نجات دینے میں بڑا موثر ہے، نہ مصیبت امت محمدیہ کی اس سے معلوم ہوتی کہ اس شدید غم و صدمہ کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کلمہ کے بجائے یَا سَعْدِی

عَلٰی یُوسُفَ فرمایا، یہی نے شہاب الایمان میں بھی یہ حدیث ابن عباسؓ کی روایت نقل کی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا شغف محبت اس مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کے ساتھ غیر معمولی محبت اور اُن کے گم ہونے پر اتنا اثر

کہ اس مفارقت کی ساری مدت میں جو بعض روایات کی بناء پر چالیس سال اور بعض کی بناء پر اسی سال بتلائی جاتی ہے مسلسل روتے رہنا، یہاں تک کہ بینائی جاتی رہی بظاہر ان کی پیغمبرانہ شان کے شایان نہیں، کہ اولاد سے اتنی محبت کریں، جب کہ قرآن کریم نے اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے ارشاد ہے: اِنَّمَا آمَوَ كُفُّرًا وَاُولَادُكُمْ فِتْنَةٌ، یعنی تمہارے مال اور اولاد فتنہ اور آزمائش ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی شان قرآن کریم نے یہ بتلائی ہے کہ اِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ، یعنی ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص صفت کے ساتھ انہیں کر دیا ہے، وہ صفت ہر دارِ آخرت کی یاد، مالک بن دینار نے اس کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں کہ

ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال دی اور صرف آخرت کی محبت سے ان کے قلوب کو مہمور کر دیا، ان کا طبع نظر کسی چیز کے لینے یا چھوڑنے میں صرف آخرت ہوتی ہے۔

اس مجموعہ سے یہ اشکال قوی ہو کر سامنے آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں ایسا مشغول ہونا کس طرح صحیح ہوا؟

حضرت قاضی ثناء اللہ بانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر منطہری میں اس اشکال کو ذکر کر کے حضرت محبت دالہ ثانی کی ایک خاص تحقیق نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے، قرآن و حدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے، یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حسن صورت ہی نہیں، بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حسن سیرت بھی ہیں، اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی، انتہی۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یہ محبت اگرچہ درحقیقت دنیا کی محبت نہ تھی مگر ہر حال اس میں ایک حیثیت دنیوی بھی تھی، اسی وجہ سے یہ محبت حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء اور امتحان کا ذریعہ بنی، اور پچاس سال کی مفارقت کا ناقابلِ برداشت صدمہ برداشت کرنا پڑا، اور اس واقعہ کے اجزاء ازل سے آخر تک اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ ایسی صورتیں بنتی چلی گئیں کہ یہ صدمہ دلوں سے طویل ہوتا چلا گیا ورنہ واقعہ کے شروع میں اتنی شدید محبت والے باپ سے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ بیٹوں کی بات سن کر گھر میں بیٹھ رہتے، بلکہ موقع پر پہنچ کر تغشش و تلاش کرتے تو اسی وقت پتہ چل جاتا، مگر اللہ ہی کی طرف سے ایسی صورتیں بن گئیں کہ اُس وقت یہ رہبان نہ آیا، پھر یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس سے روک دیا گیا کہ وہ اپنے حال کی اپنے والد کو خبر بھیجیں، یہاں تک کہ مصر کی حکومت و اقتدار ملنے کے بعد بھی انھوں نے کوئی ایسا اقدام نہیں فرمایا، اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما وہ واقعات تھے جو بار بار ان کے بھائیوں کے مصر جانے کے متعلق پیش آتے رہے، اس وقت بھی نہ بھائیوں پر اظہار فرمایا نہ والد کو خبر بھیجنے کی کوشش فرمائی، بلکہ دوسرے بھائی کو بھی اپنے پاس ایک تربیر کے ذریعہ روک کر والد کے صدمہ کو دہرا کر دیا، یہ سب چیزیں یوسف علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر سے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اُن کو بذریعہ وحی اس سے نہ روک دیا گیا ہو، اسی لئے قرآنی و غیرہ مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے اس سارے عمل کو وحی خداوندی کی تلقین قرار دیا ہے، اور کَذٰلِکَ اٰیٰتُ یٰسُف کے

قرآنی ارشاد میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

قَالُوا اتَّاللٰهَ تَفْتَوُا نَحْنُ كَوْنٌ شُعْتُ، یعنی صاحبزادے والد کے اس شدید غم و اندوہ اور اس پر صبر جمیل دیکھ کر کہنے لگے کہ بھئی آپ تو یوسفؑ کو ہمیشہ یاد ہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ بیمار پڑ جائیں اور ہلاک ہونے والوں میں داخل ہو جائیں، (آخر ہر صدمہ اور غم کی کوئی انتہا ہوتی ہے، مردِ رایام سے انسان اس کو بھول جاتا ہے، مگر آپ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسی روزِ اوّل میں ہیں، اور آپ کا غم اُسی طرح تازہ ہے)۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی بات سن کر فرمایا اِنَّمَا اَشْكُوْا اَبْنٰی وَ حَزَنٰی اِلٰی اللّٰهِ، یعنی میں تو اپنی فریاد اور رنج و غم کا اظہار تم سے یا کسی دوسرے سے نہیں کرتا، بلکہ اللہ جل شانہ کی ذات سے کرتا ہوں، اس لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر فرمایا کہ میرا یہ یاد کرنا خالی نہ جائے گا، میں اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیز جانتا ہوں جس کی تم کو خبر نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہوا ہے کہ وہ پھر مجھے ان سب ملائیں گے۔

يٰۤاِبْنٰی اِذْ هَبُوْا فَاَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوسُفَ وَ اَخِيْهِ، یعنی اے میرے بیٹے جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، کیونکہ اس کی رحمت سے سب کچھ کافروں کے کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اتنے عرصہ کے بعد صاحبزادوں کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف اور ان کے بھائی کو تلاش کرو، اور ان کے ملنے سے مایوس نہ ہو، اس سے پہلے کبھی اس طرح کا حکم نہ دیا تھا، یہ سب چیزیں تقدیرِ الہی کے تالچ تھیں، اس سے پہلے ملنا مقدر نہ تھا، اس لئے ایسا کوئی کام بھی نہیں کیا گیا، اور اب ملاقات کا وقت آچکا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسب تدبیر دل میں ڈالی۔

اوردوں کی تلاش کا رنج مصر ہی کی طرف قرار دیا، جو بنیامین کے حق میں تو معلوم اور متعین تھا، مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی ظاہر حال کے اعتبار سے کوئی وجہ نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں اس کے مناسب اسباب جمع فرمادیتے ہیں، اس لئے اس مرتبہ تلاش و تفتیش کے لئے پھر صاحبزادوں کو مصر جانے کی ہدایت فرمائی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ عزیز مصر کے اس معاملہ سے کہ انکی ہونجی بھی ان کے سامان میں واپس کر دی اس طرف خیال ہو گیا تھا کہ یہ عزیز کوئی بہت ہی شریف کریم ہو شاید یوسفؑ ہی ہوں۔

احکام و مسائل

امام قرطبی نے فرمایا کہ واقعہ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت اور تکلیف اپنی جان یا اولاد یا مال کے بارے میں پیش آئے تو اس کا علاج صبر جمیل اور اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہونے سے کرے، اور یعقوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی اقتداء کرے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان جس قدر گھونٹ پیتا ہو ان سب میں دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں، ایک مصیبت پر صبر اور دوسرے غصہ کو پی جانا۔ اور حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: مَنْ بَثَّ لَمْ يَصْبِرْ، یعنی جو شخص اپنی مصیبت سب کے سامنے بیان کرتا پھرے اس نے صبر نہیں کیا۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس صبر پر شہیدوں کا ثواب عطا فرمایا، اور اس امت میں بھی جو شخص مصیبت پر صبر کرے گا اس کو ایسا ہی اجر ملے گا۔

امام قرطبی نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس شدید ابتلا و امتحان کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے جو بعض روایات میں آئی ہے کہ ایک روز حضرت یعقوب علیہ السلام نماز تہجد پڑھ رہے تھے، اور یوسف علیہ السلام ان کے سامنے سو رہے تھے، اچانک یوسف علیہ السلام سے کچھ خیر اٹنے کی آواز نکلی، تو ان کی توجہ یوسف علیہ السلام کی طرف چلی گئی، پھر دوسری اور تیسری مرتبہ ایسا ہی ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے فرمایا دیکھو یہ میرا دوست اور مقبول بندہ مجھ سے خطاب اور عرض معروض کرنے کے درمیان میرے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے، قسم ہے میری عزت و جلال کہ میں ان کی یہ دونوں آنکھیں نکال لوں گا جن سے میرے غیر کی طرف توجہ کی ہے، اور جس کی طرف توجہ کی ہے اس کو ان سے مدت دراز کے لئے جدا کر دوں گا۔

اسی لئے بخاری کی حدیث میں بروایت عائشہؓ وارد ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ نماز میں کسی دوسری طرف دیکھنا کیسا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے ذریعہ شیطان بندہ کی نماز کو اچک لیتا ہے، والہیاذ باللہ سبحانہ و تعالیٰ۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے اے عزیز پرہیزگار ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور

جَعَلْنَا بَيْضَاتٍ مَّزْجِيَّةً فَأَرْوَيْنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقَ عَلَيْنَا إِنَّكَ

لاَ تَعْلَمُ يَوْمَ يُخْرِجُنَا نَاقِصٌ سَرُپُورِی سے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر ، اللہ

اللَّهُ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ يُوْسُفَ

بدلہ دیتا ہر خیرات کرنے والوں کو ، کہا کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے

وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾ قَالُوا أَءِذَا نَكَ لَأَنْتَ يُوْسُفَ قَالَ

اور اس کے بھائی سے جب تم کو سمجھ نہ تھی ، بولے کیا پتہ تو ہی ہے یوسف ، کہا

أَنَا يُوْسُفُ وَهَذَا أَخِي زَقْنَمٌ مِنَ اللَّهِ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ

میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی اللہ نے احسان کیا ہم پر البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور

يَعْبُدِ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٩٠﴾ قَالُوا تَاللَّهِ

مبرا کرتا ہو تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا ، بولے قسم اللہ کی

لَقَدْ أَشْرَكْنَا بِاللَّهِ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخٰطِئِينَ ﴿٩١﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ

البتہ پسند کر لیا تجھ کو اللہ نے ہم سے اور ہم تجھے چوکے والے ، کہا کچھ الزام نہیں

عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ طَيِّعُوا اللَّهَ لَكُمْ زَوْجٌ وَهُوَ أَحْمَرُ الرَّحِمَيْنِ ﴿٩٢﴾

تم پر آج ، بچنے اللہ تم کو اور وہ ہے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ۔

خلاصہ تفسیر

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حکم کے موافق کہ انھوں نے فرمایا تھا تَشْتَرُوا مِنِّي يُوْسُفَ وَخَبْرًا مَّصْرَ كَوَاطِلَ ، کیونکہ بنیامین کو مصر ہی میں چھوڑا تھا ، یہ خیال ہوا ہو گا کہ جس کا نشان معلوم ہو پہلے اس کے لانے کی تدبیر کرنا چاہیے ، کہ بادشاہ سے مانگیں ، پھر یوسف علیہ السلام کے نشان کو ڈھونڈیں گے ، غرض مصر پہنچ کر جب یوسف کے پاس (جس کو عزیز سمجھ رہے تھے) پہنچے اور غلہ کی بھی حاجت تھی ، پس یہ خیال ہوا کہ غلہ کے بہانے سے عزیز کے پاس چلیں ، اور اس کی خرید کے ضمن میں خوشامد کی باتیں کریں ، جب اس کی طبیعت میں نرمی دیکھیں ، اور مزاج خوش پائیں تو بنیامین کی درخواست کریں ، اس لئے اول غلہ لینے کے متعلق گفتگو شروع کی اور کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو (قسط کی وجہ سے) بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے اور چونکہ ہم کو ناداری نے

گھیر رکھا ہے اس لئے خرید و غلہ کے واسطے کھرتے دام بھی میسر نہیں ہوئے) ہم کچھ یہ بھی چیز لاتے ہیں، سو آپ (اس کے نکتے ہونے سے قطع نظر کر کے) پورا غلہ دیدیتے (اور اس نکتے ہونے سے غلہ کی مقدار میں کمی نہ کیجئے) اور ہمارا کچھ استحقاق نہیں) ہم کو خیرات (سمجھ کر) دیدیتے بیشک اللہ تعالیٰ خیرات دینے والوں کو (خواہ حقیقہ خیرات دیں خواہ سہولت و رعایت کریں کہ وہ بھی مثل خیرات کے ہے) جزا (سے خیر) دیتا ہے اگر مومن ہے تو آخرت میں بھی ورنہ دنیا ہی میں) یوسف (علیہ السلام) نے (جو اُن کے یہ مسکنات آمیز الفاظ سنے تو رہا نہ گیا اور بے ہمتیاً چاہا کہ اب اُن سے مکمل جاؤں، اور عجب نہیں کہ نور قلب سے معلوم ہو گیا ہو کہ اب کی بار اُن کو تجسس بھی مقصود ہو اور یہ بھی منکشف ہو گیا ہو کہ اب زمانہ مفارقت کا ختم ہو چکا، پس تمہید تعارف کے طور پر) فرمایا (کہو) وہ بھی تم کو یاد رہے جو کچھ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ (برتاؤ) کیا تھا جب کہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا اور بُرے بھلے کی سوچ نہ تھی یہ سنکر پہلے تو چکر آ کہ عزیز معمر کو یوسف کے قصہ سے کیا واسطہ اور اس شروع زمانہ کے خواب سے غالب احتمال تھا ہی کہ شاید یوسف کسی بڑے رقبہ کو پہنچیں کہ ہم سب کو ان کے سامنے گردن جھکانا پڑے اس لئے اس کلام سے شبہ ہوا اور غور کیا تو کچھ کچھ پہچانا اور مزید تحقیق کیلئے کہنے لگے کیا سچ تم ہی یوسف ہو انھوں نے فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ (دنیا میں) میرا (حقیقی) بھائی ہے (یہ اس لئے بڑھادیا کہ اپنے یوسف ہونے کی اور تاکید ہو جاوے یا انکے تجسس کی کامیابی کی بشارت ہو کہ جن کو تم ڈھونڈنے نکلے ہو ہم دونوں ایک جگہ جمع ہیں) ہم پر اللہ تم نے احسان کیا کہ ہم دونوں کو اول توفیق صبر و تقویٰ کی عطا فرمائی پھر اُس کی برکت سے ہماری تکلیف کو راحت سے اور افتراق کو اجتماع سے اور قلب مال و جاہ کو کثرت مال و جاہ سے مبتدل فرما دیا) واقعی جو شخص گناہوں سے ہیتا ہے اور (مصابہ پر) صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتا وہ (تمام گزشتہ قصوں کو یاد کر کے نادام ہو کر اور محذرت کے طور پر) کہنے لگے کہ بخدا کچھ شک نہیں، تم کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضیلت عطا فرمائی، (اور تم اسی لائق تھے) اور (ہم نے جو کچھ کیا) بیشک ہم (اس میں) خطا دار تھے و اللہ معاف کر دو) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا کہ نہیں تم پر آج (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں (بے فکر ہو میرا دل صاف ہو گیا) اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (تائب کا قصور معاف کر ہی دیتا ہے، اسی دعا سے یہ بھی مفہوم ہو گیا کہ میں نے بھی معاف کر دیا) :

۱۲

”من جانب یعقوب صلی اللہ علیہ وسلم ابن اسحاق ذریعہ اللہ ابن ابراہیم خلیل اللہ بندہ متعزیز مصر
امابعد؛ ہمارا پورا خاندان بلاؤل اور آزمائشوں میں محروم ہے، میرے دلوں
ابراہیم خلیل اللہ کا غمزدگی آگ سے امتحان لیا گیا، پھر میرے والد اسحاق کا
شدید امتحان لیا گیا، پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو
سب سے زیادہ محبوب تھا، یہاں تک کہ اس کی مشارقت میں میری بنیائی جاتی رہی
اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی بھہ غم زدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپنے
چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا، اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولاد انبیاء میں نہ ہم نے
کبھی چوری کی ہے، نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا۔ والسلام“

یوسف علیہ السلام نے جب یہ خط پڑھا تو کانپ گئے، اور بے اختیار رونے لگے، اور اپنے
راز کو ظاہر کر دیا، اور تعارف کی تمہید کے طور پر بھائیوں سے یہ سوال کیا کہ تم کو کچھ یہ بھی یاد ہو
کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ تمہاری جمالت کا زمانہ تھا
کہ بھلے بڑے کی سوچ اور انجام بینی کی فکر سے غافل تھے۔

برادران یوسف نے جب یہ سوال سنا تو چکر اگئے کہ عزیز مصر کو یوسف کے قصہ
کیا واسطہ، پھر ادھر بھی دھیان گیا کہ یوسف نے جو بچپن میں خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر
یہی تھی کہ ان کو کوئی بلند مرتبہ حاصل ہو گا کہ ہم سب کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا، کہیں یہ عزیز مصر
خود یوسف ہی نہ ہوں، پھر جب اور غور و تأمل کیا تو کچھ علامات پہچان لیا، اور مزید تحقیق کیلئے ان سے کہا:
وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ كَاذِبٌ ۖ يٰٓيُوسُفُ ۖ كَيْفَ هُوَ؟ تو یوسف علیہ السلام
نے فرمایا کہ ہاں میں ہی یوسف ہوں، اور یہ بنیائین میرا حقیقی بھائی ہے، ممبائی کا ذکر
اس لئے بڑھا دیا کہ ان کو اچھی طرح یقین آجائے، نیز اس لئے بھی کہ ان پر اس وقت اپنے مقصد
کی مکمل کامیابی واضح ہو جائے کہ جن دو کی تلاش میں تم نکلے تھے وہ دونوں یک جا نہیں مل گئے، پھر فرمایا:

قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ سَامَا إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
الْمُحْسِنِينَ ۖ ”یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان و کرم فرمایا کہ اول ہم دونوں کو صبر و
تقویٰ کی دو صفات عطا فرمائیں، جو کلید کامیابی اور ہر مصیبت سے امان ہیں، پھر ہماری
تسلیمت کو راحت سے، افتراق کو اجتماع سے، مال و جاہ کی قلت کو ان سب کی کثرت سے
تبدیل فرما دیا، بیشک جو شخص گناہوں سے بچتا اور مصائب پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ

لے ذریعہ حضرت اسحق علیہ السلام تھے، یا حضرت اسماعیل علیہ السلام، اسکی پوری تحقیق سورہ لقمت (جلد ہفتم ص ۳۶۲ تا
۳۶۶) پر دیکھی جائے۔ ناشر

ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر عطا نہیں کیا کرتے ہیں۔

اب تو برادرانِ یوسف کے پاس بجز جرم و خطا کے اعتراف اور یوسف علیہ السلام کے فضل و کمال کے اقرار کے چارہ نہ تھا، سب ایک زبان ہو کر کہا تَقُولُ اللَّهُ عَلَيْنَا وَرَأَيْتُ كُنُوزَنَا أَنفِطِحُ، بخدا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم سب پر فضیلت اور برتری عطا فرمائی اور اور آپ اسی کے مستحق تھے، اور ہم نے جو کچھ کیا بے شک ہم اس میں خطا دار تھے، بشعاً کر دیجئے، یوسف علیہ السلام نے جواب میں اپنی پیغمبرانہ شان کے مطابق فرمایا:

لَا تَذْرِبْ عَلَیْكُمْ، یعنی میں تم سے تمہارے مظالم کا انتقام تو کیا لیتا، آج تجھے کوئی ملامت بھی نہیں کرتا، یہ تو اپنی طرف سے معافی کی خوش خبری سنا دی، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی: يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو معاف فرمادیں، وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں،

پھر فرمایا إِذْ هَبُوا بَقِیَّتِیْ هَٰذَا فَإِنَّمَا أَتُوبُ عَلَیْ وَجْهِ إِلَىٰ یَٰتِی بَصِیْرًا، وَأُتُوْنِ بِأَهْلِکُمْ أَجْمَعِیْنَ، یعنی میرا یہ کرد لے جاؤ اور اس کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو اس سے ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، جس سے وہ یہاں تشریف لاسکیں گے اور اپنی باقی گھر والوں کو بھی سب کو میرے پاس لے آؤ تاکہ سب ملیں اور خوش ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور شکر گزار ہوں۔

احکام و ہدایات | آیات مذکورہ سے بہت سے احکام و مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایات حاصل ہوتیں:

اول لفظ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسف اولادِ انبیاء میں ان کے لئے صدقہ خیرات کیسے حلال تھا؟ دوسرے اگر صدقہ حلال بھی ہو تو سوال کرنا کیسے جائز تھا، برادرانِ یوسف اگر انبیاء بھی نہ ہوں تو بھی یوسف علیہ السلام تو پیغمبر تھے، انھوں نے اس غلطی پر کیوں متنبہ نہیں فرمایا؟

اس کا ایک واضح جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ خیرات کرنے سے تعبیر کر دیا ہے، کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال تو انھوں نے کیا ہی نہ تھا، بلکہ کچھ نکمٹی چیزیں پیش کی تھیں، اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کر کے قبول فرمائیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اولادِ انبیاء کے لئے صدقہ خیرات کی حرمت صرف امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہد کا یہی قول ہے (بیان مسترآن)

إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ، سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ و خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں، مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ صدقہ و خیرات کی ایک جزاء تو عام ہے جو ہر مومن کا فر کو دنیا میں ملتی ہے، وہ ہے رزق بلا اور دفع مصائب، اور ایک جزاء آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت، وہ صرف اہل ایمان کا حصہ ہے، یہاں چونکہ مخاطب عزیز مصر ہے، اور برادران یوسف کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مومن ہو یا نہیں، اس لئے ایسا عام جملہ اختیار کیا جس میں دنیا و آخرت دونوں کی جزاء شامل ہے۔ (بیان ہسترات)

اس کے علاوہ بظاہر موقع تو اس جگہ اس کا تھا کہ چونکہ عزیز مصر سے خطاب اس لئے اس جملہ میں بھی خطاب ہی کے سیغہ سے یہ کہا جاتا کہ تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں گے، لیکن چونکہ ان کا تو مومن ہونا معلوم نہ تھا اس لئے ہم عنبران اختیار کیا اور خصوصاً طور پر ان کو جزا ملنے کا ذکر نہیں کیا (قرطبی) قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا سے ثابت ہوا کہ جب انسان کسی تکلیف و مصیبت میں گرفتار ہو، اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے نجات عطا فرما کر اپنی نعمت سے نوازیں تو اب اس کو گزشتہ مصائب کا ذکر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان ہی کا ذکر کرنا چاہئے جو اب حاصل ہوا، اور مصیبت سے نجات اور انعام الہی کے حصول کے بعد بھی پچھلی تکلیف و مصیبت کو روتے رہنا ناشکری ہے، ایسے ہی ناشکر کو قرآن عزیز میں کَنُود کہا گیا ہے، إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ، کَنُود کہتے ہیں اس شخص کو جو احسانات کو یاد نہ رکھے صرف تکلیفوں اور مصیبتوں کو یاد رکھو۔ اسی لئے یوسف علیہ السلام کو کھائیوں کے عمل سے عرصہ دراز تک جن مصیبتوں سے لقمہ پڑا تھا ان کا اس وقت کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ اللہ جل شانہ کے انعامات ہی کا ذکر فرمایا۔

صبر و تقویٰ ہر مصیبت | اِنَّهُ مِنْ يَتَّقٍ وَ يَصْبِرُ سے معلوم ہوا کہ تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنا کا علاج ہے اور تکلیفوں پر صبر و ثبات قدم، یہ دو صفتیں ایسی ہیں جو انسان کو ہر بلا و مصیبت سے نکال دیتی ہیں، قرآن کریم نے بہت سے مواقع میں انہی دو صفتوں پر انسان کی فلاح و کامیابی کا مدار رکھا ہے، ارشاد ہے: وَ اِنْ تَصْبِرُوا وَ تَتَّقُوا لَا يَضُرَّكُمْ كَيْدُ الْمُكْمِلِينَ شَيْئًا، یعنی اگر تم نے صبر و تقویٰ اختیار کر لیا تو دشمنوں کی مخالفانہ تدبیریں تمہیں کوئی گزند نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

یہاں بظاہر یہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا ارتقا کر رہے ہیں کہ ہمارے صبر و تقویٰ کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجہ عالیہ نصیب ہوئے، مگر کسی کو خود اپنے تقویٰ کا دعویٰ کرنا بنص قرآن ممنوع ہے، فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِسِنِّ اَنْفِي، یعنی اپنی پاکی نہ جتلاؤ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون

مستحق ہے، مگر یہاں درحقیقت دعویٰ نہیں بلکہ تحدیث بالنعمة اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے، کہ اس نے اول ہم کو صبر و تقویٰ کی توفیق عطا فرمائی پھر اس کے ذریعہ تمام نعمتیں عطا فرمائی۔
لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ، یعنی آج تم پر کوئی ملامت نہیں، یہ اخلاق کریمانہ کا اعلیٰ مقام ہے کہ ظالم کو صرف معاف ہی نہیں کر دیکلکہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اب تم پر کوئی ملامت بھی نہیں۔

اِذْ هَبُوا بَقِيَّةَ مِثْرٍ هَذَا اَفَا لِقْوُهُ عَلٰی وُجْهِ اَبٰی يٰكٖتَ بَصِيْرًا ۚ

لے جاؤ یہ کریم میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا

وَاَتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرَ قَالَ اَبُوْهُمْ

اور لے آؤ میرے پاس مگر اپنا سارا، اور جب جدا ہوا قافلہ کہا ان کے باپ نے

اِنِّیْ لَآ اَجِدُ رِيْمَ یُوْسُفَ لَوْ لَا اَنْ تُفْزِلُوْا ۙ ﴿٩٤﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ

میں پاتا ہوں بویوسف کی اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا بہک گیا، لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو

لَقَدْ ضَلَلْتَ الْقَدْرَیْمَ ۙ ﴿٩٥﴾ فَلَمَّا اَنْ جَاءَ الْبَشِيْرَ اَلْقَاهُ عَلٰی

اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے، پھر جب پہنچا خوش خبری والا ڈالا اس نے وہ کہتا

وَجْهِهِ فَاَرْتَدَّ بِصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنْ

اس کے منہ پر پھوٹ کر ہو گیا دیکھنے والا، بولائیں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں اللہ

اللّٰهِ مَا لَا تَحْكُمُوْنَ ۙ ﴿٩٦﴾ قَالُوْا يَاۤ اَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا

کی طرف سے جو تم نہیں جانتے، بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو

اِنَّا كُنَّا خٰطِیْیْنَ ۙ ﴿٩٧﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرْ لَّكُمْ رَبِّیْۤ اِنَّهٗ

بیشک ہم تھے مجھ کے دالے، کہا دم لو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے وہی ہو

هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۙ ﴿٩٨﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اَوٰی اِلَيْهِ

بخنے والا مہربان، پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی اپنی

اَبُوْیْهِ وَقَالَ اَدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اِمْنِیْنَ ۙ ﴿٩٩﴾

اپنے ماں باپ کو اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے چاہا تو دل جمعی سے

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا أَبَتِ هَذَا

اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گئے اس کے آگے سجدے میں اور کہا اے باپ یہ

تَاوِيلٌ مِّنْ رَبِّي قَدْ جَعَلْتُ رَبِّي حَقًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي

بیان ہر میرے اس پہلے خواب کا اس کو میرے رب نے سچ کر دیا اور اس نے انعام کیا مجھ پر

إِذَا أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ

جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ

أَن تَزْعُمَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ

جھگڑا ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب تدبیر سے کرتا اور جو چاہتا ہے

إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ⑩

بیشک وہی ہر خبردار حکمت والا ۔

خلاصہ تفسیر

اب تم (میرے باپ کو جا کر بشارت دو اور بشارت کے ساتھ) میرا یہ گرتہ (بھی) لیتے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو (اس سے) ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی (اور یہاں تشریف لے آئیں گے) اور اپنے (باقی) گھر والوں کو (بھی) سب کو میرے پاس لے آؤ (کہ سب ملیں اور خوش ہوں) کیونکہ حالت موجودہ میں میرا جاننا مشکل ہے، اس لئے گھر والے ہی پہلے آئیں، اور جب (یوسف علیہ السلام سے) بات چیت ہو چکی، اور آپ کے فرمانے کے موافق گرتہ لے کر چلنے کی تیاری کی اور (قافلہ شہر مصر سے) چلا (جس میں یہ لوگ بھی تھے) تو ان کے باپ نے (پاس والوں سے) کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں پہنچاؤ گے تو میں (والدہ سمجھتا ہوں) تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی خوشبو آ رہی ہے (معجزہ اختیاری نہیں ہوتا اس لئے اس سے پہلے یہ ادراک نہ ہوا) وہ (پاس والے) کہنے لگے کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پُرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں کہ یوسف زندہ ہیں اور ملیں گے اسی خیال کے غلبہ سے اب خوشبو کا وہم ہو گیا، اور واقع میں نہ خوشبو ہے نہ کچھ اور ہے، یعقوب علیہ السلام خاموش ہو رہے (پس جب (یوسف کے صحیح سلامت ہونے کی خوش خبری لانے والا) مع گرتہ کے یہاں) آپہنچا تو (آتے ہی) اس نے وہ گرتہ ان کے منہ پر لا کر ڈال دیا پس (آنکھوں کو لگنا تھا اور داغ میں خوشبو پہنچا کہ) فوراً ہی

ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھوں نے سارا ماجرا آپ سے بیان کیا، آپ نے (بیٹوں سے) فرمایا کیوں، میں نے تم سے کہا تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اور اس لئے میں نے تم کو یوسف کے تجسس کے لئے بھیجا تھا، دیکھو آخر اللہ تعالیٰ میری امید راست لیا ان کا یہ قول اس سے اور پر کے رکوع میں آچکا ہے، اُس وقت سب بیٹوں نے کہا کہ اے ہمارے باپ ہمارے لئے (خدا سے) ہمارے گناہوں کی دعا مغفرت کیجئے (ہم نے جو کچھ آپ کو یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں تکلیف دی) ہم بیشک خطا وار تھے (مطلب یہ ہے کہ آپ بھی معاف کر دیجئے، کیونکہ عادتہ کسی کے لئے استغفار وہی کرتا ہے جو خود بھی مواخذہ کرنا نہیں چاہتا)۔ یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا عنقریب تمھارے لئے اپنے رب سے دُعا سے مغفرت کروں گا بے شک وہ غفور رحیم ہے (اور اسی سے ان کا معاف کر دینا بھی معلوم ہو گیا اور عنقریب کا مطلب یہ ہے کہ تہجد کا وقت آنے دو جو کہ قبولیت کی ساعت ہے کذا فی الدر المنثور) رفو غرض سب مصر کو تیار ہو کر چل دیئے اور یوسف علیہ السلام خبر سن کر استقبال کے لئے مصر باہر تشریف لائے اور باہر ہی ملاقات کا سامان کیا گیا (پھر جب سب کے سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے (سب کے مل ملا کر) اپنے والدین کو اپنے پاس (تعظیماً) جگہ دی، اور (بات چیت سے فارغ ہو کر) کہا سب مصر میں چلتے (اور) انشاء اللہ تعالیٰ (وہاں) امن چین سے رہتے (مخارقت کا غم اور قحط کا الم سب کا فور ہو گئے، غرض سب مصر میں پہنچے) اور (وہاں پہنچ کر تعظیماً) اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر ادنجا بٹھایا، اور (اس وقت سب کے قلوب پر یوسف علیہ السلام کی ایسی عظمت غالب ہوئی کہ) سب کے سب ان کے ساتھ حجرہ میں گر گئے اور (یہ حالت دیکھ کر) وہ کہنے لگے کہ اے ابائے یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو پہلے زمانہ میں دیکھا تھا (کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کرتے ہیں) میرے رب نے اس (خواب) کو سچا کر دیا، (یعنی اس کی سچائی کا ظہور کر دیا) اور (اس شرف کے سوا میرے رب نے مجھ پر اور انعامات بھی فرمائے، چنانچہ) میرے ساتھ (ایک) اُس وقت احسان فرمایا جس وقت مجھ کو قید سے نکالا (اور اس مرتبہ سلطنت تک پہنچایا) اور (دوسرا یہ انعام فرمایا کہ) بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان میں فساد ڈلوادیا تھا جس کا مقتضایہ تھا کہ عمر بھر بھی عیب و متفق نہ ہوتے، مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ (تم سب کو) جن میں میرے بھائی بھی ہیں) باہر سے (یہاں) لے آیا (اور سب کو ملا دیا) بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم اور حکمت والا ہے، (اپنے علم و حکمت سے سب امور کی تدبیر درست کر دیتا ہے) ۝

معارف و مسائل

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے متعلق سابقہ آیات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ جب باذن خداوندی اس کا وقت آگیا کہ یوسف علیہ السلام اپنا راز بھائیوں پر ظاہر کر دیں تو انہوں نے حقیقت ظاہر کر دی، بھائیوں نے معافی مانگی، انہوں نے نہ صرف یہ کہ معاف کر دیا، بلکہ گزشتہ واقعات پر کوئی ملامت کرنا بھی پسند نہ کیا، ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اور اب والد سے ملاقات کی فکر ہوئی، حالات کے لحاظ سے مناسب یہ سمجھا کہ والد صاحب ہی مع خاندان کے یہاں تشریف لائیں، مگر معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی بیانی اس مفارقت میں جاتی رہی، اس لئے سب سے پہلے اس کی فکر ہوئی اور بھائیوں سے کہا:

إِذْ هَبُوا بَقِيَّتِي هَذَا فَالْقَوْمُ عَلَىٰ رَحْمَةٍ آتِي يَاتٍ بِصِیْرًا، یعنی تم میرا یہ کرتا لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بیانی عود کر آئے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی کے کرتے کا چہرہ پر ڈال دینا بیانی کے عود کرنے کا کوئی مادی سبب نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ ایک ججزہ تھا حضرت یوسف علیہ السلام کا کہ ان کو باذن خداوندی معلوم ہو گیا کہ جب انکا کرتہ والد کے چہرے پر ڈالا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کی بیانی بحال فرما دیں گے۔

اور سخاک اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ اس کرتے کی خصوصیت تھی، کیونکہ یہ عام کپڑوں کی طرح نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت سے اُس وقت لایا گیا تھا جب ان کو برہنہ کر کے فرود نے آگ میں ڈالا تھا، پھر یہ جنت کا لباس ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس محفوظ رہا، اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحق علیہ السلام کے پاس رہا، اُن کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ملا، آپ نے اس کو ایک بڑی تبرک شے کی حیثیت سے ایک ٹکلی میں بند کر کے یوسف علیہ السلام کے گھلے میں بطور تعویذ کے ڈال دیا تھا، تاکہ نظر بد سے محفوظ رہیں، برادران یوسف نے جب ان کا کرتہ والد کو دھوکہ دینے کے لئے اتار لیا، اور وہ برہنہ کر کے کنویں میں ڈال دیئے گئے تو جبریل امین تشریف لائے اور گھلے میں پڑی ہوئی ٹکلی کھول کر اس سے یہ کرتہ برآمد کیا، اور یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا، اور یہ ان کے پاس برابر محفوظ چلا آیا، اس وقت بھی جبریل امین ہی نے یوسف علیہ السلام کو یہ مشورہ دیا کہ یہ جنت کا لباس ہے، اس کی خاصیت یہ ہو کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جاتا ہے، اور فرمایا کہ اس کو اپنے والد کے پاس بھیج دیجئے تو وہ بینا ہو جائیں گے۔

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا

حسن و جمال اور ان کا درجہ و خود جنت ہی کی ایک چیز تھی، اس لئے ان کے جسم سے متصیل ہونیوالے ہرگز تھے میں یہ خاصیت ہو سکتی ہے (منہری)

وَأَنْتَوْنِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ، یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس مصر لے آؤ، اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا، مگر یہاں بالتصریح والد کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا، اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بیٹائی عود کر آئے گی، اور یہاں آنے سے کوئی عذر مانع نہیں رہے گا تو وہ خود ہی ضرورتاً ریف لائیں گے، قریبی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادرانِ یوسف میں سے یہودانے کہا کہ یہ گزرتے میں نے جاؤں گا، کیونکہ ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہنچے، اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھ سے ہونا چاہئے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ، یعنی جب قافلہ شہر سے باہر نکلا ہی تھا تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس والوں سے کہا کہ اگر تم مجھے یہ وقت نہ کہو تو میں تمہیں بتلاؤں کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے، شہر مقرر سے کنعان تک ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آٹھ دن کی فست کا راستہ تھا، اور حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ اسی فرسخ یعنی تقریباً ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اتنی دیر سے قمیص یوسف کے ذریعہ حضرت یوسفؑ کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک پہنچا دی، اور یہ عجائب میں سے ہے کہ جب یوسف علیہ السلام اپنے وطن کنعان ہی کے ایک کنویں میں تین روز تک پڑے رہے تو اس وقت یہ خوشبو محسوس نہیں ہوئی، یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ درحقیقت معجزہ پیغمبر کا اپنا فعل و عمل بھی نہیں ہوتا، یہ براہ راست فعل اللہ ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں تو معجزہ ظاہر کر دیتے ہیں، اور جب اذن خداوندی نہیں ہوتا تو قریب سے قریب بھی بعید ہو جاتا ہے۔

قَالُوا تَاللّٰهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ، یعنی حاضرینِ مجالس نے یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر کہا کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پُرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں، کہ یوسف زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ، یعنی جب بشارت دینے والا کنعان پہنچا، اور قمیص یوسف کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا، تو فوراً ان کی بیٹائی عود کر آئی، بشارت دینے والا وہی حضرت یوسف علیہ السلام کا بھائی یہودا تھا، جو ان کا کرتہ مصر سے لایا تھا۔

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ، یعنی کیا میں نہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ علم حاصل ہے جس کی آپ لوگوں کو خبر نہیں کہ یوسف زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں گے۔

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ، اب جبکہ حقیقت حال واضح ہو کر سامنے آگئی تو برادرانِ یوسف نے والد سے اپنی خیاظوں کی معافی اس شان سے مانگی کہ والد سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں اور یہ ظاہر ہو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ان کی خطا معاف کرنے کی دعا کریگا وہ خود بھی ان کی خطا معاف کر دیا۔
قَالَ مَسْرُوفٌ اسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَبِّي۔ یعنی یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں غنقریب تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کی دعا کروں گا۔

یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرما ہی دعا کرنے کے بجائے وعدہ کیا کہ غنقریب دعا کروں گا، اس کی وجہ عام مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اہتمام کے ساتھ آخر شب کے وقت میں دعا کریں کیونکہ اس وقت کی دعا خصوصیت سے قبول کی جاتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں زمین سے قریب تر آسمان پر فرزولِ اہمال فرماتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے، تو میں اس کو قبول کر لوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت طلب کرے اور میں اس کی مغفرت کر دوں۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ، بعض روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس مرتبہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دو سو اونٹوں پر لدا ہوا بہت سا سامان کپڑوں اور دوسری ضروریات کا بھیجا تھا، تاکہ پورا خاندان مصر آنے کے لئے عہد تیار کر سکے اس کے مطابق یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد اور تمام متعلقین مصر کے لئے تیار ہو کر نکلے، تو ایک روایت میں ان کی تعداد بہت زیادہ دوسری میں تو ان کے نفوس مرد و عورت پر مشتمل تھی۔ دوسری طرف جب مصر پہنچنے کا وقت قریب آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام اور ملک مصر کے لوگ استقبال کے لئے شہر سے باہر تشریف لائے اور چار ہزار سپاہی ان کے ساتھ سلامی دینے کے لئے نکلے، جب یہ حضرات مصر میں یوسف علیہ السلام کے مکان میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھہرایا۔ یہاں ذکر والدین کا ہے، حالانکہ یوسف علیہ السلام کی والدہ کا انتقال بچپن ہی میں ہو چکا تھا مگر ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے مرحومہ کی بہن لیتا سے نکاح کر لیا تھا، جو یوسف علیہ السلام کی خالہ ہونے کی حیثیت سے بھی والدہ کے تھیں، اور والد کے نکاح میں ہونے کی حیثیت سے بھی والدہ ہی کہلانے کی مستحق تھیں لہٰذا
وَقَالَ اَدْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِينَ، یوسف علیہ السلام نے سب خاندان

لہٰذا یہ توجہ اس روایت کے مطابق ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ نبیائین کی ولادت کے وقت قائم تھیں اس بنا پر یہاں حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت صفحہ ۲۹ و ۳۰ ہ کی عبارت سے متضاد معلوم ہوتی ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ رحیل کو قرار دیا گیا ہے لیکن دراصل اس معاملے میں کوئی مستند روایت تو نہیں، اسرائیلی روایات ہیں اور ان میں بھی تعارض ہو خود صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ یہودی حضرات حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ کے نبیائین کی ولادت کے وقت انتقال کے قائل نہیں ہیں اگر اس روایت کو لیا جائے تو کوئی اشمال باقی نہیں رہتا، اس صورت میں ورفح البیہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ مراد ہونگی۔ ابن جریر و ابن کثیر نے اسی کو راجح قرار دیا جو چنانچہ ابن کثیر اس پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں
قال ابن جریر ولم یقم دلیل علی موت امہ (امی ام یوسف علیہ السلام) وظاہر القرآن یدل علی حیاتها۔ یعنی خالہ

کے لوگوں سے کہا کہ آپ سب باذن خداوندی مصر میں بے خوف و خطر بغیر کسی پابندی کے داخل ہو جائیں
مطلب یہ تھا کہ دوسرے ملک میں داخل ہونے والے مسافروں پر جو پابندیاں عادیہ ہوا کرتی ہیں
آپ ان سب پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ، یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو اپنے تخت
شاہی پر بٹھایا۔

وَنَحْنُ ذَاوَالْأَسْبَاجِ، یعنی والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے
سجدہ کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا،
یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت
میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا، لیکن سجدہ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا جو شریعت
اسلام میں ذریعہ شریک ہونے کی بنا پر منسوخ ہو گیا ہے، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی
غیر اللہ کے لئے سجدہ حلال نہیں۔

وَقَالَ يَا بَنَاتِ هَٰذَا ذُو قُوَّةٍ يَأْتِي، یوسف علیہ السلام کے سامنے جب دونوں
ماں باپ اور گیارہ بھائیوں نے بیک وقت سجدہ کیا تو ان کو اپنا وہ بچپن کا خواب یاد آ گیا، اور
فرمایا کہ اہاجان! یہ میرے اُس خواب کی تعبیر ہے جو بچپن میں دیکھا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اور
گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس خواب کی سچائی کو
آنکھوں سے دکھلادیا۔

احکام و مسائل | حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی درخواست معافی و
دعائے مغفرت پر جو یہ فرمایا کہ ”عَنْقَرِيبَ تَحْمَارِے لَے دَعَائِے مَغْفَرَتِ
کردں گا، اور فوراً دعاء نہیں کی۔

اس تاخیر کی ایک وجہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کی ہے کہ منظور یہ تھا کہ یوسف
علیہ السلام سے مل کر پہلے یہ تحقیق ہو جائے کہ انکھوں نے ان کی خطا معاف کر دی ہو یا نہیں،
کیونکہ جب تک مظلوم معافی نہ دے عند اللہ بھی معافی نہیں ہوتی، ایسی حالت میں دعائے
مغفرت بھی مناسب نہ تھی۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور اصولی ہے کہ حقوق العباد کی توبہ بغیر اس کے نہیں ہوتی
کہ صاحب حق اپنا حق وصول کر لے یا معاف کر دے، محض زبانی توبہ و استغفار کافی نہیں۔
۲۔ حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ جب یہود اقمیس یوسف لے کر آئے اور یعقوب
علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا تو پوچھا کہ یوسف کیسے ہیں؟ انکھوں نے بتلایا کہ وہ مصر کے بادشاہ

ہیں، یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو نہیں پوچھتا کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر، پوچھنا یہ کہ ایمان اور عمل کے اعتبار سے کیا حال ہے، تب انھوں نے ان کے تقویٰ و طہارت کے حالات بتلائے، یہ ہر انبیاء علیہم السلام کی محبت اور تعلق کہ اولاد کی جسمانی راحت سے زیادہ ان کی روحانی حالت کی فکر کرتے ہیں، ہر مسلمان کو اسی کا اتباع کرنا چاہئے۔

۳۔ حضرت حسنؑ سے روایت ہے کہ جب بشارت دینے والا قمیس یوسف لے کر پہنچا، تو یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کو کچھ انعام دیں مگر حالات سازگار نہ تھے، اس لئے غدر کیا کہ سات روز سے ہمارے گھر میں روٹی نہیں بچی، اس لئے میں کچھ مادی انعام تو نہیں دے سکتا، مگر یہ دعا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم پر سکرات موت کو آسان کر دیں، قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ دعاء ان کے لئے سب سے بہتر انعام تھا۔

۴۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشخبری دینے والے کو انعام دینا سنتِ انبیاء ہے، صحابہ کرام میں حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے، کہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر جب اُن پر عتاب ہوا اور بعد میں توبہ قبول کی گئی، تو جو شخص قبولِ توبہ کی بشارت لایا تھا اپنا جوڑا کپڑوں کا اتار کر اس کو پہنا دیا۔

نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خوشی کے موقع پر اظہارِ مسرت کے لئے دوستوں وغیرہ کو کھانے کی دعوت دینا بھی سنت ہے، حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۃ بقرہ پڑھ کر ختم کی تو خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔

۵۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں نے حقیقتِ واقعہ ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے والد اور بھائی سے معافی مانگی، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ہاتھ یا زبان سے کسی شخص کو ایذا پہنچی، یا اس کا کوئی حق اس کے ذمہ رہا اس پر لازم ہو کہ فوراً اس حق کو ادا کر دے یا اس سے معاف کرالے۔

صحیح بخاری میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ذمہ کسی دوسرے کا کوئی حق مالی واجب ہو، یا اس کو کوئی ایذا ہاتھ یا زبان سے پہنچائی ہو اس کو چاہئے کہ آج اس کو ادا کر دے، یا معافی مانگ کر اس سے سبکدوشی حاصل کر لے، قبل اس کے کہ قیامت کا ڈن آجائے جہاں کسی کے پاس کوئی مال حق ادا کرنے کے لئے نہ ہوگا، اس لئے اس کے اعمالِ صالحہ مظلوم کو دیدیئے جائیں گے، یہ خالی رہ جائے گا، اور اگر اس کے اعمال بھی صالح نہیں تو دوسرے کے جو گناہ ہیں اس کے سر پر ڈال دیئے جائیں گے، والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

یوسف علیہ السلام کا مقام صبر و شکر

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کے سامنے کچھ اپنی سرگزشت بیان کرنا شروع کی، یہاں ایک منٹ ٹھہر کر غور کیجئے کہ آج اگر کسی اتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑے، جتنے یوسف علیہ السلام پر گذرے اور والدین سے اتنی طویل مفارقت اور بایسکی کے بعد ملنے کا اتفاق ہو تو وہ والدین کے سامنے اپنی سرگزشت کیا بیان کرے گا، کتنا روئے گا اور ڈلائے گا، اور کتنے دن رات مصائب کی داستان سنانے میں صرف کرے گا، مگر یہاں طرفین میں اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں، ان کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیے، یعقوب علیہ السلام کے بچہ بچے ہوتے محبوب فرزند ہزاروں مصائب کے دور سے گزرنے کے بعد جب والد سے ملتے ہیں تو کیا فرماتے ہیں؟

وَقَدْ أَحْسَنَ بَنِيَ إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْمَدْيَنَ وَمِنْ بَنِي
أَن تَزْعُمَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا جبکہ مجھے قید خانے
سے نکال دیا، اور آپ کو باہر سے یہاں لے آیا، بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں
کے درمیان فساد ڈلوادیا تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مصائب ترتیب وار تین بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں، اول بھائیوں کا ظلم و جور، دوسرے والدین سے طویل جدائی، تیسرے قید خانے کی تکالیف، خدا تعالیٰ کے اس برگزیدہ پیغمبر نے اپنے بیان میں پہلے تو واقعات کی ترتیب کو بدل کر قید خانے سے بات شروع کی اور اس میں قید خانے میں داخل ہونے اور وہاں کی تکالیف کا نام نہیں لیا، بلکہ قید خانے سے نکلنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ بیان کیا، قید خانہ سے نجات اور اس پر شکر الہی کے ضمن میں یہ بھی بتلادیا کہ میں کسی وقت قید خانہ میں بھی رہا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل خانے سے نکلنے کا ذکر کیا، بھائیوں نے جس کنویں میں ڈالا تھا اس کا اس حیثیت سے بھی ذکر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کنویں سے نکالا، وجہ یہ ہے کہ بھائیوں کی خطا پہلے معاف کر چکے تھے، اور فرما چکے تھے لَا تُرِيبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ، اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ اب اس کنویں کا کسی طرح سے بھی ذکر آئے، تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں (قرطبی)

اس کے بعد والدین کی طویل اور صبر آزمایہ مفارقت اور اس کے تاثرات کا ذکر کرنا تھا تو ان سب باتوں کو چھوڑ کر اس کے آخری انجام اور والدین سے ملاقات کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ کیا، کہ آپ کو بند و یعنی دیہات سے شہر مصر میں پہنچا دیا، اس میں اس نعمت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ یعقوب علیہ السلام کا وطن دیہات میں تھا، جہاں معیشت کی آسانیاں کم ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے شہر میں شاہی اعزازات کے ساتھ اندر پہنچا دیا۔

اب پہلی بات رہ گئی، بھائیوں کا ظلم و جور، سو اس کو بھی شیطان کے حوالہ کر کے اس طرح بیباق کر دیا کہ میرے بھائی تو ایسے نہ تھے جو یہ کام کرتے، شیطان نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر یہ فساد کرادیا۔ یہ ہر شانِ نبوت کہ مصائب اور تکالیف پر صرف صبر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ شکر کا پہلو نکال لیتے ہیں، اسی لئے ان کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار نہ ہوں، بخلاف عام انسانوں کے کہ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں برستی رہیں تو بھی کسی کا ذکر نہ کریں اور کسی وقت کوئی مصیبت پڑ جائے تو اس کو عمر بھر گاتے رہیں، قرآن میں اسی کی شکایت کی گئی ہے إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ یعنی انسان اپنے رب کا بہت ناشکر ہے۔

یوسف علیہ السلام نے داستانِ مصائب کو تین لغظوں میں مختصر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ رَبِّيْ لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ یعنی میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے، بلاشبہ وہ بڑا علم والا حکمت والا ہے۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکمت اور سکھایا مجھ کو کچھ پھیرنا باتوں کا،

فَاُطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خُفِّ اَنْتَ وَلِيٌّ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۝

اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہو دنیا میں اور آخرت میں،

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحَقَّنِيْ بِالصَّٰلِحِيْنَ ۝

موت دے مجھ کو اسلام پر اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں۔

خلاصہ تفسیر

اس کے بعد سب تنہی خوشی رہتے رہے یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام کی عمر ختم پر پہنچی، اور بعد وفات ان کی وصیت کے مطابق ملک شام میں لے جا کر اپنے بزرگوں کے پاس دفن کئے گئے، پھر یوسف علیہ السلام کو بھی آخرت کا اشتیاق ہوا، اور دعا کی کہ اے میرے پروردگار! آپ نے مجھ کو ہر طرح کی نعمتیں دیں، ظاہری بھی باطنی بھی، ظاہری یہ کہ مثلاً سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور باطنی یہ کہ مثلاً مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا (جو کہ علمِ عظیم ہے خصوصاً

جب کہ وہ یقینی ہو جو موقوف ہے دہی پر پس اس کا وجود مستلزم ہو گا عطا نبوت کو، اے خالق آسمانوں اور زمین کے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی پس جس طرح دنیا میں میرے سارے کام بنادیتے کہ سلطنت دی، علم دیا، اسی طرح آخرت کے کام بھی بنادیتے کہ مجھ کو فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے (یعنی میرے بزرگوں میں جو انبیائے عظام ہوئے ہیں ان میں مجھ کو بھی پہنچا دیجئے)۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں تو والد بزرگوار سے خطاب تھا، اس کے بعد جبکہ والدین اور بھائیوں کی ملاقات سے ایک اہم مقصد حاصل ہو کر سکون ملا تو براہ راست حق تعالیٰ کی حمد و ثناء اور دعا میں مشغول ہو گئے، فرمایا

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُدَّتِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيَّ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِنِّي بِالصِّلِحَيْنِ ۝^{۱۰۱} یعنی اے میرے پروردگار آپ نے ہی مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا، اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا، اے آسمان و زمین کے خالق آپ ہی دنیا و آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لیجئے، اور مجھ کو کامل نیک بندوں میں شامل رکھئے، کامل نیک بندے انبیاء علیہم السلام ہی ہو سکتے ہیں، جو ہر گناہ سے معصوم ہیں (مظاہر) اس دعا میں حسن خاتمہ کی دعا خاص طور پر قابلِ نظر ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی درجات عالیہ دنیا و آخرت کے اُن کو نصیب ہوں، اور کتنے ہی جاہ و منصب ان کے قدموں میں ہوں وہ کسی وقت اُن پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہر وقت اس کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ حالات سلب یا کم نہ ہو جائیں، اس کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ظاہری اور باطنی نعمتیں موت تک برقرار رہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا رہے یہاں تک حضرت یوسف علیہ السلام کا عجیب و غریب قصہ اور اس کے ضمن میں آئی ہوئی

ہدایات کا سلسلہ جو قرآن میں مذکور ہو پورا ہو گیا، اس کے بعد کا قصہ قرآن کریم یا کسی حدیث مرفوعہ میں منقول نہیں، اکثر علماء تفسیر نے تاریخی یا اسرائیلی روایات کے حوالہ سے نقل کیا ہے تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسنؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تھا تو ان کی عمر سترہ سال کی تھی، پھر اسی سال والد سے غائب رہے، اور والدین کی ملاقات کے بعد تیس سال زندہ رہے، اور ایک سو بیس

سال کی عمر میں وفات پائی۔

اور محمد بن اسحق نے فرمایا کہ اہل کتاب کی روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی مفارقت کا زمانہ چالیس سال تھا، پھر یعقوب علیہ السلام مصر میں تشریف لانے کے بعد یوسف علیہ السلام کے ساتھ سترہ سال زندہ رہے، اس کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔ تفسیر قرطبی میں اہل تاریخ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ مصر میں چوبیس سال رہنے کے بعد یعقوب علیہ السلام کی وفات ہوئی، اور وفات سے پہلے یوسف علیہ السلام کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش کو میرے وطن بھیج کر میرے والد اسحق علیہ السلام کے پاس دفن کیا جائے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو سال کی لکڑی کے تابوت میں رکھ کر بیت المقدس کی طرف منتقل کیا گیا، اس وجہ سے عام یہود میں یہ رسم چل گئی کہ اپنے مردوں کو دور دور سے بیت المقدس میں لے جا کر دفن کرتے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر وفات کے وقت ایک سو ستالیس سال تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام حج اپنی اولاد کے جب مصر میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد تیرانوے مرد و عورت پر مشتمل تھی، اور جب یہ اولاد یعقوب علیہ السلام کی بتی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ شتر ہزار تھی (قرطبی)۔ یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سابق عزیز مصر کے انتقال کے بعد شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی زلیخا کے ساتھ کرادی تھی۔

تورات اور اہل کتاب کی تاریخ میں ہے کہ ان سے یوسف علیہ السلام کے دو لڑکے افرائیم اور منشا اور ایک لڑکی رحمت بنت یوسف پیدا ہوئے، رحمت کا نکاح حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ ہوا، اور افرائیم کی اولاد میں یوشع بن نون پیدا ہوئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق تھے (مظہری)۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ایک سو بیس سال کی عمر میں ہوا، اور دریائے نیل کے کنارے پر دفن کئے گئے۔

ابن اسحق نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں، تو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کی لاش کو مصر میں نہ چھوڑیں، اس کو اپنے ساتھ لے کر ملک شام چلے جائیں، اور ان کے آباء و اجداد کے پاس دفن کریں، اس حکم کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تفتیش کر کے ان کی قبر دریافت کی، جو ایک سنگ مرمر کے تابوت میں

تھی، اس کو اپنے ساتھ ارض کنعان فلسطین میں لے گئے، اور حضرت اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کے برابر دفن کر دیا (منظری)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہو گئے اور بنو اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دین یوسف علیہ السلام پر قائم رہے، مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عذاب سے نکالا (تفسیر منظری)

ہدایات اور احکام آیات مذکورہ میں ایک مسئلہ تو یہ معلوم ہوا کہ والدین کی تعظیم و تکریم واجب ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوا۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدہ تعظیمی جائز تھا، اسی کو والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا، مگر شریعت محمدیہ میں سجدہ کو خاص عبادت کی علامت قرار دیکر غیر اللہ کے لئے حرام قرار دیا گیا، قرآن مجید میں فرمایا لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ، اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب ملک شام گئے اور وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں تو واپس آکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ کرنے لگے، آپ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا تو عورت کو کہتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، اسی طرح حضرت سلمان فارسی نے آپ کو سجدہ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا لَا تَسْجُدُوا لِیَا سَلْمَانُ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِیْ لَا یَمُوتُ یعنی اے سلمان! مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ صرف اس ذات کو کرو جو حی و قیوم ہے جس کو کبھی فنا نہیں (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تعظیمی سجدہ جائز نہیں تو اور کسی بزرگ یا پیر کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

هَذَا أَتَاوِیْلُ رُؤْیَا حَیِّ سے معلوم ہوا کہ خواب کی تعبیر بعض اوقات زمانہ دراز کے بعد ظاہر ہوتی ہے، جیسے اس واقعہ میں چالیس یا انسی سال کے بعد ظہور ہوا (ابن جریر و ابن کثیر) قَدْ أَحْسَنَ بَنِیُّ سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی مرض یا مصیبت میں مبتلا ہو پھر اس سے نجات ہو جائے تو سنت پیغمبری یہ ہے کہ نجات پر شکر ادا کرے، اور مرض و مصیبت کے ذکر کو بھول جائے۔

إِنَّ رَبِّیَّ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَاءُ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کام کا ارادہ فرماتے ہیں اس کی ایسی لطیف اور مخفی تدبیریں اور سامان کر دیتے ہیں کہ کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

تَوَفَّنِي مُسْلِمًا۔ میں یوسف علیہ السلام نے ایمان و اسلام پر موت کی دعا مانگی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خاص حالات میں موت کی دعا کرنا ممنوع نہیں، اور احادیث صحیحہ میں جو موت کی تمنا کو منع فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کی تکلیفوں سے گھبرا کر بے صبری سے موت مانگنے لگے، یہ درست نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص کسی مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے، اگر کہنا ہی ہے تو یوں کہے کہ یا اللہ مجھے جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اس وقت تک زندہ رکھ اور جب موت بہتر ہو تو مجھے موت دیدے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس اور تو نہیں تھا ان کے پاس

اِذَا جِئْتُمْهُمْ بِاَمْرٍ مِّنْهُمْ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهِ ۖ وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ

جب وہ پھرانے لگے اپنا کام اور فریب کرنے لگے، اور اکثر لوگ نہیں ہیں

وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۗ

یقین کرنے والے اگرچہ تو کتنا ہی چاہے، اور تو مانگتا نہیں ان سے اس پر کچھ بدلہ،

اِنَّ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ ۚ ۝۱۳ وَكَآيِنٌ مِّنْ آيٰتِيْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ

یہ تو اور کچھ نہیں مگر سارے عالم کو، اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمان اور

الْاَرْضِ يَمْشُوْنَ عَلَيْهِمْ وَهُمْ غٰفِرُوْنَ ۚ ۝۱۴ وَمَا

زمین میں جن پر گزر رہا ہے ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے اور نہیں

يُؤْمِنُوْنَ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۚ ۝۱۵ اَفَاَمِنُوْا اَنْ

ایمان لانے بہت لوگ اللہ پر مکر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں، کیا نہ ہو گئے اسے

تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

کہ آڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے عذاب کی یا آپیجے قیامت اچانک،

وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۚ ۝۱۶ قُلْ هٰذِهِ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى

اور ان کو خبر نہ ہو، کہہ دے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف، سمجھ

بَصِيرَةً أَنَا وَمِنَ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَنَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۰۸﴾

بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہر اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسُكَّرَ بِهِ لِقَايَ الَّذِينَ لَمْ يُحِبِّ الْمَاءَ ۚ وَجَعَلْنَا فِيهِ غُلَامًا وَاصِفًا ۚ وَجَعَلْنَا فِيهِ نَارًا فَتَلْكَ ۚ وَجَعَلْنَا فِيهِ نَارًا فَتَلْكَ ۚ وَجَعَلْنَا فِيهِ نَارًا فَتَلْكَ ۚ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے

الْقُرَىٰ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ

رہنے والے، سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی ملک کی کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا

عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ

انجام ان لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے، اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے

لِلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۰۹﴾

پرہیز کرنے والوں کو، کیا اب بھی نہیں سمجھتے۔

خلاصہ تفسیر

یہ قصہ رجوع پر بیان کیا گیا آپ کے اعتبار سے غیب کی خبروں میں سے ہے (کیونکہ آپ کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اس کے جاننے کا نہیں تھا صرف اہم (ہی) وحی کے ذریعہ سے آپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں اور (یہ ظاہر ہے کہ) آپ ان (برادرانِ یوسفؑ) کے پاس اُس وقت موجود نہ تھے جبکہ انھوں نے اپنا ارادہ (یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالنے کا) پختہ کر لیا تھا اور وہ اس کے متعلق تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ سے یوں کہیں کہ ان کو یوں لے جائیں، وغیرہ ذلک، اور اس طرح یہ امر یقینی ہے کہ آپ نے کسی سے یہ قصہ سنا سنا یا بھی نہیں، پس یہ صاف دلائل بے نبوت کی اور صاحبِ وحی ہونے کی (اور باوجود نبوت پر دلائل قائم ہونے کے) اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو اور (ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کا تو کوئی نقصان ہی نہیں، کیونکہ آپ ان سے اس (قرآن) پر کچھ معاوضہ تو چاہتے نہیں (جس میں یہ احتمال ہو کہ اگر یہ قرآن کو قبول نہ کریں گے تو آپ کا معاوضہ فوت ہو جائے گا) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہو رہا نہ مانے گا اسی کا نقصان ہوگا) اور جبکہ یہ لوگ منکرِ نبوت ہیں اسی طرح باوجود دلائل منکرِ توحید بھی ہیں چنانچہ بہت سی نشانیاں ہیں

(کہ توحید پر دلالت کرنے والی) آسمانوں میں (جیسا کہ اکبر وغیرہ) اور زمین میں (جیسے عناصر و عنصریات) جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے (یعنی ان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں) اور وہ ان کی طرف (ذرا) توجہ نہیں کرتے (یعنی ان سے استدلال نہیں کرتے) اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتر ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں پس بدون توحید خدا کا ماننا مثل شمانیہ کے ہے پس یہ لوگ اللہ کیستے کسی کفر کرتے ہیں اور نبوت کیستے بھی کفر کرتے ہیں سو کیا اللہ و رسول کے منکر ہو کر پھر بھی اس سے مطمئن ہوئے ہیں کہ انہیں خدا کے خلاف کی کوئی ایسی آفت آپڑی جو انکو غیظ ہو سکے یا ان پر چنانکہ قیامت آجائے، اور ان کو (پہلے سے) خبر بھی نہ ہو (مطلب یہ ہے کہ مقتضائے کفر کا عقوبت ہے خواہ دنیا میں نازل ہو جائے یا قیامت کے دن واقع ہو رہے) ان کو ڈرنا اور کفر کو چھوڑ دینا چاہئے) آپ فرمادیتے کہ میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں (توحید کی اور اپنے داعی من اللہ ہونے کی) دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی (یعنی میرے پاس بھی دلیل ہے توحید و رسالت کی اور میرے ساتھ والے بھی استدلال کے ساتھ مجھ پر ایمان لائے ہیں، میں بے دلیل بات کی طرف کسی کو نہیں بلاتا، دلیل سنو اور سمجھو، پس حاصل طریق یہ ہوا کہ خدا واحد ہے اور میں داعی ہوں) اور اللہ (شرک سے) پاک ہے اور میں (اس طریق کو قبول کرتا ہوں اور) مشرکین میں سے نہیں ہوں اور (یہ جو نبوت پر شبہ کرتے ہیں کہ نبی فرشتہ ہونا چاہئے محض مہمل بات ہے کیونکہ) ہم نے آپ سے پہلے مختلف بستی والوں میں سے جتنے (رسول) بھیجے سب آدمی ہی تھے جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے (کوئی بھی فرشتہ نہ تھا جنہوں نے ان کو نہ مانا، اور ایسے ہی مہمل شبہات کرتے رہے، ان کو سزائیں دی گئیں، اسی طرح ان کو بھی سزا ہوگی خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں، اور یہ لوگ جو بے فکر ہیں) تو کیا یہ لوگ ملک میں (کہیں) چلے پھرے نہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا (دُرا) انجام ہوا جو ان سے پہلے (کافر) ہو گزرے ہیں اور (یاد رکھو کہ جس دنیا کی محبت میں مریض ہو کر تم نے کفر اختیار کیا ہے یہ دنیا فانی اور سچ ہے) البتہ عالم آخرت اُن لوگوں کے لئے نہایت بہبودی کی چیز ہے جو (شرک وغیرہ سے) احتیاط رکھتے ہیں (اور توحید و اطاعت اختیار کرتے ہیں) تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (کہ فانی اور بے حقیقت چیز اچھی ہو یا باقی اور پائدار) :

معارف و مسائل

ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ پورا بیان فرمانے کے بعد پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ، یعنی یہ قصہ غیب کی اُن خبروں میں سے ہے جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا ہے، آپ برادرانِ یوسفؑ کے پاس موجود نہ تھے،

جبکہ وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنا طے کر چکے تھے اور اس کے لئے تدبیریں کر رہے تھے۔
اس اظہار کا مقصد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس قصہ کو پوری تفصیل کے ساتھ صحیح صحیح بیان کر دینا آپ کی نبوت اور وحی کی واضح دلیل ہے، کیونکہ یہ قصہ آپ کے زمانہ سے ہزاروں سال پہلے کا ہے، نہ آپ وہاں موجود تھے، نہ دیکھ کر بیان فرمادیا ہو اور نہ آپ نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل کی، کہ کتب تاریخ دیکھ کر یا کسی سے سنا کر بیان فرمادیا ہو اس لئے بجز وحی الہی ہونے کے اور کوئی راستہ اس کے علم کا نہیں۔

قرآن کریم نے اس جگہ صرف اتنی بات پر اکتفا فرمایا ہے کہ آپ وہاں موجود نہ تھے کسی دوسرے شخص یا کتاب سے اس کا علم حاصل نہ ہونے کا ذکر اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ پورا عرب جانتا تھا، کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امتی ہیں، آپ نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں کیا اور یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ آپ کی پوری عمر مکہ معظمہ میں گزری ہے، ملک شام کا ایک سفر تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ کیا تھا، جس میں راستے ہی سے واپس تشریف لے آئے، دوسرا سفر تجارت کے لئے کیا، چند ایام میں کام کر کے واپس تشریف لے آئے، اس سفر میں بھی کسی عالم سے ملاقات یا کسی علمی ادارے سے تعلق کا کوئی شائبہ نہیں تھا، اس لئے اس جگہ اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، اور قرآن کریم میں دوسری جگہ اس کا بھی ذکر فرمادیا ہے مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا، یعنی نزول قرآن سے پہلے ان واقعات کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔

امام بغویؒ نے فرمایا کہ یہود اور قریش نے مل کر آزمائش کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتلائیے کہ کیا اور کس طرح ہوا، جب آپ نے بوحی الہی یہ سب بتلادیا اور وہ پھر بھی اپنے کفر و انکار پر جے رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معدنہ پہنچا، اس پر اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ آپ کی نبوت و رسالت کے دلائل واضح ہونے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان لانے والے نہیں آپ کتنی ہی کوشش کریں، مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ اور اصلاح کی کوشش ہے اس کا کامیاب بنانا نہ آپ کے اختیار میں ہر نہ آپ کے ذمہ ہے، نہ آپ کو اس کا کوئی بچہ ہونا چاہیے اس کے بعد فرمایا:

وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ، یعنی آپ جو کچھ ان کو تبلیغ کرنے اور صحیح راستے پر لانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اس پر ان لوگوں سے کوئی معاوضہ تو نہیں مانگئے، جس کی وجہ سے انکو اس کے سننے یا ماننے میں کوئی دشواری ہو، بلکہ آپ کا کلام تو خالص خیر خواہی

اور نصیحت ہو تمام جہان والوں کے لئے، اس میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب اس کو شش سے آپ کا مقصد کوئی دنیوی منفعت نہیں، بلکہ ثوابِ آخرت اور قوم کی خیر خواہی ہو تو وہ مقصد آپ کا حاصل ہو چکا پھر آپ کیوں غمگین ہوتے ہیں۔

وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ
”یعنی یہ لوگ صرف یہی نہیں کہ کسی ناصح کی نصیحت ضد اور ہٹ دھرمی سے نہیں سنتے بلکہ ان کا تو حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی جو کھلی کھلی نشانیاں آسمان و زمین میں ہر وقت سامنے رہتی ہیں ان پر بھی یہ غفلت و اعراض سے گزرے چلے جاتے ہیں، ذرا دھیان نہیں دیتے کہ یہ کس کی قدرت و عظمت کی نشانیاں ہیں، آسمان و زمین میں حق تعالیٰ شانہ کی خدائی و حکمت و قدرت کی نشانیاں بے شمار ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ پھیلی قوموں پر جو عذاب آئے اور ان کی الٹی ہوئی یا برباد کی ہوئی بستیاں ان کی نظروں سے گزرتی ہیں، مگر ان سے بھی کوئی عبرت نہیں پکڑتے۔
یہ بیان تو ایسے لوگوں کا تھا جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی حکمت و قدرت ہی کے قائل نہیں تھے، آگے ان کا بیان ہے جو وجود باری تعالیٰ کے، تو قائل ہیں، مگر اس کی خدائی میں دوسری چیزوں کو شریک قرار دیتے ہیں، فرمایا:

وَمَا يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ إِلَّا وَهْمٌ مُّشْرِكُونَ، یعنی ان میں جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان بھی لاتے ہیں تو وہ بھی شرک کے ساتھ، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت وغیرہ اوصاف میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، جو سراسر ظلم اور جہل ہے۔

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو ایمان کے باوجود مختلف قسم کے شرک میں مبتلا ہیں، مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تم پر جس چیز کا خطرہ ہے ان میں سب سے زیادہ خطرناک شرک صخر ہے، صحابہ کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ریا، شرک صخر ہے، اسی طرح ایک حدیث میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا، (ابن کثیر عن اسرندی) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام کی منت اور نیاز ماننا بھی باتفاق فقہاء اس میں داخل ہے۔

اس کے بعد ان کی غفلت و جہالت پر اظہارِ افسوس و تعجب ہے کہ یہ لوگ اپنے انکار و کفر کے باوجود اس بات سے کیسے بے فکر ہو گئے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حادثہ عذاب کا آپڑے، یا دفعۃً ان پر قیامت آجائے اور وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں۔

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ، ”یعنی آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ (تم مانو یا نہ مانو) میرا تو یہی

طریقہ اور مسلک ہو کہ لوگوں کو بصیرت اور یقین کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتا رہوں، میں بھی اور وہ لوگ بھی جو میرا اتباع کرنے والے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ میری یہ دعوت کسی سرسری نظر پر مبنی نہیں بلکہ پوری بصیرت اور عقل و حکمت کا ثمرہ ہے، اس دعوت و بصیرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین اور پیروؤں کو بھی شامل فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جو علوم رسالت کے خزانے اور خداوند سبحانہ و تعالیٰ کے سپاہی ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس تمام امت کے بہترین افراد ہیں جن کے قلوب پاک اور علم گہرا ہے، تکلف کا ان میں نام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی صحبت و خدمت کے لئے منتخب فرمایا ہے، تم انہی کے اخلاق و عادات اور طریقوں کو سیکھو، کیونکہ وہی سیدھے راستہ پر ہیں۔

اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ مَنِ اتَّبَعَنِي عام ہو ہر اس شخص کے لئے جو قیامت تک دعوت رسول کو امت تک پہنچانے کی خدمت میں مشغول ہو، کبھی اور ابن زید نے فرمایا کہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا دعویٰ کرے اس پر لازم ہو کہ آپ کی دعوت کو لوگوں میں پھیلائے، اور قرآن کی تعلیم کو عام کرے (منہجری)

سُبْحَنَ اللّٰهِ وَمَا اَنَّا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، یعنی شرک سے پاک ہے اللہ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں، اور چونکہ یہ ذکر آیا تھا کہ اکثر لوگ جب اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں تو اس کے ساتھ شرک جلی یا خفی ملا دیتے ہیں، اس لئے شرک سے اپنی بالکل برائت کا اعلان فرمایا، خلاصہ یہ ہو کہ میری دعوت کا یہ مطلب نہیں کہ میں لوگوں کو اپنا بندہ بناؤں، بلکہ میں خود بھی اللہ کا بندہ ہوں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں، البتہ بحیثیت اعلیٰ مجھ پر ایمان لانا فرض ہے۔

اس پر جو مشرکین مکہ یہ شبہ پیش کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور قاصد تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہونا چاہئے، اس کا جواب اگلی آیت میں اس طرح فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ مِنْ اٰهْلِ الْقُرْاٰی اٰیہن

ان کا یہ خیال بے بنیاد اور لغو ہے کہ اللہ کا رسول اور پیغمبر فرشتہ ہونا چاہئے انسان نہیں ہو سکتا بلکہ معاملہ برعکس ہو کہ انسانوں کے لئے اللہ کا رسول ہمیشہ انسان ہی ہوتا چلا آیا ہے، البتہ عام انسانوں سے اس کو یہ ہتھیاز حاصل ہوتا ہے کہ اس کی طرف براہ راست حق تعالیٰ کی وحی اور پیغام آتا ہے، اور وہ کسی کی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بندوں میں سے جس کو

مناسب سمجھتے ہیں اس کام کے لئے انتخاب فرمالتے ہیں، اور یہ انتخاب ایسی خاص صفات کمال کی بناء پر ہوتا ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتیں۔

آگے ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اللہ کی طرف داعی اور رسول کی ہدایات کی خلاف ورزی کر کے عذاب الہی کو دعوت دیتے ہیں، فرمایا:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ دَلَّ الْأُولَىٰ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا أَفَلَا يَعْقِلُونَ، یعنی کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ ان کو پہلی قوموں کے حالات کا مشاہدہ ہو کہ رسولوں کے انکار نے ان کو کس انجام بد میں مبتلا کیا، مگر یہ لوگ دنیا کی ظاہری زینت و راحت میں مست ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں، حالانکہ یہ ہیزگاروں کے لئے آخرت اس دنیا سے کہیں زیادہ بہتر ہے، کیا ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ دنیا کی چند روزہ راحت کو آخرت کی دائمی اور مکمل نعمتوں اور راحتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

احکام و ہدایات

ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ يَه سب کچھ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کو وحی کے ذریعہ بتلاتے ہیں، یہی ضمنی تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ آل عمران آیت ۴۴ میں حضرت مریم کے قصہ میں آیا ہے، ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ، اور سورۃ ہود کی آیت نمبر ۴۹ میں نوح علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق آیا ہے، تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ۔

ان آیتوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیب کی خبروں پر بذریعہ وحی مطلع کر دیتے ہیں، خصوصاً ہمارے رسول سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیب کی خبروں کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے جو تمام انبیاء سابقین سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو قیامت تک ہونے والے بہت سے واقعات کا تفصیل یا اجمال سے پتہ دیا ہے، کتب حدیث میں کتاب الفتن کی تمام حدیثیں اس سے بھری ہوئی ہیں۔

عوام الناس چونکہ علم غیب صرف اسی کو جانتے ہیں کہ کوئی شخص غیب کی خبروں سے کسی طرح واقف ہو جائے، اور یہ وصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود ہے، اس لئے خیال کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے، مگر قرآن کریم نے انہیں لفظوں میں اعلان فرمایا ہرگز لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

عالم الغیب سوائے خداے تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، علم غیب اللہ جل شانہ کی صفت خاصہ ہے۔ اس میں کسی رسول یا فرشتہ کو شریک سمجھنا ان کو اللہ کی برابر بنانے کے مرادف اور عیسائیوں کا عمل ہی، جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں، قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں سے معاملہ کی پوری حقیقت واضح ہو گئی، کہ علم غیب تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے، اور علم الغیب صرف اللہ جل شانہ ہی ہیں، البتہ غیب کی بہت سی خبریں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بتلا دیتے ہیں، یہ قرآن کریم کی اصطلاح میں علم غیب نہیں کہلاتا، اور عوام چونکہ اس باریک فرق کو نہیں سمجھتے تو غیب کی خبروں ہی کو علم غیب کہہ دیتے ہیں اور جب قرآنی اصطلاح کے مطابق غیر اللہ سے علم غیب کی نفی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اختلاف کرنے لگتے ہیں، جس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ

اختلاف خلق از نام اوستاد چوں معنی رفت آرام اوستاد

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے متعلق لفظ رِجَال سے معلوم ہوا کہ رسول ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں، عورت نبی یا رسول نہیں ہو سکتی۔

امام ابن کثیر نے جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی یا رسول نہیں بنایا، بعض علماء نے چند عورتوں کے متعلق نبی ہونے کا اقرار کیا ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم ام عیسیٰ علیہا السلام، کیونکہ ان تینوں خواتین کے بارے میں قرآن کریم میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ حکم خداوندی فرشتوں نے ان سے کلام کیا، اور بشارت سنائی یا خود ان کو وحی الہی سے کوئی بات معلوم ہوئی، مگر جمہور علماء کے نزدیک ان آیتوں سے ان تینوں خواتین کی بزرگی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہونا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ صرف یہ الفاظ ان کی نبوت و رسالت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

اور اسی آیت میں لفظ أَهْلِ الْقُرَىٰ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول عموماً مشہور وں اور قصبروں کے رہنے والوں میں بھیجتے ہیں، دیہات اور جنگل کے باشندوں میں سے رسول نہیں ہوتے، کیونکہ عموماً دیہات اور جنگل کے باشندے سخت مزاج اور عقل و فہم میں کامل نہیں ہوتے (ابن کثیر و مترطبی وغیرہ)۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُنُوْا جَاءَهُمْ

یہاں تک کہ جب نامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو

نَصْرُنَا فَنُجِّيْهِمْ مِّنْ نَّشَأُهُمْ وَلَا يَرْدُ بَاسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۱

ہماری مدد پھر بجا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھر تا نہیں عذاب ہمارا قوم گنہگار سے

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا

البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے عقل والوں کو، کچھ بنائی ہوئی بات

يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلُ كُلِّ

نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز

شَيْءٍ وَهَدًى وَرَحْمَةً لِّلْقَوْمِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۲

کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

(اگر تم کو کفار پر تاخیر عذاب سے شبہ عدم وقوع کا ہوتا ہو تو تمہاری غلطی ہے، اس لئے

کہ پہلی امتوں کے کفار کو بھی بڑی بڑی ہمتیں دی گئی تھیں) یہاں تک کہ مدت مہلت و راز

ہونے کی وجہ سے (پیغمبر اس بات سے) مایوس ہو گئے کہ ہم نے اللہ کی طرف سے کفار پر عذاب

آنے کے وعدہ کا جو وقت اپنے قیاس اور انداز سے مقرر کر لیا تھا کہیں وقت میں کفار پر عذاب آکر ہمارا

غلبہ اور حقانیت واضح ہو جائے گی، اور ان (پیغمبروں) کو گمان غالب ہو گیا کہ (وعدۃ الہیہ کا وقت

مقرر کرنے میں) ہمارے فہم نے غلطی کی (کہ بلا تخصیص بعض قرآن یا نصرت الہیہ کے جلد آنے کی خواہش

سے قریب کا وقت معین کر لیا، حالانکہ وعدہ مطلق ہے ایسی مایوسی کی حالت میں) ان کو ہماری مدد

پہنچی (وہ مدد یہ کہ کفار پر عذاب آیا) پھر (اس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا وہ بچا لیا گیا،

(مراد اس سے مؤمنین ہیں) اور (اس عذاب میں کفار ہلاک کئے گئے، کیونکہ) ہمارا عذاب مجرم لوگوں

سے نہیں ہٹتا، (بلکہ ان پر ضرور واقع ہوتا ہے، گو بدیر سہی، پس یہ کفار مکہ بھی اس دھوکہ میں رہیں،

ان (انبیاء و ائمہ سابقین) کے قصہ میں سمجھدار لوگوں کے لئے (بڑی) عبرت ہو (جو اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں

کہ اطاعت کا یہ انجام ہو اور عصیت کا یہ انجام ہو) یہ قرآن (جس میں یہ قصے ہیں) کوئی تراشی ہوئی بات تو نہیں

(کہ اس سے عبرت نہ ہوتی) بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں نازل ہو چکی ہیں یہ ان کی تصدیق کرنیوالا اور

ہر ضروری بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے پس ایسی کتاب میں جو عنایت و عبرت کے ہوں گے ان سے تو عبرت حاصل کرنا لازم ہی ہے۔

معارف و مسائل

پہلی آیتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور دعوت حق دینے کا ذکر اور انبیاء کے متعلق کچھ شبہات کا جواب دیا گیا تھا، آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس پر تنبیہ ہو کہ یہ لوگ انبیاء کی مخالفت کے انجام بد پر نظر نہیں کرتے، اگر یہ ذرا بھی غور کریں اور اپنے گرد و پیش کے شہروں اور مقامات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بد اس دنیا میں بھی کس قدر سخت ہوا ہے، قوم لوط علیہ السلام کی بستی اٹل دی گئی، قوم عاد و ثمود کو طوح طوح کے عذابوں سے نیست و نابود کر دیا گیا، اور آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔

دوسری آیت میں ہدایت کی گئی کہ دنیا کی تکلیف و راحت تو بہر حال چند روزہ ہے، اس فکر آخرت کی ہونی چاہئے، جہاں کا قیام دائمی اور رنج و راحت بھی دائمی ہو اور فرمادیا کہ آخرت کی درستی تقویٰ پر ہو قیوم ہے، جس کے معنی تمام احکام شرعیہ کی پابندی کرنا ہیں۔

اس آیت میں پچھلے رسولوں اور ان کی امتوں کے حالات سے موجودہ لوگوں کو متنبہ کرنا تھا اس لئے اگلی آیت میں ان کے ایک شبہ کو دور کیا گیا، وہ یہ کہ اکثر لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عذاب الہی سے ڈرانے کا ذکر عرصہ سے سن رہے تھے اور کوئی عذاب آتا نظر نہیں آتا تھا، اس سے ان کی ہمتیں بڑھ رہی تھیں کہ کوئی عذاب آتا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا، اس لئے فرمایا کہ اللہ جل شانہ اپنی رحمت اور حکمت بالغہ سے بسا اوقات مجرم قوموں کو مہلت دیتے رہتے ہیں، اور یہ مہلت بعض اوقات بڑی طویل بھی ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے سرکشوں کی جرات بڑھ جاتی ہے، اور پیغمبروں کو ایک گوند پریشانی پیش آتی ہے، ارشاد فرمایا:-

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُنُوْا إِجَاءَ هُمْ نَصْرَتَا
فَنُفِثَ مِنْ شَتَاءٍ وَلَا يَرُدُّ بَأْسُنَا عَنْ الْقَوْمِ الْمُسْرِئِينَ ۚ (یعنی پچھلی امتوں کے نافرمانوں کو بڑی بڑی ہمتیں دی گئیں، یہاں تک کہ مدت دراز تک ان پر عذاب نہ آنے سے پیغمبر یہ خیال کر کے مایوس ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کے اجمالی وعدہ عذاب کا جو وقت ہم نے اپنے انداز سے اپنے ذہنوں میں مقرر کر رکھا تھا اس وقت میں کفار پر عذاب نہ آئے گا اور حق کا غلبہ ظاہر نہ ہوگا، اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ وعدہ الہیہ کا اپنے اندازہ سے وقت مقرر کرنے میں ہماری فہم نے غلطی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو کوئی محقق وقت بتلایا نہیں تھا، ہم نے مخصوص قرآن سے ایک مدت

متعین کر لی تھی، اس مایوسی کی حالت میں ان کو ہماری مدد پہنچی، وہ یہ کہ وعدے کے مطابق کفار پر عذاب آیا، پھر اس عذاب سے ہم نے جس کو چاہا اس کو بچا لیا گیا، مراد اس سے یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے مؤمنین کو بچا لیا گیا، اور کفار ہلاک ہو گئے، کیونکہ ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ہٹتا، بلکہ ضرور آکر رہتا ہے، اس لئے کفار مکہ کو چاہتے کہ عذاب میں دیر ہونے سے دھوکہ کھینچ رہیں۔ اس آیت میں لفظ **کُنْ بُؤَا** مشہور قرات کے مطابق پڑھا گیا ہے، اور اس کی جو تفسیر ہم نے اختیار کی ہے وہ سب زیادہ اسلم اور بے خیار ہے، کہ لفظ **کُنْ بُؤَا** کا حاصل اپنے تئیں اور دنیاں کا غلط ہونا ہے، جو ایک قسم کی اجتہادی غلطی ہے، اور انبیاء علیہم السلام سے کوئی ایسی اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے، البتہ انبیاء اور دوسرے مجتہدین میں یہ فرق ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب کوئی اجتہاد غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتے، بلکہ ان کو باخبر کر کے حقیقت کھول دیتے ہیں، دوسرے مجتہدین کا یہ مقام نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ صلح حدیبیہ آہ مضمون کے لئے کافی شاہد ہے، کیونکہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ اس واقعہ کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خواب ہے، آپ نے دیکھا کہ آپ صبح صادق کے بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی حکیم وحی ہوتا ہے، اس لئے اس واقعہ کا ہونا یقینی ہو گیا، مگر خواب میں اس کا کوئی خاص وقت اور مدت نہیں بتلائی گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اندازہ سے خیال فرمایا کہ اسی سال ایسا ہوگا، اس لئے صحابہ کرام میں اعلان کر کے ان کی خاص تعداد کو ساتھ لے کر عمرہ کے لئے مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے، مگر قریش مکہ نے مزاحمت کی اور اس وقت طواف و عمرہ کی نوبت نہ آئی، بلکہ اس کا مکمل فلوڑ دو سال بعد شہرہ ہجری میں فوج مکہ کی صورت سے ہوا، اور اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ جو خواب آپ نے دیکھا تھا وہ حق و یقینی تھا، مگر اس کا وقت جو قرائن یا اندازہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا تھا اس میں غلطی ہوئی مگر اس غلطی کا ازالہ اسی وقت ہو گیا۔

اسی طرح آیت مذکورہ میں **قَدْ کُنْ بُؤَا** کا جس میں غموم ہے کہ کفار پر عذاب آنے میں دیر ہوئی، اور جو وقت اندازہ سے انبیاء نے اپنے ذہن میں مشترک کیا تھا اس وقت عذاب نہ آیا تو ان کو یہ گمان ہوا کہ ہم نے وقت متعین کرنے میں غلطی کی ہے، یہ تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے اور علامہ طبری نے کہا کہ یہ روایت صحیح ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں ذکر کی گئی ہے (منظری)

اور بعض قراءتوں میں یہ لفظ ذال کی تشدید کے ساتھ **قَدْ کُنْ بُؤَا** بھی آیا ہے، جو مصدر تکذیب سے مشتق ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ انبیاء نے جو اندازہ سے وقت عذاب مقرر کر دیا تھا اس وقت پر عذاب نہ آنے سے ان کو یہ خطہ ہو گیا کہ اب جو مسلمان ہیں وہ بھی ہماری

تکذیب نہ کرنے لگیں، کہ جو کچھ ہم نے کہا تھا وہ پورا نہیں ہوا، ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، منکروں پر عذاب آپڑا اور یومئین کو اس سے نجات ملی، اس طرح اُن کا غلبہ ظاہر ہو گیا۔
لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ”یعنی ان حضرات کے قصوں میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے“

اس سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام کے قصے جو قرآن میں مذکور ہیں وہ بھی ہو سکتے ہیں اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جو اس سورۃ میں بیان ہوا ہے وہ بھی، کیونکہ اس واقعہ میں یہ بات پوری طرح روشن ہو کر سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی کس کس طرح سے تائید نصرت ہوتی ہے، کہ کنوئیں سے نکال کر ایک تخت سلطنت پر اور بدنامی سے نکال کر نیک نامی کی انتہا پر پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور مکرو فریب کرنے والوں کا انجام ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصَدِّقُ الَّذِي تَبَيَّنَ بَيْنَ يَدَيْهِ ”یعنی نہیں ہے یہ قصہ کوئی مکرزی ہوئی بات بلکہ تصدیق ہے اُن کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، کیونکہ تورات و انجیل میں بھی یہ قصہ یوسف علیہ السلام کا مذکور ہے، اور حضرت وہاب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جتنی آسانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں یوسف علیہ السلام کے قصہ کوئی خالی نہیں (منظری)
وَقَدْ صَبَّلَ رَبِّيَ شَيْءًا وَهَدَىٰ ذَرَجَتَهُ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ”یعنی یہ قرآن تفصیل ہے ہر چیز کی، مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر اس چیز کی تفصیل موجود ہے جس کی دین میں انسان کو ضرورت ہے، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست وغیرہ انسانی زندگی کے ہر انفرادی یا اجتماعی حال سے متعلق احکام و ہدایات اس میں موجود ہیں، اور فرمایا کہ یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے، اس میں ایمان لانے والوں کی تنصیب جس اس لئے کی گئی کہ اس کا نفع ایمان والوں ہی کو پہنچ سکتا ہے، کافروں کے لئے بھی اگرچہ قرآن رحمت اور ہدایت ہی ہے مگر ان کی اپنی بد عملی اور نافرمانی کے سبب یہ رحمت و ہدایت ان کے لئے وبال بن گئی۔

شیخ ابو منصور نے فرمایا کہ پوری سورۃ یوسف اور اس میں درج شدہ قصہ یوسف کے بیان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصد ہے کہ آپ کو جو کچھ ایذائیں اپنی قوم کے ہاتھوں پہنچ رہی ہیں پچھلے انبیاء کو بھی پہنچی ہیں مگر ان کا اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی غالب فرمایا آپ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے :

سورۃ یوسف تمام شد

سُورَةُ الرَّعْدِ

سُورَةُ الرَّعْدِ بِرَكْعَتَيْنِ وَهِيَ ثَلَاثٌ وَأَرْبَعُونَ آيَةً وَسِتِّتَارُكَوْنُ عِبَادَاتٍ

سورۃ رعد کہ میں نازل ہوئی اور اس میں تینتالیس آیتیں اور چھ رکعات ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ

یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور جو کچھ اُترا تجھ پر میرے رب سے

الْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ①

سو حق اور لیکن بہت لوگ نہیں مانتے ، اللہ وہ ہے جس نے اوپر

السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرْوَاهُنَّ غِطَاوَى عَلَى الْعَرْشِ وَقَفُورٌ

بناتے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو تم ان کو پھر قائم ہوا عرش پر اور کلام میں لگا دیا

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ

سورج اور چاند کو ، ہر ایک چاہے وقت مختار ہے تدبیر کرتا ہے کام کی

يَفْصِلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَفْقَهُوْنَ ② وَهُوَ الَّذِي

ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ شاید تم اپنے رب سے سمجھ سکو ، اور وہی ہے جس نے

مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ كُلِّ

پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ اور ندیاں اور ہر

الشَّمَرَاتِ جَعَلَ فِرَازًا وَجَنِّينَ اثْنَيْنِ يُغْشَى اللَّيْلُ النَّهَارُ إِنَّ

میرے کے رکے اس میں جوڑے اور دو قسم، ڈھانکتا ہر دن پر رات کو اس میں

فِي ذَلِكَ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝۳ وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ

نشانیاں ہیں اُن کے واسطے جو کہ دھیان کرتے ہیں اور زمین میں کھیت ہیں مختلف

مَتَجَازٍ وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَتُرُفٌ رَّحْمٌ وَنَخِيلٌ وَنَوَّارٌ وَغَيْرُ

ایک دوسرے سے متصل اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ دوسری سے مل

صَوَّانٍ يُسْقَى بِسَاءٍ وَاحِدٍ وَنُقْضِلٌ بَعْضُهُ عَلَى بَعْضٍ

ہوتی اور بعض بن ملی اُن کو پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے اور ہم ہیں کہ بڑھا، پتر ہیں ان میں سے ایک کو ایک سے

فِي الْأَكْلِ إِنَّ فِي ذَلِكَ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝۴

میسوں میں ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

الشَّمَرَاتِ، (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو آپ سن رہی ہیں) آیتیں ہیں ایک

بڑی کتاب (یعنی قرآن) کی، اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ بالکل

سچ ہے اور اس کا مقتضایہ تھا کہ سب ایمان لاتے، لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے،

(دَلِيلًا، اور حقیقت قرآن کا مضمون تھا، آگے توحید کا مضمون ہے جو کہ اعظم مقاصد قرآن کے

ہے) اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بدو ستون کے اور نچا کھڑا کر دیا چنانچہ قرآن

(آسمانوں) کو (اسی طرح) دیکھ رہے ہو پھر عرش پر (جو مشابہ ہر تخت سلطنت کے اس طرح)

قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے) اور آفتاب و ماہتاب کو کام میں

لگا دیا (ان دونوں میں سے) ہر ایک (اپنے مدار پر) ایک وقت محبت میں چلتا رہتا ہے (چنانچہ

سورج اپنے مدار کو سال بھر میں قطع کر لیتا ہے اور پانچ مہینہ بھر میں ادھی (اللہ) ہر کام کی

(جو کچھ عالم میں واقع ہوتا ہے) تدبیر کرتا ہے (اور) دلائل (مکونینہ و تشریحیہ) کو صاف صاف

بیان کرتا ہے، تاکہ تم اپنے رب کے پاس جلنے کا (یعنی قیامت کا) یقین کر لو (اس کے امکان کا

تو اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ ایسی عظیم چیزوں کی تخلیق پر قادر ہو تو مردوں کو زندہ کرنے پر کیوں

نہیں قادر ہوگا، اور اس کے وقوع کا یقین اس طرح کہ غیر صادق نے ایک امر ممکن کے وقوع

کی خبر دی (لامحالہ وہ جتنی اور صحیح ہے) اور وہ ایسا ہے کہ اس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس (زمین) میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پیدا کئے (مثلاً کھٹے اور میٹھے یا چھوٹے اور بڑے، کوئی کسی رنگ کا اور کوئی کسی رنگ کا اور) شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو چھپا دیتا ہے (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہو جاتی ہے) ان امور (مذکورہ) میں سوچنے والوں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید پر) دلائل (موجود) ہیں (جس کی تقریر بارہ دو دم کے رکوع چہارم کے شروع میں گزری ہے) اور (اسی طرح اور بھی دلائل ہیں توحید کے چنانچہ) زمین میں پاس پاس (اور پھر) مختلف قطعے ہیں جن کا باوجود متصل ہونے کے مختلف الاثر ہونا عجیب بات ہے اور انگوروں کے باغ ہیں اور مختلف (کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت) ہیں جن میں بعضے تو ایسے ہیں کہ ایک تنہ اور پر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعضوں میں دو تنے نہیں ہوتے (بلکہ ہر سے شاخوں تک ایک ہی تنہ چلا جاتا ہے اور) سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے اور (باوجود اس کے پھر بھی) ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں ان امور (مذکورہ) میں (بھی) سمجھاروں کے (سمجھنے کے) واسطے (توحید کے) دلائل (موجود) ہیں :

معارف و مسائل

یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی محل آیتیں تینتالیس ہیں، اس سورۃ میں بھی قرآن مجید کا کلام حق ہونا، اور توحید و رسالت کا بیان اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

الَّذِي، یہ حروف مقطعه ہیں، جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اُمت کو اس کے معنی نہیں بتلائے گئے، عام اُمت کو اس کی تحقیق میں پڑنا بھی مناسب نہیں۔

حدیث رسول بھی قرآن پہلی آیت میں قرآن کریم کے کلام الہی اور حق ہونے کا بیان ہے، کتاب کی ملت وحی الہی ہے سے مراد قرآن ہے اور الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ الْبَاقِ سے بھی

ہو سکتا ہے کہ قرآن ہی مراد ہو لیکن واؤ حرف عطف بظاہر یہ چاہتا ہے کہ کتاب اور

الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ دو چیزیں الگ الگ ہوں، اس صورت میں کتاب سے مراد قرآن اور

الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ سے مراد وہ وحی ہوگی جو علاوہ قرآن کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آتی ہے،

کیونکہ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی وحی صرف

قرآن میں منحصر نہیں، خود قرآن کریم میں ہے وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ،

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ کسی اپنی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ ایک وحی ہوتی ہو جو

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

جو قرآن کے علاوہ دوسرے احکام دیتے ہیں وہ بھی منزل من اللہ ہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہو اور اس کی تلاوت نہیں ہوتی، اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ جل شانہ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور قرآن کے علاوہ حدیث میں جو احکام آپ دیتے ہیں، ان کے بھی معانی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوتے ہیں، مگر الفاظ منزل من اللہ نہیں ہوتے، اسی لئے نماز میں ان کی تلاوت نہیں کی جاسکتی۔

معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ یہ قرآن اور جو کچھ احکام آپ پر نازل کئے جاتے ہیں وہ سب حق ہیں جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن اکثر لوگ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے اس پر ایمان نہیں لاتے۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے دلائل مذکور ہیں کہ اس کی مخلوقات اور مصنوعات کو ذرا غور سے دیکھو تو یہ یقین کرنا پڑے گا کہ ان کی بنانے والی کوئی ایسی ہستی ہے جو قادر مطلق ہے اور تمام مخلوقات و کائنات اس کے قبضہ میں ہیں۔

ارشاد فرمایا: اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَلٍ تَرَوْنَهَا، یعنی اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں کے اتنے بڑے وسیع اور بلند قبة کو بغیر کسی ستون کے اونچا کھڑا کر دیا، جیسا کہ تم ان آسمانوں کو اسی حالت میں دیکھ رہے ہو۔

کیا آسمان کا جرم عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے آسمان کا رنگ ہے؟
آلہم یومک نفا آتہم مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیری کی آمیزش سے منسوب ہوتا ہے، کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیری ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے، قرآن کریم کی چند آیات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسے اسی آیت مذکورہ میں تَرَوْنَهَا کے الفاظ ہیں، اور دوسری آیت میں إِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں، فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو، یا کوئی دوسرا رنگ ہو مگر درمیانی روشنی اور اندھیری کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو، اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ جگہ اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یقینی دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا (روح اللہ تعالیٰ) اس کے بعد فرمایا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ، یعنی پھر عرش پر جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے، قائم اور اس طرح جلوہ فرما ہوا جو اس کی شان کے لائق ہے، اس جلوہ فرمانے کی کیفیت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا، اتنا اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ جس طرح کا استواء ایشان الہی کے

شایان ہے وہ مراد ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى، یعنی اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کو مسخر اور تابع حکم کیا ہوا ہے، ان میں سے ہر ایک ایک معین رفتار سے چلتا ہے۔

مسخر کرنے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کو جس جس کام پر لگادیا ہے برابر گئے ہوتے ہیں، ہزاروں سال گزر گئے ہیں لیکن نہ کبھی ان کی رفتار میں کمی بیشی ہوتی ہے، نہ ٹھککتے ہیں، نہ کبھی اپنے مقررہ کام کے خلاف کسی دوسرے کام میں لگتے ہیں، اور معین مدت کی طرف چلنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پورے عالم دنیا کے لئے جو آخری مدت قیامت تعین ہے، سب اسی کی طرف چل رہے ہیں اس منزل پر پہنچ کر ان کا یہ سارا نظام ختم ہو جائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے ہر ایک سیارے کے لئے ایک خاص رفتار اور خاص مدار مقرر کر دیا ہے وہ ہمیشہ اپنے مدار پر اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے، چاند اپنے مدار کو ایک ماہ میں پورا کر لیتا ہے، اور آفتاب سال بھر میں پورا کرتا ہے۔

ان سیاروں کا عظیم الشان وجود پھر ایک خاص مدار پر خاص رفتار کے ساتھ ہزاروں سال سے یکساں انداز میں اسی طرح چلتے رہنا کہ کبھی ان کی مشین گھستی ہے نہ ٹوٹتی ہے، نہ اس کو گریسنگ کی ضرورت ہوتی ہے، انسانی مصنوعات میں سنسن کی اس انتہائی ترقی کے بعد بھی اس کی نظیر تو کیا اس کا ہزاروں حصہ ملنا بھی ناممکن ہو، یہ نظام قدرت باواز بلند پکار رہا ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والی کوئی ایسی ہستی ضرور ہو جو انسان اور اک و شعور سے بالاتر ہے۔

ہر چیز کی تدبیر حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا يَدِّبُ الْأُمُورَ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔
کام ہے، انسانی تدبیر برائے نام ہے انسان جو اپنی تدبیروں پر نازاں ہے ذرا آنکھ کھول کر

دیکھے تو معلوم ہو گا کہ اس کی تدبیر کسی چیز کو نہ پیدا کر سکتی ہے، نہ بنا سکتی ہے، اس کی ساری تدبیروں کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ خداوند سبحانہ و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا جیسے استعمال سمجھ لے، تمام اشیاء عالم کے استعمال کا نظام بھی اس کی قدرت سے خارج ہے، کیونکہ انسان اپنے ہر کام میں دوسرے ہزاروں انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کا محتاج ہو جن کو اپنی تدبیر سے اپنے کام میں نہیں لگا سکتا، قدرت خداوندی ہی نے ہر چیز کی کڑی دوسری چیز سے اس طرح جوڑی ہے، کہ ہر چیز کبھی چلی آتی ہے، آپ کو مکان بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو نقشہ بنانے والے آرکیٹیکٹ سے لے کر رنگ و روغن کرنے والوں تک سینکڑوں انسان اپنی جان اور اپنا ہنر لئے ہوئے آپ کی خدمت کو تیار نظر آتے ہیں، سامان تعمیر جو بہت سی دکانوں میں بکھا ہوا ہے سب آپ کو تیار مل جاتا ہے، کیا آپ کی قدرت میں تھا

يَعَصِلُ الْآيَاتِ، یعنی وہ اپنی آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے، اس سے مراد آیات قرآنی بھی ہو سکتی ہیں جن کو حق تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ نازل فرمایا، چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مزید ان کا بیان اور تفسیر فرمائی۔

اور آیات سے مراد آیات قدرت یعنی اللہ جل شانہ کی قدرت کا مہم کی نشانیاں جو آسمان زمین اور خود انسان کے وجود میں موجود ہیں، وہ بھی ہو سکتی ہیں، جو بڑی تفصیل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ انسان کی نظر کے سامنے ہیں۔

لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ ۝ یعنی یہ سب کائنات اور ان کا عجیب و غریب نظام کو تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس لئے قائم فرمائے ہیں کہ تم اس میں غور کرو، توجہ متھیں آخرت اور قیامت کا یقین ہو جائے، کیونکہ اس نظام عجیب اور پیدایش عالم پر نظر کرنے کے بعد یہ اشکال تو رہ نہیں سکتا کہ آخرت میں انسان کے دوبارہ پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج سمجھیں، اور جب داخل قدرت اور ممکن ہونا معلوم ہو گیا، اور ایک ایسی ہستی نے اس کی خبر دی جس کی زبان پوری عمر میں کبھی جھوٹ پر نہیں چلی، تو اس کے واقع اور ثابت ہونے میں کیا شک رہ سکتا ہے۔
وَهُوَ الَّذِي مَلَأَ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رِجَالًا وَأَنْهَارًا وَسَمَاءً وَمِنْ دُونِهِ ذَاتٌ

زمین کا پھیلاؤ اس کے کرہ اور گول ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ گول چیز جب بہت بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے، اور قرآن کریم کا خطاب عام لوگوں سے انہی کی نظروں کے مطابق ہوتا ہے، ظاہر دیکھنے والا اس کو ایک پھیلی ہوئی سطح دیکھتا ہے، اس لئے اس کو پھیلانے سے تعبیر کر دیا گیا، پھر اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے نیز اور بہت سے دوسرے فوائد کے لئے اس پر اونچے اونچے بھاری پہاڑ قائم فرما دیے، جو ایک طرف زمین کا توازن قائم رکھتے ہیں، دوسری طرف ساری مخلوق کو پانی پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں، پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی چوٹیوں پر بحر منجمد (برف) کی شکل میں رکھ دیا جاتا ہے، جس کے لئے نہ کوئی حوص ہے اور نہ ٹنکی بنانے کی ضرورت ہے، نہ ناپاک ہونے کا احتمال، نہ سڑنے کا امکان، پھر اس کو ایک زیر زمین قدرتی پائپ لائن کے ذریعہ ساری دنیا

میں پھیلا یا جاتا ہے، اسی سے کہیں کھل ہوتی ندیاں اور نہریں نکلتی ہیں اور کہیں زیر زمین مستور رہ کر کنوؤں کے ذریعہ اس پائپ لائن کا مدراج لگایا اور پانی حاصل کیا جاتا ہے۔

وَمِنْ ثَمَرَاتِ الْجَبَلِ مِثْلُ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ، یعنی پھر اس زمین سے طرح طرح کے پھل نکالے اور ہر ایک پھل دو دو قسم کے پیدا کئے، چھوٹے بڑے، شیرخ، سفید، کھٹے میٹھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ زوجین سے مراد صرف دو نہ ہوں بلکہ متعدد انواع و اقسام مراد ہوں جسکی تعداد کم سے کم دو ہوتی ہے، اس لئے زوجین اثنین سے تعبیر کر دیا گیا، اور کچھ اجید نہیں کہ زوجین سے مراد نر و مادہ ہوں، جیسے بہت سے درختوں کے متعلق تو تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان میں نر و مادہ ہوتے ہیں، جیسے کھجور، پپیتہ وغیرہ دوسرے درختوں میں بھی اس کا امکان ہے، اگرچہ ابھی تک تحقیقات وہاں تک نہ پہنچی ہوں۔

يَعْنِي الْبَيْتَ الْبَارِ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر، مراد یہ کہ دن کی روشنی کے بعد رات لے آتا ہے جیسے کسی روشن چیز کو کسی پردہ میں ڈھانپ دیا جائے۔
 اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، بلاشبہ اس تمام کائنات کی تخلیق اور اس کی تدبیر و نظام میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرت کا ملکہ کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطْعٌ مِّمَّجِبَرَاتٍ وَجَنَّتْ مِنْ اَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخْلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقٰى بِسَآءٍ وَآحِدٍ وَنُفُوسٌ بَعْضُهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاَلْجَلِ، یعنی پھر زمین میں بہت سے قلعے آپس میں ملے ہوئے ہونے کے باوجود مزاج اور خاصیت میں مختلف ہیں، کوئی اچھی زمین ہے کوئی کھاری، کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کے قابل کوئی باغ کے قابل، اور ان قطعات میں باغات ہیں، انگور کے، اور کھیتی ہے اور کھجور کے درخت ہیں جن میں بعض ایسے ہیں کہ ایک تنے سے اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں، اور بعض میں ایک ہی تنہ رہتا ہے۔

اور یہ سائے پھل اگرچہ ایک ہی زمین سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں، اور آفتاب و ماہتاب کی شعاعیں اور مختلف قسم کی ہوائیں بھی اُن سب کو یکساں پہنچتی ہیں مگر پھر بھی ان کے رنگ اور ذائقے مختلف اور چھوٹے بڑے کا نمایاں فرق ہوتا ہے۔

باوجود اتصال کے پھر یہ طرح طرح کے اختلافات اس بات کی قوی اور واضح دلیل ہے کہ یہ سب کار و بار کسی حکیم و مدبر کے فرمان کے تابع چل رہا ہے، محض مادے کے تطورات

نہیں، جیسا کہ بعض جاہل سمجھتے ہیں کیونکہ باؤں کے تقورات ہوتے تو سب مواد کے مشترک ہونے کے باوجود یہ اختلاف کیسے ہوتا، ایک ہی زمین سے ایک پھل ایک موسم میں نکلتا ہے دو موسم دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ہی درخت کی ایک ہی شاخ پر مختلف قسم کے پھول بڑھتے بڑھتے اور مختلف ذائقہ کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ اُس میں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت اور اس کی وحدت پر دلالت کرنے والی بیست سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے، اس میں شاہد ہے کہ جو لوگ ان چیزوں میں غور نہیں کرتے وہ عقل والے نہیں گو دنیا میں ان کو کیسا ہی عقل مند سمجھا، اور کہا جاتا ہو۔

وَإِنْ تَعَجَّبَ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ إِذْ اُكِّنَّا ثِرَابًا ۚ اِنَّا لَفِي خَلْقٍ

اور اگر تو عجیب بات چاہے تو عجیب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے ہم مٹی کیا نے سر سے بنائے

جَدِيدٍ ؕ اُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولَٰئِكَ اَلَا غَلَّ

جائیں گے، وہی ہیں جو منکر ہو گئے اپنے رب سے اور وہی ہیں کہ طوق ہیں

فِي اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولَٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ؕ

ان کی گردنوں میں، اور وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی میں رہیں گے برابر

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ

اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے بُرائی کو پہلے بھلائی سے اور گزر چکے ہیں ان سے

قَبْلَهُمُ الْمَثَلَاتُ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی

پہلے بہت سے عذاب اور تیرا رب معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے

ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ۚ وَيَقُولُ الَّذِينَ

ظالم کے اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے، اور کہتے ہیں کافر

كَفَرُوا وَاُولَٰٓئِكَ لَا تُنَزَّلُ عَلَيْهِمْ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۚ اِنَّمَا اَنْتَ مُنذِرٌ

کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کے تیرا کام تو ڈرنا دینا ہے،

۱
۷

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝۶ اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْسِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ وَمَا تَغِيصُ

اور ہر قوم کیلئے ہوا ہوا راہ بتانے والا، اللہ جانتا ہی جو بیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ اور جو سکرٹے ہیں

الْأَرْحَامِ وَمَا تَرْدَادُ وُكُلِ شَيْءٍ عِنْدَكَ بِمِقْدَارٍ ۝۷

پہنٹ اور بڑھتے ہیں، اور ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے -

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ کو (ان لوگوں کے انکارِ قیامت سے) تعجب ہو تو (واقعہ) ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم (مگر) خاک ہو گئے کیا (خاک ہو کر) ہم پھر (قیامت کو) از سر نو پیدا ہوں گے (تعجب کے لائق اس لئے کہ جو ذات ایسی اشیاء مذکورہ کے خلق پر ابتداء قادر ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، اور اسی سے جواب ہو گیا استبعادِ بعث کا اور انکارِ نبوت کا بھی جس کا منہی وہ استبعاد تھا ایک کے جواب سے دوسرے کا جواب ہو گیا، آگے ان کے لئے وعید ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا (کیونکہ انکارِ بعث سے اُس کی قدرت کا انکار کیا، اور انکارِ قیامت سے انکارِ نبوت لازم آتا ہے) اور ایسے لوگوں کی گردنوں میں (دوزخ میں) طوق ڈالے جائیں گے اور ایسے لوگ دوزخی ہیں (اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ لوگ عافیت (کی ميعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے مصیبت (کے نازل ہونے) کا تقاضا کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو جاتیے عذاب منگادیتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب کے وقوع کو بہت بعید سمجھتے ہیں) حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعاتِ عقوبت گذر چکے ہیں (تو ان پر آجانا کیا مستبعد ہے) اور (اللہ تعالیٰ کے غفور اور رحیم ہونے کو سن کر یہ لوگ غرور نہ ہو جاویں کہ اب ہم کو عذاب نہ ہو گا کیونکہ وہ صرف غفور و رحیم ہی نہیں ہوتے اور پھر سب کے لئے غفور و رحیم نہیں ہیں، بلکہ دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتی ہیں یعنی) یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں باوجود ان کی (ایک خاص درجہ کی) بیجا حرکتوں کے معاف کر دیتا ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت سزا دیتا ہے، (یعنی اس میں دونوں صفتیں ہیں اور ہر ایک کے ظہور کی شرطیں اور اسباب ہیں، پس انہوں نے بلا سبب اپنے کو مستحقِ رحمت و مغفرت کیسے سمجھ لیا، بلکہ کفر کی وجہ سے اُن کے لئے تو اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہے) اور یہ کفار (انکارِ نبوت کی غرض سے) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ ان پر خاص معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں نہیں نازل کیا گیا (اور یہ اعتراض محض حماقت ہے کیونکہ آپ مالکِ معجزات نہیں، بلکہ آپ

صرف عذاب خدا سے کافروں کو ڈرانے والے (یعنی نبی) میں (اور نبی کے لئے مطلق معجزہ کی ضرورت ہو جو کہ ظاہر ہو چکا ہے) کسی خاص معجزہ کی (اور کوئی آپ انوکھے نبی نہیں ہو سکتے بلکہ ہر قوم کیلئے) (انیم ماضیہ میں) بادی ہوتے چلے آئے ہیں (ان میں بھی یہی قاعدہ چلا آیا ہے کہ دعویٰ نبوت کے لئے مطلق دلیل کو کافی قرار دیا گیا، خاص دلیل کا التزام نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ کو سب خبر رسانی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے، اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے، اور ہر چیز اللہ کے نزدیک ایک ایک خاص انداز سے ہے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ کی پہلی تین آیتوں میں کفار کے شبہات کا جواب ہے جو نبوت کے متعلق تھے اور اس کے ساتھ منکرین کے لئے عذاب کی وعید مذکور ہے۔

ان کے شبہات تین تھے، ایک یہ کہ یہ لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور فحش کے حساب و کتاب کو محال و خلاف عقل سمجھتے تھے، اسی بنا پر آخرت کی خبر دینے والے انبیاء کی تکذیب اور ان کی نبوت کا انکار کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم نے ان کے اس شبہ کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے: **هَلْ نَدَّبَكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ إِذَا أُصْرِقُمْ قُلْ هُمَزَقِ الْاِنْسَانَ فَبِئْسَ مَا يَخْلُقُ** جہل میں اس میں انبیاء کا مذاق اڑانے کے لئے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں ایک ایسا آدمی بتائیں جو تمہیں یہ بتلاتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اور تمہاری مٹی کے ذرات بھی سارے جہان میں پھیل جائیں گے تم اس وقت پھر دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے مرنے کے بعد دوبارہ آیت مذکورہ میں سے پہلی آیت میں ان کے اس شبہ کا جواب دیا گیا۔

زندہ ہونے کا ثبوت **وَاِنْ تَحْسَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ اِذَا كُنَّا تُرَابًا اَنَّا لَفِي خَلْقٍ** جہل میں اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہو کہ اگر آپ کو اس پر تعجب ہے کہ یہ کفار آپ کے لئے کھلے ہوئے معجزات اور آپ کی نبوت پر اللہ تعالیٰ کی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، اور مانتے ہیں تو ایسے بے جان پتھروں کو مانتے ہیں جن میں نہ جس سے نہ شعور، خود اپنے نفع و نقصان پر بھی قادر نہیں دوسروں کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ تعجب کے قابل ان کی یہ بات ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا، قرآن نے وجہ اس تعجب کی بالخصوص بیان نہیں کی، کیونکہ پچھلی آیات میں اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کے عجیب عجیب مظاہر بیان کر کے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ وہ ایسا قادر مطلق ہے جو ساری مخلوق کو عدم سے وجود میں

لایا، اور پھر ہر چیز کے وجود میں کیسے کیسے ہو سکتی ہیں کہ انسان ان کا ادراک و احاطہ بھی نہیں کر سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو ذات پہلی مرتبہ بالکل عدم سے ایک چیز کو موجود کر سکتی ہے اس کو دوبارہ موجود کر دینا کیا مشکل ہے انسان بھی جب کوئی نئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلی مرتبہ اس کو مشکل پیش آتی ہے اور اسی کو دوبارہ بنانا چاہیے تو آسان ہو جاتا ہے۔

تو تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے قوتِ قائل ہیں کہ پہلی مرتبہ تمام کائنات کو بے شمار حکمتوں کے ساتھ اسی نے پیدا فرمایا ہے پھر دوبارہ پیدا کرنے کو کیسے محال اور خلاف عقل سمجھتے ہیں شاید ان منکرین کے نزدیک بڑا اشکال یہ ہے کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد انسان کے اجزاء اور ذرات دنیا بھر میں منتشر ہو جاتے ہیں، ہوائیں ان کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہیں اور دوسرے اسباب و ذرائع سے بھی یہ ذرات سارے جہان میں پھیل جاتے ہیں، پھر قیامت کے روز ان تمام ذرات کو جمع کس طرح کیا جائے گا اور پھر ان کو جمع کر کے دوبارہ زندہ کیسے کیا جائیگا؟ مگر وہ نہیں دیکھتے کہ اس وقت جو وجود ان کو حاصل ہے اس میں کیا سارے جہان کے ذرات جمع نہیں، دنیا کے مشرق و مغرب کی چیزیں پانی ہوا اور ان کے لاتے ہوئے ذرات انسان کی غذا میں شامل ہو کر اس کے بدن کا جُسترو بنتے ہیں، اس مسکین کو بسا اوقات خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایک اقمہ چمکنے تک لے جا رہا ہے اس میں کتنے ذرات افریقہ کے کتنے امریکہ کے اور کتنے مشرقی ممالک کے ہیں تو جس ذات نے اپنی حکمتِ بالغہ اور تدبیرِ انور کے ذریعہ اس وقت ایک ایک انسان اور جانور کے وجود کو سارے جہان کے منتشر ذرات جمع کر کے کھڑا کر دیا ہے، کل اس کے لئے یہ بیوں اشکل ہو جاتے گا کہ ان سب ذرات کو جمع کر ڈالے، جبکہ دنیا کی ساری طاقتیں ہوا اور پانی اور دوسری قوتیں سب اس کے حکم کے تابع اور بخیر ہیں، اس کے اشارے پر عجا اپنے اندر کے اور پانی اپنے اندر کے اور فضا اپنے اندر کے سب ذرات کو جمع کر دے اس میں کیا اشکال ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قدر کو پہچانا ہی نہیں، اس کی قدرت کو اپنی قدرت پر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزیں اپنی اپنی حیثیت کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اور حکیم حق کے تابع چلتے ہیں سہ

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

خلاصہ یہ ہے کہ کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود جس طرح ان کا نبوت سے انکار قابلِ تعجب ہے اس سے زیادہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے اور حشر کے دن سے انکارِ تعجب

کی چیز ہے۔

اس کے بعد ان معاند منکرین کی سزا کا ذکر کیا گیا کہ یہ لوگ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتے، بلکہ درحقیقت اپنے رب کا انکار کرتے ہیں، اُن کی سزا یہ ہوگی کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

دوسرا شبہ منکرین کا یہ تھا کہ اگر فی الواقع آپ اللہ کے نبی اور رسول ہیں تو نبی کی مخالفت ہو عذاب کی وعیدیں آپ سناتے ہیں وہ عذاب آتا کیوں نہیں، اس کا جواب دوسری آیت میں دیا گیا

وَلَا تَسْتَعْجِلُوْا ذٰلِكَ بِالسِّيَرَةِ قَبْلَ الْحُكْمِ وَاقْنِ حَلَّتْ مِنْ قَبْلِ هٰذَا الْعَمَلُ وَادْرَاكَ
لَذُوْا مَخْفٰتٍ لِّئَلَّا يَكُنْ عَلَى قُلُوْبِهِمْ عَمَلٌ وَّاقْنِ وَاقْنِ لِيَّ الْعَمَلُ لِيَّ الْعَمَلُ لِيَّ الْعَمَلُ لِيَّ الْعَمَلُ
یہ حادثہ ختم ہونے سے پہلے آپ سے عیبیت کے نازل ہونے کا تقاضا کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو فوری عذاب منگوا دیجئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے آنے کو بہت ہی بعید یا ناممکن سمجھتے ہیں، حالانکہ ان سے پہلے دوسرے کافروں پر بہت سے واقعات عذاب کے گزر چکے ہیں جن کا سب لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے، تو ان پر عذاب آجانا کیا مستبعد ہے، یہاں لفظ امثال مشاہدہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسی سزا جو انسان کو سب کے سامنے رسوا کر دے، اور دوسروں کے لئے عبرت کا ذریعہ بنے۔

پھر فرمایا کہ بیشک آپ کا رب لوگوں کے گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود بڑی مغفرت و رحمت والا بھی ہے، اور جو لوگ اس مغفرت و رحمت سے فائدہ نہ اٹھائیں، اپنی سرکشی و نافرمانی پر تے رہیں ان کے لئے عذاب دینے والا بھی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے غفور و رحیم ہونے سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں کہ ہم پر عذاب آہی نہیں سکتا۔

تیسرا شبہ ان کفار کا یہ تھا کہ اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معجزات ہم دیکھ چکے ہیں، لیکن جن خاص خاص قسم کے معجزات کا ہم نے مطالبہ کیا ہے وہ کیوں ظاہر نہیں کرتے؟ اس کا جواب تیسری آیت میں یہ دیا گیا ہے:-

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَلَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا اٰیٰتٌ مِّثْلَ مَا اُنْزِلَ عَلٰی مٰوٰی وَ هٰذَا اٰیٰتُ مٰوٰی
وَلَا يَكُنْ قُوْلُكُمْ هٰذَا اٰیٰتُ مٰوٰی اَوْ هٰذَا اٰیٰتُ مٰوٰی اَوْ هٰذَا اٰیٰتُ مٰوٰی اَوْ هٰذَا اٰیٰتُ مٰوٰی اَوْ هٰذَا اٰیٰتُ مٰوٰی
ظن مجرہ جس کو طلب کرتے ہیں وہ کیوں نازل نہیں کیا گیا، سو اس کا جواب واضح ہے کہ مجرہ ظاہر کرنا پیغمبر اور نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا، بلکہ براہ راست وہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، وہ اپنی حکمت سے جس وقت جس طرح کا مجرہ ظاہر کرنا پسند فرماتے ہیں اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، وہ کسی کے مطالبہ اور خواہش کے پابند نہیں، اسی لئے فرمایا اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ، یعنی

آپ کا فروں کو خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والے ہیں، معجزہ ظاہر کرنا آپ کا کام نہیں۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ یعنی ہر قوم کے لئے پچھلی امتوں میں ہادی ہوتے چلے آئے ہیں، آپ کوئی ان کے نبی نہیں، سب ہی انبیاء کا ولیفہ یہ تھا کہ وہ قوم کو ہدایت کریں، اللہ کے عذاب سے ڈرائیں معجزات کا ظاہر کرنا کسی کے اختیار میں نہیں دیا گیا، اللہ تعالیٰ جب اور تین طرح کا معجزہ ظاہر کرنا پسند فرماتے ہیں ظاہر کر دیتے ہیں۔

کیا ہر قوم اور ہر ملک میں | اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، اس سے ثابت
نہی آنا ضروری ہے | ہو کہ کوئی قوم اور کوئی خطہ ملک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور ہدایت
کرنے والوں سے خالی نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کوئی بن ہو یا اس کے قائم مقام نہی کی دعوت کو پھیلانے
والا ہو جیسا سورہ یونس میں بنی کی طرف سے کسی قوم کی طرف پہلے دو شخصوں کو دعوت و ہدایت کے لئے
بھیجے گا ذکر ہے، جو خود بنی نہیں تھے، اور پھر تیسرے آدمی کو ان کی تائید و نصرت کے لئے بھیجنا
مذکور ہے۔

اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان میں بھی کوئی بنی و رسول پیدا ہوا ہو۔
البتہ دعوتِ رسول کے پہونچانے اور پھیلانے والے علماء کا کثرت سے یہاں آنا بھی ثابت ہے،
اور کھیرمیاں بے شمار ایسے ہادیوں کا پیدا ہونا بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔

اور یہاں ہے ہمارے ہاریوں کا پیدا ہونا جس کی طرف اشارہ ہے۔
یہاں تک تین آیتوں میں نبوت کا انکار کرنے والوں کے شہادت کا جواب تھا، چوتھی آیت
میں پھر وہی اصل مضمون توحید کا مذکور ہے، جس کا ذکر اس سورۃ کی ابتداء سے آرہا ہے، ارشادِ کریم
اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ كُلَّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِحِسَابٍ
عِنْدَ اللَّهِ هَدْيٌ قَائِمٌ یعنی اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے بڑا ہو یا لڑکی
جس میں ہے یا بیٹا، نیک ہے یا بد، اور جو کچھ ان عورتوں کے رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے، کہ کبھی ایک
بچہ پیدا ہوتا ہے کبھی زیادہ اور کبھی جلد ہی پیدا ہوتا ہے کبھی دیر میں ۔

اس آیت میں حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کا بیان ہے، کہ وہ عالم الغیب میں، تمام کائنات و مخلوقات کے ذرہ ذرہ سے واقف اور ہر ذرہ کے بدلتے ہوئے حالات سے باخبر ہیں اس کے ساتھ ہی تخلیق انسانی کے ہر دور اور ہر تغیر اور ہر صفت سے پوری طرح واقف ہونے کا ذکر ہے کہ عمل کا یقینی اور صحیح علم صرف اسی کو ہوتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، یا دونوں یا کچھ بھی نہیں صرف پانی یا ہوا ہے، قرآن اور تفسیر سے کوئی حکیم یا ڈاکٹر جو کچھ اس معاملہ میں رائے دیتا ہے اس کی حیثیت ایک گمان اور اندازہ سے زیادہ نہیں ہوتی، بسا اوقات واقعہ اس کے خلاف نکلتا ہے، ایکس رے کا جدید آلہ بھی اس حقیقت کو کھولنے سے قاصر ہے، اس کا حقیقی اور یقینی علم صرف

اللہ جل شانہ ہی کو ہو سکتا ہے، اسی کا یہی ایک دوسری آیت میں ہے وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَکْثَرِ حَاجًا
یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہے۔

لفظ تَعْلَمُ عربی زبان میں کم ہونے اور خشک ہونے کے معنی میں آتا ہے، آیت مذکورہ
میں اس کے بالمقابل تَزِدُ اَوْ کے لفظ نے متعین کر دیا کہ اس جگہ معنی کم ہونے کے ہیں، مطلب
یہ ہے کہ رحم مادر میں جو کچھ کم یا بیشی ہوتی ہے اس کا علم صحیح بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس
کم یا بیشی سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی تعداد میں کم یا بیشی ہو کہ کل
میں صرف ایک بچہ ہے یا زیادہ، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمانہ پیدائش کی کم یا بیشی مراد ہو کہ پہل
کتنے جیسے کتنے دن اور کتنے گھنٹوں میں پیدا ہو کر ایک انسان کو ظاہری و بودیہ کا اس کا یقینی
علم بھی بجز اللہ جل شانہ کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔

امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ زمانہ حمل میں جو خون عورت کو آجاتا ہے وہ حمل کی جناسہ
موت میں کم یا باعث ہوتا ہے، اَخِیضُ الْاَکْثَرِ حَاجًا سے مراد یہ کم یا بیشی ہے، اور حقیقت یہ ہے
کہ جتنے اقسام کی کم یا بیشی کے لفظ سب پر حاوی ہیں، اس لئے کوئی اختلاف نہیں۔

کُلُّ شَیْءٍ عِنْدَکَ بِحَقْدٍ اَرَادَ یَعْنِ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کا ایک خاص انداز
اور پیمانہ مختصر ہے، نہ اس سے کم ہو سکتی ہے نہ زیادہ، بچے کے تمام حالات بھی اس میں
داخل ہیں کہ اس کی ہر چیز اللہ کے نزدیک متعین ہو کہ کتنے دن حمل میں رہے گا، بچہ کتنے زمانہ
تک دنیا میں زندہ رہے گا، کتنا رزق اس کو حاصل ہوگا، اللہ جل شانہ کا یہ بے مثال علم
اس کی توحید کی واضح دلیل ہے۔

عَلِیْمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَةِ الْکَبِیْرُ الْمُتَعَالِ ① سَوَاءٌ مِنْکُمْ مَّنْ

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر، برابر ہے تم میں جو

اَسْرًا قَوْلٍ وَمَنْ جَحَرَبِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالْاَیْلِ وَسَارِبٌ

آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گھیلوں میں

بِالنَّهَارِ ② لَکُمْ مَعْقِبَاتٌ مِّنْ بَیْنِ يَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِہِ یَحْفَظُوْنَکَ

پھر تیرے دن کو اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں

مِّنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُخَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمُ

اللہ کے حکم سے، اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے جیوں میں ہے

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءَ أَفْلًا مَرَدَّ لَهُمْ مَالَهُمْ مِّنْ دُونِهِ

اور جب چاہتا ہے اللہ کسی قوم پر آفت پھر دے نہیں پھرتی ، اور کوئی نہیں اُن کا اس کے سوا

مِنْ وَآلٍ ۝۱۱ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ

معدن گار ، وہی برق کو دکھاتا ہے بھلی ڈر کو اور امید کو اور اٹھاتا ہے

السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝۱۲ وَيَسْبِغُ الرِّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَكُ مَلَكَةٌ مِنْ

بادل ، بھاری ، اور بڑھتا ہے گرجنے والا غویں اس کی اور سب فرشتے اس کے

خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَن يَشَاءُ وَهُمْ

ڈرے اور بھیجتا ہے کڑی بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے اور یہ لوگ

يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝۱۳ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ

جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں اور اس کی آن سخت ہے ، اسی کا پکارنا سچ ہے ،

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا

اور جن لوگوں کو پکارتے ہیں اس کے سوا وہ نہیں کام آتے ان کے کچھ بھی نکلے کسی نے

كِبَاسٍ كَفِيٍّ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ

پھیلادیے دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آپہنچے اس کے منہ تک اور کہیں پہنچے گا اس تک اور جتنی پکارے

الْكُفْرَيْنِ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝۱۴ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَ

کافروں کی سب گمراہی ہے ، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہر آسمان اور

الْأَرْضِ مَن طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُم بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۝۱۵

زمین میں خوشی سے اور زبردستی اور ان کی پرچائیاں صبح اور شام

حُصْلَةُ تَفْسِيرِ

وہ تمام پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے سب سے بڑا اور عالی شان ہے تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چپ جاسے اور جو دن میں چلے پھرے یہ سب (خدا کے علم میں) برابر ہیں یعنی سب کو یکساں جانتا ہے اور

جیسا تم میں سے ہر شخص کو جانتا ہے اسی طرح ہر ایک کی حفاظت بھی کرتا ہے چنانچہ تم میں سے ہر شخص کی حفاظت کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ کھیم خدا (بہت بلاؤں سے) اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس سے کوئی یوں نہ سمجھ جائے کہ جب فرشتے چائے محافظ ہیں پھر جو چاہو کرو، مصیبت خواہ کفر کسی طرح عذاب نازل ہی نہ ہوگا۔ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، کیونکہ واقعی اللہ تعالیٰ (ابتداءً) تو کسی کو عذاب دیتا نہیں چنانچہ اس کی عادت ہے کہ وہ کسی قوم کی ناپسندیدہ حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی (مصلحت کی) حالت کو نہیں بدلتے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جب وہ اپنی صلاحیت میں خلل ڈالنے لگتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مصیبت و عقوبت تجویز کی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کر لیتا ہے تو پھر اس کے پہنچنے کی کوئی صورت ہی نہیں (وہ واقع ہو جاتی ہے) اور ایسے وقت میں کوئی خدا کے سوا جن کی حفاظت کا ان کو زعم ہے ان کا مددگار نہیں رہتا (وہی کہ فرشتے بھی ان کی حفاظت نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی تو حفاظت ان کے کام نہ آسکتی) وہ ایسا (عظیم الشان) ہے کہ تم کو دربارش کے وقت بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور اس سے بارش کی امید بھی ہوتی ہے اور وہ ہاتھوں کو (بھی) بلند کرتا ہے جو پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور (فرشتے) اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے اور (دوسرے) فرشتے بھی اس کے ثبوت سے (اس کی تمجید و تسبیح کرتے ہیں) اور وہ زمین کی طرف بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہے گرا دیتا ہے اور وہ لوگ اللہ کے بالے میں (یعنی اس کی توحید میں) باوجود اس کے ایسے عظیم الشان ہونے کے جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ بڑا شدید القوت ہے کہ جس سے ڈرنا چاہیو مگر یہ لوگ ڈرتے نہیں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور وہ ایسا عجیب الوجود ہے کہ سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے (کیونکہ اس کو قبول کرنے کی قدرت ہے) اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ (اپنے خواجہ و مصائب میں) پکارتے ہیں وہ (بوجہ عدم قدرت کے) ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر پھینکے اور اس کو اشارہ سے اپنی طرف بلا رہا ہو تاکہ وہ (پانی) اس کے منہ تک (آ کر) آجائے اور وہ (از خود) اس کے منہ تک (کسی طرح) آئے اور انہیں (پس جس طرح پانی ان کی درخواست قبول کرنے سے عاجز ہے اسی طرح ان کے عجز و عاجزی میں اس لئے) کافروں کی (ان سے) درخواست کرنا محسن بے اثر ہے اور اللہ ہی (ایسا قادر مطلق ہے کہ اس کے سامنے سب سر خم کے ہوتے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں

(بعض خوشی سے اور بعضے) مجبوری سے (خوشی سے یہ کہ باختیار خود عبادت کرتے ہیں، اور مجبوری کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مخلوق میں جو تصرف کرنا چاہتے ہیں وہ اس کی مخالفت نہیں کر سکتا) اور ان (زمین والوں) کے سامنے بھی (سرفہم کئے ہیں) صبح اور شام کے وقتوں میں (یعنی تا کو جتنا چاہیں بڑھائیں جتنا چاہیں گھٹائیں اور صبح و شام کے وقت چوتھو تک دراز ہونے اور گھٹنے کا زیادہ ظہور ہوتا ہے اس لئے تخصیص کی گئی ورنہ سایہ بھی بائیں معنی ہر طرح ملتا ہے) ۛ

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے اللہ جل شانہ کی مخصوص صفات کمال کا سلسلہ چل رہا ہے، جو درحقیقت توحید کے دلائل ہیں، اس آیت میں فرمایا،

عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ - غیب سے مراد وہ چیز ہے جو انسانی حواس سے غائب ہو، یعنی آنکھوں سے اس کو دیکھا جاسکے نہ کانوں سے سنا جاسکے، نہ ناک سے سونگھا جاسکے نہ زبان سے پکھا جاسکے، نہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کیا جاسکے۔

شہادت، اس کے بالمقابل وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی حواس مذکورہ کے ذریعہ معلوم کیا جاسکے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص صفت کمال یہ ہے کہ وہ ہر غیب کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح حاضر و موجود کو جانتا ہے۔

الکبیر، کے معنی بڑا اور متعال کے معنی بالا و بلند، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ ہے کہ وہ مخلوقات کی صفات سے بالا و بلند اور اکبر ہے، کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کے لئے اسماءی طور پر بڑائی اور کبریائی کا تو اقرار کرتے تھے، مگر اپنے قلب و فہم سے اللہ تعالیٰ کو بھی عام انسانوں پر قیاس کر کے اللہ کے لئے ایسی صفات ثابت کرتے تھے جو اس کی شان بہت بعید ہیں، جیسے یہود و نصاریٰ نے اللہ کے لئے بیٹا ثابت کیا، کس نے اللہ کے لئے انسان کی طرح جسم اور اعضاء ثابت کئے، کس نے بہت اور سمٹ ثابت کیا، حالانکہ وہ ان تمام حالات و صفات سے بالا و بلند اور منزہ ہے، قرآن کریم نے ان کی بیان کردہ صفات سے براہت کے لئے بار بار فرمایا

شَبَّانَ اَدْنٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ، یعنی پاک ہے اللہ ان صفات سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں، ۛ

پہلے جملے عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ میں نیز اس سے پہلی آیت اللہ یَعْلَمُ مَا تَقْبِلُ اَنْفُسُکُمْ میں اللہ جل شانہ کے کمالِ علمی کا بیان تھا، اس دو سکر جملے الْکَبِیْرُ الْمُتَعَالِ میں کمالِ قدرت و عظمت کا ذکر ہے، کہ اس کی طاقت و قدرت انسانی تصورات سے بالاتر ہے، اس کے بعد کی آیت میں بھی اسی کمالِ علمی اور کمالِ قدرت کو ایک خاص انداز

سے بیان فرمایا ہے:

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسْرَأَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَلَ بِهِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَفْهِمْ بَأْسًا
وَسَارِبًا نَّهَارًا۔

اَسْرَأَ الْقَوْلَ، اسرار سے بنا ہے جس کے معنی خفیہ کلام اور چہرے کے معنی ملائکہ کلام کے ہیں جو کلام انسان کسی دوسرے کو سنانے کے لئے کرتا ہے اسے چہرہ کہتے ہیں، اور جو خود اپنے آپ کو سنانے کے لئے کرتا ہے اس کو سِرّ کہا جاتا ہے، سَتَفْہِم کے معنی چھپنے والا، سَارِب کے معنی آزادی اور بے فکری سے راستہ پر چلنے والا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ کے علم فیض کی وجہ سے اس کے نزدیک خفیہ کلام کرنے والا اور بلند آواز سے کلام کرنے والا دونوں برابر ہیں، وہ دونوں کے کلام کو یکساں طور پر سنتا اور جانتا ہے، اسی طرح جو شخص رات کی اندھیری میں چھپا ہوا ہے، اور جو دن کے اُجالے میں کھلے راستے پر چل رہا ہے، یہ دونوں اس کے علم اور قدرت کے اعتبار سے برابر ہیں، کہ دونوں کے اندرونی اور ظاہری سب حالات اس کو یکساں معلوم ہیں، اولاً دونوں پر اس کی قدرت یکساں حاوی ہے، کوئی اس کے دستِ قدرت سے باہر نہیں، اسی کام پر بیان اگلی آیت میں اس طرح ہے۔

لَهُ مَخْفِیَاتٌ مِّنْ بَیِّنٍ بَیْنَ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ یَحْفَظُهُ رَبُّهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ
مُعَقَّبَاتٌ، معقبہ کی جمع ہے، اس جماعت کو جو دوسری جماعت کے پیچھے متصل آئے اس کو مُعَقَّبَہ یا متعقبہ کہا جاتا ہے۔ مِّنْ بَیِّنٍ بَیْنَ یَدَیْهِ کے لفظی معنی ہیں دونوں ہاتھ کے درمیان، مراد انسان کے سامنے کی جہت اور پشت، وَمِنْ خَلْفِهِ پیچھے کی جانب مِّنْ أَمْرِ اللَّهِ میں مِّنْ بمعنی بارِ سببیت کے لئے ہے، بِأَمْرِ اللَّهِ کے معنی میں آیا ہے، بعض قراءتوں میں یہ لفظ بارِ آلہ منقول بھی ہے (روح)

معنی آیت کے یہ ہیں کہ ہر شخص خواہ اپنے کلام کو چھپاتا ہے یا ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی طرح اپنے چلنے پھرنے کو رات کی تاریکیوں کے ذریعہ مخفی رکھنا چاہے یا کھلے بندوں میں گول پر پھرے ان سب انسانوں کے لئے اللہ کی طرف سے فرشتوں کی جماعتیں مقرر ہیں، جو ان کے آگے اور پیچھے سے احاطہ کرتے رہتے ہیں، جن کی خدمت اور ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے اور وہ یکے بعد دیگرے آتی رہتی ہیں، اُن کے ذمہ یہ کام سپرد ہے کہ وہ حکمِ خداوندی انسانوں کی حفاظت کریں۔

بیچ بخاری کی حدیث میں ہے کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں

کے خلاف ان کی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی طرف سے انسانوں کی حفاظت کے لئے فرشتوں کا پہرہ لگا رہتا ہے، لیکن جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کر اس کی اطاعت چھوڑ کر بدکاری اور سرکشی میں ہستیار کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا حفاظتی پہرہ اٹھا لیتے ہیں، پھر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب اُن پر آتا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ میں تنذیرِ احوال سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی قوم اطاعت اور شکر گزاری چھوڑ کر اپنے حالات میں بری تبدیلی پیدا کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا طرزِ رحمت و حفاظت کا بدل دیتے ہیں۔

اس آیت کا جو عام طور پر یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قوم میں اچھا انقلاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک وہ خود اس اچھے انقلاب کے لئے اپنے حالات کو درست نہ کرے، اسی مفہوم میں یہ شعر مشہور ہے ۵

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جب کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ بات اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں، اور اس کا صحیح ہونا بھی ایک عام قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنے حالات کو اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد و نصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیت کریمہ **وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهَبَنَّ لَهُمْ سُبُلَنَا** معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہدایت کے راستے جب ہی کھلتے ہیں جب خود ہدایت کی طلب موجود ہو، لیکن انعاماتِ الہیہ اس قانون کے پابند نہیں، بسا اوقات اس کے بغیر بھی عطا ہو جاتے ہیں، ۵

داد حق را قابلیت شرط نیست

بلکہ شرط قابلیت داد ہست

خود ہمارا وجود اور اس میں بیشمار نعمتیں نہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہیں نہ ہم نے کبھی اس کے لئے دعا مانگی تھی کہ ہمیں ایسا وجود عطا کیا جائے جس کی آنکھ، ناک، کان اور سب قوی و اعضاء درست ہوں، یہ سب نعمتیں بے مانگے ہی مل رہی ہیں ۵

مانہودیم و تقاضا مانہود

لطف تو ناگفتہ مامی شنود

البتہ انعامات کا استحقاق اور وعدہ بغیر اپنی سعی کے حاصل نہیں ہوتا، اور کسی قوم کو بغیر سعی و عمل کے انعامات کا انتظار کرتے رہنا خود فریبی کے مرادف ہے۔

كُلُّ الَّذِي يَرِيكُمْ مِنَ الْمَرْقِ حَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ
اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے، جو تمہیں برق و بجلی دکھاتا ہے جو انسان کے لئے خوف بھی بن سکتی ہے کہ جس جگہ پڑ جائے سب کچھ خاک کر ڈالے اور طمع بھی ہوتی ہے کہ بجلی کی چمک کے بعد بارش آئے گی، جو انسان اور حیوانات کی زندگی کا ہمارا ہے، اور وہی ذات پاک ہے جو بڑے بڑے بجلی بادل سمندر سے مان سون بنا کر اٹھاتا ہے، اور پھر ان پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو فضا کی بڑی سرعت کے ساتھ کہیں سے کہیں لے جاتا ہے، اور اپنے حکم قضاء و قدر کے مطابق جس زمین پر پاتا ہے برساتا ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمِزُونَ بِالْقَلَمِ
اللہ تعالیٰ کے مسند و شکر کی اور تسبیح پڑھتے ہیں فرشتے اس کے خوف سے، رعد، عرف و غلاظت میں بادل کی آواز کو کہا جاتا ہے جو بادلوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے، اس کے تسبیح پڑنے سے مراد وہی تسبیح ہے جس کے متعلق قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں آیا ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن یہ تسبیح عام لوگ سن نہیں سکتے۔ اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ قرآن اس فرشتہ کا نام ہے جو بارش برسانے پر مسلط ہو اور مامور ہے، اس معنی کے اعتبار سے تسبیح پڑھنا ظاہر ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمِزُونَ بِالْقَلَمِ
زمین پر گرنے والی بجلی کو صاعقہ کہا جاتا ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی یہ جلیلا زمین پر بھیجتا ہے، جن کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے جلا دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ يَرْمِزُونَ بِالْقَلَمِ
میلہ و تدریج کے معنی میں ہے، اور مذاب و عذاب کے معنی میں بھی، اور قدرت کے معنی میں بھی، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کے معاملہ میں باہمی جھگڑے اور مجادل میں مبتلا ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ بڑی قوی و بڑے کرنے والے ہیں جس کے سامنے کسی کی چال نہیں چلتی۔

قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ قُلْ اَفَاَنْتُمْ
پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا، کہہ دے اللہ، کہہ چری تم نے پوچھا

مَنْ دُونَهُ أَوْلِيَاءُ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ

اس کے سوا ایسے کوئی جو مالک نہیں اپنے بچے اور بڑے کے کہ

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ

کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا یا کہیں برابر ہو اندھیرا اور

النُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهُ الْخَلْقُ

آج کالا کیا ٹھکانے میں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کیا انھوں نے کچھ پیدا کیا اور جیسے پیدا کیا اللہ نے بچہ

عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۷

ہوگئی پیدائش ان کی نظریں کہ اللہ کو پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ

اتارا اس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق پھر اتر پڑے آیا

السَّيْلُ سَرَّابًا أَرَأَيْتُمْ إِيَّاهُ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ

وہ نالا جھاک پھولا ہوا ، اور جس چیز کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے

أَبْتِغَاءِ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُ بَخْلٍ لَّكَ يَضْرِبُ اللَّهُ

زبور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاک ہو دیسا ہی ، یوں بیان کرتا ہے اللہ

الْحَقَّ وَالْبَاطِلُ هُ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ه وَاَمَّا

حق اور باطل کو ، سو وہ جھاک تو جاتا رہتا ہو شوکھ کر اندر وہ جو کام

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ۝۱۸

آتا ہے لوگوں کے سوا باقی رہتا ہی نہیں ، اس طرح بیان کرتا ہے اللہ مثالیں

خلاصہ تفسیر

آپ ان سے یوں کہتے کہ آسمانوں اور زمین کے درمیان کون جیسا

خالق و حافظ کون ہے اور چونکہ اس کا جواب تمہیں ہی اس لئے جواب بھی آپ ہی کہہ کر

کہ اللہ ہے (پھر) آپ یہ کہتے کہ کیا یہ دونوں تو سب ہی کہہ کر کہیں تم نے خدا کے سوا دوسرے

برہنگار (یعنی مجبور) قرار دے رکھے ہیں جو (بوجہ غایت عجز کے) خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا بھی ہمتیار نہیں رکھتے (اور پھر شرک کے ابطال اور توحید کے احقاق کے بعد اہل توحید و اہل شرک اور خود توحید و شرک کے درمیان اظہارِ فرق کے لئے) آپ یہ (بھی) کہتے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتا ہے (یہ مثال ہے شرک اور مومنین کی) یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہو سکتی ہے (یہ مثال ہے شرک اور توحید کی) یا آنکھوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ آنکھوں نے بھی (کسی چیز کو) پیدا کیا ہو جیسا خدا (ان کے عترت کے موافق بھی) پیدا کرتا ہے پھر (اس وجہ سے) ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو اور اس کے استدلال کیا ہو کہ جب دونوں یکساں خالق ہیں تو دونوں یکساں جود بھی ہوں گے اس کے متعلق بھی) آپ (اسی) کہہ چکے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور ہی اپنی ذات و صفات کمال میں (واحد ہے) اور سب مخلوقات پر (غالب ہے) اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر (اس پانی سے) نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے (اپنی چھوٹے نالے میں تھوڑا پانی اور بڑے نالے میں زیادہ پانی) پھر وہ سیلاب (کا پانی) جس دن خشاک کو بہا لایا، جو اس (پانی کی) سطح کے (اوپر) آ رہا، ہے (ایک کوڑا کرکٹ تو یہ ہے) اور زمین چیزوں کو آگ کے اندر رکھ کر (زیور یا اور اسبابِ ضرورت وغیرہ) بنانے کی غرض سے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل (اوپر آ جاتا) ہے (پس ان دونوں مثالوں میں دو چیزیں ہیں، ایک کارآمد چیز کہ اصل پانی اور اصل مال ہے اور ایک نامکارہ چیز کہ کوڑا کرکٹ میل کچیل ہو غرض) اللہ تعالیٰ حق (یعنی توحید و ایمان وغیرہ) اور باطل (یعنی کفر و شرک وغیرہ) کی اسی طرح کی مثال بیان کر رہا ہے (جس کی تکمیل اگلے مضمون سے ہوتی ہے) سو (ان دونوں مذکورہ مثالوں میں) جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے کارآمد ہے وہ دنیا میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے اور جس طرح حق و باطل کی مثال بیان کی گئی، اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر ضروری مضمون میں (مثالیں بیان کیا کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

۱۔ اصل دونوں مثالوں کا یہ ہے کہ جیسا کہ ان مثالوں میں میل کچیل برائے چندے اصل چیز کے ام پر نظر آتا ہے، لیکن انجام کار وہ پھینک دیا جاتا ہے، اور اصل چیز رہ جاتی ہے، اسی طرح باطل جو چند روز حق کے اوپر غالب نظر آئے، لیکن آخر کار باطل نوا اور مخلوب

ہو جاتا ہے اور حق باقی اور ثابت رہتا ہے، کذا فی الحبلا لیں۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ اَلْحُسْنٰی وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِیْبُوْا

جنہوں نے مانا اپنے رب کا حکم ان کے واسطے بھلائی ہے، اور جنہوں نے اس کا حکم نہ مانا

لَهُ لَوْ اَنْ لَّهُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَا فِتْنًا وَّ

اگر ان کے پاس ہو جو کچھ کہ زمین میں ہر سارا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تو سب وہیں پڑ

یہ اُولَئِكَ لَهُمْ سُوْءُ الْحِسَابِ ۝ وَمَا وُكِّلَ لَهُمْ مِنَ الْاَعْمَالِ اِلَّا

بد میں ان لوگوں کے لئے ہے بُرا حساب، اور تمکنا ان کا دوزخ ہے، اور وہ بُری

الْبِرَّ ۝ اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنْمَآ اَنْزَلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقَّ

آرام کی جگہ ہے، بھلا جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے،

کَمَنْ هُوَ اَعْمٰی اِنَّمَا یَتَذَكَّرْ اُولَآءِ لَا لِبَابِ ۝ الَّذِیْنَ

برابر ہیں سکتے ہیں اس کے جو کہ انہیں پہنچتے وہی ہیں جن کو عقل ہے، وہ لوگ ہم پر پورا

یُوفُّوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیثَاقَ ۝ وَالَّذِیْنَ

کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں توڑتے اس عہد کو، اور وہ لوگ جو

یَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ

ملا تے ہیں جسکو اللہ نے فرمایا ملانا اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے

وِیَخَافُوْنَ سُوْءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَابْتَغَآ

اور اندیشہ رکھتے ہیں بُرے حساب کا، اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا خوشی کو

وَجِهٍ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَانْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ

اپنے رب کی اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیکے میں سے

سِرًّا وَّعَلٰنِیَةً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولَئِكَ

پوشیدہ اور ظاہر اور کرتے ہیں بُرائی کے مقابل میں بھلائی ان لوگوں کے لئے

وَالَّذِیْنَ

۱۳

لَهُمْ عَقَبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنَّتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ

پہر آخرت کا گھر، باغ ہیں رہنے کے داخل ہوں گے ان میں اور جو نیک ہوتے

أَبَاءَهُمْ وَأَنْزَلْنَا لَهُمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ

ان کے باپ دادوں میں اور چورہوں میں اور اولاد میں اور فرشتے آئیں گے ان کے

عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ

پاس ہر دروازے سے، کہیں گے سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا،

عَقَبَى الدَّارِ ﴿۲۳﴾

سویاب ملا عاقبت کا گھر۔

خلاصہ تفسیر

ہن لوگوں نے اپنے رب کا ہنسا مان لیا اور توحید اور اطاعت کو اختیار کر لیا

ان کے واسطے اچھا بدلہ یعنی جنت مقرر ہے اور جن لوگوں نے اس کا کہنا نہ مانا (اور کفر و

معصیت پر قائم رہے) ان کے پاس (قیامت کے دن) اگر تمام دنیا بھر کی چیزیں (موجود)

ہوں اور (بلکہ) اس کے ساتھ اس کے برابر اور بھی (مال و دولت) ہو تو سب اپنی رہائی کے

لئے نئے ڈالیں ان لوگوں کا سخت حساب ہوگا، جس کو دوسری آیت میں حساب غیر فرمایا ہے

اور ان کا ٹھکانا ہمیشہ کے لئے، روزخ ہے، اور وہ بُری قرار گاہ ہو جو شخص یہ یقین رکھتا ہو کہ

جو کچھ آپ کے رب کی طرف آپ پر نازل ہوا ہے وہ سب حق ہے کیا ایسا شخص اس کی طسرت

ہو سکتا ہے جو کہ اس علم سے محض اندھا ہے (یعنی کافر و مؤمن برابر نہیں) آپ نصیحت

تو سمجھا رہی لوگ قبول کرتے ہیں اور یہ (سمجھا رہی) لوگ ایسے ہیں کہ اللہ سے جو کچھ انھوں

نے عہد کیا ہے اس کو پورا کرتے ہیں اور اس عہد کو توڑتے نہیں اور یہ ایسے ہیں کہ اللہ نے

اس ملا قول کے قائل رکھنے کا حکم کیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور

نعت عذاب یا ان شیعہ رکھتے ہیں (جو کفار کے ساتھ خاص ہوگا، اس لئے کفر سے بچتے ہیں)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ عذاب کی ضمانت ہی کے ہوا یا وہ کر دین حق پر (مضبوط رہتے ہیں)

ان لوگوں کی پستی رہتے ہیں، اندھا کی طرح ان کو روڈ کی دی ہے جس میں سے پیچھے بھی اور

اگر گھر کے بھی ایسا ہوتا ہے، پتا کرتے ہیں اور لوگوں کی بدسلوکی کو بوائے

کی طرف سے اس کا اقرار مختلف آیات قرآن میں مذکور ہے۔

دوسری صفت وَلَا يَنْفُتُونَ الْبَيْتَاتِ ہے یعنی وہ کسی عہد و پیمان کی خلاف ورزی نہیں کرتے، اس میں وہ عہد و پیمان بھی داخل ہیں جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہیں جن کا ذکر ابھی پہلے جگہ میں عہدِ اللہ کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اور وہ عہد بھی جو امت کے لوگ اپنے نبی و رسول سے کرتے ہیں، اور وہ معاہدے بھی جو ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ ابو داؤد نے بروایت عوف ابن مالک یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے اس پر عہد اور بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور پانچ وقت نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امراء کی اطاعت کریں گے، اور کسی انسان سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔

جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے ان کا حال پابندی عہد میں یہ تھا کہ اگر گھوڑے پر سواری کے وقت ان کے ہاتھ سے کوڑا اگر جاتا تو کسی انسان سے نہ کہتے کہ یہ کوڑا اٹھا دو، بلکہ خود سواری سے اتر کر اٹھاتے تھے۔

یہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور جذبہ اطاعت کا اثر تھا، ورنہ یہ ظاہر تھا کہ اس طرح کے سوال سے منع فرمانا مقصود نہ تھا، جیسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے، دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے ہیں اور اتفاق سے ان کے دخول مسجد کے وقت آپؐ کی زبان مبارک سے یہ کلمہ نکلا کہ بیٹھ جاؤ۔ عبداللہ بن مسعود جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سڑک پر یا بے موقع کسی جگہ کوئی ہو تو وہیں بیٹھ جائے، مگر جذبہ اطاعت نے ان کو آگے قدم بڑھانے نہ دیا، دروازہ سے باہر ہی جہاں یہ آواز کان میں پڑی اسی جگہ بیٹھ گئے۔

تیسری صفت اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی یہ بتلائی گئی وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا آمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ، یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جن تعلقات کے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو قائم رکھتے ہیں، اس کی مشہور تفسیر تو یہی ہے کہ رشتہ داری کے تعلقات قائم رکھنے اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے یہ لوگ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ساتھ عمل صالح کو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کے ساتھ پچھلے انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان کو ملا دیتے ہیں۔

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی وَيَتَذَكَّرُونَ رَبَّهُمْ، یعنی یہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں

یہاں لفظ خوف کے بجائے خشیت کا لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا خوف اس طرح کا نہیں جیسے درندہ جانور یا موذن انسان سے بلکہ خوف ہوا کرتا ہے بلکہ ایسا خوف ہے جیسے اولاد کو ماں باپ کا، شاگرد کو استاد کا خوف عارۃ ہوتا ہے کہ اس کا منشا کسی ایذا رسانی کا خوف نہیں ہوتا، بلکہ عظمت و محبت کی وجہ سے خوف اس کا ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا کوئی قول و فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند اور مکرمہ نہ ہو جائے، اسی لئے مقامِ مدت میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کے خوف کا ذکر ہے عموماً وہاں یہی لفظ خشیت کا استعمال ہوا ہے، کیونکہ خشیت اسی خوف کو کہا جاتا ہے جو عظمت و محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے اگلے جملہ میں جہاں حساب کی سختی کا خوف بیان کیا گیا ہے وہاں خشیت کا لفظ نہیں بلکہ خوف ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد فرمایا:

وَيُنَاقِظُونَ الشَّعْرَةَ إِلَىٰ حِسَابٍ، یعنی یہ لوگ بُرے حساب سے ڈرتے ہیں، بُرے حساب کے مراد حساب میں سختی اور بجزرسی ہے، حضرت صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ انسان کی نجات تو رحمتِ الہی سے ہو سکتی ہے، کہ حسابِ اعمال کے وقت اجمال اور غفود درگزر سے کام لیا جائے ورنہ جس شخص سے بھی پورا پورا ذرہ ذرہ کا حساب لیا جائے اس کا اندازے چھٹا فکں نہیں، کیونکہ ایسا کون ہے جس سے کوئی گناہ و غلطی کبھی سرزد نہ ہوا ہو، یہ حساب کی سختی کا خوف نیک و فرمانبردار لوگوں کی پانچویں صفت ہے۔

یعنی صفت یہ بیان فرمائی: وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، اَلَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، یعنی وہ لوگ جو خاص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے صبر کرتے ہیں۔

صبر کے معنی عربی زبان میں اس مفہوم سے بہت عام ہیں جو اردو زبان میں سمجھا جاتا ہے کہ کسی مصیبت اور تکلیف پر صبر کریں، کیونکہ اس کے اصلی معنی خلافت طبع چیزوں سے پریشان نہ ہونا، بلکہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے کام پر لگے رہنا ہے، اسی لئے اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں، ایک صبر علی الطاعة، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل پر ثابت قدم رہنا دوسرے صبر عن المعصية یعنی گناہوں سے بچنے پر ثابت قدم رہنا۔

صبر کے ساتھ اِبتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ کی قید نے یہ بتلایا کہ مطلقاً صبر کوئی فضیلت کی چیز نہیں، کیونکہ کبھی نہ کبھی تو بے صبری انسان کو بھی انجامِ ہمارا ایک مدت کے بعد صبر آ ہی جاتا ہے، جو صبر غیہ اختیار ہی ہو اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں، نہ ایسی غیہ اختیار کی کیفیت کا اللہ تعالیٰ اس کو حکم دیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْقَةِ الْأُولَى، یعنی اصلی اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتداءِ صبر کے

وقت اختیار کر لیا جائے، ورنہ بعد میں تو کبھی دیکھی جبری طور پر انسان کو صبر آتی جاتا ہے، بلکہ قبل مدت و شادہ صبر ہے کہ اپنے اختیار سے غلامی طبع اور کو برداشت کرے، خواہ وہ نفس و واجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات و مکروہات سے بچنا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کی نیت سے کسی مکان میں داخل ہو گیا مگر وہاں چوری کا موقع نہ ملا صبر کر کے واپس آ گیا، تو یہ غیر خستہ کاری صبر کوئی مدح و ثواب کی چیز نہیں، ثواب جب ہے کہ گناہ سے بچنا خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی کے سبب سے ہو۔

ساتویں صفت أَتَمُّوا الْحَسَنَاتِ بِإِقَامَةِ صَلَواتِہِ کے معنی نماز کو اس کے پورے آداب و شرائط اور خشوع کے ساتھ ادا کرنا ہے، جس نماز پڑھنا نہیں، اسی لئے قرآن کریم میں عموماً نماز کا حکم اقامتِ صلوٰۃ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

آٹھویں صفت وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَ عَلَانِيَةً ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں کچھ اللہ کے نام پر بھی خرچ کرتے ہیں، اس میں اشارہ کیا گیا کہ تم سے جس مالِ زکوٰۃ وغیرہ کا مطالبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے وہ کچھ تم سے نہیں مانگتا بلکہ اپنے ہی دیئے ہوئے رزق کا کچھ حصہ وہ بھی صرف دعائی فی صدہ جیسی قلیل رحیمہ مقدار میں آپ مانگا جاتا ہے جس کے دینے میں آپ کو طبعاً کوئی پس و پیش نہ ہونی چاہئے۔

مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ سِرًّا وَ عَلَانِيَةً کی قید سے معلوم ہوا کہ صدقہ خیرات میں ہر جگہ اخفاء ہی مستحسن نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا اظہار بھی درست و صحیح ہوتا ہے، اسی لئے علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کا اعلان و اظہار ہی افضل و بہتر ہے اس کا اخفاء مناسب نہیں تاکہ وہ سکریٹ لوگوں کو بھی تلقین اور ترغیب ہو، البتہ نفل صدقات کا خفیہ دینا افضل و بہتر ہے، جن احادیث میں خفیہ دینے کی فضیلت آئی ہے وہ نفلی صدقات ہی کے متعلق ہے۔

نویں صفت يَذَرُونَ بِالْحَسَنَاتِ السَّيِّئَاتِ، یعنی یہ لوگ بُرائی کو بھلاتی سے دشمنی کو دوستی سے، ظلم کو عفو و درگزر سے دفع کرتے ہیں، بُرائی کے جواب میں بُرائی سے پیش نہیں کرتے، اور بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں کہ گناہ کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، یعنی اگر کسی وقت کوئی خطا و گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس کے بعد طاعت و عبادت کی کثرت اور اہتمام اتنا کرتے ہیں کہ اس سے پچھلا گناہ مٹ ہو جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ بدی کے بعد نیکی کر لو، تو وہ بدی کو مٹا دے گی، مراد یہ ہے کہ جب اس بدی اور گناہ پر نادم ہو کر توبہ

کر لی اور اس کے پیچھے نیک عمل کیا تو یہ نیک عمل پچھلے گناہ کو مٹا دے گا، بغیر ندامت اور توبہ کے گناہ کے بعد کوئی نیک عمل کر لینا گناہ کی معافی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کے فرما بنرداروں کی یہ نو صفتیں بیان کرنے کے بعد ان کی جزا یہ بیان فرمائی
 اُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابُ الدَّارِ، دار سے مراد دارِ آخرت ہے، یعنی اپنی لوگوں کے لئے ہے دارِ آخرت کی فلاح، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ دار سے مراد دارِ دنیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ نیک لوگوں کو اگرچہ اس دنیا میں تکلیفیں بھی پیش آتی ہیں مگر انجام کار دنیا میں بھی فلاح و کامیابی اپنی کا حصہ ہوتا ہے، آگے اس عَذَابِ الدَّارِ یعنی دارِ آخرت کی فلاح کا بیان ہے، کہ وہ جنتِ عَدْنِ ہوں گی جن میں وہ داخل ہوں گے، عَدْن کے معنی قیام و قرار کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ان جنتوں سے کسی وقت ان کو نکالا نہ جائے گا، بلکہ ان میں ان کا قرار و قیام دائمی ہو گا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ عَدْن وسط جنت کا نام ہے جو جنت کے مقامات میں بھی اعلیٰ مقام ہے۔

اس کے بعد ان حضرات کے لئے ایک اور انعام یہ ذکر فرمایا گیا کہ یہ انعام ربانی صرف ان لوگوں کی ذات تک محدود نہیں ہو گا بلکہ ان کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں اور اولاد کو بھی اس میں حصہ ملے گا، شرط یہ ہے کہ وہ صالح ہوں جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مسلمان ہوں، اور مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے آباء و اجداد اور ان کی بیبیوں کا اپنا عمل اگرچہ اس مقام پر پہنچنے کے قابل نہ تھا، مگر اللہ کے مقبول بندوں کی رعایت اور برکت سے ان کو بھی اسی مقام بلند پر پہنچا دیا جائے گا۔

اس کے بعد دارِ آخرت میں ان کی فلاح و کامیابی کا مزید بیان یہ ہے کہ درشتہ بردار و ازہ سے ان کو سلام کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمہارے صبر کی وجہ سے تمام تکلیفوں سے سلامتی ہے، اور یہ کیسا اچھا انجام ہے دارِ آخرت کا!

وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ

اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں

مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ

اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے جوڑنا اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں ایسے لوگ

أُولَئِكَ لَهُمُ الْعَذَابُ وَاللَّهُ سَوَّاءُ الدَّارِ ۚ (۳۰) اللَّهُ يَبْسُطُ

ان کے واسطے ہے لعنت اور ان کے لئے ہو بُرا گھر، اللہ کشادہ کرتا ہے

الرِّشْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ وَفَرَحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا

روزی جسکو چاہے اور تنگ کرتا ہے، اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۖ ۚ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا

کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاع حقیر، اور کہتے ہیں کائنات

لَوْلَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا آيَةً مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنْ اللَّهُ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ

کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کے کہنے اللہ گمراہ کرتا ہے جسکو چاہے،

وَيَهْدِي إِلَىٰ آلِهِ مَنْ أَنْابَ ۚ ۚ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ

اور راہ دکھلاتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا، وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں

قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۚ ۚ

ان کے دل اللہ کی یاد سے، ستا ہر اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل،

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُؤْتِيَنَّهُمْ حَسَنًا مَّا ب

جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے، خوش حالی ہے ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا

كَذَلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لَبَّسُوا

اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گذر چکی ہیں اس سے پہلے بہت امتیں تاکہ سنا دے تو

عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ

ان کو جو حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور وہ منکر ہوتے ہیں رحمن سے

قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابُ ۚ ۚ

تو کہہ وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف آتا ہوں آگ کر کے

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے معابدوں کو ان کی پجستگی کے بعد توڑتے ہیں، اور خدا تعالیٰ نے

جن علاقوں کے قائم رکھنے کا حکم فرمایا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور دنیا میں فساد کرتے ہیں ایسے

لوگوں پر لعنت ہوگی اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی یعنی ظاہری دولت و ثروت

کو دیکھ کر یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ یہ لوگ مورد رحمت ہیں کیونکہ رزق کی تو یہ کیفیت ہے کہ اللہ جس کو چاہے زیادہ رزق دیتا ہے، (اور جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی کر دیتا ہے (رحمت و غضب کا یہ معیار نہیں) اور یہ (کفار) لوگ دنیوی زندگی پر (اور اس کے عیش و عشرت پر) اتراتے ہیں اور (ان کا اترنا بالکل فضول اور غلطی ہے کیونکہ) یہ دنیوی زندگی (اور اس کی عیش و عشرت) آخرت کے مقابلہ میں بجز ایک متاعِ قلیل کے اور کچھ بھی نہیں، اور یہ کافر لوگ (آپ کی نبوت میں طعن و اعتراض کرنے کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر کوئی معجزہ (جس کے فرمائش معجزوں میں سے) ان کے رب کی طرف سے کیونکہ نہیں نازل کیا گیا، آپ کہہ دیجئے کہ واقعی رہنمائی ان یہود و فرمائشوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گمراہ کر دیتے ہیں (وہ معلوم ہونے کی ظاہر ہے کہ باوجود معجزات کا یہ کہ جن میں سب سے اعظم قرآن ہے پھر فضول باتیں کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسمت ہی میں گمراہی لکھی ہے) اور اسی طرح ان معاندین کو قرآن جو اعظم معجزات ہے ہدایت کے لئے کافی نہ ہوا اور گمراہی ان کو نصیب ہوتی اسی طرح (جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے) اور طریق حق کا طالب ہوتا ہے جس کا مصداق آگے آتا ہے **الَّذِينَ آمَنُوا أَتْلُوبُ إِلَهُ** اس کو اپنی طرف (رسائی دینے کے لئے) ہدایت کر دیتے ہیں (اور گمراہی سے بچا لیتے ہیں) مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور اللہ کے ذکر سے (جس کی بڑی فرد قرآن ہے) ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے (جس کی بڑی فرد ایمان ہے) یعنی وہ قرآن کے اعجاز کو دالالت علی النبوة کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور وہی تباہی فرمائش نہیں کرتے پھر خدا کی یاد اور طاعت میں ان کو ایسی رغبت ہوتی ہے کہ متاعِ حیات دنیا سے مثل کفار کے ان کو رغبت اور فرحت نہیں ہوتی اور (خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر (کی ایسی ہی خاصیت ہے کہ اس) سے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے) (یعنی جس مرتبے کا ذکر ہو اسی مرتبہ کا اطمینان، چنانچہ قرآن سے ایمان اور اعمال صالحہ سے طاعت کا شدت تعلق اور توجہ الی اللہ میسر ہوتا ہے، غرض) جو لوگ ایمان لاتے اور نیک کام کئے (جن کا ذکر اوپر ہوا) ان کے لئے (دنیا میں) خوش حالی اور (آخرت میں) نیک انجامی ہے (جس کو دوسری آیت میں **فَنُكَلِّبُنَا سَبِيلًا طَيِّبَةً** و **لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ** الہ سے تعبیر فرمایا اسی طرح) ہم نے آپ کو ایک ایسی امت میں رسول بنا کر بھیجا ہے کہ اس (امت) سے پہلے اور بہت سی امتیں گزر چکی ہیں (اور آپ کو ان کی طرف اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تاکہ آپ ان کو وہ کتاب پڑھ کر سنادیں جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی ہے اور (ان کو چاہئے تھا کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرتے اور اس کتاب پر کہ وہ معجزہ بھی ہے ایمان لے آتے مگر) وہ لوگ ایسے بڑے رحمت والے کی ناسپاسی کرتے ہیں (اور قرآن پر ایمان نہیں لاتے) آپ فرمادیجئے کہ (تمہارے ایمان نہ لانے سے میرا کوئی ضرر

نہیں کیونکہ تم زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ مخالفت کرو گے، سو اس سے مجھ کو اس لئے اندیشہ نہیں کہ وہ میرا مربی (اور نگہبان ہے) اس کے سوا کوئی عبارت کے لائق نہیں رہیں لامحالہ وہ کامل ہستی ہوگا اور حفاظت کے لئے کافی ہوگا اس لئے میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا اور اسی کے پاس مجھ کو جانا ہے (خلاصہ یہ کہ میری حفاظت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کافی ہے تم مخالفت کر کے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے البتہ تمہارا ہی ضرر ہے)۔

معارف و مسائل

شروع رکوع میں مکمل انسانوں کی دو قسم کر کے بتلایا گیا تھا کہ ان میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں کچھ نافرمان، پھر فرمانبردار بندوں کی چند صفات و علامات بیان کی گئیں، اور آخرت میں ان کے لئے بہترین جزاء کا ذکر کیا گیا۔

اب دوسری قسم کے لوگوں کی علامات و صفات اور ان کی سزا کا بیان ان آیات میں ہے، اس میں ان سرکش اور نافرمان بندوں کی ایک نصلت تو یہ بتلائی گئی:

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ، یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے

عہد کو پھٹنے کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے عہد میں وہ عہد بھی داخل ہے جو ازل میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کے متعلق تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا گیا تھا جس کو کفار و مشرکین نے دنیا میں آکر توڑ ڈالا اور اللہ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں رب اور موجود بنائے۔ اور وہ تمام عہد بھی اس میں داخل ہیں جن کی پابندی عہد لا الہ الا اللہ کے ضمن میں انسان پر لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کا عہد بھی آجاتا ہے، اس لئے جب کوئی انسان کسی حکم خداوندی یا حکم رسول سے انحراف کرتا ہے تو اس عہد ایمانی کی عہد شکنی کرتا ہے۔

دوسری نصلت ان نافرمان بندوں کی یہ بتلائی گئی:

وَالَّذِينَ يَقُتِلُونَ مَا آمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُقْتَلَ، یعنی یہ لوگ اُن تعلقات کو قطع کر دیتے

ہیں جن کو قائم رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، ان میں انسان کا وہ تعلق بھی شامل ہے جو اس کو اللہ جل شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اس تعلق کا قطع کرنا یہی ہے کہ ان کے احکام کی خلافت و ریزی کی جائے، اور رشتہ داری کے وہ تعلقات بھی اس میں شامل ہیں

جن کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی قرآن کریم میں جا بجا ہدایت کی گئی ہے۔
اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے ان حقوق و تعلقات کو بھی توڑ ڈالتے ہیں مثلاً ماں
باپ، بھائی بہن، پڑوسی، اور دوسرے متعلقین کے جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے
انسان پر عائد کئے ہیں، یہ لوگ ان کو ادا نہیں کرتے۔

تیسری خصلت یہ بتلائی ہے:

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ، یعنی یہ لوگ زمین میں فساد مچاتے ہیں، اور یہ تیسری خصلت
درحقیقت پہلی ہی دو خصلتوں کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے عہد کی پرواہ نہیں کرتے
اور کسی کے حقوق و تعلقات کی رعایت نہیں کرتے ظاہر ہے کہ ان کے اعمال و افعال دوسرے
لوگوں کے لئے مصرت اور ایذا کا سبب بنیں گے، لڑائی جھگڑے، قتل و قتال کے بازار گرم
ہوں گے یہی زمین کا سب بڑا فساد ہے۔

مہربش اور نافرمان بندوں کی یہ تین خصلتیں بتلانے کے بعد ان کی سزا یہ بتلائی گئی ہے:
أُولَٰئِكَ لَهُمْ الْعَذَابُ الَّذِي لَمْ يَرْجُوا وَعَدًا، یعنی ان کے لئے لعنت ہے اور بڑا ٹھکانا،
لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دور اور محروم ہونے کے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس کی رحمت سے دور
ہونا سب عذابوں سے بڑا عذاب اور ساری مصیبتوں سے بڑی مصیبت ہے۔

مذکورہ آیات میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق خاص خاص
احکام و ہدایات احکام و ہدایات آئی ہیں، بعض صراحتاً اور بعض اشارۃً مثلاً:

(۱) اَلَّذِينَ يُوَفُّونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ، سے ثابت ہوا کہ جو معاہدہ
کسی سے کر لیا جائے اس کی پابندی فرض اور اس کی خلاف ورزی حرام ہے، خواہ وہ معاہدہ اللہ
اور رسولؐ سے ہو جیسے عہد ایمانی یا مخلوقات میں کسی سے ہو، خواہ مسلمان سے یا کافر سے عہد شکنی
بہر حال حرام ہے۔

(۲) وَالَّذِينَ يَعْلَمُونَ مَا آمَرَ اللّٰهُ بِهِ اَنْ يَّوْصَلَ مِنْهُمْ سَبْلًا، معلوم ہوا کہ اسلام کی
تعلیم راہبانہ انداز سے ترک تعلقات کی نہیں بلکہ ضروری تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا
کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ماں باپ کے حقوق، اولاد، بیوی اور بہن بھائیوں کے حقوق،
دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر لازم کئے ہیں، ان کو
نظر انداز کر کے نفلی عبادت میں یا کسی دینی خدمت میں لگ جانا بھی جائز نہیں، دوسرے کاموں میں
لگ کر ان کو بھلا دینا تو کیسے جائز ہوتا۔

صلہ رشتہ داری کے تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کی خبر گیری اور ادائے حقوق

متبر کے اصلی معنی اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور ثابت قدم رہنے کے ہیں جس کی مختلف

موت میں ہیں ایک نصیحت اور تکلیف پر جبکہ گہرا ہے نہیں اور مایوس نہ ہوا اللہ تعالیٰ پر نظر رکھے اور امیدوار رہے، دوسرے طاعت پر نصیر کہ احکامِ الہیہ کی پابندی اگرچہ نفس کو دشوار معلوم ہو اس پر قائم رہے، تیسرے معصیت اور برائیوں سے نصیر کہ اگرچہ نفس کا تقاضا بُرائی کی طرف چلنے کا ہو لیکن خدا تعالیٰ کے خوف سے اس طرف نہ چلے۔

(۴) **وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً** سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے درست ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ صدقات و اجبہ زکوٰۃ ستر (غفلت) وغیرہ کو علانیہ ادا کرے تاکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ادائیگی کی ترغیب ہو اور صدقات نافلہ تو واجب نہیں ان کو خفیہ ادا کرے تاکہ ریاکاری اور نام و نمود کے شبہ سے نجات ہو۔

(۵) **يَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ** سے معلوم ہوا کہ برائی کو دفع کرنا جو عقلی اور لاجبی تقاضا ہے اسلام میں اس کا طریقہ یہ نہیں کہ بُرائی کا جواب بُرائی سے دے کر دفع کیا جائے، بلکہ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ بُرائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرو، جس نے تم پر ظلم کیا ہے تم اس کے ساتھ انصاف کا، حاملہ کرو، جس نے تمہارے تعلق کا حق ادا نہیں کیا تم اس کا حق ادا کرو جس نے تم پر غصہ کیا تم اس کا جواب حلم و بردباری سے دو، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دشمن بھی دوست ہو جائے گا اور شریک بھی آپ کے سامنے نیک بن جائے گا۔

اور اس جملہ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ گناہ کا بدلہ طاعت ادا کرو کہ اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو ذرا توبہ کرو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاؤ، تو اس سے تمہارا پچھلا گناہ بھی معاف ہو جائے گا۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم سے کوئی بُرائی یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بعد تم نیک عمل کر لو، اس سے وہ گناہ مٹ جائے گا، (رواہ احمد بسند صحیح، منہجی) اس نیک عمل کی شرط یہ ہے کہ پچھلے گناہ سے توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرے۔

جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَأَمَّا زَكَاةُ فَكَافُورَةٌ

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے مقبول اور نیک بندوں کو خود بھی جنت میں مقام ملے گا اور ان کی رعایت سے ان کے ماں باپ، بیوی اور اولاد کو بھی، شرط یہ ہو کہ لوگ صالح یعنی مومن اور مسلمان ہوں کافر نہ ہوں، اگرچہ اعمالِ صالحہ میں اپنے اس بزرگ کے برابر نہ ہوں، مگر اللہ تعالیٰ اس بزرگ کی برکت سے ان لوگوں کو بھی اسی مقامِ جنت میں پہنچا دیں گے جو اس بزرگ کا مقام ہو جیسے دوسری آیت میں مذکور ہے، **أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُم** یعنی اپنے نیک بندوں کی ذریت

اور اولاد کو بھی اپنی کے ساتھ کر دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے ساتھ تعلق خواہ نسب اور قرابت کا ہو یا دوستی کا وہ آخرت میں بھی بشرط ایمان نفع دے گا۔

(۶) سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ سے معلوم ہوا کہ آخرت کی نجات اور درجات عالیہ سب اس کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ انسان دنیا میں صبر سے کام لے، اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کو ادا کرنے اور اس کی نافرمانیوں سے بچنے پر اپنے نفس کو مجبور کرتا ہے۔ اُولَئِكَ لَهُمُ اللَّحْتَةُ وَلَهُمُ الْمَوْتُ الدَّارِ، جس طرح پہلی آیات میں اللہ کے فرمانبردار بندوں کی جزا یہ ذکر فرمائی ہے کہ ان کا مقام جنت میں ہوگا، فرشتے ان کو سلام کریں گے، اور بتلائیں گے کہ یہ جنت کی دائمی نعمتیں سب مختارے صبر و ثبات اور فرمانبرداری کا نتیجہ ہیں، اسی طرح اس آیت میں نافرمان سرکش لوگوں کا انجام بدیہ بتلایا ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے، یعنی وہ رحمت سے دور ہیں، اور ان کے لئے جہنم کا ٹھکانا مقرر ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ عہد شکنی اور رشتہ داروں و عزیزوں سے قطع رحمی لعنت اور جہنم کا سبب ہے، نعوذ باللہ منہ

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِعَتْ بِهِ الْآسِرَةُ

اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا ترے ہوتے اس سے زمین

أَوْ كَلِمَةٍ بِهِ السَّمَوَاتُ بَلِّغَ لِلَّهِ الْأَمْرَ جَمِيعًا أَفَلَمْ يَأْتِ الْذِّنِينَ

یا بولیں اس سے ترے تو کیا ہوتا، بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں، سو کیا خاطر صحیح نہیں ایمان

أَمْثَلُ أَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَهْدَى النَّاسَ جَمِيعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ

دالوں کو اس پر کہ اگر چاہے اللہ تو راہ پر لائے سب لوگوں کو اور برابر پہنچا رہے گا منکروں

كَفَرُوا أَتُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ

کو ان کے کفر پر صدمہ یا اترے گا ان کے گھر سے نزدیک جب تک

حَتَّى يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝۳۱ وَلَقَدْ

کہ پہنچے وعدہ اللہ کا، بیشک اللہ خلات نہیں کرتا اپنا وعدہ، اور ٹھٹھا

اَسْتَهْنِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمَلَيْتَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ اَثَرَ اَخْلَ هُمْ

کرچے ہیں کتنے رسولوں سے تجھ سے پہلے سوڈھیل دی ہیں نے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا،

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۚ ﴿۳۳﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَاتِلٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ

سو کیسا تمہارا بدلہ، بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے،

وَجَعَلَ اللّٰهُ شُرَكَاءَ مَا قُلْ سَمُّوْهُمْ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهُ بِمَا لَا يَحْكُمُ

اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لئے شریک، کہہ اُن کا نام لو یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا

فِي الْاَرْضِ اَمْ يَبْظَاهِرُ مِنَ الْقَوْلِ بُلْ رَّيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ

زمین میں یا کرتے ہو ادھر ہی ادھر باتیں یہ نہیں بلکہ بھلے بھٹادیے ہیں منکروں کو

مَكْرَهُمْ وَصُدُّواْ عَنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ

ان کے فریب اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو

مِنْ هَآٓءِ ۚ ﴿۳۴﴾

راہ بتانے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے پیغمبر اور اے مسلمانو!) ان کافروں کی عناد کی یہ کیفیت ہو کہ قرآن کی جو موجودہ

حالت ہے کہ اس کا معجزہ ہونا غور و فکر پر موقوف ہے بجائے اس کے، اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے

ذریعہ سے پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹا دیئے جلتے یا اس کے ذریعے سے زمین جلدی جلدی ملے ہو جاتی

یا اُس کے ذریعہ سے مردوں کے ساتھ کسی کو باتیں کرادی جاتیں (یعنی مردہ زندہ ہو جاتا اور کوئی

اس سے باتیں کر لیتا اور یہ وہ معجزے ہیں جن کی فرمائش اکثر کفار کیا کرتے تھے، لیکن مطلقاً

لیکن اس طرح سے کہ قرآن کو بحالت موجودہ تو ہم معجزہ مانتے نہیں، البتہ اگر قرآن سے ان خوارق

کا ظہور ہو تو ہم اس کو معجزہ مان لیں، مطلب یہ کہ قرآن سے ایسے ایسے معجزات کا بھی ظہور ہوتا

جس سے دونوں طرح کے لوگوں کی فرمائش پوری ہو جاتی، یعنی جو نفس خوارق مذکورہ کے مستدری

تھے اور جو ان کا ظہور قرآن سے چاہتے تھے، تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے (کیونکہ یہ اسباب

موثر حقیقی نہیں) بلکہ سارا اختیار اللہ ہی کو ہے (وہ جس کو توفیق عطا فرماتے ہیں وہی ایمان لاتا ہر

ان کو شریک کہتے ہو اور مصداق واقعی اس کا کہیں نہیں ہے، اگر یہ شق ثانی ہے تو ان کے شریک نہ ہونے کو از خود تسلیم کرتے ہو، پس مطلوب کہ بطلان اشراک ہے دونوں شقوں پر ثابت ہو گیا۔ اول شق میں دلیل سے دوسری شق میں بمقتاری تسلیم سے اور یہ تقریر باوجود کیہ اعلیٰ درجہ میں کافی ہو مگر یہ لوگ نہ مانیں گے، بلکہ ان کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں جس سے تمسک کر کے مبتلا سے شریک ہیں، مرغوب معلوم ہوتی ہیں اور (اسی وجہ سے) یہ لوگ راہ (حق) سے محروم رہ گئے ہیں اور (اصل وہی بات ہے جو اوپر بَلْ كَذَّبُوا بِالْآيَاتِ سے مفہوم ہو چکی ہے یعنی) جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں رکھے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں (البتہ وہ اسی کو گمراہ رکھتا ہے جو باوجود وضوح حق کے عناد کرتا ہے)۔

معارف ومسائل

مشرکین مکہ کے سامنے اسلام کی حقانیت کے واضح دلائل اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چنے رسول ہونے کی کھلی ہوئی نشانیاں آپ کی زندگی کے ہر شعبہ سے، پھر حیرت انگیز معجزات سے پوری طرح روشن ہو چکی تھیں، اور ان کا سردار ابو جہل یہ کہہ چکا تھا کہ بنو ہاشم سے ہمارا خاندانی مقابلہ ہے ہم ان کی اس برتری کو کیسے قبول کر لیں کہ خدا کا رسول ان میں سے آیا، اس لئے وہ کچھ بھی کہیں اور کیسی ہی نشانیاں دکھلاتیں ہم ان پر کس حال ایمان نہیں لائیں گے۔ اسی لئے وہ ہر موقع پر اس ضد کا مظاہرہ لغو قسم کے سوالات اور فرمائشوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے، آیات مذکورہ بھی ابو جہل اور اس کے ساتھیوں کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہیں تفسیر بخاری میں ہے کہ مشرکین مکہ جن میں ابو جہل بن ہشام اور عبداللہ بن امیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ایک روز بیت اللہ کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے، اور عبداللہ بن امیہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، اس نے کہا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی قوم اور ہم سب آپ کو رسول تسلیم کر لیں اور آپ کی پیروی کریں، تو ہمارے چند مطالبات ہیں اپنے قرآن کے ذریعہ ان کو پورا کر دیجئے تو ہم سب اسلام قبول کر لیں گے۔

مطالبات میں ایک تو یہ تھا کہ شہر مکہ کی زمین بڑی تنگ ہے، سب طرف پہاڑوں سے گھری ایک طولانی زمین ہے جس میں نہ کاشت اور زراعت کی گنجائش ہے، نہ باغات اور دوسری ضروریات کی، آپ معجزہ کے ذریعہ ان پہاڑوں کو دور ہٹا دیجئے، تاکہ مکہ کی زمین فراخ ہو جائے، آخر آپ ہی کے کہنے کے مطابق داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑ مسخر کر دیئے گئے تھے، جب وہ تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی ساتھ تسبیح کرتے تھے، آپ اپنے قول کے مطابق اللہ کے

نزدیک داؤد سے کمتر تو نہیں ہیں۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح سلیمان علیہ السلام کے لئے آپ کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہوا کو مسخ کر کے زمین کے بڑے بڑے فاصلوں کو مختصر کر دیا تھا آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیں کہ ہمیں شام و یمن وغیرہ کے سفر آسان ہو جائیں۔

تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ جس طرح عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے آپ ان سے کچھ کم تو نہیں، آپ بھی ہمارے لئے ہمارے دادا اقصیٰ کو زندہ کر دیجئے، تاکہ ہم ان سے یہ دریافت کر سکیں کہ آپ کا دین سچا ہے یا نہیں، (منظری بحوالہ بغوی وابن ابی حاتم و ابن مردودہ) مذکور الصدر آیات میں ان معاندانہ مطالبوں کا یہ جواب دیا گیا:

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلُّ نَفْسٍ لَبِئْسَ الْأَمْرُ حَبِطًا

اس میں تسیر جبال سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹانا اور قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ سے مراد مختصر وقت میں بڑی مسافت طبع کرنا اور کُلُّ نَفْسٍ سے مُردوں کو زندہ کر کے کلام کرنا مراد ہو اور تُو حَرِطَ شَرْطُكَ جواب بقرینہ مقام محذوف ہے، یعنی کما آمَنُوا، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ایسا ہی سنون اور اس کا یہی جواب مذکور ہے، وَلَوْ أَنَّ نَارًا لَبِئْسَ الْأَمْرُ لَكُنَّ وَكَانَ غُرْمُ الْيَوْمِ مُتَوَاظِعًا، اور معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن کے ذریعہ بطور معجزہ کے ان کے یہ مطالبات پورے کر دیئے جائیں تب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں، کیونکہ وہ ان مطالبات سے پہلے ایسے معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں جو ان کے مطلوبہ معجزات سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا پہاڑوں کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے اور تسخیر ہوا سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے، اسی طرح بے جان کنکریوں کا آپ کے دست مبارک میں بولنا اور تسبیح کرنا کسی مُردہ انسان کے دوبارہ زندہ ہو کر بولنے سے کہیں زیادہ عظیم معجزہ ہے، لیلۃ المعراج میں مسجد اقصیٰ اور پھر وہاں سے آسمانوں کا سفر اور بہت مختصر وقت میں واپسی تسخیر ہوا اور تخت سلیمانی کے اعجاز سے کتنا زیادہ عظیم ہے، مگر یہ ظالم یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی جب ایمان نہ لائے تو اب ان مطالبات سے بھی ان کی نیت معلوم ہے کہ محض دفع الوقتی ہے، کچھ ماننا اور کرنا نہیں ہے، مشرکین کے ان مطالبات کا مقصد چونکہ یہی تھا کہ ہمارے مطالبات پورے نہ کئے جائیں گے تو ہم کہیں گے کہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ ہی کو ان کاموں پر قدرت نہیں، یا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اللہ تعالیٰ کے یہاں شروع

قسم کی آفتیں آتی رہیں گی، یہاں تک کہ آخر میں مکہ مکرمہ فتح ہو گا، اور یہ سب لوگ مغلوب و مقہور ہو جائیں گے۔
آیت مذکورہ میں أَوْ تَحُلَّ قَلْبُكَ قریباً مِّنْ دَارِ هِمَّتْ سے معلوم ہوا کہ جس قوم اور بستی کے قریب
جوار پر کوئی عذاب یا آفت و مصیبت آتی ہے تو اس میں حق تعالیٰ شانہ کی یہ حکمت بھی مستور
ہوتی ہے کہ اس پاس کی بستیوں کو بھی تنبیہ ہو جائے، اور وہ دوسروں سے عبرت حاصل کر کے اپنے
اعمال درست کر لیں، تو یہ دوسروں کا عذاب اُن کے لئے رحمت بن جائے، ورنہ پھر ایک دوسرا
ان کا بھی وہی انجام ہونا ہے جو دوسروں کا مشاہدہ میں آیا ہے۔

آج ہمارے ملک میں ہمارے قریب و جوار میں روز بروز کسی جماعت کسی بستی پر مختلف قسم کی
آفتیں آتی رہتی ہیں، کہیں سیلاب کی تباہ کاری، کہیں ہوا کے طوفان، کہیں زلزلہ کا عذاب، کہیں
کوئی اور آفت، قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق یہ صرف ان بستیوں اور قوموں ہی کی سزا
نہیں ہوتی بلکہ قریب و جوار کے لوگوں کو بھی تنبیہ ہوتی ہے، پچھلے زمانہ میں اگرچہ علم و فن کی اتنی
ڈیپ ٹاپ نہ تھی مگر لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا، کسی جگہ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آ جاتا
تو خود وہ لوگ بھی اور اس کے قریب و جوار والے بھی سہم جاتے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے،
اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، اور استغفار، صدقہ و خیرات کو ذریعہ نجات سمجھتے تھے، اور آنکھوں
سے مشاہدہ ہوتا تھا کہ ان کی مسیتیں بڑی آسانی سے ٹل جاتی تھیں، آج ہماری غفلت کا یہ
عالم ہے کہ مصیبت کے وقت بھی خدا ہی یاد نہیں آتا اور سب کچھ یاد آتا ہے، دنیا کے غم
غیر مسلموں کی طرح ہماری نظر میں بھی صرف مادی اسباب پر جم کر رہ جاتی ہیں، مستلب الاسباب
کی حالت تو یہ ہے کہ اس وقت بھی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے، اسی کا نتیجہ اس طرح کے مسلسل حوادث
ہیں جن سے دنیا ہمیشہ دوچار رہتی ہے۔

حَتَّىٰ يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ، یعنی ان کفار و مشرکین پر
دنیا میں بھی مختلف عذابوں اور آفتوں کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ
آپہونچے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے کبھی خلاف نہیں کرتے۔

وعدہ سے مراد اس جگہ فتح مکہ ہے، جس کا وعدہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
سے کیا ہوا تھا، اور مطلب آیت کا یہ ہوا کہ آخر میں تو مکہ فتح ہو کر ان سب مشرکین کو زیر و برادر
مغلوب و مقہور ہونا ہی ہے، اس سے پہلے بھی ان کے جرائم کی کچھ کچھ سزا ان کو ملتی رہے گی، اور
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَعْدُ اللَّهِ سے مراد اس جگہ روز قیامت ہو، جس کا وعدہ سب پیغمبروں سے
کیا ہوا ہے، اور ہمیشہ سے کیا ہوا ہے، اس روز تو ہر کافر مجرم اپنے کتے کی پوری پوری سزا بھگتے گا
مذکورہ صدر واقعہ میں مشرکین کے معاندانہ سوالات اور ان کی ہٹ دھرمی سے رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و تکلیف پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے اگلی آیت میں آپ کی تسلی کے لئے فرمایا گیا: **وَلَقَدْ أَسْتَفْهِمُ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَاَمَلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا اَنْتُمْ آخِذٌ بِمُحْمَدٍ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ**، یہ حالات جو آپ کو درپیش ہیں کچھ آپ ہی کو پیش نہیں آئے، آپ سے پہلے انبیاء کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پڑتا رہا ہے کہ نبیوں اور منکروں کو ان کے جرم پر فوراً نہیں پکڑا گیا اور وہ انبیاء کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتے رہے، جب وہ انتہا کو پہنچ گئے تو پھر ان کو عذاب الہی نے پکڑ لیا اور کیسا پکڑا کہ کسی کو مقابلہ کی تاب نہ رہی۔

اَفَمَنْ هُوَ قَاتِلٌ عَلٰی كُلِّ نَفْسٍ، اس آیت میں شرکین کی جہالت اور بے عقلی کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ یہ کیسے بیوقوف ہیں کہ بے جان و بے شعور بتوں کو اس ذات پاک کے برابر ٹھہراتے ہیں جو ہر نفس پر نگراں اور اس کے اعمال و افعال کا محاسبہ کرنے والی ہے، پھر فرمایا کہ اصل سبب اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ان کی اس جہالت ہی کو ان کی نظر میں مزین کر رکھا ہے وہ اسی کو بڑا کمال اور کامیابی سمجھتے ہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا

اُن کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت کی مار تو بہت ہی سخت ہے، اور کوئی

لَهُمْ مِّنْ اِلٰهِ مِّنْ دُوْنِ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۚ وَمَا يُخَفُّ مِنْهُ لَبِئْسَ لِلْفٰكِرِينَ اَلْمُغْنٰی ۚ

نہیں ان کو اللہ سے بچانے والا، حال جنت کا جس کا وعدہ ہے پر ہمیز گاروں سے

تَجْرِیْ مِّنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَكُلُّ شَیْءٍ اٰتٰیہُمْ وَظِلُّهُمُ الْبٰتِیٰ ۚ

بہتی ہیں اس کے نیچے نہریں، میوہ اس کا ہمیشہ ہو اور سایہ بھی، یہ بدلہ ہے اُن کا

الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۚ وَعَقِبٰی الَّذِیْنَ اٰتٰیہُمُ النَّارُ ۚ وَالَّذِیْنَ اٰتٰیہُمُ

جو ڈرتے رہے، اور بدلہ منکروں کا آگ ہے، اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہو

الْكِتٰبِ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَن

کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو نازل ہوا تجھ پر اور بعض فرقے نہیں مانتے

یَنْکِرُ بَعْضُهُمْ قُلُوبًا اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا اَشْرَکَ

اس کی بعضی بات، کہہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی اور شریک نہ کروں

بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُوا وَإِلَيْهِ مَابِ ۝ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا

اس کا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا، اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم

عَرَبِيًّا وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَ هُمْرٍ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ

عربی زبان میں، اور اگر تو چلے ان کی خواہش کے موافق بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچ چکا،

مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَّيٍّ وَلَا وَاقٍ ۝

کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی اور نہ بچانے والا

خلاصہ تفسیر

ان کا فردل کے لئے دنیوی زندگی میں (بھی) عذاب ہے وہ قتل و قید و ذلت یا امرات و مصائب ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے (کیونکہ شدید بھی ہے اور دائم بھی ہے) اور اللہ کے عذاب سے ان کو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا اور جس جنت کا متقیوں سے (یعنی شرمک و کفر سے بچنے والوں سے) وعدہ کیا گیا ہے اس کی کیفیت یہ کہ اس کی عمارات اور اشجار کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، اور اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا یہ تو انجام ہوگا متقیوں کا، اور کافروں کا انجام دوزخ ہوگا اور جن لوگوں کو ہم نے آسمانی کتاب (یعنی تورات و انجیل) دی ہے (اور وہ اس کو پورے طور سے مانتے تھے) وہ اس کتاب سے خوش ہوئے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے (کیونکہ اس کی خبر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور خوش ہو کر مان لیتے ہیں اور ایمان لے آتے ہیں، جیسے یہود میں عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور نصاریٰ میں نجاشی اور ان کے فرستادے جن کا ذکر اور آیات میں بھی ہے) اور انہی کے گردہ میں بعض ایسے ہیں کہ اس کتاب کے بعض حصہ کا (جس میں ان کی کتاب کے خلاف احکام ہیں) انکار کرتے ہیں اور کفر کرتے ہیں، آپ (ان سے) فرمائیے کہ ان کا مذہب دو قسم کے ہیں اصول اور فروع، اگر تم اصول میں مخالفت ہو سودہ سب شرائع میں مشترک ہیں چنانچہ (مذہب کو) توحید کے متعلق صرف یہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں (اور نبوت کے متعلق یہ بات ہے کہ) میں (لوگوں کو) اللہ ہی کی طرف بلاتا ہوں (یعنی نبوت کا حاصل یہ ہے کہ میں داعی الی اللہ ہوں) اور (معاد کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ) اسی کی طرف ہم کو دنیا سے لوٹ کر جانا ہے (یعنی اصول یہ تین ہیں، سوان میں سے ایک بات بھی قابل انکار نہیں، چنانچہ توحید سب کے نزدیک مسلم ہے، جیسا کہ یہی مضمون دوسری آیت میں ہے تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ

بَیِّنَاتٍ اور نبوت میں اپنے لئے مال و جاہ نہیں چاہتا جس پر انکار کی گنجائش ہو، محض دعوت الی اللہ کرتا ہوں، سو ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں جس کو تم بھی مانتے ہو، جیسا یہی مضمون دوسری جگہ بھی ہے مَآ کَانَ بَشَرًا اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتَابَ الخ اس طرح معاد کا عقیدہ مشترک اور مسلم اور غیر قابل انکار ہوا اور اگر فروع میں مخالفت ہو تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ یوں دیتے ہیں کہ ہم نے جس طرح اور رسولوں کو خاص خاص زبانوں میں خاص احکام دیئے (اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو اس طور پر نازل کیا کہ وہ خاص حکم ہے عربی زبان میں (عربی کی تصریح سے اشارہ ہو گیا دوسرے انبیاء کی دوسری زبانوں کی طرف، اور زبانوں کے اختلاف سے اشارہ ہو گیا اختلاف اُمم کی طرف، تو حاصل جواب کا یہ ہوا کہ فروع میں اختلاف بسبب اختلاف اُمم کے ہوا، کیونکہ مصالح اُمم کے ہر زمانہ میں جہاں نہ ہیں، پس یہ اختلاف شرائع کا مقتضی مخالفت نہیں، چنانچہ خود مختاری شرائع مسئلہ میں بھی ایسا اختلاف فروع کا ہوا ہے، پھر مختاری مخالفت و انکار کی کیا گنجائش ہے) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ (بغرض محال) ان کے نفسانی خیالات کا (یعنی احکام منسوخ یا احکام مجتزئ کا) اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس (احکام مقصودہ کا) علم (صحیح) پہنچ چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا (اور جب نبی کو ایسا خطاب کیا جا رہا ہے تو اور لوگ انکار کر کے کہاں رہیں گے، سو اس میں تعریف ہے اہل کتاب کے ساتھ، پس دونوں شقیوں پر منکرین و مخالفین کا جواب ہو گیا)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَذُرِیَّةً

اور بھیجے تھے ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے اور ہم نے دی تھیں ان کو جو زوجین اور اولاد

وَمَا کَانَ لِرَسُولٍ اَنْ یَّاتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِکُلِّ اَجَلٍ

اور نہیں ہوا کسی رسول سے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے ہر ایک وعدہ ہے

کِتَابٌ ۝۳۸ یَمُوجُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثَبِّتُ ۝۳۹ وَعِنْدَہٗ اُمَمٌ

لکھا ہوا، مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس ہے

الْکِتَابُ ۝۳۹ وَاِنْ مَّا نَرِیْکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُ مُرًا وَنُؤْفِیْکَ

اصل کتاب، اور اگر دکھلاویں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے یا تجھ کو اٹھایوں

فَانْمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوْلَمَ يَرَوْا اَنَّا نَأْتِي

سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہے حساب لینا ، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں

الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ

زمین کو گھٹاتے اس کے کناروں سے ، اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس

لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ

کا حکم ، اور وہ جلد لیتا ہے حساب ، اور فریب کرچکے ہیں جو اُن سے پہلے تھے ، سو

فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ

اللہ کے ہاتھ میں ہے سب فریب ، جانتا ہے جو کچھ کماتا ہے ہر ایک کی ، اور اب معلوم کئے لیتے ہیں

الْكُفْرَ لِمَنْ عَقَّبَى الْاٰسِرَ ﴿۴۲﴾ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاَلَسَتْ

کافر کہ کس کا ہوتا ہے پھلا گھر ، اور کہتے ہیں کافر تو بھیجا ہوا نہیں

مُرْسَلًا قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ اَوْ مَنْ عِنْدَهُ

آیا ، کہہ دے اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں اور جس کو خبر

عَلَّمَ الْكِتٰبَ ﴿۴۳﴾

ہے کتاب کی ۔

خلاصہ تفسیر

اور اہل کتاب میں سے بعضوں کا جو نبوت پر یہ طعن ہے کہ ان کے پاس متحد دینیات

ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو

بیبیاں اور بچے بھی دیئے یہ کونسا امر منافی رسالت ہے ، ایسا ہی مضمون دوسری آیت میں ہے

اَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتٰهُمْ اللّٰهُ الْخَيْرَ اور چونکہ اختلاف شرائع کا شبہ دیگر شہادت

سے زیادہ مشہور اور اذہان پر محض اجمال کے ساتھ مذکور تھا ، اس لئے اس کو آگے مکرر و مفصل ارشاد

فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی پر اختلاف شرائع کا شبہ کرتا ہے وہ درپردہ نبی کو مالک احکام سمجھتا ہے

حالانکہ کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ امر نہیں کہ ایک آیت (یعنی ایک حکم) بدون خدا کے حکم کے

(اپنی طرف سے) لائے بلکہ احکام کا مقرر ہونا اذن و اختیار خداوندی پر موقوف ہے ، اور

خدا تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کے اعتبار سے یہ معمول مقرر ہے کہ ہر زمانہ کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں پھر دوسرے زمانے میں بعض امور میں دوسرے احکام آتے ہیں اور پہلے احکام موقوف ہو جاتے ہیں اور بعضے بحالہ باقی رہتے ہیں پس، خدا تعالیٰ (ہی) جس حکم کو چاہیں موقوف کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہیں قائم رکھتے ہیں اور اصل کتاب (یعنی لوح محفوظ) انہی کے پاس (رہتی) ہے (اور یہ سب احکام ناسخ و منسوخ و مستمر اس میں درج ہیں) وہ سب کی جامع اور گویا میزانِ اکمل ہے، یعنی جہاں سے یہ احکام آتے ہیں وہ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پس احکام سابقہ کے موافق یا مغائر احکام لانے کی کسی کو گنجائش اور دسترس ہی نہیں ہو سکتی)

اور (یہ لوگ جو اس بنا پر انکارِ نبوت کرتے ہیں کہ اگر آپ نبی ہیں تو انکارِ نبوت پر جس عذاب کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ عذاب کیوں نہیں نازل ہوتا، اس کے متعلق سن لیجئے کہ) جس بات کا (یعنی عذاب کا) ہم ان سے (انکارِ نبوت پر) وعدہ کر رہے ہیں، اس میں کا بعض واقف اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی حیات میں کوئی عذاب ان پر نازل ہو جاوے) خواہ (قبل نزول اس عذاب کے) ہم آپ کو وفات دیدیں (پھر بعد میں وہ عذاب واقع ہو خواہ دنیا میں یا آخرت میں دونوں حالتوں میں آپ فکر و اہتمام نہ کریں کیونکہ) بس آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا ابھینا دینا اور رد و اگر کرنا تو ہمارا کام ہے) آپ اس فکر میں کیوں پڑیں کہ اگر واقع ہو جائے تو بہتر ہے، شاید ایمان لے آویں، اور ان لوگوں پر بھی تعجب ہو کہ وقوعِ عذاب علی الکفر کا کیسے یک لخت انکار کر رہے ہیں) کیا (مقدماتِ عذاب میں سے) اس امر کو نہیں دیکھ رہے کہ ہم (فتحِ اسلام کے ذریعہ سے انکی زمین کو ہر چار طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں) یعنی ان کی عملداری بسبب کثرتِ فتوحاتِ اسلامیہ کے روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، سو یہ بھی تو ایک قسم کا عذاب ہے جو مقدمہ ہے اصلی عذاب کا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے وَلَنَنْزِلَنَّهُمْ مِّنَ الْآدْنَىٰ ذُوْنَ الْعَذَابِ الْاُكْبَرِ) اور اللہ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں (پس عذابِ ادنیٰ خواہ عذابِ اکبر جو بھی ہو اس کو کوئی ان کے شرکار یا غیر شرکار میں سے رو نہیں کر سکتا) اور اگر ان کو چند سے ہمت بھی ہو گئی تو کیا ہے، وہ بڑی جلدی حساب لینے والا ہے (وقت کی دیر ہے، پھر فوراً ہی سزا سے موعود شروع ہو جائے گی) اور یہ لوگ جو ایذا پر رسول یا تنقیضِ اسلام میں طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں تو ان سے کچھ نہیں ہوتا چنانچہ (ان سے پہلے جو کچھ) لوگ ہو چکے ہیں انھوں نے (بھی ان ہی اغراض کے لئے بڑی بڑی تدبیریں کیں سو کچھ بھی نہ ہوا کیونکہ) اصل تدبیر تو خدا ہی کی ہے (اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، سو اللہ نے ان کی وہ تدبیریں نہ پہنچنے دیں اور) اس کو سب خبر رہتی ہے جو شخص جو کچھ بھی کرتا ہے (پھر اس کو وقت پہنچا)

سزا دیتا ہے اور اسی طرح ان کفار کے اعمال کی بھی سب اس کو خبر ہے سو ان کو (بھی) ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس عالم میں نیک انجامی کس کے حصہ میں ہے (آیا ان کے یا مسلمانوں کے یعنی عنقریب ان کو اپنی بد انجامی اور سزائے اعمال معلوم ہو جائے گی) اور یہ کافر لوگ (ان سزاؤں کو بھولے ہوتے) یوں کہہ رہے ہیں کہ (نحوذ باللہ) آپ پیغمبر نہیں، آپ فرما دیجئے کہ (تمہارے انکار بے معنی سے کیا ہوتا ہے) میرے اور تمہارے درمیان (میری نبوت پر) اللہ تعالیٰ اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے (جس میں میری نبوت کی تصدیق ہے) کافی گواہ ہیں (مراد اس سے علماء اہل کتاب جو منصف تھے اور نبوت کی پیشینگوئی دیکھ کر ایمان لے آئے تھے، مطلب یہ ہوا کہ میری نبوت کی دو دلیلیں ہیں عقلی اور نقلی، عقلی تو یہ کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو معجزات عطا فرمائے جو دلیل نبوت ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے گواہ ہونے کے یہی معنی ہیں، اور نقلی یہ ہے کہ کتب ساریہ سابقہ میں اس کی خبر موجود ہے، اگر یقین نہ آئے تو منصف علماء سے پوچھ لو وہ ظاہر کر دیں گے، پس دلائل نقلیہ و عقلیہ کے ہوتے ہوئے نبوت کا انکار کرنا بجز شقاوت کے اور کیا ہے، کسی عاقل کو اس سے شبہ نہ ہونا چاہئے) :

معارف و مسائل

کفار و مشرکین کا رسول و نبی کے متعلق ایک عام تخیل یہ تھا کہ وہ جنس بشر اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق مثل فرشتوں کے ہونی چاہئے جس کی وجہ سے عام انسانوں سے ان کی برتری واضح ہو جائے، قرآن کریم نے ان کے اس خیال فاسد کا جواب متعدد آیات میں دیا ہے کہ تم نے نبوت رسالت کی حقیقت اور حکمت کو ہی نہیں پہچانا، اس لئے ایسے تخیلات کے درپے ہوئے، کیونکہ رسول کو حق تعالیٰ ایک نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں کہ امت کے سارے انسان ان کی پیروی کریں انہی جیسے اعمال و اخلاق سیکھیں اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان اپنے جنس انسان ہی کی پیروی اور اتباع کر سکتا ہے، جو اس کی جنس کا نہ ہو اس کی پیروی انسان سے ناممکن ہے، مثلاً فرشتہ کو نہ بھوک لگے نہ پیاس نہ نفسانی خواہشات سے اس کو کوئی واسطہ نہ اس کو نیند آوے نہ تھکان ہو، اب اگر انسانوں کو ان کے اتباع اور پیروی کا حکم دیا جاتا تو ان کے لئے ان کی قدرت سے زائد تکلیف ہو جاتی، اس جگہ بھی مشرکین کا یہی اعتراض پیش ہوا، حصہ ص ۱۸ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد از دواج سے ان کا یہ شبہ اور بڑھا، اس کا جواب پہلی آیت کے ابتدائی جملوں میں یہ دیا گیا کہ ایک یا ایک سے زیادہ نکاح کرنے اور بیوی بچوں والا ہونے کو تم نے کس دلیل سے نبوت و رسالت کے خلاف سمجھ لیا، اللہ تعالیٰ کی تو ابتداء آفرینش سے یہی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو صاحب اہل و عیال بناتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے گزرے ہیں، اور ان میں سے بعض کی نبوت کے تم بھی قائل ہو

وہ سب متعدد بیویاں رکھتے تھے، اور صاحب اولاد تھے، اس کو نبوت و رسالت یا بزرگی اور ولایت کے خلاف سمجھنا نادانی ہے۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں) اور فرمایا کہ میں رات میں سوتا بھی ہوں اور نماز کے لئے کھڑا بھی ہوتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ساری رات عبادت ہی کروں) اور گوشت بھی کھاتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میری اس سنت کو قابل اعتراض سمجھے وہ مسلمان نہیں وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ، یعنی کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ ایک آیت بھی بغیر حکم خدا تعالیٰ کے خود لائے۔

کفار و مشرکین جو معاندانہ سوالات ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے پیش کرتے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اس زمانہ کے مشرکین نے پیش کئے، ان میں دو سوال بہت عام ہیں، ایک یہ کہ اللہ کی کتاب میں ہماری خواہش کے مطابق احکام نازل ہوا کریں، جیسے سورۃ یونس میں اُن کی یہ درخواست مذکور ہے کہ اِنْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا اَوْ بَدِّلْهُ، یعنی یا تو آپ اس موجودہ قرآن کے بجائے بالکل ہی کوئی دوسرا قرآن لائیے، جس میں ہمارے بتوں کی عبادت کو منع نہ کیا گیا ہو، یا پھر آپ خود ہی اس کے لئے ہوسے احکام کو بدل دیجئے، عذاب کی جگہ رحمت اور حرام کی جگہ حلال کر دیجئے۔

دوسرا سوال: انبیاء علیہم السلام کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود نئے نئے معجزات کا مطالبہ کرنا کہ فلاں قسم کا معجزہ دکھلائیے تو ہم مسلمان ہوں، قرآن کریم کے اس جملہ میں لفظ آیۃ سے دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں، کیونکہ اصطلاح قرآن میں قرآنی آیات کو بھی آیت کہا جاتا ہے اور معجزہ کو بھی، اسی لئے اس آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین میں سے بعض نے آیت قرآنی مراد لے کر یہ مطلب بیان کیا کہ کسی پیغمبر کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے اپنی کتاب میں کوئی آیت بنائے، اور بعض نے اس آیت سے مراد معجزہ لے کر یہ معنی قرار دیئے کہ کسی رسول و نبی کو اللہ نے یہ اختیار نہیں دیا کہ جس وقت چاہے اور جس طرح چاہے معجزہ ظاہر کر دے تفسیر روح المعانی میں فرمایا کہ عموم مجاز کے قاعدہ پر اس جگہ یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، اور دونوں تفسیریں صحیح ہو سکتی ہیں۔

اس لحاظ سے خلاصہ معنوں اس آیت کا یہ ہوا کہ ہمارے رسول سے قرآنی آیات کے بدلنے کا مطالبہ بے جا اور غلط ہے، ہم نے ایسا اختیار کسی رسول کو نہیں دیا، اسی طرح یہ مطالبہ کہ فلاں خاص قسم کا معجزہ دکھلائیے، یہ بھی حقیقت نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، کیونکہ کسی نبی رسول

کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ لوگوں کی خواہش کے مطابق جو وہ چاہیں معجزہ ظاہر کر دیں۔
لَنْ يَخْلُقَ أَجَلًا كِتَابًا، اہل کے معنی مدتِ حینہ اور میعاد کے آتے ہیں، اور کتاب اس جگہ
بمعنی مصدر ہے، یعنی تحریر، معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی میعاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے،
اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا، اور اتنے دن زندہ رہے گا، کہاں کہاں
جائے گا، کیا کیا کام کرے گا، کس وقت اور کہاں مرے گا۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں زمانے میں فلاں پیغمبر پر کیا وحی اور احکام نازل ہوں گے
کیونکہ احکام کا ہر زمانے اور ہر قوم کے مناسب حال آتے رہنا ہی مقتضائے عقل و انصاف ہے، اور
یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں پیغمبر سے فلاں وقت کس کس معجزہ کا ظہور ہوگا۔

اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کہ فلاں قسم کے احکام قرآن میں تادل
کرائیں، یا یہ مطالبہ کہ فلاں خاص معجزہ دکھلائیں ایک معاندانہ اور غلط مطالبہ ہے، جو رسالت و
نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہونے پر مبنی ہے۔

يَسْتَوِي اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَرَعْدًا أَمُّ الْكِتَابِ، اُمُّ الْكِتَابِ کے لغوی معنی اصل کتاب
کے ہیں، مراد اس سے وہ لوح محفوظ ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بانہ سے جس چیز کو چاہتا
ہے متادیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت اور باقی رکھتا ہے، اور اس خود اثبات کے بعد جو کچھ
واقع ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے، جس پر نہ کسی کی دسترس ہے، نہ اس میں کوئی کمی بیشی
ہو سکتی ہے۔

ائمہ تفسیر میں سے حضرت سعید بن جبیرؓ اور قتادہؓ وغیرہ نے اس آیت کو بھی احکام و شرائع
کے خود اثبات یعنی مسئلہ نسخ کے متعلق قرار دیا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
جو ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے مختلف رسولوں کے ذریعہ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں، جن میں احکام
شریعت اور فرائض کا بیان ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب احکام دائمی ہوں اور ہمیشہ
باقی رہیں، بلکہ قوموں کے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مناسب اپنی حکمت کے ذریعہ جس حکم
کو چاہتے ہیں متادیتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں ثابت اور باقی رکھتے ہیں، اور اصل کتاب ہر حال
ان کے پاس محفوظ ہے، جس میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں حکم جو فلاں قوم کے لئے نازل
کیا گیا ہے یا ایک خاص میعاد کے لئے یا خاص حالات کی بناء پر ہے، جب وہ میعاد گزر جائیگی،
یا وہ حالات بدل جائیں گے تو یہ حکم بھی بدل جائے گا، اس اُمُّ الْكِتَابِ میں اس کی میعاد اور وقت
مقرر بھی پوری تعیین کے ساتھ درج ہے، اور یہ بھی کہ اس حکم کو بدل کر کونسا حکم لایا جائے گا۔

اس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ احکام خداوندی کبھی منسوخ نہ ہونے چاہئیں، کیونکہ کوئی حکم جاری کرنے کے بعد منسوخ کرنا علامت اس کی ہے کہ حکم جاری کرنے والے کو حالات کا اندازہ نہ تھا اس لئے حالات دیکھنے کے بعد اس کو منسوخ کرنا پڑا، اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی شان اس سے بلند و بالا ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہو، کیونکہ تقدیر مذکور سے معلوم ہو گیا کہ جس حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف اتنی مدت کے لئے جاری کیا گیا ہے، اس کے بعد بدل جائے گا، اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کسی مریض کا حال دیکھ کر کوئی حکیم یا ڈاکٹر ایک دو اس وقت کے مناسب حال تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس دوا کا یہ اثر ہو گا اس کے بعد اس دوا کو بدل کر فلاں دوسری دوا دی جائے گی، خلاصہ یہ ہے کہ اس تفسیر کے مطابق آیت میں موجود اثبات سے مراد احکام کا منسوخ ہونا اور باقی رہنا ہے۔

اور ائمہ تفسیر کی ایک جماعت سفیان ثوری و دیگر نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی دوسری تفسیر نقل کی جس میں مضمون آیت کو نوشتہ تقدیر کے متعلق قرار دیا ہے، اور حنی آیت کے یہ بیان کئے گئے ہیں کہ قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق مخلوقات کی تقدیریں اور ہر شخص کی عمر اور زندگی بھر میں ملنے والا رزق اور پیش آنے والی راحت یا مصیبت اور ان سب چیزوں کی مقداریں اللہ تعالیٰ نے ازل میں مخلوقات کی پیدائش سے بھی پہلے لکھی ہوئی ہیں، پھر بچے کی پیدائش کے وقت فرشتوں کو بھی لکھوا دیا جاتا ہے، اور ہر سال شب قدر میں اس سال کے اندر پیش آنے والے معاملات کا چٹھا فرشتوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر فرد مخلوق کی عمر، رزق، حرکات و سکنات سب متعین ہیں، اور لکھے ہوئے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اس نوشتہ تقدیر میں سے جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں وَ عِندَنَا أُمُّ الْكِتَابِ، یعنی اصل کتاب جس کے مطابق مخلوقات کے اثبات کے بعد ختم کا عمل ہوتا ہے، وہ اللہ کے پاس ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ بہت سی احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال سے انسان کی عمر اور رزق بڑھ جاتے ہیں، بعض سے گھٹ جاتے ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ صلہ رحمی عمر میں زیادتی کا سبب بنتی ہے، اور حسنِ جسم کی روایت میں ہے کہ بعض اوقات آدمی کوئی ایسا گناہ کرتا ہے کہ اس کے سبب رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور ماں باپ کی خدمت و اطاعت سے غافل بڑھ جاتا ہے، اور تقدیر الہی کو کوئی چیز بجز دعاء کے ٹال نہیں سکتی۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کی تقدیر میں لکھ دیئے ہیں وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں، اور دعاء کی وجہ سے بھی تقدیر

بدلی جاسکتی ہے۔

اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتاب تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدل کسی عمل یا دُعا کی وجہ سے ہوتا ہے، اس سے مراد وہ کتاب تقدیر ہے جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے، جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا، اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے، بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی، صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے، جب وہ حکم بدل جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے، جس میں اس آیت کی تصریح کے مطابق محو و اثبات ہوتا رہتا ہے، لیکن آیت کے آخری جملہ وَعِنْدَ أُمِّ الْكِتَابِ نے بتلادیا، کہ اس تقدیر معلق کے اوپر ایک تقدیر غیر معلق ہے، جو اُمّ الکتاب میں لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ صرف علم الہی کے لئے مخصوص ہے، اس میں وہ احکام لکھے جاتے ہیں جو شرائط اعمال یا دُعا کے بعد آخری نتیجہ کے طور پر ہوتے ہیں، اسی کو وہ محو و اثبات اور کمی بیشی سے بالکل بری ہے (ابن کثیر)

وَلَا تَأْخُذُ بَعِثَ الَّذِي تَعِدُ هُمْ أَوْ نَسُوا فَيَتَلَكَّ اس آیت میں رسول کریم ﷺ علیہ وسلم کو تسلی دینے اور مطمئن رکھنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے آپ سے کئے ہیں کہ اسلام کی مکمل فتح ہوگی، اور کفر و کافر ذلیل و خوار ہوں گے، یہ تو ہو کر رہے گا، مگر آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ فتح مکمل کب ہوگی، ممکن ہے کہ آپ کی زندگی میں ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وفات کے بعد ہو، اور آپ کے اطمینان کے لئے تو یہ بھی کافی ہے کہ آپ برابر دیکھ رہے ہیں کہ ہم کفار کی زمینوں کو ان کے اطراف سے گھٹاتے چلے جاتے ہیں، یعنی یہ اطراف مسلمانوں کے قبضہ میں آ جاتے ہیں، اس طرح ان کی مقبوضہ زمین گھٹتی جاتی ہے، اور مسلمانوں کے لئے کشائش ہوتی جاتی ہے، اس طرح ایک دن اس فتح کی تکمیل بھی ہو جائے گی، حکم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں، وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے :

سُورۃ رعد تمام شد

سُورَةُ اِبْرٰهٖمَ

سُورَةُ اِبْرٰهٖمَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِثْنَتَانِ خَمْسُونَ آيَةً وَسَبْعُ رُكُوعَاتٍ

سورة ابراہیم مکہ میں اتری اور اس کی باؤں آیتیں ہیں اور سات رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شرع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الَّذِي كَتَبَ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ

یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو اندھیروں سے

اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّكَ اِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ① اللّٰهُ

اجالے کی طرف ان کے رب کے حکم سے رستہ پر اس زبردست خوبوں والے اللہ کے

الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِيْنَ

جس کا تو ہے کچھ کہ موجود ہو آسمانوں میں اور جو کچھ ہو زمین میں اور مصیبت ہے کافروں کو

مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ② اِلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

ایک سخت عذاب سے جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی

عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا

آخرت سے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش کرتے ہیں اس میں کجی

اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ③

وہ راستہ بھٹول کر جا پڑے ہیں دور -

خلاصہ تفسیر

الذی (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے (مرتبہ تبلیغ میں کفر کی) تارکیوں سے نکال کر (ایمان و ہدایت کی) روشنی کی طرف یعنی ذات غالب ستودہ صفات کی راہ کی طرف لاویں اور روشنی میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ بتلاویں جو ایسا خدا ہے کہ اس کی ملک ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور جب یہ کتاب خدا کا رہستہ بتلاتی ہو تو بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کو جو (اس راہ کو نہ تو خود قبول کرتے ہیں بلکہ) دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے دین کی جستجو نہیں کرتے اور (نہ دوسروں کو یہ راہ اختیار کرنے دیتے ہیں بلکہ) اللہ کی (اس راہ) (مذکور) سے روکتے ہیں اور اس میں اپنی (یعنی شبہات) کے متلاشی رہتے ہیں (جن کے ذریعہ سے دوسروں کو گمراہ کر سکیں) ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں (یعنی وہ گمراہی حق سے بڑی دور ہے)۔

معارف و مسائل

سورۃ اور اس کے مضامین | یہ قرآن کریم کی چودھویں سورۃ ابراہیم شروع ہوتی ہے یہ سورۃ مکی ہے، قبل از ہجرت نازل ہوئی، بجز چند آیات کے جن کے بارے میں اختلاف ہے کہ مدنی ہیں یا مکی۔ اس سورۃ کے شروع میں رسالت و نبوت اور ان کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر توحید کا مضمون اور اس کے شواہد کا ذکر ہے، اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کی مناسبت سے سورۃ کا نام سورۃ ابراہیم رکھا گیا ہے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا أَتَىٰ لُغَتُهُمُ الْكُفْرُ لِتَخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ، الزَّ، اُنْ حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلف صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان و یقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے، لیکن اس کے معانی کی تحقیق و تفتیش کے درپے نہ ہوں۔

کُتِبَ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ میں غوی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح اور صاف بات یہ ہے کہ اس کو لفظ ہذا محذوف کی خبر قرار دی جاتے، اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے، اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہ کی طرف، اور خطاب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ پایا گیا

ایک یہ کہ یہ کتاب نہایت عظیم المرتبہ ہے، کہ اس کو خود ذات حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، دوسرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کو اس کا پہلا مخاطب بنایا ہے۔

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ لَفِظِ نَاسٍ عام انسانوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے مراد تمام عالم کے موجودہ اور آئندہ آنے والے انسان ہیں، ظلمات ظلمت کی جمع ہے، جس کے معنی اندھیرے کے معرُوف و مشہور ہیں، یہاں ظلمات سے مراد کفر و شرک اور براعالمیوں کی ظلمت ہے، اور نور سے مراد ایمان کی روشنی ہے، اسی لئے لفظ ظلمات کو بصیغۃ جمع لایا گیا، کیونکہ کفر و شرک کی بہت سی انواع و اقسام ہیں، اسی طرح بُرے اعمال بھی بیشمار ہیں، اور لفظ نُور کو بصیغۃ مفرد لایا گیا، کیونکہ ایمان اور حق واحد ہے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہ کتاب ہم نے اس لئے آپ کی طرف نازل کی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ تمام عالم کے انسانوں کو کفر و شرک اور بُرے کاموں کی اندھیروں سے نجات دلا کر ایمان اور حق کی روشنی میں لے آئیں اُن کے رب کی اجازت سے، یہاں لفظ رب لانے میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عام انسانوں پر یہ انعام کہ اپنی کتاب اور پیغمبر کے ذریعہ اُن کو اندھیروں سے نجات دلائیں، اس کا سبب اور منشاء بجز اس لطف و مہربانی کے اور کچھ نہیں، جو تمام انسانوں کے خالق و مالک نے اپنی شان ربوبیت سے اُن پر مبذول کر رکھی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ کسی کا کوئی حق لازم ہے نہ کسی کا زور اس پر چلتا ہے۔

ہدایت صرف خدا کا فعل ہے | اس آیت میں اندھیری سے نجات دے کر روشنی میں لانے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ ہدایت دینا حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا فعل ہے، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ، یعنی آپ باختیار خود کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اسی لئے اس آیت میں بِإِذْنِ رَبِّهِمْ کا لفظ بڑھا کر یہ شبہ ختم کر دیا گیا کیونکہ معنی آیت کے یہ ہو گئے کہ یہ کفر و شرک کی اندھیروں سے نکال کر ایمان و عمل صالح کی روشنی میں لانا، اگرچہ اصل حقیقت کی رو سے آپ کے ہاتھ میں نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم و اجازت سے آپ کر سکتے ہیں۔

احکام و ہدایات | اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام بنی آدم اور نوع انسانی کو بُرائیوں کی اندھیروں سے نیکانے اور روشنی میں لانے کا واحد ذریعہ اور انسان و انسانیت کو دنیا و آخرت کی بربادی اور ہلاکت سے نجات دلانے کا واحد راستہ قرآن کریم ہی،

جتنا جتنا لوگ اس کے قریب آئیں گے، اسی انداز سے ان کو دنیا میں بھی امن و امان اور عافیت و اطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح و کامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہونگے اتنا ہی روزوں جہان کی خرابیوں بربادیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں کھولا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیریوں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات و ہدایات کو اس قوم میں پھیلایا جائے، اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی مگر قرآن کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر مجھے مستقل مقصد ہے ہونے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو بُرائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے، کم از کم کفر و شرک کے کیسے ہی خوب صورت جال ہوں قرآن پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو، ان کے دامن میں نہیں آسکتا، ہندوؤں کی تحریک شدہ سنگٹھن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے، کہ ان کے دامن میں صرف کچھ وہ لوگ آئے جو قرآن کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے، آج عیسائی مشنریاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھرتی ہیں، لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے تو صرف ان گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں، خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

شاید اسی معنوی اثر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بتلائے گئے ہیں وہاں تعلیم معانی سے پہلے تلاوت کا جدا گانہ ذکر کیا گیا ہے: **يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**، یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے، پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت ہے، اور ظاہر ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، معانی سمجھے جاتے ہیں ان کی تلاوت نہیں ہوتی، دوسرا کام لوگوں کو بُرائیوں سے پاک کرنا، اور تیسرا کام قرآن کریم اور حکمت یعنی سنت رسول کی تعلیم دینا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھے کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہی ہے، اور اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں مؤثر ہونا بھی واضح ہے، اس کے سوا اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے اس آیت میں باذن خداوندی اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے یہ بھی بتلادیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیدا کرنا حقیقۃً حق تعالیٰ کا فعل ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، قرآن کریم

کا مفہوم اور تعبیر بھی وہی معتبر ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول یا عمل سے بتلادی ہو اس کے خلاف کوئی تعبیر معتبر نہیں۔

إِلَىٰ صِرَاطٍ اِلَٰهِنَا الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يَكُنْ لَہٗ مَآفِی السَّمٰوٰتِ وَمَآفِی الْاَرْضِ
اس آیت کے شروع میں جو ظلمت و نور کا ذکر آیا ہے ظاہر ہے کہ یہ وہ اندھیری اور روشنی نہیں جو عام آنکھوں سے نظر آئے، اس لئے اس کو واضح کرنے کے لئے اس جملے میں ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے، نہ اس کو لغزش ہوتی ہے، نہ وہ مقصد تک پہنچنے میں ناکام ہوتا ہے، اللہ کے راستے سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکے، اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کر سکے۔

اس جگہ لفظ اللہ تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں، عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں، اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو، ان دو صفتوں کو اصل نام حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذات قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائیگاں ہوگی بلکہ اس کا منزل مقصود پر پہنچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ دو صفتیں پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا اَلَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یَکُنْ لَہٗ مَآفِی السَّمٰوٰتِ وَمَآفِی الْاَرْضِ یعنی یہ وہ ذات ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کا پیدا کیا ہوا اور اس کی ملک خاص ہے جس میں کوئی شریک نہیں۔

وَلَا یُکَفِّرُ بِنِّیْنٍ مِّنْ عِنْدِ اَبِّ شَرِّیْنٍ، لفظ ذیل عذاب شدید اور ہلاکت کے معنی میں آتا ہے، معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اس نعمت قرآن سے منکر ہیں اور کفر و شرک کے اندھیرے ہی میں رہنے کو پسند کرتے ہیں، ان کے لئے بڑی بربادی اور ہلاکت ہے اس عذاب شدید سے جو ان پر آنے والا ہے۔

خلاصہ مفہوم | آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ سب انسانوں کو اندھیرے سے نکال کر اللہ کے راستے کی روشنی میں لے آئے، مگر جو بد نصیب قرآن ہی کے منکر ہو جائیں تو وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو عذاب میں ڈال رہے ہیں، جو لوگ قرآن کے کلام الہی ہونے ہی کے منکر ہیں وہ تو اس وعید کی مراد ہیں ہی، مگر جو اعتقاداً منکر نہیں مگر عملاً قرآن کو چھوڑے ہوئے ہیں، نہ تلاوت سے کوئی واسطہ ہے نہ اس کے سمجھنے اور عمل کرنے کی طرف کوئی التفات ہے وہ بد نصیب بھی مسلمان ہونے کے باوجود اس وعید سے بالکل بری نہیں۔

الَّذِينَ يَسْتَجِبُونَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
وَيَبْغُونَ نَفْسًا عَاجِلًا أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۖ اس آیت میں منکرینِ قرآن کافروں کے تین حال
بتلائے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ دنیا کی زندگی کو بہ نسبتِ آخرت کے زیادہ پسند کرتے ہیں، اور ترجیح دیتے
ہیں، اسی لئے دنیا کے نفع یا آرام کی خاطر آخرت کا نقصان کرنا گوارا کر لیتے ہیں، اس میں ان کے من
کی تشخیص کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ لوگ قرآن کریم کے واضح معجزات دیکھنے کے باوجود اس سے
منکر کیوں ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کو دنیا کی موجودہ زندگی کی محبت نے آخرت کے معاملات سے اندھا
کر رکھا ہے، اس لئے ان کو اپنی اندھیری ہی پسند ہے، روشنی کی طرف آنے سے کوئی رغبت نہیں۔
دوسری خصلت ان کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ خود تو اندھیریوں میں رہنے کو پسند کرتے ہیں
اس پر ظلم یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں کو بھی روشنی کی شاہراہ یعنی اللہ
کے راستے سے روکتے ہیں۔

قرآن میں بعض تیسری خصلت يَبْغُونَ نَفْسًا عَاجِلًا میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں
غلطیوں کی نشاندہی ایک یہ کہ یہ لوگ اپنی بد باطنی اور بد عملی کے سبب اس فکر میں لگے رہتے ہیں،
کہ اللہ کے روشن اور سیدھے راستے میں کوئی کمی اور خرابی نظر آئے تو ان کو اعتراض اور طعن کا موقع
ملے، ابن کثیر نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں۔

اور اس جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے
راستے یعنی قرآن و سنت میں کوئی چیز ان کے خیالات اور خواہشات کے موافق مل جائے، تو
اس کو اپنی حقانیت کے استدلال میں پیش کریں، تفسیر قرطبی میں اسی معنی کو اختیار کیا گیا ہے،
جیسے آجکل بے شمار اہل علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کہہ بھی اپنی غلطی سے کہیں
کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں، پھر قرآن و حدیث میں اس کے مویذات تلاش
کرتے ہیں، اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے حق میں قرآنی
دلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے کیونکہ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات و
خواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب و سنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے
اسی کو اپنا مسلک قرار دے۔

أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ، اس جملہ میں ان کفار کا انجام بد بیان کیا گیا ہے جن کی
تین صفات بیان ہوئی ہیں، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی گمراہی میں بڑی دور جا چکے
ہیں، کہ اب ان کا راہ پر آنا مشکل ہے۔

احکام و مسائل

تفسیر تشریحی میں ہے کہ اگرچہ اس آیت میں صراحتاً یہ تین خصلتیں کفار کی بیان کی گئی ہیں، اور اپنی کایہ انجام ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی میں دوڑ چلے گئے ہیں، لیکن اصول کی رُو سے جس مسلمان میں بھی یہ تین خصلتیں موجود ہوں وہ بھی اس وعید کا مستحق ہو، ان تین خصلتوں کا خلاصہ یہ ہے:

- (۱) دنیا کی محبت کو آخرت پر غالب رکھیں، یہاں تک کہ دین کی روشنی میں نہ آئیں۔
- (۲) دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے کے لئے اللہ کے راستے سے روکیں۔
- (۳) قرآن و سنت کو ہیر پھیر کر کے اپنے خیالات پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ (نور اللہ)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلَّ اللَّهُ

اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ انکو سمجھا سکے پھر رہتہ بھلا تا ہوا اللہ

مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ④

جس کو چاہے اور رہتہ دکھلا دیتا ہو جس کو چاہے اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا ۔

خلاصہ تفسیر

اور اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں جو بعض کفار کو یہ شبہ ہے کہ یہ عربی کیوں ہو جس سے احتمال ہوتا ہے کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تصنیف کر لیا ہو گا، یعنی زبان میں کیوں نہیں تاکہ یہ احتمال ہی نہ ہوتا، اور قرآن دوسری کتب سادہ سے بھی ہونے میں متوافق بھی ہوتا تو یہ شبہ محض لغو ہے کیونکہ ہم نے تمام پہلے پیغمبروں کو (بھی) اپنی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاکہ ان کی زبان میں ان سے (احکام) الہیہ کو بیان کریں کہ اصل مقصود واضح بیان ہے، تو سب کتابوں کا ایک زبان میں ہونا کوئی مقصد نہیں، پھر بیان کرنے کے بعد جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول نہیں کرتا) اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں (کہ وہ ان احکام کو قبول کر لیتا ہے) اور وہی (سب امور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے (پس غالب ہونے کے سبب سب کو ہدایت کر سکتا تھا، مگر بہت سی حکمتیں اس کو مقفنی نہ ہوئیں)۔

معارف ومسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور سہولت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا ہے تو اس قوم کا ہمزبان بھیجا ہے تاکہ وہ احکام اللہ کی انہی کی زبان اور انہی کے محاورات میں بتلائے اور ان کو اس کا سمجھنا آسان ہو، اگر رسول کی زبان امت کی زبان سے مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے احکام سمجھنے میں امت کو ترجمہ کرنے کرانے کی مشقت بھی اٹھانا پڑتی، اور پھر بھی احکام کو صحیح سمجھنا مشکوک رہتا، اس لئے اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو، یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے، جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملک شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطہ شام کا نبی بنایا۔

اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کی اہست مکان و مقام کے اعتبار سے پوری دنیا کے لئے اور زمانے کے اعتبار سے قیامت تک کے لئے عام ہے دنیا کی کوئی قوم کسی ملک کی رہنے والی، کسی زبان کی بولنے والی آپ کے دائرۃ رسالت و نبوت سے باہر نہیں، اور قیامت تک جتنی قومیں اور زبانیں نئی پیدا ہوں گی، وہ بھی سب کی سب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت میں داخل ہوں گی، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا**، یعنی اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف اور صحیح بخاری و مسلم میں بروایت جابر مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم و برادری کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوام بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا۔

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو انسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر انسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی

اور اقتصادی حیثیت سے پھیلی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رشد و ہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں و پیغمبروں کے ذریعہ ہوتے رہے، زمانہ کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسب حال احکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ عالم انسانی کا نشوونما سن کمال کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے سید المرسلین و الآخرین امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب و شریعت آپ کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل و مکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا: **اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَنۡشِئْتُ عَلَیْکُمْ نِعَمَیَّ**، "یعنی میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی۔"

پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی اپنے وقت اور اپنے خطہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھیں، ان کو بھی ناقص نہیں کہا جاسکتا، لیکن شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا کمال کسی خاص وقت اور خاص خطہ کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ کامل علی الاطلاق ہے، اسی حیثیت سے تکمیل دین اس شریعت کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت ختم کر دیا گیا۔

قرآن کریم عربی زبان میں کیوں ہوا؟ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح پہلی امتوں کے رسول ان کے ہمزبان بھیجے گئے ان کو ترجمہ کرنے کی محنت کی ضرورت نہ رہی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف عرب میں عربی زبان کے ساتھ کیوں مبعوث ہوئے؟ اور آپ کی کتاب و قرآن بھی عربی زبان ہی میں کیوں نازل ہوئی، لیکن غور و فکر سے کام لیا جائے تو جواب صاف ہو نہیں سکتا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت تمام اقوام دنیا کے لئے عام ہوئی جن میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں تو ان سب کی ہدایت کے لئے دو ہی صورتیں ممکن تھیں، ایک یہ کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں جدا جدا نازل ہوتا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات بھی ہر قوم کی زبان میں جدا جدا ہوتیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے ساتھ اس کا انتظام کوئی دشوار نہ تھا، لیکن تمام اقوام عالم کے لئے ایک رسول ایک کتاب ایک شریعت بھیجنے کا جو ایک عظیم مقصد ان تمام اقوام عالم میں ہزاروں طرح کے اختلافات کے باوجود دینی، اخلاقی، معاشرتی و وحدت اور یک جہتی پیدا کرنا ہے، وہ اُس صورت حاصل نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ جب ہر قوم ہر ملک کا قرآن و حدیث الگ زبان میں ہوتے تو اس میں تحریف قرآن کے بے شمار راستے کھل جاتے، اور قرآن کریم کے کلام کا محفوظ ہونا جو اس کی ایسی خصوصیت ہے کہ اغیار اور منکرین قرآن بھی اس کے تسلیم کرنے سے گریز نہیں کر سکتے یہ عجزاً

خصوصیت قائم نہ رہتی، اور ایک ہی دین ایک ہی کتاب کے ہوتے ہوئے اس کے ماننے والوں کی اتنی مختلف راہیں ہو جاتیں کہ کوئی نقطہ وحدت ہی باقی نہ رہتا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک عربی زبان میں نازل ہونے کے باوجود اس کی تعبیر و تفسیر میں کس قدر اختلافات جائز حدود میں پیش آئے، اور ناجائز و باطل طریقوں سے اختلافات کی تو کوئی حد نہیں، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں کی قومی وحدت اور ممتاز تشخص ان سب لوگوں میں موجود ہے، جو قرآن پر کسی درجہ میں بھی عامل ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و بعثت پوری اقوام دنیا کے لئے عام ہونے کی صورت میں ان سب کی تعلیم و ہدایت کی یہ صورت کہ قرآن ہر قوم کی زبان میں الگ الگ ہوتا اس کو تو کوئی ادنیٰ سمجھ کا آدمی بھی درست نہیں سمجھ سکتا، اس لئے ضروری ہوا کہ قرآن کسی ایک ہی زبان میں آئے اور رسول کی زبان بھی وہی قرآن کی زبان ہو، پھر دوسری ملکی اور علاقائی زبانوں میں اس کے ترجمے پہنچائے اور پھیلائے جائیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب علماء ہر قوم ہر ملک میں آپ کی دی ہوئی ہدایات کو اپنی اپنی قوم و ملک کی زبان میں سمجھائیں اور شائع کریں، اس کے لئے حق تعالیٰ شانہ نے تمام دنیا کی زبانوں میں سے عربی زبان کا انتخاب فرمایا جس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

عربی کی خصوصیات | اول یہ کہ عربی زبان آسمان کی و فترتی زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوح محفوظ کی زبان عربی ہے جیسا کہ آیت قرآن بَلْ نَكُودُشْ اَنْ مَّجِیْئُ فِیْ نُوْبِ مَحْفُوْظٍ سے معلوم ہوتا ہے، اور جنت، جو انسان کا وطن اصلی ہے اور جہاں اس کو لوٹ کر جانا ہوا اس کی زبان بھی عربی ہے، طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَجِبُوْا اَلْعَصَبَ لَشَلَاثٍ لَاِیُّیْ عَرَبِیٌّ وَّ اَلْقُرْآنُ عَرَبِیٌّ وَّ کَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِیٌّ، اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجرد کہا ہے، حافظ حدیث ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجہ حسن کم نہیں، (فیض القدر شرح جامع صغیر، ص ۷۹ ج ۱)

معنی حدیث کے یہ ہیں کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے۔

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور قوبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیر ہو کر سریانی زبان پیدا ہو گئی۔

اس سے ان روایات کی بھی تائید و تقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبریل امینؑ نے قومی زبان میں ترجمہ کر کے پیغمبروں کو بتلایا اور انھوں نے اپنی قومی زبان میں امتوں کو پہنچایا، یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیت مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے دی گئی ہیں، اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں، یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہو کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہو کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جن و انس جمع ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الہی اور ایک صفت الہی ہے، جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلام الہی ہیں، مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلام الہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یمتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص باسانی عربی زبان بقدر ضرورت سکھ لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جس ملک میں پہنچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر و اکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہو گئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بد اعمالیوں کے شکار تھے مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسولؐ کو ان میں پیدا فرمایا، اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے اختیار فرمایا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت و تعلیم کا حکم دیا **وَ اذِّنْ فِیْ رَعِیْہِمْ قُلُوبَہُمْ لَا تَفْہَمُوْنَ** اور سب سے پہلے اسی قوم کے ایسے افراد اپنے رسول کے گرد جمع فرمادیئے، جنھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان و مال و اولاد سب کچھ قربان کیا اور آپ کی تعلیمات کو جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا، اور اس طرح ان پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی صحبت و تعلیم کا وہ گہرا رنگ چڑھا کہ پوری دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہو گیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان و زمین نے نہیں دیکھی تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلائے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کر دیا اور فرمایا:

بَلِّغُوا عَنِّي ذَلِكُمْ آيَةً، یعنی مجھ سے سنی ہوئی بات کو امت تک پہنچا دو، جہاں شارسحابہ نے اس ہدایت کو پتے باندھا، اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہاں میں پھیلا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پاتے تھے کہ قرآن کی آواز مشرق و مغرب میں گونجنے لگی۔

دوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت جس میں دنیا کے مشرکین اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ سب داخل ہیں، ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعت کا ایسا پیدا فرمادیا کہ اس کی نظیر دنیا کی پہلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن و سنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج و اشاعت میں عجمیوں کا قدامت عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعد و صرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں، قرآن و سنت کی جمع و تدوین پھر تفسیر و تشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔ اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہو گئی، اور دعوت و تبلیغ کی حد تک عرب و عجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک قوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علما پیدا ہو گئے جنہوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبانوں میں نہایت سہولت کے ساتھ پہنچا دیا، اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کی جو حکمت تھی وہ جاہل ہو گئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے احکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں، لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، وہی بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکھ کر نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے

إِلَى النُّورِ ۚ وَذَكَرْهُمْ يَا يُسُورُ اللَّهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ

آجالے کی طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے، البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو صبر

صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِذْ كُنتُمْ أَعْمَىٰ ۖ

کرنے والا ہر شکر گزار، اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو اللہ کا احسان اپنے

عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ

اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب،

وَيَذَّبِحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَلِكُمْ

اور ذبح کرتے تھے بچوں کو اور زندہ رکھتے تھے عورتوں کو اور اس میں درد

بَلَاءٍ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٍ ۝ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ

ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی، اور جب سنادیا تمہارے رب نے اگر احسان

شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۝

مانو گے تو اور بھی دوں گا تم کو اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے،

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرًا أَنتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا لَا

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر کرو گے تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے،

فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝

تو اللہ بے پردہ ہے سب خوبوں والا۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر و معاصی کی)

تاریکیوں سے (نکال کر ایمان و طاعت کی) روشنی کی طرف لاؤ اور ان کو اللہ تعالیٰ کے معاملات

(نعمت اور عذاب کے) یاد دلاؤ بلاشبہ ان معاملات میں عبرتیں ہیں ہر صابر و شاکر کے لئے

دیکھو کہ نعمت کو یاد کر کے شکر کرے گا اور نفقت یعنی عتاب کو پھر اس کے زوال کو یاد کر کے آئندہ حوادث میں صبر کرے گا) اور اس وقت کو یاد کیجئے کہ جب (ہم نے اس ارشادِ بالا کے موافق) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمھارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمھاری عورتوں کو (یعنی لڑکیوں کو جو کہ بڑی ہو کر عورتیں ہو جاتی تھیں) زندہ چھوڑ دیتے تھے (تاکہ ان سے کار و خدمت لیں سو یہ بھی مثل ذبح ہی کے ایک عقوبت تھی) اور اس (مصیبت اور نجات دونوں) میں تمھارے رب کی طرف سے ایک بڑا امتحان ہے (یعنی مصیبت میں بلا، تھی اور نجات میں نعمت تھی اور بلا اور نعمت دونوں بندے کے لئے امتحان ہیں پس اس میں موسیٰ علیہ السلام نے ایام اللہ یعنی نعمت و نفقت دونوں کی تذکرہ فرمادی) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا کہ اے میری قوم! وہ وقت یاد کرو جب کہ تمھارے رب نے (میرے ذریعہ سے) تم کو اطلاع فرمادی کہ اگر میری نعمتوں کو سن کر تم شکر کرو گے تو تم کو (خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور) زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم (ان نعمتوں کو سن کر) ناشکری کرو گے تو (یہ سمجھ رکھو کہ) میرا عذاب بڑا سخت ہے (ناشکری میں اس کا احتمال ہے) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ بھی) فرمایا کہ اگر تم اور تمام دنیا بھر کے آدمی سب کے سب مل کر بھی ناشکری کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں کیونکہ وہ) بالکل بے احتیاج (اور اپنی ذات میں) ستودہ صفات ہیں (ہنگامال بالغیر کا وہاں احتمال نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کا ضرر مثل ہی نہیں اور تم اپنا ضرر سن چکے ہو) اِنَّ عَذَابِيْ تَشْرِيدٌ اس لئے شکر کرنا ناشکری مت کرنا

معارف و مسائل

پہلی آیت میں مذکور ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو کفر و محسبت کی تاریکیوں سے ایمان و طاعت کی روشنی میں لے آئیں۔

لفظ آیات سے آیاتِ تورات بھی مراد ہو سکتی ہیں کہ ان کے نازل کرنے کا مقصد ہی حق کی روشنی پھیلانا تھا، اور آیات کے دوسرے معنی معجزات کے بھی آتے ہیں، وہ بھی اس جگہ مراد ہو سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو معجزات خاص طور سے عطا فرمائے تھے جن میں عصا کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا روشن ہو جانا کئی جگہ قرآن میں مذکور ہے، آیات کو معجزات کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے کھلے ہوئے معجزات دے کر بھیجا گیا جن کو دیکھنے کے بعد کوئی شریف سمجھدار انسان اپنے انکار اور نافرمانی

پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک نکتہ | اس آیت میں لفظ قوم آیا ہے کہ اپنی قوم کو اندھیری سے روشنی میں لائیں، لیکن یہی مضمون اسی سورۃ کی پہلی آیت میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے بیان کیا گیا تو وہاں قوم کے بجائے لفظ ناس استعمال کیا گیا، لَتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بعثت صرف اپنی قوم بنی اسرائیل اور مصری اقوام کی طرف تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے انسانوں کے لئے ہے۔

پھر ارشاد فرمایا اذْكُرْ هَمَزًا بِأَمْرِ اللَّهِ، یعنی حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو ایام اللہ یاد دلاؤ۔

ایام اللہ | ایام کی جمع ہے، جس کے معنی دن کے مشہور ہیں، لفظ ایام اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، اور وہ دونوں یہاں مراد ہو سکتے ہیں، اول وہ خاص ایام جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے، جیسے غزوہ بدر و احد اور احزاب و خین و غیرہ کے واقعات یا پھیلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں، جن میں بڑی بڑی قومیں زیر و زبر یا نیست و نابود ہو گئیں، اس صورت میں ایام اللہ یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجام بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی ایام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرماتا ہے۔

ستران مجید کا اسلوب اور طریق اصلاح عموماً یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم پر عمل آسان کرنے کی تدبیریں بھی بتلاتی جاتی ہیں، یہاں پہلے جملہ میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی آیات سنا کر یا معجزات دیکھا کر اپنی قوم کو کفر کی اندھیری سے نکالو، اور ایمان کی روشنی میں لاؤ، اس کی تدبیر اس جملہ میں یہ ارشاد فرمائی کہ نافرمانوں کو راہ راست پر لانے کی دو تدبیریں ہیں، ایک تنزیل سے ڈرانا، دوسرے نعمتوں اور احسانات کو یاد دلا کر اطاعت کی طرف بلانا، جملہ اذْكُرْ هَمَزًا بِأَمْرِ اللَّهِ میں یہ دونوں چیزیں مراد ہو سکتی ہیں کہ پھیلی امتوں کے نافرمانوں کا انجام بزدان پر آنے والے عذاب اور جہاد میں ان کا مقتول یا ذلیل و خوار ہونا ان کو یاد دلائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کر کے اس سے بچ جائیں، اسی طرح اس قوم پر جو اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں دن رات برستی ہیں اور جو مخصوص نعمتیں ہر موقع پر ان کے لئے

مبذول ہوتی ہیں، مثلاً وادی تیبہ میں ان کے سروں پر ابر کا سایہ، خوراک کے لئے منق و تسلی کا نر دل پانی کی ضرورت ہوتی تو پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا وغیرہ ان کو یاد دلا کر خدا تعالیٰ کی اطاعت اور توحید کی طرف بلایا جائے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ اس میں آیات سے مراد نشانیاں اور دلائل ہیں، اور صَبَّار صبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا اور شکور شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گزار، جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اَنِّیَامُ اللہ یعنی پھلے واقعا خواہ وہ جو منکروں کی سزا اور عذاب سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات سے متعلق بہر حال ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی قدر کا ملہ اور کثرت نعم کی بڑی نشانیاں اور دلائل ہو جو ہیں اس شخص کے لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کھلی ہوئی نشانیاں اور دلائل اگرچہ ہر غور کرنے والے کی ہدایت کے لئے ہیں مگر بد نصیب کفار ان میں غور و فکر ہی نہیں کرتے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے، فائدہ صرف وہ لوگ اٹھاتے ہیں، جو صبر و شکر کے جامع ہیں، مراد اس سے مؤمن ہیں، کیونکہ بیہقی نے بروایت انس نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے درجے میں آدھا صبر اور آدھا شکر (مظہری)

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ صبر نصف ایمان ہے، اور صبح مسلم اور مسر احمد میں بروایت حضرت صہیبؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر اور بھلا ہی بھلا ہے، اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں، کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت، نعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے جو اس کے لئے دین و دنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہو جاتا ہے (دنیا میں تو حسب وعدۃ الہی نعمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، اور قائم رہتی ہے، اور آخرت میں اس کے شکر کا اجر عظیم اس کو ملتا ہے) اور اگر مؤمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت و راحت کا سامان ہو جاتی ہے (دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کا ارشاد ہے إِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِینَ، اور اللہ جس کے ساتھ ہو انجام کار اس کی مصیبت راحت سے تبدیل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے إِنَّمَایُوفِی الصَّابِرِینَ أَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ، خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال بُرا نہیں ہوتا، اچھا ہی اچھا ہے، وہ گرنے میں بھی

اُبھرتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے، ۵

نہ شوخی چل سکی بادِ صبا کی،

بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان وہ دولت ہے جو مصیبت و تکلیف کو بھی راحت و نعمت میں تبدیل کر دیتی ہے۔
حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں آپ کے بعد ایک ایسی امت پیدا کرنے والا ہوں کہ اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسبِ منشاء ہو جائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور ناپسندیدہ صورتِ حال پیش آئے تو وہ اس کو ذریعہ ثواب سمجھ کر صبر کریں گے اور یہ دانشمندی اور بردباری ان کی اپنی ذاتی عقل و حلم کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم ان کو اپنے علم و حلم کا ایک حصہ عطا فرما دیں گے (منظہری)
شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال و اعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافِ طبع امور پر پریشان نہ ہو، اپنے قول و عمل میں ناشکری سے بچے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجرِ عظیم کا یقین رکھے۔

دوسری آیت میں مضمون سابق کی مزید تفصیل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی یہ خاص نعمت یاد دلائیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فرعون نے ان کو ناجائز طور پر غلام بنایا ہوا تھا، اور پھر ان غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت کا سلوک نہ تھا، ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا، اور صرف لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لئے پالا جاتا تھا؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس فرعونِ عذاب سے نجات دیدی۔

شکر اور ناشکری کے نتائج | وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ | لفظ تَأَذَّنَ، اذن اور اطلاع

بہنے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ بتیاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان نام فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا کہ انکو میری نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال و افعال کو میری مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا، یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہو سکتی ہے،

اور ان کے بقا و دوام میں بھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت اور زیادت سے محروم نہ ہوگا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباس منطری)، اور فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بھی سخت ہے، ناشکری کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی ناشرمالی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے، یا اس کے فرائض و واجبات کی ادائیگی میں سستی کرے، اور کفرانِ نعمت کا عذاب شدید دنیا میں بھی یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نعمت سلب ہو جائے یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے کہ نعمت کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور آخرت میں بھی عذاب میں گرفتار ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے شکر گزاروں کے لئے تو اجر و ثواب اور نعمت کی زیادتی کا وعدہ اور وہ بھی بلفظ تاکید وعدہ فرمایا ہے لَا زَيْدٌ لَّكُمْ لیکن اس کے بالمقابل ناشکری کرنے والوں کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ لَا عَذَابٌ بِّكُمْ یعنی میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا، بلکہ صرف اتنا فرما کر ڈرایا ہے کہ میرا عذاب بھی جس کو پہونچے، وہ بڑا سخت ہوتا ہے، اس خاص تعبیر میں اشارہ ہے کہ ہر ناشکرے کا گرفتار عذاب ہونا کچھ ضروری نہیں معافی کا بھی امکان ہے۔

قَالَ مُوسَىٰ إِنَّ لَكُمْ وَأَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا، فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ غَنِيًا
یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اگر تم سب اور جتنے آدمی زمین پر آباد ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگو تو یاد رکھو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، وہ تو سب کی حمد و ثناء اور شکر و ناشکری سے بے نیاز اور بالاتر ہے اور وہ اپنی ذات میں سمید یعنی مستحقِ حمد ہے، اس کی حمد تم نہ کرو تو اللہ کے سارے فرشتے اور کائنات کا ذرہ ذرہ کر رہا ہے۔

شکر کا فائدہ جو کچھ ہے وہ تمہارے ہی لئے ہے، اس لئے شکر گزاری کی تاکید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ اپنے فائدے کے لئے نہیں بلکہ بسبب رحمت تمہیں ہی فائدہ پہونچانے کے لئے ہے۔

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبُوءُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ

کیا نہیں پہونچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم نوح کی اور عاد اور ثمود

وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ لَا يَحْكُمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ط جَاءَهُمُ رَسُولٌ مِّنْهُمْ

اور جو ان سے پیچھے ہوئے، کسی کو ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو آئے ان کے پاس ان کے رسول

بِالْبَيِّنَاتِ قَرَدُوا وَإِنِّي يَهُودِيٌّ فِي أَخَوَاتِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا

نشانیاں لے کر پھر تو ایسے انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو

اُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ⑨

دے کر بھیجا گیا اور ہم کو تو شبہ ہے اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو غلبان میں ڈالنے والا

قَالَتْ رُسُلُهُمْ إِنِّي إِلَهِ شَكٍّ فَأُطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ

بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہو جس نے بنائے آسمان اور زمین وہ تم کو بلاتا ہے

لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُخْرِجَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى قَالُوا

تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک تو بظہر چکا ہو کہنے لگے

إِنَّا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنا طَرِيدٌ وَنَ أَنْ تَصُدُّوا عَمَّا كَانَ

تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے ، تم چاہتے ہو کہ ردک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے

يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَاتُّوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ⑩ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ

ہمارے باپ دادا سولاؤ کوئی سند کھلی ہوئی ، ان کو کہا ان کے رسولوں نے

إِن تَنْحَرُوا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّا إِلَٰهٌ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ

ہم تو یہی آدمی ہیں جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں جس پر

عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَعَلَىٰ

چاہے ، اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس سند مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ

إِلَٰهٌ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ⑪ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ

پر بھروسہ چاہتے ایمان والوں کو ، اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور

هٰذَا نَاسٌ سَبَلْنَاهُ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا أَدْبَرْتُمْ وَنَاوَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ

وہ بھلا چکا ہم کو ہماری راہیں ، اور ہم صبر کریں گے ایذا پر جو تم ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر بھروسہ چاہو

الْمُتَوَكِّلُونَ ⑫ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّسُلُ هِمَّ لَكُمْ فَتَرْجَلُكُمْ

بھروسے والوں کو ، اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے تم کو

مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوْدَنَّ فِي مِثْلِنَا فَآوَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنَمَلِكَنَّ

اپنی زمین سے یا لوٹ آؤں گا یا میں لوٹوں گا، تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کریں گے

الظَّالِمِينَ ﴿۱۴﴾ وَلَنَسِيكَنَّكُمْ أَلْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَٰلِكَ

ان ظالموں کو، اور آباد کریں گے تم کو اس زمین میں اُن کے پیچھے، یہ ملتا ہے

لِسَنِّ خَافَ مَقَامِحِي وَخَافَ وَعِيدِ ﴿۱۵﴾ وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ

اس کو جوڑتا ہو کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہو میری عذاب کے وعدے سے، اور فیصلہ لگے مانگتے پیغمبر اور لوگوں

كُلَّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۱۵﴾

ہوا ہر ایک سرکش ضدی۔

حلاصۃ تفسیر

(اے کفار مکہ) کیا تم کو ان لوگوں کے واقعات کی خبر (گو اجمالاً ہی) نہیں پہنچی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں یعنی قوم نوح اور عاد (قوم ہود) اور ثود (قوم صالح) اور جو لوگ اُن کے بعد ہوئے ہیں جن کی مفصل حالت کو جزاء اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، (کیونکہ ان کے حالات تفصیلات منضبط و منقول نہیں ہوتے، اور وہ واقعات یہ ہیں کہ) ان کے پیغمبر اُن کے پاس دلائل لے کر آئے سو ان قوموں (میں جو کفار تھے انھوں) نے اپنے ہاتھ اُن پیغمبروں کے منہ میں دیدیئے (یعنی مانتے تو کیا یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کو بات تک نہ کرنے دیں) اور کہنے لگے کہ جو حکم دے کر تم کو ربزعم تمھارے) بھیجا گیا ہے (یعنی توحید و ایمان) ہم اس کے منکر ہیں، اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو (یعنی وہی توحید و ایمان) ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو (ہم کو) تردد میں ڈالے ہوئے ہے (مقصود اس سے توحید و رسالت دونوں کا انکار ہے، توحید کا تو ظاہر ہے اور رسالت کا تدعوٰنا میں، جس کا حاصل یہ ہے کہ تم خود اپنی رائے سے دعوتِ توحید کر رہے ہو، مامور و مرسل من اللہ نہیں ہو) ان کے پیغمبروں نے اس بات کے جواب میں کہا کیا (تم کو) اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) شک (دانکار) ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (یعنی اس کا ان چیزوں کو پیدا کرنا خود دلیل اس کی ہستی اور وحدانیت کی ہے، پھر اس دلیل کے ہوتے ہوئے شک کربا بڑی تعجب کی بات ہے اور تم جو دعوت الی التوحید کو استقلالاً ہماری طرف منسوب کرتے ہو یہ

بھی محض غلط ہے گو توحید بوجہ حق ہونے کے اس قابل ہے کہ اگر کوئی اپنی رائے سے بھی اس کی دعوت کرے تو بھی زیبا ہے، لیکن محل متنازع فیہ میں تو ہماری دعوت بحکم خداوند تعالیٰ ہی (پس وہ رہی) تم کو توحید کی طرف، بلارہا ہے تاکہ (اس کے قبول کرنے کی برکت سے) تمہارے (گذشتہ) گناہ معاف کر دے اور (تمہاری عمر کی) معین مدت تک تم کو (خیر و خوبی کے ساتھ) حیات دے (مطلب یہ کہ توحید علاوہ اس کے کہ فی نفسہ حق ہے تمہارے لئے دونوں جہان میں نافع بھی ہے، اور اس جواب میں دونوں امر کے متعلق جواب ہو گیا، توحید کے متعلق بھی آفِی اللہ شَلَّتْ الخ اور رسالت کے متعلق بھی یَدَّ غَوْ کُم میں جیسا تقریر ترجمہ سے ظاہر ہے) پھر انہوں نے (پھر دونوں امر کے متعلق گفتگو شروع کی اور) کہا کہ تم (پیغمبر نہیں ہو بلکہ) محض ایک آدمی ہو جیسے ہم ہیں (اور بشریت منافی رسالت ہے، تم جو کہتے ہو وہ من اللہ نہیں ہے بلکہ) تم (اپنی رائے ہی سے) یوں چاہتے ہو کہ ہمارے آباء و اجداد جس چیز کی عبادت کرتے تھے، (یعنی بت) اس سے ہم کو روک دو سو (اگر رسالت کے مدعی ہو تو علاوہ ان دلائل و بیانات مذکورہ کے اور) کوئی صاف معجزہ دکھلاؤ (جو ان سب کے واضح تر ہو، اس میں نبوت پر تو کلام ظاہر ہے اور یَقْبُضُ الْبَاطِلُ و نَافِی میں توحید کلام کی طرف اشارہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شرک کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اس کو کرتے تھے) ان کے رسولوں نے (اس کے جواب میں) کہا کہ (تمہاری تقریر کے کئی جزو ہیں، انکار توحید دلیل فعل آباء، انکار نبوت مطالبہ سلطان مبین علاوہ بیانات سابقہ، سو امر اول کے متعلق فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، میں جواب ہو گیا، کیونکہ دلیل عقل کے رد و رد رسم دعوت کوئی چیز نہیں، امر دوم کے متعلق ہم اپنی بشریت کو تسلیم کرتے ہیں کہ واقعی) ہم بھی تمہارے جیسے آدمی ہیں لیکن (بشریت اور نبوت میں تنافی نہیں، کیونکہ نبوت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان خداوندی ہے اور) اللہ کو اختیار ہے کہ) اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (وہ) احسان فرماوے (اور احسان کے غیر بشر کے ساتھ مختص ہونے کی کوئی دلیل نہیں) اور (امر سوم کے متعلق یہ ہے کہ دعویٰ کے لئے جس میں دعویٰ نبوت بھی داخل ہے، نفس لیل اور مطلق بلکہ جو دعویٰ نبوت کی صورت میں معجزہ ہو گا ضرور ہو گا کہ پیش کی جا چکی ہے، رہا دلیل معجزہ خاص جس کو سلطان مبین یعنی صاف دلیل سے تعبیر کر رہے ہو سو اولاً حسب قواعد مناظرہ ضروری نہیں ثانیاً، یہ بات ہمارے قبضہ کی نہیں کہ ہم تم کو کوئی معجزہ دکھلا سکیں بغیر خدا کے حکم کے پس تمہارے تمام تر شبہات کا جواب ہو گیا، پھر اگر اس پر بھی تم نہ مانو اور مخالفت کئے جاؤ تو خیر ہم تمہاری مخالفت سے نہیں ڈرتے بلکہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں) اور اللہ ہی پر سب

ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے، (چونکہ ہم بھی باایمان ہیں اور ایمان مستحق ہے تو کھل کو اس لئے ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں) اور ہم کو اللہ پر بھروسہ نہ کرنے کا کون امر باعث ہو سکتا ہے، حالانکہ اس نے (ہماری حالت پر بڑا فضل کیا کہ) ہم کو ہمارے (منافع دارین کے) رستے بتلا دیتے جس کا اتنا بڑا فضل ہو اس پر تو ضرور بھروسہ کرنا چاہیے) اور (ضرر خارجی سے قویوں بے فکر ہو گئے) رہا ضرر داخلی کہ تمہاری مخالفت کا غم و حزن ہوتا ہو، تم نے (عناد و خلاف کر کے) جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے ہم اس پر صبر کریں گے (پس اس سے بھی ہم کو ضرر نہ رہا اور حاصل اس صبر کا بھی وہی توکل ہے) اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو (ہمیشہ) بھروسہ رکھنا چاہیے اور (ان تمام تر اتمامِ حجت کے بعد بھی کفار نرم نہ ہوئے بلکہ) ان کفار نے اپنے رسولوں سے کہا کہ تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے، یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (پھر آنا اس لئے کہا کہ سکوت قبل بعثت سے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم ہی جیسا ہوگا) پس ان رسولوں پر ان کے رب نے (تسل کے لئے) وحی نازل فرمائی کہ (یہ پیارے تم کو کیا نکالیں گے ہم) (ہی) ان ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے اور ان کے (ہلاک کرنے کے) بعد تم کو اس سرزمین میں آباد رکھیں گے (اور) یہ وعدہ آباد رکھنے کا کچھ تمہارے ساتھ خاص نہیں، بلکہ) ہر اس شخص کے لئے (عام) ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے (مراد یہ کہ جو مسلمان ہو جس کی علامت، نبوت، قیامت اور خوف و عید ہے سب کیلئے یہ وعدہ عذاب سے نجات دینے کا عام ہے) اور (پیغمبروں نے جو یہ مضمون کفار کو سنایا کہ تم نے دلائل کے فیصلہ کو نہ مانا، اب عذاب سے فیصلہ ہونے والا ہے، یعنی عذاب آنے والا ہے تو) کفار (چونکہ ہل مرکب و عناد میں غرق اب تھے اس سے بھی نہ ڈرے بلکہ کمال بیباکی سے وہ) فیصلہ جاننے لگے (جیسا آیت قَاتِلُوا بِمَآ تَعُولُوا امثالہا سے معلوم ہوتا ہے) اور (جب وہ فیصلہ آیا تو) جتنے سرکش (اور) فندی لوگ تھے وہ سب (اس فیصلہ میں) بے مراد ہوئے (یعنی ہلاک ہو گئے اور جو ان کی مراد تھی کہ اپنے کو اس دنیا میں بکریٹ و ظفر چاہتے تھے وہ حاصل نہ ہوئی)۔

مِّنْ وَّرَآئِهِ جَهَنَّمُ ۖ وَسِيقَىٰ مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ ۖ (۱۶) يَتَجَرَّعُهُ وَلَا

پچھ اس کے دوزخ ہے اور پلائیں گے اس کو پانی پیپ کا، گھونٹ گھونٹ پیتا ہو اس کو اور

يَكَادُ يُسِيغُهُ ۖ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ ۖ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ط

کھلے نہیں اتار سکتا اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر طرف سے اور وہ نہیں مڑتا، اور

مِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ①۷

اس کے پیچھے عذاب ہے سخت۔

خلاصہ تفسیر

(جس جبار عنید کا اوپر ذکر ہوا ہے علاوہ دینی عذاب کے) اس کے آگے دوزخ (کا عذاب آنے والا) ہے اور اس کو (دوزخ میں) ایسا پانی پینے کو دیا جاوے گا جو کہ پیپ ہو (کے مشابہ) ہو گا جسکو (غایت تشنگی کی وجہ سے) گھونٹ گھونٹ کر کے پیوے گا اور (غایت حرارت و کڑواہٹ کی وجہ سے) اگلے سے آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور ہر (چہار) طرف سے اس پر (سامان) موت کی آمد ہوگی اور وہ کسی طرح مرے گا نہیں (بلکہ یوں ہی سسکتا رہے گا) اور (پھر یہ بھی نہیں کہ یہی عذاب مذکور ایک حالت پر رہے بلکہ) اس (شخص) کو اور زیادہ سخت عذاب کا سامنا برابر ہو (اگرے) گا جس سے عادت پڑنے کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہولہ تعالیٰ کَلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بِدَلِّهِمْ جَلُودًا غَيْرَهَا۔

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ

حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں جیسے وہ لکڑی زور کی جلیے اس پر

بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَى شَيْءٍ

ہوا آندھی کے دن ، کچھ اُن کے ہاتھ میں نہ ہو گا اپنی کمائی میں سے ،

ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ①۸ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ

یہی ہو بہک کر دور جا بڑھنا ، تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور

الْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنَّ يَاسِينَ هَبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ①۹

زمین جیسی چاہتے ، اگر چاہے تم کو لیجاؤ اور لائے کوئی پیدا کرے نئی

وَمَا ذَلِك عَلَى اللَّهِ بَعِزٌ ②۰ وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ

اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں ، اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سامنے پھر کہیں گے

الضَّعْفُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَبَلَ أَنَّهُم

کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے ، سو کیا بچاؤ گے

مَخْنُونٍ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوا لَوْ هَدَنَا اللَّهُ

ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ ، وہ کہیں گے اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ

لَوْ هَدَىٰ نَاكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزَعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ

تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے ، اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بیقراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں

مَخِصٍ ۚ (۲۱) وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ

خلاصی ، اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بیشک اللہ نے تم کو دیا تھا

وَعَدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ

سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا پھر سچا کیا ، اور میری تم پر کچھ حکومت نہ

سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۚ فَلَا تَكُونُوا مَوْنِي وَلَا مَوْنَىٰ

تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تم کو پھر تم نے مان لیا میری بات کو سوا الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو

أَنفُسُكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِي ۚ إِنِّي كَفَرْتُ

اپنے آپ کو ، نہ میں تمھاری فریاد کو پہنچوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچو ، میں منکر ہوں

بِمَا أَشْرَكْتُم مِّن قَبْلُ ۚ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ (۲۲)

جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا اس سے پہلے ، البتہ جو ظالم ہیں ان کے لئے ہے عذاب دردناک۔

خلاصہ تفسیر

ان کافروں کو اگر اپنی نجات کے متعلق یہ زعم ہو کہ ہمارے اعمال ہم کو نافع ہوں گے تو اس کا قاعدہ کلیہ تو یہ سن لو کہ جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں ان کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے (یعنی ان کے اعمال کی ایسی مثال ہے) جیسے کچھ راکھ ہو (جو اڑنے میں بہت خفیف ہوتی ہے) جس کو تیز آمدھی کے دن میں تیزی کے ساتھ ہوا اڑالے جائے کہ اس صورت میں اس راکھ کا نام و نشان بھی نہ رہے گا اسی طرح ان لوگوں نے جو کچھ عمل کئے تھے اس کا کوئی حصہ (یعنی اثر و نفع کے قبیل سے) ان کو حاصل نہ ہو گا اس راکھ کی طرح ضائع و برباد جائے گا یہ بھی بڑی دور دراز کی گمراہی ہے کہ گمان تو ہو کہ ہمارے عمل نیک اور نافع ہیں اور پھر ظاہر ہو بد اور مضر جیسے عبادت اصنام یا غیر نافع جیسے اعتناق و صلہ رہمی ، اور چونکہ حق سے اس کو

بہت بعد ہے اس لئے کہا گیا، پس اس طریقے تو نجات کا احتمال نہ رہا، اور اگر ان کا یہ زعم ہو کہ قیامت ہی کا وجود محال ہے اور اس صورت میں عذاب کا احتمال نہیں تو اس کا جواب یہ ہو کہ کیا رائے مخاطب (تجہ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک (یعنی مشتمل بر منافع و مصالح) پیدا کیا ہے اور اس سے قادر ہونا اس کا ہر سولہیں جب وہ قادر مطلق ہے تو اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور ایک دوسری نئی مخلوق پیدا کر دے اور یہ خدا کو کچھ بھی مشکل نہیں (پس جب نئی مخلوق پیدا کرنا آسان ہے تو تم کو دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے) اور اگر یہ ہوسہ ہو کہ ہمارے اکابر ہم کو بچالیں گے تو اسکی حقیقت سن لو کہ قیامت کے دن (خدا کے سامنے سب پیش ہوں گے پھر چھوٹے درجہ کے لوگ (یعنی عوام و تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی خواص و متبعین سے بطور ملامت و عتاب کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے رشتہ کی دین کی جو راہ تم نے ہم کو بتلائی ہم اسی پر اڈے، اور آج ہم پر مصیبت ہے) تو کیا تم خدا کے عذاب کا کچھ جزو ہم سے ملنا سکتے ہو (یعنی اگر بالکل نہ بچا سکو تو کسی قدر بھی بچا سکتے ہو) وہ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تم کو کیا بچاتے خود ہی نہیں بچ سکتے ہیں البتہ) اگر اللہ ہم کو (کوئی) راہ (بچنے کی) بتلاتا تو ہم تم کو بھی (وہ) راہ بتلا دیتے (اور اب تو) ہم سب کے حق میں دونوں صورتیں برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں، (بسیا کہ تمہاری پریشانی فهل أنتم مفلحون سے ظاہر کہ اور ہماری پریشانی تو لنؤذینا اللہ سے ظاہر ہی ہے) خواہ ضبط کریں (دونوں حالتوں میں) ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں (پس اس سوال کا جواب سے یہ معلوم ہو گیا کہ طریق کفر کے اکابر بھی اپنے متبعین کے کچھ کام نہ آئیں گے، یہ طریق کبی نجات کا مشتمل نہ رہا) اور اگر اس کا بھروسہ ہو کہ یہ مجبور دین غیر اللہ کا کام آویں گے اس کا حال اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ جب (قیامت میں) تمام مقدمات فیصل ہو چکیں گے (یعنی اہل ایمان جنت میں اور کفار دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے) تو اہل دوزخ سب شیطان کے پاس کہ وہ بھی وہاں ہو گا جا کر ملاست کریں گے کہ کم بخت تو تو ڈوبا ہی تھا ہم کو بھی اپنے ساتھ ڈبو یا اس وقت شیطان (جواب میں) کہے گا کہ مجھ پر تمہاری ملامت ناسخ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے (جتنے وعدے کئے تھے سب) سچے وعدے کئے تھے (کہ قیامت ہوگی اور کفر سے ہلاکت ہوگی اور ایمان سے نجات ہوگی) اور میں نے بھی وعدے تم سے کئے تھے (کہ قیامت نہ ہوگی اور تمہارا طریقہ کفر بھی طریقہ نجات ہے) سو میں نے وہ وعدے تم سے خلاف کئے تھے (اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے حق ہونے پر اور میرے وعدوں کے باطل ہونے پر دلائل قطعیہ قائم تھے، سو باوجود اس کے تم نے میرے وعدوں کو صحیح

اور خدا تعالیٰ کے وعدوں کو غلط سمجھا، تو اپنے ہاتھوں تم ڈوبے، اور اگر تم یوں کہو کہ آخر یہ وعدے
کو جھوٹا سمجھنے اور جھوٹے وعدوں کو سچا سمجھنے کا سبب بھی تو میں ہی ہوں تو بات یہ ہے کہ واقعی میں
اغوار کے مرتبہ میں سبب ضرور ہوا، لیکن یہ دیکھو کہ میرے اغوار کے بعد تم منتار تھے، یا مضطرب
بیقرار سو ظاہر ہے کہ) میرا تم پر اور تو کچھ زور چلتا نہ تھا، بجز اس کے کہ میں نے تم کو دگر اس کی طرف
بلایا تھا سو تم نے (باختیار خود) میرا کہنا مان لیا اگر نہ مانتے تو میں بزور تم کو گمراہ نہ کر سکتا تھا،
جب یہ بات ثابت ہے، تو مجھ پر (ساری) ملامت مت کرو (اس طرح سے کہ اپنے کو بالکل بری
سمجھنے لگو) اور (زیادہ) ملامت اپنے آپ کو کرو (کیونکہ اصل علت عذاب کی تمہارا ہی فعل ہے
اور میرا فعل تو نقص سبب ہے جو بعید اور غیر مستلزم ہے، پس ملامت کا تو یہ جواب ہے، اور اگر
مقصود اس قول سے استعانت و استمداد ہے تو میں کسی کی کیا مدد کروں گا، خود ہی مبتلائے مصیبت
و محتاج امداد ہو رہا ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ کوئی میری مدد نہ کرے گا ورنہ میں بھی تم سے اپنے لئے
مدد چاہتا کیونکہ زیادہ مناسبت تم سے ہے بس اب تو) نہ میں تمہارا مددگار ہو سکتا ہوں اور نہ
تم میرے مددگار (ہو سکتے) ہو (البتہ اگر میں تمہارے طریقہ شریک کو حق سمجھتا تو بھی اس تعلق کی وجہ
سے نصرت کا مطالبہ کرنے کی گنجائش بنتی لیکن) میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں (اور اس کو
باطل سمجھتا ہوں) کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو (خدا کا) شریک قرار دیتے تھے (یعنی دربارہ عباد
اصنام وغیرہ میری ایسی اطاعت کرتے تھے جو اطاعت کہ خاصہ حق تعالیٰ ہے، پس اصنام کو شریک
ٹھہرانا بایں معنی شیطان کو شریک ٹھہرانا ہے، پس مجھ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں نہ تم کو استمداد کا
کوئی حق ہے پس) یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے (پس عذاب میں پڑے رہو
نہ مجھ پر ملامت کرنے سے نفع کی امید رکھو اور نہ مدد چاہنے سے جو تم نے ظلم کیا تھا تم بھگتو جو
میں نے کیا تھا میں بھگتوں گا، پس گفتگو قطع کرو، یہ جمل ہوا ابلیس کے جواب کا، پس اس سے مجبورین
غیر اللہ کا بھروسہ بھی قطع ہوا، کیونکہ جو ان مجبورین کی عبادت کا اصل بانی و محرک ہے اور درحقیقت
عبادت غیر اللہ سے زیادہ راضی و ہی ہوتا ہے، چنانچہ اسی بناء پر قیامت کے دن دوزخ میں اہل نا
اسی سے کہیں سنیں گے، اور کسی مجبور غیر اللہ سے کچھ بھی نہ کہیں گے، جب اس نے صاف جواب
دیدیا تو اردوں سے کیا امید ہو سکتی ہے، پس نجات کفار کے سب طریقے مسدود ہو گئے، اور
یہی مضمون مقصود تھا۔

وَأَدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ

أُفُقِهَا نَهَارٌ لَا يَمُوتُ فِيهَا سَمَرٌ وَلَا يَسْخَرُونَ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ

تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خِلَافَيْنِ فِيهَا بَازُنَ رِيحٍ تَحْتِ تَحْمُرُ فِيهَا سَلَامٌ ۝۲۳

بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اپنے رب کے حکم سے ان کی ملاقات ہے وہاں سلام

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) وہ ان میں اپنے پروردگار کے حکم سے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) وہاں ان کو سلام اس لفظ سے کیا جائے گا السلام علیکم (یعنی باہم بھی اور فرشتوں کی طرف سے بھی، لقولہ تعالیٰ اِلَّا قِلَالًا سَلَامًا سَلَامًا وَلِقَوْلہ تعالیٰ وَالْمَلَائِکَةُ یَذُحُّونَ عَلَیْہِم مِّنْ کُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ الْآیۃ)

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیْبَۃً کَشَجَرۃٍ طَیْبَۃٍ اَصْلُہَا

تو نے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال بات مستحرمی جیسے ایک درخت مستحرم اس کی

ثَابِتٌ وَفَرْعُہَا فِی السَّمَآءِ ۝۲۴ تُوۡفِیْ اُکُلُہَا کُلِّ حَیۡنٍ بِاِذۡنِ رَّبِّہَا

جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی ہے آسمان میں، لانا بے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے

وَلِیَضْرِبَ اللّٰهُ الْاَمَثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝۲۵

اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ منکر کریں۔

خلاصہ تفسیر

کیا آپ کو معلوم نہیں (یعنی اب معلوم ہو گیا) کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی (اچھی اور موقع کی) مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی (یعنی کلمہ توحید و ایمان کی) کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے (مادہ پور کا درخت ہے) جس کی جڑ (زمین کے اندر) خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جاری ہوں (اور) وہ (درخت) خدا کے حکم سے ہر فصل میں (یعنی جب اس کی فصل آجادی) اپنا پھل دیتا ہو (یعنی خوب پھلتا ہو، کوئی فصل باری نہ جاتی ہو، اسی طرح کلمہ توحید یعنی لا الہ الا اللہ کی ایک جڑ ہے، یعنی اعتقاد جو مؤمن کے قلب میں استوکار کے ساتھ جا لگتا ہے، اور اس کی کچھ شاخیں ہیں یعنی اعمال صالحہ جو ایمان پر مرتب ہوتے ہیں جو بارگاہ قبولیت میں آسمان کی طرف لے جائے جاتے ہیں، پھر ان پر رضائے دائمی کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ

اس قسم کی مثالیں لوگوں کے بتلانے کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ لوگ معافی مقصود کو شرب سمجھ لیں کیونکہ مثال سے مقصود کی خوب توضیح ہو جاتی ہے

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَيِّثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَيْرَةٍ اِجْتَنَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ

اور مثال گندی بات کی جیسے درخت گندرا اکھاڑ لیا اس کو زمین کے اوپر سے

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝۲۶ يَثْبُتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ

کچھ نہیں اس کو ٹھہراؤ، مضبوط کرتا ہی اللہ ایمان والوں کی مضبوط بات سے دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ اَوْ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۷ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝۲۸

میں اور آخرت میں اور بھلا دیتا ہی اللہ بے انصافیوں کو اور کرتا ہی اللہ جو چاہے

الْمُتَرٰٓئِيْنَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحْلَوْا قُلُوْبَهُمْ

تولے نہ دیکھا ان کو جنہوں نے بدل کیا اللہ کے احسان کا ناشکری اور اتارا اپنی قوم کو

دَآسَرَ الْبَوَارِ ۝۲۹ جَهَنَّمَ يَصْلُوْنَ نَحْمًا وَّبِئْسَ الْقَرَارُ ۝۳۰

تباہی کے گھر میں، جو دوزخ ہے داخل ہوں گے اس میں اور وہ بُرا ٹھکانا ہے

خلاصہ تفسیر

اور گذرہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد درخت حنظل ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے (اور اس کو زمین میں) کچھ ثبات نہ ہو (خراب فرمایا یا اعتبار اس کی بو اور مزہ اور رنگ کے یا اس کے پھل کی بو اور مزہ اور رنگ کے یہ صفت طیبہ کے مقابل ہوئی اور اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جڑ اس کی دو ٹکڑیوں میں ہوتی اور ہر ٹکڑی ہوتی ہو، یہ افسوسناک ثابت کے مقابل فرمایا اور ما لہا من قرار اس کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا تفکھا مطلب نہ ہونا ظاہر ہے یہ حال کلمہ کفر کا ہے کہ گو کا فر کے دل میں اس کی جڑ ہے مگر حق کے سامنے اس کا غفل و مغلوب ہو جانا مشابہ اسی کے ہے جیسے اس کی جڑ ہی نہیں، قال تعالیٰ اَحْجَرْتُمْ دَاۤءِیَہُمْ اور شایہ ما لہا من قرار کی تصریح سے کفر کا یہی انحلال و مغلوبیت بتلانا مقصود ہو، اور چونکہ اس کے اعمال مقل نہیں ہوتے، اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فناء میں نہیں پھیلیں اور چونکہ اس کے

اعمال پر رضائے الہی مرتب نہیں ہوتی اس لئے پھل کی نفی بھی ظاہر ہے اور چونکہ قبول و رضا کا کافر میں بالکل احتمال نہیں اسی لئے مشبہ بہ کی جانب میں شاخوں اور پھل کا ذکر قطعاً متروک فرمادیا ہو، بخلاف نفس کفر کے کہ اس کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس کا وجود محسوس بھی ہے اور احکام جہاد وغیرہ میں معتبر بھی ہے۔ یہ تو دونوں کی مثال ہو گئی، آگے اثر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس کی بات یعنی کلمہ طیبہ ثابت الاصل کی برکت سے دنیا میں اور آخرت (دونوں جگہوں) میں (دین میں اور امتحان میں) مضبوط رکھتا ہے اور (اس کلمہ خبیثہ کی نجاست) ظالموں (یعنی کافروں) کو (دونوں جگہ دین میں اور امتحان میں) بچلا دیتا ہے اور (کسی کو ثابت رکھنے اور کسی کو بچلا دینے میں ہزاروں حکمتیں ہیں) اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتا ہو کرتا ہے، کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا یعنی ان کا حال عجیب ہے جنہوں نے بجا سے نعمت الہی (کے شکر) کے کفر کیا (مراد اس سے کفار مکہ ہیں، کذا فی الدر المنثور عن ابن عباس) اور جنہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچایا (یعنی ان کو بھی کفر کی تعلیم کی جس سے) وہ اس (جہنم) میں داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی جگہ ہے (اس میں اشارہ ہو گیا کہ ان کا داخل ہونا قرار اور دوام کے لئے ہو گا)۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ سے پہلے ایک آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کے اعمال کی یہ مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ راکھ کی مانند ہیں، جس پر تیز اور سخت ہوا چل جائے تو اس کا ذرہ ذرہ ہوا میں منتشر ہو کر بے نشان ہو جائے، پھر کوئی اس کو جمع کر کے اس سے کوئی کام لینا چاہے تو نا ممکن ہو جائے، مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَابَرَّ بِهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اِشْتَدَّتْ بِهِ السَّيْلُ يَوْمَئِذٍ يَوْمَئِذٍ عَاصِفٍ، مطلب یہ ہے کہ کافر کے اعمال جو بظاہر اچھے بھی ہوں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس لئے سب ضائع اور بیکار ہیں۔

اس کے بعد مذکورہ آیات میں پہلے مؤمن اور اس کے اعمال کی ایک مثال دی گئی ہے پھر کفار و منافقین کے اعمال کی، پہلی آیت میں مؤمن اور اس کے اعمال کی مثال ایک ایسے درخت سے دی گئی ہے جس کا تنہ مضبوط اور بلند ہو اور اس کی جڑیں زمین میں گہری گئی ہوئی ہوں اور زیر زمین پانی کے چشموں سے سیراب ہوتی ہوں، گہری جڑوں کی وجہ سے اس درخت کو استحکام اور مضبوطی بھی حاصل ہو کہ ہوا کے جھونکے سے گرنے جائے، اور سطح زمین سے دور ہونے کی وجہ سے اس کا پھل گندگی سے پاک صاف رہے، دوسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کی شاخیں بلند ہی پر

آسمان کی طرف ہوں، تیسری صفت اس درخت کی یہ ہے کہ اس کا پھل ہر وقت ہر حال میں کھایا جاتا ہو۔ یہ درخت کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، مگر زیادہ اقرب یہ ہے کہ وہ کھجور کا درخت ہے، اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے، اور روایات حدیث سے بھی، کھجور کے درخت کے تنہ کا بلند اور مضبوط ہونا تو مشاہدہ کی چیز ہے، سب ہی جانتے ہیں، اس کی جڑوں کا زمین کی دُور گہرائی تک پہنچنا بھی معروف و معلوم ہے، اور اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے، جس وقت سے اس کا پھل درخت پر ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے پکنے کے زمانہ تک ہر حال اور ہر صورت میں اس کا پھل مختلف طریقوں سے چٹنی و اچار کے طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے کھایا جاتا ہے، پھر پھل پک جانے کے بعد اس کا ذخیرہ بھی پورے سال باقی رہتا ہے، صبح و شام دن اور رات، گرمی اور سردی، غرض ہر موسم اور ہر وقت میں کام دیتا ہے، اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے، اس سے میٹھا رس بھی نکالا جاتا ہے، اس کے پتوں سے بہت سی مفید چیزیں چٹائیاں وغیرہ بنتی ہیں، اس کی گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے، بخلاف دوسرے درختوں کے پھلوں کے کہ وہ خاص موسم میں آتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، ان کا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا ہے، اور نہ ان کی ہر چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اور ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شجرۃ طیبۃ (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کھجور کا درخت ہے اور شجرۃ خبیثۃ حنظل کا درخت (مظہری)

اور مسند احمد میں بروایت مجاہد مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کوئی صاحب آپ کے پاس کھجور کے درخت کا گودہ لائے، اس وقت آپ نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال کیا کہ درختوں میں سے ایک ایسا درخت بھی ہے جو مردِ مؤمن کی مثال ہے، (اور بخاری کی روایت میں اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس درخت کے پتے کسی موسم میں جھڑتے نہیں) بتلاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ کھجور کا درخت ہے، مگر مجلس میں ابو بکرؓ و عمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہ موجود تھے، ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی، پھر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

مؤمن کی مثال اس درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمۃ طیبہ میں ایمان اس کی جڑ ہے، جو بہت مستحکم اور مضبوط ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے، مؤمنین کا ملیں صحابہ و تابعین بلکہ ہر زمانہ کے پختہ مسلمانوں کی ایسی مثالیں کچھ کم نہیں کہ ایمان کے مقابلہ میں

نہ جان کی پروا کی نہ مال کی اور نہ کسی دوسری چیز کی، دوسری وجہ ان کی طہارت و نفاست ہے کہ دنیا کی گندگیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جیسے بڑے درخت پر سطح زمین کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ دو وصف تو اظہارِ ثابوت کی مثال ہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں، مؤمن کے ایمان کے ثمرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ہر اَلَّذِي يَصْعَدُ الْكَلِمَ الطَّيِّبَ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں پاکیزہ کلمات، مطلب یہ ہے کہ مؤمن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح، تہلیل، قرآن و غیرہ کرتا ہو یہ صبح شام اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے رہتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت ہر حال ہر موسم میں لیل و نہار کھایا جاتا ہو مؤمن کے اعمال صالحہ بھی ہر وقت ہر موسم اور ہر حال میں صبح شام جاری ہیں، اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کارآمد ہے، مؤمن کا ہر قول و فعل اور حرکت و سکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے نافع و مفید ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ مؤمن کامل اور تعلیماتِ خدا و رسول کا پابند ہو۔

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ لُغَتِيْ اُطَهَّرُ كُلَّ حَيٍّ میں اُكُل سے مراد پھل اور کھانے کے لائق چیزیں ہیں اور حَيٍّ سے مراد ہر وقت ہر حال ہے، اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، بعض حضرات کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔

اس کے بالمقابل دوسری مثال کفار کی شجرۃ نجیثۃ سے دی گئی، جس طرح کفار کی مثال

کفار کی مثال | کَلِمَۃٌ طَيِّبَۃٌ مُّرَادٌ قَوْلٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی ایمان ہے، اسی طرح کَلِمَۃٌ نَجِیْثَۃٌ سے مراد کلماتِ کفر اور افعالِ کفر ہیں، شجرۃ نجیثۃ سے مراد مذکورہ حدیث میں حنظل کو قرار دیا گیا ہے، اور بعض نے لہسن وغیرہ کہا ہے۔

اس شجرۃ نجیثۃ کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی چاہے اس درخت کے پورے جڑ کو زمین سے اُکھاڑ سکتا ہے، اُجْثَتَتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ کے یہی معنی ہیں، کیونکہ اُجْثَتَتْ کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جڑ کو پورا پورا اٹھالیا جائے۔

کافر کے اعمال کو اس درخت سے تشبیہ دینے کی وجہ ظاہر ہے کہ اول تو اس کے عقائد کی کوئی جڑ بنیاد نہیں، اذرا دیر میں متزلزل ہو جاتے ہیں، دوسرے دنیا کی گندگی سے متاثر ہوتے ہیں، تیسرے ان کے درخت کے پھل پھول یعنی اعمال و افعال عند اللہ کارآمد نہیں۔

ایمان کا خاص اثر | اس کے بعد مؤمن کے ایمان اور کلمۃ طیبہ کا ایک خاص اثر دوسری

آیت میں بیان فرمایا ہے یُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِأَقْوَالِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ یعنی مومن کا کلمہ طیبہ مضبوط و مستحکم و رخت کی طرح ایک قول ثابت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم و برقرار رکھتے ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بشرطیکہ یہ کلمہ اخلاص کے ساتھ کہا جائے، اور لا الہ الا اللہ کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ کر خستیاں کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھنے والے کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک اس کلمہ پر قائم رہتا ہے، خواہ اس کے خلاف کتنے ہی حوادث سے مقابلہ کرنا پڑے اور آخرت میں اس کلمہ کو قائم و برقرار رکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔

قبر کا عذاب و ثواب | حدیث یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مومن سے سوال کیا جائے گا تو ایسے ہولناک مقام اور سخت حال میں بھی وہ بتائیں

ربانی اس کلمہ پر قائم رہ گا، اور لا الہ الا اللہ مستند رسول اللہ کی شہادت دے گا، اور پھر فرمایا کہ ارشاد فرمائی یُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِأَقْوَالِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ کا یہی مطلب ہے، یہ روایت حدیث حضرت براہ بن عازبؓ نے نقل فرمائی۔ اسی طرح تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون کی حدیثیں منقول ہیں جن کو امام ابن کثیرؒ نے اس جگہ اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے، اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے منظم رسالہ التثبیت عند التبییت میں اور شرح الصدور میں شتر احادیث کا حوالہ نقل کر کے ان روایات کو متواتر فرمایا ہے، ان سب حضرات صحابہ کرام نے آیت مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر اور اس آیت کو قبر کے عذاب و ثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا، پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شتر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے جس میں مسلمان کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں، اور وہ عامیانه شہادت کہ دنیا میں دیکھنے والوں کو یہ ثواب و عذاب نظر نہیں آتے، سو اس کے تفصیلی جوابات کی تو یہاں گنجائش نہیں، اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں، ہوا نظر نہیں آتی، مگر موجود ہے جس کا منافی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں

گر فتنہ ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔
اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے،
جب خالق کائنات نے اپنے رسول کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد اس عذاب و ثواب کی
خبر دیدی تو اس پر ایمان و اعتقاد رکھنا لازم ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَيُخِصِّلُ اللَّهُ الظَّالِمِينَ، یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کو تو کاملہ طیبہ اور
قول ثابت پر ثابت قدم رکھتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں قبر ہی سے اُن کے لئے راحت کے سامان
جمع ہو جاتے ہیں، مگر ظالموں یعنی کفار و مشرکین کو یہ خداوندی نصرت و امداد نہیں ملتی، بلکہ تکبر
کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے، اور انجام کار ابھی سے ایک قسم کے عذاب میں مبتلا
ہو جاتے ہیں۔

وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ یعنی اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے، کوئی طاقت نہیں
جو اس کے ارادہ اور مشیت کو روک سکے، حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، حذیفہ بن
یمانؓ وغیرہ حضرات صحابہ نے فرمایا ہے کہ مومن کو اس کا اعتقاد لازم ہے کہ اس کو جو چیز حاصل
ہوئی وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے حاصل ہوئی، اس کا ٹلنا ناممکن تھا، اسی طرح جو چیز
حاصل نہیں ہوئی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا، اور فرمایا کہ اگر تمہیں اس پر یقین و اعتماد نہ ہو
تو تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔

الَّذِينَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ
الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْطَلُونَ فِيهَا وَيَلْسَنُ الْقَرَارُةَ یعنی کیا آپ اُن لوگوں کو نہیں دیکھتے جنہوں
نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بدلہ میں کفر اختیار کر لیا، اور اپنی قوم کو جو اُن کے کہنے پر چلتی تھی
ہلاکت و بربادی کے مقام میں اتار دیا، وہ جہنم میں جلیں گے اور جہنم بہت بُرا ٹھکانا ہے۔
یہاں نعمۃ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو مخصوص و مشاہد ہیں
اور جن کا تعلق انسان کے ظاہری منافع سے ہے جیسا کھانے پینے پہننے کی اشیاء، زمین اور
مکان وغیرہ اور وہ مخصوص معنوی نعمتیں بھی ہو سکتی ہیں جو انسان کے رشد و ہدایت کے لئے
حق تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں، مثلاً انبیاء اور آسمانی کتابیں اور جو نشانیاں اللہ تعالیٰ کی قدرت و
حکمت کی اپنے وجود کے ہر جوار میں پھر زمین اور اس کی بے شمار مخلوقات میں، آسمان اور اس کی
ناقابلِ ادراک کائنات میں انسان کی ہدایات کا سامان ہیں۔

ان دونوں قسم کی نعمتوں کا تقاضا یہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کو پہچانتا
اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو کر اس کی فرمانبرداری میں لگ جاتا، مگر کفار و مشرکین نے نعمتوں کے

مقابلہ شکر کے بجائے کفرانِ نعمت اور سرکشی و نافرمانی سے کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی قوم کو ہلاکت و بربادی کے مقام میں ڈال دیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

ان تینوں آیتوں میں توحید اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی عظمت و فضیلت | احکام و ہدایات اور اس کی برکات و ثمرات اور اس سے انکار کی نحوست اور انجام بدکامی

ہوا ہے کہ توحید ایسی لازوال دولت ہے جس کی برکت سے دنیا میں تائید ایزدی ساتھ ہوتی ہے اور آخرت اور قبر میں بھی، اور اس سے انکار اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو عذاب سے بدل ڈالنے کے مرادف ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ

اور تمہارے لئے مقابلہ کہ یہ کائنات لوگوں کو اس کی راہ سے، تو کہہ مزا اڑا لو پھر

مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ۚ قُلْ لِّلْعِبَادِ كِيَ الْإِيمَانِ الْيَقِينُ ۚ

تم کو لوٹنا ہے طرفِ آگ کی، کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لاتے ہیں قائم رکھیں

الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ

نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر پہلے اس سے کہ

أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ۚ ۝۳۱ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ

اُسے وہ دن جس میں نہ سودا ہے نہ دوستی، اللہ وہ ہے جس نے بنائے

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ

آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکال روزی

مِنَ الشَّجَرِ ۚ إِنَّ قَالِكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ لِتَجْرِيَ

تمہاری میوے، اور کہنے میں کیا تمہارے کشتی کو کہ چلے

فِي الْبَحْرِ بِأَمْرٍ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْوَهْجَ ۚ ۝۳۲ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ

دریا میں اس کے حکم سے اور کام میں لگا دیا تمہارے ندیوں کو، اور کام میں لگا دیا تمہارے سورج

وَالْقَمَرَ ۚ آتِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ ۝۳۳ وَأَتَكُمُ

اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو، اور دیا تم کو

مِنْ كُلِّ مَآسَاءٍ مُّشْرِكًا وَإِنْ تَعَدَّ وَإِنْعَمَتِ اللَّهُ لَا تُحْصِرُهَا

ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی، اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

بیشک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر

خلاصہ تفسیر

اور (اد پر جو کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے شکرِ نعمت کی جگہ کفر کیا اور اپنی قوم کو جہنم میں پہنچایا اس کفر اور پہنچانے کا بیان یہ ہے کہ) ان لوگوں نے اللہ کے ساتھ کسی قرار دیے تاکہ (دوسروں کو بھی) اس کے دین سے گمراہ کریں پس ساتھ ہی شرار دینا کفر ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنا جہنم میں پہنچانا ہے) آپ (ان سب سے) کہہ دیجئے کہ چندے عیش کر لو، کیونکہ آخر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے (عیش سے مراد حالتِ کفر میں رہنا کیونکہ ہر شخص کو اپنے مذہب میں لذت ہوتی ہے، یعنی اور چندے کفر کر لو یہ تہدید ہے، اور مطلب "کیونکہ" کا یہ ہے کہ چونکہ جہنم میں جانا تو تمہارا ضروری ہے، اس واسطے کفر سے باز آنا تمہارا مشکل ہے، خیر، اور چندے گزار لو، پھر تو اس مصیبت کا سامنا ہو ہی گا اور جو میرے خاص ایمان والے بندے ہیں (ان کو اس کفرِ نعمت کے وبال پر متنبہ کر کے اس سے محفوظ رکھنے کے لئے، ان سے کہہ دیجئے کہ وہ نعمتِ الہی کے اس طرح شکر گزار رہیں کہ) نماز کی پابندی رکھیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے (حسبِ عہد شرعیہ) پوشیدہ اور آشکارا (جیسا موقع ہو) خرچ کیا کریں ایسے دن کے آنے سے پہلے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی (مطلب یہ کہ عباداتِ بدنیہ و مالیہ کو ادا کرتے رہیں کہ یہی شکر ہے نعمت کا) اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس پانی سے پھلوں کی قسم سے تمہارے لئے رزق پیدا کیا اور تمہارے نفع کے واسطے کشتی (اور جہاز) کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ وہ خدا کے حکم (و قدرت) سے دریا میں چلے اور تمہاری تجارت اور سفر کی غرض حاصل ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے نہروں کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ اسی سے پانی پیو اور آبِ پاشی کرو اور اس میں کشتی چلاؤ اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا جو ہمیشہ چلتے ہی میں رہتے ہیں تاکہ تم کو روشنی اور گرمی وغیرہ کا فائدہ ہو) اور تمہارے نفع کے واسطے رات اور دن کو (اپنی قدرت کا) مسخر بنایا تاکہ تم کو معیشت اور آسائش کا نفع حاصل ہو) اور جو چیز تم نے مانگی (اور

وہ تمہارے مناسب حال ہوئی، تم کو ہر چیز دی اور اشیائے مذکورہ ہی پر کیا منحصر ہو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں (تو اس قدر بے شمار ہیں کہ) اگر (ان کو) شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لاسکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف بڑا ہی ناشکر ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اور شکر نہیں کرتا، بلکہ اور بالعکس کفر و معصیت کرنے لگتا ہے، جیسا اور آیا ہے اَلَّذِينَ يَدَّبُرُوْنَ اَعْيُنَهُۥنَّ لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي كَفَرُوْا وَعَلَىٰ رُءُوسِهِمْ سُحُوفٌ مِّنْ غَمٍّ اَللّٰهُ كُفِّرًا ۙ -

معارف و مسائل

سورۃ ابراہیم کے شروع میں رسالت و نبوت اور معاد و آخرت کے متعلق مضامین تھے اس کے بعد توحید کی فضیلت اور کلمۃ کفر و شرک کی مذمت کا بیان مثالوں کے ذریعہ کیا گیا، پھر مشرکین کی مذمت اس بات پر کی گئی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مشکرا داکر نہ کرنے کے بجائے ناشکری اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں کفار و مشرکین کی مذمت اور ان کے انجامِ بد کا ذکر ہے، دوسری آیت میں مؤمنین کی فضیلت اور ان کو ادا سے شکر کے لئے کچھ احکامِ الہیہ کی تاکید کی گئی ہے، تیسری چوتھی اور پانچویں آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم نعمتوں کا ذکر فرما کر اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی ناشکرمانی میں صرف نہ کریں۔

تفسیر و تشریح

اَنْذَاۤ اِنْذَ کی جمع ہے، جس کے معنی مثل اور برابر کے ہیں، بتوں کو انداز اس لئے کہا جاتا ہے کہ مشرکین نے ان کو اپنے عمل میں خدا کی مثل یا برابر قرار دے رکھا تھا، تمسح کے معنی کسی چیز سے چند روزہ عارضی فائدہ حاصل کرنے کے ہیں، اس آیت میں مشرکین کے اس غلط نظریہ پر نیکی ہے کہ انہوں نے بتوں کو خدا کے مثل اور اس کا شریک ٹھہرا دیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں کو بتلا دیں کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے فرمایا کہ چند روزہ دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر تمہارا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔

دوسری آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ کفار مکہ نے تو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا اب آپ میرے مؤمن بندوں سے فرمادیں کہ نماز کی پابندی کریں اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں، پوشیدہ اور علانیہ طور پر اس آیت میں مؤمن بندوں کے لئے بڑی بشارت اور اعزاز ہے، اول تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا بندہ کہہ کر بچا دیا، پھر صفتِ ایمان کے ساتھ موصوف کیا، پھر ان کو دائمی رحمت اور اعزاز دینے کی ترکیب بتلائی، کہ نماز کی پابندی کریں، نہ اس کے اوقات میں سستی کریں

نہ آداب میں کوتاہی، اور اللہ ہی کے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ اس کی راہ میں بھی خرچ کیا کریں
خرچ کرنے کی دونوں صورتوں کو جائز قرار دیا کہ پوشیدہ طور پر صدقہ خیرات کریں یا اعلانِ اظہار
کے ساتھ کریں، بعض علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ فرض صدقۃ الفطر وغیرہ علانیہ ہونے چاہئیں تاکہ دوسرے
کو بھی ترغیب ہو، اور نفل صدقہ خیرات کو پوشیدہ دینا بہتر ہے کہ نام و نمود کا خطرہ نہ رہے، اور اصل
مدار نیت اور حالات پر ہے، اگر اعلان و اظہار میں نام و نمود کا شائبہ آجائے تو صدقہ کی فضیلت
ختم ہو جاتی ہے خواہ فرض ہو یا نفل اور اگر نیت یہ ہو کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو تو فرض اور
نفل دونوں میں اعلان و اظہار جائز ہے۔

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ لَفْظِ خِلَالٍ، خِلَالٌ کی جمع بھی
ہو سکتی ہے، جس کے معنی بے غرض دوستی کے ہیں، اور اس لفظ کو بابِ مطاعلہ کا مصدر بھی کہہ
سکتے ہیں، جیسے قتال، دفاع وغیرہ اس صورت میں اس کے معنی دو شخصوں کے آپس میں دونوں
طرف سے مخلصانہ دوستی کرنے کے ہوں گے، اس جملہ کا تعلق اوپر کے بیان کے ہوئے دونوں
حکم یعنی نماز اور صدقہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے طاقتِ فرصت عطا فرما رکھی ہے کہ نماز ادا کریں،
اور اگر پچھلی عمر میں غفلت سے کوئی نماز رہ گئی ہو تو اس کی قضاء کریں، اسی طرح آج مال تمھاری
ملک اور قبضہ میں ہے اس کو اللہ کے لئے خرچ کر کے دائمی زندگی کا کام بنا سکتے ہو، لیکن
دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ دونوں قوتیں اور قدرتیں تم سے لے لی جائیں گی، نہ تمھارے
بدن نماز پڑھنے کے قابل رہیں گے، نہ تمھاری ملک اور قبضہ میں کوئی مال رہے گا، جس سے
ضائع شدہ حقوق کی ادائیگی کر سکو، اور اس دن میں کوئی بیع و شراء اور خرید و فروخت
بھی نہ ہو سکے گی، کہ آپ کوئی ایسی چیز خرید لیں جس کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا
کفارہ کر سکیں، اور اس دن میں آپس کی دوستیاں اور تعلقات بھی کام نہ آسکیں گے، کوئی
عزیز دوست کسی کے گناہوں کا بار نہ اٹھاسکے گا اور نہ اس کے عذاب کو کسی طرح ہٹا سکے گا۔
اس دن سے مراد بظاہر حشر و قیامت کا دن ہے، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موت
کا دن ہو، کیونکہ یہ سب آثار موت ہی کے وقت سے ظاہر ہو جاتے ہیں، نہ بدن میں کسی عمل
کی صلاحیت رہتی ہے، نہ مال ہی اس کی ملک میں رہتا ہے۔

احکام و ہدایات | اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ قیامت کے روز کسی کی دوستی کسی
کے کام نہ آئے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض دنیاوی دوستیاں
اس روز کام نہ آئیں گی، لیکن جن لوگوں کی دوستی اور تعلقات اللہ کے لئے اور اس کے دین کے

کاموں کے لئے ہوں ان کی دوستی اس وقت بھی کام آئے گی کہ اللہ کے نیک اور مقبول بندے دوسروں کی شفاعت کریں گے جیسا کہ احادیث کثیرہ میں منقول ہے، اور قرآن عزیز میں ارشاد ہر
 اَلَا يَحْضُرُ يَوْمَئِذٍ لِّبَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمَتَّقِينَ یعنی وہ لوگ جو دنیا میں باہم
 دوست تھے، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، کہ یہ چاہیں گے کہ دوست پر اپنا
 گناہ ڈال کر خود بری ہو جائیں، مگر وہ لوگ جو تقویٰ شعار ہیں، کیونکہ اہل تقویٰ وہاں بھی ایک
 دوسرے کی مدد بطریق شفاعت کر سکیں گے۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں کی یاد دہانی کر کے
 انسان کو اس کی عبادت و اطاعت کی طرف دعوت دی گئی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات
 ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے جس پر انسانی وجود کی ابتداء اور بقا موقوف ہے، پھر
 آسمان سے پانی اتارا جس کے ذریعہ طرح طرح کے ثمرات پیدا کئے تاکہ وہ تمہارا رزق بن سکیں
 لفظ ثمرات، ثمرہ کی جمع ہے، ہر چیز سے حاصل ہونے والے نتیجہ کو اس کا ثمرہ کہا جاتا ہے، اس لفظ
 لفظ ثمرات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انسان کی غذا بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کا
 لباس بنتی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو اس کے رہنے سہنے کا مکان بنتی ہیں، کیونکہ لفظ رزق جو اس
 آیت میں مذکور ہے وہ ان تمام ضروریات انسانی پر حاوی اور شامل ہے (مظہری)

پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے ہی کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگا دیا کہ وہ اللہ کے
 حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں، لفظ سفینہ جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے
 کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا استعمال تمہارے لئے آسان کر دیا ہے، لکڑی، لوہا اور ان سے
 کشتی جہاز بنانے کے اوزار و آلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل و دانش یہ سب چیزیں
 اسی کی دی ہوئی ہیں اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر ناز نہ کریں، کہ یہ ہم نے ایجاد کی یا
 بنائی ہے، کیونکہ جن چیزوں سے ان میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی تم نے پیدا کی ہو
 نہ کر سکتے ہو، خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی، لوہے، تانبے اور پتیل ہی میں تصرفات
 کر کے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے، ورنہ حقیقت دیکھو تو خود آپ کا اپنا وجود اپنے
 ہاتھ پاؤں، اپنا دماغ اور عقل بھی تو آپ کی بنائی ہوئی نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا، کہ یہ دونوں ہمیشہ
 ایک حالت پر چلتے ہی رہتے ہیں، ذاب سے مشتق ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں
 مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں چلنا ان دونوں سیاروں کی عادت بنا دی گئی کہ کبھی اس
 کے خلاف نہیں ہوتا، مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ تمہارے حکم اور اشاروں پر چلا کریں

کیونکہ اگر شمس و قمر کو اس طرح انسان کا سفر کر دیا جاتا کہ وہ انسانی حکم کے تابع چلا کرتے تو انسانوں کے باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوتا کہ ایک انسان کہتا کہ آج آفتاب دو گھنٹے بعد نکلے، کیونکہ رات میں کام زیادہ ہو، دوسرا چاہتا کہ دو گھنٹے پہلے نکلے کہ دن کے کام زیادہ ہیں، اس لئے رب العزت جل شانہ نے آسمان اور ستاروں کو انسان کا مسخر تو بنایا، مگر اس مہنی سے مسخر کیا کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حکمت خداوندی کے ماتحت انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں، یہ نہیں کہ ان کا طلوع و غروب اور رفتار انسان کی مرضی کے تابع ہو جائے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ ہم نے رات اور دن کو تمھارے لئے مسخر کر دیا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو انسان کی خدمت اور راحت کے کام میں لگا دیا۔

وَالشُّكْرُ مِنَ كُلِّ مَآسَا لَشَيْءٍ، ”یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تم کو ہر اس چیز میں سے جو تم نے مانگی، اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش کسی کے مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا، اسی نے اپنے فضل سے بے مانگے عطا فرمایا۔“

ما نبرودیم و تقاضا ما نبرود ؛ لطف تو ناگفتہ مامی شنود

اسی طرح آسمان، زمین، چاند، سورج، وغیرہ پیدا کرنے کی دعا کس نے مانگی تھی، یہ سب کچھ مالک نے بے مانگے ہی دیا ہے، اسی لئے قاضی بیہناوی نے اس لفظ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز دیدی جو مانگنے کے قابل ہے، اگرچہ تم نے مانگا ہو لیکن اگر الفاظ کے ظاہری معنی ہی مراد ہوں تو ان میں بھی کچھ اشکال نہیں کہ عموماً انسان جو کچھ مانگتا اور طلب کرتا ہے اکثر تو اس کو دے ہی دیا جاتا ہے، اور جہاں کہیں اس کا سوال اپنی ظاہری صورت میں پورا نہیں کیا جاتا اس میں اس شخص کے لئے یا پورے عالم کے لئے کوئی مصلحت ہوتی ہے جس کا اس کو علم نہیں ہوتا، مگر علیم وخبیر جانتے ہیں کہ اگر اس کا یہ سوال پورا کر دیا گیا تو خود اس کے لئے یا اس کے خاندان کے لئے یا پورے عالم کے لئے وبال جان بنیگا ایسی صورت میں سوال کا پورا نہ کرنا ہی بڑی نعمت ہوتی ہے، مگر انسان اپنے قصور علم کی وجہ سے اس کو نہیں جانتا، اس لئے غمگین ہوتا ہے۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا، ”یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان پر

اس قدر ہیں کہ سب انسان مل کر ان کو شمار کرنا چاہیں تو شمار میں بھی نہیں آسکتیں، انسان کا اپنا وجود خود ایک عالم صخرہ ہے، اس کی آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ پاؤں اور بدن کے ہر جوڑ بلکہ ہر رگ و ریشہ میں رب العزت کی غیر متناہی نعمتیں مستور ہیں جن سے یہ جلتی پھرتی سیکڑوں نازک مشینوں کی عجیب و غریب فیکٹری ہر وقت مشغول بکار ہے، پھر آسمان و

زمین اور دونوں کی مخلوقات سمندروں پہاڑوں کی مخلوقات کہ آج کی جدید تحقیقات اور اس میں غریب
کھپانے والے ہزاروں ماہرین بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکے، پھر نعمتیں صرف وہی نہیں جو مثبت صورت
میں عام طور پر نعمت سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ہر مرض، ہر تکلیف، ہر مصیبت ہر رنج و غم سے محفوظ رہنا الگ
الگ مستقل نعمت ہے، ایک انسان کو کتنی قسم کی بیماریاں اور کتنی اقسام کی بدنی اور ذہنی تکلیفیں
دنیا میں پیش آسکتی ہیں انہی کا شمار ایک انسان سے نہیں ہو سکتا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ
اللہ تعالیٰ کے پورے عطیات اور نعمتوں کا شمار کس سے ہو سکتا ہے۔

انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بے شمار نعمتوں کے بدلہ میں بے شمار عبادت اور بے شمار
مشکر لازم ہوتا، مگر اللہ جل شانہ نے ضعیف البنیان انسان کی رعایت فرمائی، جب وہ حقیقت
پر نظر کر کے یہ اعتراف کر لے کہ شکر واجب سے سبکدوش ہونا اس کی قدرت میں نہیں، تو
اسی اعتراف کو ادائے شکر کے قائم مقام قرار دیا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد
علیہ السلام کے لیے ہی اعتراف پر ارشاد فرمایا کہ *الآن قد شکرت یادادہ*، یعنی یہ اعتراف
کر لینا ہی ادائے شکر کے لئے کافی ہے۔

آخر آیت میں فرمایا *إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ*، یعنی انسان بہت بے انصاف
اور بڑا ناشکر ہے، یعنی مقتضی انصاف کا تو یہ تھا کہ کوئی تکلیف و مصیبت پیش آئے تو
صبر و سکون سے کام لے، زبان اور دل کو شکایت سے پاک رکھے، اور سمجھے کہ یہ جو کچھ پیش آیا
ہے ایک حاکم حکیم کی طرف سے آیا ہے، وہ بھی مقتضائے حکمت ہونے کی بناء پر ایک نعمت
ہی ہے، اور جب کوئی راحت و نعمت ملے تو دل اور زبان ہر عمل سے اس کا مشکہ گزاریں،
مگر عام انسانوں کی عادات اس سے مختلف ہیں، کہ ذرا مصیبت و تکلیف پیش آجائے، تو
بے صبری میں مبتلا ہو جائیں، اور کہتے پھر میں، اور ذرا نعمت و دولت مل جائے تو اس میں
مست ہو کر خدا تعالیٰ کو بھلا دیں، اسی لئے مؤمنین مخلصین کی صفت پچھلی آیت میں صبار اور
مشکور بتلائی گئی ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَ

اور جس وقت کہا ابراہیم نے اے رب کر دے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور

بَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ إِلَّا هَكَذَا ۖ رَبِّ انصَلِّ ۖ كَثِيرًا مِّنْ

میرے اولاد کو اس بات کہ ہم پوجیں مورتوں کو، اے رب انھوں نے گمراہ کیا بہت

النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَافِرٌ رَحِيمٌ ﴿۳۶﴾

لوگوں کو سوتیس نے پیروی کی میری سورتو میرا ہی اور جس نے میرا کھنڈا مارنا سوتا تو بخشتے والا مہربان ہے ،

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ

اے رب میں نے بسایا ہے اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ یہاں کھیت نہیں تیرے محترم گھر کے

السَّحَرِ ۚ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ

پاس ، اے رب ہمارے تاکہ قائم رکھیں نماز کو سو رکھ اجسے لوگوں کے دل کہ

تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الشَّجَرِ ۚ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ﴿۳۷﴾

مائل ہوں ان کی طرف اور روزی دے ان کو میوؤں سے شاید وہ شکر کریں

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْ

اے رب ہمارے تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کچھ کرتے ہیں دکھا کر اور نفعی نہیں اللہ پر کوئی

شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿۳۸﴾ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ

ہیز زمین میں اور نہ آسمان میں ، شکر ہو اللہ کا جس نے بخشا

لِي عَلَى الْكَبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعٌ دُعَاءِ ﴿۳۹﴾

مجھ کو اتنی بڑی عمر میں اسمعیل اور اسحاق ، بیشک میرا رب سنتا ہے دعا کو

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۚ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ

اے رب میرے کر مجھ کو کہ قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی اے رب میری اور قبول

دُعَاءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ

کر میری دعا ، اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان والوں کو جس

يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

دن قائم ہو حساب ۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے (مختار

اسمعیل اور حضرت ہاجرہ کو حکیم الہی میدانِ مکہ میں لاکر رکھنے کے وقت دعا کے طور پر کہا کہ اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنادیکھتے رکھ اس کے رہنے والے مستحق امن رہیں، یعنی حرم کر دیجئے اور مجھ کو اور میرے خاص فرزندوں کو بتوں کی عبادت سے (جو کہ اس وقت جہلا میں شائع ہے) بچائے رکھتے (جیسا اب تک بچائے رکھا) اے میرے پروردگار (میں بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعا اس لئے کرتا ہوں کہ) ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا، یعنی ان کی گمراہی کا سبب ہو گئے، اس لئے اگر آپ کی پناہ چاہتا ہوں اور میں جس طرح اولاد کے بچنے کی دعا کرتا ہوں، اسی طرح ان کو بھی کہتا سنتا رہوں گا، پھر (میرے کہنے سننے کے بعد) جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہے (اور اس کے لئے وعدہ مغفرت ہے ہی) اور جو شخص (اس باب میں) میرا کسانہ مانے (سو اس کو آپ ہدایت فرمائیے، کیونکہ) آپ تو کثیر المغفرت (اور کثیر الرحمۃ ہیں) ان کی مغفرت اور رحمت کا سامان بھی کر سکتے ہیں کہ ان کو ہدایت دیں، مقتصد اس دعا سے شفاعت مؤمنین کے لئے اور طلب ہدایت غیر مؤمنین کے لئے ہے، اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو (یعنی اسمعیل علیہ السلام کو اور ان کے واسطے سے ان کی نسل کو) آپ کے محکم گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے قریب (جو کہ پہلے سے یہاں بنا ہوا تھا اور ہمیشہ سے لوگ اس کا ادب کرتے آتے تھے) ایک (چھوٹے سے) میدان میں جو (بوجہ سنگستان ہونے کے) زرت کے قابل (بھی) نہیں آباد کرتا ہوں اے ہمارے رب (بیت الحرام کے پاس اس لئے آباد کرتا ہوں) تاکہ وہ لوگ نماز کا (خاص) اہتمام رکھیں (اور چونکہ یہ اس وقت چھوٹا سا میدان ہے) تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طافت مائل کر دیجئے (کہ یہاں آکر رہیں ہمیں تاکہ آبادی پر رونق ہو جائے) اور (چونکہ یہاں زراعت وغیرہ نہیں ہے اس لئے) ان کو (محض اپنی قدرت سے) پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ ان نعمتوں کا شکر کریں، اے ہمارے رب (یہ دعائیں محض اپنی بندگی اور حاجت مندی کے اظہار کے لئے ہیں آپ کو اپنی حاجت کی اطلاع کے لئے نہیں، کیونکہ) آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے، جو ہم اپنے دل میں رکھیں اور جو ظاہر کر دیں اور (ہمارے ظاہر و باطن پر کیا حصر ہے) اللہ تعالیٰ سے (تو) کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (کچھ دعائیں آگے آئیں گی اور بیچ میں بعض نعم سابقہ پر حمد و شکر کیا، تاکہ شکر کی برکت سے یہ دعائیں اقرب الی القبول ہو جائیں، چنانچہ فرمایا) تمام حمد و ثناء خدا کے لئے (سزاوار) ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمعیل اور اسحاق (دو بیٹے) عطا فرمائے، حقیقت میں میرا رب دعا کا بڑا سننے والا (یعنی قبول کرنے والا) ہے (کہ عطاۃ اولاد کے متعلق میری یہ دعا دیتے ہیں) مِنَ الشَّيْلِ حِلِّينَ قبول کر لی، پھر اس نعمت کا شکر ادا کر کے آگے بقیہ

دعا میں پیش کرتے ہیں، اے میرے رب (جو میری نیت ہے اپنی اولاد کو بیت محرم کے پاس بسانے سے کہ وہ نمازوں کا اہتمام رکھیں اس کو پورا کر دیجئے، اور جیسا ان کے لئے اہتمام نماز میرا مطلب ہے اس طرح اپنے لئے بھی مطلب ہے، اس لئے اپنے اور ان کے دونوں کے لئے دعا کرتا ہوں اور چونکہ مجھ کو وحی سے معلوم ہو گیا ہے کہ ان میں بعض غیر مؤمن بھی ہوں گے اس لئے دعا سب کے لئے نہیں کر سکتا ہوں، پس ان مضامین پر نظر کر کے یہ دعا کرتا ہوں کہ) مجھ کو بھی نماز کا (خاص) اہتمام کرنیوالا رکھئے، اور میری اولاد میں بھی بعضوں کو (نماز کا اہتمام رکھنے والا کیجئے) اے ہمارے رب اور میری (یہ) دعا قبول کیجئے (اور) اے ہمارے رب میری مغفرت کر دیجئے اور میرے مال باپ کی بھٹی اور کل موٹنیں کی بھی حساب قائم ہونے کے دن (یعنی قیامت کے روز سب مذکورین کی مغفرت کر دیجئے) :

معارف و مسائل

پہلی آیات میں عقیدہ توحید کی معقولیت اور اہمیت کا اور شرک کی چہالت اور مذمت کا بیان تھا، توحید کے معاملہ میں زمرہ انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ کامیاب جہاد حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا جہاد تھا، اسی لئے دین ابراہیم کو خاص طور پر دین حنیف کا نام دیا جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کا ذکر آیات مذکور میں کیا گیا ہے، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی ایک آیت اَلَّذِیْنَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ کُفْرًا میں قریش مکہ کے ان لوگوں کی مذمت بیان کی گئی تھی جنہوں نے تقلید آبائی کی بناء پر اپنا کو کفر سے اور توحید کو شرک سے بدل ڈالا تھا، ان آیات میں ان کو بتلایا گیا کہ تمہارا جدِ جبریلہ ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ اور عمل کیا تھا تا کہ تقلید آبائی کے بخیر اسی پر نظر کر کے اپنے کفر سے باز آجائیں (بحر محیط)

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص اور حالات کے بیان سے قرآن کریم کا مقصد صرف ان کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ان میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایتی اصول ہوتے ہیں، انہی کو جاری رکھنے کے لئے یہ واقعات قرآن میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

اس جگہ پہلی آیت میں حضرت ابراہیم کی دو دعائیں مذکور ہیں، اول رَبِّ اجْعَلْ ہٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا، یعنی اے میرے پروردگار اس شہر (مکہ) کو جائے امن بنا دیجئے، سورۃ

بقرہ میں بھی یہی دعا مذکور ہے، مگر اس میں افظا بکذا بجیر الف لام کے بدلہ فرمایا ہے، جس کے معنی غیر محلین شہر کے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ دعا اُس وقت کی تھی جبکہ شہر مکہ کی بستی آباد نہ تھی، اس لئے عام الفاظ میں یہ دعا کی کہ اس جگہ کو ایک شہر مامون بنادیتے۔

اور دوسری دعا اس وقت کی ہے جبکہ مکہ کی بستی بس چکی تھی، تو شہر مکہ کو متعین کر کے دعا فرمائی، کہ اس کو جائے امن بنادیتے، دوسری دعا یہ فرمائی کہ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے۔

انبیاء علیہم السلام اگرچہ معصوم ہوتے ہیں ان سے شرک و بت پرستی بلکہ کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا، مگر یہاں حضرت خلیلؑ نے اس دعا میں اپنے آپ کو بھی شامل فرمایا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ طبعی خوف کے اثر سے انبیاء بھی ہر وقت اپنے کو خطرہ میں محسوس کرتے رہتے ہیں، یا یہ کہ اصل مقصود اپنی اولاد کو شرک و بت پرستی سے بچانے کی دعا کرنا تھا، اولاد کو اس کی اہمیت سمجھانے کے لئے اپنے آپ کو بھی شامل دعا فرمایا۔

اللہ جل شانہ نے اپنے خلیل کی دعا قبول فرمائی ان کی اولاد شرک و بت پرستی سے محفوظ رہی، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اہل مکہ تو عموماً اولاد ابراہیم علیہ السلام ہیں، ان میں تو بت پرستی موجود تھی، بحر قیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عیینہ یہ دیا ہے کہ اولاد خلیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بت پرستی نہیں کی، بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کر کے اولاد اسمعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا، تو یہ لوگ حرم سے انتہائی بت و عظمت کی بناء پر یہاں کے کچھ پتھر اپنے ساتھ اٹھالے گئے تھے، ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے، جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رخ نہ تھا، بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے، اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس کے بعد یہی طریقہ کار بت پرستی کا سبب بن گیا۔

دوسری آیت میں اپنی اس دعا کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ بت پرستی سے ہم اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا ہے، یہ اس لئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم السلام اپنے والد اور قوم کا تجربہ کر چکے تھے کہ بت پرستی کی رسم نے ان کو ہر خیر و صلاح سے محروم کر دیا۔

آخر آیت میں فرمایا فَاَنْتَ تَعْبُدُنِيْ وَمَنْ عَصَاكَ غَضُوْكَ وَرَحِيْمُهُ

”یعنی ان میں سے جو شخص میرا اتباع کرے یعنی ایمان اور عمل صالح کا پابند ہو جائے وہ تو میری ہر مطلب یہ ہے کہ اس پر فضل و کرم کی امید تو ظاہر ہے، اور جو شخص میری نافرمانی کرے تو آپ بہت مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں، اس میں نافرمانی سے اگرچہ عملی نافرمانی یعنی بدعملی مراد لی جائے تو معنی ظاہر ہیں، کہ آپ کے فضل سے ان کی بھی مغفرت کی امید ہے، اور اگر نافرمانی سے مراد کفر و انکار لیا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ کافر و مشرک کی مغفرت نہ ہونے اور ان کی شفاعت نہ کرنے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہو چکا تھا، پھر ان کی مغفرت کی امید کا اظہار کرنا درست نہیں ہو سکتا، اس لئے بحر محیط میں فرمایا کہ اس جگہ حضرت خلیل علیہ السلام نے ان کی سفارش یا دعاء کے الفاظ نہیں اختیار کئے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ ان کی مغفرت کر دیں، البتہ پیغمبرانہ شفقت جس کے دامن میں کافر بھی رہتے ہیں اور ہر پیغمبر کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ کوئی کافر بھی عذاب میں مبتلا نہ ہو اپنی اس طبعی خواہش کا اظہار اس عنوان سے کر دیا کہ ”آپ تو بڑے غفور و رحیم ہیں“ یوں نہیں فرمایا کہ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرمایا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے کافروں کے بارے میں فرمایا اِنَّ تَخَفُّرَ لِّهٖمْ قَاٰنَکَ اَنْتَ الْخَنِیْزُ الْخٰکِیْکُمْۙ یعنی اگر آپ ان کی مغفرت فرمائیں تو آپ قوی اور حکمت والے ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں کوئی روکنے والا نہیں۔“

ان دونوں بزرگوں نے کافروں کے معاملہ میں سفارش پر اقدام تو اس لئے نہیں کیا کہ وہ ادب حق کے خلاف تھا، مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ ان کافروں پر آپ عذاب نازل کر دیں بلکہ ادب کے ساتھ ایک خاص عنوان سے ان کے بھی بخشتے جانے کی طبعی خواہش کا اظہار کر دیا۔

احکام و ہدایات | دعاء تو ہر انسان مانگتا ہے، مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے، اس دعائے ابراہیمی کے دو جز ہیں، ایک شہر مکہ کو خوف و خطر سے آزاد جائے امن بنا دینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔ غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح و فلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف و خطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن اطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے دنیا کے سائے کامیوں اور راحتوں کا مدار تو امن و اطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے، جو شخص دشمنوں کے ترغیوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا ہو اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے، مال دولت

کی بہتات سب تلخ ہو جاتی ہیں۔

دینی اعتبار سے بھی ہر طاعت و عبادت اور احکام الہیہ کی تعمیل انسان اس وقت کر سکتا ہے کہ جب اس کو کچھ سکون و اطمینان نصیب ہو۔

اس لئے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی پہلی دعا میں انسانی فلاح کی تمام ضروریات معاشی و اقتصادی اور دینی و اخروی سب داخل ہو گئیں، اس ایک جملہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی تمام اہم چیزیں مانگ لیں۔

اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کی بروردی اور ان کی معاشی راحت کا انتظام بھی حسب قدرت باپ کے فرائض میں سے ہے، اس کی کوشش زہد اور ترک دنیا کے منافی نہیں۔ دوسری دعا میں بھی بڑی جامعیت ہے، کیونکہ وہ گناہ جس کی مغفرت کا امکان نہیں، وہ شرک و بت پرستی ہے اس سے محفوظ رہنے کی دعا فرمادی، اس کے بعد اگر کوئی گناہ سرزد بھی ہو جائے تو اس کا کفارہ دوسرے اعمال سے بھی ہو سکتا ہے، اور کسی کی شفاعت بھی معاف کئے جاسکتے ہیں، اور اگر عبادتِ اصنام کا لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بت ہے اور اس کی محبت سے مغلوب ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کر لینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے، تو اس دعا یعنی عبادتِ اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا ضمیمہ آجاتا ہے، بعض صوفیائے کرام نے اسی معنی میں اپنے نفس کو خطاب کر کے غفلت و معصیت پر ملامت کی ہے ۵

سودہ گشت از سجدہ راہِ بتاں پیشانیم

چند بر خود تهمت دینِ مسلمانانِ نہم

اور عارف رومیؒ نے فرمایا ہے کہ

ہر خیالِ شہوتے در رہ جئے ست

تیسری آیت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک اور حکیمانہ دعا اس طرح مذکور ہے کہ، رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْـَٔلُکَ الْاٰیۃَ اَلِیَّہِیْمِ عَلٰی سِرِّہِیْمِؕ (میرے پروردگار! میں نے اپنی کچھ ذریت یعنی اہل و عیال کو ایک ایسے دامنِ کودہ میں ٹھہرا دیا ہے جس میں کوئی کھیتی وغیرہ نہیں ہو سکتی اور بظاہر وہاں زندگی کا کوئی سامان نہیں) یہ دامنِ کودہ آپ کے عظمت والے گھر کے پاس ہے، تاکہ یہ لوگ نماز قائم کریں، اس لئے آپ کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دیں، کہ انکے آنس اور آبادی کا سامان ہو جائے، اور ان کو خیرات (بھل) عطا فرمائیے تاکہ

یہ لوگ شکر گزار ہوں۔

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفانِ نوح میں بے نشان ہو گئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرمایا کہ ان کو ملکِ شام سے ہجرت کر کے حضرت ہاجرہ اور صاحبزادے اسمعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب و گیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صبح بخاری میں ہے کہ اسمعیل علیہ السلام اس وقت شیرخوار بچے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسبِ حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہ کو موجودہ بیت اللہ اور چاہِ زمزم کے قریب ٹھہرا دیا، اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی، دور دور تک نہ پانی نہ آبادی، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکِ شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا، جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیلِ حکم کے لئے روانہ ہو گئے، بیوی اور شیرخوار بچہ کو اس بے وقوف جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعا سے ہو گا جو بعد میں کی گئی مگر حکیم ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر کبھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہ کو خبر دیدیں، اور کچھ تسلی کے الفاظ کہہ دیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں، جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان مگر خلیل اللہ نے مُردہ کر نہیں دیکھا، تب حضرت ہاجرہ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کر سکتا، شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے، تو آواز دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مُردہ کر جواب دیا کہ ہاں، حضرت ہاجرہ نے یہ سن کر فرمایا اِذَا لَا يُفْصِحُنَا، یعنی اب کوئی پرواہ نہیں، جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہنچ گئے، جہاں ہاجرہ و اسمعیل علیہما السلام آنکھوں سے او جھل ہو گئے، تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعا کے ضمن میں بہت سی ہدایات اور مسائل ہیں، ان کا بیان یہ ہے :-

(۱) حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو دعا ابراہیمی کے اسرار و حکم

مقام خلیل اللہ کا حق ادا کیا، کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو یہ حکم ملا کہ آپ ملک شام واپس چلے جائیں، اس بے آب و گیاہ لٹ و دو ق میدان میں اہلیہ و شیر خواہ بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں منبرائی، اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جا کر تسلی کر دیں، اور کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے آپ گہرا میں نہیں، بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔

دوسری طرف اہل و عیال کے حقوق اور ان کی محبت کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اجبصل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن و اطمینان کے ساتھ رخصت کی دعا فرمائی، ان کی راحت کا سامان کر دیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیل حکم کے ساتھ جو دعا کی جائے گی بارگاہِ کریم سے وہ ہرگز روند نہ ہوگی، اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بکیں و بے بس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے، بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریات زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہل مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسن انتظام کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوب الحال نہیں ہوتے، اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان انسان کا مل بنتا ہے۔

(۲) غَیْرِ ذِی زَرْع، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیر خواہ بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملک شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرمادیں گے بلکہ ان کیلئے پانی ضرور ہیا کیا جائے گا، اس لئے بِرَاحٍ غَیْرِ ذِی مَاءِ نہیں کہا، بلکہ غَیْرِ ذِی زَرْعِ فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں، یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں، مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحرِ خط)

(۳) عِشْرَتَ بَنَاتٍ اَلْمَحْرَمِ سے ثابت ہوا کہ بیت اللہ شریف کی بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی، جیسا کہ امام قرطبی نے تفسیر سورۃ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے جب

ان کو زمین پر اتارا گیا، تو بطور متجزہ جبل سراندرپ سے اس جگہ تک ان کو پہنچایا گیا، اور جبریل امین نے بیت اللہ کی جگہ کی نشاندہی بھی کی، اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے، یہاں تک کہ طوفانِ نوح میں بیت اللہ کو اکٹھا کیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا، حضرت جبریل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی، پھر یہ بناء ابراہیمی عہدِ جاہلیت عرب میں منہدم ہو گئی، تو قریش جاہلیت نے از سر نو تعمیر کی، جس کی تعمیر میں ابو طالب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حصہ لیا۔

اس میں بیت اللہ کی صفت محترم ذکر کی گئی ہے، محترم کے معنی معزز کے بھی ہو سکتے ہیں اور محفوظ کے بھی، بیت اللہ شریعت میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں کہ ہمیشہ معزز اور محترم رہا ہے، اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

(۴) لَيَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، حضرت خلیلؑ نے شروع دعا میں اپنے بچے اور اس کی والدہ کی بے بسی اور خستہ حالی ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو دعا کی وہ یہ کہ ان کو نماز کا پابند بنادے کیونکہ نماز دنیا و آخرت کی تمام خیرات و برکات کے لئے جامع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے حق میں اس سے بڑی کوئی ہمدردی اور خیر خواہی نہیں کہ ان کو نماز کا پابند بنادیا جائے، اور اگرچہ وہاں اُس وقت صرف ایک عورت اور بچہ کو چھوڑا تھا، مگر دعا میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہاں شہر آباد ہوگا اور اس بچہ کی نسل چلے گی، اس لئے دعا میں ان سب کو شریک کر لیا۔

(۵) اَفْئِذْ مِّنَ النَّاسِ، اَفْئِذْ، فُواد کی جمع ہے، جس کے معنی دل کے ہیں، اس جگہ لفظ اَفْئِذْ کو نکرہ اور اسکے ساتھ حرفِ مبنی لایا گیا، جو تبعض اور تقلیل کے لئے آتا ہے، اس لئے معنی یہ ہوتے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے، امام تفسیر حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس دعا میں یہ حرف تبیین و تقلیل نہ ہوتا بلکہ اَفْئِذْ مِّنَ النَّاسِ کہہ دیا جاتا تو ساری دنیا کے مسلم و غیر مسلم یہود و نصاریٰ اور مشرق و مغرب کے سب آدمی مکہ پر ٹوٹ پڑتے، جو اُن کے لئے باعثِ رحمت ہو جاتا، اس حقیقت کے پیش نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں یہ الفاظ فرمائے کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیجئے۔

(۶) وَاسْرُزُّهُمْ مِّنَ الشَّجَرَاتِ، شَجَرَات، ثمرۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل اور عادتاً ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں، اس اعتبار سے دعا کا حاصل یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو کھانے کے لئے ہر طرح کے پھل عطا فرمائے۔

اور کبھی لفظ ثمرہ نتیجہ اور پیداوار کے معنی میں بھی آتا ہے، جو کھانے کی چیزوں سے زیادہ عام ہے، ہر نفع آور چیز کے نتیجہ اور حاصل کو اس کا ثمرہ کہا جاسکتا ہے، مشینوں اور صنعتی کارخانوں کے ثمرات ان کی مصنوعات کہلائیں گی، ملازمت اور مزدوری کا ثمرہ وہ اجرت اور تنخواہ کہلائیں گی جو اس کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔ قرآن کریم کی ایک آیت میں اس دعا میں ثمرات کلمہ شعی کا لفظ بھی آیا ہے، اس میں لفظ شجر کے بجائے لفظ شعی لایا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ حضرت خلیل اللہ نے ان لوگوں کے لئے صرف کھانے کے پھلوں ہی کی دعا نہیں فرمائی، بلکہ ہر چیز کے ثمرات اور حاصل شدہ نتائج کی دعا مانگی ہے، جس میں دنیا بھر کی مصنوعات اور بہر طرح کی قابل انتفاع چیزیں داخل ہیں، شاید اس دعا کا یہ اثر ہے کہ مکہ مکرمہ باوجود دے کے نہ کوئی زراعتی ملک ہو نہ تجارتی یا صنعتی، لیکن دنیا بھر کی ساری چیزیں مشرق و مغرب سے پہنچ کر مکہ معظمہ میں آتی ہیں، جو غالباً دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شہر کو بھی نصیب نہیں۔

(۷) حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے یہ دعا نہیں فرمائی کہ مکہ کی زمین کو قابل کاشت بنادیں، ورنہ کچھ مشکل نہ تھا کہ مکہ کی وادی اور سارے پہاڑ سرسبز کر دیئے جاتے، جن میں باغات اور کھیت ہوتے، مگر خلیل اللہ نے اپنی اولاد کے لئے یہ زراعت کا مشغلہ پسند نہ کیا، اس لئے دعا فرمائی کہ کچھ لوگوں کے قلوب اُن کی طرف مائل کر دیئے جائیں، جو مشرق و مغرب اور اطرافِ عالم سے یہاں آیا کریں، ان کا یہ اجتماع پوری دنیا کے لئے رشد و ہدایت کا اور اہل مکہ کی خوش حالی کا ذریعہ بنے، اطرافِ عالم کی چیزیں بھی یہاں پہنچ جائیں، اور اہل مکہ کو کسبِ مال کے ذرائع بھی ہاتھ آجائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، اور آج تک اہل مکہ زراعت اور کاشت سے بے نیاز ہو کر تمام ضروریاتِ زندگی سے مالا مال ہیں۔

(۸) اَعْلَمُ شُكْرًا مَوْنٌ، میں اشارہ کر دیا کہ اولاد کے لئے معاشی راحت و سکون کی دعا بھی اسی لئے کی گئی کہ یہ شکر گزار بن کر اس پر بھی اجر حاصل کریں، اس طرح دعا کی ابتداء نماز کی پابندی سے ہوتی، اور انتہا شکر گزاری پر، درمیان میں معاشی راحت و سکون کا ذکر آیا، اس میں یہ تعلیم ہے کہ مسلمان کو ایسا ہی ہونا چاہئے، کہ اس کے اعمال و احوال خیالات و افکار پر آخرت کی فلاح کا غلبہ ہو، اور دنیا کا کام بقدر ضرورت ہو۔

رَبَّنَا اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نَخْفِیْ وَ مَا نَعْلَمُ ط وَ مَا یَخْفِیْ عَلٰی اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ عِی
الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاۤءِ ۝

اس آیت میں دعا کا تکملہ اللہ جل شانہ کے علمِ محیط کا حوالہ دے کر کیا گیا ہے، اور

لفظ رَبَّنَا کو الحاج و زاری کے لئے مکرر لایا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ آپ ہمارے ہر حال سے واقف اور ہماری قلبی باطنی کیفیات اور ظاہری عرض و محرومیت سب سے باخبر ہیں۔

باطنی کیفیات سے مراد وہ رنج و غم اور فکر ہے جو شیرخوار بچے اور اس کی والدہ کو ایک کھلے میدان میں بے سرو سامان فریاد کرتے ہوئے چھوڑنے اور ان کی جدائی سے فطری طور پر لاحق ہو رہا تھا، اور ظاہری عرض و محرومیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت ہاجرہ کے وہ کلمات مراد ہیں جو انھوں نے امراہی کی خبر سنا کر کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم کیلئے دیا تو وہ ہمارے لئے بھی کافی ہے وہ ہیں بھی ضائع نہیں کرے گا، آخر آیت میں عِلْمِ اِلٰہی کی اسی رحمت کا مزید بیان ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن ہی کیا، تمام زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلٰی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ طَافِلًا رَبِّیْ
تَسْمِیْمٌ الَّذِیْ عَآءَہٗ اِسْ ایت کا مضمون بھی اس دعا کا تکملہ ہے، کیونکہ یہ دعا کے آداب میں سے ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کیا کہ شدید بڑھاپے کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما کر اولاد صالح حضرت اسمعیل اور اسحاق علیہما السلام عطا فرمائے۔

اس حمد و ثناء میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بچہ جو بے یار و مددگار چٹیل میدان میں چھوڑا ہے آپ ہی کا عطیہ ہے، آپ ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے، آخر میں حمد و ثناء کا تکملہ اِنَّ رَبِّیْ تَسْمِیْمٌ الَّذِیْ عَآءَہٗ سے کیا گیا، یعنی بلاشبہ میرا پروردگار دعاؤں کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

اس حمد و ثناء کے بعد پھر دعا میں مشغول ہو گئے، اور فرمایا: رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَ تَقْبَلْ دُعَآءِہٖ، جس میں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے نماز کی پابندی پر قائم رہنے کی دعا کی، اور آخر میں پھر بطور الحاج کے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میری یہ دعا قبول فرمائیے۔

آخر میں ایک جامع دعا فرمائی رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِیِّ اِلٰہِیْ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ
یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ یعنی اے ہمارے پروردگار! میری اور میرے والدین کی اور تمام مومنین کی مغفرت فرما، اس دن جب کہ محشر میں تمام زندگی کے اعمال کا حساب لیا جائیگا اس میں والدین کے لئے بھی مغفرت کی دعا فرمائی، حالانکہ والد یعنی آذر کا کافر ہونا قرآن میں مذکور ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ دعا اُس وقت کی ہو جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں کی سفارش اور دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا تھا، جیسے دوسری جگہ

قرآن کریم میں ہے **وَاعْفُ عَنَّا إِنَّكَ لَكَنَّ مِنَ الْخَالِقِينَ ۝**

احکام و ہدایات آیات مذکورہ سے دعا کے آداب یہ معلوم ہوتے ہیں کہ بار بار الحاج و زائر کے ساتھ کی جائے، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بھی کی جائے اس طرح دعا کی قبولیت کی بڑی امید ہر جاتی ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ۚ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ

اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہو ان کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف، ان کو تو ڈھیل دے رکھی

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۚ ۝۲۲ مَّطُوعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ

ہو اس دن کے لئے کہ پتھر اچانک اُنکھیں، دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر

لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرَفُهُمْ ۚ وَأَفِيدَ تَهُمُهُمْ هَوَاءُ ۚ ۝۲۳ وَأَنْذِرِ

پھر نہ پھریں آئیں گی ان کی طرف انکی آنکھیں، اور دل اُن کے اڑ گئے ہوں گے، اور ڈرا دے

النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ ۚ ابْ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا

لوگوں کو اس دن کہ آئے گا ان پر عذاب تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے

أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۚ نَحْبِ دَعْوَتِكَ وَنَتَّبِعِ الرَّسُولَ ۚ أَوَلَمْ

مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت تک، کہ ہم قبول کر لیں تیری بلائے کو اور پیر دی کر لیں رسولوں کی کیا تم

تَكُونُوا أَقْسَمًا مِّنْ قَبْلِ مَا لَكُم مِّنْ زَوَالٍ ۚ ۝۲۴ وَكَانَتْ

پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں دنیا سے ملنا، اور آباد تھے تم

فِي مَسْكِنٍ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا

بستیوں میں انہی لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا

بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمْ الْأَمْثَالَ ۚ ۝۲۵ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَ

ہم نے اُن سے اور بتلائے ہم نے تم کو سب قسے، اور یہ بنا چکے ہیں اپنے داؤ اور

عِنْدَ اللَّهِ مَكْرَهُمْ ۚ وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ لِلتَّزْوِيلِ مِنْهُ الْجِبَالِ ۚ ۝۲۶

اللہ کے آگے جو ان کا داؤ اور نہ ہو گا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ،

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفًا وَعْدَهُ رُسُلَهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو

سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کریگا اپنا وعدہ اپنے رسولوں کے بیشک اللہ زبردست ہے

اِنْتِقَامٍ ۝ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَ

بدلہ لینے والا، جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں آسمان اور

بَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ

لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے، اور دیکھے تو گنہگاروں کو اس دن

مَقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَكَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطْرِ اِنٍ وَتَغْشَى

باہم جکڑے ہوئے زنجیروں میں، کرتے اُن کے ہیں گندھک کے اور ڈھانکے لیتی

وُجُوهُهُمُ النَّارَ ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ إِنَّ

ہر ان کے منہ کو آگ، تاکہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جس کو اس کی کمائی کا، بیشک

اللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ هَذَا ابْلَغُ النَّاسِ وَلِيُنْذِرَ رُؤَايَاهُ

اللہ جلد کرنے والا ہے حساب، یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تاکہ چونک جائیں ہر

وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ وَلِيُنْذِرَ أُولَ الْأَلْبَابِ ۝

اور تاکہ جان لیں کہ معبود وہی ایک ہے اور تاکہ سوچ لیں عقل والے۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے مخاطب) جو کچھ یہ ظالم (کافر) لوگ کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو (جلدی

عذاب نہ دینے کی بنا پر) بے خبر مت سمجھ (کیونکہ) ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے

جس میں اُن لوگوں کی نگاہیں (مائے حیرت اور ہیبت کے) پھٹی رہ جاویں گی (اور وہ موقف حساب کی طرف

حسب الطلب) دوڑتے ہوں گے (اور فرط حیرت سے) اپنے منہ پر پٹا باندھ لیں گے (اور) ان کی نظر ان کی طرف ہٹ

کر نہ آدیتی (یعنی ایسی ٹٹکی بندھے گی کہ انکے نہ جھکیں گے) اور ان کے دل (شدت بول سے) بالکل بدحواس

ہوں گے اور (جب وہ دن آجائے گا پھر مہلت نہ ہوگی پس) آپ ان لوگوں کو اس دن (کے آنے)

سے ڈراتے جس دن ان پر عذاب آپڑے گا، پھر یہ ظالم لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ایک بڑا

قلیل تک ہم کو (اور) مہلت دیدیجئے (اور دنیا میں پھر بھی دیکھئے) ہم (اس مدت میں) آپ کا

سب کہنا مان لیں گے اور پیغمبروں کا اتباع کریں گے (جواب میں ارشاد ہو گا کہ کیا ہم نے دنیا میں تم کو مہلت طویلہ نہ دی تھی اور کیا تم نے (اس مہلت کے بدلے ہی کے سبب) اس کے قبل (دنیا میں) قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو (دنیا سے) کہیں جہاں نہیں ہے (یعنی قیامت کے منکر تھے اور اس پر قسم کھاتے تھے، بقولہ تعالیٰ وَ أَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهَنَّمَ اَنْ يَّمَا نَزِمَ لَا يُعَذِّبُ اللّٰهُ مَوْتًا يَّمُوتُونَ) حالانکہ (انکار سے باز آ جانے کے اسباب سب مجتمع تھے چنانچہ) تم ان (پہلے) لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنہوں نے (کفر و انکار قیامت کر کے) اپنی ذات کا نقصان کیا تھا اور تم کو (تو اتر اخبار سے) یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیونکر معاملہ کیا تھا (کہ ان کے کفر و انکار پر ان کو سزائیں دیں، اس سے تم کو معلوم ہو سکتا تھا کہ انکار کرنا موجب غضب ہے، پس تصدیق واجب ہے، اور ان کے مساکن میں رہنا ہر وقت اُن کے ان حالات کی یاد دلانے کا سبب ہو سکتا تھا، پس انکار کی کسی وقت گنجائش نہ تھی) اور (علاوہ ان واقعات کے سننے کے جو کہ عبرت کے لئے کافی تھے) ہم نے (بھی) تم سے مثالیں بیان کیں (یعنی کتب سماویہ میں ہم نے بھی ان واقعات کو مثال کے طور پر بیان کیا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی ایسے ہی مغضوب و مستحق عذاب ہو گے پس واقعات کا اولاً اخبار سے سننا پھر ہمارا ان کو بیان کرنا، پھر مثالیت پھر تنبیہ کر دینا یہ سب اسباب مقتضی اس کو تھے کہ قیامت کا انکار نہ کرتے اور (ہم نے جن پہلے لوگوں کو ان کے کفر و انکار پر سزائیں دیں) ان لوگوں نے (دین حق کے ماننے والے) اپنی ہی سبب سے بڑی بڑی تدبیریں کیں تھیں اور ان کی (یہ سب) تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں (اس کے علم سے غفلت نہ رہ سکتی تھیں) اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ (عجب نہیں) ان سے پہاڑ بھی (اپنی جگہ سے) ٹل جاویں (مگر پھر بھی حق ہی غالب رہا اور ان کی ساری تدبیریں لغو و بیکار ہو گئیں اور وہ ہلاک کئے گئے، اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ حق دہی ہر جو پیغمبر فرماتے تھے اور اس کا انکار موجب غضب و عذاب ہے، جب قیامت میں ان کا مخلوق ہونا معلوم ہو گیا) پس (اے مخاطب) اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنا (اللہ تعالیٰ سے) (چنانچہ قیامت کے دن ان کے منکرین کے عذاب کا وعدہ تھا سودہ پورا ہو گا، جیسا اوپر مذکور ہوا) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) پورا بدلہ لینے والا ہے (کہ اس کو کوئی بدلہ لینے سے نہیں روک سکتا، پس قدرت بھی کامل پھر مشیت کا تعلق اوپر معلوم ہوا، پھر خلف وعدہ کا کیا احتمال رہا اور یہ بدلہ اس روز ہو گا) جس روز دوسری زمین بدل جا دے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی زرد و سرے بدل دیئے جا دیں گے (ان آسمانوں کے علاوہ کیونکہ اول بار کے نفع صوری سے سب زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جا دیں گے، پھر دوسری بار میں از سر نو زمین و آسمان بنیں گے)،

اور سب کے سب ایک (اور) زبردست اللہ کے روبرو پیش ہوں گے (اور اس سے قیامت کا دن ہر
یعنی قیامت میں ہر لہ لیا جاوے گا) اور اس روز اے مخاطب (تو مجرموں کو) یعنی کافروں کو (زنجیروں
میں جکڑے ہوئے دیکھے گا) اور ان کے کرتے قطران کے ہوں گے (یعنی سارے بدن کو قطران
پٹی ہوگی کہ اس میں آگ جلدی اور تیزی کے ساتھ لگے اور قطران درخت چتر کا روغن ہوتا ہے
کما فی کتب اللغات والطب) اور آگ ان کے چہروں پر (بھی) پٹی ہوگی (یہ سب کچھ اس روز
ہوگا) تاکہ اللہ تعالیٰ ہر مجرم (مجرم) شخص کو اس کے کئے کی سزا دے (اور گواہی مجرم بے انتہا ہوگی
مگر) یقیناً اللہ تعالیٰ (کو ان کا حساب و کتاب کچھ دشوار نہیں کیونکہ وہ) بڑی جلد حساب لینے والا
ہے (سب کا فیصلہ شروع کر کے فوراً ہی ختم کر دے گا) یہ (قرآن) لوگوں کے لئے احکام کا پہنچانا
ہے (تاکہ مسلخ یعنی رسول کی تصدیق کریں) اور تاکہ اس کے ذریعہ سے (عذاب کے) ڈرائے جائیں
اور تاکہ اس بات کا یقین کر لیں کہ وہی ایک محبوب و برحق ہے اور تاکہ دانشمندان لوگ نصیحت حاصل کر لیں:

معارف و مسائل

سورۃ ابراہیم میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے کچھ حالات و معاللات
کی تفصیل اور احکام الہیہ کی مخالفت کرنے والوں کے انجام بد اور آخر میں حضرت خلیل اللہ
ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ تھا۔ جنہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی، اور جن کی اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ
نے مکہ مکرمہ کی بستی بسائی، اور اس کے بسنے والوں کو ہر طرح کا امن و امان اور غیر معمولی طور پر
معاشی سہولتیں عطا فرمائیں، انہی کی اولاد بنی اسرائیل قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے مخاطب اول ہیں۔

سورۃ ابراہیم کے اس آخری رکوع میں خلاصہ کے طور پر اپنی اہل مکہ کو پچھلی قوموں کی
سرگذشت سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین اور اب بھی ہوش میں نہ آنے کی صورت میں قیامت
کے ہولناک عذابوں سے ڈرایا گیا ہے۔

پہلی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر مظلوم کی تسلی اور ظالم کے لئے سخت
عذاب کی دھمکی ہے کہ ظالم اور مجرم لوگ اللہ تعالیٰ کی ڈھیل دینے سے بے فکر نہ ہو جائیں، اور یہ
نہ سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے جرائم کی خبر نہیں، اس لئے باوجود جرائم کے وہ پھل پھولتے
ہیں، کوئی عذاب و مصیبت ان پر نہیں آتی، بلکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی نظر
میں ہے، مگر وہ اپنی رحمت اور حکمت کے تقاضے سے ڈھیل دے رہے ہیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا، یعنی نہ سمجھو اللہ تعالیٰ کو غافل، یہ خطاب بظاہر ہر اس

شخص کے لئے ہے جس کو اس کی غفلت اور شیطان نے اس دھوکہ میں ڈالا ہوا ہے، اور اگر اس کا خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو بھی مقصود اس سے امت کے غافلوں کو سنانا اور تنبیہ کرنا ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا امکان ہی نہیں کہ وہ معاذ اللہ تعالیٰ کو حالات سے بے خبر یا غافل سمجھیں۔

دوسری آیت میں بتلایا کہ ان ظالموں پر فوری طور سے عذاب نہ آنا ان کے لئے کچھ اچھا نہیں، کیونکہ اس کا انجام یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک قیامت اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لئے جائیں گے آگے ختم سورۃ تک اس عذاب آخرت کی تفصیلات اور ہولناکی و قانع کا بیان ہے۔

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ، یعنی اس دن جبکہ پھٹی رہ جائیں گی آنکھیں۔
مُغْلِبَاتٍ مَّتَّعِيْنَ رُؤُوسِهِمْ لِيَنْجُوثَ وَيَمُوتَ، یعنی خوف و حیرت کے سبب سر اوپر اٹھائے ہوئے بے تھاشا دوڑ رہے ہوں گے۔ لَا يَرْجِعُونَ إِلَيْهِمْ طَرَفَ عَيْنٍ اُنْ كِيْلَيْسَ نَ جَیْکِیْسَ کِی "وَأَقْبِلْ نَعْمَ هَؤُلَاءِ، اُنْ کے دل خالی بدحواس ہوں گے۔

یہ حالات بیان کرنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنی قوم کو اس دن کے عذاب سے ڈرائیے جس میں ظالم اور مجرم لوگ مجبور ہو کر پھریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں کچھ اور مہلت دیدیجئے یعنی پھر دنیا میں چند روز کے لئے بھیج دیجئے تاکہ ہم آپ کی دعوت قبول کریں اور آپ کے رسولوں کا اتباع کر کے اس عذاب سے نجات حاصل کر سکیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی درخواست کا یہ جواب ہو گا کہ اب تم یہ کہہ رہے ہو کیا تم نے اس سے پہلے یہ قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہماری دولت و شوکت کو زوال نہ ہو گا ہم ہمیشہ دنیا میں یوں ہی عیش و عشرت میں رہیں گے اور دوبارہ زندگی اور عالم آخرت کا انکار کیا تھا۔

وَسَكَتْنَا فِي مَسْکِنِ الْوَحْشِ نَظْمًا أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَخَرَّبْنَاهُمْ نَزْلًا، ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب مشرکین عرب کو ہے جن کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے أَنْزِلِ النَّاسَ، یعنی ڈراؤ ان لوگوں کو، اس خطاب میں ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اقوام سابقہ کے حالات و انقلابات تمہارے لئے بہترین واعظ ہیں تعجب ہے کہ تم ان سے عبرت حاصل نہیں کرتے، حالانکہ تم انہی ہلاک شدہ قوموں کے گھروں میں بستے اور چلتے پھرتے ہو، اور تمہیں کچھ حالات کے مشاہدہ سے کچھ متواتر خبروں سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان پر کیسا سخت عذاب نازل کیا، اور ہم نے بھی تمہارے راہ پر لانے کے لئے بہت سی مثالیں بیان کیں، پھر بھی تم ہوش میں نہیں آتے۔

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ، یعنی ان لوگوں نے دین حق مٹانے اور دعوت حق قبول کرنے والے مسلمانوں کو مٹانے اور ایذا پہنچانے کے لئے بھرپور تدبیریں کیں، اور اللہ تعالیٰ کے پاس انکی سب کھلی اور چھپی ہوئی تدبیریں سامنے موجود ہیں، وہ سب سے واقف اور ان کو ناکام بنادینے پر قادر ہیں، اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی عظیم اور سخت تھیں کہ ان کے مقابلہ پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں، مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ ساری تدبیریں گرد اور ناکام ہو کر رہ گئیں۔

جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پھیلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں، مثلاً فرعون، قوم عاد و ثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجودہ مشرکین عرب کا حال بیان کیا گیا ہو کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑی گہری اور دور رس سازشیں اور تدبیریں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ناکام بنا دیا اور اکثر مفسرین نے وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ میں لفظ إِنْ کو حرف نفی قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اگرچہ انھوں نے بہت سی تدبیریں کیں اور چالیں چلیں، لیکن ان کی تدبیروں اور چالوں سے یہ ممکن نہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں، اور پہاڑ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا عزم و استقلال ہے کہ کفار کی کوئی چال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

اس کے بعد آیت محمدیہ کو سنانے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ہر مخاطب کو یہ تنبیہ کی گئی: فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخَلَّفًا وَعِدٍ بِرُسُلِهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے جو وعدے فیج و نصرت اور کامیابی کے کئے ہیں وہ ان کے خلاف کرے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست اور انتقام لینے والا ہے، وہ ضرور اپنے پیغمبروں کے دشمنوں سے انتقام لے گا، اور پیغمبروں سے جو وعدے کئے ان کو پورا کرے گا۔

اس کے بعد کی آیات میں پھر قیامت کے ہولناک حالات و واقعات کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا: يَوْمَ تَبْدَلُ السَّمَاوَاتُ غَيْرَ السَّمَاوَاتِ الْأُولَىٰ وَتَبْدَلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ الْأُولَىٰ یعنی قیامت کا دن ایسا ہوگا کہ اس میں موجودہ زمین بھی بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی اور سب کے سب اللہ واحد و قہار کے سامنے حاضر ہوں گے،

زمین و آسمان کے بدل دینے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی صفات اور شکل و صورت بدل دی جائے، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات حدیث میں ہے کہ پوری زمین ایک سطح مستوی بنادی جائے گی، جس میں نہ کسی مکان کی آڑ ہوگی، نہ درخت وغیرہ کی، نہ کوئی پہاڑ اور ٹیلہ رہے گا نہ غار اور گہرائی، قرآن کریم میں اسی حال کا ذکر اس طرح مندرمایا ہے

لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا، یعنی تعمیرات اور پہاڑوں کی وجہ سے جو آجکل راستے اور سڑکیں ترا کر گذرتی ہیں، اور کہیں اونچائی ہے کہیں گہرائی، یہ صورت نہ رہے گی بلکہ سب صاف میدان ہو جائے گا۔

اور تبدیل زمین و آسمان کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنادیتے جائیں، روایات حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی اہم حدیث سیوطی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی اور یہ زمین ایسی ہوگی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا، اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انسؓ مذکور ہے (تفسیر منطہری)

یحییٰ بن بخاری و مسلم میں حضرت ہبل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف و سفید ہوگی جیسے میدے کی روٹی، اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہوگی، یہی مضمون سیوطی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی، جیسے چمڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلونٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار اور پہاڑ سب برابر ہو کر ایک سطح مستوی بن جائے گی، اور اس وقت تمام اولاد آدم اس زمین پر جمع ہوگی، اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہوگی جس پر وہ کھڑا ہو سکے، پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا، میں رب العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا، کہ ان کا حساب کتاب جلد ہو جائے۔ اس آخری روایت سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں تبدیلی صرف صفت کی ہوگی کہ غار اور پہاڑ اور عمارت اور درخت نہ رہیں گے، مگر ذات زمین ہی باقی رہے گی، اور پہلی سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر کی زمین اس موجودہ زمین کے علاوہ کوئی اور ہوگی، اور جس تبدیلی کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے ذات کی تبدیلی مراد ہے۔

بیانِ فقر 'ان میں حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ہو سکتا کہ پہلے لغو تصور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔

تفسیر مظہری میں مسند عبد بن حمید سے حضرت عکرمہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے، اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہوگی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

شیخ مسلم میں بروایت حضرت ثوبانؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور یہ سوال کیا کہ جس دن یہ زمین بدلی جائے گی تو آدمی کہاں ہوں گے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ پل صراط کے پاس ایک اندھیری میں ہوں گے۔

اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمین سے بذریعہ پل صراط دوسری طرف منتقل کئے جائیں گے، اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں متعدد صحابہ و تابعین کے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ اُس وقت موجودہ زمین اور اس کے سب دریا آگ ہو جائیں گے، گویا یہ سارا علاقہ جس میں اب دنیا آباد ہے اس وقت جہنم کا علاقہ ہو جائے گا، اور حقیقت حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔

زبان تازہ کردن با قرار تو ؛ نینگختن علت از کار تو

آخری آیات میں اہل جہنم کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ نجوم لوگوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا جائے گا، یعنی ہر جرم کے مجرم الگ الگ جمع کر کے یک جا باندھ دیئے جائیں گے، اور ان کو جو لباس پہنایا جائے گا وہ قطران کا ہوگا، جس کو تار کول کہا جاتا ہے، اور وہ ایک آتش گیر مادہ ہے کہ آگ فوراً پکڑ لیتا ہے۔

آخری آیت میں ارشاد فرمایا کہ یہ سب احوال قیامت کا بیان کرنا لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے ہے، تاکہ وہ اب بھی سمجھ لیں کہ قابلِ عبادت و اطاعت صرف ایک ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اور تاکہ جن میں کچھ بھی عقل و ہوش ہے وہ شرک سے باز آجائیں۔

سُورَةُ اِبْرٰهٖمَ خَمْسُ وِثْنِ مِائَةٍ وَاثْنِ عَشَرَ آيَةً

ایک یادداشت اور اطلاع

احقر ناکارہ نہ اس کا اہل تھا کہ تفسیر قرآن لکھنے کی جرأت کرے، نہ کبھی اس خیال کی ہمت کرتا تھا البتہ اپنے مرشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کو جو اس زمانہ کی بے نظیر تفسیر ہے نہ بہت مختصر کہ مضمون قرآن سمجھنا مشکل ہو نہ بہت طویل کہ پڑھنا مشکل ہو، پھر خدا داد علم و ذکاوت اور تقویٰ و ہمارت کی برکت سے اقوال مختلفہ میں ایک کو ترجیح دے کر لکھ دینے کا جو خاص ذوق حق تعالیٰ نے موصوف کو عطا فرمایا تھا وہ بڑی تفسیروں سے بھی حاصل ہونا مشکل تھا، مگر یہ تفسیر حضرت نے اہل علم کے لئے اپنی زبان اور علمی اصطلاحوں میں لکھی ہے، عوام خصوصاً اس زمانہ کے عوام جو عربی زبان اور اس کی اصطلاحات سے بہت دور ہو چکے ہیں ان کو اس تفسیر سے استفادہ مشکل تھا۔

اس لئے یہ خیال اکثر رہا کرتا تھا کہ اس کے معنایں عجیبہ کو آجکل کی آسان زبان میں لکھا جائے مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔

بحکم قصار و قدر اس کی ابتداء اس طرح ہو گئی کہ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر صاحب نے مجھ پر اصرار کیا کہ ریڈیو پر ایک سلسلہ قرآن کی خاص خاص آیات کا بعنوان "معارف القرآن" جاری کیا جائے ان کا اصرار اس کام کے آغاز کا سبب بن گیا، اور ریڈیو پاکستان پر ہر جمعہ کے روز جمعہ ۳۱ شوال ۱۳۸۳ھ مطابق ۲ جولائی ۱۹۶۴ء سے شروع ہو کر ۱۵ صفر ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۶۴ء تک جاری رہا، جو سورۃ ابراہیم کے اختتام پر منجانب محکمہ ریڈیو پاکستان ختم کر دیا گیا۔

حق تعالیٰ نے اس کو میرے وہم و گمان سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائی، اور اطراف علم سے اس کو کتابی صورت میں طبع کرنے کا تقاضا ہوا، اس کا ارادہ کیا تو جتنا کام اس وقت تک ہو چکا تھا وہ بھی اس لحاظ سے ناتمام تھا کہ یہ سلسلہ منتخب آیات کا تھا، درمیانی آیات کو جو خالص علمی تھیں ریڈیو پر عوام کو ان کی تفسیر سمجھانا آسان نہ تھا، وہ رہ گئی تھیں، کتابی شکل میں طبع کرنے کے لئے ان کا سلسلہ بھی پورا کرنا تھا، جو بوجہ وقف مشاغل کے پورا کرنا مشکل تھا۔

عجائب قدرت سے ہے کہ رمضان ۱۳۸۵ھ میں احقر سخت بیمار ہو کر نقل و حرکت معذور صاحب فراش ہو گیا، اور موت سامنے محسوس ہونے لگی، تو اس کا افسوس ستانے لگا کہ یہ مسودات یوں ہی ضائع ہو جائیں گے، حق تعالیٰ نے دل میں یہ داعیہ پیدا فرمادیا کہ لیٹے لیٹے "معارف القرآن" کے مسودات پر نظر ثانی اور درمیانی آیات جو رہ گئی ہیں ان کی تکمیل کسی طرح اسی حالت میں کر دی جائے۔

ادھر بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا، بیماری نے تمام دوسرے مشاغل پہلے ہی چھڑا دیے تھے، اب صرف یہی مشغلہ رہ گیا، اس لئے قدرت کے عجیب و غریب انتظام نے اسی بیماری میں بے انتہا یہ کام ۲۹ رجب ۱۳۹۱ھ تک پورا کرادیا۔

یہاں تک کہ سورۃ ابراہیم کا ختم اور قرآن پاک کے تیرہ پارے اسی ریڈیو کی نشری دروس کے ذریعہ پورے ہو گئے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اگلے حصہ کے لکھنے کی توفیق و ہمت بھی عطا فرمادی، نقل و حرکت سے معذوری کی تکلیف بھی رفع فرمادی، اگرچہ سلسلہ مختلف امراض کا تقریباً مسلسل رہا اور ضعف بھی بڑھتا رہا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کی امداد سے ۳۰ شعبان ۱۳۹۱ھ سے قرآن کے اگلے پاروں کی تفسیر کا لکھنا شروع ہو کر اس وقت جبکہ معارف القرآن کی تین جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یعنی ۲۵ صفر ۱۳۹۱ھ میں اس تفسیر کا مسودہ قرآن کریم کی چوتھی منزل سورۃ فرقان اُنیسویں پارے تک بعون اللہ سبحانہ مکمل ہو چکا ہے۔

اس وقت بھی مختلف امراض اور ضعف کا سلسلہ بھی ہے، اور بھدا اللہ یہ کام بھی جاری ہے، کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمادیں۔
وما ذلک علی اللہ بعزیز

بندہ محمد رفیع شفیق

۲۵ صفر ۱۳۹۱ھ

—————

سُورَةُ الْحَجَرِ

سُورَةُ الْحَجَرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ آيَةً وَسِتُّ رُكُوعَاتٌ

سورۃ حجر مدین میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد ہر بان نہایت رحم والا ہے

الَّذِينَ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَفُرْآنِ مُبِينٍ ①

۲ یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور واضح قرآن کی ،

رَبِّمَا يَوْمَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ②

کبھی وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کیا اچھا ہوتا جو ہوتے مسلمان ،

ذُرُّهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ③

پھوڑے ان کو کھالیں اور برت لیں اور امیدیں لگے رہیں سو آئندہ معلوم کر لیں گے

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قُرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ④ مَا تَسْبِقُ

اور کوئی بستی ہم نے غارت نہیں کی مگر اس کا وقت لکھا ہوا تھا مقرر ، نہ سبقت کرتا ہو

مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ⑤

کوئی فرقہ اپنے وقت مقررے اور نہ پیچھے رہتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

الَّذِينَ اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں ، یہ آیتیں ہیں ایک کامل کتاب کی اور

سُورَةُ الْحَجَرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ آيَةً وَسِتُّ رُكُوعَاتٌ

قرآن واضح کی (یعنی اس کی دونوں صفتیں ہیں) کامل کتاب ہونا بھی اور قرآن واضح ہونا بھی، ان کلمات سے قرآن کا کلام حق ہونا واضح کرنے کے بعد ان لوگوں کی حسرت اور عذاب کا بیان ہے جو قرآن پر ایمان نہیں لاتے، یا اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے، فرمایا **رَبِّمَآ يَوَدُّ** یعنی جب قیامت کے حشر و نشر کے میدان میں کافروں پر طرح طرح کا عذاب ہوگا تو کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے (بار بار اس لئے کہ جب کوئی نئی شدت و مصیبت دیکھیں گے تو ہر مرتبہ اپنے اسلام نہ لانے پر حسرت تازہ ہوتی رہے گی) آپ (دنیا میں ان کے کفر پر غم نہ کیجئے اور) ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے، کہ وہ (خوب) کھالیں اور چین اڑالیں، اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی (مرنے کے ساتھ ہی) حقیقت معلوم ہوتی جاتی ہے (اور دنیا میں جو ان کو ان کے کفر اور بد عملی کی فوراً سزا نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سزا کا وقت مقرر کر رکھا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا، اور ہم نے جتنی بستیاں رکفر کی وجہ سے) ہلاک کی ہیں ان سب کے لئے ایک معین وقت لکھا ہوا ہوتا رہا اور رہا (اصول ہو کہ) کوئی امت اپنی میعاد مقرر سے نہ پہلے ہلاک ہوتی ہے اور نہ پیچھے رہی ہے بلکہ وقت مقرر پر ہلاک ہوتی ہے، اسی طرح جب ان کا وقت آجائے گا ان کو بھی سزا دی جائے گی۔

معارف و مسائل

ذَرَهُمْ يَأْكُلُوا اللہ سے معلوم ہوا کہ کھانے پینے کو مقصد اور اصلی مشغلہ بنالینا اور دنیاوی عیش و عشرت کے سامان میں موت سے بے فکر ہو کر طویل منصوبوں میں لگے رہنا کفار ہی سے ہو سکتا ہے، جن کا آخرت اور اس کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان نہیں، تو من بھی کھاتا پیتا ہے، اور محاش کا بقدر ضرورت سامان کرتا ہے، اور آئندہ کاروبار کے منصوبے بھی بناتا ہے، مگر موت اور فکر آخرت سے غافل ہو کر یہ کام نہیں کرتا، اسی لئے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر رہتی ہے، اور فضول منصوبہ بندی کو مشغلہ نہیں بناتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں بدبختی اور بد نصیبی کی علامت ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہونا (یعنی اپنے گناہوں، غفلتوں پر نادم ہو کر نہ رونا) اور سخت دلی، طویل امل اور دنیا کی حرص (قرطبی عن مسند البزار عن انس)

اور طویل امل کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی محبت اور حرص میں اہٹاک اور موت و آخرت سے بے فکری کے ساتھ دور دراز کے منصوبے بناتے جائیں، (قرطبی) جو منصوبے دینی مقاصد

کے لئے یا کسی قوم و ملک کے آئندہ مفاد کے لئے بنائے جاتے ہیں وہ اس میں داخل نہیں کیونکہ وہ فکر آخرت ہی کی ایک صورت ہے۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کے پہلے طبقہ کی نجات ایسا کامل اور دنیا سے اعراض کی وجہ سے ہوگی، اور آخری امت کے لوگ بخل اور طویل امل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔

اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ جامع مسجد دمشق کے منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا، اے اہل دمشق! کیا تم اپنے ایک ہمدرد خیر خواہ بھائی کی بات سنو گے سن لو! کہ تم سے پہلے بہت بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے مال و متاع بہت جمع کیا اور بڑے بڑے شان دار محلات تعمیر کئے اور دروازے طویل منصوبے بنائے، آج وہ سب ہلاک ہو چکے ہیں، ان کے مکانات ان کی قبریں ہیں، اور ان کی طویل امیدیں سب دھوکہ اور قریب ثابت ہوئیں، قوم عادی تھائے قریب تھی جس نے اپنے آدمیوں سے اور ہر طرح کے مال و متاع سے اور اسلحہ اور گھوڑوں سے ملک کو بھر دیا تھا، آج کوئی بے جوان کی وراثت مجھ سے دو درہم میں خریدنے کو تیار ہو جائے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی زندگی میں طویل امیدیں باندھتا ہے اس کا عمل ضرور خراب ہو جاتا ہے (قرطبی)

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ⑥ لَوْ مَا

اور لوگ کہتے ہیں اے وہ شخص کہ تجھ پر اترا ہے قرآن تو بیشک دیوانہ ہے، کیوں نہیں

تَأْتِينَا بِالْمَلَكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ⑦ مَا نُزِّلُ

لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے، ہم نہیں اُتارتے

الْمَلَكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنْظَرِیْنَ ⑧

فرشتوں کو مگر کام پورا کر کے اور اس وقت نہ ملے گی ان کو مہلت۔

خلاصہ تفسیر

وَالْحَقِّ میں لفظ حق سے مراد فیصلہ عذاب ہے، اور بعض مفسرین نے قرآن یا راست

کو مراد قرار دیا ہے، بیان القرآن میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، یہ معنی حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہیں، تفسیر آیات یہ ہے)۔

اور ان کفار (کہ) نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) یوں کہا کہ اے وہ شخص جس پر (اس کے دعوے کے مطابق) قرآن نازل کیا گیا ہے تم (نحوذ باللہ) مبنی ہو (اور نبوت کا غلط دھوکہ کرتے ہو ورنہ اگر تم (اس دعوے میں) پتے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لاتے) (جو ہمارے سامنے تمہارے صدق کی گواہی دیں کقولہ تعالیٰ تَوَلَّآ أَنزَلَ إِلَيْنَا مَلَكٌ مِّمَّكَوْنِ مَعَهُ نَذِيرًا ۚ اللَّهُ تَعَالَىٰ جَوَاب دیتے ہیں کہ) ہم فرشتوں کو (جس طریق پر وہ درخواست کرتے ہیں) صرف فیصلہ ہی کے لئے نازل کیا کرتے ہیں اور (اگر ایسا ہوتا تو) اس وقت ان کو مہلت بھی نہ دی جاتی بلکہ جب اُن کے آنے پر بھی ایمان نہ لاتے جیسا کہ ان کے حالات سے ہی متیقن ہو تو فوراً ہلاک کر دیئے جاتے جیسا کہ سورۃ انعام کے اَدْل رکوع کی اخیر آیتوں میں اس کی وجہ مذکور ہو چکی ہے)

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ ۙ

ہم نے آپ اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔

خلاصہ تفسیر

ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں بلکہ اس کا معجزہ ہونا اس پر دلیل ہے، اور قرآن کے ایک اعجاز کا بیان تو دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ کوئی انسان اس کی ایک سورۃ کی مثل نہیں بنا سکتا، دوسرا اعجاز یہ ہے کہ ہم اس (قرآن) کے محافظ (اور نگہبان) ہیں اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتا، جیسا اور کتابوں میں ہوتا ہے، یہ ایسا صریح معجزہ ہی جس کو ہر عام و خاص سمجھ سکتا ہے، پہلا معجزہ کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور جامعیت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، ان کو تو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر کمی بیشی نہ ہونے کو تو ایک ان پرچہ جاہل بھی دیکھ سکتا ہے۔

معارف و مسائل

مامون کے دربار کا امام قرطبیؒ نے اس جگہ سند متصل کے ساتھ ایک واقعہ امیر المؤمنین مامون ایک واقعہ کے دربار کا نقل کیا ہے کہ مامون کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار

میں علمی مسائل پر بحث و مباحثہ اور مذاکرے ہوا کرتے تھے جس میں ہر اہل علم کو آنے کی اجازت تھی، ایسے ہی ایک مذاکرہ میں ایک یہودی بھی آگیا، جو صورت، شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا، پھر گفتگو کی تودہ بھی فصیح و بلیغ اور عاقلانہ گفتگو تھی جب مجلس ختم ہو گئی تو مامون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، مامون نے امتحان لینے کے لئے کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے۔ اس نے جواب دیا کہ میں تو اپنے اور اپنے آباء و اجداد کے دین کو نہیں چھوڑتا، بات مستم ہو گئی، یہ شخص چلا گیا، پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا، اور مجلس مذاکرہ میں فقہ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں، مجلس ختم ہونے کے بعد مامون نے اس کو بلا کر کہا کہ تم وہی شخص ہو جو سال گذشتہ آئے تھے؟ جواب دیا ہاں وہی ہوں، مامون نے پوچھا کہ اس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟

اس نے کہا میں یہاں سے لوٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، میں ایک خطاط اور خوشنویس آدمی ہوں، کتابیں لکھ کر فروخت کرتا ہوں تو اچھی قیمت سے فروخت ہو جاتی ہیں، میں نے امتحان کرنے کے لئے تورات کے تین نسخے کتابت کئے، جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی اور یہ نسخے لے کر میں کنیسہ میں پہونچا، یہودیوں نے بڑی رغبت سے ان کو خرید لیا، پھر اسی طرح انجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانہ میں لے گیا وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر و منزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لئے، پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا، اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کئے جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی تھی، ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے کے لئے نکلا تو جس کے پاس لے گیا اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں، جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا۔ اس واقعہ سے میں نے یہ سبق لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی حفاظت کی ہوئی ہے، اس لئے مسلمان ہو گیا، قاضی یحییٰ بن اکثم اس واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ اتفاقاً اسی سال مجھے حج کی توفیق ہوئی، وہاں سفیان بن عیینہ سے ملاقات ہوئی، تو یہ قصہ ان کو سنایا انھوں نے فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔

یحییٰ بن اکثم نے پوچھا قرآن کی کونسی آیت میں؟ تو فرمایا کہ قرآن عظیم نے جہاں تورات و انجیل کا ذکر کیا ہے، اس میں تو فرمایا **بِمَا اسْتَحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ**، یعنی یہود و نصاریٰ کو کتاب اللہ تورات و انجیل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، یہی وجہ ہوئی کہ جب یہود و

نصاری نے فریضہ حفاظت ادا نہ کیا تو یہ کتابیں نسخ و محرف ہو کر ضائع ہو گئیں، بخلاف قرآن کریم کے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا لَنَحْفِظُكَ، یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں، اس لئے اس کی حفاظت حق تعالیٰ نے خود فرمائی تو دشمنوں کی ہزاروں کوششوں کے باوجود اس کے ایک نقطہ اور ایک زیر و زبر میں فرق نہ آسکا، آج عہد رسالت کو بھی تقریباً چودہ سو برس پہلے میں تمام دینی اور اسلامی امور میں مسلمانوں کی کوتاہی اور غفلت کے باوجود قرآن کریم کے حفظ کرنے کا سلسلہ تمام دنیا کے مشرق و مغرب میں اسی طرح قائم ہے، ہر زمانہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان جوان بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں ایسے موجود رہتے ہیں جن کے سینوں میں پورا قرآن محفوظ ہے، کسی بڑے سے بڑے عالم کی بھی مجال نہیں کہ ایک حرف غلط پڑھ دے، اسی وقت بہت سے بڑے اور بچے اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔

حفاظت قرآن کے وعدے میں تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ صرف الفاظ قرآنی کا نام حفاظت حدیث بھی داخل ہے، نہ صرف معانی قرآن کا، بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامین قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً مضامین قرآنیہ ہی ہوتے ہیں مگر ان کو قرآن نہیں کہا جاتا، کیونکہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم کے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھ دے تو اس کو بھی کوئی قرآن نہیں کہے گا اگرچہ اس میں ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن صرف اس مصنف ربانی کا نام ہے جس کے الفاظ اور معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی زبان اردو یا انگریزی وغیرہ میں جو صرف ترجمہ قرآن کا شائع کر کے لوگ اس کو اردو یا انگریزی قرآن کا نام دیتے ہیں یہ ہرگز جائز نہیں، کیونکہ وہ قرآن نہیں، اور جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن صرف الفاظ قرآن کا نام نہیں بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزو ہیں، تو حفاظت قرآن کی جو ذمہ داری اس آیت میں حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمے قرار دی ہے اس میں جس طرح الفاظ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ اور ذمہ داری ہے اسی طرح معانی اور مضامین قرآن کی حفاظت اور مصنوی تحریف سے اس کے محفوظ رہنے کی بھی ذمہ داری اللہ تعالیٰ ہی نے لے لی ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ معانی قرآن وہی ہیں جن کے تعلیم دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا ہے لِنُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ، یعنی آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ آپ بتلا دیں لوگوں کو مفہوم اس کلام کا جو ان کے لئے نازل کیا گیا۔

اور یہی معنی اس آیت کے ہیں۔

يَعْلَمُ خَيْرًا مِّنْ اَنفُسِكُمْ وَ اَلْحِكْمَةُ ، اور اسی لئے آپ نے فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ، یعنی میں تو وحی بنا کر بھیجا گیا ہوں ، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معانی قرآن کے بیان اور تعلیم کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے امت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی ، انہی اقوال و افعال کا نام حدیث ہے۔

مطلقاً احادیث رسول کو جو لوگ آج کل دنیا کو اس مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں کہ احادیث کا ذخیرہ جو غیر محفوظ کہنے والا درحقیقت قرآن کو غیر محفوظ کہتا ہے

مستند کتب میں موجود ہے وہ اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ وہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد میں ردون کیا گیا ہے۔

اول تو ان کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ، کیونکہ حدیث کی حفاظت و کتابت خود عہد رسالت میں شروع ہو چکی تھی ، بعد میں اس کی تکمیل ہوئی ، اس کے علاوہ حدیث رسول درحقیقت تفسیر قرآن اور معانی قرآن ہیں ، ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے ، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں معانی (یعنی احادیث رسول) ضائع ہو جائیں ؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْاَوَّلِينَ ⑩ وَمَا يَأْتِيهِمْ

اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے اگلے فرقوں میں ، اور نہیں آتا ان کے پاس

مِّنْ رَّسُولٍ اِلَّا كَانُوْا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪ كَذٰلِكَ نَسْلُكُكَ

کوئی رسول مگر کرتے رہے ہیں اس سے ہنسی ، اسی طرح بٹھا دیتے ہیں ہم

فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑫ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سَنَةٌ

اس کو دل میں گنہگاروں کے ، یقین نہ لائیں گے اس پر اور ہوتی آتی ہے رسم

الْاَوَّلِينَ ⑬ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيْهِ يَعْرِجُوْنَ ⑭

پہلوں کی ، اور اگر ہم کھول دیں ان پر دروازہ آسمان سے اور سائے دن اس میں چڑھتے رہیں

لَقَالُوْا اِنَّمَا سَكِرَاتُ اَبْصَارِنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُوْنَ ⑮

تو بھی یہی کہیں گے کہ باندھ دیا ہمارا نگاہ کو ، نہیں بلکہ ہم لوگوں پر جادو ہوا ہے

اللُّغَاتُ

الشَّيْبِ جمع شیعہ کی ہے، جس کے معنی کسی شخص کے پیروکار و مددگار کے بھی آتے ہیں، اور ایسے فرقہ کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے جو خاص عقائد و نظریات پر اتفاق رکھتے ہوں، مراد یہ ہو کہ ہم نے ہر فرقہ اور ہر گروہ کے اندر رسول بھیجے ہیں اس میں لفظ الیٰ کے بجائے فی شیعہ الہ و لیلین فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہر گروہ کا رسول اسی گروہ کے لوگوں میں سے بھیجا گیا، تاکہ لوگوں کو اس پر اعتماد کرنا آسان ہو، اور یہ بھی اُن کی طبائع اور مزاج سے واقف ہو کر ان کی اصلاح کے لئے مناسب پروگرام بنا سکے۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی تکذیب سے غم نہ کیجئے، کیونکہ یہ معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، چنانچہ ہم نے آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کو اگلے لوگوں کے بہت سے گروہوں میں بھیجا تھا، اور ان کی یہ حالت تھی کہ کوئی رسول اُن کے پاس ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انھوں نے استہزاء نہ کیا، تو کہ تکذیب کی بدترین قسم ہے، پس جس طرح ان لوگوں کے دلوں میں یہ استہزاء پیدا ہوا تھا، اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرمین (یعنی کفار مکہ) کے قلوب میں ڈال دیتے ہیں (جس کی وجہ سے) یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے اور یہ دستور پہلوں سے ہی ہوتا آیا ہے (کہ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے ہیں، پس آپ مغموم نہ ہوں) اور (ان کے عناد کی یہ کیفیت ہو کہ فرشتوں کا آسمان سے آنا تو درکنار اس سے بڑھ کر، اگر خود ان کو آسمان پر بھیجا جائے اس طرح سے کہ) ہم اُن کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں پھر یہ دن کے وقت (جس میں نیند اور اذگہ وغیرہ کا بھی شبہ نہ ہو، اس دروازہ) میں (سے آسمان کو) چڑھ جا دیں تب بھی یوں کہیں کہ ہماری نظر بند کر دیجئے مگر (جس سے ہم اپنے کو آسمان پر چڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور واقع میں نہیں چڑھ رہے، اور نظر بندی میں کچھ اسی واقعہ کی تخصیص نہیں، بلکہ ہم لوگوں پر تو بالکل جادو کر رکھا ہے) اگر ہم کو اس سے بڑھ کر بھی کوئی معجزہ دکھلایا جائے گا وہ بھی واقع میں معجزہ نہ ہوگا) :

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّظَرِ ۚ (۱۶)

اور ہم نے بنائے ہیں آسمان میں برج اور رونق دی اس کو دیکھنے والوں کی نظر میں۔

خلاصہ تفسیر

پہلی آیات میں منکرین کی ہٹ دھرمی اور عناد کا ذکر تھا، ان آیات میں جو آگے

آرہی ہیں، اللہ جل شانہ کے وجود، توحید، علم، قدرت کے واضح دلائل، آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کے حالات و مشاہدات سے بیان کئے گئے ہیں جن میں ذرا بھی غور کیا جائے تو کسی عاقل کو انکار کی مجال نہیں رہتی ارشاد فرمایا،

اور بیشک ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے پیدا کئے اور دیکھنے والوں کیلئے آسمان کو ستاروں سے آراستہ کیا۔

معارف ومسائل

بُرُوجًا، بُرُوج کی جمع ہے، جو بڑے محل اور قلعہ وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے، ائمہ تفسیر مجاہد، قتادہ، ابو صالح وغیرہ نے اس جگہ بُرُوج کی تفسیر بڑے ستاروں سے کی ہے، اور اس آیت میں جو ان بڑے ستاروں کا آسمان میں پیدا کرنا ارشاد ہے، یہاں آسمان سے مراد فضاء آسمانی ہے، جس کو آجکل کی اصطلاح میں خلا کہا جاتا ہے، اور لفظ سماء کا دونوں معنی میں اطلاق عام معروف ہے، ہر زم آسمان کو بھی سما کہا جاتا ہے اور آسمان سے بہت نیچے جو فضاء آسمانی ہے اس کو بھی قرآن کریم میں جا بجا لفظ سماء سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیارات اور ستاروں کا آسمانوں کے اندر نہیں بلکہ فضاء آسمانی میں ہوا کی مکمل تحقیق قرآن کریم کی آیات سے نیز قدیم و جدید علم فلکیات کی تحقیق سے انشاء اللہ سورۃ فرقان کی آیت لَا تَبَارَكَ إِلَّا الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا کی تفسیر میں آئے گی۔

وَحَفِظْنَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيزٍ ۝۱۷ إِلَّا مَنْ اسْتَرَقَ السَّمْعَ

اور محفوظ رکھا ہم نے اس کو ہر شیطان مردود سے، مگر جو چوری سے سن بھاگا سو

فَاتَّبَعَهُ شَرَابٌ مُبِينٌ ۝۱۸

اس کے پیچھے پڑا انگارہ چمکتا ہوا۔

خلاصہ تفسیر

آسمان کو ستاروں کے ذریعہ ہر شیطان مردود سے محفوظ فرمادیا کہ وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہونے پاتی، ہاں مگر کوئی بات رفرشتوں کی، چوری چھپے سن بھاگے تو اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہوتا ہے۔ (اور اس کے اثر سے وہ شیطان ہلاک یا بدحواس ہو جاتا ہے)۔

معارف ومسائل

شہاب ثاقب | ان آیات سے ایک توبہ ثابت ہو کہ شیاطین کی رسائی آسمانوں تک نہیں ہوتی ابلیس لعین کا تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت آسمانوں میں ہونا اور آدم دھواڑا علیہما السلام کو دھوکہ میں مبتلا کرنا وغیرہ یہ سب آدم علیہ السلام کے زمین پر نزول سے پہلے کے واقعات ہیں، اس وقت تک جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع نہیں تھا، نزول آدم علیہ السلام اور اخراج شیطان کے بعد سے یہ داخلہ ممنوع ہوا، سورۃ جن کی آیات میں جو یہ مذکور ہے اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمِمْ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْاَنَ يَعِدْ لَ شِهَابًا رَّصَدًا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک شیاطین آسمانوں کی خبریں فرشتوں کی باہمی گفتگو سے سن لیا کرتے تھے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیاطین آسمانوں میں داخل ہو کر سنتے تھے، نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ کے الفاظ سے بھی یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چوروں کی طرح آسمانی فضا میں جہاں بادل ہوتے ہیں چھپ کر بیٹھ جاتے اور سن لیا کرتے تھے، ان الفاظ سے خود بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ قبل بعثت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنات و شیاطین کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع ہی تھا، مگر فضا آسمانی تک پہنچ کر چوری سے کچھ سن لیا کرتے تھے، بعثت نبوی کے بعد حفاظت وحی کا یہ مزید سامان ہوا کہ شیاطین کو اس چوری سے بھی بذریعہ شہاب ثاقب روک دیا گیا۔

رہا یہ سوال کہ آسمانوں کے اندر فرشتوں کی گفتگو کو آسمانوں سے باہر شیاطین کس طرح سن سکتے تھے، سو یہ کوئی ناممکن چیز نہیں، بہت ممکن ہے کہ اجرام سماویہ سماعت اصوات سے مانع نہ ہوں، اور یہ بھی بعید نہیں کہ فرشتے کسی وقت آسمانوں سے نیچے اتر کر باہم ایسی گفتگو کرتے ہوں جس کو شیاطین سن بھاگتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت صدیقہ عائشہ کی حدیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمان سے نیچے جہاں بادل ہوتے ہیں کبھی کسی وقت یہاں تک اترتے ہیں، اور آسمانی خبروں کا باہمی تذکرہ کرتے ہیں، شیاطین اسی فضا آسمانی میں چھپ کر یہ خبریں سنتے تھے جن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ بند کیا گیا، اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورۃ جن میں اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمِمْ کی تفسیر میں آئے گی۔

دوسرا مسئلہ: ان آیات میں شہاب ثاقب کا ہے قرآن کریم کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہاب حفاظت وحی کے لئے شیاطین کو مارنے کے واسطے پیدا ہوتے ہیں ان کے ذریعہ شیاطین کو دفع کیا جاتا ہے تاکہ وہ فرشتوں کی باتیں نہ سن سکیں۔

اس میں ایک اشکال قوی یہ ہو کہ فضا آسمانی میں شہابوں کا وجود کوئی نئی چیز نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹنے کا مشاہدہ کیا جاتا تھا، اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے، تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ شہاب ثاقب شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جو کہ عہد نبوی کی خصوصیت ہے، اس سے تو بظاہر اسی بات کی تقویت ہوتی ہے جو فلاسفہ کا خیال کہ شہاب ثاقب کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے جو بخارات زمین سے اٹھتے ہیں ان میں کچھ آتش گیر مادے بھی ہوتے ہیں، اور پر جا کر جب ان کو آفتاب یا کسی دوسری وجہ سے مزید گرمی پہنچتی ہے تو وہ سداگ اٹھتے ہیں، اور دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ستارا ٹوٹا ہے، اسی لئے بخارات میں اس کو ستارا ٹوٹنے ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، عربی زبان میں بھی اس کے لئے انقضا میں کوکب کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی کا ہم معنی ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں، زمین سے اٹھنے والے بخارات مشتعل ہو جائیں یہ بھی ممکن ہے، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ کسی ستارے یا سیارے سے کوئی شعلہ نکل کر گرے، اور ایسا ہونا عام عادات کے مطابق ہمیشہ سے جاری ہو، مگر بعثت نبوی سے پہلے ان شعلوں سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ان شہابی شعلوں سے یہ کام لے لیا گیا، کہ شیاطین جو فرشتوں کی بائیں چوری سے سننا چاہتے ان کو اس شعلے سے مارا جائے۔

علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں یہی توجیہ بیان فرمائی ہے، اور نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے کسی نے دریافت کیا کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ستارے ٹوٹتے تھے؟ فرمایا کہ ہاں؛ اس پر اس نے سورۃ جن کی مذکورہ آیت معارضہ کے لئے پیش کی تو فرمایا کہ شہاب ثاقب تو پہلے بھی تھے، مگر بعثت نبوی کے بعد جب شیاطین پر تشدد کیا گیا تو ان سے شیاطین کے دفع کرنے کا کام لے لیا گیا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں بروایت ابن عباسؓ منقول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ آپ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے، کہ ستارہ ٹوٹا، آپ نے لوگوں سے یہ سچا کہ تم زمانہ جاہلیت میں یعنی اسلام سے پہلے اس ستارہ ٹوٹنے کو کیا سمجھا کرتے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی بڑا حادثہ پیدا ہونے والا ہے، یا کوئی بڑا آدمی مرتے گا، یا پیدا ہوگا، آپ نے فرمایا کہ یہ غو خیال ہے، اس کا کسی کے مرنے جینے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شعلے تو شیاطین کو دفع کرنے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شہاب ثاقب کے متعلق جو کچھ فلاسفہ نے کہا ہے وہ بھی قرآن

کے منافی نہیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ یہ شعبے براہ راست بعض ستاروں سے ٹوٹ کر گرائے جاتے ہوں، مقصد قرآن دونوں صورتوں میں ثابت اور واضح ہے۔

وَالْأَرْضُ مَدَدٌ لِّهَا وَآلَقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور رکھ دیے اس پر بوجھ اور اُگائی اس میں

کُلِّ شَيْءٍ مَّوْرُودٍ ۝ ۱۹ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّكُمْ

ہر چیز اندازے سے، اور بنادیتے تھائے واسطے اس میں معیشت کے اسباب اور وہ چیزیں

لَهُ بِرِزْقَيْنَ ۝ ۲۰ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا

جن کو تم روزی نہیں دیتے، اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور

نُنَزِّلُ لَهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝ ۲۱ وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاحِشَ

اتارتے ہیں ہم اندازہ معین پر، اور چلاتیں ہم نے ہوائیں رس بھری،

فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ

پھر اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر تم کو وہ پلایا اور تھالے پاس نہیں

بِخَزَائِنٍ ۝ ۲۲ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ۝ ۲۳

اس کا خزانہ، اور ہم ہی ہیں جلاتے والے اور مارنے والے اور ہم ہی ہیں پیچھے رہنے والے،

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝ ۲۴

اور ہم نے جان رکھا ہر آگے بڑھنے والوں کو تم میں سے اور جان رکھا ہر پیچھے رہنے والوں کو

وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ ۲۵

اور تیرا رب وہی اکٹھا کر لائے گا ان کو بیشک وہی ہے حکمتوں والا خبردار

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس زمین میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیے اور اس میں قسم

کی (ضرورت کی پیداوار) ایک معین مقدار سے اُگائی، اور ہم نے تمہارا واسطے اس (زمین) میں

معاشر کے سامان بنائے (جس میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں داخل ہیں جو کھانے پینے پہننے

اور رہنے پہنے سے متعلق ہیں اور یہ سامانِ معاش اور ضروریاتِ زندگی صرف تم کو ہی نہیں دیا، بلکہ ان کو بھی دیا جن کو تم روزی نہیں دیتے (یعنی وہ تمام مخلوقات جو ظاہر میں بھی تمہارے ہاتھ سے خورد و نوش اور زندگی گزارنے کا سامان نہیں پاتے، ظاہر اس لئے کہا کہ گھر کے پالتو جانور بکری، گائے، بیل، گھوڑا، گدھا وغیرہ بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے اپنی روزی اور ضروریاتِ معاش حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے پاتے ہیں، مگر ظاہری طور پر ان کے خورد و نوش اور رہائش کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے، ان کے علاوہ تمام دنیا کے بری اور بھری جانور، پرندے اور درندے ایسے ہیں جن کے سامانِ معاش میں کسی انسانی ارادے اور عمل کا کوئی دخل اور شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اور یہ جانور اتنے بے حد بے شمار ہیں کہ انسان نہ ان سب کو پہچان سکتا ہے نہ شمار کر سکتا ہے) اور جتنی چیزیں (ضروریاتِ زندگی سے متعلق) ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں اور ہم (اپنی خاص حکمت کے مطابق) اس (چیز کو ایک معین مقدار سے اتارتے رہتے ہیں اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو بادل کو پانی سے بھر دیتی ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، پھر وہ پانی تم کو پینے کو دیتے ہیں اور تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھنے والے نہ تھے، رکھ اگلی بارش تک اس ذخیرہ کو استعمال کرتے رہتے) اور ہم ہی ہیں کہ زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور (سب کے مرنے کے بعد) ہم ہی باقی رہ جاؤں گے، اور ہم ہی جانتے ہیں تم میں سے آگے بڑھ جانے والوں کو اور تم جانتے ہیں پیچھے رہنے والوں کو، اور بیشک آپ کا رب ہی ان سب کو (قیامت میں) مشور فرمادے گا (یہ اس لئے فرمایا کہ اوپر توحید ثابت ہوئی ہے، اس میں منکر توحید کی سزا کی طرف اشارہ کر دیا) بیشک وہ حکمت والا ہے (ہر شخص کو اس کے مناسب بدلہ دینا اور) علم والا ہے (سب کے اعمال کی اس کو پوری خبر ہے)۔

معارف و مسائل

حکمتِ الہیہ، ضروریاتِ معاش میں
 متن مجمل شئی مؤذون کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ترجمہ میں
 لیا گیا ہے کہ بتقاضائے حکمت ہر آگنے والی چیز کی ایک مقدار
 تناسب موزونیت

معین آگائی، جس سے کم ہو جاتی تو زندگی میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں، اور زیادہ ہو جاتی تو بھی مشکلات پیدا کرتی، انسانی ضرورت کے گندم اور چاول وغیرہ اور بہتر سے بہتر عمدہ چل اگر اتنے زیادہ پیدا ہو جاتیں جو انسانوں اور جانوروں کے کھانے پینے کے بعد بھی بہت بچ رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سڑیں گے، ان کا رکھنا بھی مشکل ہوگا، اور پھینکنے کے لئے جگہ بھی رہیگی اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تو یہ بھی تھا کہ جن دانوں اور پھلوں پر

انسان کی زندگی موقوف ہے، ان کو اتنا زیادہ پیدا کر دیتے کہ ہر شخص کو ہر جگہ مغت مل جایا کرتے، اور بے فکری سے استعمال کرنے کے بعد بھی ان کے بڑے ذخیرے پڑے رہتے، لیکن یہ انسان کے لئے عذاب ہو جاتا، اس لئے ایک خاص مقدار میں نازل کئے گئے، کہ ان کی قدر و قیمت بھی باقی رہے اور بیکار بھی نہ بچیں۔

اور میں کل شئی موزون کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام اگنے والی چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تناسب اور موزونیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، جس سے اس میں حسن اور دل شئی پیدا ہوتی ہے، مختلف درختوں کے تنے، شاخیں، پتے، پھول اور پھل، مختلف سائز اور مختلف شکل، مختلف رنگ اور ذائقے کے پیدا کئے گئے، جس کے تناسب اور حسین منظر سے تو انسان فائدہ اٹھاتا ہے، مگر ان کی تفصیلی حکمتوں کا ادراک کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

تمام مخلوق کے لئے آب رسانی اور آبپاشی کا عجیب و غریب نظام الہی کے اس حکیمانہ نظام کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اور جانور، پرندوں، پرندوں کے لئے ضرورت کے مطابق آب رسانی کا ایسا نظام محکم قائم کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ہر جگہ ہر حال میں اپنی ضرورت کے مطابق پینے، نہانے، دھونے اور کھیتوں، درختوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی بلا کسی قیمت کے مل جاتا ہے، اور جو کچھ کسی کو کنواں بنانے یا پائپ لگانے پر خرچ کرنا پڑتا ہے وہ اپنی سہولتیں حاصل کرنے کی قیمت ہے، پانی کے ایک قطرہ کی قیمت بھی کوئی ادا نہیں کر سکتا، نہ کسی سے مانگی جاتی ہو اس آیت میں پہلے تو اس کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قدرت الہیہ نے سمندر کے پانی کو پوری زمین پر پہنچانے کا عجیب و غریب نظام بنایا ہے، کہ سمندر میں بخارات پیدا فرمائے جن سے بارش کا مواد (مان سون) پیدا ہوا اوپر سے ہوائیں چلائیں، جو اس کو بادل کی شکل میں تبدیل کر کے پانی سے بھرے ہوئے پہاڑوں جیسے جہاز بنادیں، پھر پانی سے لبریز ان ہوائی جہازوں کو دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں جہاں پہونچانا ہے پہونچا دیں، پھر فرمان الہی کے تابع جس زمین پر جتنا پانی ڈالنے کا حکم ہے، اس کے مطابق یہ خود کار ہوائی جہاز وہاں پانی برسا دیں۔

اس طرح یہ سمندر کا پانی زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے انسانوں اور جانوروں کو گھریٹھے مل جائے، اسی نظام میں ایک عجیب و غریب تبدیلی پانی کے ذائقے اور دوسری کیفیات میں پیدا کر دی جاتی ہے، کیونکہ سمندر کے پانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے انتہائی کھارا اور ایسا نمکین بنایا ہے کہ ہزاروں ٹن نمک اس سے نکالا اور استعمال کیا جاتا ہے، حکمت اس میں یہ ہے کہ یہ عظیم الشان پانی کا کرہ جس میں کروڑوں قسم کے جانور رہتے

اور اسی میں مرتے اور سڑتے ہیں، اور ساری زمین کا گندہ پانی بالآخر اسی میں جا کر پڑتا ہے، اگر یہ پانی میٹھا ہوتا تو ایک دن میں سڑ جاتا، اور اس کی بدبو اتنی شدید ہوتی کہ خشکی میں رہنے والوں کی تندرستی اور زندگی بھی مشکل ہو جاتی، اس لئے قدرت نے اس کو ایسا تیزابی کھار ا بنا دیا کہ دنیا بھر کی غلامتیں اس میں پہنچ کر جھسم ہو جاتی ہیں، غرض اس حکمت کی بناء پر سمندر کا پانی کھار ا بلکہ تلخ بنایا گیا، جو نہ پیا جاسکتا ہے اور نہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے، نظام قدرت نے جو پانی کے ہوائی جہاز بادلوں کی شکل میں تیار کئے ان کو صرف سمندری پانی کا خزانہ ہی نہیں بنایا بلکہ مان سون اٹھنے سے لے کر زمین پر برسنے تک اس میں ایسے انقلابات بخیر کسی ظاہر می مشین کے پیدا کر دیتے کہ اس پانی کا شک علیحدہ ہو کر میٹھا پانی بن گیا، سورۃٔ مرسلات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے :-
وَأَسْقِیْتُكُمْ مَّاءً مَّحْسَنًا، اس میں لفظ قرأت کے معنی ہیں ایسا میٹھا پانی جس سے پیاس بجھے،
معنی یہ ہیں کہ ہم نے بادلوں کی قدرتی مشینوں سے گزار کر سمندر کے کھاری اور تلخ پانی کو تمھارے پینے کے لئے شیریں بنا دیا۔

سورۃ واقعہ میں اسی مضمون کو ارشاد فرمایا ہے: **آخِرُ يَسْمُ الْمَاءِ الَّذِي تَشْرَبُونَ**
عَ أَنْتُمْ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ أَمْ نُحْيِي الْمَيِّتِينَ ۚ كَذَلِكَ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَلًا
قَدْ لَا تَشْكُرُونَ ۝ بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم
 ہیں اتارنے والے، اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو کھارا، پھر کیوں نہیں احسان مانتے ؟
 یہاں تک تو قدرتِ الہیہ کی یہ کرشمہ سازی دیکھی کہ سمندر کے پانی کو میٹھے پانی میں
 تبدیل کر کے پوئے روئے زمین پر بادلوں کے ذریعے کس حسن نظام کی تہا پہونچا یا کہ ہر خطہ
 کے نہ صرف انسانوں کو بلکہ اُن جانوروں کو بھی جو انسانوں کی دریافت سے باہر ہیں، گھر بیٹھے
 پانی پہونچا دیا، اور بالکل مفت بلکہ جبری طور پر پہونچا۔

لیکن انسان اور جانوروں کا مسئلہ صرف اتنی بات سے حل نہیں ہو جاتا کیونکہ پانی انکی ایسی ضرورت ہے جس کی احتیاج ہر روز بلکہ ہر آن ہے، اس لئے ان کی ضرورت روزمرہ کو پورا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جگہ سال کے بارہ مہینے ہر روز بارش ہو ا کرتی، لیکن اس صورت میں اُن کی پانی کی ضرورت تو رفع ہو جاتی، مگر دوسری معاشی ضروریات میں کتنا خلل آتا، اس کا اندازہ کسی اہل تجربہ کے لئے مشکل نہیں، سال بھر کے ہر دن کی بارش تندرستی پر کیا اثر ڈالتی اور کاروبار اور نقل و حرکت میں کیا تعطل پیدا کرتی۔

پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جائے، مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوٹہ

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سال بھر کے خاص خاص مہینوں میں اتنی بارش ہو جائے کہ اس پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جائے، مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوڑ

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سال بھر کے خاص خاص مہینوں میں اتنی بارش ہو جائے کہ اس پانی باقی مہینوں کے لئے کافی ہو جائے، مگر اس کے لئے ضرورت ہوتی کہ ہر شخص کا ایک کوڑ

مقرر کر کے اس کے سپرد کیا جائے وہ اپنے کوٹہ اور حصہ کا پانی خود اپنی حفاظت میں رکھے۔ اندازہ لگائیے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو ہر انسان اتنی ٹنکیاں یا برتن وغیرہ کہاں سے لاتا جن میں تین یا چھ مہینہ کی ضرورت کا پانی جمع کر کے رکھ لے، اور اگر وہ کسی طرح ایسا کر بھی لیتا تو ظاہر ہے کہ چند روز کے بعد یہ پانی سٹرجاتا، اور پینے بلکہ استعمال کرنے کے بھی قابل نہ رہتا، اس کو قدرت الہیہ نے اس کے باقی رکھنے اور بوقت ضرورت ہر جگہ مل جانے کا ایک دوسرا عجیب و غریب نظام بنایا، کہ جو پانی برسایا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ تو فوری طور پر درختوں، کھیتوں اور انسانوں اور جانوروں کو سیراب کرنے میں کام آہی جاتا ہے، کچھ کھلے تالابوں، جھیلوں میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کے بہت بڑے حصہ کو برف کی شکل میں بجز منجمد بنا کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر لا دیا جاتا ہے، جہاں تک نہ گرد و غبار کی رسائی ہے نہ کسی غلاظت کی، پھر اگر وہ پانی سیال صورت میں رہتا تو ہوا کے ذریعے کچھ گرد و غبار یا دوسری خراب چیزیں اس میں پہونچ جانے کا خطرہ رہتا، پرندے جانوروں کے اس میں گرنے مرنے کا اندیشہ رہتا، جس سے وہ پانی خراب ہو جاتا، مگر قدرت نے اس پانی کے عظیم خزانے کو بجز منجمد (برف) بنا کر پہاڑوں پر لا دیا جہاں تک تھوڑا تھوڑا رس کردہ پہاڑوں کی رگوں میں پیوست ہو جاتا ہے، اور پھر چشموں کی صورت پر ہر جگہ پہونچ جاتا ہے، اور جہاں یہ چشمے بھی نہیں ہیں تو وہاں زمین کی تہ میں یہ پانی انسانی رگوں کی طرح زمین کے ہر خطہ پر بہتا ہے اور کنواں کھودنے سے برآمد ہونے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آب رسائی کا یہ نظام الہی ہزاروں نعمتیں اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اول تو پانی کو پیدا کرنا ایک بڑی نعمت ہے، پھر بادلوں کے ذریعہ اس کو زمین کے ہر خطہ پر پہونچانا دوسری نعمت ہے، پھر اس کو انسان کے پینے کے قابل بنانا تیسری نعمت ہے، پھر انسان کو اس کے پینے کا موقع دینا چوتھی نعمت ہے، پھر اس پانی کو ضرورت کے مطابق جمع اور محفوظ رکھنے کا نظام محکم یا پتھریں نعمت ہے، پھر انسان کو اس سے پینے اور سیراب ہونے کا موقع دینا چھٹی نعمت ہے، کیونکہ پانی کے موجود ہونے ہوئے بھی ایسی آفتیں ہو سکتی ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی پینے پر قادر نہ ہو، قرآن کریم کی آیت فَأَسْقَيْنَكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَائِرِينَ میں اپنی نعماء الہیہ کی طرف اشارہ اور تنبیہ کی گئی ہے، فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

نیک کاموں میں آگے بڑھنے اور وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُتَكِبِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُتَكِبِينَ میں پیچھے رہنے میں درجات کا فرق مستقدین اور مستأخرین کی چند تفسیریں ائمہ صحابہ و تابعین سے

مختلف منقول ہیں:- مستقدین وہ لوگ جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں اور مستأخرین وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے (قادر و عکرمہ) مستقدین سے مراد اموات ہیں اور مستأخرین سے وہ لوگ جو اب

زندہ ہیں (ابن عباس و حاکم) مستقدین سے مراد امتِ محمدیہ سے پہلے حضرات ہیں اور مستأخرون سے امتِ محمدیہ (مجاہد) مستقدین سے مراد اہل طاعت و خیر ہیں اور مستأخرون سے اہل معصیت و غفلت (حسن و قتادہ) مستقدین وہ لوگ ہیں جو نماز کی صفوں یا جہاد کی صفوں اور دوسرے نیک کاموں میں آگے رہنے والے ہیں اور مستأخرون وہ جو ان چیزوں میں پچھلی صفوں میں رہنے والے اور دیر کرنے والے ہیں، حسن بصری، سعید بن مسیب، قرطبی، شعبی وغیرہ ائمہ تفسیر کی یہی تفسیر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ درحقیقت ان اقوال میں کوئی خاص اختلاف نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں، کیونکہ اللہ جل شانہ کا علم محیط ان تمام اقسام کے مستقدین و مستأخرون پر حاوی ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ اسی آیت سے نماز میں صفِ اول اور شروع وقت میں نماز ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جانا کہ اذان کہنے اور نماز کی صفِ اول میں کھڑے ہونے کی کتنی بڑی فضیلت ہو تو تمام آدمی اس کی کوشش میں لگ جاتے کہ پہلی ہی صف میں کھڑے ہوں اور سب کے لئے جگہ نہ ہوتی تو قرعہ اندازی کرنا پڑتی۔

قرطبی نے اس کے ساتھ حضرت کعب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس امت میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ سجدے میں جاتے ہیں تو جتنے آدمی اس کے پیچھے ہیں سب کی مغفرت ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت کعب آخری صف میں رہنا پسند کرتے تھے کہ شاید انکی صفوں میں اللہ کا کوئی بندہ اس شان کا ہو تو اس کی برکت سے میری مغفرت ہو جائے، انتہی کلام۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اصل فضیلت تو صفِ اول ہی میں ہے، جیسا کہ آیت قرآن اور حدیث کی تصریحات سے ثابت ہوا، لیکن جس شخص کو کسی وجہ سے صفِ اول میں جگہ نہ ملی تو اس کو بھی ایک گونہ فضیلت یہ حاصل رہے گی کہ شاید انکی صفوں کے کسی نیک بندے کی بدولت اس کی بھی مغفرت ہو جائے، اور آیت مذکورہ میں جیسے نماز کی صفِ اول کی فضیلت ثابت ہوئی اسی طرح جہاد کی صفِ اول کی افضلیت بھی ثابت ہو گئی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ﴿۲۶﴾

اور بنایا ہم نے آدمی کو کھنکھاتے سے ہوتے گمارے سے ،

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّوْمِ ﴿۲۷﴾ وَإِذْ قَالَ

اور جن کو بنایا ہم نے اس سے پہلے گو کی آگ سے ، اور جب کہا

رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِیُّ خَالِقٍۭۙ بَشَرًاۙ مِنْ صَلٰٓصَالٍۭ مِنْ حَمَإٍۭ مَّسْتُوٍۙ ۝۲۸

تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناؤں گا ایک بشر کھنکھاتے سے ہوئے گالے سے ،

فَاِذَا سُوِّيْتُۙ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیۡ فَقَعُوْا۟ اِلَیْهِۙ سٰجِدٰتٍۭ ۝۲۹

پھر جب ٹھیک کر دوں اس کو اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوؤ

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْۙ اٰجَمُوْنَ ۝۳۰ اِلَّا اِبْلِیْسَۙ اَبٰی اَنْ

تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے سب نے مل کر ، مگر ابلیس نے نہ مانا کہ ساتھ

یَكُوْنُۙ مَعَ السَّٰجِدِیْنَ ۝۳۱ قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنُۙ مَعَ

ہو سجدہ کرنے والوں کے ، فرمایا ، اے ابلیس کیا ہوا تجھ کو کہ ساتھ نہ ہوا

السَّٰجِدِیْنَ ۝۳۲ قَالَ لَمَّا كُنْتُۙ لَاسُجْدًاۙ لِّبَشَرٍۭ خَلَقْتَهُۥ مِنْ صَلٰٓصَالٍۭ

سجدہ کرنے والوں کے ، بولا میں وہ نہیں کہ سجدہ کر دوں ایک بشر کو جس کو تو نے بنایا کھنکھاتے

مِّنْ حَمَإٍۭ مَّسْتُوٍۙ ۝۳۳ قَالَ فَاخْرِجْ مِنْهَاۙ فَاِنَّكَ رَٰجِعٌۙ ۝۳۴ وَاِنَّ

سے ہوئے گالے سے ، فرمایا تو تو نکل یہاں سے تجھ پر مار ہے ، اور تجھ پر

عَلٰیكَ اللَّعْنَةُۙ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳۵ قَالَ رَبِّۙ فَانْظِرْنِیۙ اِلٰی

بھٹکار ہے اُس دن تک کہ انصاف ہو ، بولا اے رب تو مجھ کو ڈھیل دے اُس دن تک کہ

یَوْمٍۭ یَّبْعَثُوْنَ ۝۳۶ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۝۳۷ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ

مُردے زندہ ہوں ، فرمایا تو تجھ کو ڈھیل دی ، اسی مقرر وقت کے دن

الْمَعْلُوْمِ ۝۳۸ قَالَ رَبِّۙ بِمَاۤ اَغْوٰیْتَنِیۙ لَاۤ اُزِیْنَنَّ لَهُمْۙ فِی الْاَرْضِۙ

تک ، بولا اے رب جیسا تو نے مجھ کو راہ سے کھو دیا میں بھی ان سب کو بہاریں دکھلاؤں گا زمین میں

وَلَاۤ اُغْوِیَنَّهُمْۙ اَجْمَعِیْنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝۴۰

اور راہ سے کھو دوں گا ان سب کو ، مگر جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں ،

قَالَ هٰذَا اِصْرًاۙ طَعَلْتُۙ مُسْتَقِیْمٌۙ ۝۴۱ اِنَّ عِبَادِیۙ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ

فرمایا یہ راہ ہے مجھ تک سیدھی ، جو میرے بندے ہیں تیرا اُن پر کچھ

سُلْطٰنٍ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدٌ لَّهُمْ

زور نہیں مگر جو تیری راہ چلا جائے ہوؤں میں ، اور دوزخ پر وعدہ ہے ان

اَجْمَعِيْنَ ﴿۲۲﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ

سب کا ، اس کے سات دروازے ہیں ، ہر دروازہ کے واسطے ان میں سے

جَزَاءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۲۳﴾

ایک فرقہ ہے بانٹا ہوا

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے انسان کو (یعنی اس نوع کی اصل اول آدم علیہ السلام کو) بھتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا (یعنی اول گارے کو خوب خمیر کیا کہ اس میں بڑ آنے لگی، پھر وہ خشک ہو گیا کہ وہ خشک ہونے سے کھن کھن بولنے لگا جیسا مٹی کے برتن چٹلی مارنے سے بجا کرتے ہیں پھر اس خشک گارے سے آدم کا پتلا بنایا جو بڑی قدرت کی علامت ہے) اور جن کو (یعنی اس نوع کی اصل ابوالجان کو) اس کے قبل (یعنی آدم علیہ السلام کے قبل) آگ سے کہ وہ (غایت لطافت کی وجہ سے) ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے (مطلب یہ کہ چونکہ اس آگ میں اجزاء دھانیہ نہ تھے اس لئے وہ مثل ہوا کے نظر نہ آتی تھی، کیونکہ آگ کا نظر آنا اجزاء سے کشیفہ کے اختلاط سے ہوتا ہے، اس کو دوسری آیت میں اس طرح فرمایا ہے وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّثْنٍ اَوْ رَدَّہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے (ارشاد) فرمایا کہ میں ایک بشر کو (یعنی اس کے پتلے کو) بھتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے اعضائے جسمانیہ کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈال دوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنا لیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم علیہ السلام کو) سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ اس نے اس بات کو قبول نہ کیا کہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو (یعنی سجدہ نہ کیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس تجھ کو کون امر باعث ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا، کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جس کو آپ نے بھتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے (یعنی ایسے حقیر و ذلیل مادہ سے بنایا گیا ہے کیونکہ میں نورانی مادہ آتش

سے پیدا ہوا ہوں تو نورانی ہو کر ظلمانی کو کیسے سجدہ کروں، ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل، کیونکہ بیشک تو اس حرکت سے (مردود ہو گیا اور بیشک تجھ پر (میری) لعنت قیامت تک رہے گی) جیسا دوسری آیت میں ہے عَلَيْكَ لَعْنَتِي، یعنی قیامت تک تو میری رحمت سے بعید رہے گا، توبہ کی توفیق نہ ہوگی اور مقبول و مرحوم نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ قیامت تک جو محل رحمت نہ ہو تو پھر قیامت میں تو مرحوم ہونے کا احتمال ہی نہیں، پس جس وقت تک احتمال تھا اس کی نفی کر دی، اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس میں تو مہلت مانگنے سے پہلے ہی مہلت دینے کا وعدہ ہو گیا، بات یہ ہے کہ مقصود قیامت تک عمر دینا نہیں ہو کہ یہ شبہ ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حیاتِ دنیویہ میں تو ملعون ہے گو وہ قیامت تک ممتد کیوں نہ ہو) کہنے لگا کہ اگر مجھ کو آدم کی وجہ سے مردود کیا ہے، تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تاکہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے) تو (جا) تجھ کو محنتِ وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی، کہنے لگا اے میرے رب بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (حکمِ تکوین) گمراہ کیا ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ میں دنیا میں ان کی (یعنی آدم اور اولادِ آدم کی) نظر میں معاصی کو مرغوب کر کے دکھلاؤں گا، اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ (ہاں) یہ (منتخب ہو جانا جس کا طریقہ اعمالِ صالحہ و اطاعتِ کاملہ ہے) ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے (یعنی اس پر چل کر سہارا مقرب ہو جاتا ہے) واقعی میرے ان (مذکور) بندوں پر تیرا ذرا بھی پس چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے (تو چلے) اور (جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے) ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے، جس کے سات دروازے ہیں ہر دروازہ (میں سے جانے) کیلئے ان لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں (کہ کوئی کسی دروازے سے جائے گا کوئی کسی دروازے سے)

معارف و مسائل

بدنِ انسانی میں نفخِ روح اور اس کو بسجود ملائکہ بنانے کی مختصر تحقیق	روح کوئی جسم ہوا جو ہر مجرد، اس میں علماء و حکماء کا اختلاف قدیم زمانے سے چلا آتا ہے، شیخ عبدالرؤف منادی نے فرمایا کہ اس میں حکماء کے اقوال ایک ہزار تک پہنچے ہیں، مگر سب قیاسات اور تخمینے ہی ہیں، کسی کو یقین نہیں کہا جاسکتا، امام غزالی، امام رازی اور عموماً صوفیہ اور فلاسفہ کا قول یہ ہے کہ وہ جسم نہیں بلکہ جو ہر مجرد ہے، امام رازی نے اس کے بارے دلائل پیش کئے ہیں۔ مگر جہور علماء امت روح کو ایک جسم لطیف قرار دیتے ہیں، نفخ کے معنی چھونک مارنے
--	---

کے ہیں، اگر بقول پہلے روح کو جسم لطیف قرار دیا جائے تو اس کو پھونکنا ظاہر ہے، اور جو ہر محسوس دماغ لیا جائے تو پھونکنے کے معنی اس کا بدن سے تعلق پیدا کر دینا ہوگا (بیان القرآن)

روح اور نفس کے متعلق یہاں اس طویل الذیل بحث کو چھوڑ کر ایک خاص تحقیق پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ حضرت قاضی شہار اللہ کی تحقیق جو تفسیر منظری میں قاضی شہار اللہ پانی پتی نے تحریر فرمائی ہے۔

حضرت قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ روح کی دو قسم ہیں، علوی اور سفلی، روح علوی مادہ سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے، اہل کشف کو اس کا اصل مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے، کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے، اور روح علوی بنظر کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے، وہ پانچ یہ ہیں، قلب، روح، بستر، خفی، اخفی، اور یہ سب عالم امر کے لطائف میں سے ہیں، جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ فرمایا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي۔

اور روح سفلی وہ بخار لطیف ہے جو بدن انسانی کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا، سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی روح سفلی کو نفس کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس روح سفلی کو جسے نفس کہا جاتا ہے، اور روح علویہ مذکورہ کا آئینہ بنا دیا ہے، جس طرح آئینہ جب آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے بہت بعید ہونے کے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے، اور روشنی کی وجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہے، اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے، جو کپڑے کو جلا سکتی ہے، اسی طرح اور روح علویہ اگرچہ اپنے تجربہ کی وجہ سے بہت اعلیٰ و ارفع اور بہت مسافت بعیدہ پر ہیں مگر ان کا عکس اس روح سفلی کے آئینہ میں آکر اور روح علویہ کی کیفیات و آثار اس میں منتقل کر دیتا ہے، اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہو جاتے ہیں ہر ہر فرد کے لئے اور روح جزئیہ کہلاتے ہیں۔

پھر یہ روح سفلی جس کو نفس کہتے ہیں اپنی ان کیفیات و آثار کے ساتھ جن کو اور روح علویہ سے حاصل کیا ہے، اس کا تعلق بدن انسانی میں سب سے پہلے مضنۂ قلبیہ سے ہوتا ہے، اور اس تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے، روح سفلی کے تعلق سے سب سے پہلے انسان کے قلب میں حیات اور وہ ادراکات پیدا ہوتے ہیں، جن کو نفس نے اور روح علویہ سے حاصل کیا ہے، یہ روح سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے، جن کو مشرئین کہا جاتا ہے، اور اس طرح وہ تمام بدن انسانی کے ہر حصہ میں پہنچ جاتی ہے۔

روح سفلی کے بدن انسانی میں سرایت کرنے ہی کو نفخ روح سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کسی چیز میں پھونک بھرنے سے بہت مشابہ ہے۔

اور آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے رُوح کو اپنی طرف منسوب کر کے مِنْ رُوحِی اسی لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں رُوح انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے، کیونکہ وہ بغیر مادہ کے محض امر الہی سے پیدا ہوئی ہے، نیز اس میں تجلیاتِ رحمانیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہر جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی رُوح میں نہیں ہے۔

اور انسان کی پیدائش میں اگرچہ عنصر غالب مٹی کا ہے، اور اسی لئے قرآن عسزیر میں انسان کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت وہ دس چیزوں کا جامع ہر جن میں پانچ عالمِ خلق کی ہیں اور پانچ عالمِ امر کی، عالمِ خلق کے چار عنصر، آگ، پانی، مٹی، ہوا، اور پانچواں ان چاروں سے پیدا ہونے والا بخار لطیف جس کو رُوحِ سفلی یا نفس کہا جاتا ہے، اور عالمِ امر کی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی قلب، روح، سر، خفی، انخی۔ اسی جامعیت کے سبب انسان خلافتِ الہیہ کا مستحق بنا، اور نورِ معرفت اور نارِ عشق و محبت کا تحمل ہوا، جس کا نتیجہ بے کیف معیتِ الہیہ کا حصول ہے، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ**، یعنی ہر انسان اس فرد کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے۔

اور انسان میں تجلیاتِ الہیہ کی قابلیت اور معیتِ الہیہ کا جو درجہ اس کو حاصل ہے، اسی کی وجہ سے حکمتِ الہیہ کا تقاضا یہ ہوا کہ اس کو مسجد ملائکہ بنایا جائے، ارشاد ہوا **فَقَعُوا لَہٗ سَجِدًا**

حکمِ سجدہ فرشتوں کو ہوا تھا | سورہ اعراف میں ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا ہے **مَا مَنَعَكَ** ابلیس میں تبعا شامل قرار دیا گیا | **اَلَا تَسْجُدُ اِذَا اُمِرْتُ لَکَ**، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کے ساتھ ابلیس کو بھی دیا گیا تھا، اسی لئے اس سورت کی جو آیات ابھی آپ نے پڑھی ہیں جن سے بظاہر اس حکم کا فرشتوں کے لئے مخصوص ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اصلاً یہ حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر ابلیس بھی چونکہ فرشتوں کے اندر موجود تھا، اس لئے تبعا وہ بھی اس حکم میں شامل تھا، کیونکہ آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کے لئے جب اللہ تعالیٰ کی بزرگترین مخلوق فرشتوں کو حکم دیا گیا تو دوسری مخلوق کا تبعا اس حکم میں داخل ہونا بالکل ظاہر تھا، اسی لئے ابلیس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ مجھے سجدہ کا حکم دیا ہی نہیں گیا تو عدم تعمیل کا جرم مجھ پر عائد نہیں ہوتا، اور شاید قرآن کریم کے الفاظ **اَلَا اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السَّجِدِیْنَ** میں بھی اس کی طرف اشارہ ہو کہ **اَلَا اَنْ یَّسْجُدَ** کے بجائے **اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السَّجِدِیْنَ** ذکر فرمایا جس سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصل ساجدین تو فرشتے ہی تھے، مگر عقلاً لازم تھا کہ

ابلیس بھی جب ان میں موج دھکا تو وہ بھی ملائکہ ساجدین کے ساتھ شامل ہو جاتا، اس کے عدم شمول پر عقاب فرمایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں پر | اِنَّ عِبَادِيَ لَآ اَنۡتَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ سے معلوم ہوتا ہے شیطان کا تسلط نہ ہونے کے معنی | کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور منتخب بندوں پر شیطانی فریب کا اثر نہیں ہوتا، مگر اسی واقعہ آدم میں یہ بھی مذکور ہے کہ آدم و حوا پر اس کا فریب چل گیا، اسی طرح صحابہ کرام کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا کَسَبُوۡا (آل عمران) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ پر بھی شیطان کا کید اس موقع میں چل گیا۔

اس لئے آیت مذکورہ میں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب و عقول پر شیطان کا ایسا تسلط نہیں ہوتا، کہ وہ اپنی غلطی پر کسی دقت متنبہ ہی نہ ہوں جس کی وجہ سے ان کو توبہ نصیب نہ ہو، یا کوئی ایسا گناہ کر بیٹھیں جس کی مغفرت نہ ہو سکے۔

اور مذکورہ واقعات اس کے منافی نہیں، کیونکہ آدم و حوا علیہما السلام نے توبہ کی اور یہ توبہ قبول ہوئی، اسی طرح حضرات صحابہؓ نے بھی توبہ کر لی تھی، اور شیطان کے مکر سے جس گناہ میں ابتلا ہوا وہ معاف کر دیا گیا۔

جہنم کے سات دروازے | لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ، ام احمد، ابن جریر طبری اور بیہقی نے برداشت حضرت علی کرم اللہ وجہہ لکھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے اور نیچے سات طبقات کے اعتبار سے ہیں، اور بعض حضرات نے ان کو عام دروازوں کی طرح قرار دیا ہے، ہر دروازہ خاص قسم کے مجرمین کے لئے مخصوص ہوگا (تشریطی)

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِی جَنَّٰتٍ وَعِیۡوُنَ ﴿۴۵﴾ اَدْخُلُوۡہَا بِسَلَامٍ اٰمِیۡنَ ﴿۴۶﴾

پرہیزگار ہیں باغوں میں اور چشموں میں، کہیں گے ان کو جاؤ ان میں سلامتی سے جمع خاطر سے

وَنَزَعْنَا مَا فِی صُدُوۡرِہِمْ مِّنۡ غِلٍّ اِنَّا عَلٰی سُرُرٍ

اور نکال ڈالی ہم نے جو ان کے جیوں میں تھی غمگلی، بھائی ہو گئے تختوں پر بیٹھے

مُتَقَبِّلِیۡنَ ﴿۴۷﴾ لَا یَسۡہَمُوۡنَ فِیۡہَا نَصِیۡبٌ وَّمَا ہُمۡ بِمُخۡرَجِیۡنَ ﴿۴۸﴾

آگے سامنے، نہ پیچھے گی ان کو وہاں کچھ تکلیف اور نہ ان کو وہاں سے کوئی نکالے

نَبِيِّ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۴۹﴾ وَأَنَّا عَذَابِي هَمٌ

خبر سنا دے میرے بندوں کو کہ میں ہوں مہل بخشنے والا مہربان، اور یہ بھی کہ میرا عذاب

الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

وہی عذاب دردناک ہے۔

خلاصہ تفسیر

بے شک خدا سے ڈرنے والے (یعنی اہل ایمان) باغوں اور چشموں میں رہتے رہیں گے،
 (خواہ اول ہی سے اگر معصیت نہ ہو یا معاف ہو گئی ہو اور خواہ سزا سے معصیت بھگتنے کے
 بعد ان سے کہا جائے گا کہ تم ان اجنات و عیون) میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو یعنی اس
 وقت بھی ہرنا پسند چیز سے سلامتی ہے، اور آئندہ بھی کسی شرکاء اندیشہ نہیں) اور دنیا میں بھی
 تقاضے سے) ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ سب (ان کے دلوں سے جنت میں داخل ہونے
 کے قبل ہی) دور کر دیں گے سب بھائی بھائی کی طرح (الفت و محبت سے) رہیں گے، تختوں پر
 آٹنے سامنے بیٹھا کریں گے، وہاں ان کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے
 (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے بندوں کو اطلاع دیدیتے کہ میں بڑا مغفرت اور رحمت والا
 بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا (بھی) دردناک سزا ہے (تاکہ اس سے مطلع ہو کر ایمان اور تقویٰ
 کی رغبت اور کفر و معصیت سے خوف پیدا ہو)۔

معارف و مسائل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو سب
 پہلے ان کے سامنے پانی کے دو چشمے پیش کئے جائیں گے، پہلے چشمہ سے وہ پانی پییں گے تو ان
 سب کے دلوں سے باہمی رنجش جو کبھی دنیا میں پیش آئی تھی، اور طبعی طور پر اس کا اثر آخر تک
 موجود رہا وہ سب مٹ جائے گی، اور سب کے دلوں میں باہمی الفت و محبت پیدا ہو جائے گی،
 کیونکہ باہمی رنجش بھی ایک تکلیف و عذاب ہے، اور جنت ہر تکلیف سے پاک ہے۔

اور حدیث صحیح میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر کینہ کسی
 مسلمان سے ہو گا وہ جنت میں نہ جائے گا، اس سے مراد وہ کینہ اور رنجش ہے جو دنیوی غرض
 سے اور اپنے قصد و اختیار سے ہو اور اس کی وجہ سے یہ شخص اس کے درپے رہے کہ جب موقع پائے

اپنے دشمن کو تکلیف اور نقصان پہنچائے، طبعی انقباض جو خاصہ بشری اور غیر اختیاری ہے وہ اس میں داخل نہیں، اسی طرح جو کسی شرعی بنیاد پر مبنی ہو، ایسے ہی بغض و انقباض کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اہل جنت کے دلوں سے ہر طرح کا انقباض اور رنجش دور کر دی جائے گی۔ اسی کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ: مجھے امید ہے کہ میں اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے جن کے دلوں کا غبار جنت میں داخلہ کے وقت دور کر دیا جائے گا۔ اشارہ ان اختلافات و مشاجرات کی طرف ہے جو ان حضرات اور حضرت علیؑ کے درمیان پیش آئے تھے۔

لَا يَسْتَكْبِرُ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝ اس آیت سے جنت کی دو خصوصیات معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ کسی کو کبھی تکان اور ضعف محسوس نہ ہوگا، بخلاف دنیا کے کہ یہاں محنت و مشقت کے کاموں سے تو ضعف و تکان ہوتا ہی ہے، خالص آرام اور تفریح سے بھی کسی نہ کسی وقت آدمی تھک جاتا ہے اور ضعف محسوس کرنے لگتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی لذیذ کام اور مشغلہ ہو۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے جو آرام و راحت اور نعمتیں وہاں کسی کو مل جائیں گی پھر وہ دائمی ہوں گی، نہ وہ نعمتیں کبھی کم ہوں گی اور نہ ان میں سے اس شخص کو نکالا جائے گا، سورۃ ص میں ارشاد ہے إِنَّ هَذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَفَادٍ، یعنی یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا، اور اس آیت میں فرمایا وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ، یعنی ان کو کبھی ان نعمتوں و راحتوں سے نکالا نہیں جائے گا، بخلاف معاملات دنیا کے کہ یہاں اگر کوئی کسی کو بڑے سے بڑا انعام و راحت دے بھی دے تو یہ خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے کہ جس نے یہ انعامات دیے ہیں وہ کسی وقت ناراض ہو کر یہاں سے نکال دے گا۔

ایک تیسرا احتمال جو یہ تھا کہ نہ جنت کی نعمتیں ختم ہوں اور نہ اس کو وہاں سے نکالا جائے مگر وہ خود ہی وہاں رہتے رہتے اکتا جائے اور باہر جانا چاہے، قرآن عزیز نے اس احتمال کو بھی ایک جملہ میں ان الفاظ سے ختم کر دیا ہے کہ لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حَوْلًا، یعنی یہ لوگ بھی وہاں سے پلٹ کر آنے کی کبھی خواہش نہ کریں گے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا

اور حال سنا دے ان کو ابراہیم کے ہمانوں کا، جب چلے آئے اس کے گھر میں اور بولے

سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ۝ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا

سلام وہ بولا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے، بولے ڈر مت ہم تجھ کو

نَبَشِّرْكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿۵۳﴾ قَالَ ابَشِّرْهُنَّ بِمَا تَعْلَمِينَ عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ

خوش خبری سناتے ہیں ایک ہوشیار لڑکے کی، بولا کیا خوش خبری سناتے ہو۔ مجھ کو جب پہنچ چکا ہوں کہ بڑھاپا

فِيهِمْ تَبَشِّرُونَ ﴿۵۴﴾ قَالُوا ابَشِّرْنَا بِالْحَقِّ فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ ﴿۵۵﴾

اب کا ہر پر خوش خبری سناتے ہو، بولے ہم نے تجھ کو خوش خبری سنائی تھی سو مت ہوتا نا امیدوں میں،

قَالَ وَمَنْ يَقْظُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۵۶﴾ قَالَ

بولا اور کون اس توڑے اپنے رب کی رحمت سے مگر جو گمراہ ہیں، بولا پھر

فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۷﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ

کیا ہم ہر تمہاری اے اللہ کے بھیجے ہوئے، بولے ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں ایک قوم

مُجْرِمِينَ ﴿۵۸﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجِّوهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۹﴾ إِلَّا امْرَأَتَ

گنہگار ہیں، مگر لوط کے گھر والے ہم ان کو بچالیں گے سب کو، مگر ایک اسکی عورت

قَدَرْنَا لَا إِنهَآ لَبِيسٌ الْغَابِرِينَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ﴿۶۱﴾

ہم نے ٹھہر لیا، وہ ہر وہ جانے والوں میں، پھر جب پہنچے لوط کے گھر وہ بھیجے ہوئے

قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّكَرُّونَ ﴿۶۲﴾ قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا

بولا تم لوگ ہو ادھر سے، بولے نہیں پر ہم لیکر آئے ہیں تیرے پاس وہ چیز جس میں

فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿۶۳﴾ وَآتَيْنَكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿۶۴﴾

وہ جھگڑتے تھے، اور ہم لائے ہیں تیرے پاس سچی بات اور ہم سچا کہتے ہیں،

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْقَاكَ

سوئے نکل اپنے گھر والوں کو کچھ رات رہے سے، اور تو جہل ان کے پیچھے اور مڑ کر نہ دیکھے

مِنْكُمْ أَحَدٌ وَأَمْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ

تم میرے کوئی، اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم ہے، اور مقرر کر دی ہم نے اس کو

ذَلِكَ إِلَّا مَرَّ أَنْ دَاوُدَ هُوَ لَا يَوْمَ مَقْطُوعٍ مُّصْبِحِينَ ﴿۶۶﴾ وَ

یہ بات کہ ان کی جڑ کٹے گی صبح ہوتے، اور

جَاءَ أَهْلَ الْمَدْيَنَ وَيَتَبَشَّرُونَ ﴿۶۷﴾ قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ خِيفَىٰ

آئے شہر کے لوگ خوشیاں کرتے، لوط نے کہا یہ لوگ میرے مہمان ہیں

فَلَا تَفْضَحُون ۝۶۸ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْرَوْنَ ۝۶۹ قَالُوا أَوَلَمْ

سوچھ کر رسوا مت کرو ، اور ڈرو اللہ سے اور میری آبرو مت کھو دو ، بولے کیا ہم نے تجھ کو منع

نہمک عَنِ الظَّالِمِينَ ۝۷۰ قَالَ هُوَ لِأَخِي بَلَّتِي إِنْ كُنْتُمْ فَعِلِينَ ۝۷۱

نہیں کیا جہان کی حمایت سے ، بولایہ حاضر ہیں میری بیٹیاں اگر تم کو کرنا ہے ،

لَعَمْرُكَ أَنْتُمْ لَغِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝۷۲ فَأَخَذَتْهُمُ

قسم ہر تیری جان کی وہ اپنی مستی میں مدہوش ہیں ، پھر آپکڑا ان کو چٹھاڑ

الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ۝۷۳ فَجَعَلْنَاهَا لَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا

نے سورج نکلنے وقت ، پھر کرڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے اور برسائے

عَلَيْهِمْ حِجَابًا مِّنْ سَجَاجٍ ۝۷۴ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّمُسْتَوْسِمِينَ ۝۷۵

ان پر پتھر کھنگر کے ، بیشک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنیوالوں کو

وَأَنَّهَا لِبَسِيلٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۷۶ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمُؤْمِنِينَ ۝۷۷

اور وہ بستی واقع ہر سیدھی راہ پر ، البتہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کو ۔

خلاصہ تفسیر

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (لوگوں) کو ابراہیم (علیہ السلام) کے مہمانوں کے قصہ کی بھی اطلاع دیجئے وہ قصہ اس وقت واقع ہوا تھا جب کہ وہ مہمان جو کہ واقع میں فرشتے تھے ، اور شکل انسانی ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو مہمان سمجھا ان کے (یعنی ابراہیم علیہ السلام کے) پاس آئے پھر راکر انہوں نے السلام علیکم کہا (ابراہیم علیہ السلام ان کو مہمان سمجھ کر فوراً ان کے لئے کھانا تیار کر کے لائے ، مگر چونکہ وہ فرشتے تھے ، انہوں نے کھانا نہیں تب (ابراہیم علیہ السلام) دل میں ڈرے کہ یہ لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے کیونکہ وہ فرشتے (شکل بشر تھے) ان کو بشر ہی سمجھا اور کھانا نہ کھانے سے شبہ ہوا کہ یہ لوگ کہیں مخالف نہ ہوں اور کہنے لگے کہ ہم تو تم سے خائف ہیں ، انہوں نے کہا کہ آپ خائف نہ ہوں کیونکہ ہم (فرشتے) ہیں منجانب اللہ ایک بشارت لے کر آئے ہیں اور آپ کو ایک مقررہ زندگی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا (مطلب یہ کہ نبی ہوگا ، کیونکہ آدمیوں میں سب سے زیادہ

علم انبیاء کو ہوتا ہے، مراد اس فرزند سے اسحق علیہ السلام ہیں، اور دوسری آیتوں میں حضرت اسحق علیہ السلام کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی بشارت بھی مذکور ہے (ابراہیم علیہ السلام) کہنے لگے کہ کیا تم مجھ کو اس حالت میں (فرزند کی) بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بوڑھا پا آگیا ہو (ایسی حالت میں مجھ کو) کس چیز کی بشارت دیتے ہو (مطلب یہ کہ یہ امر فی نفسہ عجیب ہی، نہ یہ کہ قدرت سے بعید) (وہ فرشتے) بولے کہ ہم آپ کو امر واقعی کی بشارت دیتے ہیں (یعنی تو لید فرزند یقیناً ہونے والا ہے) سو آپ ناامید نہ ہوں (یعنی اپنے بڑھاپے پر نظر نہ کیجئے کہ ایسے اسباب عادیہ پر نظر کرنے سے وسوسہ ناامید سے غالب ہوتے ہیں) ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے (یعنی میں نبی ہو کر گمراہوں کی صفت سے کب موصوف ہو سکتا ہوں، محض مقصود اس امر کا عجیب ہونا ہے، باقی اللہ کا وعدہ سچا اور مجھ کو امید سے بڑھ کر اس کا کامل یقین ہی، بعد اس کے فراست نبوت سے آپ کو معلوم ہوا کہ ان ملائکہ کے آنے سے علاوہ بشارت کے اور بھی کوئی ہم عظیم مقصود ہر اس لئے) فرمانے لگے کہ (جب قرآن سے مجھ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تمہارے آنے کا کچھ اور بھی مقصود ہے) تو یہ بتلاؤ کہ اب تم کو کیا ہم درپیش ہے اے فرشتو! فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف (ان کو سزا دینے کے لئے) بھیجے گئے ہیں (مراد قوم لوط ہے) مگر لوط (علیہ السلام) کا خاندان کہ ہم ان سب کو (عذاب سے) بچالیں گے (یعنی ان کو بچنے کا طریقہ بتلا دیں گے کہ ان مجرموں سے علیحدہ ہو جائیں) بجز ان کی (یعنی لوط علیہ السلام کی) بی بی کے کہ اس کی نسبت ہم نے جو بزرگ رکھا ہو کہ وہ ضرور اسی قوم مجرم میں رہ جائے گی (اور ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوگی)۔

پھر جب وہ فرشتے خاندان لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے (تو چونکہ بشکل بشر تھے اس لئے) کہنے لگے تم تو اجنبی آدمی (معلوم ہوتے ہو) (دیکھتے شہر والے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کیونکہ یہ اجنبی لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں) انھوں نے کہا نہیں (ہم آدمی نہیں) بلکہ ہم (فرشتے ہیں) آپ کے پاس وہ چیز (یعنی وہ عذاب) لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز (یعنی عذاب) لے کر آئے ہیں اور ہم (اس خبر دینے میں) بالکل سچے ہیں، سو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر (یہاں سے) چلے جاتیے، اور آپ سب کے پیچھے ہو لیجئے (تاکہ کوئی رہ نہ جائے یا لوٹ نہ جاسے، اور آپ کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے جس کی ممانعت کر دی گئی ہو) اور تم میں سے کوئی پیچھا پھر کر بھی نہ دیکھے (یعنی سب جلدی چلے جائیں) اور جس جگہ (جانے کا) تم کو حکم ہوا ہے اس طرف سب کے سب چلے جاؤ (تفسیر ورنشور میں بحوالہ سدی نقل کیا ہے)

کہ وہ جگہ ملک شام ہے جس کی طرف ہجرت کرنے کا ان حضرات کو حکم دیا گیا تھا اور ہم نے ان فرشتوں کے واسطے سے، لوط (علیہ السلام) کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی بالکل اُن کی جڑ کٹ جائیگی (یعنی بالکل ہلاک و برباد ہو جائیں گے، فرشتوں کی یہ گفتگو وقوع کے اعتبار سے اس قصہ کے بعد ہوتی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، لیکن اس کو ذکر کرنے میں اس لئے مقدم کر دیا کہ قصہ بیان کرنے سے جو بات مقصود ہے، یعنی نافرمانوں پر غراب اور فرمانبرداروں کی نجات و کامیابی وہ پہلے ہی اہتمام کے ساتھ معلوم ہو جائے، اگلا قصہ یہ ہے) اور شہر کے لوگ (یہ خبر سن کر کہ لوط علیہ السلام کے یہاں حسین لڑکے آئے ہیں) خوب خوشیاں مناتے ہوئے (اپنی فاسد نیت اور بُرے ارادہ کے ساتھ لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے) لوط (علیہ السلام) نے (جواب تک ان کو آدمی اور اپنا مہمان ہی سمجھ رہے تھے ان کے فاسد ارادوں کا احساس کر کے) فرمایا کہ یہ لوگ میرے مہمان ہیں (ان کو پریشان کر کے) مجھ کو (عام لوگوں میں) رسوا نہ کرو (کیونکہ مہمان کی توہین میزبان کی توہین ہوتی ہے، اگر تمہیں ان پر دلیلوں پر رحم نہیں آتا تو کم از کم میرا خیال کرو کہ میں تمہاری بستی کا رہنے والا ہوں، اس کے علاوہ جو ارادہ تم کر رہے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کا سبب ہے) تم اللہ سے ڈرو اور مجھ کو (ان مہمانوں کی نظر میں) رسوا مت کرو (کہ مہمان یہ سمجھیں گے کہ اپنی بستی کے لوگوں میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں) وہ کہنے لگے (کہ یہ رسوائی ہماری طرف سے نہیں آپنے خود اپنے ہاتھوں خریدی ہے کہ ان کو مہمان بنایا کیا ہم آپ کو دنیا بھر کے لوگوں کو اپنا مہمان بنانے سے (بار بار) منع نہیں کر چکے) نہ آپ ان کو مہمان بناتے نہ اس رسوائی کی نوبت آتی (لوط علیہ السلام) نے فرمایا کہ (یہ تو جلاؤ کہ اس بیہودہ حرکت کی کیا ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کسی کو مہمان بنانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی، قصارِ شہوت کے طبعی تقاضے کے لئے ایہ میری رہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھر میں ہیں) موجود ہیں اگر تم میرا کہنا کرو (تو مشرفانہ طور پر اپنی عورتوں سے اپنا مطلب پورا کرو، مگر وہ کس کی سنتے تھے) آپ کی جان کی قسم، اپنی مستی میں رہو تو تھے، پس سوچ نکلتے نکلتے ان کو سخت آواز نے آدیا (یہ ترجمہ مترقین کا ہے، اس سے پہلے جو صحیحین کا لفظ آیا ہے جس کے معنی صبح ہوتے ہوتے کے ہیں، ان دونوں کا اجتماع اس اعتبار سے ممکن ہو کہ صبح سے ابتداء ہوئی اور اشراق تک خاتمہ ہوا) پھر اس سخت آواز کے بعد ہم نے ان بستیوں کی زمین کو الٹ کر اُن کا اوپر کا تختہ (تو) نیچے کر دیا (اور نیچے کا تختہ اوپر کر دیا) اور ان لوگوں پر کسک کے پتھر برسانا شروع کئے، اس واقعہ میں بہت سے نشانات ہیں اہل بصیرت کے لئے (مثلاً ایک تو یہ کہ بُرے فعل کا نتیجہ آخر کار بُرا ہوتا ہے، اگر کچھ دن کی مہلت اور تعمیل مل جائے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے، دوسرے یہ کہ دائمی اور باقی رہنے والی راحت و عزت

صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت پر موقوف ہے، تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کر کے فریب میں مبتلا نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہو وہ ظاہری اسباب کے خلاف بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔ وغیرہ ذلک

معارف و مسائل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم | قَوْلَا تَحْصُرُكَ رُوحُ الْمُحَافِیِّیْنَ مِیْنِ جَبُورٍ مُّفْسِدٍ كَا قَوْلِیْ بِهٖ نَقْلُ كِیَا هِیْ كِهْ كَا نَحْصُورِیْ اَعْزَارِ اَكْرَامِ | تَحْصُرُكَ كِهْ مُخَاطَبِ رَسُوْلِ كَرِیْمِ صَلِی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ہِیْنَ، اللّٰہُ تَعَالٰی نِیْ اُكْی حِیَاتِ كِی قِسْمِ كِهائی ہِیْ، بِیَقِیْ نِیْ دَلٰیْلِ اِلْمَسْبُوْقِیْنِ اُوْر اَبُوْ نَعِیْمِ دَاہِنِ مَرْدِیْہِ وَغِیْرَہُ نِیْ حَضْرَتِ عِبْرَاللّٰہِ اَبِنِ عَبَّاسِ سَیْ رَوَا یَتِ كِیَا ہِیْ كِهْ اللّٰہُ تَعَالٰی نِیْ تَمَامِ مَخْلُوْقَاتِ وَكَائِنَاتِ مِیْنِ كِی كُوْ حَمِیْدِ مُصْطَفٰی صَلِی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سَیْ زِیَادَہُ عِزّتِ وَ مَرْتَبَہُ عِظَاہِیْنِیْ فَرَا یَا، یِہِیْ وَجِہِ ہِیْ Kِهْ اللّٰہُ تَعَالٰی نِیْ كِیْ یَخْبِرُ یَا كِیْ فَرِشْتِہٖ كِی حِیَاتِ پَر كِیہِیْ قِسْمِ نِہِیْنِ كِهائی اُوْر اِسْ آیَتِ مِیْنِ رَسُوْلِ كَرِیْمِ صَلِی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم كِیْ حَمْدِ حِیَاتِ كِی قِسْمِ كِهائی ہِیْ جُوْ اَسْتَحْضَرْتِ صَلِی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم كَا اِنْتِہَا یَا عَزَّ وَ اَزْدِ اَكْرَامِ ہِیْ۔

غیر اللہ کی قسم کھانا | كِی انسان كِهْ لَیْ جَا ئِزِ نِہِیْنِ Kِهْ اللّٰہُ تَعَالٰی كِهْ اَسْمَاءِ وَ صِفَاتِ كِهْ علاوہ كِیْ اُوْر چیز كِی قِسْمِ كِهائے، كِیونكہ قِسْمِ اِس كِی كِهائی جاتی ہِیْ جِس كُو سَب سَیْ زِیَادَہُ بڑا بھجا جاتے، اُوْر ظاہر ہِیْ سَب سَیْ زِیَادَہُ بڑا صرف اللہ تعالیٰ ہِیْ ہو سكتا ہِیْ۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی ماؤں اور باپوں کی اور بتوں کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کے سوا کسی کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کی قسم بھی صرف اس وقت کھاؤ جب تم اپنے قول میں پچھے ہو (رواہ ابو داؤد والنسائی عن ابی ہریرۃ)

اور صحیحین میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطابؓ کو دیکھا کہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا کہ ”خبردار رحو اللہ تعالیٰ باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، جس کو حلف کرنا ہو اللہ کے نام کا حلف کرے اور نہ خاموش رہے (قرطبی، مائتہ)

لیکن یہ حکم عام مخلوقات کے لئے ہے، اللہ جل شانہ خود اپنی مخلوقات میں سے مختلف چیزوں کی قسم کھاتے ہیں، یہ ان کے لئے مخصوص ہے، جس کا مقصد کسی خاص اعتبار سے اس چیز کا اشرف اور عظیم النفع ہونا بیان کرنا ہے، اور عام مخلوق کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے روکنے کا جو سبب ہے وہ یہاں موجود نہیں، كِیونكہ اللہ تعالیٰ كِهْ كَلَامِ مِیْنِ اِس كَا كُوْیْ اِمكَا نِ نِہِیْنِ Kِهْ وہ اپنی كِیْ مَخْلُوْق كُو سَب كِی بڑا اُوْر اَفْضَلِ سَمجھیں، كِیونكہ عَلِی الْاِطْلَاقِ بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ كِی ذَاتِ سَیْ

مخصوص ہے۔

جن بستیوں پر عذاب نازل ہوا | اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّمَنۡ يَّسْمِعُوْنَ سَمِيْعِيْنَ وَلَا تَهْمَلُوْا لَيْسَابِيْلٍ مُّعْتَدِيْهِہٗ
ان سے عبرت حاصل کرنا چاہئے | اس میں حق تعالیٰ نے ان بستیوں کا مہل وقوع بیان فرمایا جو عرب شام
تک جانے والے راستہ پر ہیں، اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ان میں اہل بصیرت کے لئے اللہ تعالیٰ کی
قدرت کاملہ کی بڑی نشانیاں ہیں۔

ایک دوسری آیت میں ان کے متعلق یہ بھی ارشاد ہوا ہے لَمَّا تَشْكُنْ مِّنۡ بَعْدِ هِمِّہٖ
اِلَّا قَلِيْلًا، یعنی یہ بستیاں عذاب الہی کے ذریعہ دیران ہونے کے بعد پھر دوبارہ آباد نہیں ہونگی
بجز چند بستیوں کے، اس مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان بستیوں اور ان کے مکانات
کو آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا سامان بنایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان مقامات سے گزرے ہیں تو آپ پر
ہیبت حق کا ایک خاص حال ہوتا تھا جس سے سر مبارک ٹھک جاتا تھا، اور آپ اپنی سواری کو ان مقامات
میں تیز کر کے جلد عبور کرنے کی سعی فرماتے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل نے یہ سنت
قائم کر دی کہ جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہے ان کو تماشا گاہ بنانا بڑی قسادت ہے بلکہ
ان سے عبرت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا آئینہ
اور اس کے عذاب کا خوف طاری ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں جن کا تذکرہ آتا گیا ہے، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق
عرب سے شام کو جانے والے راستہ پر اردن کے علاقہ میں آج بھی یہ مقام سطح سمندر سے
کافی گہرائی میں ایک عظیم صخرہ کی صورت میں موجود ہے، اس کے ایک بہت بڑے رقبہ پر ایک
خاص قسم کا پانی دریا کی صورت اختیار کرتے ہوئے ہے، اس پانی میں کوئی پھل، مینڈک وغیرہ
جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اس دریا کو بحر میت اور بحر لوط کے نام سے موسوم کیا جا
تا ہے، اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اس میں پانی کے اجزاء بہت کم اور تیل کی قسم کے
اجزاء زیادہ ہیں، اس لئے اس میں کوئی دریا کی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔

آجکل آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے کچھ رہائشی عمارتیں ہوٹل وغیرہ بھی بنادینے ہیں، اور آخرت
سے غافل مادہ پرست طبیعتوں نے آجکل اس کو ایک سیرگاہ بنایا ہوا ہے، لوگ تماشے کے طور
پر اسے دیکھنے جاتے ہیں، قرآن کریم نے اسی غفلت شکاری پر تنبیہ کیلئے آخر میں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ
لِّمَنۡ يَّسْمِعُوْنَ سَمِيْعِيْنَ، یعنی درحقیقت تو یہ واقعات و مقامات ہر چشم بصیرت رکھنے والے کیلئے عبرت آموز ہیں لیکن اس
عبرت کے فائدہ اٹھانے والے مومنین ہی ہوتے ہیں دوسرے لوگ ان مقامات کو ایک تماشا کی حیثیت دیکھ کر ردِ شہوات ہیں

وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ ظَالِمِينَ ﴿۸۸﴾ فَانْقَضَتْ عَنْهُمْ وَأَنْتُمْ

اور تحقیق تھے بن کے رہنے والے گنہگار ، سو ہم نے بدلہ لیا ان سے اور یہ دونوں

لَبِئْسَ مَا مَكَّنَّيْنَا ﴿۸۹﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسِلِينَ ﴿۹۰﴾

بستیاں واقع ہیں کھلے راستہ پر، اور بیشک جھٹلایا ہجر والوں نے رسولوں کو ،

وَآتَيْنَاهُمُ الْيَتِيمَ الْيَنَانِي ﴿۹۱﴾ أَتَعْرَافُونَ ﴿۹۲﴾ وَكَانُوا يُنْحِتُونَ مِنَ

اور دیں ہم نے ان کو اپنی نشانیاں سورہے ان سے منہ پھرنے، اور تھے کہ تراشتے تھے

الْجِبَالِ بَيُوتًا آمِنِينَ ﴿۹۳﴾ فَأَخَذَ اللَّهُمَّ الصَّيْحَةَ مُصْحِحِينَ ﴿۹۴﴾

پہاڑوں کے گھر اطمینان کے ساتھ ، پھر پکڑا ان کو چٹا کرنے صبح ہونے کے وقت

فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۹۵﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ

پھر کام نہ آیا ان کے جو کچھ کمایا تھا ، اور ہم نے بنائے نہیں آسمان

وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَإِنَّ السَّاعَةَ

اور زمین اور جو ان کے بیچ میں ہے بغیر حجت، اور قیامت بیشک

لَأَتِيَةٌ ﴿۹۶﴾ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿۹۷﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ

آنے والی ہے سو کنارہ کراچی طرح کنارہ ، تیرا رب جو ہے وہی ہے

الْخَلْقِ الْعَلِيمِ ﴿۹۸﴾

پیدا کرنے والا خبردار۔

خلاصہ تفسیر

قصہ اصحاب ایکہ اور بن والے راجی شعیب علیہ السلام کی امت بھی بڑے ظالم تھے سو ہم نے

اور اصحاب حجر ان سے رکھی بدلہ لیا اور ان کو عذاب سے ہلاک کیا اور دونوں قوم کی

بستیاں صاف سڑک پر واقع ہیں اور شام کو جاتے ہوئے راہ میں نظر آتی ہیں اور حجر

رکبہ حارم والوں نے رکھی سنجیدوں کو جھوٹا بتلایا کیونکہ صبا علیہ السلام کو جھوٹا کہا اور سب پیغمبروں کا

اصل دین ایک ہی ہے تو گویا سب کو جھوٹا بتلایا اور ہم نے انکا اپنی (طریق) نشانیاں دیں (جس سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور

حضرت صالح علیہ السلام کی جو ثابت ہوتی تھی مثلاً دلائل توحید، نماز، حج، صلاۃ، صوم، زکوٰۃ، ان (نشانوں) سے گزرنے والی رہی کرتے تھے اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ (ان میں سب آفات سے) امن میں رہیں سو ان کو صبح کے وقت (خواہ اول ہی صبح میں یا دن چڑھے، علی الاحتمالین) آواز سخت نے آ پکڑا سو ان کے (دنوی) ہنران کے کچھ بھی کاٹم آئے (ان ہی سنگ گھروں میں عذاب سے کام تمام ہو گیا، اس آفت سے ان کے گھروں نے نہ بچایا، بلکہ اس آفت کا ان کو احتمال بھی نہ تھا، اور اگر ہوتا بھی تو کیا کرتے)۔

معارف ومسائل

ایک، بن یعنی گھنے جنگل کو کہتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ مزیق کے پاس ایک بن تھا، اس لئے ایک اصحاب مذہب ہی کا لقب ہے، بعض نے کہا ہے کہ اصحاب ایک اور اصحاب مذہب دو عالمی و غلیظہ قومیں تھیں، ایک قوم کی ہلاکت کے بعد شعیب علیہ السلام دوسری قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔

تفسیر روح المعانی میں ابن عساکر کے حوالہ سے یہ مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے کہ: **إِنَّ مَنِ يَنْ وَاصْحَابَ الْأَيَّامِ كَرَّ أَمَّتَانِ بَعَثَ اللَّهُ تَعَالَى إِلَيْنَا شُعَيْبًا، وَاللَّهُ أَعْلَمُ** اور پھر ایک وادی ہے جو حجاز و شام کے درمیان واقع ہے، اس میں قوم ثمود آباد تھی۔

شروع سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ کو جو شدید عناد و مخالفت تھی اس کا بیان تھا، اس کے ساتھ اجمالاً آپ کی تسلی کا مضمون بھی ذکر کیا تھا، اب ختم سورت پر اسی عناد و مخالفت کے بارے میں آپ کی تسلی کے لئے تفصیلی مضمون بیان کیا جا رہا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

بَقِيَّةُ خِلَافَةِ تَفْسِيرِ اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں کے عناد و مخالفت سے غم نہ کیجئے کیونکہ اس کا ایک روز فیصلہ ہونے والا ہے، اور وہ روز قیامت ہے، جس کی آمد کے متعلق

ہم آپ سے تذکرہ کرتے ہیں کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان کے درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا (بلکہ اس مصلحت سے پیدا کیا کہ ان کو دیکھ کر صانع عالم کے وجود اور وحدت و عظمت پر استدلال کر کے اس کے احکام کی اطاعت کریں، اور بعد اقامت اس حجت کے جو ایسا نہ کرے وہ محذوب ہو) اور (دنیا میں پورا عذاب ہوتا نہیں تو اور کہیں ہونا چاہئے اس کے لئے قیامت مقرر ہے پس) ضرور قیامت آنے والی ہے (وہاں سب کو ہگستا یا جائے گا سو

آپ (کو غم نہ کیجئے بلکہ بخوبی کے ساتھ) ان کی شرارتوں سے (درگزر کیجئے) (درگزر کا مطلب یہ ہے کہ اس غم میں نہ پڑیے، اس کا خیال نہ کیجئے، اور بخوبی یہ کہ شکوہ و شکایت بھی نہ کیجئے، کیونکہ

بلاتشبہ آپ کا رب (چونکہ) بڑا خالق ہے اس سے ثابت ہوا کہ بڑا عالم رکھی ہے (سب کا حال اس کو معلوم ہے آپ کے صبر کا بھی ان کی شرارت کا بھی، اس لئے ان سے پورا پورا بردبار لے لے گا)۔

وَلَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝۸۷ لَا تَحْزَنْ

اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا، مت ڈال اپنی

عَيْنُكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَاهُ أَنزَ وَأَجَازْنَهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

آنکھیں ان چیزوں پر جو برتنے کو دیں ہم نے ان میں سے کئی طرح کے لوگوں کو اور نہ غم کھا ان پر

وَأَخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝۸۸ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ۝۸۹

اور تھکا اپنے بازو ایمان والوں کے واسطے، اور کہہ کہ میں ہوں ڈرانے والا کھول کر

كَمَا أَنزَلْنَاهُ عَلَى الْمُقْسِرِينَ ۝۸۹ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ۝۹۱

بیسہم نے بھیجا ہے اُن بانٹنے والوں پر، جنہوں نے کیا ہے قرآن کو بوٹیاں،

فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝۹۲ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۹۳

سو قسم ہر تیرے رب کی ہم کو پوچھنا ہوا ان سب سے، جو کچھ وہ کرتے تھے،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝۹۴ إِنَّا كَفَيْتَكَ

سو سنا دے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پروا نہ کر مشرکوں کی، ہم ہیں تیری طرف سے

الْمُسْتَهْزِئِينَ ۝۹۵ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ

تمہارے کرنے والوں کو، جو کہ ٹھہراتے ہیں اللہ کے ساتھ دوسرے کی بندگی،

فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝۹۶ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرَكَ

سو غم قریب معلوم کر لیں گے، اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا جی مضطرب ہے ان کی

بِمَا يَقُولُونَ ۝۹۷ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّجِدِينَ ۝۹۸

باتوں سے، سو تو یاد کر خوبیاں اپنے رب کی اور ہو سجدہ کرنے والوں سے

وَأَعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝۹۹

اور بندگی کئے جا اپنی رب کی جب تک آئے تیرے پاس یقینی بات

خلاصہ تفسیر

اور آپ ان کے معاملہ کو نہ دیکھئے کہ موجب غم ہوتا ہے، ہمارا معاملہ اپنے ساتھ دیکھئے، کہ ہماری طرف سے آپ کے ساتھ کس قدر رطفت و عنایت ہے چنانچہ ہم نے آپ کو ایک بڑی بھاری نعمت یعنی سات آیتیں دیں جو (نمازیں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور وہ (بوجہ جامع منشاء) عظیمہ ہونے کے اس قابل ہے کہ اس کے دینے کو یوں کہا جاوے کہ قرآن عظیم و یاد مراد اس سے سورۃ فاتحہ جو جس کی عظمت کی وجہ سے اس کا نام اُمّ القریٰ آن بھی ہے، پس اس نعمت اور منعم کی طرف نگاہ رکھئے کہ آپ کا قلب سرور و مطمئن ہو، ان لوگوں کے عناد و خلاف کی طرف التفات نہ کیجئے اور آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھئے نہ بلحاظ افسوس نہ بلحاظ ناراضگی، جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو مثلاً یہود و نصاریٰ مجوس اور مشرکین کو برتنے کے لئے دے رکھی ہے اور بہت جلد ان سے جدا ہو جائے گی، اور ان کی حالت کفر پر کچھ غم نہ کیجئے بلحاظ ناراضگی نظر کرنے سے یہ مراد ہے کہ چونکہ وہ دشمن خدا ہیں اس لئے بوجہ بغض فی اللہ غصہ آئے کہ ایسی نعمتیں ان کے پاس نہ ہوتیں، اس کے جواب کی طرف متعنائیں اشارہ ہے کہ یہ کوئی بڑی بھاری دولت نہیں کہ ان مغرور ضلیم کے پاس نہ ہوتیں، یہ تو متارعہ فانی ہے، بہت جلد حساب تارے گا، اور میں افسوس کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ افسوس یہ چیزیں ان کو ایمان سے مانع ہو رہی ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو غالباً ایمان لے آئیں، اس کا جواب لا تقنن میں ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کی طینت میں حد درجہ عناد ہے، ان سے کسی طرح توقع نہیں، اور حزن ہوتا ہے خلاف توقع پر جب توقع نہیں تو پھر حزن بے وجہ ہے، اولاً یہ بلحاظ حرص نظر کرنے کا تو آپ سے احتمال ہی نہیں، غرض یہ کہ آپ کسی بھی طرح ان کفار کے فکر و علم میں نہ پڑتیے، اور مسلمانوں پر شفقت رکھئے (یعنی فکر مصلحت اور شفقت کے لئے مسلمان کافی ہیں کہ ان کو اس سے نفع بھی ہے) اور کافروں کے لئے چونکہ فکر مصلحت کا کوئی نتیجہ نہیں اس لئے ان کی طرف توجہ بھی نہ کیجئے، البتہ تبلیغ جو آپ کا فرض منصبی ہے اس کو ادا کرتے رہئے، اور اتنا کہہ دیجئے کہ میں حکم کھلا (تم کو خدا کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں اور خدا کی طرف سے تم کو یہ مضمون پہنچاتا ہوں کہ وہ عذاب جس سے ہمارا نبی ڈراتا ہے ہم تم پر کسی وقت ضرور نازل کریں گے) جیسا ہم نے (وہ عذاب) ان لوگوں پر (مختلف اوقات گذشتہ میں) نازل کیا ہے جنہوں نے (احکامِ الہی کے) حصے کر رکھے تھے، یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دیتے تھے (ان میں جو مرضی کے موافق ہوا مان لیا جو مرضی کے خلاف ہوا اس

انکار کر دیا، مراد اس سے سابق یہود و نصاریٰ ہیں جن پر مخالفتِ انبیاء علیہم السلام کی وجہ سے عذابوں کا ہونا مثل مسخ بصورت بندر و خنزیر، قید، قتل اور ذلت مشہور و معروف تھا، مطلب یہ کہ عذاب کا نازل ہونا امر بعید نہیں، پہلے ہو چکا ہے اگر تم پر بھی ہو جائے تو تعجب کی کونسی بات ہے، خواہ وہ عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں، اور جب تقریر مذکور سے یہ بات اٹھ ہو گئی کہ جس طرح پہلے لوگ مخالفتِ انبیاء کی وجہ سے عذاب کے مستحق تھے اسی طرح موجودہ لوگ بھی مستحق عذاب ہو گئے ہیں، سو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو آپ کے پروردگار کی (یعنی اپنی) قسم ہم ان سب راگلوں اور پھیلوں سے ان کے اعمال کی (قیامت کے روز) ضرور باز پرس کریں گے (پھر یہ ایک کو اس کے مناسب مزا دیں گے) غرض (حاصل کلام یہ کہ) آپ کو جس بات (کے پہنچانے کا حکم کیا گیا ہے اس کو) (تو) صاف صاف سنا دیجئے اور اگر یہ نہ مانیں تو ان مشرکوں (کے ذمہ) کی (مطلق) ہر دانہ کیجئے (یعنی غم نہ کیجئے، جیسا اوپر آیا ہے لَا تَحْزَنُوا، اور نہ طبعی طور پر خوف کیجئے کہ یہ مخالف بہت سے ہیں کیونکہ) یہ لوگ جو (آپ کے اور خدا کے مخالف ہیں) چنانچہ آپ پر تو (پہنتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں ان (کے شر و ایذا) سے آپ (کو محفوظ رکھنے) کے لئے (اور ان سے بدلہ لینے کے لئے) ہم کافی ہیں، سو ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہتھارا اور شرک کا کیا انجام ہوتا ہے، غرض جب ہم کافی ہیں پھر کاتے کا خوف ہی) اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو (کفر و استہزاء کی باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں (کہ یہ طبعی بات ہے) سو (اس کا علاج یہ ہے کہ) آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے، اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ (اسی حالت میں) آپ کو موت آجائے (یعنی مرتے دم تک) کرد عبادت میں مشغول رہئے، کیونکہ ذکر اللہ اور عبادت میں آخرت کے اجر و ثواب کے علاوہ یہ نصیبت بھی ہے کہ دنیا میں جب انسان اس طرف لگ جاتا ہے تو دنیا کے رنج و غم اور تکلیف و مصیبت ہلکی ہو جاتی ہے۔

معارف و مسائل

سورۃ فاتحہ پورے قرآن | ان آیات میں سورۃ فاتحہ کو قرآن عظیم کہنے میں اس طرف اشارہ ہے
کامتن اور خلاصہ ہے | کہ سورۃ فاتحہ ایک حیثیت سے پورا قرآن ہے کیونکہ اصول اسلام سب

اس میں سموئے ہوئے ہیں۔

نخستین سوال اس چیز کا ہو گا | آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم لگا کر فرمایا ہے

کہ ان سب انگلوں پھپھوں سے ضرور سوال اور باز پرس ہوگی۔

صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ سوال کس معاملہ کے متعلق ہوگا، تو آپ نے فرمایا
 قَوْلَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے متعلق، تفسیر قرطبی میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سے مراد
 اس عمل کو عملی طور پر پورا کرنا ہے جس کی علامت کلمہ طیبہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے، محض زبانی قول مقصود نہیں کہیونکہ
 زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ ایمان کسی خاص وضع و ہئت
 بتانے سے اور دین محض تمنا سے نہیں بنتا، بلکہ ایمان اس یقین کا نام ہے جو قلب میں ڈال دیا گیا،
 اور اعمال نے اس کی تصدیق کی ہو، جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہے گا وہ ضرور جنت میں جائے گا
 لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کلمہ میں اخلاص کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب یہ کلمہ انسان
 کو اللہ کے محارم اور ناجائز کاموں سے روک دے تو وہ اخلاص کے ساتھ ہے (قرطبی)

تبلیغ و ارشاد میں تیغ | فَاَصْدَقُ بِمَا نُفِخُ بِهِ، اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے رسول کریم صلی اللہ
 بعد استطاعت | علیہ وسلم اور صحابہ کرام چھپ چھپ کر عبادت اور تلاوت کرتے تھے، اور تبلیغ و
 ارشاد کا سلسلہ بھی ختم ہی ایک ایک دو دو فرد کے ساتھ جاری تھا، کیونکہ اظہار و اعلان میں کفار کی
 ایذا رسانی کا خطرہ تھا، اس آیت میں حق تعالیٰ نے اتہزاز کرنے والے اور ایذا دینے والے کفار کی
 ایذا سے محفوظ رکھنے کی خود ذمہ داری لے لی، اس لئے اس وقت بے فکری کے ساتھ اعلان اظہار
 کے ذریعہ تلاوت و عبادت اور تبلیغ و دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔

إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ، میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان کے لیڈر پانچ آدمی تھے، جس بنی نل
 اسود بن المطلب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، حارث بن المطلب، یہ پانچوں معجزانہ طور پر ایک
 ہی وقت میں حضرت جبریلؑ کے اشارے سے ہلاک کر دیئے گئے، اس واقعہ سے تبلیغ و دعوت کے
 معاملہ میں یہ حاصل ہوا کہ اگر انسان کسی ایسے مقام یا ایسے حال میں مبتلا ہو جائے کہ وہاں حق بات کو
 علی الاعلان کہنے سے ان لوگوں کو تو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع نہ ہو اور اپنے آپ کو نقصان و تکلیف
 پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں یہ کام خفیہ طور پر کرنا بھی درست اور جائز ہے، البتہ جب اظہار
 اعلان کی قدرت ہو جائے تو پھر اعلان میں کوتاہی نہ کی جائے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ إِلَىٰ قَبِيحٍ | دشمنوں کی ایذا سے | پہنچے اور دل تنگی پیش آئے تو اس کا روحانی علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و عبادت
 میں مشغول ہو جائے اللہ تعالیٰ خود اس کی تکلیف کو دور فرمادیں گے۔

سورۃ حجر تمام شد

سُورَةُ النَّحْلِ

سُورَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَمَانُونَ آيَةً وَسِتِّعَشْرُ رُكُوعًا

سورۃ نحل مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو اٹھائیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

إِنِّي أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلْهُ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ①

آپہنجا حکم اللہ کا سو اس کی جلدی مت کرو، وہ پاک اور برتر ہے ان کے شریک بتلانے سے

يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

اتارتا ہے فرشتوں کو بھیج دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں

أَنْ أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ②

کہ خبردار کرو کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے، سو مجھ سے ڈرو

خلاصہ تفسیر

اس سورۃ کا نام سورۃ نحل اس مناسبت سے رکھا گیا ہے کہ اس میں نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا ذکر قدرت کی عجیب و غریب صنعت کے بیان کے سلسلے میں ہوا ہے، اس کا دوسرا نام سورۃ نعم بھی ہے (قرطبی) نعم کبرون نعمت کی جمع ہے، اس لئے کہ اس سورۃ میں خاص طور پر اللہ جل شانہ کی عظیم نعمتوں کا ذکر ہے۔

خدا تعالیٰ کا حکم (یعنی سزا سے کفر کا وقت قریب) آپہنجا سو حکم اس میں (منکرانہ) جلدی مت مچاؤ (بلکہ توحید اختیار کرو اور اس کی حقیقت سنو کہ) وہ لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے وہ اللہ تعالیٰ فرشتوں (کی جنس یعنی جبرئیل) کو وحی یعنی اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں جس پر چاہے (یعنی انبیاء پر) نازل فرماتے ہیں (اور وہ حکم) یہ ہے کہ لوگوں کو خبردار کرو کہ میرے سوا کوئی لائق عباد

نہیں سوچتے ہی ڈرتے رہتے (یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ ورنہ سزا ہوگی)۔

معارف و مسائل

اس سورہ کو بغیر کسی خاص تمہید کے ایک شدید وعید اور ہیبت ناک عنوان سے شروع کیا جس کی وجہ مشترکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (ﷺ) اصلے اللہ علیہ وسلم) ہمیں قیامت سے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غالب کرنے اور مخالفوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا ہے، ہمیں تو یہ کچھ بھی ہوتا نظر نہیں آتا، اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ”آپہو نجا حکم اللہ کا تم جلد بازی نہ کرو“

حکم اللہ سے اس جگہ مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول سے کیا ہے، کہ ان کے دشمنوں کو زیر و مغلوب کیا جاوے گا، اور مسلمانوں کو فتح و نصرت اور عزت و شوکت حاصل ہوگی، اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہیبت ناک لہجہ میں ارشاد فرمایا کہ حکم اللہ کا آپہنچا، یعنی پہنچنے ہی والا ہے، جس کو تم عنقریب دیکھ لو گے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں حکم اللہ سے مراد قیامت ہے، اس کے آپہنچنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کا وقوع قریب ہے، اور پوری دنیا کی عمر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قیامت کا قریب ہونا یا آپہنچنا بھی کچھ بعید نہیں رہتا (بحر محیط)

اس کے بعد کے جملے میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک سے پاک ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ جو حق تعالیٰ کے وعدہ کو غلط قرار دے رہے ہیں یہ کفر و شرک ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں (بحر)

اس آیت کا خلاصہ ایک وعید شدید کے ذریعہ توحید کی دعوت دینا ہے، دوسری آیت میں دلیل نقل سے توحید کا اثبات ہے، کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کے مختلف خطوں، مختلف زمانوں میں جو بھی رسول آیا ہے، اس نے یہی عقیدہ توحید پیش کیا ہے، حالانکہ ایک کو دوسرے کے حال اور تعلیم کی بظاہر اسباب کوئی اطلاع بھی نہ تھی، غور کرو کہ کم از کم ایک لاکھ بیس ہزار حضرات عقلاء جو مختلف اوقات میں مختلف ملکوں مختلف خطوں میں پیدا ہوئے اور وہ سب ایک ہی بات کے قائل ہوں تو فطرۃ انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ بات غلط نہیں ہو سکتی، ایمان لانے کے لئے تہنایہ دلیل بھی کافی ہے۔

لفظ روح سے مراد اس آیت میں بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بقول بعض مفسرین ہدایت ہے (بحر) اس آیت میں توحید کا دینی اور نقلی ثبوت پیش کر کے بعد اگلی آیتوں میں اسی عقیدہ توحید کو عقلی طور سے حق تعالیٰ کی نعمتیں پیش نظر

کر کے ثابت کیا جاتا ہے، ارشاد ہے:-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط تَطْعَمًا يُّشْرٰكُوْنَ ﴿۳﴾ خَلَقَ

بنائے آسمان اور زمین ٹھیک ٹھیک وہ برتر ہر ان کے شریک بتلانے سے، بنایا

الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ وَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴﴾ وَالْاَنْعَامَ

آدمی کو ایک بوند سے پھر جب ہی ہو گیا جھگڑا کر نیوالا بولنے والا، اور چوپائے

خَلَقْنَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْعًا وَمَنْفَعًا وَمِنْهَا تَكُوْنُ ﴿۵﴾ وَلَكُمْ

بنادیئے تمھارے واسطے ان میں بڑا اول ہر اور کتنے فائدے اور بعضوں کو کھاتے ہو، اور تم کو

فِيْهَا جَبَالٌ حٰقِيْنٌ تُّرِيْحُوْنَ وَحِيْنٌ تُّسْرَحُوْنَ ﴿۶﴾ وَتَحْمِلُ

ان سے عورت ہر جب شام کو چرا کر لاتے ہو اور جب چرانے لیجاتے ہو اور اٹھائے چلتے ہو

اَنْتَ اَلَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بِلٰغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ اَنْفُسٍ ط

بوجھ تمھارے ان شہروں تک کہ تم نہ پہنچتے وہاں مگر جان مار کر،

اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷﴾ وَالْاُحْيٰلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ

بیشک تمھارا رب بڑا شفقت کر نیوالا ہر بان ہر، اور گھوڑے پیدا کئے اور خچر میں اور گدھے

لِلرُّكْبٰنِ هَآؤُ زَيْنَةً ط وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾

کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے اور پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے

لغات کی تشریح | خصیم، خصومت سے مشتق ہے، بمعنی جھگڑالو، اَنْعَام، نَعْمٌ (رفع لون)

کی جمع ہے چوپایوں میں سے اونٹ، بکری اگائے کو کہا جاتا ہے (معزوات راغب)

دِفْعًا، گرمی اور گرمائی حاصل کرنے کی چیز، مراد اُون ہے جس کے گرم کپڑے بنائے

جاتے ہیں، تُّرِيْحُوْنَ (رواح سے اور تُّسْرَحُوْنَ (سراج سے مشتق ہے، چوپائے جانوروں کے جمع

کے وقت چراگاہ کی طرف جانے کو سراج اور شام کو گھر میں واپس آنے کو روح کہا جاتا ہے،

رَشِقَّ اَلْاَنْفُسُ، جان کی محنت و مشقت۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے بنایا وہ ان کے شرک سے پاک ہے (اور) انسان کو لطفہ سے بنایا پھر وہ اچانک کھلم کھلا (خدا ہی کی ذات و صفات میں) جھگڑنے لگا (یعنی بعض ایسے بھی ہوئے، مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ نعمتیں اور انسان کی طرف سے ناشکری) اور اسی نے چوپایوں کو بنایا، ان میں تمھارے جاڑے کا بھی سامان ہو (جانوروں کے بال اور کھال سے انسان کے پوشین اور کپڑے بنتے ہیں) اور کبھی بہت سے فائدے ہیں (دودھ، سواری، بار بڑاری وغیرہ) اور ان میں جو کھانے کے قابل ہیں ان کو کھاتے بھی ہو اور ان کی دھب سے تمھاری رونق بھی ہو جب کہ شام کے وقت (جنگل سے گھر) لاتے ہو اور جب کہ صبح کے وقت (گھر سے جنگل کو) چھوڑ دیتے ہو اور وہ تمھارے بوجھ بھی (لاؤ کر) ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدون جان کو محنت میں ڈالے ہو نہیں پہنچ سکتے، واقعی تمھارا رب بڑی شفقت و رحمت والا ہے کہ تمھارے آرام کے لئے کیا کیا سامان پیدا کئے) اور گھوڑے اور چھرا درگدھے بھی پیدا کئے تاکہ ان پر سوار ہو اور نیز زمینت کے لئے بھی، اور وہ ایسی ایسی چیزیں (تمھاری سواری وغیرہ کے لئے) بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں ہے۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں تخلیق کائنات کی عظیم نشانیوں سے حق تعالیٰ کی توحید کا اثبات ہے، اول تو سب سے پہلی مخلوق آسمان اور زمین کا ذکر فرمایا، اس کے بعد تخلیق انسان کا ذکر فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے مخدوم کائنات بنایا ہے، انسان کی ابتداء ایک حقیر لطفہ سے ہونا بیان کر کے فرمایا **فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ**، یعنی جب اس ضعیف الخلق انسان کو طاقت اور قوت گویائی عطا ہوئی تو خدا ہی کی ذات و صفات میں جھگڑنے لگا۔

انسان کے بعد ان اشیاء کی تخلیق کا ذکر فرمایا جو انسان کے فائدے کے لئے خصوصی طور پر بنائی گئی ہیں، اور قرآن کے سب سے پہلے مخاطب چونکہ عرب تھے، اور عرب کی حیثیت کا بڑا مدار پالتو چوپاؤں اونٹ، گائے، بکری پر تھا، اس لئے پہلے ان کا ذکر فرمایا **وَالْاَنْعَامَ خَلَقْنَا** پھر **النَّعَمَ** سے جو فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں ان میں سے دو فائدے خاص طور سے بیان کر دیئے، ایک **لَكُمْ فِيْهَا دِيْنٌ**، یعنی ان جانوروں کے اڈن سے انسان اپنے کپڑے اور کھال سے پوشین اور ٹوپیاں وغیرہ تیار کر کے جاڑے کے موسم میں گرمائی حاصل کرتا ہے۔ دوسرا فائدہ **وَمِنْهَا تَكُوْنُ**، یعنی انسان ان جانوروں کو ذبح کر کے اپنی خوراک بھی

بنا سکتا ہے، اور جب تک زندہ ہے ان کے دودھ سے اپنی بہترین غذا پیدا کرتا ہے، دودھ دہاؤں مکھن، گھی اور ان سے بننے والی تمام اشیاء اس میں داخل ہیں۔

اور باقی عام فوائد کے لئے فرمایا وَ مَنَافِعُ، یعنی بے شمار منافع اور فوائد انسان کے جانوروں کے گوشت، چمڑے، ہڈی، اور بالوں سے وابستہ ہیں، اس ابہام و اجمال میں ان سب نئی سے نئی ایجادات کی طرف بھی اشارہ ہے جو حیوانی اجزاء سے انسان کی غذا، لباس، دوا، استعمالی اشیاء کے لئے اب تک ایجاد ہو چکی ہیں، یا آئندہ قیامت تک ہوں گی۔

اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ایک اور فائدہ عرب کے مذاق کے مطابق یہ بیان کیا گیا کہ وہ تمھارے لئے جمال اور رونق کا ذریعہ ہیں، خصوصاً جب وہ شام کو چراگا ہوں سے تمھارے مویشی خانوں کی طرف آتے ہیں یا صبح کو گھروں سے چراگا ہوں کی طرف جاتے ہیں، کیونکہ اس وقت مویشی سے ان کے مالکان کی خاص شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

آخر میں ان جانوروں کا ایک اور اہم فائدہ یہ بیان کیا کہ یہ جانور تمھارے بوجھل سامان دور دراز شہروں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تمھاری اور تمھارے سامان کی رسائی جان بوجھوں میں ڈالے بغیر ممکن نہ تھی، اونٹ اور بیل خاص طور سے انسان کی یہ خدمت بڑے پیمانے پر انجام دیتے ہیں، آج ریل گاڑیوں، ٹرکوں، ہوائی جہازوں کے زمانے میں بھی انسان ان جانوروں سے مستغنی نہیں، کتنے مقامات دنیا میں ایسے ہیں جہاں یہ تمام فوائد سواریاں باربرداری کا کام نہیں دے سکتیں وہاں پھر انہی کی خدمات حاصل کرنے پر انسان مجبور ہوتا ہے۔

الْحَمْلُ یعنی اونٹ اور بیل وغیرہ کی باربرداری کا ذکر آیا تو اس کے بعد ان چوپایہ جانوروں کا ذکر بھی مناسب علوم ہو جن کی تخلیق ہی سواری اور باربرداری کے لئے ہے، ان کے دودھ یا گوشت سے انسان کا دائرہ تعلق نہیں، کیونکہ از روئے شرع وہ اخلاقی بیماریوں کا سبب ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں، فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ نَنْبُوْهُنَّ وَأُولَٰئِكَ مِمَّا يَتَذَكَّرُ، یعنی ہم نے گھوڑے،

خیر، گدھے پیدا کئے، تاکہ تم ان پر سوار ہو سکو، اس میں باربرداری بھی ضمناً آگئی، اور ان کو اس لئے بھی پیدا کیا کہ یہ تمھارے لئے زینت بنیں، زینت سے وہی شان و شوکت مراد ہو جو عموماً ان جانوروں کے مالکان کو دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔

قرآن میں ریل موٹر | آخر میں سواری کے تین جانور گھوڑے، خیر، گدھے کا خاص طور سے بیان کرنے ہوائی جہاز کا ذکر کے بعد دوسری قسم کی سواروں کے متعلق بھیضہ استقبال فرمایا۔

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَحْسِبُوْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا وہ چیزیں جن کو تم نہیں جانتے،

اس میں وہ تمام نو ایجاد و سواری گاڑیاں بھی داخل ہیں جن کا زمانہ قدیم میں نہ وجود تھا نہ کوئی تصور، مثلاً ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ جو اب تک ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ تمام چیزیں بھی اس میں داخل ہیں جو آئندہ زمانے میں ایجاد ہوں گی، کیونکہ تخلیق ان سب چیزوں کی درحقیقت خالق مطلق ہی کا فعل ہے، سائنس قدیم و جدید کا اس میں صرف اتنا ہی کام ہے کہ قدرت کی پیدا کی ہوئی دھاتوں میں قدرت ہی کی دی ہوئی عقل و فہم کے ذریعہ جو توڑ کر کے ان کے مختلف کٹ چرے بنائے، اور پھر اس میں قدرت الہیہ کی بخشی ہوئی ہوا، پانی، آگ وغیرہ سے برقی رو پیدا کر لے، یا قدرت ہی کے دیئے ہوئے خزانوں میں سے پیٹرول نکال کر ان سواریوں میں استعمال کر لے، سائنس قدیم و جدید مل کر بھی نہ کوئی لوہا، پیتل پیدا کر سکتی ہے، نہ ایلومینیم قسم کی ہلکی دھاتیں بنا سکتی ہے، نہ لکڑی پیدا کر سکتی ہے، نہ ہوا اور پانی پیدا کرنا اس کے بس میں ہے، اس کا کام اس سے زائد نہیں کہ قدرت الہیہ کی پیدا کی ہوئی قوتوں کا استعمال سکھ لے، دنیا کی ساری ایجادات صرف اسی استعمال کی تفصیل ہیں، اس لئے جب ذرا بھی کوئی غور فکر سے کام لے تو ان سب نئی ایجادات کو تخلیق خالق مطلق کہنے اور تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ نظر ہے کہ پچھلے تمام اشیاء کی تخلیق میں لفظ ماضی خلق استعمال فرمایا گیا ہے، اور محدث سواریوں کا ذکر کرنے کے بعد بصیغہ مستقبل یُخْلَقُ ارشاد ہوا ہے، اس تغیر عنوان سے واضح ہو گیا کہ یہ لفظ ان سواریوں اور دوسری اشیاء کے متعلق ہے جو ابھی معرض وجود میں نہیں آئیں، اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اگلے زمانے میں کیا کیا سواریاں اور دوسری اشیاء پیدا کرنا ہیں، ان کا اظہار اس مختصر جملے میں فرمادیا۔

حق جل شانہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ آئندہ وجود میں آنے والی تمام نئی ایجادات کا نام لیکر ذکر فرمادیتے، مگر اس زمانے میں اگر ریل، موٹر، طیارہ وغیرہ کے الفاظ ذکر بھی کر دیتے جاتے، تو اس سے بجز تشویش ذہن کے کوئی فائدہ نہ ہوتا، کیونکہ ان اشیاء کا اس وقت تصور کرنا بھی لوگوں کے لئے آسان نہ تھا، اور نہ یہ الفاظ ان چیزوں کے لئے اس وقت کہیں مستعمل ہوتے تھے، کہ اس سے کچھ مفہوم سمجھا جاسکے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد حسین صاحب نے فرمایا کہ ہمارے استاذ استاذ اکمل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانو تو مٹی فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں ریل کا ذکر موجود ہے، اور اسی آیت سے استدلال فرمایا، اس وقت تک موٹریں عام نہ ہوتی تھیں اور ہوائی جہاز ایجاد

نہ ہوئے تھے اس لئے ریل کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔

مسئلہ: قرآن کریم نے اَوَّلِ اَنْعَام یعنی اونٹ، گائے، بکری کا ذکر فرمایا، اور ان کے فوائد میں سے ایک اہم فائدہ ان کا گوشت کھانا بھی قرار دیا، پھر اس سے الگ کر کے فرمایا:

وَالْخَيْلَ وَالْإِبْخَالَ وَالْحَمِيرَ، ان کے فوائد میں سواری لینے اور ان سے اپنی زینت حاصل کرنے کا تو ذکر کیا، مگر گوشت کھانے کا یہاں ذکر نہیں کیا، اس میں یہ دلالت پائی جاتی ہے کہ گھوڑے، خچر، گدھے کا گوشت حلال نہیں، پھر اور گدھے کا گوشت حرام ہونے پر تو جہود فقہاء کا اتفاق ہے اور ایک مستقل حدیث میں ان کی حرمت کا عداوتہ بھی ذکر آیا ہے، مگر گھوڑے کے معاملہ میں حدیث کی دو روایتیں متعارض آئی ہیں، ایک سے حلال اور دوسری سے حرام ہونا معلوم ہوتا ہے، اسی لئے فقہائے امت کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہو گئے، بعض نے حلال قرار دیا بعض نے حرام، امام اعظم ابو حنیفہؒ نے اسی تعارض دلائل کی وجہ سے گھوڑے کے گوشت کو گدھے اور خچر کی طرح حرام تو نہیں کہا مگر مکروہ قرار دیا (احکام القرآن جصاص)۔

مسئلہ: اس آیت سے جمال اور زینت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تفاخر و تکبر حرام ہیں، فرق یہ ہے کہ جمال اور زینت کا حاصل اپنے دل کی خوشی یا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اظہار ہوتا ہے نہ دل میں اپنے کو اس نعمت کا حق سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو حقیر جانتا ہے، بلکہ حق تعالیٰ کا عطیہ اور انعام ہونا اس کے پیش نظر ہوتا ہے، اور تکبر و تفاخر میں اپنے آپ کو اس نعمت کا حق سمجھنا، دوسروں کو حقیر سمجھنا پایا جاتا ہے وہ حرام ہے (بیان القرآن)۔

وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ وَكَوْشَاءٌ لَّهْدَكُمْ

اور اللہ تک پہنچتی ہو سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہو اور اگر وہ چاہے تو سیدھی راہ

اجْمَعِينَ ۹

دے تم سب کو۔

خلاصہ تفسیر

اور (دلائل مذکورہ سابقہ و لاحقہ سے ہو) سیدھا رستہ (دین کا ثابت ہوتا ہے وہ خاص) اللہ

تک پہنچتا ہے اور بعضے رستے (جو کہ دین کے خلاف ہیں) ٹیڑھے بھی ہیں رکہ ان سے اللہ تک رسائی ممکن نہیں، پس بعض تو سیدھے رستہ پر چلتے ہیں اور بعض ٹیڑھے پر (اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو

امنزل مقصود تک پہنچا دیتا مگر وہ اسی کو پہنچاتے ہیں جو صراطِ مستقیم کا طالب بھی ہو وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهَبَنَّ مِنْهُمْ شُرُكُتَهُمْ اس لئے ہم کو چاہئے کہ دلائل میں غور کر وادراں سے حق کو طلب کر دہم کو امنزل مقصود تک رسائی عطا ہو

معارف و مسائل

ان آیات میں اللہ جل شانہ کی عظیم الشان نعمتوں کا ذکر فرما کر توحید کے عقلی دلائل جمع کئے گئے، آگے بھی انہی نعمتوں کا ذکر ہے، درمیان میں یہ آیت بطور جملہ معترضہ کے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے لائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وعدہ قدیمہ کی بناء پر اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ لوگوں کے لئے وہ صراطِ مستقیم واضح کر دے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے، اسی لئے انعامِ الہیہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کے دلائل جمع کئے جا رہے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف کچھ لوگوں نے دوسرے ٹیڑھے راستے بھی اختیار کر رکھے ہیں، وہ ان تمام واضح آیات اور دلائل سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ گمراہی میں بہکتے رہتے ہیں۔

پھر ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے کہ سب کو سیدھے راستہ پر مجبور کر کے ڈال دیں، تو ان کے اختیار میں تھا، مگر حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ جبر نہ کیا جائے، دونوں راستے سامنے کر دیئے جائیں، چلنے والا جس راستہ پر چلنا چاہے، صراطِ مستقیم اللہ تعالیٰ اور جنت تک پہنچائے گا، اور ٹیڑھے راستے جہنم پر پہنچائیں گے، انسان کو اختیار دیدیا کہ جس کو چاہے انتخاب کر لے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ

وہی ہے جس نے اتارا آسمان سے تمہارے لئے پانی اس سے پیتے ہو اور اسی سے درخت ہوتے

فِيهِ تَسْمُونُ ۝ يَنْبُتُ لَكُمْ بِهِ الشَّرْعُ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلُ

میں ہیں جراتے ہو، اُگاتا ہے تمہارے واسطے اس سے کیستی اور زیتون اور کھجوریں

وَالْأَعْنَابُ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّمُسْلِمٍ

اور انگور اور ہر قسم کے میوے، اس میں البتہ نشانی ہے اُن لوگوں کو

يَتَفَكَّرُونَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

جو غور کرتے ہیں، اور تمہارے کام میں لگا دیا رات اور دن اور سورج اور چاند کو

وَالنَّجْمُ مَسْخَرَةٌ بِأَمْرِ رَبِّهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۱﴾

اور ستارے کام میں لگے ہیں اس کے حکم سے اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو سمجھ رکھتے ہیں ،

وَمَا ذَرَأْتُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً

اور جو چیزیں پھیلاتیں تمھارے واسطے زمین میں رنگ رنگ کی اس میں نشانی ہے ان

لِقَوْمٍ أَيْدٍ كَرُورٌ ﴿۱۲﴾ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِيَتَأْكَلُوا مِنْهُ لَحْمًا

لوگوں کو جو سوچتے ہیں ، اور وہی ہے جس نے کام میں لگا دیا دریا کو کہ کھاؤ اس میں گوشت

طَرِيًّا وَتَسَخَّرُ مِنْهُ حُلِيِّهٖ تَلْبَسُونَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلَ مَوْجًا

تازہ اور کھاؤ اس میں سے گھنا جو پہنتے ہو ، اور دیکھتا ہو تو کشتیوں کو چلتی ہیں پانی

فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۳﴾ وَالْقَلْبِ

پھاڑ کر اس میں اور اس واسطے کہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ احسان مانو ، اور دیکھ دیتے

فِي الْأَرْضِ رَوْا سِيَّ أَنْ تَسِيدَ بِكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

زمین پر ، بوجھ کر کہیں بھٹک پڑے تم کوٹ کر اور بنائیں ندیاں اور راستے تاکہ تم

تَكْتَدُونَ ﴿۱۴﴾ وَعَلَّمَتْ بِالزَّجْرِ هُمْ يَكْتَدُونَ ﴿۱۵﴾

راہ پاؤ ، اور بنائیں علامتیں اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں

خلاصہ تفسیر

وہ اللہ ایسا ہے جس نے تمھارے افادہ کے واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے

تم کو پینے کو ملتا ہے اور جس کے سبب سے درخت پیدا ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشی

کو چارے چھوڑ دیتے ہو (اور اس پانی سے تمھارے فائدے کے لئے کھیتی اور زیتون اور

کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل زمین سے) اگاتا ہے بیشک اس (مذکورہ) میں سوچنے والوں کے

لئے توحید کی (دلیل موجود) ہے اور اس (اللہ) نے تمھارے افادہ کے لئے رات اور دن

اور سورج اور چاند کو اپنا مسخرہ قدرت (بنایا اور اسی طرح اور ستارے بھی) اس کے حکم

سے مسخرہ قدرت (یہاں بیشک اس (مذکورہ) میں (بھی) عقلمند لوگوں کے لئے توحید کی چند دلیلیں

موجود ہیں اور اسی طرح ان چیزوں کو بھی مسخرہ قدرت (بنایا جن کو تمھارے فائدہ کیلئے)

اس طور پر پیدا کیا ہے کہ ان کے اقسام (یعنی اجناس و انواع و اصناف) مختلف ہیں (اس میں تمام حیوانات و نباتات و جمادات، مفردات و مرکبات داخل ہو گئے) بیشک اس (مذکور) میں رکھی، سمجھار لوگوں کے لئے (توحید کی) دلیل (موجود) ہے اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اس نے دریا کو (جی) مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اس میں سے تازہ تازہ گوشت (یعنی پھلی نکال نکال کر) کھاؤ اور (تاکہ) اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جس کو تم (مرد و عورت سب) پہنتے ہو اور (اے مخاطب اس دریا کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ) تو کشتیوں کو (غواہ چھوٹی ہوں یا بڑی جیسے بڑے جہاز تو ان کو) دیکھتا ہے کہ اس (دریا) میں (اس کا) پانی پیرتی ہوئی چل جا رہی ہیں اور (نیز اس لئے) دریا کو مسخر قدرت بنایا تاکہ تم (اس میں مال تجارت لے کر سفر کرو اور اس کے ذریعہ سے) خدا کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (ان سب فائدوں کو دیکھ کر اس کا) شکر (ادا) کرو اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیئے تاکہ وہ (زمین) تم کو لے کر ڈگمگانے (اور ہلنے) نہ لگے اور اس نے (چھوٹی چھوٹی) نہریں اور رستے بنائے تاکہ (ان رستوں کے ذریعہ سے اپنے) منزل مقصود تک پہنچ سکو اور (ان رستوں کی سچان کے لئے) بہت سی نشانیاں بنائیں (جیسے پہاڑ، درخت، تعمیرات وغیرہ جن سے رستہ پہچانا جاتا ہے ورنہ اگر تمام زمین کی سطح یکساں حالت پر ہوتی تو رستہ ہرگز نہ پہچانا جاتا) اور ستاروں سے بھی لوگ رستہ معلوم کرتے ہیں (چنانچہ ظاہر و معلوم ہے)۔

معارف و مسائل

مِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ نَسِيمٌ، (لفظ شجر اکثر درخت کے لئے بولا جاتا ہے، جو ساق یعنی تنے پر کھڑا ہوتا ہے، اور کبھی مطلق زمین سے اُگنے والی ہر چیز کو بھی شجر کہتے ہیں، لگھا س اور ہیل وغیرہ بھی اس میں داخل ہوتی ہیں، اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ آگے جانوروں کے چرانے کا ذکر ہے، اس کا تعلق زیادہ تر گھاس ہی سے ہے۔

نَسِيمٌ، اسامت مشتق ہے جس کے معنی ہیں جانور کو چراگاہ میں چرنے کیلئے چھوڑنا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، ان تمام آیات میں نعمائے الہیہ اور عجیب و غریب حکمت کے ساتھ تخلیق کائنات کا ذکر ہے، جس میں غور و فکر کرنے والوں کو ایسے دلائل اور شواہد ملتے ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ کی توحید کا گویا مشاہدہ ہونے لگتا ہے، اسی لئے ان نعمتوں کا ذکر کرتے کرتے بار بار اس پر متنبہ کیا گیا ہے، اس آیت کے اخیر میں فرمایا کہ اس میں سوچنے والوں کے لئے دلیل ہے، کیونکہ کھیتی اور درخت اور ان کے پھل پھول وغیرہ کا تعلق اللہ جل شانہ کی صنعت و حکمت کے ساتھ کسی قدر غور و فکر چاہتا ہے، کہ آدمی یہ سوچے کہ دانہ یا گٹھلی زمین کے

اندھ لٹنے سے اور پانی دینے سے تو خود بخود یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں سے ایک عظیم الشان درخت نکل آئے اور اس پر رنگارنگ کے پھول لگنے لگیں، اس میں کسی کا شکر کار زمیندار کے عمل کا کوئی دخل نہیں، یہ سب قادر مطلق کی صنعت و حکمت سے وابستہ ہے، اور اس کے بعد لیل و نہار اور ستاروں کا اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع چلنے کا ذکر آیا تو آخر میں ارشاد فرمایا:

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ یعنی ان چیزوں میں چند دلائل ہیں عقل والوں کے لئے، اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ ان چیزوں کا حکم الہی کا مسخر ہونا ایسا ظاہر ہے کہ اس میں بہت کچھ غور فکر کی ضرورت نہیں، جسکو ذرا بھی عقل ہوگی وہ سمجھ لے گا، کیونکہ نباتات اور درختوں کے اگانے میں تو بظاہر کچھ نہ کچھ انسانی عمل کا دخل تھا بھی یہاں وہ بھی نہیں۔

اس کے بعد زمین کی دوسری مختلف انواع و اقسام کی پیداوار کا ذکر فرما کر فرمایا:

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ کہ اس میں دلیل ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت پکڑتے ہیں، مراد یہ ہے کہ یہاں بھی بہت گہرے فکر و نظر کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کی دلالت بالکل کھلی ہوئی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ کوئی اس کی طرف توجہ سے دیکھے، اور نصیحت حاصل کرے، ورنہ بیوقوف بے فکر آدمی جو ادھر دھیان ہی نہ دے اس کو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ، رات اور دن کو مسخر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ان کے کام میں لگانے کے لئے اپنی قدرت کا مسخر بنادیا کہ رات انسان کو آرام کے سامان مہیا کرتی ہو، اور دن اس کے کام کے راستے ہموار کرتا ہے، ان کے مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ رات اور دن انسان کے حکم کے تابع چلیں۔

هُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لَكُمْ دَافِقَيْنِ یَسْرَنِ، آسمان و زمین کی مخلوقات اور ان میں انسان کے منافع اور فوائد بیان کرنے کے بعد بحر محیط زمین کے اندر حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ سے انسان کے لئے کیا کیا فوائد ہیں ان کا بیان ہے، کہ دریا میں انسان کی خوراک کا کیسا اچھا انتظام کیا گیا ہے کہ مچھلی کا تازہ گوشت اس کو ملتا ہے۔

لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا، کے الفاظ میں مچھلی کو تازہ گوشت قرار دینے سے اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ دوسرے جانوروں کی طرح اس میں ذبح کرنے کی شرط نہیں وہ گویا بنا بنا یا گوشت ہے۔

وَتَسَخَّرُ لَكُمْ مِنْهُ جَنَّتٌ تَحْتِهَا تَرْتَمُونَ، یہ دریا کا دوسرا فائدہ بتلایا گیا ہے کہ اس میں غوطہ لگا کر انسان اپنے لئے جلیہ نکال لیتا ہے، جلیہ کے لغظی معنی زینت کے ہیں، مراد وہ موتی، مونگا اور جواہرات ہیں جو سمندر سے نکلنے میں اور غورتوں میں ان کے ہار بنا کر گلے میں یا دوسرے طریقوں

سے کانوں میں پہنتی ہیں، یہ زیور اگرچہ عورتیں پہنتی ہیں، لیکن قرآن نے لفظ مذکر استعمال فرمایا
 تَبَسُّوْنَ نَهَايْنِیْ عَنْ تَمَ لُوكِ سَهْنَتِهٖ ہوا، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ عورتوں کا زیور پہننا درحقیقت
 مردوں ہی کے مفاد کے لئے ہے عورت کی زینت و حقیقت مرد کا حق ہے، وہ اپنی بیوی کو زینت کہتا ہے
 اور زیور پہننے پر بھیڑ بھی کر سکتا ہے، اس کے علاوہ جواہرات کا استعمال مرد بھی انگوٹھی وغیرہ میں کر سکتے ہیں
 وَتَرَى الْخَلْقَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لَیْسَ بِغَوْثٍ مِّنْ عَصِیْہِ یہ تیسرا فائدہ دریا کا بتلایا گیا ہے
 فُتُكْ کے معنی کشتی، اور مواخر، ماخرہ کی جمع ہے، فُتُكْ کے معنی پانی کو چیرنے کے ہیں، اور وہ کشتیاں
 اور جہزی پہاڑ ہیں جو پانی کی موجوں کو چیرتے ہوئے مسافت طے کرتے ہیں۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ دریا کو اللہ تعالیٰ نے بلاد بعیدہ کے سفر کا راستہ بنایا ہے، وہ دریا
 کے ملکوں میں دریا ہی کے ذریعہ سفر کرنا اور تجارتی مار کی درآمد و برآمد کرنا آسان فرمادیا ہے، اور اس
 کو حصول رزق کا عمدہ ذریعہ قرار دیا، کیونکہ دریا کے راستہ سے تجارت سب سے زیادہ نفع بخش ہوتی ہے
 وَ اَلْقٰی فِی الْاَسْوَءِ رَوَاسِیْ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمَا رَوَاسِیْ، راسیہ کی جہت ہے، بھاری پہاڑ
 کو کہا جاتا ہے، ثبید، غیر مصدر سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈگمگانا یا مضطربانہ قسم کی حرکت کرنا ہے
 معنی آیت کے یہ ہیں کہ زمین کے گروہ کو حق تعالیٰ نے بہت سی حکمتوں کے ماتحت ٹھوس اور
 متوازن جہاز سے نہیں بنایا، اس لئے وہ کسی جانب سے بھاری کسی جانب سے ہلکی واقع ہوتی ہے
 اس کا لازم نتیجہ یہ تھا کہ زمین کو مٹا سفرروں کی طرح ساکن مانا جائے یا کچھ قدیم و جدید فدا سفرروں
 کی طرح حرکت مستریرہ کے ساتھ متحرک قرار دیا جائے، دونوں حال میں زمین کے اندر ایک
 اضطرابی حرکت ہوتی، جس کو اردو میں کانپنے یا ڈگمگانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس اضطرابی حرکت
 کو روکنے اور اجزاء زمین کو متوازن کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے زمین پر پہاڑوں کا وزن رکھ دیا
 تاکہ وہ اضطرابی حرکت نہ کر سکے، ہوتی رہا مسئلہ حرکت مستریرہ کا، جیسے تمام سیارات کرتے ہیں
 اور قدیم فلاسفہ میں سے فیثاغورث کی یہی تحقیق تھی، اور جدید فلاسفہ سب اس پر متفق ہیں اور
 نئے تجربات نے اس کو اور بھی زیادہ واضح کر دیا ہے تو قرآن کریم میں نہ کہیں اس کا اثبات ہے نہ
 اس کی نفی، بلکہ یہ اضطرابی حرکت جس کو پہاڑوں کے ذریعہ بند کیا گیا ہے اس حرکت مستریرہ کے
 لئے اور زیادہ معین ہوگی جو سیارات کی طرح زمین کے لئے ثابت کی جاتی ہے، واللہ اعلم

وَ عَلَّمَتْ طَوْ بِاَلْمَجِیْدِ هَمَّ تَحْتَرُّوْنَ اور چونکہ تجارتی سفر کا ذکر آیا ہے تو مناسبت
 ہوا کہ ان آسائینوں کو بھی ذکر کیا جائے جو حق تعالیٰ نے مسافروں کی قطع مسافت اور منزل مقصود
 تک پہنچانے کے لئے زمین و آسمان میں پیدا فرمائی ہیں، اس لئے فرمایا وَ عَلَّمَتْ، یعنی ہم نے
 زمین میں راستہ پہنچانے کے لئے بہت سی علامات پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، مکانوں وغیرہ کے

ذریعہ قائم کر دی ہیں، ظاہر ہے کہ اگر زمین ایک سپاٹ کرہ ہوتا تو انسان کسی منزل تک پہنچنے کے لیے کسی طرح راستے میں بھٹکتا۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ۔ یعنی سفر کرنے والے جیسے زمینی علامات سے راستہ پہنچاتے ہیں اسی طرح ستاروں کے ذریعے بھی سمت معلوم کر کے راستہ پہچان لیتے ہیں، اس عنوان میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کی تخلیق کا اصل مقصد تو کچھ اور ہے، اس کے ساتھ ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ ان سے راستے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

أَفَسَوْفَ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۷﴾ وَإِنْ تَعْدُوا

بمیلہ جو پیرا کرے برابر ہواں کے جو کچھ نہ پیدا کرے، کیا تم سوچتے نہیں، اور اگر شمار کر دو

نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

اللہ کی نعمتوں کو نہ پورا کر سکوگے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے

مَا تَسْرُونَ وَمَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ

جو تم پھیلاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا

اللَّهُ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۲۰﴾ أَمْ أَمْثَلُ غَيْرِ أَحْيَاءٍ

کچھ پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں، مثلاً یہ جن میں جان نہیں

وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يَبْعَثُونَ ﴿۲۱﴾ إِلَهُكُمْ إِلَهُ وَاحِدٌ

اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے، معبود تمہارا معبود ہے اکیلا

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ

سو جن کو یقین نہیں آخرت کی زندگی کا ان کے دل نہیں مانتے اور وہ

مُسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا

مغرور ہیں، ٹھیک بات ہے اللہ جانتا ہے جو کچھ پھیلاتے ہیں اور جو

يُعْلِنُونَ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ﴿۲۳﴾

کچھ ظاہر کرتے ہیں، بیشک وہ نہیں پسند کرتا غور کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر

سورہ جب اللہ تعالیٰ کا خالق اشیا، مذکورہ ہونا اور اس میں اس کا منفرد ہونا ثابت ہو چکا تو کیا جو شخص پیدا کرتا ہو (یعنی اللہ تعالیٰ) وہ اس جیسا ہو جاوے گا جو پیدا نہیں کر سکتا (کہ تم دونوں کو مجبور سمجھنے لگے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی اہانت ہے کہ اس کو بتوں کے برابر کر دیا) پھر کیا تم راتیں بھی نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ نے جو اوپر دلائل توحید میں اپنی نعمتیں بتلائی ہیں ان پر کیا حسرت ہے وہ تو اس کثرت سے ہیں کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی (ان نعمتوں کو گنتے لگو تو کبھی) نہ گن سکو (مگر مشہد کہیں شکر اور قدر نہیں کرتے اور یہ جرم اتنا عظیم تھا کہ نہ معاف کرانے سے معاف ہوتا اور نہ اس پر آگ کو یہ نعمتیں ملتیں لیکن) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ کوئی شرک سے توبہ کرے تو مغفرت ہو جاتی ہے اور نہ کرے جب بھی تمام نعمتیں حیات تک منقطع نہیں ہوتیں) اور رہاں نعمتوں کے فائن ہوئے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کبھی سزا نہ ہوگی، بلکہ آخرت میں سزا ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری احوال سب جانتے ہیں (پس ان کے موافق سزا دیں گے یہ تو حق تعالیٰ کے خالق اور منعم ہونے کا بیان تھا) اور جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود ہی مخلوق ہیں اور اوپر قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے کہ بے خالق اور خالق مساوی نہیں، پس یہ معبودین کیسے مستحق عبادت ہو سکتے ہیں اور (معبودین) مردے (بے جان) ہیں (خواہ دو اما جیسے بت یا فی الحال جیسے وہ لوگ جو مر چکے ہیں یا فی الحال جو مریں گے مثلاً جن اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہم) زندہ رہنے والے (پس خالق تو کیا ہوتے) اور ان (معبودین) کو (راتنی بھی) خبر نہیں کہ (قیامت میں) مردے کب اٹھائے جائیں گے (یعنی بعض کو تو علم ہی نہیں اور بعض کو تعین معلوم نہیں) اور معبود کے لئے علم تو محیط چاہئے، خصوصاً قیامت کا کہ اس پر جزا ہوگی عبادت و عدم عبادت کی تو اس کا علم تو معبود کے لئے بہت ہی مناسب ہے، پس خدا کے برابر تو علم میں کیا ہوں گے، اس تقریر سے ثابت ہوا کہ تمہارا معبود بڑی ایک ہی معبود ہے تو (اس ایضاً حق پر بھی) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے (اور اسی لئے ان کو ڈر نہیں کہ توحید کو قبول کریں معلوم ہوا کہ) ان کے دل (ہی ایسے ناقابل ہیں کہ محقول بات کے) منکر ہو رہے ہیں اور (معلوم ہوا کہ) وہ قبول حق سے تکبر کرتے ہیں (اور) ضروری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کے احوال پوشیدہ و ظاہر جانتے ہیں (اور یہ بھی) یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے (پس جب ان کا تکبر معلوم ہو تو ان کو بھی ناپسند کرینگے اور سزا دیں گے) :

معارف ومسائل

پہلی آیتوں میں اللہ جل شانہ کی نعمتوں کا اور تخلیق کائنات کا منسل ذکر کرنے کے بعد اس بات پر تنبیہ فرمائی جس کے لئے ان سب نعمتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور وہ ہر توحید حق تعالیٰ کی کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، اس لئے فرمایا کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تہا زمین و آسمان بنائے، کوہ و دریا بنائے، نباتات و حیوانات بنائے، درخت اور ان کے پھول پھل بنائے تو کیا وہ ذات پاک جو ان سب چیزوں کی خالق ہے ان باتوں کی مانند ہو جائے گی جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے، تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَآذٍ أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۳﴾

اور جب کہ ان سے کہ کیا اتارا ہو تمہارے رب نے تو کہیں کہانیاں ہیں پہلوں کی،

لِيَحْجِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَمِنْ أَوْدَانِ الَّذِينَ

تاکہ اٹھائیں بوجھ اپنے پورے دن قیامت کے اور کچھ بوجھ ان کے جن کو

يُضِلُّونَهُمْ بِخَيْرٍ عِلْمٍ إِلَّا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿۲۴﴾ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ

بھکاتے ہیں بلا تمہیں سناہر برا بوجھ ہو تو اٹھاتے ہیں، البتہ دغا بازی کر چکے ہیں

مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَلَى اللَّهِ بَلِيًّا ثُمَّ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ

جو تھے ان سے پہلے پھر پہنچا حکم اللہ کا ان کی عمارت پر بنیادوں سے پھر گر پڑی ان پر

السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَأَتَتْهُمْ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۵﴾

چھت اوپر سے اور آیا ان پر عذاب جہاں سے ان کو خبر نہ تھی،

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءُ الَّذِينَ كُنْتُمْ

پھر قیامت کے دن رسوا کرے گا ان کو اور کہے گا کہاں ہیں میرے شریک جن پر تم کو

تَشَاقُّونَ فِيهِمْ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ

بڑی ضد تھی، بولیں گے جن کو دی گئی تھی خبر بیشک رسوائی آج کے دن

وَالشُّعْرَىٰ عَلَى الْكَافِرِينَ ۚ الَّذِينَ تَتَوَفَّيْهُمْ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي

اور بُرائی منکروں پر ہے جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اور وہ بُرا کر رہے ہیں

أَنفُسِهِمْ ۖ فَالْقَوْمَ الْآتِلُوا السَّلَامَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ

اپنے حق میں تب ظاہر کریں گے اطاعت کہ ہم تو کرتے دیتے کچھ بُرائی کیوں نہیں اللہ

عَلِيمٌ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ

خوب جانتا ہر جو تم کرتے تھے ، سو داخل ہو دروازوں میں دوزخ کے رہا کر دے گا

فِيهَا وَلَبِئْسَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ۚ

اسی میں سو کیا بُرا ٹھکانا ہے غور کرنے والوں کا۔

خلاصہ تفسیر

اور جب ان سے کہا جاتا ہے (یعنی کوئی ناواقف شخص تحقیق کے لئے یا کوئی واقف شخص امتحان کے لئے ان سے پوچھتا ہے) کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی ہے (یعنی قرآن جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا فرماتے ہیں آیا یہ صحیح ہے) تو کہتے ہیں کہ (صاحب وہ رب کا نازل کیا ہوا کہاں ہے) وہ تو تمہیں بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے (منقول) چلی آ رہی ہیں (یعنی اہل ملل پہلے سے توحید و نبوت و معاد کے مدعی ہوتے آئے ہیں ان ہی سے یہ بھی نقل کرنے لگے باقی یہ دعوے خدا کے تعلیم دیے ہوئے نہیں) نتیجہ اس رکھنے کا یہ ہو گا کہ ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے تھے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑے گا (گمراہ کرنے سے مراد یہی کہنا ہے اَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ کا کیونکہ اس سے دوسرے آدمی کا اعتقاد خراب ہوتا ہے، اور جو شخص کسی کو گمراہ کیا کرتا ہے اس گمراہ کو تو گمراہی کا گناہ ہوتا ہے اور اس گمراہ کرنے والے کو اس کی گمراہی کے سبب بن جانے کا، اس حصہ تسمیہ کو کچھ بوجھ فرمایا گیا، اور اپنے گناہ کا کامل طور پر اٹھانا ظاہر ہے) خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو یہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ بُرا بوجھ ہے (اور انہوں نے جو گمراہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی ہے کہ دوسروں کو ایسی باتیں کر کے بہکاتے ہیں، سو یہ تدبیریں حق کے مقابلہ میں نہ چلیں گی، بلکہ خود انہی پر ان کا وبال نکال خود کرے گا، چنانچہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے را نبیاء علیہم السلام کے مقابلہ اور مخالفت میں (بڑی بڑی تدبیریں کیں، سو اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیروں) کا بنا بنایا کھر جڑ بنیاد

سے دھار دیا پھر وہ ایسے کام ہوئے جیسے گویا (اوپر سے ان پر) اس گھر کی (پھٹ آپڑی ہو) یعنی جس طرح پھٹ آپڑنے سے سب دب کر رہ جاتے ہیں اسی طرح وہ لوگ بالکل خائب و خاسر ہوئے (اور غلامہ نامکانی کے) ان پر (خدا کا) عذاب ایسی طرح آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا (کیونکہ توقع تو اس تربیت کامیابی کی تھی خلافتِ توقع) ان پر نامکانی سے بڑھ کر عذاب آگیا جو کوسوں بھی ان کے ذہن میں نہ تھا کفار سابقین پر عذابوں کا آنا معلوم و معروف ہے، یہ حالت تو ان کی دنیا میں ہوئی (پھر قیامت کے دن ان کے واسطے یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرے گا اور اس میں سے ایک رسوائی یہ ہوگی کہ ان سے یہ کہے گا کہ رستم نے جو میرے شریک بنا رکھے تھے جن کے بارے میں منہم را انبیاء و اول ایمان سے لڑائی جھگڑا کرتے تھے وہ اب کہاں ہیں اس حالت کو دیکھ کر حق کے جاندار دائے کہیں گے کہ آج پوری رسوائی اور عذاب کا فرد پر ہے جن کی جان فرشتوں نے حالتِ کفر پر قبض کی تھی (یعنی آخر وقت تک کافر رہے شاید ان اہل علم کا قول بیجا میں اس لئے بیان فرمایا ہو کہ کفار کی رسوائی کا عام اور غلامیہ ہونا معلوم ہو جائے) پھر کافر لوگ (اپنے شرکار کے جواب میں) صلح کا پیغام ڈالیں گے (اور کہیں گے) کہ (شرک جو اعلیٰ درجہ کی بُرائی اور مخالفتِ حق تعالیٰ کی ہر ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اس کے مرتکب ہوتے) ہم تو کوئی بُرا کام (جس میں ادنیٰ مخالفت بھی حق تعالیٰ کی ہو) نہ کرتے تھے اس کو صلح کا مضمون اس لئے کہا گیا کہ دنیا میں شرک کا ہو کہ لفظِ یقینیہ ہے بڑے جوش و شروش سے اقرار تھا کہ قولہ تعالیٰ کہ شَاءَ اللہ مَا أَشْرَکْنَا اور شرک کا اقرار حق تعالیٰ کا اقرار تھی خصوصاً انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تو خود صریح مخالفت کے مدعی تھے وہاں اس شرک کے انکار سے مخالفت کا انکار کریں گے اس لئے اس کو صلح فرمایا اور یہ ایسا جیسا دوسری آیت میں ہے وَاللّٰہُ رَبُّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیۡنَ، حق تعالیٰ ان کے اس قول کو رد فرمائیں گے کہ کیوں نہیں بلکہ واقعی تم نے بڑے کام مخالفت کے کئے بیشک اللہ کو تم سے سب اعمال کی پوری خبر ہے سو (اچھا) جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہو جاؤ (اور) اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہو غرض (حق سے) تکبر (اور مخالفت اور مقابلہ) کرنے والوں کا وہ بُرا نتیجہ ہے یہ عذابِ آخرت کا ذکر ہو گیا پس حاصل کیا یہ ہوا کہ تم نے اپنے سے پہلے کافروں کا حالِ خسارہ و عذابِ دنیا و آخرت کا سن لیا، اسی طرح جو مدبر و مکر دین حق کے مقابلہ میں تم کر رہو ہو اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہو یہی انجام تمہارا ہو گا) :

معارف و مسائل

پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور تخلیقِ عالم میں یتما ہونے کا ذکر کر کے مشرکین کی اپنی گمراہی کا بیان تھا، ان آیات میں دوسروں کو گمراہ کرنے اور اس کے عذاب کا بیان ہوا اور اس سے پہلے ایک سوالِ قرآن کے متعلق ہے، اور اس سوال کے مخاطب یہاں تو مشرکین ہیں اور انہیں کا جائزاً جواب یہاں ذکر کر کے ان پر وعید بیان کی گئی ہے، اور پانچ آیتوں کے بعد یہی سوال مومنین متقین کو خطاب کر کے کیا گیا اور ان کا جواب اور اس پر وعدہ انعامات کا ذکر ہے۔

قرآن کریم نے یہ نہیں کھولا کہ سوال کرنے والا کون تھا، اس لئے مفسرین کے اس میں اقوال مختلف ہیں، کسی نے کافروں کو سوال کرنے والا قرار دیا، کسی نے مسلمانوں کو کسی نے ایک سوالِ مشرکین کا اور دوسرا مومنین کا قرار دیا، لیکن قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھ کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس بحث میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ سوال کس کی طرف سے تھا، دیکھنا تو جواب اور اس کے نتیجہ کا ہے جن کا قرآن نے خود بیان کر دیا ہے۔

مشرکین کی طرف سے خلاصہ جواب یہ ہے کہ انہوں نے اسی کو تسلیم نہیں کیا کہ کوئی کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا بھی ہے، بلکہ قرآن کو پچھلے لوگوں کی کہانیاں قرار دیا، قرآن کریم نے اس پر یہ وعید سنائی کہ یہ ظالم قرآن کو کہانیاں بتلا کر دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اس کا یہ نتیجہ ان کو جگتنا پڑے گا، کہ قیامت کے روز اپنے گناہوں کا پورا دبال تو ان پر پڑنا ہی ہے، جن کو یہ گمراہ کر رہے ہیں ان کا بھی کچھ دبال ان پر پڑے گا، اور پھر فرمایا کہ گناہوں کے جس بوجھ کو یہ لوگ اپنے اوپر لا رہے ہیں، وہ بہت بڑا بوجھ ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرٌ الَّذِينَ

اور کہا پرہیزگاروں کو کیا اتارا تمہارے رب نے بولے نیک بات جنہوں نے

أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارِ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ

بھلائی کی اس دنیا میں ان کو بھلائی ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے، اور کیا خیر

دَارِ الْمُتَّقِينَ ۝ جَنَّاتٌ عِدْنُ يَدْخُلُونَهَا يُجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

گھر ہے پرہیزگاروں کا، باغ ہیں ہمیشہ رہنے کے جن میں وہ جائیں گے بہتی ہیں ان کے نیچے سے

الَّذِينَ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذَلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٣﴾

ہنریں ان کے واسطے وہاں ہی جو چاہیں ایسا بدلہ دیگا اللہ پرہیزگاروں کو

الَّذِينَ تَتَوَفَّيْهُمْ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا

جن کی جان قبض کرتے ہیں فرشتے اور وہ ستھری ہیں کہتے ہیں فرشتے سلامتی تم پر جاؤ

الْجَنَّةِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٤﴾ هَلْ يَنْصَرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ

بہشت میں بدلہ ہو اس کا جو تم کرتے تھے، کیا کافر اب اس کے منتظر ہیں کہ آئیں ان پر۔

الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنَ قَبْلِهِمْ

فرشتے یا پہنچے حکم تیرے رب کا اسی طرح کیا تھا ان سے انہوں نے

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٥﴾ فَاصْبِرْ

اور اللہ نے ظلم نہ کیا ان پر لیکن وہ خود اپنا بُرا کرتے رہے، پھر پڑے ان کے

سَيِّئَاتٍ مَا عَلَيْكَ وَلَا حَاقٌ بِهِمْ مَا كَانُوا يَفْسَهُنَّ ﴿٣٦﴾

سراں کے بُرے کام اور اُلٹ پڑا ان پر جو ٹھٹھا کرتے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ شرک سے بچتے ہیں ان سے (جو قرآن کے بارے میں) کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب

نے کیا چیز نازل فرمائی ہے وہ کہتے ہیں کہ بڑی خیر اور برکت کی چیز (نازل فرمائی ہے جن لوگوں نے

نیک کام کئے ہیں) جس میں یہ قول مذکور اور تمام اعمال صالحہ آگئے (ان کے لئے اس دنیا میں بھی

بھلائی ہے) وہ بھلائی ثواب کا وعدہ و بشارت ہے) اور عالم آخرت تو (بوجہ اس کے) وہاں

اس وعدہ کا استحقاق و ظہور ہو جائے گا) اور زیادہ بہتر (اور موجب سرور) ہے اور واقعی وہ شرک سے

بچنے والوں کا اچھا گھر ہے وہ گھر (کیا ہے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں یہ داخل ہوں گے

ان باغوں کے (اشجار و عمارات کے) نیچے سے ہنریں جاری ہوں گی جس چیز کو ان کا جی چاہے گا

وہاں ان کو ملے گی (اور خاص انہی کی کیا تخصیص ہے جن کا قول اس مقام پر مذکور ہے بلکہ)

اسی طرح کا عوض اللہ تعالیٰ سب شرک سے بچنے والوں کو دے گا، جن کی روح فرشتے اس حالت

میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (شرک سے) پاک (صاف) ہوتے ہیں (مطلب یہ کہ مرتے دم تک توحید)

تکارتے ہیں اور وہ (فرشتے) کہتے جاتے ہیں السلام علیکم تم (قبض روح کے بعد) جنت میں
چلے جانا اپنے اعمال کے سبب یہ لوگ (جو اپنے کفر و عناد و جہالت پر اصرار کر رہے ہیں اور باوجود
وضوح و دلیل حق کے ایمان نہیں لاتے) تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف (اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان
کے پاس موت کے) فرشتے آجائیں یا آپ کے پروردگار کا حکم (یعنی قیامت) آجائے (یعنی کیا
موت کے وقت یا قیامت میں ایمان لاتیں گے جبکہ ایمان قبول نہ ہوگا، گو اس وقت تمام کفار بوجہ
انکشاف حقیقت کے توبہ کریں گے جیسا اصرار کفر پر یہ لوگ کر رہے ہیں) ایسا ہی ان سے پہلے جو
لوگ تھے انہوں نے بھی (کفر پر اصرار) کیا تھا اور (اصرار کی بدولت سزا یاب ہوئے) سو ان پر
اللہ تعالیٰ نے ذرا ظلم نہیں کیا، لیکن وہ آپ ہی اپنے اور پر ظلم کر رہے تھے (کہ سزا کے کام جان
کے کرتے تھے) آخر ان کے اعمال بد کی ان کو سزا میں ملیں اور جس عذاب کی خبر پائے (پر وہ
منت تھے) ان کو اس (عذاب نے) آگھیرا پس ایسا ہی تمہارا حال ہوگا۔

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عِیدَ نَا مِنْ دُونِهِ مِنْ

اور بولے شرک کرنے والے اگر چاہتا اللہ نہ ہوتا جتے ہم اس کے سوا کسی

شَیْءٍ نَّعْبُدُ وَلَا آبَاءُ وَلَا حُرْمًا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَیْءٍ عَظِيمٍ

چیز کو اور نہ ہمارے باپ اور نہ حرام ٹھہراتے ہم بدون اس کے حکم کے کسی چیز کو

كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَبَقِيَ الرُّسُلُ إِلَّا الْبَلَاءُ

اسی طرح کیا ان سے انہوں نے سوسولوں کے ذمہ نہیں مگر یہ بھادینا

الْمُسْلِمِينَ ۚ وَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ آعْبُدُوا اللَّهَ

مسلمین صاف، اور ہم نے اٹھائے ہیں ہر امت میں رسول کہ بندگی کرو اللہ کی

وَاجْتَلِبُوا الطَّاعُونَ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَن

اور پکڑا ہونے سے بہرہ کسی کو ان میں سے ہدایت کی اللہ نے اور کسی پر

حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ

ثابت ہوئی گمراہی، سو سفر کرو ملکوں میں پھر دیکھو کیسا ہوا انجام

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝۳۶ إِنَّ تَحْرِصَ عَلَى هُدَاهُمْ فَإِنَّ

جھٹلانے والوں کا، اگر تو طمع کرے ان کو راہ پر لانے کی تو

اللَّهُ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۳۵) وَأَشْمُوا

اللہ راہ نہیں دیتا جسکو بھلا تا ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار ۔ اور قسمیں کھاتے ہیں

بِاللَّهِ جَدَّ أَيُّهَا فَهِمٌ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَنْ يَمُوتُ بَلَى وَعَدًا

اللہ کی سخت قسمیں کہ نہ اٹھائے گا اللہ جو کوئی مر جائے کیوں نہیں وعدہ

عَلَيْهِمْ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۶) لَيَبْلِيَنَّ لَهُمُ

ہو چکا ہو اس پر پکا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ، اٹھائے گا تاکہ ظاہر کر دے انہیں

الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا

جس بات میں جھگڑتے ہیں اور تاکہ معلوم کر لیں کافر کہ وہ جھوٹے

كَاذِبِينَ (۳۷) إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَادْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۳۸)

تھے ۔ ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اس کو کرنا چاہیں یہی ہے کہ کہیں اس کو ہو جا تو وہ ہو جائے

خلاصہ تفسیر

۱۔ مشرک لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (بطور رضا کے یہ امر) منظور ہو تا رہے کہ ہم

غیر اللہ کی عبادت نہ کریں جو ہمارے طریقہ کے اصول میں سے ہے اور اجنبی ہشیار کی تحریم نہ کریں جو

ہمارے طریقہ کے فروع میں سے ہے مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے موجودہ اصول و فروع

کو ناپسند کرتے تو خدا کے سوا کسی چیز کی نہ ہم عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس

کے بدوان (حکم کے) کسی چیز کو حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا طرہیت

پسند ہو ورنہ ہم کو کیوں کرنے دیتے ، اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے مفہوم نہ ہوں کیونکہ

یہ یہود و مجاہدہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ (جو کافر) ان سے پہلے ہوئے ہیں ایسی ہی حرکت انہوں

نے بھی کی تھی (یعنی یہود و مجاہدات اپنے پیغمبروں سے کہتے تھے) سو پیغمبروں (کا اس سے کیا

بگڑا اور وہ جس طریق کی طرف بلا تے ہیں اس کو کیا ضرر پہنچا ان) کے ذمہ تو (احکام کا) صرف

صاف صاف پہنچا دینا ہے (صاف صاف یہ کہ دعویٰ واضح ہو اور دلیل صحیح اس پر قائم ہو

اسی طرح آپ کے ذمہ بھی یہی کام تھا جو آپ کر رہے ہیں ، پھر اگر براہِ عناد دعویٰ اور دلیل میں

غور نہ کریں تو آپ کی بلا سے) اور جس طرح ان کا معاملہ آپ کے ساتھ یعنی مجاہدہ کوئی نئی بات

نہیں اسی طرح آپ کا معاملہ ان کے ساتھ یعنی توحید و دین حق کی طرف بلانا کوئی نئی بات نہیں

بلکہ اس کی تعلیم بھی قدیم سے چلی آئی ہے چنانچہ ہم ہر امت میں (امم سابقہ سے) کوئی نہ کوئی پیغمبر
 (اس بات کی تعلیم کے لئے) بھیجتے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان (کے رستے)
 سے روکو وہ شرک و کفر ہے (بچتے ہو) اس میں اس شیا کی وہ تحریم بھی آگئی جو مشرکین اپنی رائے
 سے کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ شعبہ شرک و کفر کا تھا (سوان میں لہجئے وہ ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت
 دی روک انہوں نے حق کو قبول کر لیا) اور لہجئے ان میں وہ ہوئے جن پر گمراہی کا ثبوت ہو گیا۔

(مطلب یہ کہ کفار اور انبیاء میں یہ معاملہ اسی طرح چلا آرہا ہے، اور ہدایت و اضلال
 کے متعلق اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ہمیشہ سے یوں ہی جاری ہے کہ مجادلہ کفار کا بھی قدیم اور
 تعلیم انبیاء علیہم السلام کی بھی قدیم اور سب کا ہدایت نہ پانا بھی قدیم پھر آپ کو غم کیوں ہوا؟
 یہاں تک تسلی فرمائی گئی جس میں اخیر کے مضمون میں ان کے شبہ کا اجمالی جواب بھی ہو گیا کہ ایسی
 باتیں کرنا گمراہی ہے جس کے گمراہی ہونے کی آگے تائید اور جواب کی زیادہ توضیح ہے، یعنی
 اگر مجادلہ مع الرسل گمراہی ہونا تم کو معلوم نہ ہو (تو اچھا) زمین میں چلو پھرو پھر (آثار سے)
 دیکھو کہ پیغمبروں کے (جھٹلانے والوں کا کیسا (ہرا) انجام ہوا پس اگر وہ گمراہ نہ تھے تو ان پر
 عذاب کیوں نازل ہوا اور واقعات اتفاقہ ان کو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ خلاف عادت ہو کر
 اور انبیاء علیہم السلام کی پیشینگوئی کے بعد ہوئے اور مؤمنین اس سے بچتے رہے، پھر اس کے
 عذاب ہونے میں کیا شک ہو، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے کسی فرد کی
 گمراہی سے بھی سخت حد پہنچا تھا اس لئے آگے پھر آپ کو خطاب ہے کہ جیسے پہلے بعض لوگ
 ہوئے ہیں جن پر گمراہی قائم ہو چکی تھی، اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں سو ان کے راہ راست پر
 آنے کی اگر آپ کو تمنا ہو تو رد کیے نتیجہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت نہیں کیا کرتا
 جس کو اس شخص کے عناد کے سبب، گمراہ کرتا ہے (البتہ اگر وہ عناد کو چھوڑ دے تو ہدایت
 کر دیتا ہے، لیکن یہ عناد کو چھوڑیں گے نہیں، اس لئے ان کو ہدایت بھی نہ ہوگی) اور احضار
 و عذاب کے بارے میں اگر ان کا یہ گمان ہو کہ ہمارے معبود اس حالت میں بھی عذاب سے بچا لیں گے
 تو وہ سمجھ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں، ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا (یہاں تک ان کے پہلے شبہ
 کے جواب کی تقریر تھی، آگے دوسرے شبہ کے متعلق کلام ہے) اور یہ لوگ بڑے زور لگا لگا کر
 اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مرجاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا اور قیامت
 نہ آئے گی، آگے جواب ہے، کیوں نہیں زندہ کرے گا (یعنی ضرور زندہ کرے گا) اس وعدہ
 کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لازم کر رکھا ہے، لیکن اکثر لوگ ربا و جود قیام دلیل صیح کے اس پر
 یقین نہیں لاتے (اور یہ دوبارہ زندہ کرنا اس لئے ہوگا) تاکہ (دین کے متعلق) جس چیز میں

یہ لوگ دنیا میں اختلاف کیا کرتے تھے (اور انبیاء کے فیصلہ سے راستہ پر نہ آتے تھے) انکے رد و بر اس کی حقیقت کا (بطور معائنہ کے) اظہار کر دے اور تاکہ (اس اظہار حقیقت کے وقت) کافر لوگ (پورا) یقین کر لیں کہ واقعی وہی جھوٹے تھے (اور انبیاء و مؤمنین سچے تھے) پس قیامت کا آنا یقینی اور عذاب سے فیصلہ ہونا ضروری ہے، یہ جواب ہو گیا لَا يَبْعَثُ اللَّهُ كَا اور جو نہ وہ لوگ قیامت کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ مرکز زندہ ہونا ان کے خیال میں کسی کے بس میں نہ تھا، اس لئے آگے اپنی قدرت کاملہ کے اثبات سے ان کے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہماری قدرت ایسی عظیم ہے کہ ہم جس چیز کو (پیدا کرنا) چاہتے ہیں (ہیں اس میں کچھ محنت مشقت کرنا نہیں پڑتی) بس اس سے ہمارا تناسبی کہنا (کافی) ہوتا ہے کہ تو (پیدا) ہو جا بس وہ (موت) ہو جاتی ہے (تو اتنی بڑی قدرت کاملہ کے رد و بر بے جان چیزوں میں دوبارہ جان کا پڑ جانا کو نسا دشوار ہے، جیسے پہلی بار ان میں جان ڈال چکے ہیں اب دونوں شبہوں کا پورا جواب ہو چکا واللہ الحمد)

معارف و مسائل

ان کفار کا پہلا مشبہ تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اگر ہمارا کفر و شرک اور ناجائز کام پسند نہیں تو وہ ہمیں زبردستی اس سے روک کیوں نہیں دیتے۔

اس شبہ کی بیہودگی واضح تھی، اس لئے اس کا جواب دینے کے بجائے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی پر اکتفا کیا گیا کہ ایسے بیہودہ سوالات سے آپ غمگین نہ ہوں، اور شبہ کی بیہودگی کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم دنیا کا نظام ہی اس بنیاد پر قائم فرمایا ہے کہ انسان کو بالکل مجبور نہیں رکھا گیا، ایک قسم کا اختیار اس کو دیا گیا، اسی اختیار کو وہ اللہ کی اطاعت میں استعمال کرے تو ثواب اور نافرمانی میں استعمال کرے تو عذاب کے وعدے اور وعید فرمائے، اسی کے نتیجہ میں قیامت اور حشر و نشر کے سارے ہنگامے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ سب کو مجبور کر کے اپنی اطاعت کرائیں تو کس کی مجال تھی کہ اطاعت سے باہر جاتا، مگر بتقاضائے حکمت مجبور کر دینا درست نہ تھا، اس لئے انسان کو اختیار دیا گیا، تو اب کافروں کا یہ کہنا کہ اگر اللہ کو ہمارا طریقہ پسند نہ ہوتا تو ہمیں مجبور کیوں نہ کر دیتے ایک احمقانہ اور معاندانہ سوال ہے۔

کیا ہندوستان پاکستان میں بھی **وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا**، اس آیت سے نیز دوسری آیت **وَأَنَّ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ** سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے علاقوں میں بھی اللہ کے پیغمبر ضرور آئے ہوں گے

خواہ وہ یہیں کے باشندے ہوں یا کسی دوسرے ملک میں ہوں اور ان کے نائب اور مبلغ یہاں پہنچے ہوں اور آیت لَنْتَنِي رَقُومًا مَّا آتَاهُمْ مِّنْ نَّيِّبٍ سِوَايَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جس امت کی طرف بھیجے گئے ہیں ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا، اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بظاہر وہ قوم عرب ہے جو آپ کی بعثت و نبوت کی سب سے پہلے مخاطب ہوئی، کہ ان میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی رسول نہیں آیا تھا، اسی لئے ان لوگوں کا لقب قرآن کریم میں اُمِّيِّتَيْنِ رکھا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باقی دنیا میں بھی آپ سے پہلے کوئی رسول نہ آیا ہو، واللہ اعلم

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا إِلَى اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنَسُودَنَّهُمْ

اور جنہوں نے گھر چھوڑا اللہ کے واسطے بعد اس کے کہ ظلم اٹھایا البتہ ان کو ہم ٹھکانا

فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَا جَزَاءَ لَآخِرَةٍ أَكْبَرُ مَا كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾

دیں گے دنیا میں اچھا اور ثواب آخرت کا تو بہت بڑا ہو اگر ان کو معلوم ہوتا،

الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۴۲﴾

جو ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسہ کیا۔

خلاصہ تفسیر

اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن (مکہ) چھوڑ دیا (اور حبشہ چلے گئے) بعد اس کے کہ ان پر کفار کی طرف سے ظلم کیا گیا رکیز کہ ایسی بُھوری میں وطن چھوڑنا بڑا شاق گذرتا، ہم ان کو دنیا میں شرور اچھا ٹھکانا دیں گے (یعنی ان کو مدینہ پہنچا کر خوب امن و راحت دیں گے چنانچہ بعد چندے مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا اور اس کو وطن اصلی قرار دیا گیا، اس لئے اس کو ٹھکانا کہا اور ہر طرح کی وہاں ترقی ہوئی اس لئے خسنہ کہا گیا اور حبشہ کا قیام عارضی تھا اس لئے اس کو ٹھکانا نہیں فرمایا، اور آخرت کا ثواب (اس سے) بدرجہا بڑا ہے (کہ خیر بھی ہے اور باقی بھی) کاش (اس اجر آخرت کی) ان (بے خبر کافروں) کو (بھی) خبر ہوئی (اور اس کے حاصل کرنے کی رغبت سے مسلمان ہو جاتے) وہ (مہاجرین ان وعدوں کے اس لئے مستحق ہیں کہ وہ) ایسے ہیں جو (ناگوار واقعات پر) صبر کرتے ہیں (چنانچہ وطن کا چھوڑنا گو ان کو ناگوار ہے، لیکن بدون اس کے دین پر عمل نہیں کر سکتے تھے، دین کے لئے وطن چھوڑا،

اور صبر کیا، اور (وہ ہر حال میں) اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (وطن چھوڑنے کے وقت یہ خیال نہیں کرتے کہ کھائیں پیئیں گے کہاں سے) :

معارف ومسائل

تشریح و تفسیر | الَّذِينَ هَاجَرُوا، ہجرت سے مشتق ہے، ہجرت کے اخوی معنی ترک وطن کے ہیں، ترک وطن جو اللہ کے لئے کیا جائے وہ اسلام میں بڑی طاعت و

عبادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْهَجْرَةُ كَقَدِيمِ مَا كَانَ قَبْلَهَا، یعنی ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو انسان نے ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔

یہ بہت بعض صورتوں میں فرست دیا جب اور بعض صورتوں میں سبب و انفسل پہلی ہے، اس کے مفصل احکام تو سورہ نسا کی آیت، ہر، اَلَمْ تَرَ كَيْفَ اَرْسَلَ اللّٰهُ وَاِيسَعٰى قَتْلًا جَرَوْا فَيَبَا كے تحت میں بیان ہو چکے ہیں، اس جگہ صرف ان وعدوں کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے کئے ہیں۔

کیا ہجرت دنیا میں بھی فراموشی آیات مذکورہ میں چند شرائط کے ساتھ ہجرتین کے لئے دو عظیم الشان عیش کا سبب ہوتی ہے؟ | دندے کئے گئے ہیں، اول تو دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دینے کا، دوسرے آخرت کے بے حساب ثواب عظیم کا، دنیا میں اچھا ٹھکانا ایک نہایت جامع لفظ ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ ہاجر کو سکونت کے لئے مکان اور پڑوسی اچھے ملیں، یہ بھی داخل ہے کہ اس کو رزق اچھا ملے، دشمنوں پر فتح و غلبہ نصیب ہو، عام لوگوں کی زبان پر ان کی تعریف اور بھلائی ہو، عزت و شرف ملے جو ان کے خاندان اور اولاد تک چلے (قرطبی)

نسلوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت و شرف بخشا، یہ تو دنیا میں ہونے والی چیزیں تھیں جو ہو چکیں اور آخرت کا وعدہ پورا ہونا بھی یقینی ہے، لیکن تفسیر بحر محیط میں ابو حیان کہتے ہیں:

<p>”الَّذِينَ هَاجَرُوا كَالْفُطُورِ الْمَاجِرِينَ“ عالم کے لئے عام اور شامل ہی کسی بھی غلط اور زمانہ کے ہاجرینوں، اس لئے یہ لفظ ہاجرین اولین کو بھی شامل ہو اور قیامت</p>	<p>وَالَّذِينَ هَاجَرُوا عَمَّا فِي الْمَنَاجِرِ كَالْمَنَاجِرِ كَالْمَنَاجِرِ فَيَسْمَلُ أَوْلَهُمْ وَأَخْرَهُمْ (ص ۱۴۹۲، ۵۷۰)</p>
---	--

نیک اللہ کے لئے ہر ہجرت کرنے والا اس میں داخل ہے۔

عام تفسیر کی ضابطہ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آیت کا شان نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ اور خاص جماعت ہو مگر اعتبار عموم لفظ ہوتا ہے، اس لئے اس وعدہ میں تمام دنیا کے اور ہر زمانہ کے ہاجرین بھی شامل ہیں، اور یہ دونوں وعدہ تمام ہاجرین کے لئے پورا ہونا امر یقینی ہے۔

اس طرح کا ایک وعدہ ہاجرین کے لئے سورہ نسا کی اس آیت میں کیا گیا ہے وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرْتَدًّا كَثِيرًا وَسَعَةً، جس میں وسعت مکانی اور فراخی نیش خاص طور سے موعود ہیں، مگر قرآن کریم نے ان وعدوں کے ساتھ ہاجرین کے کچھ اوصاف اور ہجرت کی کچھ شرائط بھی بیان فرمائی ہیں، اس لئے ان وعدوں کے مستحق وہی ہاجرین ہو سکتے ہیں جو ان اوصاف کے حامل ہوں اور جنہوں نے مطلوبہ شرائط پوری کر دی ہوں۔

ان میں سب سے پہلی شرط تو فی اللہ کی ہے، یعنی ہجرت کرنے کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو، اس میں دنیاوی منافع تجارت، ملازمت وغیرہ اور نفسانی فوائد پیش نظر نہ ہوں، دوسری شرط ان ہاجرین کا مظلوم ہونا ہے، مَنْ بَعْدَ مَا ظَلَمُوا، تیسرا وصف ابتدائی تکالیف و مصائب پر صبر اور ثابت قدم رہنا ہے، الَّذِينَ صَبَرُوا، چوتھا وصف تمام مادی تدبیروں کا اہتمام کرتے ہوئے بھی بھروسہ صرف اللہ پر رکھنا ہے، کہ فزع و نصرت اور ہر کامیابی صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، وَ عَلَىٰ رَبِّكُم يَتَوَكَّلُونَ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی مشکلات و تکالیف تو ہر کام میں ہوا ہی کرتی ہیں، ان کو عبور کرنے کے بعد بھی اگر کسی مہاجر کو اچھا ٹھکانا اور اچھے حالات نہیں ملے تو قرآن کے وعدے میں شبہ کرنے کے بجائے اپنی نیت و اخلاص اور اس حسن عمل کا جائزہ لے جس پر یہ وعدے کئے گئے ہیں تو اس کو معلوم ہوگا کہ قصور اپنا ہی تھا، کہیں نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، کہیں صبر و ثبات اور توکل کی کمی ہوتی ہے۔

ترک وطن اور ہجرت کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام

قربلی نے بحوالہ ابن عربی لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی تو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے، پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کو ہجرت کہتے ہیں، اور اس کی چھ قسمیں ہیں۔

اول، یعنی دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف جانا یہ قسم مگر عہد رسالت میں بھی فرض تھی، اور قیامت تک بشرط استطاعت و قدرت فرض ہے (جبکہ دار الکفر میں اپنے جان و مال اور آبرو کا امن نہ ہو، یا دینی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ ہو) اس کے باوجود دار الحرب میں مقیم رہا تو گناہ گار ہوگا۔

دوسرا دار البدعت سے نکل جانا، ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں، جس میں سلف صالحین پر سب و شتم کیا جاتا ہو، ابن عربی یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اگر تم کسی منکر کا ازالہ نہیں کر سکتے تو تم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علیحدہ ہو جاؤ، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے

وَإِذَا زَايَلْتُمْ يُنَادُوا فَكُنْ مُنْجِبًا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ عَلِيمِينَ

تیسرا سفر وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا، کیونکہ طلب حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کے لئے سفر، یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے کہ انسان جس جگہ دشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے، تاکہ اس خطرہ سے نجات ہو، یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا، جبکہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملک شام کی طرف روانہ ہوئے اور فرمایا

إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى سَبَئٍ، ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا، فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ

پانچواں سفر آب و ہوا کی خرابی اور امراض کے خطرہ سے بچنے کے لئے ہے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا، کیونکہ شہری آب و ہوا ان کو موافق نہ تھی، اسی طرح حضرت فاروق اعظم نے ابو عبیدہؓ کو حکم بھیجا تھا کہ دار الخلافہ اُردن سے منتقل کر کے کسی سہل مرتفع پر لے جائیں، جہاں آب و ہوا خراب نہ ہو۔

لیکن یہ اس وقت میں ہے جب کسی مقام پر طاعون یا وبا کی امراض پھیلے ہوئے نہ ہوں

اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ تو وہاں سے بھاگیں نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں، جیسا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو سفر شام کے وقت پیش آیا، کہ سرحد شام پہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملک شام میں طاعون پھیل چکا ہے، تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردد پیش آیا، صحابہ کرام سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

تَبَّ كَيْسٍ نَخِطَ فِي طَاعُونٍ يَحِيلُ جَائِعًا
اور تم وہاں موجود ہو تو اب وہاں سے نہ
نکلو اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں ہو
طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل

نہ ہو۔

إِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا
فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا وَإِذَا وَقَعَ
بِأَرْضٍ وَلَسْتُمْ بِهَا فَلَا
تَهْبِطُوا عَلَيْهَا رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

وقال حديث حسن صحيح

اس وقت فاروق اعظمؓ نے حکم حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلہ کو لے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث شریف کے اس حکم میں ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس جگہ مقیم ہیں جہاں کوئی وبا پھیل چکی ہے یہاں کے لوگوں میں وبائی جراثیم کا موجود ہونا ظن غالب ہے، وہ اگر یہاں سے بھاگیں گے تو جس میں یہ مادہ وبائی سرایت کر چکا ہے وہ تو بچے بچا نہیں اور جہاں یہ جائے گا وہاں کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے، اس لئے یہ حکیمانہ فیصلہ فرمایا۔

پہٹا سفر اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے، جب کوئی شخص کسی مقام میں چوروں اڈاکوؤں کا خلاء محسوس کرے تو وہاں سے منتقل ہو جائے، شریعت اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ تین قسمیں تو اس ترک وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو، اور جو سفر کسی چیز کی طلب و جستجو کے لئے کیا جائے اس کی تو قسمیں ہیں:-

۱۔ سفر عبرت: یعنی دنیا کی سیاحت و سفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرت کاملہ کا اور اقوام سابقہ کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے، قرآن کریم نے ایسے

سفر کی ترغیب دی ہے: فَلَمَّا كَسَبْتُمْ رُؤَا فِي الْأَمْثَالِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ، حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے تھا۔

إِنَّكَ الَّذِي كَرَّ لَتَبَيْنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ وَلَحَدَّ بِهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۴۴﴾

تجھ پر یادداشت کہ تو کھول لئے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے تاکہ وہ غور کریں

خلاصہ تفسیر

اور یہ منکر لوگ جو آپ کی رسالت و نبوت کا اس بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ آپ بشر اور انسان ہیں، اور نبی و رسول ان کے نزدیک کوئی انسان و بشر نہ ہونا چاہتے، یہ ان کا جاہلانہ خیال ہی، کیونکہ ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف آدمی ہی رسول بنا کر معجزات اور کتابیں دے کر بھیجے ہیں کہ ان پر وحی بھیجا کرتے تھے (تو اے مکہ والو مشرکین) اگر تم کو علم نہیں تو دوسرے اہل علم سے پوچھ دیجو جن کو انبیاء سابقین کے حالات کا علم ہو اور وہ تمہارے خیال میں بھی مسلمانوں کی طرفدار ہی نہ کریں، اور اسی طرح آپ کو بھی رسول بنا کر، آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو ہدایت آپ کے واسطے ہے، لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں وہ ہدایات آپ ان کو واضح کر کے سمجھا دیں اور تاکہ وہ ان میں غور و فکر کیا کریں۔

معارف و مسائل

روح المعانی میں ہے کہ اس آیت نازل ہونے کے بعد مشرکین نے اپنے قاصد مدنیہ طیبہ کے یہود کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجے کہ کیا یہ بات واقعی ہے کہ پہلے بھی سب انبیاء جنس بشر و انسان سے ہوتے آئے ہیں۔

اگرچہ لفظ اہل الذکر میں اہل کتاب اور مؤمنین سب داخل تھے مگر یہ ظاہر ہے کہ مشرکین کا اہلینان غیر مسلموں ہی کے بیان سے ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ خود رسول کریم کی بات پر مطمئن نہیں تھے، تو دوسرے مسلمانوں کی بات کیسے مان سکتے تھے۔

أَهْلُ الذِّكْرِ، لفظ ذکر چند معانی کے لئے استعمال ہوا ہے ان میں ایک معنی علم کے بھی ہیں، اسی مناسبت سے قرآن کریم میں تو رات کو بھی ذکر فرمایا ہے وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْضِ الذِّكْرِ اور قرآن کریم کو بھی ذکر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ اس کے بعد والی آیت میں أَمْزَلْنَا لَكَ الذِّكْرَ میں قرآن مراد ہے، اس لئے اہل الذکر کے لفظی معنی اہل علم کے ہوئے، اور یہاں اہل علم سے کون لوگ مراد ہیں، اس میں ظاہر یہ ہے کہ علمائے اہل کتاب یہود و نصاریٰ مراد ہیں، یہ قول ابن عباس، حسن، السدی وغیرہ کا ہے، اور بعض حضرات نے اس جگہ بھی ذکر سے قرآن مراد لے کر اہل الذکر کی تفسیر اہل قرآن سے کی ہے، اس میں زیادہ واضح بات

رمانی، زبانت، ازہری کی ہے، وہ کہتے ہیں المراد باہل الذکر علماء اخبار الاہم السالفة
کائنات من کان خالذ کر بمعنی الحفظ کا ذہن قیل اسألوا المطالعین علی اخبار الاہم
یصلو کہم بن لک، اس تحقیق کی بناء پر اس میں اہل کتاب بھی داخل ہیں اور اہل سران بھی۔

یہ نکات کے معنی محروفت ہیں اور مراد اس سے یہاں چیزات ہیں، زبور، دراصل زبورۃ
کی جمع ہے جو لوہے کے بڑے ٹکڑوں کے لئے بولا جاتا ہے، اَلتَّوْرٰی زُبْرًا حَسْبُیْ، ٹکڑوں کو
جوڑنے کی مناسبت سے لکھنے کو زبور کہا جاتا ہے، اور لکھی ہوئی کتاب کو زبور اور زبور بولتے ہیں
یہاں مراد اس سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس میں تورات، انجیل، زبور، قرآن سب داخل ہیں۔

امۃ مجتہدین کی تقلید | آیت مذکورہ کا یہ جملہ فَسَلُّوْا اَهْلَ الدِّیْنِ کُرٰیٰنَ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ،
غیر مجتہد پر واجب ہے | اس جگہ اگرچہ ایک خاص مضمون کے بارے میں آیا ہے، مگر الفاظ عام ہیں

جو تمام معاملات کو شامل ہیں، اس لئے قرآنی اسلوب کے اعتبار سے درحقیقت یہ اہم ضابطہ ہے
جو عقلی بھی ہے نقلی بھی کہ جو لوگ احکام کو نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں، اور
نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، یہ قرآن
کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

امت میں عہد صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے
منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے، کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتویٰ لے کر عمل
کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن و حدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ
ان دلائل کو بھی اپنی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی
صلاحیت تو ہے نہیں، اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کس جاننے والے کے اعتماد پر

کس حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں
کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، البتہ وہ علماء جو خود قرآن و حدیث کو اور مواقع اجتماع کو
سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان کو ایسے احکام میں جو قرآن و حدیث میں صریح اور واضح طور پر

مذکور ہیں اور علماء صحابہ و تابعین کے درمیان ان مسائل میں کوئی اختلاف بھی نہیں ان احکام میں
وہ علماء براہ راست قرآن و حدیث اور اجماع پر عمل کریں، ان میں علماء کو کسی مجتہد کی تقلید
کی ضرورت نہیں، لیکن وہ احکام و مسائل جو قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور نہیں، یا جن میں

آیات قرآن اور روایات حدیث میں بظاہر کوئی تعارض نظر آتا ہے، یا جن میں صحابہ و تابعین کے
درمیان قرآن و سنت کے معنی متعین کرنے میں اختلاف پیش آیا ہے، یہ مسائل و احکام محل
اجتہاد ہوتے ہیں، ان کو اصطلاح میں مجتہد فیہ مسائل کہا جاتا ہے، ان کا حکم یہ ہے کہ جن عالم

کو درجہ اجتہاد حاصل نہیں اس کو بھی ان مسائل میں کسی امام مجتہد کی تقلید ضروری ہے، مگر اپنی ذاتی رائے کے بھروسہ پر ایک آیت یا روایت کو ترجیح دے کر اختیار کرنا اور دوسری آیت یا روایت کو مرجوح قرار دے کر چھوڑ دینا اس کے لئے جائز نہیں۔

اسی طرح جو احکام قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور نہیں ان کو قرآن و سنت کے بیان کردہ اصول سے نکالنا اور ان کا حکم شرعی متعین کرنا یہ بھی اپنی مجتہدین امت کا کام ہے جن کو عربی زبان عربی لغت اور محاورات اور طرق استعمال کا نیز قرآن و سنت سے متعلقہ تمام علوم کا معیاری علم اور ورع و تقویٰ کا اونچا مقام حاصل ہو، جیسے امام اعظم ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمد بن حنبلؒ یا اوزاعیؒ، فقہ ابوالبیہؒ وغیرہ، جن میں حق تعالیٰ نے قرب زمانہ نبوت اور صحبت صحابہ و تابعین کی برکت سے شریعت کے اصول و مقاصد سمجھنے کا خاص ذوق اور منصوص احکام سے غیر منصوص کو قیاس کر کے حکم نکالنے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا۔ ایسے مجتہد فیہ مسائل میں عام علماء کو بھی ائمہ مجتہدین میں سے کسی کی تقلید لازم ہے، ائمہ مجتہدین کے خلاف کوئی نئی رائے اختیار کرنا خطا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امت کے اکابر علماء محدثین و فقہاء امام غزالی، رازی، ترمذی، طحاوی، مزنی، ابن ہمام، ابن قدامہ اور اسی معیار کے لاکھوں علماء سلف و خلف باوجود علوم عربیت و علوم شریعت کی اعلیٰ مہارت حاصل ہونے کے ایسے اجتہادی مسائل میں ہمیشہ ائمہ مجتہدین کی تقلید ہی کے پابند رہے ہیں، سب مجتہدین کے خلاف اپنی رائے سے کوئی فتویٰ دینا جائز نہیں تھا البتہ ان حضرات کو علم و تقویٰ کا وہ معیاری درجہ حاصل تھا، کہ مجتہدین کے اقوال و آراء کو قرآن و سنت کے دلائل سے جانچتے اور پرکھتے تھے، پھر ائمہ مجتہدین میں جس امام کے قول کو وہ کتاب و سنت کے ساتھ اقرب پاتے، اس کو اختیار کر لیتے تھے، مگر ائمہ مجتہدین کے مسلک سے خروج اور ان سب کے خلاف کوئی رائے قائم کرنا ہرگز جائز نہ جانتے تھے، تقلید کی اہل حقیقت اتنی ہی ہے۔

اس کے بعد روز بروز علم کا معیار گھٹتا گیا، اور تقویٰ و خدا ترسی کے بجائے اغراض نفسانی غالب آنے لگیں، ایسی حالت میں اگر یہ آزادی دی جائے کہ جس مسئلہ میں چاہیں کسی ایک امام کا قول اختیار کر لیں اور جس میں چاہیں کسی دوسرے کا قول لے لیں تو اس کا لازمی اثر یہ ہونا تھا کہ لوگ اتباع شریعت کا نام لے کر اتباع ہوا میں مبتلا ہو جائیں، کہ جس امام کے قول میں اپنی غرض نفسانی پوری ہوتی نظر آئے اس کو اختیار کر لیں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا کوئی دین و شریعت کا اتباع نہیں ہوگا، بلکہ اپنی اغراض و اہواء کا اتباع ہوگا، جو باجماع امت حرام ہے، علامہ شامی نے موافقات میں اس پر بڑی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور ابن تیمیہ نے بھی

عام تقلید کی مخالفت کے باوجود اس طرح کے اتباع کو اپنے قیامی میں باجماع امت حرام کہا ہے، اس لئے متاخرین فقہاء نے یہ ضروری سمجھا کہ عمل کرنے والوں کو کسی ایک ہی امام مجتہد کی تقلید کا پابند کرنا چاہئے، یہیں سے تقلید شخصی کا آغاز ہوا جو درحقیقت ایک انتظامی حکم ہے، جس سے دین کا انتظام قائم رہے اور لوگ دین کی آڑ میں اتباع ہوائی کے شکار نہ ہو جائیں، اس کی مثال بعینہ وہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے باجماع صحابہ قرآن کے سب سے اہم احرف (یعنی سات لغات) میں سے صرف ایک لغت کو مخصوص کر دینے میں کیا، اگرچہ ساتوں لغات قرآن ہی کے لغت تھے، ہر سبیل امین کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق نازل ہوئے مگر جب قرآن کریم عجم میں پھیلا اور مختلف لغات میں پڑ بنے سے تحریف قرآن کا خطرہ محسوس کیا گیا تو باجماع صحابہ مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ صرف ایک ہی لغت میں قرآن کریم لکھا اور پڑھا جائے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اسی ایک لغت کے مطابق تمام مصاحف لکھوا کر اطراف عالم میں بھجوائے، اور آج تک پوری امت اسی کی پابند ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے لغات حق نہیں تھے، بلکہ انتظام دین اور حفاظت قرآن از تحریف کی بناء پر صرف ایک لغت اختیار کر لیا گیا، اسی طرح ائمہ مجتہدین سب حق ہیں ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لئے معین کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس امام معین کی تقلید کسی نے اختیار کی ہے اس کے نزدیک دوسرے ائمہ قابل تقلید نہیں، بلکہ اپنی صواب دید اور اپنی سہولت جس امام کی تقلید میں دیکھی اس کو اختیار کر لیا، اور دوسرے ائمہ کو بھی اسی طرح واجب الاحترام سمجھا۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیمار آدمی کو شہر کے حکیم اور ڈاکٹر دول میں سے کسی ایک کو اپنی علاج کے لئے متعین کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ بیمار اپنی رائے سے کبھی کسی ڈاکٹر سے پوچھ کر دوا استعمال کرے کبھی کسی دوسرے سے پوچھ کر یہ اس کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے، وہ جب کسی ڈاکٹر کا انتخاب اپنے علاج کے لئے کرتا ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسرے ڈاکٹر ماہر نہیں، یا ان میں علاج کی صلاحیت نہیں۔

حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی جو تقسیم امت میں قائم ہوئی، اس کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی، اس میں فرقہ بندی اور گروہ بندی کا رنگ اور باہمی جدال و شقاق کی گرم بازار کی کوئی دین کا کام ہے نہ کبھی اہل بصیرت علماء نے اسے اچھا سمجھا ہے، بعض علماء کے کلام میں علمی بحث و تحقیق نے مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا، اور بعد میں طعن و طنز تک نوبت آگئی، پھر جابلانہ جنگ و جدال نے وہ نوبت پہنچا دی جو آج عموماً دینداری اور مذہب پسندی کا نشان بن گیا، فانی اللہ المشتکی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ علیٰ اعظم

تفسیر: مسئلہ تقلید و اجتہاد پر جو کچھ یہاں لکھا گیا وہ اس مسئلہ کا بہت مختصر خلاصہ ہے، جو عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لئے کافی ہے، عالمانہ تحقیقات و تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل موجد ہیں خصوصاً کتاب الموافقات علامہ شاطبی جلد رابع باب الاجتہاد، اور علامہ سیف الدین آمری کی کتاب احکام الاحکام جلد ثالث القاعدۃ الثالثۃ فی المجتہدین، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب جمعۃ اللہ البانہ اور رسالہ عقد الجید اور آخر میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب الاقتصاد فی التقليد والاجتہاد، اس مسئلے میں خاص طور سے قابل دید ہیں، اہل علم ان کی طرف مراجعت فرمائیں۔

قرآن فہمی کے لئے حدیث رسول ضروری ہے، حدیث کا انکار در قرآن کا انکار ہے

وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الَّذِي كُنَّا نُبَيِّنُ لِلنَّاسِ، اس آیت میں ذکر سے مراد باتفاق تشرآن کریم ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں مامور فرمایا ہے کہ آپ قرآن کی نازل شدہ آیات کا بیان

اور وضاحت لوگوں کے سامنے کر دیں، اس میں اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے حقائق و معارف اور احکام کا صحیح سمجھنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے، اگر ہر انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو حسب منشاء خداوندی سمجھے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان و توضیح کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوتا، علامہ شاطبی نے موافقات میں پوری تفصیل سے ثابت کیا ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کی پوری کتاب اللہ کا بیان ہے، کیونکہ تشرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا ہے، وَأَنْتَ لَاصِلٌ خَلْقٍ عَظِيمٍ، اور حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس خلق عظیم کی تفسیر یہ فرمائی کہ كَانَ جُثْلُهُ الْقُرْآنَ، اس کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی کوئی قول و فعل ثابت ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں، لیکن تو ظاہری طور پر کسی آیت کی تفسیر و توضیح ہوتے ہیں، جن کو عام اہل علم جانتے ہیں، اور لیکن جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بطور وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ حسب تصریح قرآنی آپ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے وَمَا يَنْهَىٰ عَنْ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عبادات، معاملات، اخلاق، عادات سب کی سب بدھ وحی خداوندی اور بحکم تشرآن ہیں، اور جہاں کہیں آپ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا ہے تو بالآخر وحی الہی سے یا اس پر کوئی نیکر نہ کرنے سے اس کی تصحیح اور پھر تائید کر دی جاتی ہے، اس لئے وہ بھی بحکم وحی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد جنت قرآن کریم کی تفسیر بیان کو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۃ تجمہ وغیرہ کی متعدد آیات میں تعلیم کتاب کے الفاظ سے اس مقصد جنت کو ذکر کیا گیا ہے، اب وہ ذخیرہ حدیث جس کو صحابہ و تابعین سے لے کر متاخرین محدثین تک امت کے بالکمال افراد نے اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت کر کے امت تک پہنچایا ہے، اور اس کی پیمائش میں عمریں صرف کر کے روایات حدیث کے درجے قائم کر دیئے ہیں، اور جس روایت کو بحیثیت سند اس درجہ کا نہیں پایا کہ اس پر احکام شرعیہ کی بنیاد رکھی جاسے، اس کو ذخیرہ حدیث سے الگ کر کے صرف ان روایات پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں جو علم ہجر کی تنقیدوں اور تحقیقات کے بعد صحیح اور قابل اعتماد ثابت ہوئی ہیں۔

اگر آج کوئی شخص اس ذخیرہ حدیث کو کسی جیلے بہانے سے ناقابل اعتماد کہتا ہے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی کہ صحابہ قرآن کو بیان نہیں کیا، یا یہ کہ آپ نے تو بیان کیا تھا مگر وہ قائم و محفوظ نہیں رہا، یہ دونوں قرآن بحیثیت معنی کے محفوظ نہ رہا، جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ رکھی ہے، **وَإِنَّا لَنَحْفِظُوكَ**، اس کا یہ دعویٰ اس نص قرآن کے خلاف ہے، اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص سنت رسول کو اسلام کی محبت ماننے سے انکار کرتا ہے، وہ درحقیقت قرآن ہی کا منکر ہے، نعوذ باللہ

أَفَاَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ

سو کیا نڈر ہو گئے وہ لوگ جو بُرے فریب کرتے ہیں اس سے کہ دھنسا دیوے اللہ ان کو

الْأَرْضِ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۴۵﴾

زمین میں یا آپہنچے ان پر عذاب جہاں سے خبر نہ رکھتے ہوں

أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿۴۶﴾ أَوْ

یا پکڑے ان کو چلتے پھرتے سو وہ نہیں ہیں عاجز کرنے والے

يَأْخُذَهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۴۷﴾

پکڑے ان کو ڈرانے کے بعد، سو تمہارا رب بڑا نرم ہے مہربان

خلاصہ تفسیر

جو لوگ دین حق کے باطل کرنے کو، بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں کہ کہیں اس میں شبہ نہ
اعتراض نہ نکالتے ہیں اور حق کا انکار کرتے ہیں کہ ضلال ہے کہیں دوسروں کو روکتے ہیں کہ ضلال
ہے کیا ایسے لوگ (یہ کارروائیاں کفر کی کرکے) پھر بھی اس بات سے بے فکر بیٹھے ہوئے ہیں
کہ اللہ تعالیٰ ان کو دان کے کفر کے وبال میں، زمین میں غرق کر دے، یا ان پر ایسے موقع سے عذاب
آپڑے جہاں ان کو گمان بھی نہ ہو (جیسے جنگ بدر میں ایسے بے سرو سامان مسلمانوں کے ہاتھ سے
ان کو سزا ملی کہ کہیں ان کو اس کا احتمال عقل بھی نہ ہو تا کہ یہ ہم پر غالب آسکیں گے) یا ان کو چلتے پھرتے
رکسی آفت میں (جیسے کوئی مرض ہی دفعۃً آکھڑا ہو) سوداگران امور میں سے کوئی امر ہو جاتا
تو یہ لوگ خدا کو ہر ادبھی نہیں سمجھتے یا ان کو گھٹاتے گھٹاتے پکڑے (جیسے قحط و بار پڑے اور
تدریجاً خاتمہ ہو جائے، یعنی نڈر ہونا نہیں چاہتے، خدا کو سب قدرت ہے، مگر مہلت جو دوسری
ہے) سو اس کی وجہ یہ ہے کہ (تمہارا رب شفیق مہربان بڑا ہے) اس لئے مہلت دی ہے کہ اب بھی
سمجھ جاؤ اور فلاح اور نجات کا طریق اختیار کر لو۔

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں کفار کو عذاب آخرت سے ڈرایا گیا تھا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَخْزِيهِمْ
ان آیات میں ان کو اس سے ڈرایا گیا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا
میں بھی اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ جس زمین پر بیٹھے ہو اسی کے اندر و فساد دینے جاؤ، یا اور
کسی بے گمان راستہ سے اللہ کے عذاب میں پکڑے جاؤ، جیسے غزوہ بدر میں ایک ہزار سپاہ اور
مسلم لوہو انوں کو چند بے سرو سامان مسلمانوں کے ہاتھ سے ایسی سزا ملی جس کا ان کو کہیں دُور
گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چلتے پھرتے کسی عذاب الہی میں پکڑے جاؤ کہ کوئی
بیماری جان لیوا آکھڑی ہو، یا کسی اونچی جگہ سے گر کر یا کسی سخت چیز سے ٹکرا کر ہلاک ہو جاؤ، اور
عذاب کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دفعۃً عذاب نہ آئے مگر مال اور صحت اور تندرستی اور اسباب
راحت و سکون گھٹتے چلے جائیں، اسی طرح گھٹاتے گھٹاتے اس قوم کا خاتمہ ہو جائے۔

لفظ تخوف جو اس آیت میں آیا ہے لفظ ہر خوف سے مشتق ہے، اور بعض حضرات مفسرین
نے اسی معنی کے اعتبار سے یہ تفسیر کی ہے کہ ایک جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے تاکہ دوسری
جماعت ڈر جائے، اسی طرح دوسری جماعت کو عذاب میں پکڑا جائے جس سے تیسری جماعت

ڈر جائے، یوں ہی ڈراتے ڈراتے سب کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر مفسر القرآن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؓ وغیرہ ائمہ تفسیر نے یہاں لفظ تنقوص کو تنقص کے معنی میں لیا ہے، اور اسی معنی کے اعتبار سے ترجمہ گھٹاتے گھٹاتے کیا گیا ہے۔

حضرت سعید بن مسیبؓ نے فرمایا کہ حضرت فاروق اعظمؓ کو بھی اس لفظ کے معنی میں تردد پیش آیا تو آپ نے برہم منبر صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ لفظ تنقوص کے آپ کیا معنی سمجھتے ہیں؟ عام مجمع خاموش رہا، مگر قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! یہ ہمارے قبیلہ کا خاص لغت ہے، ہمارے یہاں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی بتدریج گھٹانا، فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ کیا عرب اپنے اشعار میں یہ لفظ تنقص کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اس نے عرض کیا کہ ہاں، اور اپنے قبیلہ کے شاعر ابو کبیر ہذلی کا ایک شعر پیش کیا، جس میں یہ لفظ بتدریج گھٹانے کے معنی میں لیا گیا تھا، اس پر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ: لوگو! تم اشعار جاہلیت کا علم حاصل کرو، کیونکہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہاری کلام کے معانی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

قرآن بھی کے لئے معمولی اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ معمولی طور پر عربی زبان بولنے لکھنے کی عربی دانی کافی نہیں | قابلیت قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس میں اتنی مہارت اور واقفیت ضروری ہے جس سے قدیم عرب جاہلیت کے کلام کو پورا سمجھا جاسکے، کیونکہ قرآن کریم اسی زبان اور انہی کے محاورات میں نازل ہوا ہے، اس درجہ کا ادب عربی سیکھنا مسلمانوں پر لازم ہے۔

عربی ادب سیکھنے کے لئے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے زمانہ جاہلیت کی شعراء جاہلیت کا کلام پڑھنا عربی زبان اور اس کا لغت و محاورات سمجھنے کے لئے شعراء جاہلیت کا کلام پڑھنا پڑھنا پڑھنا جائز ہے، اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ شعراء جاہلیت کا کلام جاہل رسوں اور خلاف اسلام جاہلانہ افعال و اعمال پر مشتمل ہوگا، مگر قرآن فہمی کی ضرورت سے اس کا پڑھنا پڑھنا جائز قرار دیا گیا۔

دنیا کا عذاب بھی ایک آیات مذکورہ میں دنیا کے مختلف اقسام عذاب کا ذکر کرنے کے بعد خاتمہ طرح کی رحمت ہے | آیات پر فرمایا فَإِنَّ رَبَّكُمُ لِلْزُوفِ رَحِيمٌ اس میں اذل تو لفظ رب سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا کے عذاب انسان کو متنبہ کرنے کے لئے شان ربوبیت کے تقاضے سے ہیں، پھر لام تاکید کے ساتھ حق تعالیٰ کا مشفق و مہربان ہونا بتلایا کہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ دنیا کی تنبیہات درحقیقت شفقت و رحمت ہی کے داعیہ سے ہیں تاکہ غافل انسان متنبہ ہو کر اپنے اعمال کی اصلاح کر لے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَّبِعُهُ ظِلُّهُ عَنِ الْيَمَانِ

کیا نہیں دیکھتے وہ جو کہ اللہ نے پیدا کی ہے کوئی چیز کہ ڈھلتے ہیں ساتھ اس کے دائیں طرف

وَالشَّمَاكِلِ سَجْدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿۵۸﴾ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا

سے اور باتیں طرقت سے سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اور وہ عاجزی میں ہیں ، اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے

فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ

آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے جان داروں سے اور فرشتے اور وہ

لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿۵۹﴾ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا

تکبر نہیں کرتے ، ڈر رکھتے ہیں اپنے رب کا اپنے اوپر سے اور کرتے ہیں جو

يُؤْمَرُونَ ﴿۶۰﴾ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ

حکم پاتے ہیں ، اور کہا ہر اللہ نے مت پکڑو معبود دو وہ معبود

إِلَهُ وَاحِدٌ فَإِنِّي فَارְهَبُونَ ﴿۶۱﴾ وَلَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

ایک ہی ہے ، سو مجھ سے ڈرو ، اور اسی کا ہے جو کچھ ہر آسمانوں میں اور زمین

وَلَهُ الَّذِينَ وَاصِبًا أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ ﴿۶۲﴾ وَمَا بِكُمْ مِنْ

میں اور اسی کی عبادت ہر ہمیشہ سو کیا سوائے اللہ کے کسی سے ڈرتے ہو ، اور جو کچھ تمہارے پاس

نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْرُونَ ﴿۶۳﴾

ہو نعمت سوائے اللہ کی طرف سے ، پھر جب پہنچتی ہو تم کو سختی تو اسی کی طرف چلاتے ہو

ثُمَّ إِذَا كُشِفَ الضُّرُّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِحْتُمْ مِنْكُمْ بِرَبِّكُمْ يُشْرِكُونَ ﴿۶۴﴾

پھر جب کھول دیتا ہے سختی تم سے اسی وقت ایک فرقہ تم میں سے اپنے رب کی شاکت ہر شریک بتلانے

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا أَفَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۶۵﴾ وَ

تاکہ منکر ہو جائیں اس چیز سے جو کہ ہم نے ان کو دی ہے سو مزے اڑاؤ آخر معلوم کر لو گے ، اور

يَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ تَا دُنِ

ٹھہراتے ہیں ان کے لئے جن کی خبر نہیں رکھتے ایک حصہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے قسم اللہ کی

سورہ نحل
۱۶: ۵۴
۱۳

لَسْتُمْ لَنَا عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿۵۷﴾ وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ

تم سے پوچھنا ہی جو تم بہتان باندھتے ہو، اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں

سُبْحَنَهُ ۚ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ﴿۵۸﴾

وہ اس سے پاک ہے اور اپنے لئے جو دل چاہتا ہو

خلاصہ تفسیر

کیا ان لوگوں نے اللہ کی ان چیزوں کو نہیں دیکھا اور دیکھ کر توجہ پر استدلال نہیں کیا جن کے سامنے کبھی ایک طرف کو کبھی دوسری طرف کو اس طور پر جھکتے جاتے ہیں کہ بالکل خدا کے حکم کے تابع ہیں (یعنی سامنے کے اسباب کہ آفتاب کا گورانی ہونا اور سایہ دار جسم کا کثیف ہونا ہی، اور حرکت میں سایہ کا سبب کہ آفتاب کی حرکت ہو، پھر سایہ کے خواص، یہ سب حکم الہی ہے، اور وہ (سایہ دار چیزیں بھی) اللہ کے روبرو عاجز اور تابع حکم ہیں، اور ان میں طرح یہ اشیاء مذکورہ جن میں حرکت ارادہ نہیں جیسا کہ یقیناً کی اسنادِ ظلال کی طرف اس کا قرینہ ہے، کیونکہ متحرک بالارادہ میں سایہ کی حرکت خود اس متحرک بالارادہ کی حرکت سے ہوتی ہے، مگر خدا کے تابع ہیں اسی طرح اللہ ہی کے مطیع (حکم ہیں) جنہی چیزیں (بالارادہ) پہلنے والی آسمانوں میں (جیسے فرشتے) اور زمین میں (جیسے حیوانات) موجود ہیں اور رب انھیں فرشتے (بھی) اور وہ فرشتے باوجود غلبہ مکان و رفعت شان کے اطاعتِ خداوندی سے بہت نہیں کرتے اور اسی لئے بالخصوص ان کا ذکر کیا گیا باوجود اسے کہ کافی السموات میں داخل تھے) وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان پر بالادست ہے، اور ان کو جو کچھ (خدا کی طرف سے) حکم کیا جاتا ہے وہ اس کو کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے (تمام مکلفین کو بواسطہ رسل کے) فرمایا ہے کہ دو ایاز یادہ) معبود مت بناف پس ایک معبود ہی ہے (اور جب یہ بات ہے) تو تم لوگ خاص بھد ہی سے ڈرا کرو (کیونکہ جب الوہیت میرے ساتھ خاص ہے تو جو جو اس کے لوازم ہیں کمال قدرت وغیرہ وہ بھی میرے ہی ساتھ خاص ہوں گے تو انتقام وغیرہ کا خوف بھد ہی سے چاہئے اور شرک انتقام کو مسترد ہی ہے، پس شرک نہ کرنا چاہئے) اور اسی کی (ملک) ہیں سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور لازمی طور پر اطاعت بجالانا اسی کا حق ہے (یعنی وہی اس امر کا مستحق ہے کہ سب اس کی اطاعت بجالاویں جب یہ بات ثابت ہے) تو کیا پھر بھی اللہ کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو، (اور ان سے ڈر کر انکو پوجو تو)

اور ایسا کرنے کے قابل سوائے خدا کے کوئی نہیں ایسا ہی نعمت دینے والا اور امید کے قابل جسز
خدا کے کوئی نہیں چنانچہ (تمہارے پاس جو کچھ کسی قسم کی) بھی نعمت ہو وہ سب اللہ ہی کی طرف
سے ہے پھر جب تم کو (ذرا) تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے رفع ہونے کے لئے، اسی (اللہ) سے
فریاد کرتے ہو اور کوئی بُت وغیرہ اس وقت یاد نہیں آتا جس سے توجہ کا حق ہونا اس وقت
تمہارے اقرار حال سے بھی معلوم ہو جاتا ہے لیکن پھر جب (اللہ تعالیٰ) تم سے اس تکلیف کو
ہٹا دیتا ہے تو تم میں کی ایک جماعت (اور وہی بڑی جماعت ہے) اپنے رب کے ساتھ (بدستور
سابق) شرک کرنے لگتی ہیں جس کا عاقل یہ ہے کہ ہماری دی ہوئی نعمت کی ذمہ داری تکلیف کا
رفع کرنا ہے (ناشکری کرتے ہیں) (جو کہ عقلاً بھی قبیح ہے) (خیر چند روزہ عیش اڑا لو (دیکھو)
اب جلدی (مرنے ہی) تم کو خبر ہوئی جاتی ہے زار و ایک جماعت اس لئے کہا گیا کہ بعض اس
حالت کو یاد رکھ کر توحید و ایمان پر قائم ہو جاتے ہیں انہوں نے اُمّی قُلْتُ سَجَّطُ بِرَأْفِ السَّيِّدِ
قَدِّمْتُ هُنَا مَشْهُوْرًا) اور (مخلد ان کے شرک کے ایک یہ ہو کہ) یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں
میں سے ان (مجبوروں) کو حجت لگاتے ہیں جن کے (موجود ہونے کے) متعلق ان کو کچھ علم (اور
ان کے مجبور ہونے کی کوئی دلیل و سند) نہیں (جیسا اس کی تفصیل پورہ ہشتم کے رکوع
سوم آیت وَجَعَلُوا لِلّٰهِ الْغَنِيَّ غُرُوْرًا ہے) قسم تو خدا کی قسم سے تمہاری ان افتراء پر دازیوں
کی (قیامت میں) ضرور باز پرس ہوگی (اور ایک شرک ان کا یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے نبیوں
تو بزرگرتے ہیں، سبحان اللہ (کیسی بھل بات ہو) اور اس پر یہ طوا کہ) اپنے لئے چاہا تو چیز
(یعنی بیٹے پسند کرتے ہیں) :

وَلَاذَابُشَرٍّ اَحَدٌ مِنْهُمْ بِالْاَنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ

اور جب خوش خبری ملے ان میں کسی کو بیٹی کی سانس دن ہے مگر اس کا سیاہ اور جی میں

كَبِيْرٌ ۙ يَتَّارِي مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ اَيْسَكُهُ

کھتا رہے، پچھتا پھرے لوگوں سے اے بُرائی اس خوش خبری کے جو سنی اس کو پہنچے ہے

عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُّ مُدَّ فِي التَّرَافِ اَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۱۵

ذلت قبول کر کے یا اس کو داب سے مٹی میں ستا ہو بُرا فیصلہ کرتے ہیں،

لَئِنْ لَّا يُوْمَرُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ

جو نہیں مانتے آخرت کو ان کی بڑی مثال ہے اور اللہ کی مثال

الَا عَلَىٰ وَهْوٍ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۱۰

سب اہل اور وہی ہر ذریعہ دستِ حکمت والا۔

خلاصہ تفسیر

اوجہ ان میں کسی کو بھی (پیدا ہونے) کی خبر دی جائے (جس کو اللہ کے لئے بخیر کرتے ہیں) تو اس قدر ناراض ہو کہ سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹنار ہے (اور) جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے (یعنی تولد و ختم) اس کی عارت لوگوں سے چھپا چھپ پھرے (اور دل میں اتار چڑھاؤ کرے کہ) کیا اس (موجود جدید) کو ذلت کی حالت پہنچے رہے، یا اس کو (زندہ یا مار کر) مٹی میں گھاڑ دے، خوب سن لو ان کی یہ تجویز بہت بُری ہے (کہ اول تو خدا کے لئے اولاد ثابت کرنا، یہی کس قدر بُری بات ہے، پھر اولاد بھی وہ جس کو خود اس قدر ذلیل و مہجور سمجھیں ہیں) جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کی بُری حالت ہر دنیا میں بھی کہ ایسے جہل میں مبتلا ہیں اور آخرت میں بھی کہ مبتلائے عقوبت و ذلت ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو بڑے اعلیٰ درجہ کے صفات ثابت ہیں (نہ وہ جو کہ یہ مشرکین کہتے ہیں) اور وہ بڑے زبردست ہیں (اگر ان کو دنیا میں شرک کی سزا دینا چاہیں تو کچھ مشکل نہیں، لیکن ساتھ ہی بڑی حکمت والے رہیں ہیں بمقتضائے حکمت بعد موت تک سزا کو مؤخر فرما دیا ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیات میں کفار و کلاب کی دو خصلتوں پر مذمت کی گئی ہے کہ اول تو وہ اپنے گھر میں لڑکی پیدا ہونے کو اتنا برا سمجھتے ہیں کہ شرمندگی کے سبب لوگوں سے چھپتے پھرتے ہیں، اور اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ لڑکی پیدا ہونے سے جو میری ذات تو چلے ہے اس پر صبر کروں یا اس کو زندہ درگور کر کے چھپ چھپاؤں، اور اس پر مزید بہالت یہ ہے کہ جس اولاد کو اپنے لئے پسند نہ کریں، اللہ جل شانہ کی طرف اسی کو منسوب کریں کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیں۔

دوسری آیت کے آخر میں آلاءِ مساکم مایٰ بحسنون کا مفہوم تفسیر بجز مہیط میں جو الہامی ہے یہی دونوں خصلتیں قرار دی ہیں کہ اول تو ان کا یہ فیصلہ ہی برا فیصلہ ہے کہ لڑکیوں کو ایک عذاب اور ذلت سمجھیں (دوسرے پھر جس چیز کو اپنے لئے ذلت سمجھیں، اسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں۔ تیسری آیت کے اخیر میں وَهْوٍ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ

لڑکی پیدا ہونے کو مصیبت و ذلت سمجھا اور چاہتے پھر حکمت خداوندی کا مقابلہ کرنا ہے، کیونکہ مخلوق میں نور و مادہ کی تخلیق عین قانون حکمت ہے (روح البیان)

مسئلہ :- ان آیتوں میں واضح اشارہ پایا گیا کہ لڑکی میں لڑکی پیدا ہونے کو مصیبت و ذلت سمجھنا جائز نہیں یہ کفار کا فعل ہے، تفسیر روح البیان میں بحوالہ شریح لکھا ہے کہ مسلمان کو چاہئے کہ لڑکی پیدا ہونے سے زیادہ خوشی کا اظہار کرے تاکہ اہل جاہلیت کے فعل پر رد ہو جائے، اور ایک حدیث میں ہے وہ سعادت مبارک جتنی ہے جس کے پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہو، قرآن کریم کی آیت یَذَّبُ بَنَاتٍ یَّشَاءُ اِنَّا نَاۤءٍ یَّحِبُّ لِعَنَیْشَاءُ اَلَّذِیْ کُوِّرَ مِنْ حِیْ اَنَاثَ کو مقدم کرنے سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہونا افضل ہے۔

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس کو ان لڑکیوں میں سے کسی کے ساتھ سابقہ پڑے اور پھر وہ ان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرے تو یہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائیں گی (روح البیان)

خلاصہ یہ ہے کہ لڑکی کے پیدا ہونے کو برا سمجھنا جاہلیت کی بُری رسم ہے، مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور اس کے بالقابل جو اللہ کا وعدہ ہے اس پر مطمئن اور مسرور ہونا چاہئے (اللہ اعلم)

وَلَوْ یُبَایِعُ اِنَّہُ الذِّنَّاسُ یُظْلِمُوْنَ مَا شَرَّکَ عَلَیْہَا مِنْ ذَاتِیۡہِ وَ

اور اگر بیکڑے اللہ لوگوں کو ان کی بے انصافی پر نہ چھوڑے زمین پر ایک چلنے والا،

لَکِنۡ یُّؤَخِّرُہُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّیٍّ ۚ وَاِذَا اٰجَآءَ اَجَلُہُمْ لَا یَسْتَخْرِجُوْنَ

لیکن ڈھیس دیتا ہے ان کو ایک وقت موعود تک، پھر جب آجھنے گا ان کا وعدہ نہ بھیجے سب کی سب

سَاعَۃً وَّ لَا یَسْتَقْدِرُوْنَ ۚ وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ مَا یُکْرَہُوْنَ وَ

ایک گھنٹی اور نہ آگے سرک سکیں گے، اور کرتے ہیں اللہ کے واسطے جس کو اپنا ہی نہ چاہے اور

تَصِفُ اَلْسِنَتُہُمُ الْکِذْبَ اَنۡ لَّہُمُ الْحَسَنٰطُ لَا جَرَۃَ اَنۡ یَّکَاۡہُمُ

ہیان کرلی ہیں زبانیں ان کی جھوٹ کہ ان کے واسطے خوشی ہے، آپ ثابت ہو کہ ان کے واسطے

النَّارُ وَاَنۡہُمْ مُّقْرَحُوْنَ ۚ مَا لَہُمۡ لَقَدَّ اَرْسَلْنَا اِلَیْہِمْ

آگ اور وہ بڑھانے جارہے ہیں، قسم اللہ کی ہم نے رسول بھیجے مختلف فرقوں میں

مِّن قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ

تجارت پہلے پہرا پتے کر کے دکھائے ان کو شیطان نے ان کے کام سودی رفیق ان کا ہر آج اور

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۚ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِلْبَيِّنِ

ان کے واسطے عذاب دردناک ہے اور ہم نے اتنی ہی بھجھ پر کتاب اسی واسطے کہ کھول کر سنا لے تو

لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١٥﴾

ان کو وہ چیز کہ جس میں جھگڑ رہے ہیں اور سیدھی راہ بتانے کو اور واسطے بخشش ایمان لانے والوں کے

وَاللَّهُ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَازْهَبَ بِهِ الْأَرْضُ بِعَدِّ مَوْتِكَ

اور اللہ نے آسمان سے پانی پھر اس سے زندہ کیا زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے،

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿١٦﴾

اس میں نشانی ہے ان لوگوں کو جو سنتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اور اگر اللہ تعالیٰ (ظالم) لوگوں پر ان کے ظلم یعنی شرک و کفر کے سبب (فی الفور دنیا میں پوری) دار و گیر فرماتے تو سب زمین پر کوئی (حسن و) حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے (بلکہ سب کو ہلاک کر دیتے) لیکن (فی الفور) دار و گیر نہیں فرماتے بلکہ ایک مہینہ یا عین تک مہلت دے رہے ہیں تاکہ اگر کوئی توبہ کرنا چاہے تو گنجائش ہو (پھر جب ان کا وہ وقت مہینہ رنزدیک) آپہنچے گا اس وقت ایک ساعت نہ (اس سے) پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے (بلکہ فوراً سزا ہو جائیگی) اور اللہ تعالیٰ کے لئے وہ امور تجویز کرتے ہیں جن کو خود (اپنے لئے) بنا پسند کرتے ہیں (جیسا اوپر آیا کہ دَيِّخَ لَكُم مِّنْهُنَّ مَتَاعًا) اور (پھر) اس پر اپنی زبان سے جھوٹے دعوے کرتے جاتے ہیں کہ ان کے (یعنی ہمارے) لئے (بر تقدیر و وقوع قیامت) ہر طرح کی بھلائی ہے (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بھلائی کہاں سے آتی تھی بلکہ) لازمی بات ہو کہ ان کے لئے قیامت کے دن (دوزخ) ہے اور بیشک وہ لوگ (دوزخ میں) سب سے پہلے بھیجے جائیں گے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کے کفر و جہالت پر کچھ غم نہ کیجئے، کیونکہ (بجہ آپ کے زمانہ) سے پہلے جو امتیں ہو گزری ہیں ان کے پاس بھی تمہارے رسولوں کو بھیجا تھا (جیسا کہ آپ کو ان کے پاس بھیجا ہے) سو جس طرح یہ لوگ اپنی کفریات کو پسند کرتے ہیں اور اس پر قہم ہیں اسی طرح ان کو بھی شیطان نے ان کے اعمال (کفریہ) مستحسن کر کے

دکھلائے ہیں وہ شیطان، آج یعنی دنیا میں، ان کا رفیق ہے یعنی رفیق تھا کہ ان کو بہکتا سکتا تھا پس دنیا میں تو ان کو یہ نساہت ہو (اور پھر قیامت میں) ان کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہو (خاص یہ لاشعین بھی ان سابقین کی طرح کفر کرتے ہیں اور انہی کی طرح ان کو سزا بھی ہوگی، آپ کیوں غم میں پڑے) اور ہم نے آپ پر یہ کتاب (جس کا نام قرآن ہے) اس واسطے نازل نہیں کی کہ سب کا ہدایت پر لانا آپ کے ذمہ ہوتا کہ بعض کے ہدایت پر نہ آنے سے آپ منہم ہوں، بلکہ) صرف اس واسطے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں (مثلاً توحید و معاد و احکام حلال و حرام) آپ (عام) لوگوں پر اس کو ظاہر فرمادیں، یہ فائدہ تو قرآن کا عام ہے اور ایمان والوں کی ہدایت (خاصہ) اور رحمت کی غرض سے (نازل فرمایا ہے سورہ امور بغضلہ تعالیٰ حاصل ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مرزہ ہونے کے بعد زندہ کیا (یعنی اس کی قوت نامیہ کو بعد اس کے کہ خشک ہو جانے سے کمزور ہو گئی تھی تقویت دی) اس (امر) میں ایسے لوگوں کے لئے (توحید کی اور منعم ہونے کی) بڑی دلیل ہے جو رہی سے ان باتوں کو سنتی ہیں۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ

اور تمہارے واسطے پیو پاؤں میں سوچنے کی جگہ ہو، پلاتے ہیں تم کو اس کے پیٹ کی چیزوں میں

فَرْتٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ (۶۶)

سے گوہر اور لہو کے نیچے میں سے دودھ ستہ (خوشگوار پینا والوں کے لئے)۔

خلاصہ تفسیر

اور (نیز) تمہارے لئے مواشی میں بھی خورد و کار ہے (دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوہر اور خون (کا مادہ) اس کے درمیان میں سے (دودھ کا مادہ کہ ایک حتمہ خون کا ہے) بعد ہضم کے جدا کر کے عسں کے مزاج سے ان کا رنگ بدل کر اس کو (صاف اور گھلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ) بنا کر ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔

معارف و مسائل

بُطُونِہ کی ضمیر انعام کی طرف راجع ہے لفظ انعام جمع مؤنث ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ بُطُونُہا کہا جاتا جیسا کہ سورہ مؤمنون میں اسی طرح نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِہَا منسرایا گیا ہے۔

قرطبی نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ سورہ مؤمنون میں "مہنی" جمع کی رعایت کر کے ضمیر مؤنث لائی گئی، اور سورہ نحل میں لفظ جمع کی رعایت سے ضمیر مذکر استعمال ہوئی، اور اسی اور اس عرب میں اس کی نظیریں بے شمار ہیں کہ لفظ جمع کی طرف ضمیر مذکر جمع کی جاتی ہے۔

گوہر اور نون کے درمیان سے صاف دودھ نکالنے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جانور جو گھاس کھاتا ہے جب وہ اس کے معدہ میں جمع ہو جاتی ہے تو معدہ اس کو پچانے اور معدہ کے اس نل سے غذا کا فضلہ نیچے پیچہ جاتا ہے اور دودھ ہو جاتا ہے، اور اس کے دھنوں پھر قدرت نے یہ کام ہنگ کے سپرد کیا ہے کہ ان تینوں قسموں کو الگ الگ ان کے مقامات میں تقسیم کر دیتا ہے، نون کو لگ کر کے رگوں میں منتقل کر دیتا ہے، اور دودھ کو الگ کر کے جانور کے منہ میں پہنچا دیتا ہے اور اب معدہ میں سے فضلہ باقی رہ جاتا ہے جو گوہر کی صورت میں نکلتا ہے۔ مسئلہ:۔۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ لذیذ اور شیریں کھانے کا استعمال زیادہ کے خلاف نہیں ہے جبکہ اس کو حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو، اور اس میں اسراف اور فضول نہ ہو کی گئی ہو، حضرت حسن بصری نے ایسا ہی فرمایا ہے (قرطبی)

مسئلہ:۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کوئی کھانا کھاؤ تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَ اطْعِمْنَاْ خَيْرَ اَمْنَةٍ رَّزَقْنَاْ اِنَّ اِسْمَ اِلٰہِ اِسْمِ اَمَانَتِنَاْ بَرَکَاتُهَا فرما اور آئندہ اس سے اچھا کھانا نصیب فرما، اور

فرمایا کہ جب دودھ پیو تو یہ کہو اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهِ وَ زِدْنَاْ مِنْهُ، یعنی یا اللہ ہمارے لئے اس میں برکت دیجئے اور زیادہ عطا فرمائیے، اس سے بہتر کا سوال اس لئے نہیں کیا کہ انسانی غذا میں دودھ سے بہتر کوئی دوسری غذا نہیں ہے، اسی لئے قدرت نے ہر انسان و حیوان کی پہلی غذا دودھ ہی بنائی ہے جو ان کی پھاتیوں سے اسے ملتی ہے (قرطبی)

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا

اور میوؤں سے کھجور کے اور انگور کے بناتے ہو اس سے نشہ اور

وَرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (۶۷)

رزقِ خاصی اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے واسطے جو سمجھتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور زیز، کھجور اور انگوروں کی حالت میں غلو کرنا چاہئے کہ ان کے پھلوں سے تم لوگ

نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں (جیسے خربازے خشک کشمش اور شربت اور سرکہ) بناتے ہو بیشک اس میں کوئی توحید اور منعم ہونے کی، ان لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہو جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

معارف و مسائل

پہلی آیتوں میں حق تعالیٰ کی ان نعمتوں کا ذکر تھا جو انسانی غذائیں پیدا کرنے میں عجیب و غریب صنعت و قدرت کا مظہر ہیں، اس میں پہلے دو دفعہ کا ذکر کیا جس کو قدرت نے حیوان کے پیٹ میں خون اور فضلہ کی آلائشوں سے الگ کر کے صاف ستھری غذا انسان کے لئے عطا کر دی جس میں انسان کو کسی مزید صنعت کی ضرورت نہیں، اسی لئے یہاں لفظ **لَتَقْبَلَنَّ** استعمال فرمایا کہ ہم نے پلایا و دودھ۔

اس کے بعد فرمایا کہ کھجور اور انگور کے کچھ پھلوں میں سے بھی انسان اپنی غذا اور نشہ کی چیزیں بناتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہو کہ کھجور اور انگور کے پھلوں سے اپنی غذا اور منفعت کی چیزیں بنانے میں انسانی صنعت کا بھی کچھ دخل ہے، اور اسی دخل کے نتیجہ میں دو طرح کی چیزیں بنائی گئیں، ایک نشہ آور چیز جس کو خمر یا شراب کہا جاتا ہے، دوسری رزق حسن یعنی عمدہ رزق کہ کھجور اور انگور کو تروتازہ کھانے میں استعمال کریں یا خشک کر کے ذخیرہ کر لیں۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے کھجور اور انگور کے پھل انسان کو دیدیے، اور اس سے اپنی غذا وغیرہ بنانے کا اختیار بھی دیدیا، اب یہ اس کا انتخاب ہے کہ اس سے کیا بنائے نشہ آور چیز بنا کر عقل کو خراب کرے یا غذا بنا کر قوت حاصل کرے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت سے نشہ آور چیز یعنی شراب کے حلال ہونے پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہاں مقصود قدرت کے عطیات اور ان کے استعمال کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، جو ہر حال میں نعمت خداوندی ہے جیسے تمام غذائیں اور انسانی منفعت کی چیزیں کہ ان کو بہت سے لوگ ناجائز طریقوں پر بھی استعمال کرتے ہیں مگر کسی کے غلط استعمال سے اصل نعمت تو نعمت ہونے سے نہیں نکل جاتی، اس لئے یہاں یہ تفصیل بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ان میں کونسا استعمال حلال ہے کونسا حرام، تاہم ایک لطیف اشارہ اس میں بھی اس طرف کر دیا گیا کہ شکر کے مقابل رزق حسن رکھا جس سے معلوم ہوا کہ شکر اچھا رزق نہیں ہے، شکر کے معنی جہور مفسرین کے نزدیک نشہ آور چیز کے ہیں رزق المعالی، قرطبی نے اسے بعض علماء نے اس کے معنی سرکہ یا بے نشہ بنیذ کے بھی لئے ہیں (جصاص و قرطبی) مگر اس جگہ اس

اختلاف کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ۱۲ منہ

یہ آیات باتفاق امت مکی ہیں اور شراب کی حرمت اس کے بعد مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔
نزدک آیت کے وقت اگرچہ شراب حلال تھی، اور مسلمان عام طور پر پیتے تھے، مگر اس وقت بھی
اس آیت میں اشارہ اس طرف کر دیا گیا کہ اس کا پینا اچھا نہیں، بعد میں صراحتاً شراب کو شدت کے
ساتھ حرام کرنے کے لئے قرآنی احکام نازل ہو گئے۔ ﴿ہَذَا مُخَسَّسٌ بِلِیِّ الْجِصَّاصِ وَاقْرَءِ لِّی﴾

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلٰی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوتًا وَمِنَ

اور ہم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنائے پہاڑوں میں گھر اور درختوں میں

الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُونَ ﴿۶۹﴾ ثُمَّ کَلٰی مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاَسْلٰکِی

اور جہاں تمناں باندھتے ہیں۔ پھر کھا ہر طرح کے میوؤں سے پھر چل

سُبُلَ رَبِّکَ ذٰلَکَ لِیَخْرِجَ مِنْ بُطُونِہَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ

راستوں میں اپنے رب کے شاہد کی مکھی ہر ان کے پیٹ میں سے پینے کی چیز جس کے مختلف

اَلْوَانُ فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیۃً لِّمَعْرِفِی

رنگ ہیں اس میں مرض اپنے ہوتے ہیں لوگوں کے، اس میں نشانی ہے ان لوگوں کیلئے

یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۷۰﴾

تو دھیان کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی
کہ تو پہاڑوں میں گھر یعنی چھتہ بنائے اور درختوں میں (بھی) اور لوگ جو عمارتیں بناتے ہیں ان میں
(بھی) چھتہ لگالے پنانچہ ان سب موقعوں پر وہ چھتہ لگاتی ہے، پھر ہر قسم کے مختلف پھلوں سے
(جو تجھ کو مرغوب ہوں) چوستی کھپ، پھر (چوس کر) چھتہ کی طرف واپس آنے کے لئے اپنے رب
کے راستوں میں چل جو (تیرے لئے باعتبار چلنے کے) آسان ہیں، (چنانچہ بڑی
بڑی دو سبے راستہ بھولے ہوئے اپنے چھتے کو لوٹ آتی ہے، پھر جب چوس کر اپنے چھتہ کی
طرف واپس آتی ہے تو) اس کے پیٹ میں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہو (یعنی شہد جس کی رنگینیں مختلف ہوتی ہیں
اس میں لوگوں کی بہت سی بیماریوں) کیلئے شفا ہے (بھی) ان لوگوں کیلئے (توحید کی اور نعم ہونے کی) بڑی دلیل بھی ہے۔

معارف و مسائل

آؤسی، وہی یہاں اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں ہی، بلکہ لغوی معنی میں ہے، وہ یہ کہ مکمل مخاطب کو کوئی خاص بات مخفی طور پر اس طرح سمجھا دے کہ دوسرا شخص اس بات کو نہ سمجھ سکے۔

التَّحَلُّ: شہر کی مکھی اپنی عقل و فراست اور حسن تدبیر کے لحاظ سے تمام حیوانات میں ممتاز جانور ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو خطاب بھی امتیازی شان کا کیا ہے۔ باقی حیوانات کے بارے میں تو قانون کلی کے طریقہ پر اعلیٰ کمال شئی خَلْقَهُ لَمْ يَهْدِیْ فرمایا، لیکن اس بھی سی مخلوق کے بارے میں خاص کر کے آؤسی رَبِّكَ فرمایا جس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ یہ دوسرے حیوانات بہ نسبت عقل و شعور اور توجہ و بوجہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہو۔

شہر کی مکھیوں کی فہم و فراست کا اندازہ ان کے نظام حکومت سے بخوبی ہوتا ہے، اس ضعیف جانور کا نظام زندگی انسانی سیاست و حکمرانی کے اصول پر چلتا ہے، تمام نظم و نسق ایک بڑی مکھی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جو تمام مکھیوں کی حکمران ہوتی ہے، اس کی تنظیم اور تقسیم کار کی وجہ سے پورا نظام صحیح سالم چلتا رہتا ہے، اس کے عجیب و غریب نظام اور استحکم قوانین و ضوابط کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے، خود یہ ملکہ تین ہفتوں کے عرصہ میں چھ ہزار سے بارہ ہزار تک انڈے دیتی ہے، یہ اپنی قد و قامت اور وضع و قطع کے لحاظ سے دوسری مکھیوں سے ممتاز ہوتی ہو یہ بلکہ تقسیم کار کے اصول پر اپنی رعایا کو مختلف امور پر مامور کرتی ہے، ان میں سے بعض دُبانے کے فرائض انجام دیتی ہیں، اور کسی نامعلوم اور خارجی فرد کو اندر داخل نہیں ہونے دیتی۔ بعض انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں، بعض نابالغ بچوں کی تربیت کرتی ہیں، بعض معاشی اور انجینئرنگ کے فرائض ادا کرتی ہیں، ان کے تیار کردہ اکثر چھتوں کے خانے میں ہزار سے تیس ہزار تک ہوتے ہیں، بعض موم جمع کر کے معماروں کے پاس پہنچاتی رہتی ہیں جن سے وہ اپنے مکانات تعمیر کرتے ہیں۔ یہ موم نباتات پر جمے ہوئے سفید قسم کے سفوف سے حاصل کرتی ہیں، گتے پر یہ مادہ بکثرت نظر آتا ہے، ان میں سے بعض مختلف قسم کے پھولوں اور پھلوں پر بیٹھ کر اس کو پکڑتی ہیں، جو ان کے پیٹ میں شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے، یہ شہد ان کی اور ان کے بچوں کی غذا ہے، اور یہی ہم سب کے لئے بھی لذت و غذا کا جو ہر اور دوا و شفاء کا نسخہ ہے، یہ مختلف پارٹیاں نہایت سرگرمی سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہیں اور اپنی ”ملکہ“ کے حکم کو دل و جان سے قبول کرتی ہیں، ان میں سے اگر کوئی گندگی پر بیٹھ جائے تو چھتے کے دربان اسے باہر روک لیتے ہیں، اور ملکہ اس کو قتل کر دیتی ہے، ان کے اس حیرت انگیز نظام اور حسن کارکردگی کو دیکھ کر انسان

حیرت میں پڑ جاتا ہے (از الجواہر)

بَيِّنَاتٌ ۖ اَوْحٰى رَبُّكَ سَعٰدَاتٍ ۚ اِنَّ مِّنْ شَيْءٍ لَّا عِندَنَا بِكَلِمَةٍ لَّا نَعْمٰى لَهَا اَوْ نَكْرَهًا ۚ وَكَذٰلِكَ نُبَيِّنُ لِّلنَّاسِ اٰيٰتِهِۦ لَعَلَّ هُمْ يَرْجِعُوْنَ ۙ
 کہ ذکر ہے، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہر جانور اپنے رہنے سہنے کے لئے گھر تو بناتا ہی ہے، پھر اس اہتمام سے ”گھروں“ کی تعمیر کا حکم مکھیوں کو دینے میں کیا خصوصیت ہے، پھر یہاں لفظ بھی بیت کا استعمال فرمایا جو عموماً انسانی رہائش گاہوں کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے اشارہ ایک تو اس طرف کر دیا کہ مکھیوں کو چونکہ شہد تیار کرنا ہے، اس کے لئے پہلے سے ایک محفوظ گھر بنالیں، دوسرا اس طرف اشارہ کر دیا کہ جو گھر یہ بنائیں گی وہ عام جانوروں کے گھروں کی طرح نہیں ہوں گے، بلکہ ان کی ساخت و بناوٹ غیر معمولی قسم کی ہوگی، چنانچہ ان کے گھر عام جانوروں کے گھروں سے ممتاز ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر انسانی عقل بھی ششدر رہ جاتی ہے، ان کے گھر مستطیل شکل کے ہوتے ہیں، پرکار اور مسطح بھی اگر ان کی پیمائش کی جائے تو بال برابر بھی فرق نہیں۔ ہتھامہ مستطیل شکل کے علاوہ وہ دوسری کسی شکل مثلاً مربع اور منہر وغیرہ کو اس لئے اختیار نہیں کرتیں کہ ان کے بس کرنے بیکار رہ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مکھیوں کو محض گھر بنانے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کا مکمل وقوع بھی بتلادیا کہ وہ کسی بلندی پر ہونا چاہئے، کیونکہ ایسے مقامات پر شہد کو تازہ اور صاف چھنی ہوئی ہوا پہنچتی رہتی ہو وہ گندی ہوا سے بچا رہتا ہے، اور توڑ پھوڑ سے بھی محفوظ رہتا ہے، چنانچہ فرمایا:
 مِنَ الْجِبَالِ يُّنۡسَفِثُ مِمَّا يَخۡرُجُ مِّنۡهَا سَيِّۡوَنٌ ۚ وَفِیۡۤ اٰنۡ لَّہُمۡ دُخٰنٌ ۙ
 اور بلند عمارتوں پر ہونی چاہئے، تاکہ شہد بالکل محفوظ طریقہ سے تیار ہو سکے۔

ثُمَّ يَخۡرُجۡ مِّنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۚ وَاِنَّ ہُمۡ لَیۡۤ اِلَیۡہِۡۤا رٰجِعُونَ ۙ
 اپنی رغبت اور پسند کے مطابق پھل پھول سے رس چوستے، یہاں مِّنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فرمایا، لیکن اظہار یہاں لفظ ”کل“ سے دنیا بھر کے پھل پھول مراد نہیں ہیں، بلکہ جن تک آسانی سے اس کی رسائی ہو سکے، اور مطلب حاصل ہو سکے، ”کل“ کا یہ لفظ مکمل سبب کے واقعہ میں بھی وارد ہوا کہ وَ اُوۡتِیۡتِہُمۡ مِّنۡ كُلِّ شَیۡءٍ اور ظاہر ہے کہ وہاں بھی استغراق کمالی مراد نہیں ہے، کہ مکمل سبب کے پاس ہوائی جہاز اور ریل موٹر ہونا بھی لازم آئے، بلکہ اس وقت کی تمام ضروریات و مناسبات مراد ہیں، یہاں بھی مِّنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ سے یہی مراد ہے، — یہ مکھی ایسے ایسے لطیف اور قیمتی اجزاء چوستی ہے کہ آج کے سائنسی دور میں مشینوں سے بھی وہ جوہر نہیں نکالا جاسکتا۔

فَاَنۡسَلِکَیۡ سُبُلَ رَہۡبَۡنٍ ۙ ذٰلَکَ لَّعَلَّہُمۡ یَعۡلَمُوْنَ ۙ
 کہ ہوا رکتے ہوئے راستوں پر چل پڑے، یہ جب گھر سے دور دراز مقامات پر پھل پھول کا رس چوستے

کے لئے کہیں جاتی ہے، تو بلا ہر اس کا اپنے گھر میں وہ پس آتا شکل ہونا چاہئے تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اہول کو آسان بنا دیا ہے، ہر پتھر وہ میلوں دور جاتی ہے اور بغیر بھولے بھٹکے اپنے گھر واپس پہنچ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فضا میں اس کے لئے راستے بنا دیئے ہیں، کیونکہ زمین کے پچھڑے راستوں میں بھٹکے کا خطرہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فضا کو اس حقیر ذراتوں مکھی کے لئے مسخر کر دیا تاکہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے گھر آسانی سے آجاسکے۔

اس کے بعد وہی کے اس حکم کا جو حقیقی ثمرہ تھا، اس کو بیان فرمایا یٰضُرُوعُ مِنَّا بُطُورٌ مِّنَا شَرِبَ ابْتِغَاءً لِّلْزَوَانِ فَبِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ کہ اس کے پیٹ میں سے مختلف رنگ کا مٹہ دب نکلتا ہے، جس میں تمنا سے لئے شہد ہے، رنگ کا اختلاف غذا اور موسم کے اختلاف کی بنا پر ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی خاص علاقے میں کس خاص پھل پھول کی کثرت ہو تو اس علاقہ کے شہد میں اس کا اثر روزِ کثرت ہو رہوتا ہے، شہد عموماً پورے سال مادہ کی شکل میں ہوتا ہے اس لئے اس کو شراب دینے کی چیز، فرمایا، اس جملے میں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرتِ کاملہ کی قاطع دلیل موجود ہے، کہ ایک چھوٹے سے جانور کے پیٹ سے کیسا منقعت بخش اور لذیذ مشروب نکلتا ہے، حالانکہ وہ جانور خود زہریلا ہے، زہریلی سے یہ تریاق واقعی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی عجیب مثال ہے، پھر قدرت کی یہ بھی عجیب صنعت گری ہے کہ دودھ دینے والے حیوانات کا دودھ موسم اور غذا کے اختلاف سے سرخ و زرد نہیں ہوتا اور مکھی کا شہد مختلف رنگوں کا ہو جاتا ہے۔

فَبِمَا كَسَبَتْ اِنَّهَا لَتَلِدُنَّ اِسْ، شہد جہاں قوت بخش غذا اور لذت و لعل کا ذریعہ ہے، وہاں امراض کے لئے نسیفہ شہد بھی ہے، اور کیوں نہ ہو، خالق کائنات کی یہ لطیف گشتی مشین ہر قسم کے پھل پھول سے مقوی عرق اور پاکیزہ ہو ہر کشیدہ کر کے اپنے محفوظ گھروں میں ذخیرہ کرتی ہو اگر چہ جڑی بوٹیوں میں شہد اور دوا کا سامان ہے تو ان کے جوہر میں کیوں نہ ہوگا، بعض امراض میں بلا واسطہ اور دوسرے امراض میں دوسرے اجزاء کے ساتھ مل کر بطور دوا شہد استعمال ہوتا ہے، اہلکارِ معجونوں میں بطورِ خاص اس کو شامل کرتے ہیں، اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ خود بھی خراب نہیں ہوتا اور دوسری اشیاء کی بھی طویل عرصہ تک حفاظت کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا سال سے اہلکار اس کو انکھل کی جگہ استعمال کرتے آئے ہیں، شہد مہل ہے اور پیٹ سے فاسد مادہ نکالنے میں بہت مفید ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی نے اپنے بھائی کی بیماری کا حال بیان کیا تو آپ نے اسے شہد پلانے کا مشورہ دیا، دوسرے دن پھر آکر اس نے بتلایا کہ بیماری بدستور ہے، آپ نے پھر وہی مشورہ دیا، تیسرے دن جب

اس نے پھر کہا کہ اب بھی کوئی فرق نہیں ہے تو آپ نے فرمایا: **صَوَّرَ قُلُوبَ بَنِي إِسْرَءِیْلَ**
یعنی اللہ کا قول بلاشبہ سچا ہے، پھر نے بھائی کا پیٹ لٹکتا ہے، یہاں یہ ذکر دراصل قصہ نہیں بلکہ
کے مزاج خاص کی وجہ سے جلدی تر بنا ہر نہیں ہوا، اس کے بعد پھر یوں یا تو یہ بات درست ہو گیا۔

یہاں مشرآن کریم میں شفا کا ذکر ہے، تحت اللفظ ہے، جس سے اس کا ہر مرض کے لئے تو
شفا ہونا معلوم نہیں ہوتا، لیکن شفا کی تینوں جو تعظیم کے لئے ہے اس بات پر ضرور دلالت
کرتی ہے کہ شفا کی شفا عظیم اور ممتاز نوعیت کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے بعض اہل اول بندے

وہ بھی ہیں جن کو شفا کے کسی بھی مرض کے لئے شفا ہونے میں کوئی شبہ نہیں، ان کو اپنے رب کے
قول کے اس ظاہری پراس قدر تسلیم یقین اور مضبوط اعتقاد ہے کہ وہ کبھی گمراہ اور انکسار کا علاج
بھی شہر سے کرتے ہیں اور جسم کے دوسرے امراض کا بھی۔ حضرت ابن عمرؓ کے

متعلق روایت میں ہے کہ ان کے بدن پر اگر چھوڑا بھی نکل آتا تو اس پر شفا کا یہ سبب کر کے
عالج کرتے، بعض لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو جواب میں فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے
مشرآن کریم میں اس کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ **وَفِيهِ شِفَاؤُ كُلِّ دَاءٍ** (قرطبی)۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ دیا ہی حاصل کرتے ہیں جیسا ان بندوں کا
اپنے رب کے متعلق اعتقاد ہوتا ہے، حدیث قدری میں فرمایا: **أَنَا رَبُّ كُلِّ عِلْمٍ عَلَى**
بَنِي إِسْرَءِیْلَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بندہ جو کچھ مجھ سے گمان رکھتا ہے میں اس کے پاس ہوتا ہوں، یعنی
اس کے مطابق کر دیتا ہوں۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ملک کی مذکورہ
بالا مثالیں بیان فرمانے کے بعد انسان کو چہر غور و فکر کی دعوت دی ہے، کہ قدرت کی
ان مثالوں میں غور و فکر کر کے تو دیکھ لو، اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو پانی برسا کر زندہ کر دیتا ہے
وہ غلات و نباتات کے درمیان سے تمھارے لئے سعادت و شفاوت اور خوشگوار دودھ
کی نایاں بیاتا ہے، وہ انگوروں و کھجوروں کے درختوں پر شیریں پھل پیدا کرتا ہے، جن سے تم لذت و شفا
اور مزے دار مرتے بناتے ہو، وہ ایک پھول سے نو ہریے جانداری کے ذریعہ پھرتے، لئے
لذت و طعام اور غدار و شفا کا بہترین سامان مہیا کرتا ہے۔ کیا اب بھی تم ریبوی،

دیوتاؤں کو پکارو گے؟ کیا اب بھی تمھاری عبادت و وفادار اپنے خالق و مالک کے بجائے پتھر
اور کدائی کی بے جان مورتیوں کے لئے ہوگی؟ اور خوب سمجھ لو، کیا یہ بھی تمھاری عقل میں
آ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اندھے بہرے اور بے شعور مادے کی کرشمہ سازی ہو؟ صنعت
کار گیری کے یہ بے شمار کام، حکمت و تدبیر کے یہ حیرت انگیز کارنامے اور عقل و دانش

کے یہ بہترین فیصلے اپنی زبان سال سے پکار پکار کر گویا ہیں کہ ہمارا ایک خالق ہے، کتنا دھمکت والا خالق تو ہی عبادت و وفار کا مستحق ہے، وہی شکل کشا ہے، اور شکر و حمد اسی کو سزاوار ہے۔

(۱۱) آیت سے معلوم ہوا کہ عقل و شعور انسانوں کے علاوہ دوسرے جانداروں میں بھی ہے۔ **فَوَاقِد** یعنی ہے۔ **وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا قَبِيْطٌ بِحَسْبِ**، البتہ عقل کے درجات مختلف ہیں انسانوں کی عقل تمام ذی حیات اشیاء کی عقلوں سے زیادہ کامل ہو، اسی وجہ سے وہ احکام شرعیہ کا مکلف ہو، یہی وجہ ہے کہ اگر جنوں کی وجہ سے انسان کی عقل میں فتور آجائے تو دوسری مخلوقات کی طرح وہ بھی مکلف نہیں رہتا۔

(۱۲) شہد کی مکھی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی فضیلت میں حدیث وارد ہوئی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الَّذِي تَأْتِي مَكْبَأَتِي الْمَسَايِرُ
يَجْعَلُنَا عِنْدَ اَبَايَا قَلْبِ النَّارِ
اِلَّا النَّحْلَ،

(نوادر الاصول بحوالہ قدس)

یعنی دوسری ایذا دہاں سال جانداروں کی طرح مکھیوں کی بھی تمام قسمیں جہنم میں جاتیں گی، جو وہاں چمٹیوں پر بطور غذا مستعمل کر دی جائیں گی، مگر شہد کی مکھی جہنم میں نہیں جائے گی۔

یہ ایک حدیث میں آپ نے اس کو مارنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

(۱۳) اطباء کا اس میں کلام ہے کہ شہد کی مکھی کا فضلہ ہو یا اس کا لعاب ہو، ارسطو طائیس نے شیشے کا ایک نفیس پستہ بنا کر مکھیوں کو اس میں بند کر دیا تھا، وہ ان کے نظام کار کو جاننا چاہتا تھا، لیکن ان مکھیوں نے سب سے پہلے برتن کے اندرونی حصہ پر موم اور کیچڑ کا پردہ چڑھا دیا اور جب تک پوری طرح پردہ پوش نہیں ہو گئیں اُس وقت تک اپنا کام شروع نہیں کیا۔ حضرت علی کریم اللہ وجہ نے دنیا کی حقارت کی مثال دیتے ہوئے فرمایا،

اَمْسَ وَنَبَاَسَ بَنِي اٰدَمَ فَيَدِ
لَعَابِ ذُو دَقَّةٍ وَ اَشْرَفَ
شَرَّ اٰبِهٖ رَجِيْعُ رَجُلَةٍ،

”انسان کا بہترین ریشی بس اس کا نشانہ
کے ایک چھوٹے سے کیڑے کا لعاب اور
اس کا نفیس لذت بخش مشروب کی نفی“

(۱۴) **فِيْهِ شِفَاؤُ لِّلنَّاسِ** سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوا سے مرض کا علاج کرنا جائز ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بطور انعام ذکر کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے **وَنُزِّلَ مِنَ الْمُرَّةِ اِنْ مَّا هُوَ شِفَاؤُ لِّلْمَرِيْضِ**، حدیث میں دوا استعمال کرنے اور علاج کرنے کی ترغیب آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

بعض حضرات نے سوال کیا کہ کیا ہم وہ استعمال کریں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں، علاج کر لیں کہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی مرض پیدا کیا ہے اس کے لئے دوا بھی پیدا فرمائی ہے، مگر ایک مرض کا علاج نہیں، انہوں نے سوال کیا وہ مرض کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا بلا حیا و زانیہ و الترمذی بحوالہ قرطبی،

حضرت شریک رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ جو ہم بیمار پھونک کو عمل کرتے ہیں یا دوا سے اپنا علاج کرتے ہیں، اسی طرح بچاؤ اور حفاظت کے ہوا انتظامات کرتے ہیں کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ کہیں تو تقدیر الہی کی سورتیں ہیں۔

غرض یہ کہ علاج کرنے اور دوا استعمال کرنے کے جو اوزار پر تمام علماء متفق ہیں، اور اس سلسلے میں بے شمار احادیث و آثار وارد ہوئے ہیں، حضرت ابن عمرؓ کی اولاد میں مگر کسی کو پھونکاٹ لیتا تھا تو اسے تریاقی پلاتے تھے، اور جھاڑ پھونک سے اس کا علاج فرماتے، آپ نے لقوہ کے مرض پر داغ لگا کر اس کا علاج کیا (قرطبی)

بعض صوفیاء کے متعلق منقول ہے کہ وہ علاج کو پسند نہیں کرتے تھے، اور حضرت صحابہ میں سے بھی بعض کے عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے، مثلاً روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے، حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ ان کی سیادت کے لئے تشریف لائے اور ان سے پوچھا، آپ کو کیا شرکایت ہے؟ انہوں نے جواب دیا مجھے اپنے گناہوں کی فکر ہے، حضرت عثمانؓ نے فرمایا پھر کس چیز کی خواہش ہے؟ فرمایا میں اپنے رب کی رحمت کا طلب گزار ہوں، حضرت عثمانؓ نے فرمایا آپ پسند کریں تو میں طبیب کو بلا لیتا ہوں؟ انہوں نے جواب دیا، طبیب ہی نے تو مجھے لٹایا ہے، یہاں مجازی طور پر طبیب مراد اللہ تعالیٰ شانہ ہیں، لیکن اس قسم کے واقعات اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ حضرات علاج کو مکروہ سمجھتے تھے، ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کے ذوق کو گوارہ نہیں تھا، اس لئے طبیعت کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے پسند نہیں کیا، یہ وقتی طور پر غلبہ حال کی ایک کیفیت ہوتی ہے جس کو علاج کے ناجائز یا مکروہ ہونے کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا، حضرت عثمانؓ کا حضرت ابن مسعودؓ سے درخواست کرنا کہ میں آپ کے لئے طبیب لے آتا ہوں خود اس بات کی دلیل ہے کہ علاج جائز ہے، بلکہ بعض صورتوں میں یہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ لَآ وَفِيْكُمْ مِّنْ يُّرْسِدُ اِلَىٰ اَرْضٍ لِّ

اور اللہ نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دیتا ہے اور تم میں سے کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں

الْعُمُرِ لَكُمْ لَا يَخْلَعُ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۷۰

کو تاکہ سب سے پہلے اب کچھ نہ کہے۔ اللہ خبردار ہے قدرت والا۔

۹
ع
۱۵

خلاصہ تفسیر

اور اپنی حالت بھی سوچنے کے قابل ہو کہ (اللہ تعالیٰ نے تم کو (اول) پیدا کیا پھر (آخر) تم کو (پہلے) تمہاری جان قبض کرتا ہے (جن میں بعض تو ہوش و حواس میں چلتے ہاتھ پاؤں اکٹھا جاتے ہیں) اور بعض تم میں وہ ہیں جو ناکارہ ہو کر کبھی نہ جاتے ہیں (جن میں نہ قوت جسمانیہ رہی نہ قوت عقلیہ رہی) جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے (جیسا کہ اکثر ایسے بوڑھوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ابھی ان کو ایک بات بتلائی اور ابھی بھول گئے اور پھر اس کو پوچھ رہے ہیں) بے شک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی قدرت والے ہیں (علم سے ہر ایک مسئلہ جانتے ہیں، اور قدرت سے ویسا ہی کر دیتے ہیں) اس لئے حیات و وفات کی حالتیں مختلف کر دیں، پس یہ بھی دلیل ہے توحید کی: ﴿

معارف و مسائل

اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے پانی، نباتات، چوپائے اور شہد کی مکھی کے مختلف احوال بیان فرما کر انسان کو اپنی قدرت کا مکمل اور متفوق کے لئے اپنے انعامات پر متنبہ کیا، اب ان آیات سے اس کو اپنے اندرونی حالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ انسان کچھ نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود کی دولت سے نوازا پھر جب پایا موت بھیج کر وہ نعمت ختم کر دی، اور بعضوں کو تو موت سے پہلے ہی پیرانہ سالی کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں کہ ان کے ہوش و حواس ٹھکھکاتے نہیں رہتے، ان کے ہاتھ پاؤں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، نہ وہ کوئی بات سمجھ سکتے ہیں، اور نہ بھیجی ہوئی یاد رکھ سکتے ہیں، یہ آذوقہ اور انفسی فیہ و تبدل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم و قدرت اسی ذات کے خزانہ میں ہے جو خالق و مالک ہے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرْسِدُ اِلَىٰ اَرْضٍ لِّ الْعُمُرِ لَكُمْ لَا يَخْلَعُ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۷۰

پہلے بھی ایک ضمنت اور کہہ دے گی کا وقت گزر چکا ہے، اس کے بچپن کا ابترا لائی و در تھا جس

میں یہ کسی شوجہ نہ جھوٹا رکھتا تھا، اس کے قوی بالکل ضعیف و ناتواں تھے، یہ اپنی بھوک پیاس کو دہرا کر کے اور اپنے اٹھنے بیٹھنے میں غیروں کا محتاج تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جوانی عطا کی یہ اس کی ترقی کا زمانہ ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کو بڑھاپے کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں جس میں یہ بالکل اسی طرح کمزوری، ضعیف اور انحطال کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جیسا کہ بچپن میں تھا۔

أَرَادَ لِي الضَّعْفُ، اس سے مراد پیرانہ سالی کی وہ عمر ہے جس میں انسان کے تمام جسمانی اور دماغی قوی منتقل ہو جاتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عمر سے پناہ مانگتے تھے، ارشاد کر:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَخَذْتُ بِكَ مَوْتَ
شَوْبِ الضَّعْفِ فِي رِوَايَةٍ
فَمَا أَنْ أَرَادَ لِي الضَّعْفُ

یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں
بڑی عمر سے، اور ایک روایت میں ہو کہ پناہ
مانگتا ہوں ارذلِ عمر سے۔

ارذلِ العمر کی تعریف میں کوئی تعین نہیں ہے، البتہ مذکورہ تعریف راجح معلوم ہوتی ہے جس کی طرف قرآن نے بھی لَکَيْلًا يَعْلَمَ بَعْدَ ثَبَاتٍ سے اشارہ کیا ہے، کہ وہ ایسی عمر ہے جس میں ہوش و بوا اس باقی نہیں رہتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات بھول جاتا ہے۔

ارذلِ العمر کی تعریف میں اور بھی اقوال ہیں، بعض نے انش سال کی عمر کو ارذلِ عمر قرار دیا ہے اور بعض نے نوے سال کو، حضرت علیؓ سے بھی پچھتر سال کا قول منقول ہے،
در صحیحین بحوالہ مظہری

لَکَيْلًا يَعْلَمَ بَعْدَ ثَبَاتٍ، پیرانہ سالی کے انتہائی درجہ میں پہنچنے کے بعد آدمی میں نہ قوتِ جسمانی رہتی ہے اور نہ ہی عقلیہ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے، وہ تمام معلومات بھول کر بالکل نکل کے بچنے کی مانند ہو جاتا ہے، جس کو نہ علمِ خبر ہے اور نہ ہی فہم و فراست، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کی یہ حالت نہیں ملے گی۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ يَوْمَ بَيْتِكَ اللَّهُ تَعَالَى بَرْءُ عِلْمٍ أَلَا، بڑی قدرت والے ہیں۔

وہ علم سے ہر شخص کی عمر کو جانتے ہیں اور قدرت سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، اگرچاہیں تو طاقت ور نوجوان پر ارذلِ عمر کے آثار طاری کر دیں، اور چاہیں تو ستر سال کا معمر انسان بھی طاقت ور جوان رہے، یہ سب کچھ اسی ذات کے دستِ قدرت میں ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِي يُرَى

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں، سو جن کو

فَضْلًا بِرَأْدِي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَهُمْ فِيهِ

بڑائی دی وہ نہیں پہنچا دیتے اپنی روزی ان کو جن کے مالک ان کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب

سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿۷۱﴾

اس میں برابر ہو جائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اور راہبات توحید کے ساتھ شرک کی قباحت ایک باہمی معاملہ کے ضمن میں منو کہ، اللہ تعالیٰ نے تم میں اجنوں کو اجنوں پر رزق (کے باب) میں فضیلت دی ہے (مثلاً کسی کو غنی اور غلاموں کا مالک بنایا کہ ان کے ہاتھ سے ان غلاموں کو بھی رزق پہنچتا ہے اور کسی کو غلام بنادیا، کہ اس کو مالک ہی کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو نہ ایسا غنی بنایا کہ دوسرے غلاموں کو نہ غلام بنایا کہ اس کو کسی مالک کے ہاتھ سے پہنچے) سو جن لوگوں کو (رزق میں خاص) فضیلت دی گئی ہے (کہ ان کے پاس مال بھی ہو اور غلام بھی ہیں) وہ (لوگ) اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس میں برابر ہو جائیں (کیونکہ اگر غلام رکھ کر دیا تو مال ان کی ملک ہی نہ ہوگا، بلکہ بدستور یہی مالک رہیں گے، اور اگر آزاد کر کے دیا تو مساوات ممکن ہو مگر وہ غلام نہ رہیں گے، پس غلامی اور مساوات ممکن نہیں، اسی طرح یہ بُت و غیرہ جب باعتراف مشرکین خدا تعالیٰ کے مملوک ہیں، تو باوجود مملوک ہونے کے عبودیت میں خدا کے مماثل کیسے ہو جائیں گے، اس میں شرک کی انتہائی تقبیح ہے کہ جب تمھارے غلام تمھارے شریکِ رزق نہیں ہو سکتے تو اللہ تعالیٰ کے غلام اس کے شریکِ الوہیت کیسے ہو سکتے ہیں) کیا (یہ مضامین سن کر) پھر بھی (خدا کے تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس سے عقلاً یہ لازم آتا ہے کہ) خدا تعالیٰ کی نعمت کا (یعنی اس بات کا کہ خدا نے نعمت دی ہے) انکار کرتے ہیں؟

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنے علم و قدرت کے اہم مظاہر اور انسان پر مبذول ہونے والی نعمتوں کا تذکرہ فرما کر اپنی توحید کے فطری دلائل بیان فرمائے ہیں، جن کو دیکھ کر ادنیٰ سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کسی مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی صفاتِ علم و قدرت وغیرہ میں شریک نہیں مان سکتا، اس آیت میں اسی مضمونِ توحید کو ایک باہمی معاملہ کی مثال سے واضح

کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے انسانی مصالیح کے پیش نظر رزق میں سب انسانوں کو برابر نہیں کیا، بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور مختلف درجات قائم فرمائے، کسی کو ایسا غنی بنادیا جو ساز و سامان کا مالک ہو، چشم و خدم، غلام و خدمتگار رکھتا ہے، وہ خود بھی اپنی منشاء کے مطابق خرچ کر لیتا، اور غلاموں، خدمتگاروں کو بھی اس کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو غلام و خدمتگار بنادیا کہ وہ دوسروں پر تو کیا خرچ کرتے ان کا اپنا خرچ بھی دوسروں کے ذریعہ پہنچاتا ہے، اور کسی کو متوسط الحال بنایا، نہ اتنا غنی کہ دوسروں پر خرچ کرے، نہ اتنا فقیر و محتاج کہ اپنی ضروریات میں بھی دوسروں کا دست نگر ہو۔

اس قدرتی تقسیم کا یہ اثر سب کے مشاہد میں ہے کہ جس کو رزق میں فضیلت دی گئی اور غنی بنایا گیا وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مال کو اپنے غلاموں، خدمتگاروں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ وہ بھی مال میں اس کے برابر ہو جائیں۔

اس مثال سے سمجھو کہ جب مشرکین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بت اور دوسری مخلوقات جن کی وہ پرستش کرتے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مملوک ہیں تو یہ کیسے تجویز کرتے ہیں کہ یہ مخلوق و مملوک اپنے خالق و مالک کے برابر ہو جائیں، کیا یہ لوگ یہ سب نشانیاں دیکھ کر اور یہ مضامین سن کر پھر بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک اور برابر قرار دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اگر یہ اقرار ہوتا کہ یہ سب نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ان میں کسی خود تراشیدہ جت کا یا کسی انسان اور جن کا کوئی دخل نہیں ہے تو پھر ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے قرار دیتے؟

یہی مضمون سورۃ روم کی اس آیت میں بھی ارشاد ہوا ہے:

مَرْبَّكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّثْرَ

شَاةٍ كَأَنَّ فِي مَادَرَسَاتِكُمْ فَا تَنْتَفِعُونَ بِهَا لَكُمُ (سورۃ روم آیت ۲۸) ”مختارے لئے تمہاری

میں سے ایک مثال دہی ہے، جو لوگ تمہارے زیر دست ہیں کیا وہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں تمہارے شریک ہیں کہ تم اس میں برابر ہو گئے ہو۔“

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تم اپنے مملوک غلاموں اور خدمتگاروں کو اپنے برابر کرنا پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لئے یہ کیسے پسند کرتے ہو کہ وہ اور اس کی مخلوق و مملوک چیزیں اس کے برابر ہو جائیں۔

محاش میں درجات کا اختلاف | اس آیت میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فقر و غنی اور معیشت
انسانوں کے لئے رحمت ہے | میں انسانوں کے مختلف درجات ہونا کہ کوئی غریب ہو کوئی امیر

کوئی متوسط الحال۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، حق تعالیٰ کی حکمت بالذکر کا تقاضا ہے اور انسانی معاش کا مقصد ہی اور انسانوں کے لئے رحمت ہے، اگر یہ صورت نہ رہے اور مال و سامان میں سب انسان برابر ہو جائیں تو نظام عالم میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے گا، اسی لئے جب دنیا آباد ہوئی کسی دور اور کسی زمانے میں سب انسان مال و متاع کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوئے، اور نہ ہو سکتے ہیں، اور اگر کہیں زبردستی ایسی مساوات پیدا کر بھی دی جائے تو چند ہی روز میں تمام انسانی کاروبار میں خلل اور فساد کا مشاہدہ ہو جائے گا، حق تعالیٰ نے جیسے تمام انسانوں کو عقل و دماغ اور قوت و طاقت اور صلاحیت کار میں مختلف مزاہجوں پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں ادنیٰ، اعلیٰ، متوسط کی اقسام ہیں، جس کا کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا، اسی ملرت یہ بھی ناگزیر ہے کہ مال و متاع میں بھی یہ مختلف درجات قائم ہوں کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا صلہ پائے، اور اگر اہل صلاحیت اور نااہل کو برابر کر دیا گیا تو اہل صلاحیت کی جو مشکلی ہوگی، جب معیشت میں اس کو نااہلوں کے برابر ہی رہنا ہے تو وہ کوئی ناسا داعیہ ہے جو اسے جدوجہد اور فکر و عمل پر مجبور کرے، اس کا لازمی نتیجہ صلاحیت کار کو برباد کرنا ہوگا۔

ارٹکار دولت کے | البتہ خالق کائنات نے جہاں عقلی اور جسمانی قوتوں میں بعض کو بعض پر فضیلت
خلا قرآنی احکام | دی اور اس کے تابع رزق اور مال میں تفاوت قائم فرمایا، وہیں معاش کا یہ
نظام حکم بھی قائم فرمایا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دولت کے خزانوں اور کسب معاش کے مرکزوں
پر چند افراد یا کوئی خاص جماعت قبضہ کر لے، دوسرے اہل صلاحیت کے کام کرنے کا میدان ہی باقی
نہ رہے کہ وہ اپنی عقلی اور جسمانی صلاحیتوں سے کام لے کر معاش میں ترقی کر سکیں، اس کے لئے
قرآن کریم سورۃ حشر میں ارشاد فرمایا: **لَا يَكُونُ دُولًا كَابْنِ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ**، یعنی
ہم نے تقسیم دولت کا قانون اس لئے بنایا کہ دولت صرف سرمایہ داروں میں منحصر ہو کر نہ رہ جائے۔
آج کل دنیا کے معاشی نظاموں میں جو افراطی پھیلی ہوئی ہے وہ اس ربانی قانون حکمت
کو نظر انداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے، ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں دولت کے مرکزوں پر
سود و قمار کے راستے سے چند افراد یا جماعتیں قابض ہو کر باقی ساری مخلوق کو اپنا معاشی غلام
بنانے پر مجبور کر دیتی ہیں، ان کے لئے بجز غلامی اور مزدوری کے کوئی راستہ اپنی ضروریات
حاصل کرنے کے لئے نہیں رہ جاتا، وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود صنعت و تجارت کے میدان
میں قدم نہیں رکھ سکتے۔

سرمایہ داروں کے اس ظلم و جور کے ردی عمل کے طور پر ایک متضاد نظام اشتراکیت کیونٹا
یا سوشلزم کے نام سے وجود میں آتا ہے، جس کا نعرہ غریب و امیر کے تفاوت کو ختم کرنا اور سب

میں مساوات پیدا کرنا ہے، ظالمانہ سرمایہ داری کے مظالم سے متنگ آنے ہوئے عوام اس نعرہ کے پیچھے لگ جاتے ہیں، مگر چند ہی روز میں وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ یہ نعرہ محض فریب تھا، معاشی مساوات کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا، اور غریب اپنی غربت اور فقر و فاقہ کے ساتھ بھی جو ایک انسانی احترام رکھتا تھا اپنی مرضی کا مالک تھا، یہ احترام انسانیت بھی ہاتھ سے جاتا رہا، نظام اشتراکیت میں انسان کی کوئی قدر قیمت مشین کے ایک پیرزے سے زائد نہیں، کسی جائداد کی ملکیت کا تو وہاں تصور ہی نہیں ہو سکتا، اور جو معاملہ وہاں ایک مزدور کے ساتھ کیا جاتا ہے اس پر غور کریں تو وہ کسی چیز کا مالک نہیں، اس کی اولاد اور بیوی بھی اس کی نہیں بلکہ سب ریاست کی مشین کے گل پیرزے ہیں جن کو مشین ہٹا دیتے ہیں اپنے کام پر لگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ریاست کے مفروضہ مقاصد کے سوا اس کا کوئی ضمیر ہے نہ آواز، ریاست کے جبر و تشدد اور ناقابل برداشت محنت سے کراہنا ایک بغاوت شمار ہوتا ہے، جس کی سزا موت ہے، خدا تعالیٰ اور مذہب کی مخالفت اور خالص مادہ پرستی نظام اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے کوئی اشتراکی انکار نہیں کر سکتا، ان کے پیشواؤں کی کتابیں اور اعمال نامے اس کے شاہد ہیں کہ ان کے حوالوں کو جمع کرنا بھی ایک مستقل کتاب بنائے بغیر قرآن حکیم نے ظالمانہ سرمایہ داری اور امتحانہ اشتراکیت کی دونوں انتہاؤں کے درمیان افراد و تفریط سے پاک ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ رزق اور دولت میں فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد یا جماعت مائدہ مفلوک کو اپنا غلام نہ بنا سکے، اور مصنوعی گرائی اور قیلا میں مبتلا نہ کر سکے، سود اور بڑے کو حرام قرار دے کر ناجائز سرمایہ داری کی بنیاد منہدم کر دی، پھر ہر مسلمان کے مال میں غریبوں کا حق متعین کر کے شریک کر دیا، جو غریبوں پر احسان نہیں، بلکہ ادائی فرض ہے، آیت فی أموالکم حق معلوم لستائل والتمحوروم اس پر شاہد ہے، پھر مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام ملکیت کو افرادِ خاندان میں تقسیم کر کے ارتکازِ دولت کا خاتمہ کر دیا، قدرتی حشیوں، سمندروں اور پہاڑی جنگلوں کی خود رو پیداوار کو تمام خلقِ خدا کا مشترک سرمایہ قرار دے دیا، جس پر کسی فرد یا جماعت کا قبضہ مالکانہ جائز نہیں، جب کہ سرمایہ داری نظام میں یہ سب چیزیں صرف سرمایہ داروں کی ملکیت قرار دی گئی ہیں۔

چونکہ علیٰ عملی صلاحیتوں کا متفاوت ہونا ایک ادنیٰ فطری ہے، اور تمسیل معاش بھی انہی صلاحیتوں کے تابع ہے، اس لئے مال و دولت کی ملکیت کا متفاوت ہونا بھی عین تقاضائے حکمت ہے، جس کو دنیا کا کچھ بھی عقل و شعور پروردہ اس کا انکار نہیں کر سکتا اور مساوات کے نعرے لگانے والے بھی چند قدم چلنے کے بعد اس مساوات کے دعوے

کو چھوڑنے اور حیثیت میں تفاوت و تقاضی پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خروشیعت نے ۵ مئی ۱۹۱۷ء کو سپریم سویت کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:
 ”ہم اجزوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں، ہم اجزوں میں مساوات
 قائم کرنے اور ان کے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں، یہ لیٹن کی تعلیم ہے
 اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی محرکات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔
 (سویت ورلڈ، ص ۳۴۶)

معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر عدم مساوات تو ابتداء ہی سے سامنے آگئی تھی، مگر دیکھو
 یہی دیکھتے یہ عدم مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکت روس میں عام سرمایہ دار ملکوں
 سے بھی آگے بڑھ گیا۔

لیون شیڈ وکھتا ہے:

”شاید ہی کوئی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک ایسا ہو جہاں مزدوروں کی اجزوں میں اتنا

تفاوت ہو جتنا روس میں ہے۔“

واقعات کی ان چند مثالوں نے آیت مذکورہ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ
 کی تفسیر صدیق منکرین کی زبانوں سے کرا دی وَاللّٰهُ يُفَضِّلُ مَا يَشَاءُ، یہاں اس آیت کے تحت تو صرف
 اتنا ہی بیان کرنا تھا کہ رزق و مال میں تفاوت قدرتی اور فطری اور عین مصالح انسانی کے مطابق
 ہے، باقی تقسیم دولت کے اسلامی اصول اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اس کا امتیاز و
 انشاء اللہ تعالیٰ سورہ زخرف پارہ نمبر ۵۲ آیت زَحْنٌ قَسَمْنَا بَيْنَهُنَّ مَا فِيكُنَّ لَهُنَّ مِنَ الثَّمَرَاتِ کے تحت میں
 آئے گا، اور اس مونسورخ پر احقر کا ایک مستقل رسالہ ”اسلام کا نظام تقسیم دولت“ کے نام سے
 شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ بھی کافی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں اور دیئے تم کو تمہاری

اَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَلَةً وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ اَفَبِالْبَاطِلِ

عورتوں سے بیٹے اور پوتے اور کھانے کو دے تم کو ستھری چیزیں سو کیا بھولتے

يُوعِدُونَ وَبِغَيْبِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ (۲۱) وَيَعْبُدُونَ

باتیں مانتے ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے، اور بدبخت ہیں

مَنْ دُونَ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِشْقًا مِّنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

اللہ کے سوائے ایسوں کو جو مختار نہیں ان کی روزی کے آسمان اور زمین سے

شَيْءًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ (۳۳) فَلَا تَضُرُّهُ إِلَّا مِثَالُ إِنْ

کچھ بھی اور نہ قدرت رکھتے ہیں، سومت چسپاں کرو اللہ پر مثالیں، بیشک

اللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۳۴) ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، اللہ نے بتلایا ایک مثال ایک بندہ

مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَمِنْ رَّزْقِ اللَّهِ مَنَارُهَا وَاحْسَنَافَهُوَ

پرایا مال نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر اور ایک جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف غمی روزی

يَنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا أَهْلُ يَسْتَوُونَ (۳۵) الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ

وہ خرچ کرتا اس میں چھپا کر اور سبک رو برد، کہیں برابر ہوتے ہیں، سب تعریف اللہ کو ہو، پر

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۳۶) وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ

بہت لوگ نہیں جانتے، اور بتائی اللہ نے ایک دوسری مثال دو مرد ہیں

أَحَدُهُمَا أَتَىٰ بِكُمُ اللَّيْلُ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ

ایک گونگا کچھ کام نہیں کر سکتا، اور وہ بھاری ہے اپنے صاحب پر

أَيُّهَا يُوْجِّهُهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ لَا وَمَنْ يَأْمُرُ

جس طرف اس کو بھیجے نہ کر کے لائے کچھ بھلائی، کہیں برابر ہو وہ اور ایک وہ شخص جو حکم

بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۳۷)

کرتا ہو انصاف سے اور ہے سیدھی راہ پر۔

خلاصہ تفسیر

اور منجملہ دلائل قدرت و وجہ نعمت کے ایک بڑی نعمت اور دلیل قدرت اللہ تعالیٰ کی خود مختار وجود و بقاء شخصی و نوعی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے یعنی تمہاری جنس اور نوع سے تمہارے لئے بیبیاں بنائیں اور (پھر) ان بیبیوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کرو

کہ یہ بقار نوعی ہے، اور ہم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کہ دیں (کہ یہ بقار شخص ہوا اور چونکہ بقار موقوف ہے وجود پر اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا) کیا یہ سب والائل و نعم سنکر، پھر بھی بے بنیاد چیز پر یعنی بتوں وغیرہ پر جن کے مجبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلاف دلیل ہو، ایمان رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری (بے قدری) کرتے رہیں گے، اور (مطلب اس ناشکری کا یہ ہے کہ) اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے جو ان کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے (یعنی نہ بارش برسانے کا ان کو اختیار ہے نہ زمین سے کچھ پیدا کرنے کا) اور نہ (اختیار حاصل کرنے کی) قدرت رکھتے ہیں اس کی نفی سے زیادہ مبایعہ ہو گیا، کیونکہ بعض دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص بالفعل تو با اختیار نہیں ہو، لیکن جدوجہد سے اختیارات حاصل کر لیتا ہے، اس لئے اس کی بھی نفی فرمادی) سو جب شرک کا بطلان ثابت ہو گیا تو تم اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں مت گھڑو (کہ اللہ تعالیٰ کی مثال بادشاہان دنیا کی سی ہے کہ ہر شخص ان سے عرض حاجت نہیں کر سکتا، اس لئے اس کے نائب ہوتے ہیں کہ عوام ان سے عرض حاجت کرتے ہیں، پھر وہ سلاطین سے عرض کرتے ہیں کذا فی الکبریٰ و یوحسن من قولہ مَا نَعْبُدُہُمْ إِلَّا لِمَقَرِّبُوْنَا وَھُوَ لَا یَسْمَعُ شَفَاعًا وَّنَا عِنْدَ اللّٰہِ) اللہ تعالیٰ (خوب) جانتے ہیں (کہ ایسی مثالیں محض مہمل ہیں) اور ہم (بوجہ عدم تدبر کے) نہیں جانتے (اس لئے جو چاہتے ہو بیک ڈالتے ہو اور) اللہ تعالیٰ (شرک کے بطلان ظاہر کرنے کے لئے) ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) ایک (تو) غلام ہے (کسی کا) ملوک کہ (اموال و تصرفات میں سے) کسی چیز کا ر بلا اجازت آقا، اختیار نہیں رکھتا اور (دوسرا) ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی مے رکھی تو اس میں سے پوشیدہ اور غلامیہ (جس طرح چاہتا ہے وہاں چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے (اس کو کوئی روکنے توکنے والا نہیں) کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہو سکتے ہیں (بس جب مالک مجازی و ملوک مجازی برابر نہیں ہو سکتے، تو مالک حقیقی و ملوک حقیقی تو کب برابر ہو سکتے ہیں اور استحقاق عبادت و قوف ہے مساوات پر، اور وہ ہے نہیں) ساری تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں کیونکہ کامل الذات والصفات وہی ہیں، پس مجبود بھی وہی ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی مشرکین غیر اللہ کی عبادت نہیں چھوڑتے، بلکہ ان میں اکثر (بوجہ عدم تدبر کے) جانتے ہی نہیں (اور چونکہ عدم علم کا سبب خود ان کا عدم تدبر ہے اس لئے معذور نہ ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ (اس کی توفیق کے لئے) ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) دو شخص ہیں جن میں ایک تو سلاوہ غلام ہونے کے (گو نگا رہا بھی) ہے (اور بوجہ بہرے اندھے بے عقل ہونیکے)

کوئی کام نہیں کر سکتا اور (اس وجہ سے) وہ اپنے مالک پر وبال جان ہے (کہ وہ مالک ہی اس کے سائے کام کرتا ہے اور) وہ (مالک) اس کو جہاں بھیجتا ہے کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا، یعنی خود تو کیا کتر یا دوسروں کی تعلیم سے بھی اس سے کوئی کام درست نہیں ہوتا ہو کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم کرتا ہو جس سے اس کا ناطق، عاقل صاحب قوت علیہ ہونا معلوم ہوتا ہے (اور خود بھی رہا اہر میں) معتدل طریقہ پر (چلتا) ہو، جس سے قوت عملیہ مستطعمہ معلوم ہوتی ہے جب مخلوق مخلوق میں باوجود اشتراک ماہیت و اشتراک اوصاف کے یہ تفاوت ہے تو کجا مخلوق و خالق، اور لایق قدر کے ترجمہ میں بلا اجاز آفاق قید سے جو سابقہ آیات میں نفی شہادت مندفع ہو گئے، اور کوئی دوسرے میں نہ پڑے کہ شاید معبود غیر اللہ کو بھی اذن ہو گیا ہو، جواب یہ ہے کہ ربوبیت کے لئے کسی کو اذن نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔

معارف ومسائل

جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا، اس آیت میں ایک اہم نعمت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس اور قوم میں سے تمہاری بیبیاں بنائیں تاکہ باہمی موانست بھی پوری ہو، اور نسل انسانی کی شرافت و بزرگی بھی قائم رہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیبیاں تمہاری ہی جنس کی ہیں انکی ضروریات اور جذبات بھی تمہارے ہی جیسے ہیں، ان کی رعایت تم پر لازم ہے۔
وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَنًا، یعنی تمہاری بیبیوں سے تم نے تمہارے بیٹے پوتے پیدا کئے۔

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ اولاد تو ماں باپ دونوں ہی سے مل کر پیدا ہوتی ہے، اس آیت میں اس کو صرف ماؤں سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ بچہ کی تولید و تخلیق میں بہ نسبت باپ کے ماں کا دخل زیادہ ہے، باپ سے تو صرف ایک قطرہ بے جان نکلتا ہے اس قطرہ پر مختلف قسم کے دور گزرتے ہوئے انسانی شکل میں تبدیل ہونا اور اس میں جان پڑنا قدرت کے ان سارے تخلیقی کارناموں کا محفل تو ماں کا ہیٹ ہی ہے، اسی لئے حدیث میں ماں کے حق کو باپ کے حق پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اس جملے میں بیٹوں کے ساتھ پوتوں کا ذکر فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس جوڑے بنانے کا اصل مقصد نسل انسانی کی بقا ہے کہ اولاد پھر اولاد کی اولاد ہوتی رہے تو یہ انسان کی بقا نوعی کا سامان ہوا۔

پھر وَذَرَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ میں اس کی بقاءِ شخصی کے سامان کا ذکر فرمادیا کہ انسان پیدا ہو جائے تو پھر اس کی بقاءِ شخصی کے لئے غزا کی ضرورت ہو، وہ بھی حق تعالیٰ نے مہیا فرمادی، آیت میں لفظ حَفْدَہ کے اصلی معنی مددگار اور خدمت گار کے ہیں، اولاد کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہو کہ اولاد کو اپنے ماں باپ کا خادم ہونا چاہی (قریبی) فَلَا تَخْصِبْ جُؤَاسِیۡہِ الْاِمۡثَالَ میں ایک اہم حقیقت کو واضح فرمایا ہے، جس سے غفلت برتنا ہی تمام کافرانہ شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ حق تعالیٰ کو اپنے بنی نوع انسان پر قیاس کر کے ان میں سے اعلیٰ ترین انسان مثلاً بادشاہ و فرمانروا کو اللہ تعالیٰ کی مثال قرار دیتے ہیں، اور پھر اس غلط بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے نظامِ قدرت کو بھی انسانی بادشاہوں کے نظام پر قیاس کر کے یہ کہنے لگتے ہیں کہ جس طرح کسی سلطنت حکومت میں اکیلا بادشاہ سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا، بلکہ اپنے ماتحت وزراء اور دوسرے افسروں کو اختیارات سپرد کر کے ان کے ذریعہ نظم مملکت چلایا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کے ماتحت کچھ اور مجبور بھی ہوں جو اللہ کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں، یہی تمام بُت پرست اور مشرکین کا عام نظریہ ہے، اس جملے نے ان کے شبہات کی جڑ قطع کر دی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق کی مثالیں پیش کرنا خود بے عقلی ہے، وہ مثال و تمثیل اور ہمارے وہم و گمان سے بالاتر ہے۔

آخری دو آیتوں میں انسان کی جو دو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں سے پہلی مثال میں تو آقا اور غلام یعنی مالک اور مملوک کی مثال دے کر بتلایا کہ جب یہ دونوں ایک ہی جنس ایک ہی نوع کے ہوتے ہوئے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے تو کسی مخلوق کو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیسے برابر ٹھہراتے ہو۔

اور دوسری مثال میں ایک طرف ایک انسان ہے، جو لوگوں کو عدل و انصاف اور اچھی باتیں سکھاتا ہے، جو اس کی قوتِ علمیہ کا کمال ہے، اور خود بھی معتدل اور سیدھے راستے پر چلتا ہے، جو اس کی قوتِ عملیہ کا کمال ہے، اس علمی اور عملی قوت میں مکمل انسان کے بالمقابل وہ انسان ہے جو نہ خود اپنا کام کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے کا کوئی کام درست کر سکتا ہے، یہ دونوں قسم کے انسان ایک ہی جنس ایک ہی نوع ایک ہی برادری کے ہونے کے باوجود آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، تو خالق و مالک کائنات جو حکیم مطلق اور قادر مطلق اور علیم وخبیر ہے اس کے ساتھ کوئی مخلوق کیسے برابر ہو سکتی ہے۔

وَلِلّٰهِ خَبْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلِمَةٍ

اور اللہ ہی کے پاس ہیں بحیرہ آسمانوں اور زمین کے اور قیامت کا کام تو ایسا ہی جیسے لپک

الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰ وَاللّٰهُ اَخْرَجَ

نگاہ کی یا اس سے بھی قریب اللہ ہر چیز پر قادر ہے ، اور اللہ نے تم کو نکالا

مِّنْ اَبْطُونِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کہیں چیز کو اور دیتے سم کو کان اور

الْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۱ الْمَرْيَدُ اِلٰی

آنکھیں اور دل ، تاکہ تم احسان مانو ، کیا نہیں دیکھے

الطَّيْرِ مَسَّحِرَتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَاءِ مَا یُسْكِنُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِیْ

اڑتے جانور حکم کے باندھے ہوئے آسمان کی ہوائیں کوئی نہیں تھا رہا ان کو سوا اللہ کے اس میں

ذٰلِكَ لَا یَتْلُوْهُمۡ اِلَّوۡهٌ مُّنۢوِنٌ ۝۱۲ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِنْۢ بَیۡوتِكُمۡ

نشانیاں ہیں اُن لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ، اور اللہ نے بنا دیئے تم کو تمہارے گھر

سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ مِنْۢ جُلُوۡدِ الْاَنْعَامِ بَیۡوتًا تَسْتَخِفُّوۡنَهَا یَوْمَ

بسنے کی جگہ اور بنا دیئے تم کو چوپاؤں کی کھال سے ڈیرے جو ہلکے رہتے ہیں تم پر جس دن

ظَعِنَکُمْ وَیَوْمَ اِقَامَتِکُمْ ۝۱۳ وَ مِنْ اَصۡوَافِہَا وَاَوۡبَارِہَا وَاَشْعَارِہَا

سفر میں ہو اور جس دن گھر میں ہو ، اور بھیڑوں کی آؤں سے اور اونٹوں کی ہرلوں اور کبریوں کی بالوں

اَنَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰی حَیۡنٍ ۝۱۴ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلَالًا

سے کتنے اسباب استعمال کی چیزیں وقت مقرر تک ، اور اللہ نے بنا دیئے تمہارے واسطے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے ساتھ

وَجَعَلَ لَكُمۡ مِنَ الْجِبَالِ اَکۡنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ سَرَایِیۡلَ تَقِیُّکُمۡ

اور بنا دیں تمہارے واسطے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں اور بنا دیئے تم کو کرتے جو چھاؤ ہیں

الْحَرَّ وَ سَرَایِیۡلَ تَقِیُّکُمۡ بِاَسۡکُمۡ کَذٰلِکَ یَتِمُّ نِعْمَتُہٗ عَلَیْکُمۡ

گرمی میں اور کرتے جو بچھاؤ ہیں لڑائی میں ، اسی طرح پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر

لَعَلَّكُمْ تَسْلَمُونَ ﴿۸۱﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُونَ

تاکہ تم حکم مانو ، پھر اگر پھر جائیں تو تیرا کام تو یہی ہو کہ بول کر سنارینا ، پہچانتے ہیں

نِعْمَتَ اللَّهِ تَمَيِّزُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۸۳﴾

اللہ کا احسان پھر منکر ہو جاتے ہیں اور بہت ان میں ناشکر ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں جو کسی کو معلوم نہیں باعتبار علم کے اللہ ہی کے لئے
خاص ہیں (وہ صفت علم میں وہ کامل ہیں) اور قدرت میں ایسے کامل ہیں کہ ان غیوب میں سے جو
ایک امر عظیم (یعنی قیامت) اس کا معاملہ بس ایسا (جھٹ پٹ) ہو گا جیسے آنکھ جھپکنا، بلکہ
اس سے بھی جلدی قیامت کے معاملہ سے مراد ہے۔ مردوں میں جان پڑنا اور اس کا بہ نسبت
آنکھ جھپکنے کے جلدی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ آنکھ جھپکنا حرکت ہے اور حرکت زمانی ہوتی ہے،
اور جان پڑنا آتی ہے، اور آتی ظاہر ہے کہ زمانی سے اتر رہا ہے، اور اس پر تعجب نہ کیا جائے کیونکہ
یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (اور اثبات قدرت کے لئے تخصیص قیامت
کی شاید اس وجہ سے کی ہو کہ وہ جملہ غیوب خاصہ کے بھی ہے، اس لئے وہ علم اور قدرت دونوں
کی دلیل ہے، قبل الوقوع تو علم اور بعد الوقوع قدرت کی) اور (جملہ دلائل قدرت و وجہ
نعمت یہ امر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ
بھی نہ جانتے تھے (اس درجہ کا نام فلاسفہ کی اصطلاح میں عقل ہیولانی ہے) اور اس نے تم کو
نکال دینے اور آنکھ اور دل تاکہ تم شکر کرو (ہستدلال علی القدرت کے لئے) کیا لوگوں نے
پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے (تِلے) فضاء میں (قدرت کے) مسخر ہو رہے ہیں (یعنی) انکو
(اس جگہ) کوئی نہیں تھا مگر اللہ کے (ورنہ ان کے اجسام کا ثقیل ہونا اور مادہ ہوا کا
رقیق و لطیف ہونا قطعاً مقتضی اس کو ہے کہ نیچے گر پڑیں، اس لئے اس امر مذکور میں) ایمان والوں
کے لئے (قدرت الہیہ کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں (چند نشانیاں اس لئے فرمایا کہ پرندوں
کو خاص وضع پر پیدا کرنا جس سے اڑنا ممکن ہو، ایک دلیل ہی، پھر فضاء کو ایسے طرز پر پیدا
کرنا جس میں اڑنا ممکن ہو دوسری دلیل ہے، پھر بالفعل اس طیران کا وقوع تیسری دلیل ہے
اور جن اسباب کو طیران میں دخل ہے وہ سب اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان
اسباب پر مسبب یعنی طیران کا مرتب ہو جانا یہ بھی مشیت الہی ہے، ورنہ اکثر ایسا بھی

ہوتا کہ کسی چیز کے اسباب و جزو ہوتے ہوئے بھی وہ وجود میں نہیں آتی، اس لئے مَآئِنِ سَكُونٍ فرمایا گیا، اور منجملہ وجوہ نعمت و دلائل قدرت یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے (حالتِ حضر میں) تمہارے گھر وں میں رہنے کی جگہ بنائی (اور حالتِ سفر میں) تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر (یعنی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام (کرنے) کے دن ہلکا بھلکا پاتے ہو (اور اس وجہ سے اس کا لادنا اور نصب کرنا سب سہل معلوم ہوتا ہے) اور ان (جانوروں) کے اُن اُنکے رُودن اور ان کے بالوں سے (تمہارے) گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لئے بنائیں (مدت تک اس لئے فرمایا کہ عَادۃً یہ سامان بہ نسبت رُودن کے کپڑوں کے دیر پا ہوتا ہے، اور منجملہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت کے ایک یہ ہو کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اپنی بعض مخلوقات کے ساتھ بنائے (جیسے درخت و مکانات وغیرہ) اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں (یعنی غار وغیرہ جس میں گرمی سردی، بارش، موذی دشمن جانور آدمی سے محفوظ رہ سکتے ہو) اور تمہارے لئے ایسے کرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں اور ایسے کرتے (بھی) بنائے جو تمہاری آپس کی لڑائی (میں زخم لگنے) سے تمہاری حفاظت کریں (امداد اس سے زیادہ ہیں) اللہ تعالیٰ تم پر اسی طرح کی اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے کہ تم ان نعمتوں کے مشکریہ میں (فرمانبردار رہو،) اور ہر چند کہ مذکورہ نعمتوں میں بعض مصلحت عباد بھی ہیں، مگر ان کا مادہ اور ان کے بنانے کا سلیقہ تو اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے منعم حقیقی وہی ہیں پھر ان نعمتوں کے بعد بھی) اگر یہ لوگ ایمان سے اعراض کریں (تو آپ غم نہ کریں آپ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) آپ کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (اور ان کے اعراض کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان نعمتوں کو پہچانتے نہیں، بلکہ وہ لوگ) خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں مگر پہچان کر پھر (برتاؤ میں) اس کے منکر ہوتے ہیں (کہ جو برتاؤ منعم کے ساتھ چاہئے تھا یعنی عبادت و طاعت وہ دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں) اور زیادہ ان میں ایسے ہی ناشکرے ہیں :

معارف و مسائل

قُلْ تَعَالَى لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا، اس میں اشارہ ہے کہ علم انسان کا ذاتی ہنر نہیں، پیدائش کے وقت وہ کوئی علم و ہنر نہیں رکھتا، پھر ضرورتِ انسانی کے مطابق اس کو کچھ کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ سکھایا جاتا ہے، جس میں نہ ماں باپ کا دخل ہے نہ کسی معلم کا، سب پہلے اس کو روزنا سکھایا، اس کی یہی صفت اس وقت اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے، بھوک پیاس لگے تو وہ روتا ہے، سردی گرمی لگے تو رو دیتا ہے، کوئی اور تکلیف

پہونچنے تو رو دیتا ہے۔ قدرت نے اس کی ضروریات کے لئے ماں باپ کے دلوں میں خاص اُلفت ڈال دی کہ جب بچے کی آواز سنیں تو وہ اس کی تکلیف کے پہچاننے اور اس کے دور کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اگر بچے کو منجانب اللہ یہ رونے کی تعلیم نہ دی جاتی تو اس کو کون یہ کام سکھا سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے تو اس طرح چلا یا کرے، اس کے ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر یہ بھی سکھا دیا کہ اپنی غذا کو ماں کی چھاتی سے حاصل کرنے کے لئے اپنے مسوڑھوں اور ہونٹوں سے کام لے، اگر یہ تعلیم فطری اور بلا واسطہ نہ ہوتی تو کس معلم کی مجال تھی جو اس نو مولود کو منہ چلانا اور چھاتی کو چومنا سکھا دیتا، اسی طرح بچوں میں اس کی ضروریات بڑھتی گئیں قدرت نے اس کو بلا واسطہ ماں باپ کے خود بخود سکھا دیا، کچھ عرصہ کے بعد اس میں یہ سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے اس کے آذینوں کی بات سن کر یا کچھ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سیکھنے لگتا ہے، اور پھر ان سنی ہوئی آوازوں اور دیکھی ہوئی چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا کے بعد فرمایا وَجَعَلْنَاكُمْ أَشْعَمَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْصَاةَ، یعنی اگرچہ ابتداء پر پیدائش میں انسان کو کسی چیز کا علم نہیں تھا، مگر قدرت نے اس کے وجود میں علم حاصل کرنے کے عجیب و غریب قسم کے آلات نصب کر دیئے تھے، ان آلات میں سب پہلے سمیع یعنی سننے کی قوت کا ذکر فرمایا، جس کی تقدیم کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کا سب سے پہلا علم اور سب سے زیادہ علم کانوں ہی کے رستہ سے آتا ہے، شروع میں آنکھ تو بند ہوتی ہے مگر کان سلتے ہیں، اور اس کے بعد بھی اگر غور کیا جائے تو انسان کو اپنی پوری عمر میں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ کانوں سے سنی ہوئی ہوتی ہیں، آنکھ سے دیکھی ہوئی معلومات اس کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد منبر ان معلومات کا ہے جن کو انسان اپنی سنی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور و فکر کر کے معلوم کرتا ہے، اور یہ کام تشرانی ارشادات کے مطابق انسان کے قلب کا ہے، اس لئے تیسرے منبر میں أَفْصَاةَ فرمایا، جو فواد کی جمع ہے، جس کے معنی قلب کے ہیں، فلاسفہ نے عام طور پر سمیع بوجھ اور ادراک کا مرکز انسان کے دماغ کو قرار دیا ہے، مگر ارشاد تشرانی سے معلوم ہوا کہ دماغ کو اگرچہ اس ادراک میں دخل ضرور ہے، مگر علم و ادراک کا اصلی مرکز قلب ہے۔

اس موقع پر حق تعالیٰ نے سننے، دیکھنے، اور سمجھنے کی قوتوں کا ذکر فرمایا ہے، گویا بیانی اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ نطق اور گویائی کو حصول علم میں دخل نہیں، بلکہ وہ اظہارِ علم کا ذریعہ ہیں، اس کے علاوہ امام ترمذی نے فرمایا کہ لفظ سمیع کے ساتھ نطق بھی ضمناً آگیا، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص سنتا ہے وہ بولتا بھی ہے، گویا جو بولنے پر قادر نہیں وہ کانوں سے بھی بہرا ہوتا ہے، اور

شاید اس کے نہ بولنے کا سبب ہی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی آواز سنتا نہیں، جس کو سن کر بولنا چاہے، واللہ اعلم۔
 وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ مَسْکِنًا، بیت کی جمع ہے، جس مکان میں رات گزاری جائے
 اس کو بیت کہتے ہیں، امام قسطلانی نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

کُلُّ مَا عَلَاكَ فَإِنَّ لَكَ فِيهِ مَسْكَنًا	”جو چیز تمھارے سر سے بلند ہو اور تم پر
وَسَمَاءٌ، وَكُلُّ مَا آفَلَكَ فَهُوَ	سایہ کرے وہ چھت یا سماء کہلاتی ہے، اور
أَرْضٌ وَكُلُّ مَا سَتَرَكَ مِنْ	جو چیز تمھارے وجود کو اپنے اوپر اٹھائے
جِهَاتِكَ الْأَدْبَعِ فَهُوَ جِدَارٌ	وہ زمین ہے، اور جو چیز چاروں طرف سے
فَإِذَا انْشَقَّتْ وَالْعَصَلَتْ فَهُوَ	تمھارا پردہ کرے وہ دیواریں ہیں اور جب یہ
بَيْتٌ،	سب چیزیں جمع ہو جائیں تو وہ بیت ہے۔“

گھر بنانے کا اصل مقصد اس میں حق تعالیٰ نے انسان کے بیت یعنی گھر کو سکون فرما کر گھر بنانے کا فلسفہ
 قلب جسم کا سکون ہے اور حکمت واضح فرمادی کہ اس کا اصل مقصد جسم اور قلب کا سکون ہے،
 عادت انسان کا کسب و عمل گھر سے باہر ہوتا ہے، جو اس کی حرکت سے وجود میں آتا ہے، اس کے گھر کا
 اصلی منشاء یہ ہے کہ جب حرکت و عمل سے تھک جائے تو اس میں جا کر آرام کرے، اور سکون حاصل کرے
 اگرچہ بعض اوقات انسان اپنے گھر میں بھی حرکت و عمل میں مشغول رہتا ہے مگر یہ عادت کم ہے۔
 اس کے علاوہ سکون اصل میں قلب و دماغ کا سکون ہے، وہ انسان کو اپنے گھر میں ہی حاصل
 ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انسان کے مکان کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اس میں سکون
 ملے، آج کی دنیا میں تعمیرات کا سلسلہ اپنے عروج پر ہے، اور ان میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بے حد
 خرچ بھی کیا جاتا ہے، لیکن ان میں ایسے مکانات بہت کم ہیں جن میں قلب اور جسم کا سکون حاصل ہو،
 بعض اوقات تو مصنوعی تکلفات خود ہی آرام و سکون کو برباد کر دیتے ہیں، اور وہ بھی نہ ہو تو گھر
 میں جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اس سکون کو ختم کر دیتے ہیں، ایسے عالی شان مکانات سے وہ
 بگلی اور جھونپڑی ابھی ہے جس کے رہنے والے کے قلب و جسم کو سکون حاصل رہا ہو۔

قرآن کریم ہر چیز کی روح اور اصل کو بیان کرتا ہے، انسان کے گھر کا اصل مقصد اور سب سے
 بڑی غرض و غایت سکون کو قرار دیا، اسی طرح ازدواجی زندگی کا اصل مقصد بھی سکون قرار دیا کہ
 لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا، جس ازدواجی زندگی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو وہ اس کے اصل فائدے سے محروم
 ہے، آج کی دنیا میں ان چیزوں میں رسمی اور غیر رسمی تکلفات اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی حد
 نہیں رہی، اور مغربی تمدن و معاشرت نے ان چیزوں میں ظاہری زیب و زینت کے سارے
 سامان جمع کر دیئے، مگر سکون قلب و جسم سے قطعاً محروم کر ڈالا۔

قَوْلِهِمْ ذَا لَآئِعَامٍ دِقْوَلِهِمْ مِنْ أَصْوَابِهَا وَأَوْبَارِهَا، سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی کھال اور بال اور اُون سب کا استعمال انسان کے لئے حلال ہے، اس میں یہ بھی قید نہیں کہ جانور مذکور ہو یا مردار اور نہ یہ قید ہے کہ اس کا گوشت حلال ہے یا حرام، ان سب قسم کے جانوروں کی کھال و باغٹ دے کر استعمال کرنا حلال ہے، اور بال اور اُون پر تو جانور کی موت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، وہ بغیر کسی خاص صنعت کے حلال اور جائز ہے، امام اعظم ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے، البتہ خنزیر کی کھال اور اس کے تمام اجزاء ہر حال میں نجس اور ناقابل استغاثہ ہیں۔

سَرَابِيلٌ تَقِيكُمُ الْحَرَّ، یہاں انسان کو گرمی کی غرض گرمی سے بچانے کو فرمایا ہے، حالانکہ گرمی انسان کو گرمی اور سردی دونوں سے بچاتا ہے، اس کا ایک جواب تو امام قرطبی اور دوست مفسرین نے یہ دیا ہے کہ قرآن حکیم عربی زبان میں آیا ہے، اس کے اولین مخاطب عرب ہیں، اس لئے اس میں عرب کی عادات و ضروریات کا لحاظ رکھ کر کلام کیا گیا ہے، عرب ایک گرم ملک ہے، وہاں برف باری اور سردی کا تصور ہی شکل ہے، اس لئے گرمی سے بچانے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا، حضرت تھانویؒ نے بیان قرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم نے اسی سورۃ کے شروع میں لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ فرما کر لباس کے ذریعہ سردی سے بچنے اور گرمی حاصل کرنے کا ذکر پہلے کر دیا تھا، اس لئے یہاں صرف گرمی دِفْءِ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَرِيذًا تُمْرَ لَا يُوْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

اور جس دن کھڑا کریں گے ہر فرقہ میں ایک بتلائی والا پھر حکم نہ ملے مسکروں کو

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (۱۴) وَإِذَا رَأَوْا الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ

اور نہ اُن سے توبہ لی جائے، اور جب دیکھیں گے ظالم عذاب کو پھر

فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ (۱۵) وَإِذَا رَأَوْا الَّذِينَ يَنْ

ہلکا نہ ہو گا اُن سے اور نہ اُن کو ڈر حاصل ملے، اور جب دیکھیں

أَشْرَكَ كَمَا هُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَؤُلَاءِ شُرَكَائُنَا الَّذِينَ

مشرک اپنے شریکوں کو بولیں اے رب یہ ہمارے شریک ہیں جن کو

۱۰۰

كُنَّا نَدْعُوا مِنْ دُونِكَ ۚ فَاَنْقَرُوا اِلَيْهِمْ الْقَوْلَ ۖ اِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۸۹﴾

ہم پکارتے تھے تیرے سوا تب وہ اُن پر ڈالیں گے بات کہ تم جھوٹے ہو،

وَالْقَوَا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ اِلْسَلَمَ ۚ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۹۰﴾

اور آپڑیں اللہ کے آگے اس دن عاجز ہو کر اور بھول جائیں جو جھوٹ باندھتے تھے،

الَّذِينَ كَفَرُوا وَاصْطَدُوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۖ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ

جو لوگ منکر ہوتے ہیں اور روکتے رہیں اللہ کی راہ سے ان کو ہم بڑھا دیں گے عذاب پر

الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿۹۱﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ اُمَّةٍ

عذاب بدلہ اس کا جو شرارت کرتے تھے، اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں

شَرِيْدًا ۖ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَرِيْدًا ۚ عَلٰی هٰٓؤُلَاءِ

ایک بتلانے والا ان پر اپنی میں کا اور تجھ کو لائیں بتلانے کو ان لوگوں پر،

وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تَبٰیٰنًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت

وَبَشٰرٰی لِّلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۲﴾

اور خوش خبری حکم ماننے والوں کے لئے

خلاصہ تفسیر

اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہو) جس دن ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (کہ اس

امت کا پیغمبر ہو گا) قائم کریں گے (جو ان کے اعمالِ ستیتہ کی شہادت دیں گے) پھر ان کافروں کو

عذروہ عذرت کرنے کی) اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے حق تعالیٰ کے راضی کرنے کی

فرمائش کی جائے گی (یعنی ان سے یوں نہ کہا جائے گا کہ تم تو یہ یہ کوئی عمل کر کے اللہ کو خوش کر لو،

وہ جو اس کی ظاہر ہے کہ آخرت دارالجزا ہے دارالعمل نہیں، اور جب ظالم (یعنی کافر) لوگ عذاب

کو دیکھیں گے (یعنی اس میں پڑیں گے) تو وہ عذاب نہ ان سے ہٹا کیا جائے گا اور نہ وہ (اس میں)

کچھ بہت دیتے جائیں گے (کہ چند روز کے بعد وہ عذاب جاری کیا جائے) اور جب مشرک لوگ

اپنے مشرکوں کو (جن کو خدا کے سوا پوجتے تھے) دیکھیں گے تو ابطور اقرار جرم کے کہیں گے کہ

ایہاں پر درکار! وہ ہمارے شریک ہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کو پوجا کرتے تھے سو وہ (شرکاء) ڈریں گے کہ کہیں ہماری کم بختی نہ آجائے اس لئے) وہ ان کی طرف کلام کو متوجہ کریں گے کہ تم جھوٹے ہو اصل مطلب ان کا یہ ہو گا کہ ہمارا امتحان کوئی تعلق نہیں جس سے مقصود اپنی حفاظت ہے اب خواہ یہ مطلب ان کا صحیح ہو جیسا اگر مقبولین مثل ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کے یہ بات کہیں تو صحیح ہے، کقولہ تعالیٰ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِبْنَ اور خواہ یہ غلط ہو جیسے خود شیاطین کہنے لگیں، اور خواہ ان کو صحیح غلط ہونے کی خبر ہی نہ ہو، جیسے اصنام و اشجار وغیرہ کہنے لگیں) اور یہ مشرک اور کافر لوگ اس روز اللہ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ (دنیا میں) افتراء پر دازیاں کرتے تھے (اس وقت) وہ سب گم ہو جائیں گے (اور ان میں) جو لوگ (خود بھی) کفر کرتے تھے (اور دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے اُن کے لئے ہم ایک سزا پر رکہ کفر کے مقابلہ میں ہو گی) دوسری سزا بمقابلہ ان کے فساد کے (کہ راہ خدا سے روکتے تھے) بڑھا دیں گے۔

اور (وہ دن بھی یاد کرنے اور لوگوں کے ڈرنے کا ہی) جس دن ہم ہر امت کے ایک ایک گواہ جو انہی میں کا ہو گا ان کے مقابلہ میں قائم کریں گے (مراد اس امت کا نبی ہے اور انہی میں کا ہونا عام ہے خواہ باعتبار شرکت نسب کے ہو خواہ باعتبار شرکت سکنی کے ہو) اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (اور اس اخبار شہادت سے جو آپ کی رسالت کا انجا مفہوم ہوتا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے جو (علاوہ معجز ہونے کے) جو کہ مدار ہے اثبات رسالت کا اُن خوبیوں کا جامع ہے، کہ تمام (دین کی) باتوں کا دوا سطر یا بلا واسطہ عامۃ الناس کے لئے) بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور (ایمان پر) خوشخبری سنانے والا ہے ۛ

معارف و مسائل

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِّلشَّيْءِ ۚ اِس میں کتاب یعنی قرآن کو ہر چیز کا بیان فرمایا گیا ہے، مراد اس سے دین کی سب چیزیں اور باتیں ہیں، کیونکہ وحی و نبوت کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے، اس لئے معاشی فنون اور ان کے مسائل کو قرآن میں ڈھونڈنا ہی غلط ہے، اگر کہیں کوئی ضمنی اشارہ آجائے تو وہ اس کے منافی نہیں، رہا یہ سوال کہ قرآن کریم میں دین کے بھی نسب مسائل مذکور نہیں تو تَبْيَانًا لِّلشَّيْءِ کہنا کیسے درست ہو گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اصول تو تمام مسائل کے موجود ہیں، انہی کی روشنی میں احادیث رسول اللہ ص ان مسائل کا بیان کرتی ہیں، اور کچھ تفصیلات کو اجماع و قیاس شرعی

کے سپرد کر دیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع و قیاس سے جو مسائل نکلتے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کے ہوتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ

اللَّهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۹۰﴾

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کے دینے کا اور منع کرتا ہے الفحشاء والمنکر والبغی سے تم کو تاکہ تم یاد رکھو۔

خلاصہ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ (قرآن میں) اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی بُرائی اور مطلق بُرائی اور کسی پر ظلم (اور زیادتی) کرنے سے منع فرماتے ہیں (اور) امورِ مذمومہ کی مذہبیات مذکورہ میں تمام اعمالِ صالحہ اور ستیہ آگے، اس جامعیت کی وجہ سے قرآن کا تبیان ہونا صاف ظاہر ہے اور اللہ تعالیٰ تم کو (امور مذکورہ کی) اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو اور عمل کرو، کیونکہ ہدٰی اور رحمت اور بشارتیں ہونا اسی پر موقوف ہے)۔

معارف و مسائل

یہ آیت قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے، جس میں پوری اسلامی تعلیمات کو چند الفاظ میں سمودیا گیا ہے، اسی لئے سلفِ صالحین کے عہدِ مبارک سے آج تک دستور چلا آ رہا ہے کہ جمعہ و عیدین کے خطبوں کے آخر میں یہ آیت تلاوت کی جاتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی جامع ترین آیت سورۃ نحل میں یہ ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (ابن کثیر)

اور حضرت اکثم بن صیفیؓ تو اسی آیت کی بناء پر اسلام میں داخل ہوئے، امام ابن کثیر نے حافظاتِ حدیث ابو یعلیٰ کی کتاب معْرِفَةُ الصَّحَابِہ میں سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اکثم بن صیفی اپنی قوم کے سردار تھے، جب اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اشاعتِ اسلام کی خبر ملی تو ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں، مگر قوم کے لوگوں نے کہا کہ آپ ہم سب کے بڑے ہیں، آپ کا خود جانا مناسب نہیں، اکثمؓ نے کہا کہ اچھا تو قبیلہ کے دو آدمی منتخب کرو جو وہاں جائیں، اور حالات کا جائزہ لے کر مجھے بتلائیں یہ دونوں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اکثم بن صیفی کی طرف سے دو باتیں دریافت کرنے کے لئے آئے ہیں، اکثم کے دو سوال یہ ہیں؛

مَنْ أَنْتَ وَمَا أَنْتَ ، | آپ کون ہیں اور کیا ہیں ؟

آپ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ میں محمد بن عبد اللہ ہوں اور دوسرا سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس کے بعد آپ نے سورہ نحل کی یہ آیت تلاوت فرمائی: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الْآيَةِ ۹۰ فَوَاقِدِ رُوحِی نے درخواست کی کہ یہ جملہ ہمیں پھر سنائیے، آپ اس آیت کی تلاوت کرتے رہے یہاں تک کہ ان قاصدوں کو آیت یاد ہو گئی قاصد واپس اکثم بن صیفی کے پاس آئے اور بتلایا کہ ہم نے پہلے سوال میں یہ چاہا تھا کہ آپ کا نسب معلوم کریں، مگر آپ نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی صرف باپ کا نام بیان کر دینے پر اکتفا کیا، مگر جب ہم نے دوسروں سے آپ کے نسب کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ بڑے عالی نسب شریف ہیں، اور پھر بتلایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کچھ کلمات بھی سنائے تھے وہ ہم بیان کرتے ہیں۔

ان قاصدوں نے آیت مذکورہ اکثم بن صیفی کو سنائی، آیت سنتے ہی اکثم نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکارم حسلاق کی ہدایت کرتے ہیں اور بڑے سے اور رذیل انسانوں سے روکتے ہیں، تم سب ان کے دین میں داخل ہو جاؤ تاکہ تم دوسرے لوگوں سے مقدم اور آگے رہو، پیچھے تابع بن کر نہ رہو (ابن کثیر)

اسی طرح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں میں نے لوگوں کے کہنے سننے سے شرمناک شرمی اسلام قبول کر لیا تھا، مگر میرے دل میں اسلام راسخ نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک روز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، اچانک آپ پر نزل وحی کے آثار ظاہر ہوئے، اور بعض عجیب حالات کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قصہ میرے پاس آیا، اور یہ آیت مجھ پر نازل ہوئی، حضرت عثمان بن مظعونؓ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو دیکھ کر اندر آیت سن کر میرے دل میں ایمان مضبوط و مستحکم ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میرے دل میں گھر کر گئی، (ابن کثیر نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے)۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کے سامنے تلاوت فرمائی تو اس کا تاثر یہ تھا جو اس نے اپنی قوم قریش کے سامنے بیان کیا:

وَاللّٰهُ اِنَّ لَهُ لِحَلَاوَةً وَّادًا | خدا کی قسم اس میں ایک خاص حلاوت ہے اور

عَلَيْهِ لَطْلُؤَةٌ وَآثَانٌ أَصْلُهُ مُتَوَرِّقٌ
وَأَعْلَاهُ لَمْتُورٌ وَمَا هُوَ بِقَوْلٍ بَشَرٍ

اس کے اوپر ایک خاص رونق اور نور ہے اس کی جڑ
منہیں اور پتے نکلنے والے ہیں اور شاخوں پر پھیل گئے

والا ہے، یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

تین چیزوں کا حکم اور اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے، عدل، احسان، اور اس قرأت
تین چیزوں کی ممانعت کو بخشش اور تین چیزوں سے منع فرمایا ہے، نفس کا کام، اور ہر ہر کام، اور ظلم و
تعدی، ان تین الفاظ کی شرعی مفہوم اور اس کے حدود کی تشریح یہ ہے:

عدل، اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اسی کی مناسبت سے حکماء
کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عدل کہلاتا ہے، قرآن کریم میں
أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ اس معنی کے لئے آیا ہے، اور اسی لحاظ سے لفظ عدل افرط تفریط
کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ
لفظ عدل کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعمال
سے سرزد ہو باطن میں بھی اسکا وہی اعتقاد اور حال ہو، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ
عدل اپنے عام معنی میں ہے، جو ان سب صورتوں کو شامل ہے جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول
ہیں، ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔

اور ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف
نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس
اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے
حظ نفس پر اور اس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے، اور اس کے احکام کی تعمیل
اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ ہے کہ
اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اس کی
ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام
لے، نفس پر بلا وجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

تیسرا عدل اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ
تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، اور کسی ادنیٰ اعلیٰ معاملہ میں
کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی
انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہر یا باطناً کوئی ایذا اور تکلیف نہ پہنچے۔

اسی طرح ایک عدل یہ ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا خاکہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے، اور ایک عدل یہ بھی ہو کہ ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے، ابو عبد اللہ رازیؒ نے یہی محسنی اختیار کر کے فرمایا ہو کہ لفظ عدل میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں (بحر محیط)

امام قرطبیؒ نے عدل کے مفہوم میں اس تفصیل کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ تفصیل بہت بہتر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کا صرف لفظ عدل تمام اعمال و اخلاقِ حسنہ کی پابندی اور برے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے۔

الْإِحْسَان، اس کے اصل لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ فعل یا خلق و عادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے، اور دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف الی استعمال ہوتا ہے، جیسا ایک آیت میں احْسِنْ كَمَا احْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ فرمایا ہے۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ آیت میں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے، اس لئے احسان کی دونوں قسموں کو شامل ہے، پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا کرنا یہ بھی عام ہے عبادات کو اچھا کرنا، اعمال و اخلاق کو اچھا کرنا، معاملات کو اچھا کرنا۔

حضرت جبریلؑ کی مشہور حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کے جو معنی بیان فرماتے ہیں، وہ احسان عبادت کے لئے ہے، اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر دو کہ گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم خدا کا یہ درجہ نصیب ہو تو اتنی بات کا یقین تو ہر شخص کو ہونا ہی چاہئے کہ حق تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم جزو ہے کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حکم اس آیت میں احسان کا آیا ہے، اس میں عبادت کا احسان حدیث کی تشریح کے مطابق بھی داخل ہے، اور تمام اعمال، اخلاق، عبادت کا احسان یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق بالکل صحیح و درست کرنا بھی داخل ہے، اور تمام مخلوقات کیسے اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہو خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، انسان ہوں یا حیوان۔

اہم قرطبی نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر میں اس کی بیوی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے بچے میں بندہ پندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو وہ کتنی ہی عبادت کرے عسین میں شمار نہیں ہوگا۔

اس آیت میں اذل عدل کا حکم دیا گیا پھر احسان کا بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دیدے اور اپنا وصول کرنے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف نہیں پہنچائے تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ نہ کم نہ زیادہ، اور احسان یہ کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دے دو جو اپنے حق میں چشم پوشی ہو کام لو کہ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کر لو، اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذا پہنچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو محاف کر دو، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اسی طرح عدل کا حکم تو فرض و واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرع کے طور پر ہوا۔ ایتا ذی القربى، تیسرا حکم ہے اس آیت میں دیا گیا ہے وہ ایتا ذی القربى ہے، ایتار کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں، اور لفظ قربى کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں، ذی القربى کے معنی رشتہ دار، ذی رحم، ایتا ذی القربى کے معنی ہو کر رشتہ دار کو کچھ دینا یہاں اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ کیا چیز دینا، لیکن ایک دوسری آیت میں اس کا مفعول مذکور ہے قَاتِ ذِ الْقَرْبَى حَقَّهُ، یعنی دور رشتہ دار کو اس کا حق، ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی یہی مفعول مراد ہے، کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا جائے، اس حق میں رشتہ دار کو مال دے کر مالی خدمت کرنا بھی داخل ہے، اور جسمانی خدمت بھی، پیار پرسی اور خبر گیری بھی، زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی، اور اگرچہ لفظ احسان میں رشتہ داروں کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا مگر اس کو اس کی زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔

یہ تین حکم ایجابی تھے، آگے تین ممانعت و حرمت کے احکام ہیں:-

وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ، یعنی اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے فحشاء اور منکر اور بغی سے، فحشاء ہر ایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اس کو بُرا سمجھے، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہل شرع کا اتفاق ہو، اس لئے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جاسکتا، اور لفظ منکر میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی، عملی اور اخلاقی سب داخل ہیں، اور بغی کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم و عدوان ہے، یہاں اگرچہ لفظ منکر کے مفہوم میں فحشاء بھی داخل ہے اور بغی بھی، لیکن فحشاء کو اس کی انتہائی بُرائی اور شناعیت کی وجہ سے الگ کر کے بیان فرمایا اور مقدم کیا، اور بغی کو اس لئے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں

ایک متحد ہی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ و جدل تک یا اس سے بھی آگے عالمی فساد تک پہنچ جاتی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو، اس سے محال ہے کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہونا ہی ہے اس سے پہلے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی سزا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چہ حکم ایجابی اور تحریمی دیے ہیں اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخہ اکیسویں رزق خدا اللہ تعالیٰ اتباع۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ

اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو بچھا کرنے

تَزَكِّيهِمْ هَا وَكَلَّ جَعَلْتُمْ اللَّهُ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا

کے بعد اور تم نے کیا ہی اللہ کو اپنا ضمانت اللہ جانتا ہے جو تم

تَفْعَلُونَ ۚ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَضَتْ غَزْلَهُمَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ

کرتے ہو اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اس نے اپنا سوت کا تا ہوا منت کے بعد

أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ

ملکڑے لکڑے کہ تمہارا اپنی قسموں کو دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک فرقہ ہو

أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ إِنْهَا يَبْلُوكُمْ اللَّهُ بِهِ وَلِيَسِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ

چڑھا ہوا دوسرے سے یہ تو اللہ پر کستا ہی تم کو اس سے اور آئندہ کھول دے گا اللہ تم کو

الْقِيَمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَفُونَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ

قیامت کے دن، جس بات میں تم جھگڑا رہے تھے، اور اللہ چاہتا تو سب کو

أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ

ایک ہی فرقہ کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جسکو چاہتا ہے اور بھٹاتا ہے جسکو چاہتا ہے

وَلْتَسْأَلَنَ عَنْمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۹۳﴾ وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا

اور تم سے پوچھ ہوگی جو کام کرتے تھے ، اور نہ تمہارا اپنی قسموں کو دھوکا ،

بَيْنَكُمْ فَتْرًا قَدْ مُمْ بَعْدَ ثَبَرْتُمَا وَتَدُّوْنَ السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ

آپس میں کہ ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جتنے کے پیچھے اور تم چھو سزا اس بات پر کہ تم نے روکا

عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ

اللہ کی راہ سے اور تم کو بڑا عذاب ہو ، اور نہ لا اللہ کے عہد پر

اللَّهُ ثَمَنًا قَلِيلًا إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ

مول حقوڑا سا ، بیشک جو اللہ کے یہاں ہو وہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم

تَعْلَمُونَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّهُ

جانتے ہو ، جو تمہارے پاس ہر ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہو کبھی ختم نہ ہوگا ، اور ہم بدلہ میں دیں گے

الَّذِينَ صَبَرُوا وَأَجْرُهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

صبر کرنے والوں کو ان کا حق اچھے کاموں پر جو کرتے تھے

خلاصہ تفسیر

ایفاء عہد کا حکم اور اور تم اللہ کے عہد کو ریعنی جس عہد کے پورا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو پورا عہد شکنی کی مذمت کرو اس سے وہ نکل گیا جو خلافت شرع عہد ہو اور باقی سب عہود مشرکیت خواہ متعلق حقوق اللہ کے ہوں یا متعلق حقوق العباد کے ہوں اس میں داخل ہو گئے ، جبکہ تم اس کو (تخصیصاً یا تعیناً) اپنے ذمہ کر لو رخصتاً یہ کہ صراحتاً کسی کام کا ذمہ لے لیا اور تعیناً یہ کہ ایمان لائے تو تمام احکام واجہہ کی ذمہ داری اس کے ضمن میں آگئی ، اور بالخصوص جن عہود میں قسم بھی کھائی ہو وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں ، سو ان میں قسموں کو ابدان کے مستحکم کرنے کے ریعنی اللہ کا نام لے کر قسم کھانے کے) مت توڑو اور تم ان قسموں کی وجہ سے ان عہود میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو یہ قیدیں بعد تو کینیدہا اور قد جہلتم ، قید واقعی ہیں و فاء عہد پر تنبیہ کے لئے تصریح کی گئی ، بیشک اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو خواہ وفاء یا عہد شکنی پس اسی کے موافق تم کو جزا و سزا دے گا ، اور تم (نقص عہد کر کے) اس رکنہ میں رہنے والی پاگل عورت کے

مشابہ مت بنو جس نے اپنا سوت کاتے پیچھے بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالا کہ (اس کی طرح) تم (بھی) اپنی قسموں کو بعد رستی کے توڑ کر ان کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو (کیونکہ قسم و عہد توڑنے سے موافقین کو بے اعتباری اور مخالفین کو براہِ نیکیختگی پیدا ہوتی ہے، اور یہ اصل ہو فساد کی اور توڑنا بھی محض اس وجہ سے کہ) ایک گروہ دوسرے گروہ سے (کثرت یا ثروت میں) بڑھ جائے یعنی مثلاً کفار کے دو گروہ ہوں میں باہم مخالفت ہو اور تمھاری ایک سے صلح ہو جائے پھر دوسری طرف پلہ جھکتا ہو ادیکھ کر جس گروہ سے صلح کی تھی اس سے غدر کر کے دوسرے گروہ سے سازش کر لے، یا مثلاً کوئی مسلمان ہو کر مسلمانوں میں شامل ہو اور پھر کافروں کی طرف زور دیکھا تو عہدِ اسلام کو توڑ کر مرتد ہو جائے، اور یہ جو ایک گروہ دوسرے سے بڑھا ہوا ہوتا ہے یا دوسری کسی جماعت کے شامل ہو جانے سے بڑھ جاتا ہے، تو بس اس (زائد ہونے) سے اللہ تعالیٰ تمھاری آزمائش کرتا ہے کہ دیکھیں وفاء عہد کرتے ہو یا جھکتا پلہ دیکھ کر اُدھر ڈھل جاتے ہو) اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے (اور مختلف راہیں چلتے رہے) قیامت کے دن ان سب (کی حقیقت) کو تمھارے سامنے (علاً) ظاہر کر دے گا کہ حق والوں کو جزاء اور باطل والوں کو سزا ہو جائے گی، آگے اس اختلاف کی حکمت بطور جملہ معترضہ کے اجمالاً بیان فرماتے ہیں، اور اگرچہ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت تھی کہ اختلاف نہ ہونے دیتے، چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن، بمقتضائے حکمت جس کی تفصیل تعین یہاں ضروری نہیں، جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں (چنانچہ منجملہ ہدایت کے وفائے عہد اور منجملہ ضلالت کے نقض عہد بھی ہوا اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دنیا میں گمراہوں کو پوری سزا نہیں ہوتی ایسے ہی آخرت میں مطلق العنان رہیں گے ہرگز نہیں بلکہ قیامت میں) تم سے تمھارے سب اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی اور جیسا نقض عہد و قسم سے محسوس ضرر ہوتا ہے جس کا اوپر بیان تھا، اسی طرح اس سے معنوی ضرر بھی ہوتا ہے، آگے اسی کا ذکر ہے یعنی) تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ (یعنی قسموں اور عہدوں کو مت توڑو، کہیں اس کو دیکھ کر کسی اور کا قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے، یعنی دوسرے بھی تمھاری تقلید کریں، اور عہد شکنی کرنے لگیں) پھر تم کو اس سبب سے کہ تم (دوسروں کے لئے) راہِ خدا سے مانع ہوؤ تکلیف جھگڑنا پڑے (کیونکہ وفاء عہد راہِ خدا ہے تم اس کے توڑنے کے سبب بن گئے اور یہی ہر وہ معنوی ضرر کہ دوسروں کو بھی عہد شکن بنایا اور تکلیف یہ ہوگی کہ اس حالت میں) تم کو بڑا عذاب ہوگا اور (جس طرح گروہ غالب میں شامل ہو کر جاہ حاصل کرنے کی غرض سے نقض عہد

منوع ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اسی طرح تفصیل مال کی غرض سے جو عہد توڑا ہو اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ) اور ہم لوگ عہد خداوندی کے عوض میں (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مست حاصل کرو (عہد خداوندی کے معنی تو شروع آیت میں معلوم ہوئے اور ثمن قلیل سے مراد دنیا ہے کہ باوجود کثیر ہونے کے بھی قلیل ہی ہے، اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی کہ) پس اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی ذخیرہ آخرت) وہ تمھارے لئے (متاع دنیوی سے) بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھنا چاہو (پس متاع آخرت کثیر ہوئی اور متاع دنیوی خواہ کتنی بھی ہو قلیل ہوئی) اور (علاوہ تفاوت قلیل و کثیر کے دوسرا تفاوت یہ بھی ہے کہ) جو کچھ تمھارے پاس (دنیا میں) ہے وہ (ایک روز) ختم ہو جائے گا، خواہ زوال سے یا موت سے) اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ (دفاعے عہد وغیرہ احکام دین پر) ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر (یعنی نعمت) باقیہ مذکورہ) ان کو ضرور دیں گے (پس دفاعے عہد کر کے دولت کثیرہ غیر فانیہ کو حاصل کرو اور قلیل فانی کے لئے نقصان عہد مت کرو)

معارف و مسائل

عہد شکنی حرام ہے | لفظ عہد ان تمام معاملات و معاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے الزام کیا جائے یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے۔

اور یہ آیات درحقیقت آیت سابقہ کی تشریح و تکمیل ہیں، آیت سابقہ میں عدل احسان کا حکم تھا، لفظ عدل کے مفہوم میں ایفاء عہد بھی داخل ہے (قرطبی) کسی سے عہد معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا بڑا گناہ ہے، مگر اس کے توڑنے پر کوئی کفارہ معتبر نہیں، بلکہ آخرت کا عذاب ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز عہد شکنی کرنے والے کی پشت پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا، جو میدانِ حشر میں اس کی رسوائی کا سبب بنے گا۔

اسی طرح جس کام کی قسم کھائی اس کے خلاف کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے، آخرت میں وبال عظیم ہے اور دنیا میں بھی اس کی خاص صورتوں میں کفارہ لازم ہوتا ہے (قرطبی)

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةً مِّمَّنْ اٰذٰی مِنْ اُمَّةٍ، اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جس جماعت سے تمھارا معاہدہ ہو جائے اس معاہدہ کو دنیوی اغراض و منافع کے لئے نہ توڑو مثلاً تمھیں یہ محسوس ہو کہ جس جماعت یا پارٹی سے معاہدہ ہوا ہے یہ کمزور اور اتحاد میں قلیل ہے،

یا مال کے اعتبار سے مفلس ہو، اور اس کے بالمقابل دوسری جماعت کثیر اور قوی ہے، یا مال دولت والی ہے، تو صرف اس طبع سے کہ قومی اور مالدار پارٹی میں شامل ہو جانے سے منافع زیبا ہوں گے، پہلی جماعت کا عہد توڑنا جائز نہیں، بلکہ اپنے عہد پر قائم رہے اور نفع و ضرر کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے، البتہ جس جماعت یا پارٹی سے عہد کیا ہے، وہ اگر خلاف شرع امور کا ارتکاب کرے اور کرائے تو اس کا عہد توڑ دینا واجب ہے، بشرطیکہ واضح طور پر ان کو جتلا دیا جائے کہ ہم اب اس عہد کے پابند نہیں رہیں گے، جیسا کہ آیت فَاَنْتَبِہْ اَلَيْحِمْ عَلٰی سَوَآءٍ میں مذکور ہے۔

آخر آیت میں مذکورہ صورت حال کو مسلمان کی آزمائش کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، کہ حق تعالیٰ اس کا امتحان لیتے ہیں، کہ یہ اپنے نفس کی اغراض و خواہشات کا تابع ہو کر عہد کو توڑ دیتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نفسانی جذبات کو قربان کرتا ہے۔

کسی کو دوسرے دینے کے لئے قسم کھانے | وَلَا تَخِيْلُوْا اَنْ يَّكُنَّ دَخَلًا، اس آیت میں ایک اور عظیم میں سلب ایمان کا خطبہ ہے | گناہ اور وبال سے بچانے کی ہدایت ہے، وہ یہ کہ قسم کھاتے

وقت ہی سے اس قسم کے خلاف کرنے کا ارادہ ہو صرف مخاطب کو فریب دینے کے لئے قسم کھائی جائے تو یہ عام قسم توڑنے سے زیادہ خطرناک گناہ ہے، جس کے نتیجہ میں یہ خطرہ ہے

کہ ایمان کی دولت ہی سے محروم ہو جائے، فَ تَنْزِيلًا قَدْ فُتِحَ ثُبُوْتُهَا، کا یہی مطلب (قرآنی ثبوت لینا سخت حرام | وَلَا تَشْكُرُوْا وَاِذْ عٰهَدِ اللّٰہُ ثُمَّ اَقْبَلْتُمْ، عین اللہ کے عہد کو حق توڑی کی

اور اللہ سے عہد شکنی ہے | قیمت کے بدلے میں نہ توڑو، یہاں حق توڑی سی قیمت سے مراد دنیا اور

اس کے منافع ہیں وہ مقدار میں کتنے بھی بڑے ہوں، آخرت کے منافع کے مقابلہ میں ساری دنیا اور اس کی ساری دولتیں بھی قلیل ہی ہیں، جس نے آخرت کے بدلے میں دنیا لے لی اس نے

انتہائی خسارہ کا سودا کیا، کہ ہمیشہ رہنے والی اعلیٰ ترین نعمت و دولت کو بہت جلد فنا ہونے والی گھٹیا قسم کی چیز کے عوض بیچ ڈالنا کوئی سمجھے بوجہ والا انسان گوارا نہیں کر سکتا

ابن عطیہ نے فرمایا کہ جس کام کا پورا کرنا کسی شخص کے ذمہ واجب ہو وہ اللہ کا عہد اس کے ذمہ ہے، اس کے پورا کرنے پر کسی سے معاوضہ لینا اور بغیر لئے نہ کرنا اللہ کا عہد توڑنا اور اسی طرح جس کام کا نہ کرنا کسی کے ذمہ واجب ہے کسی سے معاوضہ لے کر اس کو کر دینا یہ بھی اللہ کا عہد توڑنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رشوت کی مروجہ قسمیں سب حرام ہیں، جیسے کوئی سرکاری ملازم کسی کام کی تنخواہ حکومت سے پاتا ہے تو اس نے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ یہ تنخواہ لے کر مفوضہ

خدمت پوری کر دی گا، اب اگر وہ اس کے کرنے پر کس سے معاوضہ مانگے اور بغیر معاوضہ میں کوئی ملا کر تو یہ عہد اللہ کو توڑ رہا ہے، اسی طرح جس کام کا اس کو محکمہ کی طرف سے اختیار نہیں اس کو رشوت لے کر کر ڈالنا بھی اللہ سے عہد شکنی ہے (بحر محیط)

رشوت کی جامع تعریف ابن عطیہ کے اس کلام میں رشوت کی جامع مانع تعریف بھی آگئی، جو تفسیر بحر محیط کے الفاظ میں یہ ہے:

یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہے اس کے	اخذ الاموال علی فعل ما يجب علی الاخذ فعله او فعل ما يجب علیه تركه
--	---

کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے (تفسیر بحر محیط، ص ۵۳۳ ج ۵)

اور پوری دنیا کی ساری نعمتوں کا قلیل ہونا اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا: مَا عِنْدَ كُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ، یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے (مراد اس سے دنیوی منافع ہیں) وہ سب ختم اور فنا ہونے والا ہے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (مراد اس سے آخرت کا ثواب و عذاب ہی) وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

دنیا کی راحت و کلفت، دوستی، دشمنی سب فنا ہونے والے ہیں اور ان کے ثمرات و نتائج جو اللہ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والے ہیں	مَا عِنْدَ كُمْ کے لفظ سے عام طور پر ذہن صرف مال و متاع کی طرف جاتا ہے، استاد محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انفظ ما لفت کے اعتبار سے عام ہے، اور عموم کے معنی مراد لینے سے کوئی امر شرعی مانع نہیں۔
---	---

اس لئے اس میں دنیا کا مال و متاع بھی داخل ہے، اور اس میں پیش آنے والے تمام حالات و معاملات، خوشی اور غم، بچ اور راحت، بیماری اور صحت، نفع اور نقصان کسی کی دوستی یا دشمنی یہ سب چیزیں شامل ہیں کہ سب کی سب فنا ہونے والی ہیں، البتہ ان حالات و معاملات پر جو آثار مرتب ہونے والے ہیں اور قیامت میں ان پر عذاب و ثواب ہونے والا ہو وہ سب باقی رہنے والے ہیں، فنا ہو جانے والے حالات و معاملات کی دھن میں لگا رہنا اور اپنی زندگی اور اس کی توانائی کو اسی کی فکر میں لگا کر دائمی عذاب و ثواب سے غفلت برتن کسی ذی عقل کا کام نہیں ہے

تلمنی و خوشی و زشت و زیبائے گشت	دوران بقا و چو باد صبح اگدشت
برگردن سے بہاند و برا بگدشت	پنداشت ستمگر کہ چنابر ما کرد

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّكَ حَيٰوةً

جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہو تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک

طیبہؑ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۷﴾

اپنی زندگی اور بدلے میں دیں گے ان کو حق ان کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر

اس سے پہلی آیات میں ایثار و عہد کی تاکید اور عہد شکنی کی مذمت کا بیان تھا جو ایک خاص عمل ہے اس آیت میں تمام اعمال صالحہ اور عاملین صالحین کا عمومی بیان ہے مضمون آیت کا یہ ہے، کہ آخرت کا اجر و ثواب اور دنیا کی برکات صرف ایسے عہد میں منحصر نہیں اور نہ کسی حال کی تخصیص، بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو شخص بھی کوئی نیک کام کیے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو کیونکہ کافر کے اعمال صالحہ مقبول نہیں، تو ہم اس شخص کو دنیا میں تو، بالطف زندگی دیں گے اور آخرت میں، ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

معارف و مسائل

حیات طیبہ کیا چیز ہے؟ | جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں حیات طیبہ مراد دنیا کی پاکیزہ اور بالطہف زندگی ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے اس سے آخرت کی زندگی مراد لی ہے، اور جمہور کی تفسیر کے مطابق بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کو کبھی فقر و فاقہ یا بیماری پیش نہ آئے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ مومن کو اگر کبھی معاشی تنگی یا کوئی تکلیف بھی پیش آتی ہے تو دو چیزیں اس کو پریشان نہیں ہونے دیتیں، ایک قناعت اور سادہ زندگی کی عادت جو تنگدستی میں بھی چل جاتی ہے، دوسرے اس کا یہ عقیدہ کہ مجھے اس تنگی اور بیماری کے بدلے میں آخرت کی عظیم الشان دائمی نعمتیں ملنے والی ہیں، بخلاف کافر و فاجر کے کہ اگر اس کو تنگدستی اور بیماری پیش آتی ہے، تو اس کے لئے کوئی تسلی کا سامان نہیں ہوتا، عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے، بعض اوقات خودکشی کی نوبت آ جاتی ہے، اور اگر اس کو فراخی عیش بھی نصیب ہو تو اس کو زیادتی کی حرص کسی وقت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ کر ڈرتی ہو جاتا ہے، تو ارب پتی بننے کی فکر اس کے عیش کو خراب کرتی رہتی ہے۔

ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ مومنین صالحین کو حق تعالیٰ دنیا میں بھی وہ فرحت و انبساط اور پُر لطفت زندگی عطا فرماتے ہیں جو کسی حال میں متغیر نہیں ہوتی، تندرستی اور فراخ دستی کے وقت

تو ان کی زندگی کا ہر لطف ہونا ظاہر ہے ہی، خصوصاً اس بنا پر کہ بلا ضرورت مال کو بڑھانے کی حرص ان میں نہیں ہوتی جو انسان کو ہر حال میں پریشان رکھتی ہے، اور اگر تنگ دستی یا بیماری بھی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے دعوں پر ان کا مکمل یقین اور مشکل کے بعد آسانی، کلفت کے بعد راحت ملنے کی قومی اُمید ان کی زندگی کو بے لطف نہیں ہونے دیتی، جیسے کاشتکار کھیت بولے اور اس کی پرورش کے وقت اس کو کتنی ہی تکلیفیں پیش آجائیں سب کو اس لئے راحت محسوس کرتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کا بڑا صلہ اس کو ملنے والا ہے، تاجر اپنی تجارت میں، ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں کیسی کیسی محنت و مشقت بلکہ بعض اوقات ذلت بھی برداشت کرتا ہے، مگر اس لئے خوش رہتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کو تجارت کا بڑا نفع یا ملازمت کی تنخواہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، مومن کا بھی یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مجھے ہر تکلیف پر اجر مل رہا ہے اور آخرت میں اس کا بدلہ دائمی عظیم الشان نعمتوں کی صورت میں ملے گا، اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے یہاں کے سنج و راحت اور سرد و گرم سب کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے، اس کی زندگی ایسے حالات میں بھی مشغوش اور بے لطف نہیں ہوتی، یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جو مومن کو دنیا میں نقد ملتی ہے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ④

سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ⑤

اس کا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں

إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَكَّلُونَهُ وَالَّذِينَ هُمْ

اس کا زور تو اپنی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو

بِمِ شَرِّكَوْنَ ⑥

شریک مانتے ہیں۔

۱۱۶

رابطہ آیات | سابقہ آیات میں اول ایفاء عہد کی تاکید اور مطلقاً اعمال صالحہ کی تاکید و ترغیب کا بیان آیا ہے، انسان کو ان احکام میں غفلت اغواء شیطانی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس لئے اس آیت میں شیطانِ رحیم سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے جس کی ضرورت ہر نیک عمل میں ہے، مگر اس آیت میں اس کو خاص طور سے قراءتِ قرآن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس شخص کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تلاوتِ قرآن ایک ایسا عمل ہے جس سے خود شیطان بھاگتا ہے۔

دیو بگرنی دازاں قوم کہ قراں خوانند

اور بعض خاص آیات اور سورتیں بالخاصہ شیطانی اثرات کو زائل کرنے کیلئے تجرب ہیں جن کا مؤثر و مفید ہونا نصوح شریعہ سے ثابت ہو رہا ہے (قرآن)، اس کے باوجود جب تلاوتِ قرآن کے ساتھ شیطان سے تعویذ کا حکم دیا گیا تو دوسرے اعمال کے ساتھ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا۔ اس کے علاوہ خود تلاوتِ قرآن میں شیطانی وساوس کا بھی خطرہ رہتا ہے، کہ تلاوت کے آداب میں کمی ہو جائے، تدبیر و تفکر اور خشوع و خضوع نہ رہے تو اس کے لئے بھی وساوس شیطانی سے پناہ مانگنا ضروری سمجھا گیا (ابن کثیر، مظهری وغیرہ)۔

خلاصہ تفسیر

(اور جب عملِ صالح کی فضیلت معلوم ہوئی، اور کبھی کبھی شیطان اس میں خلل ڈالتا ہے، کبھی وفاتِ عہد میں بھی خلل ڈالتا ہے اور کبھی دوسرے عملِ مثل قراءتِ قرآن میں بھی) تو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور آپ کے واسطے آپ کی امت سُن لیں کہ جب آپ (کیسا ہی نیک کام کرنا چاہیں حتیٰ کہ قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں) (اصلاً تو دل سے خدا پر نظر رکھنا ہے اور یہی حقیقت استعاذہ کی واجب ہے اور قراءت میں پڑھ لینا زبان سے بھی مسنون ہے، اور پناہ مانگنے کا حکم ہم اس لئے دیتے ہیں کہ) یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں، پس اس کا قابو تو صرف ان ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر (چلتا ہے) جو کہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

ابن کثیر نے مقدمہ تفسیر میں فرمایا کہ انسان کے دشمن دو قسم کے ہیں، ایک خود نوعِ انسانی میں سے جیسے عام کفار، دوسرے جنات میں سے جو شیطانِ نافرمان ہیں، پہلی قسم کے دشمن کے ساتھ اسلام نے جہاد و قتال کے ذریعہ مدافعت کا حکم دیا ہے، مگر دوسری قسم کے لئے صرف اللہ سے پناہ مانگوں کا حکم ہوا ہے کہ پہلی قسم کا دشمن اپنی ہی جنس و نوع سے ہے اس کا حملہ ظاہر ہو کر ہوتا ہے اس لئے اس سے جہاد و قتال فرس کر دیا گیا، اور دشمن شیطانی نظر نہیں آتا، اس کا حملہ بھی انسان پر نامناسب

نہیں ہوتا، اس لئے اس کی مدافعت کے لئے ایک ایسی ذات کی پناہ لینا واجب کیا گیا جو نہ انسان کو نظر آتی ہے نہ شیطان کو، اور شیطان کی مدافعت کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنے میں یہ بھی مصلحت ہو کہ جو اس سے مغلوب ہو جائے وہ اللہ کے نزدیک راندہ درگاہ اور متحق عذاب ہو، بخلاف عدو انسانی یعنی کفار کے مقابلہ میں کوئی شخص مغلوب ہو جائے یا مارا جائے تو وہ شہید اور متحق ثواب ہے، اس لئے عدو انسانی کا مقابلہ اعضا پر جو اچھکنا ہر حال میں نفع ہی نفع ہو، یا دشمن غالب کرے اسکی قوت کو ختم کر دینا یا پھر خود شہید کر عذاب اللہ کا جو ہوگا۔

مسئلہ :- تلاوت قرآن سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ کا پڑھنا اس آیت کی تکمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، مگر کبھی کبھی اس کا ترک کرنا بھی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اس لئے جو علماء امت نے اس حکم کو واجب نہیں بلکہ سنت قرار دیا ہے، اور ابن جریر طبری نے اس پر اجماع امت نقل کیا ہے، اس معاملے میں روایات حدیث قولی اور عملی تلاوت سے پہلے اکثر حالات میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنے کی اور بعض حالات میں نہ پڑھنے کی یہ سب ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے شروع میں مبسوط ذکر کی ہیں۔

مسئلہ :- نماز میں اَعُوْذُ (یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ) صرف پہلی رکعت کے شروع میں پڑھا جائے یا ہر رکعت کے شروع میں، اس میں ائمہ فقہاء کے احوال مختلف ہیں، امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں پڑھنا چاہئے، اور امام شافعی ہر رکعت کے شروع میں پڑھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں، دونوں کے دلائل تفسیر مظہری میں مبسوط لکھے گئے ہیں (ص ۴۹ ج ۵)۔

مسئلہ :- تلاوت قرآن نماز میں ہو یا خارج نماز دونوں صورتوں میں تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنا سنت ہے، مگر ایک دفعہ پڑھ لیا تو آگے جتن پڑھتا رہے وہی ایک اَعُوْذُ کافی ہے، البتہ تلاوت کو درمیان میں چھوڑ کر کسی دنیوی کام میں مشغول ہو گیا اور پھر دوبارہ شروع کیا، تو اس وقت دوبارہ اَعُوْذُ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

مسئلہ :- تلاوت قرآن کے علاوہ کسی دوسرے کلام یا کتاب پڑھنے سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھنا سنت نہیں، وہاں صرف بسم اللہ پڑھنا چاہئے، (در مختار، شامی)۔

البتہ مختلف اعمال اور حالات میں اَعُوْذُ کی تعلیم حدیث میں منقول ہے، مثلاً جب کسی کو غصہ زیادہ آئے تو حدیث میں ہے کہ (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ) پڑھنے سے شدت غصہ فرو ہو جاتی ہے (ابن کثیر)۔

نیز حدیث میں ہے کہ بیت الخمار میں جانے سے پہلے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِاَیِّ صِلَ الْخُبْرِ وَالْخَبَائِثِ، پڑھنا مستحب ہو (شامی)۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان و توکل | اس آیت میں یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسی قوت نہیں دی کہ وہ کسی بھی انسان کو ہزانی پر مجبور و بے اختیار کر دے، انسان خود اپنے اختیار و قدرت کو غفلت یا کسی غرض نفسانی سے استعمال نہ کرے تو یہ اس کا تصور ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے احوال و اعمال میں اپنی قوت ارادہ کے بجائے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہی ہر خیر کی توفیق دینے والا اور ہر شر سے بچانے والا ہے، ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا، ہاں جو اپنے اغراض نفسانی کے سبب شیطان ہی سے دوستی کرتے ہیں، اُسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیرو کو شریک ٹھہراتے ہیں اُن پر شیطان تسلط ہو جاتا ہے کہ کسی خیر کی طرف نہیں جانے دیتا، اور ہر ہزانی میں وہ آگے آگے ہوتے ہیں۔

یہی مضمون سورۃ حج کی آیت کا ہے جس میں شیطان کے دعوے کے مقابلہ میں خود حق تعالیٰ نے یہ جواب دیدیا ہے: **إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ** یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا تسلط نہیں ہو سکتا ہاں اس پر ہو گا جو خود ہی گمراہ ہو اور تیرا اتباع کرنے لگے۔

وَإِذْ بَدَلْنَا آيَاتَ مَكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنْزِلُ قَالُوا إِنَّمَا

اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارنا چاہے تو کہتے ہیں تو تو

أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝۱۱ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ

بنالافتاب یہ بات نہیں، بڑا اکثر وہ کو اُن میں خبر نہیں، تو کہہ اس کو اتارنا ہے پاک

الْقُدُّسُ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهُدًى وَ

فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے بلاشبہ تاکہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت اور

بَشْرًى لِّلْمُسْلِمِينَ ۝۱۲ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنْهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعِيشُهُ

خوش خبری مسلمانوں کے واسطے، اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اس کو نہ کھلاتا ہے،

بَشَرٌ لِّلسَّانِ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَبِي هَٰذَا لِسَانٌ

ایک آدمی، جس کی طرف تعریف کرتے ہیں اس کی زبان ہی عجیبی اور یہ قرآن زبان

عَرَبِيٌّ مُبِينٌ ۝۱۰۳ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُهُمُ

عربی ہے صاف ، وہ لوگ جن کو اللہ کی باتوں پر یقین نہیں ان کو اللہ راہ

اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰۴ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا

نہیں دیتا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے۔ جھوٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جن کو یقین

يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ جَ وَآوَلَدِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝۱۰۵

نہیں اللہ کی باتوں پر اور وہی لوگ جھوٹے ہیں

خلاصہ تفسیر

رابطہ آیات | اس سے پہلی آیت میں تلاوت قرآن کے وقت اخوذ باللہ پڑھنے کی ہدایت تھی، جس میں اشارہ ہے کہ شیطان تلاوت کے وقت انسان کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے، مذکور آیات میں اسی طرح کے دساوس شیطان کا جواب ہے۔

نبوت پر کفار کے شبہات

کا جواب مع تہرید | اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں (یعنی ایک

آیت کو لفظاً یا معنی منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم بھیج دیتے ہیں) اور حالانکہ اللہ تعالیٰ

جو حکم پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ بھیجتا ہے (اس کی مصلحت و حکمت کو) وہی خوب جانتا ہے

کہ جن کو حکم دیا گیا ہے ان کے حالات کے اعتبار سے ایک وقت میں مصلحت کچھ تھی پھر حالت

بدل جانے سے مصلحت اور حکمت دوسری ہو گئی، تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ (خدا پر)

افتراء کرنے والے ہیں کہ اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، ورنہ اللہ کا حکم ہوتا تو

اس کے بدلنے کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا۔ اور یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ

بعض اوقات سب حالات کا علم ہونے کے باوجود پہلی حالت پیش آنے پر پہلا حکم دیا جاتا ہے

اور دوسری حالت پیش آنے کا اگرچہ اس وقت بھی علم ہے مگر بمقتضائے مصلحت اس دوسری

حالت کا حکم اس وقت بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ جب وہ حالت پیش آجاتی ہے اس وقت بیان

کیا جاتا ہے، جیسے طیب ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس کے استعمال

سے حالت بدلے گی، اور پھر دوا دوسری دی جائے گی، مگر مریض کو ابتداء میں سب تفصیل نہیں

بتاتا، یہی حقیقت نسخ احکام کی ہے جو قرآن و سنت میں ہوتا ہے، جو حقیقت سے واقف

نہیں وہ باغواں شیطانی نسخ کا انکار کرنے لگتے ہیں، اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغتری نہیں، بلکہ اپنی میں اکثر لوگ جاہل ہیں (کہ احکام میں نسخ کو بلا کسی دلیل کے کلام الہی ہونے کے خلاف سمجھتے ہیں) آپ (ان کے جواب میں) فرمادیتے (کہ یہ کلام میرا بنایا ہوا نہیں بلکہ اس کو) روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لاتے ہیں (اس لئے یہ اللہ کا کلام ہے اور اس میں احکام کی تبدیلی بمقتضائے حکمت و منسلکات ہو اور یہ کلام اس لئے بھیجا گیا ہے) تاکہ ایمان والوں کو (ایمان پر) ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوش خبری (کا ذریعہ) ہو جائے (اس کے بعد کفار کے ایک اور بخوشیہ کا جواب ہے) اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ (ایک دوسری غلط بات) یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھاتا ہے (اس سے مراد ایک عجمی روم کا بارشندہ لوہار ہے جس کا نام بلعام یا مفسیس تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جی لگا کر سنتا تو حضورؐ کبھی اس کے پاس جاتا تھا اور وہ کچھ انجیں وغیرہ کو بھی جانتا تھا، اس پر کافروں نے یہ بات چلتی کی کہ یہی شخص حضورؐ کو قرآن کا کلام سکھاتا ہے، کذا فی الدر المنثور، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ قرآن مجید تو مجہود و مہودہ افسانہ و معانی کا نام ہے تم لوگ اگر قرآن کریم کے معانی اور معارف کو نہیں پہچان سکتے تو کم از کم یہ زبان کی معیاری فصاحت و بلاغت سے تو ناواقف نہیں ہو تو اتنا تو تمہیں سمجھنا چاہئے کہ اگر بالہنہ صحن قرآن کے معانی اس شخص نے سکھلا دیئے ہوں تو کلام کے الفاظ اور ان کی ایسی فصاحت و بلاغت جس کا مقابلہ کرنے سے پورا عرب عاجز ہو گیا یہ کہاں سے آگئی؟ کیونکہ جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی ہے۔

رکونی عجمی بیچارہ ایسی عبارت کیسے بنا سکتا ہے، اور اگر کہا جائے کہ عبارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائی ہوگی تو اس کا واضح جواب اس تختی (چیلنج) سے پوری طرحت ہر چکا ہے جو سورۃ بقرہ میں آچکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باذن خداوندی اپنی نبوت اور قرآن کی حقانیت کا معیار اسی کو قرار دیا تھا، کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق یہ انسان کا کلام ہو تو تم بھی انسان ہو اور بڑی فصاحت و بلاغت کے مدعی ہو تو تم اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک آیت ہی کی برابر لکھ لاؤ، مگر سارا عرب باوجود اسے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنا سب کچھ جان مال قربان کرنے کو تیار تھا، مگر اس چیلنج کو قبول کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، اس کے بعد منکرین نبوت اور قرآن پر ایسے اعتراضات کرنے والوں پر وعید و تہدید ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے ان کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ پر نہ لائیں گے اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی (اور یہ لوگ جو نعوذ باللہ آپ کو مغتری کہتے ہیں) جھوٹا فتراہ کرنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ لوگ ہیں پورے جھوٹے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَتَّ اُكْرِهًا وَّ قَلْبُهٗ

جو کوئی منکر ہو اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا

مُطْمَئِنِّۢنٌ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مِّنۡ شَرٍّۢ بِالْكَفْرِ مَدَّ سَرًّا

دل بقرار ہے ایمان پر لیکن جو کوئی دل کھول منکر ہوا

فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ

سوان پر غضب ہے اللہ کا اور ان کو بڑا عذاب ہے

بِاَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْاٰخِرَةِ ۗ وَاَنَّ اللّٰهَ

اس واسطے کہ انھوں نے عزیز رکھا دنیا کی زندگی کو آخرت سے اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَعِمَ اللّٰهُ عَلٰى

رہتے نہیں دیتا منکر لوگوں کو، یہ وہی ہیں کہ مہر کردی اللہ نے ان کے

قُلُوْبِهِمْ وَاَسْمَعٰهُمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۸﴾

دل پر اندکافوں پر اور آنکھوں پر ادبیں ہیں بے ہوش

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

خود ظاہر ہے کہ آخرت میں یہی لوگ خراب ہیں

خلاصہ تفسیر

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے اس میں کفر بالرسول اور انکار قیامت وغیرہ سب داخل ہیں، مگر جس شخص پر رکافروں کی طرف سے زبردستی کی جائے رک اگر تو کفر کا فلاں کلام یا فلاں قول نہیں کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر دیں گے مثلاً اور حالات سے اس کا اندازہ بھی ہو کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو یعنی عقیدے میں کوئی فتور نہ آئے اور اس قول و فعل کو سخت گناہ اور بُرا سمجھتا ہو تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا ظاہری طور پر کلمہ کفر یا فعل کفر میں مبتلا ہو جانا ایک عذر کی بنا پر ہو، اس لئے جو وعید ارتداد کی آگے آرہی ہے وہ ایسے شخص کے لئے نہیں، لیکن ہاں جو جی کھول کر یعنی اس کفر کو صحیح اور مستحسن سمجھ کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا۔ اور

ان کو بڑی سزا ہوگی (اور) یہ رنجش و عذاب اس سبب سے ہوگا کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا، اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو دنیا کو ہمیشہ آخرت پر ترجیح دیں، ہدایت نہیں کیا کرتا (یہ دو سبب الگ الگ نہیں بلکہ مجموعہ سبب ہو چکا) اس کا یہ ہو کہ عزم فعل کے بعد عادیۃ اللہ یہ ہو کہ خلق فعل ہوتا ہے جس پر مسدود فعل مرتب ہوتا ہے، یہاں استنبوأت عزم اور لایہدی سے خلق کی طرف اشارہ ہے، اور اس مجعول پر فعل قبیح کا مصدر مرتب ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیا میں ان کے امداد علی الکفر کی حالت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر غبار لگا دی ہو اور یہ لوگ (انجمن سے) بالکل غافل ہیں (اس لئے) لازمی بات ہو کہ آخرت میں یہ لوگ بالکل گھٹائے میں رہیں گے۔

معارف و مسائل

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس شخص کو کلمہ کفر کہنے پر اس طرح مجبور کر دیا گیا کہ اگر یہ کلمہ نہ کہے تو اس کو قتل کر دیا جائے، اور یہ بھی لفظ غالب معلوم ہے کہ دہکی دینے والے کو اس پر پوری قدرت حاصل ہے تو ایسے اکراہ کی حالت میں اگر وہ زبان سے کلمہ کفر کہہ دے، مگر اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو اور اس کلمہ کو باطل اور بُرا جانتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس کی بیوی اس پر حرام ہوگی (قطبی و مظہری)

یہ آیت اُن صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کر لیا تھا، اور کہا تھا کہ یا وہ کفر اختیار کریں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات حضرت عمار اور ان کے والدین یا سہ اور سمیہ اور صہیب اور بلال اور خباب رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسر اور ان کی زوجہ سمیہ نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسر کو قتل کر دیا گیا، اور حضرت سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو دوڑایا گیا، جس سے اُن کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو کر شہید ہوئے، اور یہی دو بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح حضرت خباب نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے امینان کے ساتھ قتل کئے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمار نے جان کے خوف سے زبانی اقرار کفر کا کر لیا، مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب یہ دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے بیخ و غم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمہارے دل کا کیا حال تھا، انھوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مطمئن

کیا کہ ہم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی منہری) اکراہ کی تعریف و تفسیر | اکراہ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے یا کرنے پر وہ راضی نہیں، پھر اس کے دو درجے ہیں، ایک درجہ اکراہ کا یہ ہو کہ وہ دل سے تو اس پر آمادہ نہیں مگر ایسا بے اختیار و بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ثانی کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمہ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ دوسرا درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ مصلوب الاختیار کر دیا جائے کہ اگر وہ اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ پہلی کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں ایسا اکراہ جو انسان کو مصلوب الاختیار اور مجبور محض کر دے، ایسے اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کا زبان سے کہہ دینا بشرطیکہ قلب ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے، اسی طرح دوسرے انسان کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

مگر دونوں قسم کے اکراہ میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی ذمہ داری رکھتا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلا ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی ذمہ داری رہا ہو وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا (منہری) مسئلہ: معاملات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں دل سے رضامند ہونا ضروری ہو، جیسے خرید و فروخت و ہبہ وغیرہ کہ ان میں دل سے رضامند ہونا معاملہ کے لئے شرط ہے، بنصر قرآن اِلَّا اَنْ تَكُوْنَنَّ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ، یعنی کسی دوسرے شخص کا مال حلال نہیں ہو تا جب تک تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہ ہو، اور حدیث میں ہے:

”یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو“

لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اِلَّا بِطَيِّبِ نَفْسٍ مِّنْهُ

==

ایسے معاملات اگر اکراہ کے ساتھ کرائے جائیں تو شرعاً ان کا کوئی اعتبار نہیں، اکراہ کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہو گا کہ بحالت اکراہ جو بیع یا ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضا سے باقی رکھے یا فسخ کر دے۔

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صرف زبان سے الفاظ کہہ دینے پر مدار ہے، دل

کا قصد و ارادہ یا رضائے خویشی شرط معاملہ نہیں، مثلاً نکاح، طلاق، رجعت، عتاق وغیرہ، ایسے معاملہ کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے، ثَلَاثٌ جَدُّ هُنَّ جَدُّ وَهِنَّ لِهِنَّ جَدُّ النِّكَاحِ وَالطَّلَاقِ وَالرَّجْعَةِ، رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ یعنی اگر دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب و قبول شرائط کے مطابق کر لیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور جنسی نزاع کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محسن الفاظ کے کہنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا، اور طلاق پڑ جائے گی، نیز رجعت صحیح ہو جائے گی (منظری)

امام اعظم ابو حنیفہ شجعی، زہری، نخعی اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق نکرہ کا بھی یہی حکم ہے کہ حالتِ اکراہ میں اگرچہ وہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظِ طلاق کہہ دیئے، اور وقوعِ طلاق کا تعلق صرف الفاظِ طلاق ادا کر دینے سے ہے، دل کا قصد و ارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیث مذکور سے ثابت ہے، اس لئے یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

مگر امام شافعی اور حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک حالتِ اکراہ کی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ حدیث میں ہے:

رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ، رواہ الطبرانی عن ثوبان	یعنی میری امت سے خطا اور نسیان اور جس چیز پر ان کو غلط و مجبور کر دیا جائے سب اٹھا دیتے گئے۔
---	--

امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ حدیث احکامِ آخرت کے متعلق ہے، کہ خطا یا نسیان سے یا اکراہ کی حالت میں جو کوئی قول و فعل شریعت کے خلاف کر لیا اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، باقی رہے احکامِ دنیا اور وہ نتائج جو اس فعل پر مرتب ہو سکتے ہیں ان کا وقوع تو محسوس شاہد ہے، اور دنیا میں اس وقوع پر جو آثار و احکام مرتب ہوتے ہیں وہ ہو کر رہیں گے، مثلاً کسی نے کسی کو خطا قتل کر دیا تو اس کو قتل کا گناہ اور آخرت کی سزا تو بے شک نہ ہوگی، مگر جس طرح قتل کا محسوس اثر مقتول کی جان چلا جانا واقع ہے اسی طرح اس کا یہ شرعی اثر بھی ثابت ہوگا کہ اس کی بیوی عدت کے بعد نکاح ثانی کر سکے گی، اس کا مال وراثت میں تقسیم ہو جائے گا، اسی طرح جب الفاظِ طلاق یا نکاح یا رجعت زبان سے ادا کر دیئے تو ان کا شرعی اثر بھی ثابت ہو جائے گا (منظری و تشریطی واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم)

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنَّا بَعْدَ مَا فِتْنُوهُمْ جَهِدٌ ۖ

پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ انھوں نے وطن چھوڑا ہے بعد اس کے کہ مصیبت اٹھائی پھر جہد کرتے

وَصَبِرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنَ الْغَفُورِ رَحِيمٌ ۝۱۱۰ يَوْمَ رَأَىٰ

رہو اور قہم ہو بیشک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا مہربان ہے، جس دن آئے گا

كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا وَتُوْفَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا عَمِلَتْ وَهُمْ

ہر جی جو اب سوال کرتا اپنی طرف سے اور پورا ملے گا ہر کسی کو جو اس نے کمایا اور ان پر

لَا يُظْلَمُونَ ۝۱۱۱ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً

ظلم نہ ہوگا، اور بتلانی اللہ نے ایک مثال ایک بستی تھی جس میں

مُطْمَئِنَّةٌ يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ

امن سے جلی آتی تھی اس کو روزی فراغت کی ہر جگہ سے پھر ناشکری کی اللہ کے

اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝۱۱۲

احسانوں کی پھر پکھلایا اس کو اللہ نے مزہ کہ انکے تن کے کپڑے ہو گئے بھوک اور ڈر بدل اس کا جو وہ کرتے تھے

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ

اور ان کے پاس پہنچ چکا رسول انہی میں کا پھر اس کو جھٹلایا پھر آپکڑا ان کو

الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ۝۱۱۳

عذاب نے اور وہ گنہگار تھے۔

خلاصہ تفسیر

پہلی آیات میں کفر پر وعید کا ذکر تھا، خواہ کفر اصلی ہو یا ارتداد کا کفر، اس کے بعد کی مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان ایسی دولت ہے کہ جو کافر یا مرتد سچا ایمان لے آئے اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں قیامت کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ جزا و سزا سب قیامت کے بعد ہی ہونے والی ہے، تیسری آیت میں یہ بتلایا گیا کہ کفر و معاصی کی اصلی سزا تو قیامت کے بعد

ہی ملے گی، مگر بعض گناہوں کی سزا دنیا میں بھی کچھ مل جاتی ہے، تینوں آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے:-
 پھر (اگر کفر کے بعد یہ لوگ ایمان لے آویں تو) بیشک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے
 کہ جنہوں نے مبتلا بہ کفر ہونے کے بعد (ایمان لا کر) ہجرت کی پھر جہاد کیا، اور (ایمان پر قائم
 رہے تو آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے) ان (اعمال) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت
 کرنے والا ہے (یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کی برکت سے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے
 اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کو جنت میں بڑے بڑے درجے ملیں گے، کفر سے پہلے کے
 گناہ تو صرف ایمان سے معاف ہو جاتے ہیں، جہاد وغیرہ اعمال صالحہ شرط معافی نہیں، لیکن
 اعمال صالحہ درجات جنت ملنے کے سبب ہیں، اس لئے اس کے ساتھ ذکر کر دیا گیا،
 اور یہ جزاء و سزا مذکور اس روز واقع ہوگی) جس روز ہر شخص اپنی اپنی طرف داری
 میں گفتگو کرے گا (اور دوسروں کو نہ پوچھے گا) اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا (یعنی
 نیکی کے بدلے میں کمی نہ ہوگی، گو اللہ کی رحمت سے زیادتی ہو جانے کا امکان ہے اور بدی کے بدلے
 میں زیادتی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہو کہ رحمت سے اس میں کچھ کمی ہو جائے، یہی مطلب ہے اس کا
 کہ، ان پر ظلم نہ کیا جائے گا اس کے بعد یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ کفر و معصیت کی پوری سزا
 حشر کے بعد ہوگی، مگر کبھی دنیا میں بھی اس کا وبال عذاب کی صورت میں آجاتا ہے) اور اللہ
 تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن و اطمینان میں رہتے
 تھے (اور) ان کے گھرانے پینے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چار طرف سے ان کے پاس
 پہنچا کرتی تھیں (ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا بلکہ) انہوں نے خدا کی نعمتوں
 کی بے قدری کی (یعنی کفر و شرک اور معصیت میں مبتلا ہو گئے) اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان
 کی حرکتوں کے سبب سے ایک محیط قسط اور خوف کا مزہ چکھایا (کہ مال و دولت کی فراوانی سلب
 ہو کر قسط اور کھوک میں مبتلا ہو گئے، اور دشمنوں کا خوف مسلط کر کے ان کی بستیوں کا
 امن و اطمینان بھی سلب کر لیا) اور اس سزا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ جلدی نہیں لگتی
 بلکہ اول اس کی تنبیہ و اصلاح کے واسطے ان کے پاس اپنی میں کا ایک رسول بھی (منجانب
 اللہ) آیا (جس کے صدق و دیانت کا حال خود اپنی قوم میں ہونے کی وجہ سے ان کو پوری طرح
 معلوم تھا) سو اس رسول (کو بھی) انہوں نے جھوٹا بتایا تب ان کو عذاب نے آپکڑا جب کہ وہ بالکل ہی
 ظلم پر مکر باندرہنے لگے :-

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معارف ومسائل

آخری آیت میں بھوک اور خوف کا حزد چکمانے کے لئے لفظ لباس استعمال فرمایا کہ لباس بھوک اور خوف کا ان کو چکھایا گیا، حالانکہ لباس چکھنے کی چیز نہیں، مگر یہاں لباس کا لفظ محیط اور ہمگیر ہونے کے لئے تشبیہا استعمال ہوا ہے، کہ یہ بھوک اور خوف ان سب کے سب پر ایسا چھا گیا کہ جس طرح لباس بدن کے ساتھ لازم ملزوم ہو جاتا ہے، یہ بھوک اور خوف بھی ان پر اسی طرح مسلط کر دیئے گئے۔

یہ مثال جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک تو عام مثال ہے، کسی خاص بستی سے اس کا تعلق نہیں، اور اکثر حضرات نے اس کو مکہ مکرمہ کا واقعہ قرار دیا کہ وہ سات سال تک شدید قحط میں مبتلا رہے، کہ مردار جانور اور کتے اور غلامتیں کھانے پر مجبور ہو گئے، اور مسلمانوں کا خوف ان پر مسلط ہو گیا، پھر مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کفر و نافرمانی کے قصور دار تو مرد ہیں، عورتیں، بچے تو بے قصور ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مدینہ طیبہ سے کھانے وغیرہ کا سامان بھجوا دیا۔ (مظہری)

اور ابوسفیان نے بحالت کفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ تو صلہ رحمی اور غنودہ درگذر کی تعلیم دیتے ہیں، یہ آپ کی قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کہ یہ قحط ہم سے دور ہو جائے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعا فرمائی اور قحط ختم ہوا (تربطی)

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا لِنِعْمَتِ اللَّهِ

سو کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ نے حلال اور پاک اور شکر کرو اللہ کے احسان کا

إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۖ إِنَّهُ حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کو پوجتے ہو، اللہ نے تو یہی حرام کیا ہے تم پر مردار اور

الذَّمَّ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهْلَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ فَمَنْ اضْطَرَّ

لہو اور شور کا گوشت اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی ناچار ہو جائے

غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَا

نہ زور کرتا ہو نہ زیادتی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور مت کہو اپنی زبانوں کے

تَصِفُ أَلْسِنَتَكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا

جھوٹ بنالینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر

عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ

بہتان باندھو، بیشک جو بہتان باندھتے ہیں اللہ پر ان کا

لَا يُفْلِحُونَ ﴿۱۱۸﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱۹﴾ وَعَلَى

بھلا نہ ہوگا، کھٹڑا سا فائدہ اٹھالیں، اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے اور جو

الَّذِينَ هَادُوا وَآخَرُ مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَمَا

لوگ یہودی ہیں ان پر حرام کیا تھا جو تمہ کو پہلے سننا چھے، اور ہم نے

ظَلَمْنَاهُمْ وَلَئِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۲۰﴾ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ

ان پر ظلم نہیں کیا بروہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے، پھر بات یہ ہو کہ تیرا رب

لِلَّذِينَ عَمِلُوا الشُّعُوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَ

ان لوگوں پر جنہوں نے بُرائی کی نادانی سے پھر توبہ کی اس کے پیچھے اور

أَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۲۱﴾

سزا را اپنی آپ کو، سو تیرا رب ان باتوں کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے۔

خلاصہ تفسیر

پہلی آیت میں اللہ جل شانہ کی نعمتوں پر کفار کی ناشکری اور اس کے عذاب کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اول تو مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی کہ وہ ناشکری نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے جو حلال نعمتیں ان کو دہی ہیں ان کو شکر کے ساتھ استعمال کریں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی ایک خاص صورت یہ بھی اختیار کر رکھی تھی کہ بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے حلال کیا تھا، اپنی طرف سے ان کو حرام کہنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ نے حرام کہا تھا ان کو حلال کہنے لگے، مسلمانوں کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ وہ ایسا نہ کریں، کسی چیز کا حلال یا حرام کرنا صرف اس ذات کا حق ہے جس نے انکو پیدا کیا ہے اپنی طرف سے ایسا کرنا خدائی اختیارات میں دخل دینا اور اللہ تعالیٰ پر افسر کرنا۔

آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے جہالت سے اس طرح کے برا حکم کئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اگر وہ توبہ کر لیں اور صحیح ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیں گے، مختصر تفسیر آیات کی یہ ہے:-

سو جو چیزیں تم کو اللہ نے حلال اور پاک دی ہیں ان کو حرام نہ سمجھو کہ یہ مشرکین کی جاہلانہ رسم پر (بلکہ) ان کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم (اپنے دعوے کے مطابق) اسی کی عبادت کرتے ہو، تم پر تو (منجملہ ان چیزوں کے جن کو تم حرام کہتے ہو) اللہ تعالیٰ نے (صرف فردار کو حرام کیا ہے) اور خون کو اور خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو اور جس چیز کو غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص کہ (مات فاقہ کے) بالکل بے قرار ہو جائے بشرطیکہ طالب لذت نہ ہو، اور نہ حد (ضرورت) سے تجاوز کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ (اس کے لئے) اگر وہ ان چیزوں کو کھالے، بخش دینے والا مہربانی کرنے والا ہے، اور جن چیزوں کے متعلق محض تمہارا جھوٹا زبانی دعوایہی ہے، (اور اس پر کوئی دلیل صحیح قائم نہیں) ان کے متعلق یوں نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال اور فلاں حرام ہے (جیسا کہ یارۃ ہشتم کے راجع کے قریب آیات وَجَعَلُوا لِلّٰهِ میں ان کے ایسے جھوٹے دعوے آچکے ہیں) جس کا حاصل یہ ہو گا کہ اللہ پر جھوٹی بہمت لگاؤ گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف فرمایا ہے) بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے، (خواہ دنیا و آخرت دونوں میں یا صرف آخرت میں) یہ (دنیا میں) چند روزہ عیش ہے (اور آگے مرنے کے بعد) ان کے لئے دردناک سزا ہے اور یہ مشرکین ملتِ ابراہیمی کے متبع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کی شریعت میں تو یہ چیزیں حرام نہ تھیں، جن کو انہوں نے حرام قرار دیدیا ہے، البتہ بہت زمانے کے بعد ان اشیاء میں سے (صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں جن کا بیان ہم اس کے قبل سورۃ النعام میں) آپ سے کرچکے ہیں (اور ان کی تحریم میں بھی) ہم نے ان پر (صورۃ بھی) کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہ خود ہی اپنے اوپر (انبیاء کی مخالفت کر کے) زیادتی کیا کرتے تھے (تو معلوم ہوا کہ اشیاء طیبہ کو بالاعتدال تو کبھی حرام نہیں کیا گیا اور شریعتِ ابراہیمی میں کسی دقیق ضرورت کی وجہ سے بھی نہیں ہوتی پھر یہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا)۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے جہالت سے برا کام (خواہ کچھ بھی ہو) کر لیا پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور (آئندہ کے لئے) اپنے اعمال درست کر لئے تو آپ کا رب اس کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

خرافات مذکورہ میں ہر اضافی ہر حقیقی نہیں | اس آیت میں لفظ ائمتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزیں صرف یہی چار ہیں جو آیت میں مذکور ہیں اور اس سے زیادہ هیچ طور پر آیت قل لا اجد فیما اوحی الی محرم ما الایۃ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں، حالانکہ قرآن و سنت کی تصریحات کے مطابق باجماع امت اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں، اس اشکال کا جواب خود انہی آیات کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جگہ عام حرام و حلال کا بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ مشترکین جاہلیت نے جو بہت سی چیزوں کو اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حرمت کا حکم نہیں دیا تھا ان کا بیان کرنا مقصود ہے، کہ تمہاری حرام کردہ اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک صرف یہی چیزیں حرام ہیں، اس آیت کی مکمل تفسیر اور ان چاروں محرمات کے احکام کا مفصل بیان سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں معارف القرآن جلد اول صفحہ ۳۵۸ سے صفحہ ۳۷۰ تک آچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

توبہ سے گناہ کی معافی عام ہے | آیت ثُمَّ اِنْ رَّبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّوْءَ بِحَقَالَتٍ مِّنْ لِّفْظِہِمْ خواہ بے سمجھی سے کری یا جان بوجھ کر نہیں بلکہ جہالت سے استعمال فرمایا ہے، جہل تو علم کے بالمقابل آتا ہے۔ بے علمی بے سمجھی کے معنی میں ہے، اور جہالت کا لفظ جاہلانہ حرکت کے لئے بولا جاتا ہے، اگرچہ جان بوجھ کر کرے، اس سے معلوم ہو گیا کہ توبہ سے گناہ کی معافی بے سمجھی یا بے اختیاری کے ساتھ مقید نہیں۔

اِنَّ اِبْرٰهٖمَ کَانَ اُمَّةًۭۭۭ قَانِیًا لِلّٰہِ حَنِیۡفًا وَّلَمْ یَلِدْ مِنْ

اصل میں ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرمانبردار اللہ کا سب ایک طرف ہو کر، اور نہ تھا مشرک

الْمُشْرِکِیۡنَ ۝۱۲۱ شَکِرًا لَاۡ نَعْبُدُہٗۤ اِجْتِبٰہُ وَہٰذِہٖۤ اِلٰی صِرَاطٍ

کرنے والوں میں، حق ماننے والا اس کے احسانوں کا، اس کو اللہ نے چن لیا اور چلا یا سیدھی

مُسْتَقِیۡمٌ ۝۱۲۲ وَاتَّیٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَّانَّہٗ فِی الْاٰخِرَةِ

راہ پر، اور دی ہم نے دنیا میں اس کو خوبی اور وہ آخرت میں

لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا

اچھے لوگوں میں سے ، پھر حکم بھیجا کہ تم کو ہم نے کہ چل دین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۳﴾ إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ

اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں ، ہفتہ کا دن جو مستتر کیا سوانہی پر جو اس

اُخْتَلَفُوا فِيهِ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُم بِرِوَا الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا

میں اختلاف کرتے تھے ، اور تیرا رب حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۲۴﴾

اختلاف کرتے تھے ۔

خلاصہ تفسیر

رابط آیات | پہلی آیات میں اصول شرک و کفر یعنی انکار توحید و انکار رسالت پر رد اور کفر و شرک کے بعض فروغ یعنی تحلیل حرام اور تحریم حلال پر رد و ابطال کی تفصیل تھی ، اور مشرکین مکہ مکہ کی جو قرآن کریم کے پہلے اور بلا واسطہ مخاطب تھے اپنے کفر و بت پرستی کے باوجود دعویٰ یہ کرتے تھے کہ ہم ملت ابراہیمی کے پابند ہیں ، اور ہم جو کچھ کرتے ہیں یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات ہیں ، اس لئے مذکورہ چار آیتوں میں ان کے اس دعوے کی تردید اور انہی کے مسلمات سے ان کے جاہلانہ خیالات کا ابطال اس طرح کیا گیا کہ مذکورہ پانچ آیتوں میں سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام اقوام عالم کا مسلم مقتدر ہونا بیان فرمایا ، ہونہوت و رسالت کا اعلیٰ مقام ہی اس سے ان کا عظیم الشان نبی و رسول ہونا ثابت ہوا ، اس کے ساتھ ہی مآکان من المشرکین سے ان کا کامل توحید پر ہونا بیان فرمایا۔

اور دوسری آیت میں ان کا شکر گزار اور صراطِ مستقیم پر ہونا بیان فرمایا کہ ان کو تنبیہ کی کہ تم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے ہو جسے اپنے کو ان کا متبع کس زبان سے کہتے ہو ؟

تیسری آیت میں ان کا دنیا و آخرت میں کامیاب و بامراد ہونا اور چوتھی آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات کے ساتھ آپ کا صیغہ ملت ابراہیم کا پابند ہونا بیان فرمایا کہ یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے بغیر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔

پانچویں آیت **لَا تَمَاجِجِلُ السَّبَبُ** میں اشارہ یہ بیان فرمایا کہ ملت ابراہیمی میں اشیا طیبہ حرام نہیں تھیں جن کو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا ہے، مختصر تفسیر آیات مذکورہ کی یہ ہے :-
 بیشک ابراہیم (علیہ السلام) جن کو تم بھی مانتے ہو، بڑے مقتدار (یعنی بن اولیاء العزم اور اُمتِ عظیمہ کے متبوع و مقتدر) اللہ تعالیٰ کے پاس سے فرمانبردار تھے (ان کا کوئی عقیدہ یا عمل اپنی خواہش نفسانی سے نہ تھا، پھر تم اس کے خلاف محض اپنے نفس کی پیروی سے اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیوں ٹھہراتے ہو، اور وہ) بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے،
 (اور مطلب ایک طرف ہونے کا یہ ہے کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تو پھر تم شرک کیسے کرتے ہو اور وہ) اللہ کی نعمتوں کے (بڑے) شکر گزار تھے (پھر تم شرک و کفر میں مبتلا ہو کر ناشکری کیوں کرتے ہو، غرض ابراہیم علیہ السلام کی یہ شان اور طریقہ تھا اور وہ ایسے مقبول تھے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب کر لیا تھا اور ان کو سید سے راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہنوز ان کو دنیا میں بھی خوبیاں (مثلاً نبوت و رسالت میں منتخب ہونا اور ہدایت پر ہونا وغیرہ) دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی راضی و راجع کے) اچھے لوگوں میں ہوں گے (اس لئے تم سب کو انہی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور وہ طریقہ اب مختصر ہے طریقہ نمبر یہ میں جس کا بیان یہ ہے کہ) پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے چلتے (اور چونکہ اس زمانہ کے وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے اتباع کے مدعی تھے کچھ نہ کچھ شرک میں مبتلا تھے، اس لئے مکرر فرمایا کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تاکہ بت پرستوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے موجودہ طریقہ پر بھی رد ہو جائے جو شرک سے خالی نہیں، اور چونکہ یہ لوگ تحریم طہیات کی جاہلانہ و مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے، اس لئے فرمایا کہ) بس ہفت کی تعظیم (یعنی ہفتہ کے روز پھل کے ٹکڑا کی لذت جو تحریم طہیات کی ایک فردیت وہ تو) صرف انہی لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنہوں نے اس میں (عملاً) خلاف کیا تھا (کہ کسی نے مانا اور عمل کیا، کسی نے اس کے خلاف کیا، مراد اس سے یہودی ہیں کہ تحریم طہیات کی یہ صورت مثل دوسری صورتوں کے صرف یہود کے ساتھ مخصوص تھی، ملت ابراہیمی میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں، آگے احکامِ اکہیدہ میں اختلاف کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ) بیشک آپ کا رب قیامت کے دن ان میں باہم (عملاً) فیصلہ کر دے گا جس بات میں یہ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے۔

معارف و مسائل

لفظ اُمت چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور معنی جماعت اور قوم کے ہیں،

حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ یہی معنی منقول ہیں، اور مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک فرد ایک امت اور قوم کے کمالات و فضائل کے جامع ہیں، اور ایک معنی لفظ امت کے معنی رائے قوم اور جامع کمالات کے بھی آتے ہیں، بعض مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں اور قنات کے معنی تاج فرمان کے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں وصفوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، مقتدا ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے تمام مشرور و غائب کے لوگ سب آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور آپ کی بات کے اتباع کو عزت و فخر جانتے ہیں، یہود، نصاریٰ، مسلمان تو ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہی ہیں، مشرکین عرب بت پرستی کے باوجود اس بت شکن کے معتقد اور ان کی مدت پر چنے کو اپنا فخر جانتے ہیں، اور قنات و صلح ہونے کا خاص امتیاز ان امتحانات سے واضح ہو جاتا ہے جن سے اللہ کے یہ خلیل گذرے ہیں، آتش فرود، اہل و عیال کو لقمہ و دوق جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم، پھر آرزوں سے حاصل ہونے والے بیٹے کی فسرانی پر آمادگی یہ سب وہ امتیازات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان القاب سے معزز فرمایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق تعالیٰ نے جو شریعت و احکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا لئے ملت ابراہیمی کا اتباع فرماتے تھے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی بعض خاص احکام کے علاوہ اس کے مطابق رکھی گئی، اور اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل سے افضل ہیں، مگر یہاں افضل کو منقول کے اتباع کا حکم دینے میں دو حکمتیں ہیں، اول تو یہ کہ وہ شریعت پہلے دنیا میں آچکی ہے، اور معلوم و معروف ہو چکی ہے، آخری شریعت بھی چونکہ اس کے مطابق ہونے والی تھی، اس لئے اس کو اتباع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا کہ دوم یہ بقول علامہ زنجیزی یہ حکم اتباع بھی مجملہ اکرام و اعزاز خلیل اللہ کے ایک خاص اعزاز ہے، اور اس کی خصوصیت کی طرف لفظ اللہ سے اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے تمام فضائل و کمالات ایک طرف اور ان سب پر قانع یہ کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سب سے افضل رسول و حبیب کو ان کی ملت کے اتباع کا حکم فرمایا۔

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ

بما اُخْبِرَ رَبُّكَ بِهِ سُبُلَ سُبُلِهِمْ وَتُحْذِرُ عَنْ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَتُحْذِرُ عَنْ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

دے ان کو جس طرح بہتر ہو، قیام ہے ہی بہتر جانتا ہے ان کو جو بھول گیا اس کی راہ سے

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَرِينَ ۝ (۱۲۵) وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ

اور وہی بہتر جانتا ہو ان کو جو راہ پر ہیں ، اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف

دے۔ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝ (۱۲۶) وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ

بیخیالی جائے ، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کو ، اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے

إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ (۱۲۷)

اللہ ہی کی مدد سے اور نہ ان پر غم کھا اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے ،

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ۝ (۱۲۸)

اللہ ساتھ ہو ان کے جو پرہیز گاریں اور جو نیکی کرتے ہیں ۔

خلاصہ تفسیر

رابط آیات | سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات سے مقصد یہ تھا کہ امت آپ کے احکام کی تعمیل کر کے رسالت کے حقوق ادا کریں ، مذکورہ آیات میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا سے رسالت کے حقوق اور آداب کی تعلیم ہے ، جس کے عموم میں تمام مومنین شریک ہیں ، مختصر تفسیر یہ ہے :-

آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین اسلام) کی طرف رلوگوں کو ، حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلائیے ، حکمت سے وہ طریقہ دعوت مراد ہے جس میں مخاطب کے احوال کی رعایت سے ایسی تدبیر اختیار کی گئی ہو جو مخاطب کے دل پر اثر انداز ہو سکے ، اور نصیحت سے مراد یہ ہے کہ خیر خواہی بہدرمی کے جذبہ سے بات کہی جائے ، اور اچھی نصیحت سے مراد یہ ہے کہ عنوان بھی نرم ہو ، دل خراش تو نہیں آمیز نہ ہو ، اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے (یعنی اگر بحث مباحثے کی نوبت آجائے تو وہ بھی شدت اور خشونت سے اور مخاطب پر الزام تراشی اور بے انصافی سے خالی ہونا چاہئے ، بس اتنا کام آپ کا ہے ، پھر اس تحقیق میں نہ پڑیے کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا ، یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے پس) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور (اگر کبھی مخاطب علمی بحث و مباحثہ کی حد سے آگے بڑھ کر عملی جدال اور بات چال یا زبان سے ایذا پہنچانے لگیں تو اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو بدلہ لینا بھی جائز ہے اور صبر کرنا بھی ہے) اگر (پہلی صورت اختیار کرو یعنی)

برہ لئے لگو تو اتنا ہی برہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے (اس سے زیادتی نہ کرو) اور اگر (دوسری صورت یعنی ایذا دل پر صبر کر دو وہ صبر کرنا) صبر کرنے والوں کے حق میں بہت سی اچھی بات ہے رکہ مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والوں پر بھی اور آخرت میں موجب اجر عظیم ہے اور صبر کرنا اگرچہ سبھی کے لئے بہتر ہے، مگر آپ کی عظمت شان کے لحاظ سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ حکم ہے کہ آپ انتقام کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی توفیق خاص سے ہے (اس لئے آپ اطمینان رکھیں کہ صبر میں آپکو دشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں (یعنی ان کے ایمان نہ لانے پر یا مسلمانوں کو ستانے) پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے متغیر نہ ہو جائے (ان کی مخالفت تدبیروں سے آپ کا کوئی ضرر نہ ہوگا کیونکہ آپ کو احسان اور تقویٰ کی صفات حاصل ہیں اور) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مددگار ہوتا ہے) جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں ۛ

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے اصول | اس آیت میں دعوت و تبلیغ کا مکمل نصاب، اس کے اصول اور آداب کی اور مسائل نصاب پوری تفصیل چند کلمات میں سمیٹی ہوئی ہے، تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت ہرم ابن حیان کی موت کا وقت آیا تو عزیزوں نے درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمائیے، تو فرمایا کہ وصیت تو لوگ اموال کی کیا کرتے ہیں وہ میرے پاس ہے نہیں، لیکن میں تم کو اللہ کی آیات خصوصاً سورۃ نحل کی آخری آیتوں کی وصیت کرتا ہوں، کہ ان پر مضبوطی سے قائم رہو، وہ آیات یہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

دعوت کے لفظی معنی بلانے کے ہیں، انبیاء علیہم السلام کا پہلا فرض منصبی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے، پھر تمام تعلیمات نبوت و رسالت اس دعوت کی تشریحات ہیں، مسترآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفت داعی الی اللہ ہونا ہے، وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَرِسَالًا مِّنْهُ (احزاب ۴۱) يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ (احقاف ۳۱) امت پر بھی آپ کے نقش قدم پر دعوت الی اللہ کو فرض کیا گیا ہے، سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دیں (یعنی) نیک کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے منع

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ أُولَٰئِكَ يُسَمُّوْنَ

اور ایک آیت میں ارشاد ہے :-

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا

إِلَى اللَّهِ

گفتار کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا

کون ہو سکتا ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا

تفسیر میں کبھی اس لفظ کو دعوت الی اللہ کا عنوان دیا جاتا ہے، اور کبھی دعوت الی الخیر کا اور کبھی دعوت الی سبیل اللہ کا، حاصل سب کا ایک ہے کیونکہ اللہ کی طرف بلانے سے اس کے دین اور صراط مستقیم ہی کی طرف بلانا مقصود ہے۔

إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ، اس میں اللہ جل شانہ کی خاص صفت رب اور پھر اس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفت ربوبیت اور ربوبیت سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ کی تربیت فرمائی، آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہئے، جس میں مخاطب کے حالات کی رعایت کر کے وہ طرز اختیار کیا جائے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، اور اس کی تاثیر زیادہ سے زیادہ ہو، خود لفظ دعوت بھی اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کے احکام پہنچا دینا اور سننا دینا نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کیا کرتا جس سے مخاطب کو وحشت و نفرت ہو یا جس میں اس کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا گیا ہو۔

بِأَنحِمْهُمْ، لفظ حکمت قرآن کریم میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس جگہ بعض ائمہ تفسیر نے حکمت اور قرآن کریم بعض نے قرآن و سنت بعض نے جنت قطعیہ قرار دیا ہے، اور روح المعانی نے بقاء بر فیض حکمت کی تفسیر یہ کی ہے:

انها الكلام الصواب الواقع

یعنی حکمت اس درست کلام کا نام ہے

من النفس اجمل موقع (روح)

جو انسان کے دل میں اتر جائے

اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہو جاتے ہیں، اور صاحب روح البیان نے بھی تفسیر یہی ہے مطلب ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیات احوال کو معلوم کر کے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحت کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی، وہاں اشارات سے کلام کرے، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر تمبے کا تعصب پیدا ہو۔

الْمَوْعِظَةُ، موعظۃ اور وعظ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی خیر خواہی کی بات کو ایسی طرح کہاجائے کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لئے نرم ہو جائے، مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب و نواہد اور نہ کرنے کے عذاب و مخاطب ذکر کئے جائیں رقا مومن و مفردات راغب، اَوْحَتْ لَہُ کے معنی یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو، اس کے مشکوک و شبہات دور ہوں، اور مخاطب یہ محسوس کرے کہ آپ کی اس میں کوئی غرض نہیں صرف اس کی خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔

موعظۃ کے لفظ سے خیر خواہی کی بات مؤثر انداز میں کہنا تو واضح ہو گیا تھا، مگر خیر خواہی کی بات بعض اوقات دل خراش عنوان سے یا اس طرح بھی کہی جاتی ہے جس سے مخاطب اپنی بات محسوس کرے (روح المعانی) اس طریقہ کو پھوڑنے کے لئے لفظ حسنہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، لفظ جادل، مجادلہ سے مشتق ہے، اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث و مناظرہ ہے، اور بالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آجائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقہ سے ہونا چاہئے، روح المعانی میں ہے کہ اچھے طریقہ سے یہ مراد ہے کہ گفتگو میں لطفت اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کر جائیں جو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلائل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور و معروف ہوں تاکہ مخاطب کے مشکوک و درہمزل، اور وہ ہٹ و ہرمی کے رشتہ پر نہ پڑ جائے، اور قرآن کریم کی دوسری آیات اس پر شاہد ہیں، کہ یہ احسان فی المجادلہ صرف مسلمانوں کے ساتھ نہیں، بلکہ ان کتاب کے بارے میں تو خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ارشاد ہے، وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، اور دوسری آیت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو قَوْلَا کہ قَوْلَا لَیْسَ لَکِ ہِدَیْتَا کی ہدایت دے کر یہ بھی بتلادیا کہ فرعون جیسے سہ کیش کافر کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا ہے۔

دعوت کے سہول و آداب | آیت مذکورہ میں دعوت کے لئے تین چیزوں کا ذکر ہے۔
اول حکمت، دوسرے موعظۃ حسنہ، تیسرے مجادلہ بالَّتِي
ہی احسن، بعض حضرات مغسرتین نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین قسموں کی بنا پر ہیں، دعوت بالحکمت، اول علم و فہم کے لئے، دعوت بالموعظۃ، عوام کے لئے، مجادلہ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں مشکوک و شبہات ہوں، یا جو عناد اور ہٹ و ہرمی کے سبب بات ماننے سے منکر ہوں۔
سیدی حضرت حکیم الامتہ تھانویؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ ان تین چیزوں کے مخاطب الگ الگ تین قسم کی جماعتیں ہونا سیاق آیت کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے، آیت

ظاہر یہ ہے کہ یہ آداب دعوت ہر ایک کے لئے استعمال کرنے میں بہت سب سے پہلے حکمت سے مخاطب کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب کلام تجویز کرنا ہے، پھر اس کلام میں خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ایسے شواہد اور دلائل سامنے لانا ہے جن سے مخاطب مطمئن ہو سکے، اور طرز بیان و کلام ایسا مشفقانہ اور نرم رکھنا ہے کہ مخاطب کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میری ہی مصالحت اور خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں مجھے شرمندہ کرنا یا میری حیثیت کو مجروح کرنا ان کا مقصد نہیں۔

البتہ صاحب روح المعانی نے اس جگہ ایک نہایت لطیف نکتہ یہ بیان فرمایا کہ آیت کے نسق سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول دعوت اصل میں دو ہی چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، میری چیز مجادلہ، اصول دعوت میں داخل نہیں، ہاں طریق دعوت میں کبھی اس کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

صاحب روح المعانی کا استدلال اس پر یہ ہے کہ اگر یہ تینوں چیزیں اصول دعوت ہوتیں تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ تینوں چیزوں کو عطف کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا، بالمشکۃ والمرعظۃ الحسنۃ والصلح الی اللہ حسن، مگر قرآن حکیم نے حکمت و موعظت کو تو عطف کے ساتھ ایک ہی نسق میں بیان فرمایا اور مجادلہ کے لئے الگ جملہ بجاؤں لکھیں بالیقی ہی احسن اختیار کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ فی العلم دراصل دعوت الی اللہ کا رکن یا شرط نہیں بلکہ طریق دعوت میں پیش آنے والے معاملات کے متعلق ایک ہدایت ہے، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت میں صبر کی تلقین فرمائی ہے، کیونکہ طریق دعوت میں لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصول دعوت دو چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، جن سے کوئی دعوت خالی نہ ہونا چاہئے، خواہ علماء و خواص کو ہو یا عوام الناس کو، البتہ دعوت میں کسی وقت ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے جو شکوک و ادھام میں مبتلا اور داعی کے ساتھ بحث مباحثہ پر آمادہ ہیں تو ایسی حالت میں مجادلہ کی تعلیم دی گئی، مگر اس کے ساتھ بالیقی ہی احسن کی قید لگا کر بتلادیا کہ جو مجادلہ اس شرط سے خالی ہو اس کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں۔

دعوت الی اللہ کے | علماء اس منصب کو ان کا نائب ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں | پیغمبرانہ آداب

تو لازم یہ ہے کہ اس کے آداب اور طریقے بھی انہی سے سیکھیں جو دعوت ان طریقوں پر نہ رہے وہ دعوت کے بجائے عداوت اور جنگ و جدال کا موجب ہو جاتی ہے۔

دعوت پیغمبرانہ کے اصول میں جو ہدایت قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و ہارون کے لئے نقل کی گئی ہے کہ فَقُولَا لَنَا لَعَلَّہُمْ یَتَّقُوۡا اَوْ یَخْشَیْا یعنی فرعون سے نرم بات کرو شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے۔ یہ ہر داعی حق کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے کہ فرعون جیسا سرکش کافر جس کی موت بھی علمِ الہی میں کفر ہی پر ہونے والی تھی اس کی طرف بھی جب اللہ تعالیٰ اپنے داعی کو بھیجتے ہیں تو نرم گفتار کی ہدایت کے ساتھ بھیجتے ہیں، آج ہم جن لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں، اور ہم میں سے کوئی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برابر ہادی و داعی نہیں، تو جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں پیغمبروں کو نہیں دیا کہ مخاطب کے سخت کلامی کریں اس پر فتنے کھیں، اس کی توہین کریں، وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا۔

مشرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ اور کفار کے مجادلہ سے بھرا ہوا ہے اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی اللہ کے رسول نے حق کے خلاف ان پر طعنہ لڑی کر نیوالوں کے جواب میں کوئی ثقیل کلمہ بھی بولا ہو، اس کی چند مثالیں دیکھئے:-

سورۃ اعراف کے ساتویں رکوع میں آیات ۵۹ سے ۶۷ تک دو پیغمبر حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے ساتھ ان کی قوم کے مجادلے اور سخت مشرت الزامات کے جواب میں ان بزرگوں کے کلمات قابل ملاحظہ ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں جن کی طویل عمر دنیا میں مشہور ہے، سارے نو سو برس تک اپنی قوم کی دعوت و تبلیغ، اصلاح و ارشاد میں دن رات مشغول رہے، مگر اس بد بخت قوم میں سے معذرت دے پندر کے علاوہ کسی نے ان کی بات نہ مانی، اور تو اور نودان کا ایک لڑکا اور بیوی کافروں کے ساتھ لگے رہے، ان کی جگہ آج کاکوئی دعویٰ دعوت و اصلاح ہوتا تو اس قوم کے ساتھ اس کا لب و لہجہ کیسا ہوتا، اندازہ لگائیے، پھر دیکھتے کہ ان کی تمام ہمدردی و خیر خواہی کی دعوت کے جواب میں قوم نے کیا کہا:-

اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝
(اعراف)

ہم تو آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں
پاتے ہیں ۝

ادھر سے اللہ کے پیغمبر جاتے اس کے کہ اس سرکش قوم کی گمراہیوں، بدکاریوں پر وہ چاک کرتے جواب میں کیا فرماتے ہیں:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوۡا عَلَیْہِ
رَسُوْلًا مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیۡنَ ۝
تیسرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں
میں تو رسولِ عالمین کا رسول اور قاسمِ ہول
(تمہارے فائدہ کی باتیں بتلاتا ہوں)

ان کے بعد آنے والے دو مشرک اللہ کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم نے معجزات دیکھنے کے باوجود ازراہ عناد کہا کہ آپ نے اپنے دعوے پر کوئی دلیل پیش نہیں کی، اور ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں (بتوں) کو چھوڑنے والے نہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم نے جو ہمارے معبودوں کی شان میں بے ادبی کی ہے اس کی وجہ تم جنوں میں مبتلا ہو گئے ہو حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ سن کر جواب دیا:

لَئِنْ سَأَلْتُمْ عِلْمَ رَبِّي	لَئِنْ سَأَلْتُمْ عِلْمَ رَبِّي
أَتَدْرِكُونَ مَا لَا مَرْجِعَ فِيهِ	أَتَدْرِكُونَ مَا لَا مَرْجِعَ فِيهِ

بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک مانتے ہو (سورة ہود)

اور سورة اعراف میں ہے کہ ان کی قوم نے اُن کو کہا:-

إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ آبَاءَنَا وَآبَاءَ آبَائِنَا	إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ آبَاءَنَا وَآبَاءَ آبَائِنَا
وَأَنَّا نَحْنُ غَيْرُ مَعْبُودٍ	وَأَنَّا نَحْنُ غَيْرُ مَعْبُودٍ

بولنے والوں میں سے ہیں

(اعراف)

قوم کے اس دل آزار خطاب کے جواب میں اللہ کے رسول ہود علیہ السلام نہ ان پر کوئی فقرہ کہتے ہیں نہ اُن کی بے راہی اور کذب و افتراء علی اللہ کی کوئی بات کہتے ہیں جواب کیا ہے صرف یہ کہ:-

يَقُولُ هُمْ لَا يُشْعِرُونَ	يَقُولُ هُمْ لَا يُشْعِرُونَ
وَأَنَّا نَحْنُ غَيْرُ مَعْبُودٍ	وَأَنَّا نَحْنُ غَيْرُ مَعْبُودٍ

کار رسول ہوں

(اعراف)

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو حسب دستور انبیاء اللہ کی طاعت و دعوت دی اور ان میں جو بڑا غیب ناپ تول میں کمی کرنے کا تھا اس سے باز آنے کی ہدایت فرمائی، تو ان کی قوم نے تمسخر کیا، اور توہین آمیز خطاب کیا:-

يَسْتَعْجِلُ بَعْدَ الْغَيْبِ	يَسْتَعْجِلُ بَعْدَ الْغَيْبِ
أَن تَكُونَ لَكُم مِّنْ آيَاتٍ	أَن تَكُونَ لَكُم مِّنْ آيَاتٍ

عقل مندین پر چلنے والے

الشی شیئہ

انہوں نے ایک تیری طعنہ دیا کہ تم جو نہ بڑھتے ہو یہی تمہیں بے وقوفی کے کماؤ سمجھاتی ہے دوسرے یہ کہ مال ہمارے ہیں، ان کی خرید و فروخت کے معاملات میں تمہارا یا خدا کا کیا دخل ہوگا جس طرح چاہیں ان میں تصرف بھی کرتے ہیں، تیسرا جملہ تمہیں ہستہ ہستہ کہتا ہے کہ آپ ہیں بڑی عقل مند بہت دین پر چلنے والے۔

معلوم ہوا کہ یہ لادینی معاشیات کے بجاویں صرف آج نہیں پیدا ہوئے ان کے بھی کچھ اسلاف ہیں جن کا نظریہ وہی تھا جو آج کے بعض نام کے مسلمان کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اسلام کو مانستے ہیں، مگر معاشیات میں ہم سوشل ازم کو اختیار کرتے ہیں، اس میں اسلام کا کیا دخل ہے، ہم حال اس ظالم قوم کے اس محضے ہیں اور دل آزار گفتگو کا جواب اللہ کا رسول کیا دیتا ہے، دیکھئے۔

قَالَ بَلَّغْ أَمْرًا وَتَشْمِزْ كُنْتُ
عَلَى بَيْتِي بِمَنْ تَرَى وَرَدَّ قَلْبِي مِنْهُ
رَبُّدَا حَسَنًا وَمَا أُرِيدُ أَنْ
أَخْلُقَ لَكُمْ إِلَّا مَا أَكْثَرَكُمْ عَنَّا
لَا أُرِيدُ إِلَّا الْإِسْلَامَ مَا اسْتَطَعْتُ
وَمَا تَكُونُ فِيهِمْ إِلَّا بَادِئٌ عَسِيَّةٍ
تَرَكْتُ وَلَا نَبِيٍّ أَنْتَبَ ۝
رسورۃ ہود، آیت ۸۸

”تک میری قوم، بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر میں
اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں
اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے عمرہ
دولت یعنی نبوت دی ہو تو پھر میں کیا
اس کی تبلیغ نہ کروں“ اور میں خود بھی تو اس
کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتا، جو تمہیں بتلاتا
ہوں میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں،
جہاں تک میری قدرت میں ہے اور مجھ کو

جو کچھ اصلاح اور عمل کی توفیق ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے، میں اسی پر
بھروسہ رکھتا ہوں، اور تمام امور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنا کے وقت جو نرم گفتار کی ہدایت بجانب
دن گئی تھی اس کی پوری تعمیل کرنے کے باوجود فرعون کا خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ تھا:

قَالَ أَلَمْ نَسِرْبَكَ أَخِيًا أَوْ لِيَدٍ
وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عَمَرٍ
بَسِيفٍ ۝ وَفَعَلْتَ فَعَلَتَكَ
الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ
الْمُكْذِبِينَ ۝

”فرعون کہنے لگا (اے تمہارے) کیا ہم نے تم کو
بچپن میں پرورش نہیں کیا، اور تم اس
میں برسوں بمانے پائے، باہم کے باہم
تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی
یعنی قبلی کو قتل کیا تھا، اور تم بڑے
نامشکرے ہو۔“

(سورۃ شعراء)

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنا یہ احسان بھی جتلا یا کہ بچپن میں ہم نے تجھے پالا ہی، پھر یہ احسان بھی جتلا یا کہ بڑے ہونے کے بعد بھی کافی مدت تک تم ہمارے پاس رہے، پھر یہ عتاب کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جو ایک قبیلہ بغیر ارادہ قتل کے مارا گیا تھا اس پر غصہ و ناراضی کا اظہار کر کے یہ بھی کہا کہ تم کافروں میں سے ہو گئے۔

یہاں کافروں میں سے ہونے کے لغوی معنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی ناشکری کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے تو تم پر احسانات کئے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کو مار ڈالا جو احسان کی ناشکری تھی، اور اصطلاحی معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ فرعون خود خدائی کا دعویٰ کرتا تھا، تو جو اس کی خدائی کا منکر ہوا وہ کافر ہوا۔

اب اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب سنئے، جو پیغمبرانہ آداب و دعوت اور پیغمبرانہ اخلاق کا شاہکار ہے، کہ اس میں سب سے پہلے تو اس کمزوری اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا جو ان سے سرزد ہو گئی تھی، یعنی اسرائیلی آدمی سے لڑنے والے قبیلے کو ہٹانے کے لئے ایک نمونہ اس کے مارا تھا جس سے وہ مر گیا، تو گو یہ قتل عدا ارادہ نہیں تھا، مگر کوئی دینی تقاضا بھی نہیں تھا، بلکہ شریعت موسوی کے لحاظ سے بھی وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، اس لئے پہلے یہ اعتراف فرمایا:-

یعنی میں نے یہ کام اس وقت کیا تھا،
جبکہ میں ناواقف تھا»

فَدَلَّوْا اِذَا دَاۤءَاۤنَا مِنْ لَّدُنَّیْ
(سورۃ شعراء)

مداویہ ہے کہ یہ فعل عطا ربوبیت سے پہلے سرزد ہو گیا تھا، جب کہ مجھے اس بارہ میں اللہ کا کوئی حکم معلوم نہیں تھا، اس کے بعد فرمایا:

”پھر مجھ کو لڑ لگا تو میں تمہارے یہاں سے
مغرور ہو گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے
وہابی عطا فرمائی، اور مجھ کو اپنی پیغمبری
میں شامل کر دیا»

فَقَرَرْتُ مِّنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ لَئِیْ
فَوَهَّبَ لَنَا رَبِّیْ ثَمَنًا وَجَعَلَنی
مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝
(سورۃ شعراء)

پھر اس کے احسان جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تمہارا یہ احسان جتنا صحیح نہیں، کیونکہ میری پرورش کا معاملہ تمہارے ہی ظلم و عدوان کا نتیجہ تھا، کہ تم نے اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا، اس لئے والدہ نے مجبور ہو کر مجھے دریا میں ڈالا اور تمہارے گھر تک پہنچنے کی نوبت آئی، فرمایا:

رہا احسان جتلا نا پرورش کا، سو یہ

وَذٰلِكَ نَعْمَةٌ مِّنْ رَبِّیْ عَلٰی اَنْ

عَبَّثَتْ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۝

(سورۃ شعراء)

وہ نعت پر حس کا تو بھر احسان رکھتا ہو

کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت میں ڈال

رکھا تھا :

اس کے بعد فرعون نے جب سوال کیا تو بَارَبِّ الْعَالَمِينَ، یعنی رب العالمین کون ہے اور کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کہ ان کے درمیان ہے اس سب کا، اس پر فرعون نے بطور استہزاء کے حاضرین سے کہا اَلَا قَسَمْتُ لَّكُمْ، یعنی قسمیں ہو کہ یہ کیسی بے عقلی کی باتیں کہہ رہے ہیں، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

وَلَكُمْ رَبٌّ اَبَدٌ عِندَكُمْ

یعنی تمہارا اور تمہاری باپ دادوں کا

اَلَا وَلِيٌّ ۝

بھی وہی رب پروردگار ہے :

اس پر فرعون نے جھجھلا کر کہا :

اِنَّ رَسُوْلَكُمْ لَظَنِي اُرْسِلَ

یعنی یہ جو تمہاری طرف اللہ کے رسول پڑ

اَلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝

کا مدعی ہے وہ دیوانہ ہے :

مضمون دیوانہ کا خطاب دینے پر بھی موسیٰ علیہ السلام بہت سے اس کے کہ ان کا دیوانہ ہونا اور اپنا ناقابل ہونا ثابت کرتے اس طرف کوئی التفات ہی نہیں کیا، بلکہ اللہ رب العالمین کی ایک اور صفت بیان فرمادی :-

رَبُّ الْعَشْرِ قَدْ اَلْمَغْرِبَ وَ

وہ رب ہے مشرق و مغرب کا اور جو کہ

مَنْ يَنْهَضُكُمْ اَنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

ان کے درمیان ہے اگر تم کو کچھ عقل ہو :

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوا ہے جو سورۃ شعراء کے تین کورع میں بیان ہوا ہے، اللہ کے مقبول رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمہ کو اوّل سے آخر تک دیکھتے، نہ کہیں جذبات کا اظہار ہے نہ اس کی بدگوئی کا جواب ہے، نہ اس کی سخت کلامی کے جواب میں کوئی سخت کلام ہے، بلکہ مسلسل اللہ جلّ شانه کی صفات کمال کا بیان ہے، اور تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ مختصر سا نمونہ ہے انبیاء علیہم السلام کے مجاہدات کا جو اپنے معاند اور ضدی قوم کے مقابلہ میں کئے گئے ہیں، اور مجاہدہ بالحق ہی احسن جو قرآن کی تعلیم ہے اس کی علی تشریح جو مجاہدات کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اصول اور عنوان و تصویریں حکمت و مصلحت کی رعایتیں بھی ہوا انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمائی ہیں اور دعوت الی اللہ کو مقبول و مؤثر اور پائیدار بنانے کے لئے جو طریقہ عمل

اختیار فرمایا ہے وہی دراصل دعوت کی روح ہے اس کی تفصیلات تو تمام تعلیمات نبوی علیہ السلام میں پھیل ہوئی ہیں، نمونے کے طور پر چند چیزیں دیکھئے:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت میں اس کا بڑا الحافز تھا تھا کہ مخاطب پر بار نہ پونے پاسے، صحابہ کرام جیسے عشاق رسول جن سے کسی وقت بھی اس کا احتمال نہ تھا کہ وہ آپ کی باتیں سننے سے اکتا جائیں گے، ان کے لئے بھی آپ کی عادت یہ تھی کہ وعظ و نصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کے کاروبار کا حرج اور ان کی طبیعت پر بار نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اکتانہ جائیں، اور دوسروں کو بھی آپ کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَيَذَرُ ذَاكَ تَغِيثًا وَابْتِشَارًا
وَلَا تُنْفِرُوا

لوگوں پر آسانی کرو دشواری نہ پیدا کرو اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سناؤ، مایوس یا متنفر نہ کرو۔

صحیح بخاری، کتاب العلم،

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ہمیں چاہئے کہ ربانی حکماء، علماء و فقہاء بنو، صحیح بخاری میں یہ قول نقل کر کے لفظ ربانی کی یہ تفسیر فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ اور تعلیم میں تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھ کر پیچھے آسان آسان باتیں بتلاتے، جب لوگ اس کے عادی ہو جائیں تو اس وقت دوسرے احکام بتلاتے جو ابتدائی مرحلے میں مشکل ہوتے وہ عالم ربانی ہے، آجکل جو وعظ و تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کام کے کرنے والے ان اصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے، ایسی تقریریں، وقت بے وقت نصیحت، مخاطب کے حالات کو معلوم کئے بغیر اس کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی تسکلی یا رسوائی نہ ہو، اسی لئے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ کسی غلط اور برے کام میں مبتلا ہے تو اس کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے مجمع عام کو مخاطب کر کے فرماتے تھے

مَرَاتِلُ أَتُحِبُّ أَنْ يَفْعَلَ كُفْرًا
كَذَا

لوگوں کو کیا ہو گیا کہ فلاں کام کرتے ہیں۔

اس عام خطاب میں جس کو سنا اصرار غلط نہ ہوتا وہ بھی سن لیتا، اور دل میں شرمندہ

ہو کر اس کے چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی عام عادت یہی تھی کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے، اسی لئے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوتا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کر کے اصلاح کی کوشش فرماتے، سورۃ النہم میں ہے: **قُلْ مَا لِيَ لَا أَعْبُدُ إِلَّا اللَّهَ**، یعنی مجھے کیا ہو گیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں؟ ظاہر ہے کہ یہ قاصد رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول تھے، سنانا اس مخاطب کو تھا جو مشغول عبادت نہیں ہے، مگر اس کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اور دعوت کے معنی دوسرے کو اپنے پاس بلانا ہے، بعض اس کے عجب بیان کرنا نہیں، اور یہ بلانا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ منظم اور مخاطب میں کوئی اشتراک ہو، اسی لئے قرآن عظیم میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عنوان اکثر **يَقُولُ** سے شروع ہوتا ہے، جس میں برادرانہ رشتہ کا اشتراک پہلے بتا کر آگے اصلاحی کلام کیا جاتا ہے، کہ ہم تم کو ایک ہی برادری کے آدمی ہیں، کوئی منافرت نہیں ہونی چاہئے، یہ کہہ کر ان کی اصلاح کا کام شروع فرماتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت کا خط ہر قافلہ شاہ روم کے نام بھیجا، اس میں **اَوَّلُ** تو شاہ روم کو **عَلِيمُ الرُّومِ** کے لقب سے یاد فرمایا، جس میں اس کا جائز اکرام ہے، کیونکہ اس میں اس کے عظیم ہونے کا اقرار بھی ہے، مگر رومیوں کے لئے اپنے لئے نہیں، اس کے بعد ایمان کی دعوت اس عنوان سے دی گئی:-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى
كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ،

(سورۃ الکفر ۱)

”اے اہل کتاب، اس کلمہ کی طرف جلدی
ت آ جاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان
مشترک ہو، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی

عبادت نہیں کریں گے۔“

جس میں پہلے آپس کا ایک مشترک نقطہ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھیان دیا جائے تو ہر تعلیم و دعوت میں اس طرح کے آداب و اصول ملیں گے، آجکل اول تو دعوت و اصلاح اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کی طرف دھیان ہی نہ رہا، اور جو اس میں مشغول بھی ہیں انہوں نے صرف بحث و مباحثہ اور مخالف پر الزام تراشی، فقہائے کئے اور اس کی تہقیر و توہین کرنے کو دعوت و تبلیغ سمجھ لیا ہے، جو خلاف سنت ہونے کی وجہ سے کبھی تو شرم و مفید نہیں ہوتا، وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے

اسلام کی بڑی ندامت کی، اور حقیقت میں وہ لوگوں کو متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔
 مروجہ مجاہدات کی دینی | آیت مذکورہ کی تفسیر میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصل مقصود شرع و دعوت
 اور دنیوی منسرتیں | الی اللہ ہے، جس کے دو اصول ہیں، حکمت اور موعظت سنہ، مجاہدہ
 کی صورت کبھی سرکپڑے تو اس کے لئے بھی احسن کی قید لگا کر اجازت دیدی گئی ہے، مگر
 وہ حقیقتہً دعوت کا کوئی شعبہ نہیں، بلکہ اس کے منفی پہلو کی ایک تفسیر ہے جس میں قرآن کریم
 نے بالآخر ہی احسن کی قید لگا کر جس طرح یہ بتلادیا ہے کہ وہ نرمی، نیر خواہی اور ہمدردی
 کے جذبے سے ہونا چاہئے اور اس میں دلائل واضحہ مخاطب کے مناسب حال بیان کرنا چاہئے
 مخاطب کی توہین و حقیر سے نکلی اجتناب کرنا چاہئے، اسی طرح اس کے احسن ہونے کے لئے
 یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود تکلم کے لئے مضر نہ ہو جائے، کہ اس میں اخلاق و ذلیہ حسد، بغض،
 تکبر، جاہ پسندی وغیرہ پیدا نہ ہو جائیں، جو بالنی گناہ کبیرہ ہیں، اور آجکل کے بحث و مباحثہ
 مناظرہ، مجاہدہ میں شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ان سے نجات پاتے تو ممکن ہے ورنہ عادتاً
 ان سے بچنا سخت دشوار ہے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ جس طرح شراب اُمّ النجاست ہے کہ خود بھی برا گناہ ہے
 اور دوسرے بڑے بڑے جسمانی گناہوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرح بحث و مباحثہ میں جب
 مقصود مخاطب پر غلبہ پانا اور اپنا علمی تفوق لوگوں پر ظاہر کرنا ہو جائے تو وہ بھی باطن کیلئے
 اُمّ النجاست ہے جس کے نتیجہ میں بہت سے روحانی جرائم پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حسد، بغض، تکبر
 غیبت، دوسرے کے عیوب کا تجسس، اس کی بُرائی سے خوش اور بھلائی سے رنجیدہ ہونا، قبول
 حق سے استکبار، دوسرے کے قول پر انصاف و اعتدال کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جواب ہی
 کی فکر خواہ اس میں قرآن و سنت میں کیسی ہی تاویلات کرنا پڑیں۔

یہ تو وہ مہلکات ہیں جن میں باوقار علماء بھی مبتلا ہوتے ہیں، اور معاملہ جب ان کے متبعین
 میں پہنچتا ہے تو دست و گریبان او دجنگ و جدال کے مہر کے گرم ہو جاتے ہیں، انا اللہ
 حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:۔

”علم تو اہل علم و فضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتہ اخوت و برادری) ہے
 ہر اتو وہ لوگ جنہوں نے علم ہی کو عداوت بنا لیا ہے، وہ دوسروں کو اپنے
 مذہب کی اقتدار کی وجوہات کس طرح دیتے ہیں، ان کے پیش نظر دوسرے پر
 غلبہ پانا ہی ہے تو پھر ان سے باہمی انس و مودت اور محبت کا تصور کیسے کیا
 کیا جاسکتا ہے، اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شر اور بُرائی اور

کیا ہوگی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کر دے، اور مومنین و منافقین کے اخلاق سے محروم کر دے؟

امام غزالی نے فرمایا کہ عظیم دین اور دعوت حق میں اشتغال رکھنے والا یا تو اصولِ صحیح کے تابع اور ہلک خطرات سے بچتا رہ کر سعادتِ ابدی حاصل کر لیتا ہے یا پھر اس مقام سے گرتا ہے تو شقاوتِ ابدی کی طرف جاتا ہے، اس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے، کیونکہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَمَةِ
عَالِمٌ لَمْ يَنْفَعَهُ اللَّهُ بِعِلْمِهِ

”سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو۔“

ایک دوسری حدیث صحیح میں ہے:-

لَا تَحْسَبُوا الْعِلْمَ لِسَبَابٍ أَوْ
الْعِلْمَاءَ وَاسْمَارُ أَوِ السَّهَابِ
وَلِتَصْرِفُوا أَيْدِيَكُمْ إِلَى النَّاسِ
إِلَيْكُمْ فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَهُوَ فِي
النَّارِ (ابن جریر من مشاہیر ما یصححہ ابی داؤد)

”علم دین کو اس غرض سے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ دوسرے علماء کے مقابلہ میں غرور عزت حاصل کرو یا کم علم لوگوں سے جھگڑو کرو یا اس کے ذریعہ لوگوں کی توبہ اپنی طرف کرو اور جو ایسا کر چکا وہ آگ میں ہے۔“

اسی لئے ائمہ فقہاء اور اہل حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدل ہرگز جائز نہیں تھے، دعوتِ حق کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطاب پر تجھے اس کو نرمی اور نیکیوں کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطاب پر متنبہ کر دے، پھر وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے، جھگڑے اور بدگوئی سے کلی احتراز کرے، حضرت امام مالک کا ارشاد ہے:-

كَانَ مَا يَنْفَعُ يَقُولُ الْهَرَاءُ وَ
الْحَدَّالُ فِي الْعِلْمِ يَدُ هَبْ
بِشُرِّ الْعِلْمِ عَنْ قَلْبِ الْعَبْدِ
وَقِيلَ لَهُ رَجُلٌ لَمْ يَعْلَمْ
بِالسُّنَّةِ فَمَهْلٌ يُجَادِلُ عَرْمًا
قَالَ لَا وَلَٰكِنْ يُخْبِرُ بِالسُّنَّةِ
فَإِنْ قِيلَ مِنْهُ وَإِلَّا سَكَتَ
(ارجز المسالك شرح موطا ص ۱۱۱)

”امام مالک نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدل فیر علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے کسی عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو گیا وہ حفاظتِ سنت کیلئے جہاں کر سکتا ہو، فرمایا نہیں، بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے، پھر وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے۔“

اس زمانے میں دعوت و اصلاح کا کام پوری طرح منتشر ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ فسادِ زمانہ اور حرام چیزوں کی کثرت کے سبب عام طور پر لوگوں کے قلوب سخت اور آخرت سے غافل ہو گئے ہیں، اور قبولِ حق کی توفیق کم ہو گئی ہے، اور بعض تو اس قبر میں مبتلا ہیں جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ آخرِ زمانے میں بہت سے لوگوں کے قلوب اندھ ہو جائیں گے، بھلے تجربے کی پہچان اور جائز و ناجائز کا امتیاز ان کے دل سے اٹھ جائے گا۔

اور وہ دوسرا سبب یہ کہ اندر بالمحروف اور نہی عن المنکر اور دعوت حق کے فرائض غفلت عام ہو گئی ہے، عوام کا تو کیا ذکر خواص علماء و فضلاء میں اس ضرورت کا احساس بہت کم ہے، یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اپنے اعمال درست کر لئے جائیں تو یہ کافی ہے خواہ اُن کی اولاد، بیوی، بھائی، دوست احباب کیسے ہی گناہوں میں مبتلا رہیں ان کی اصلاح کی فکر گویا ان کے ذمہ ہی نہیں، حالانکہ قرآن و حدیث کی نصیحتیں ہر شخص کے ذمہ اپنے ابن و عیال اور متعلقین کی اصلاح کو فرض قرار دے رہی ہیں ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَآتَوْا حَقَّهُمْ ذُرِّيَّتًا حَالًا﴾ اور پھر اگر کہیں لوگ دعوت و اصلاح کے فرائض کی طرف توجہ دیتے بھی ہیں تو وہ قرآنی تعلیمات اور دعوت پیغمبرانہ کے اصول و آداب سے نا آشنا ہیں یا بے سوجہ سمجھتے ہیں کہ جس وقت جو چاہا ہم والدہ اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، حالانکہ یہ قرآن و حدیث کی سنت انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دین اور احکام دین پر عمل کرنے سے اور زیادہ دور بھینک دیتا ہے۔

نہایت جہاں کسی دوسرے پر تنقید کی ذہبت آئے تو تنقید کا نام لے کر تفتیش اور استہزاء
و تمسخر تک پہنچ جاتے ہیں، حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا،

”جس شخص کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہے، اگرچہ اسے کھوتہالی میں نرمی کے ساتھ سمجھایا تو یہ نصیحت ہے، اور اگر علانیہ لوگوں کے سامنے اس کو اسو کیا تو یہ فضیحت ہے۔“

آجکل تو ایک دوسرے کے عیوب کو اخباروں، اشتہاروں کے ذریعہ منظرِ عام پر لانے کو دین کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین اور اس کی دعوت کی صحیح بصیرت اور آداب کے مطابق اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں تک دعوت کے اصول اور آداب کا بیان ہوا۔ اس کے بعد فرمایا:

داعیانِ دین کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ مذکور الصدر آدابِ دعوت کو استعمال کرنے کے باوجود جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر انسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اور بعض اوقات اس کا یہ اثر بھی ہو سکتا ہے کہ دعوت کا فائدہ نہ دیکھ کر آدمی پر بالوسی طاری

ہو جائے اور کام ہی پھول بیٹے، اس لئے اس جگہ میں یہ فرمایا کہ آپ کا کام صرف دعوت حق کو قبول
 صبر کے مطابق، اور دینا ہے، آگے اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا اس میں نہ آپ کا کوئی دخل ہو نہ آپ کی
 ذمہ داری، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ رہے گا، اور کون ہدایت
 پائے گا، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اپنا کام کرتے رہیں اس میں ہرست نہ باریاں یا دوس نہ ہوں اس
 سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی آداب دعوت ہی کا مکمل ہے۔

داعی حق کو کوئی ایذا پہونچائے | اس کے بعد کی تین آیتوں میں داعیان حق کے لئے ایک اور اہم
 توجہ دینا بھی جائز ہے مگر بہتر ہے | ہدایت ہو، وہ یہ کہ بعض اوقات ایسے سخت دل جاہلوں سے
 سابقہ پڑتا ہے کہ ان کو کتنی ہی نرمی اور خیر خواہی سے بات سمجھانی جائے وہ اس پر بھی مشتعل ہو جاتے
 ہیں زبان درازی کر کے ایذا پہونچاتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بھی تجاوز کر کے ان کو جسمانی
 تکلیف پہونچانے تک قتل تک سے بھی گریز نہیں کرتے، ایسے حالات میں دعوت حق دینے والوں کو
 کیا کرنا چاہئے۔

اس کے لئے قرآن عظیم میں ایک تو ان حضرات کو قانونی حق دیا گیا کہ جو آپ پر ظلم
 کرے آپ کو بھی اس کا بدلہ لینا جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بدلہ لینے میں محنت و زحمت سے
 تجاوز نہ ہو، جتنا ظلم اس نے کیا ہے، اتنا ہی بدلہ لیا جائے اس میں زیادتی نہ ہونے پائے۔
 اور آخر آیت میں مشورہ دیا کہ اگرچہ آپ کو انتقام لینے کا حق ہو لیکن صبر کریں اور انتقام
 نہ لیں تو یہ بہتر ہے۔

آیات مذکورہ کا شان نزول | جبہ و مفسرین کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے، غزوہ احد میں مشرکوں کی
 اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم | شہادت اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے مشلہ کرنے کے واقعہ
 و جہاں کی طرف تھیں سکے | میں نازل ہوئی صحیح بخاری کی روایت اسی کے مطابق ہے، دارقطنی نے
 بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ:

”غزوہ احد میں جب مشرکین ٹوٹ گئے تو صحابہ کرام میں سے ستر اکابر کی لاشیں
 سامنے آئیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم منہج حضرت حمزہ بھی
 تھے چونکہ مشرکین کو ان پر بڑا غیظ تھا، اس لئے ان کو قتل کرنے کے بعد ان کی
 لاش پر اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ ان کی ناک، کان، اور دوسرے اعضا کاٹے
 گئے، پیٹ چاک کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے سخت صدمہ
 پہنچا، اور آپ نے فرمایا کہ میں حمزہ کے بدلے میں مشرکین کے ستر آدمیوں کو اسی
 طرح مشلہ کروں گا، جیسا انہوں نے حمزہ کو کیا ہے، اس واقعہ میں یہ تین آیات

نازل ہوئیں، قرآن عاقبتیہ اور تفسیر قرطبی، بعض روایات میں ہر کہ دو سرے
حضرات صحابہ کے ساتھ بھی ان ظالموں نے اسی طرح کا معاملہ منشا کرنے کا کیا تھا۔
رکابہ وادہ الترمذی و احمد و ابن خزیمہ و ابن حبان فی تصنیہا عن ابی بن کعب
اس میں چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما غم سے بلا لیا تا تعداد ان صحابہ کے بدلے
میں شتر مشرکین کے منشا کرنے کا عزم فرمایا تھا، جو اللہ کے نزدیک اس اصول عدل و مساوات
کے مطابق نہ تھا جس کو آپ کے ذریعے دنیا میں قائم کرنا منظور تھا، اس لئے ایک تو اس پر متنبہ
ذرایا گیا کہ بدلہ لینے کا حق تو ہے، مگر اسی صفت اور اور پیمانہ پر جس مقدار کا ظلم ہے، بلا لحاظ تعداد چند کا
بدلہ شتر سے لینا درست نہیں، دوسرے آپ کو مکہ کرام انصاف کا نمونہ بنانا مقصود تھا، اس لئے یہ
نصیحت کی گئی کہ برابر برابر بدلہ لینے کی اگر یہ اجازت ہے، مگر وہ بھی چھوڑ دو اور میزموں پر اسکا
کرد تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم صبر ہی کریں گے، کسی ایک بھی
بدلہ نہیں لیں گے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا، غلہ یوحنا البغدی (فتح مکہ کے موقع پر جب یہ تمام
مشرکین غلاب ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے قبضہ میں تھے، یہ موقع تھا کہ
اپنا وہ عزم دارادہ پورا کر لیتے جو غزوہ اُحُد کے وقت کیا تھا، مگر آیات مذکورہ کے نزول کے وقت
ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کو چھوڑ کر صبر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے
فتح مکہ کے وقت ان آیات کے مطابق سب کا عمل ختم ہو گیا، شاید اسی بنا پر بعض روایات
میں یہ مذکور ہے کہ یہ آیتیں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی تھیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ان
آیات کا نزول مکہ ہوا ہو، اول غزوہ اُحُد میں نازل ہوئیں اور پھر فتح مکہ کے وقت دوبارہ
نازل ہوئیں (مکاحکامہ المنظری عن ابن الحصار)

مسئلہ: اس آیت نے بدلہ لینے میں مساوات کا قانون بتایا ہے، اسی لئے حضرت
فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا، جو زخمی
کر دے تو اتنا ہی زخم اس کرنے والے کو لگایا جائے گا جو کسی کا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر قتل
کر ڈالے تو وہی مقتول کو حق دیا جائے گا کہ وہ بھی پہلے قاتل کا ہاتھ یا پاؤں کاٹے پھر قتل کر دے۔
البتہ اگر کسی نے پتھر مار کر کسی کو قتل کیا یا تیروں سے زخمی کر کے قتل کیا تو اس میں نوعیت
قتل کی وجہ سے ہمدرد متعین نہیں کی جاسکتی کہ کتنی میزوں سے یہ قتل واقع ہوا ہے، اور مقتول کو
کتنی تکلیف پہنچی ہے، اس معاملہ میں حقیقی مساوات کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اس لئے اس کو تلوار ہی
سے قتل کیا جائے گا (جصاص)

مسئلہ: آیت کا نزول اگرچہ جسمانی نکاحات اور مالی نقصان پہنچانے کے متعلق ہوا ہے مگر الفاظ عام ہیں جس میں مالی نقصان پہنچانا بھی داخل ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی سے اس کا مال غصب کرے تو اس کو بھی حق محض ہے کہ اپنے حق کے مطابق اس سے مال چھین لے، یا چوری کر کے سیلاب طغیان کے لیے جس کے مثلاً نقد و پیدیا ہو تو اس کے لیے میں اتنا ہی نقد و پیدیا غصب یا چوری کے ذریعے لے سکتا ہے، غلہ، کپڑا وغیرہ لیا ہے تو اسی طرح کا غلہ، کپڑا لے سکتا ہے، مگر ایک جنس سے بدلے میں دوسری جنس نہیں لے سکتا، مثلاً روپے کے بدلے میں کپڑا یا کوئی دوسری استعمالی چیز زبردستی نہیں لے سکتا، اور بعض فقہاء نے مطلقاً اجازت دی ہے خواہ جنس حق سے ہو یا کسی دوسری جنس سے، اس مسئلہ کی کچھ تفصیل قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے، اور تفصیلی بحث کتب فقہ میں مذکور ہے۔

آیت وَلَئِنْ عَاثَبْتُمْ فِيهِمْ قَانُونِ مذکور تھا جس میں منصب مانور کے لئے برابر کا بدلہ لینا جائز مسگر صبر کرنا افضل و بہتر بتلایا گیا ہے، اس کے بعد کی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی خطاب فرما کر صبر کرنے کی تلقین و ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ آپ کی شانِ عظیم اور منصب بلند کے لئے دوسروں کی نسبت سے وہی زیادہ موزوں و مناسب ہو، اس لئے فرمایا اَوَلَيْسَ بِرُوْحٍ مَّا صَبَرْتُمْ اَنْ تَصْبِرُوْا عَلٰی مَا كُنْتُمْ يَوْمَئِذٍ، یعنی آپ تو انتقام کا ارادہ ہی نہ کریں، صبر ہی کو اختیار کریں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ آپ کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ہوگا، یعنی صبر کرنا آپ کے لئے آسان کر دیا جاتے گا۔

آخری آیت میں پھر ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد حاصل ہونے کا یہ بتلادیا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ حَيْثُ يَشَاءُوْنَ ؕ

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو دو صفوں کے حامل ہوں، ایک تقویٰ دوسرے احسان، تقویٰ کا حاصل نیک عمل کرنا اور احسان کا مفہوم اس جگہ خلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہی، یعنی جو لوگ شریعت کے تابع اعمال صالحہ کے پابند ہوں اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتے ہوں، حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی محبت (نصرت) حاصل ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟

المثل سورۃ نحل کی تفسیر آج ۲۵ شعبان ۱۳۸۹ھ شب شعبہ میں پوری ہوئی۔

وَبِشۡءٍ اَلْحَمْدُ اَوَّلًا وَاٰخِرًا وَاَمَّا بَیِّنَاتُ

سورۃ نحل تمام شد

سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِيلَ

سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِيلَ

سُورَةُ بَنِي إِسْرَءِيلَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَوَاحِدٌ عَشَرَ آيَةً وَاثْنَا عَشَرَ كُوفَةً

سورہ بنی اسرائیل مکہ میں اُتری اور اس کی ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ

پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات

الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بَرَكْنَا حَوْلَہٗ

حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تاکہ

لِنُزِیْہَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ هُوَ السَّبِیْعُ الْبَصِیْرُ

و کھلائیں اس کو اپنی قدرت کے نمونے وہی ہے سننے والا دیکھنے والا۔

خلاصہ تفسیر

وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے آس پاس (کہ ملکِ شام ہے) ہم نے (دینی اور دنیوی) برکتیں کر رکھی ہیں (دینی برکت یہ ہے کہ وہاں بکثرت انبیاء مدفون ہیں اور دنیوی برکت یہ ہے کہ وہاں باغات اور نہروں، چشموں اور پیداوار کی کثرت ہے۔ غرض اس مسجد اقصیٰ تک عجیب طور پر اس واسطے) لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلا دیں (جن میں بعض تو خود وہاں کے متعلق ہیں مثلاً اتنی بڑی مسافت کو بہت تھوڑے سے وقت میں طے کر لینا اور سب انبیاء سے ملاقات کرنا اور ان کی باتیں سننا وغیرہ اور بعض آگے کے متعلق ہیں۔ مثلاً آسمانوں پر جانا اور وہاں کے

عجائبات کا مشاہدہ کرنا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سنے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو سنتے اور احوال کو دیکھتے تھے اس کے مناسب اُن کو یہ خاص انبیاء اور اعزاز بخشا اور اپنے قریب خاص کا وہ مقام عطا کیا جو کسی کو نہیں ملا)

معارف و مسائل

اس آیت میں واقعہ معراج کا بیان ہے جو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مخصوص اعزاز اور انبیاء کی مجتہدہ ہے لفظ اسم ہی اسماء سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی رات کو لیجانا ہیں اس کے بعد تبیلاً کے لفظ سے صراحت بھی اس مفہوم کو واضح کر دیا اور لفظ تبیلاً کے نکرہ لانے سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اس تمام واقعہ میں پوری رات بھی صحت نہیں بلکہ رات کا ایک حصہ صرف ہوا ہے نہ سب حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر جس کا ذکر اس آیت میں ہے اس کو اسماء کہتے ہیں اور یہاں سے جو سفر آسمانوں کی طرف ہوا اس کا نام معراج ہے اسماء اس آیت کی نفس قطعی سے ثابت ہے اور معراج کا ذکر سورہ نجم کی آیات میں ہے اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے بَعْدَہ اس مقام اعزاز و اکرام میں لفظ بَعْدَہ ایک خاص مجہولیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حق تعالیٰ کسی کو خود فرمادیں کہ یہ میرا بندہ ہے اس سے بڑھ کر کسی بشر کا بڑا اعزاز نہیں ہو سکتا حضرت حسن دہلوی نے خوب فرمایا ہے

بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بندہ تو ام تو بزبان خود بگو بندہ تو از کیستی

یہ ایسا ہے جیسے ایک دوسری آیت میں عَبَادَہٗ لَکُم مِّنْ ذَٰلِکَ لیتا ہے فرمایا کہ اپنے مقبولانِ بارگاہ کا ۱۰۰٪ بڑا بھانا مقصود ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ کا عبدِ کامل بن جائے اس لئے کہ خصوصاً اعزاز کے مقام پر آپ کی بہت سی صفات کمال میں سے صفتِ عبودیت کو اختیار کیا گیا اور اس لفظ سے ایک بڑا فائدہ بھی مقصود ہے کہ اس حیرت انگیز سفر سے جس میں اول سے آخر تک سب فوق العادات معجزات ہی ہیں کسی کو خدائی کا وہم نہ ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھانے جانے سے عیسائیوں کو دھوکہ لگا ہے اس لئے لفظ عَبْدَہٗ کہہ کر یہ بتا دیا کہ ان تمام صفات و کمالات اور معجزات کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے ہی ہیں خدا نہیں۔

معراج کے جسمانی ہونے پر قرآن قرآن مجید کے ارشادات اور احادیث متواترہ سے جگہ ذکر آگے آتا ہے ثابت ہے و سنت کے دلائل اور اجماع کہ اسماء اور معراج کا تمام سفر صرف روحانی نہیں تھا بلکہ جسمانی تھا جیسے

عام انسان سفر کرتے ہیں قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ سَبَّحَانَ ہیں اس طرف اشارہ موجود ہے کیونکہ یہ لفظ تعجب اور کسی عظیم الشان امر کے لئے استعمال ہوتا ہے اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتی تو اس میں کوئی عجیب بات بے خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے کہ میں آسمان پر گیا فلاں

نلاں کام کئے۔

دوسرا اشارہ لفظ قَبَد سے اسی طرف ہے کیونکہ قَبَد صرف روح نہیں بلکہ جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے اس کے علاوہ۔

واقعہ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمّ ہانیؓ کو بتلایا تو انہوں نے حضورؐ کو یہ خبر دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں پر اس کا اظہار کیا تو کفار مکہ نے تکذیب کی اور منافق اڑبایا یہاں تک کہ بعض تو مسلم اس خبر کو شکر مہر ہو گئے اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو ان معاملات کا کیا امکان تھا اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ آپ کو اس سے پہلے اور بعد میں کوئی معراج روحانی بصورت خواب بھی ہوئی ہو جو ہر امت کے نزدیک آیت قرآن وَمَا جَعَلْنَا السُّورَةَ اِلَّا نَذِيرًا میں رُوئے ہے اور دیت ہے مگر اس کو بلفظ رُوئے یا رُوئے اکثر خواب دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس معاملہ کو تشبیہ کے طور پر لیا گیا ہو کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ لے اور اگر رویا کے معنی خواب ہی کے لئے جائیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ واقعہ معراج جسمانی کے علاوہ اس سے پہلے یا پچھلے یہ معراج روحانی بطور خواب بھی ہوئی ہو اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے جو اس کا واقعہ خواب ہونا منقول ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معراج جسمانی نہ ہوتی ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ احادیث اسرار کی متواتر میں اور نقاشی نے میں صحابہ کرام کی روایات اس باب میں نقل کی ہیں اور نقاشی میں اس نے شفاء میں اور زیادہ تفصیل دی ہے۔ (قرطبی)

اور امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ان تمام روایات کو پوری جرح و تعدیل کے ساتھ نقل کیا ہے پھر کچھ صحابہ کرام کے اسماء ذکر کئے ہیں جن سے یہ روایات منقول ہیں ان کے اسماء یہ ہیں: حضرت عمر ابن خطابؓ، علیؓ، مرثد بن اسحقؓ، ابوذر غفاریؓ، مالک بن حنفیہؓ، ابوہریرہؓ، ابو شحیرہؓ، ابن عباسؓ، شذاد بن اوسؓ، ابی بن کعبؓ، عبدالرحمن بن قریظؓ، ابو جحیمہؓ، ابولیلؓ، عبداللہ بن عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ، حذیفہ بن یمانؓ، بزیڑہؓ، ابوالیوب انصاریؓ، ابوامامہؓ، سمرہ بن جندبؓ، ابوالفضلؓ، صہیبؓ، الرویؓ، ام ہانیؓ، عائشہؓ، ام المؤمنینؓ، اسرار کثرت الی بکر رضی اللہ عنہم اجمعین اس کے بعد ابن کثیر نے فرمایا:

فَحَدَّثَ يَثُ الْأَسْرَاءُ أَجْمَعِ عَلِيهِ

المسلمون وأعرض عنه الزنادقة

والمليحون - (ابن کثیر)

واقعہ اسرار کی حدیث پر تمام مسلمانوں کا

اجماع ہے صرف ملحد و زندقہ لوگوں نے اس

کو نہیں مانا۔

مختصر واقعہ معراج ابن کثیر کی روایت سے

امام ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور احادیث متعلقہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر اسرار بیداری میں پیش آیا خواب میں نہیں بلکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر برات پر ہوا جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو برات کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبیلہ کی طرف تہمتہ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زمینہ لایا گیا جس میں نیچے سے اوپر جانے کے درجے بنے ہوئے تھے اس زمینہ کے ذریعہ آپ پہلے آسمان پر تشریف لے گئے اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے (اس زمینہ کی حقیقت تو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے کہ کیا اور کیسا تھا) کل بھی زمینہ کی بہت سی قسمیں دنیا میں رائج ہیں ایسے زمینہ بھی جتنی خود حرکت میں لٹ کی صورت کے زمینہ بھی ہیں اس معجزانہ زمینہ کے متعلق کسی شک و شبہ میں پڑنے کا کوئی مقام نہیں بہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپ کا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی جن کا مقام کسی زمین آسمان میں ہے مثلاً چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پھر آپ ان تمام انبیاء علیہم السلام کے مقامات سے بھی آگے تشریف لے گئے اور ایک ایسے میدان میں پہنچے جہاں ظہم تقدیر کے کھنکھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور آپ نے سدا رفا المنہی کو دیکھا جس پر اللہ جل شانہ کے حکم سے سونے کے پردے اور مختلف رنگ کے پردے لگے اور جس کو اللہ کے فرشتوں نے گھیرا ہوا تھا اسی جگہ حضرت جبریل امین کو مختلف مقامی اللہ تعالیٰ نے انکی مثل شکل میں دیکھا جن کے چہرے سو بازو تھے اور وہیں پر ایک رفعت سبز رنگ کا دکھیا جسے اللہ تعالیٰ نے گھیرا ہوا تھا رفعت مندرجہ ہر رنگ کی پانچ اور آپ نے بیت المعمور کو بھی دیکھا جس کے پاس بانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار سے کرنگے کی طرح ہوتے تھے اس بیت المعمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جسکی باریک دوبارہ غفلت ہونے کی قیامت تک نہیں آتی اور آسمان بیت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کا پیشہ خود معائنہ فرمایا اس وقت آپ کی اُمت پر اقول پچاس نمازوں کے فرض ہونے کا حکم ملا پھر تکلیف کر کے پانچ کر دی گئیں اس سے تمام عبادات کے اندر نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپ واپس بیت المقدس میں اترے اور جن انبیاء علیہم السلام کیساتھ مختلف آسمانوں میں ملاقات ہوئی وہ بھی آپ کے ساتھ اترے (گویا آپ کو نصرت کرنے کے لئے بیت المقدس تک ساتھ آئے) اس وقت آپ نے نماز کا وقت ہو جانے پر سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اسی دن صبح کی نماز ہو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ امامت انبیاء کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک آسمان پر جانے سے پہلے پیش آیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ واپسی کے بعد ہوا کیونکہ

آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کے واقعات ہیں یہ بخیر قول ہے کہ سب انبیاء سے جبائیل امین نے آپ کا تعارف کرایا۔ اگر واقعہ امامت پہلے ہو چکا ہوتا تو یہاں تعارف کی ضرورت نہ ہوتی اور آپ بھی نظام ہی رہتے کہ اس سفر کا اصل مقصد مدار اعلیٰ میں جانے کا تھا پہلے اسی کو پورا کرنا اقرب معلوم ہوتا ہے پھر اس اصل کام سے فراغت ہوئی تو تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے ساتھ شایعت (رخصت) کے لئے بیت المقدس تک آئے اور آپ کو جبائیل امین کے اشارہ سے سب کا امام بنا کر آپ کی سیادت اور سب پر فضیلت کا اعلیٰ ثبوت دیا گیا۔

اس کے بعد آپ بیت المقدس سے رخصت ہوئے اور براق پر سوار ہو کر اندھیرے وقت میں مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

واقعہ سراج کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حافظ ابو نعیم اسماعیلی نے اپنی کتاب دلائل النبوة میں محمد بن عمرو واقدی کی سند سے بروایت محمد بن کعب قرظی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ روم قیصر کے پاس اپنا نام مبارک دیکر حضرت دحیہ ابن خلیفہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اس کے بعد حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ کے خط پہنچا اور شاہ روم تک پہنچے اور اس کے صاحب عقل و فراست ہونے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا۔ جو صحیح بخاری اور حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے جس کے آخر میں ہے کہ شاہ روم ہرقل نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیق کرنے کے لئے عرب کے ان لوگوں کو جمع کیا جو اس وقت ان کے ملک میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے مثلاً ہی حکم کے مطابق ابوسفیان ابن حرب اور ان کے رفقاء جو اس وقت مشہور تجارتی قافلہ سے لے کر شام میں آئے ہوئے تھے وہ حاضری کئے گئے شاہ ہرقل نے ان سے وہ سوالات کئے جنکی تفصیل صحیح بخاری وسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ ابوسفیان کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کریں جن سے آپ کی حقارت اور بے حیثیت ہونا ظاہر ہو کر ابوسفیان کہتا ہیں کہ مجھے پس اس ارادہ سے کوئی چیز اس کے سوا مانع نہیں تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جسکا جھوٹ ہونا کھل جائے اور میں بادشاہ کی نظر سے گرجاؤں اور میرے ساتھی بھی ہمیشہ مجھے جھوٹا ہونے کا طعنہ دیا کریں۔ البتہ مجھے اس وقت خیال آیا کہ اس کے سامنے واقعہ معراج بیان کروں جسکا جھوٹ ہونا

مسند واقدی رقم کردہ روایت حدیث میں محدثین نے چونکہ امام ابن کثیر جیسے نقاطہ حدیث نے ان کی روایت کو غلط سمجھا ہے اس لئے ان کا تعلق عقلاً یا طعن دھرم نہیں اور ایسے ماریخی معاملات میں انکی روایت معتبر ہے۔ ۱۲۰

بادشاہ خود سمجھ لیتا۔ تو میں نے کہا کہ میں ان کا ایک معاملہ آپ سے بیان کرتا ہوں جس کے متعلق آپ خود معلوم کر لیتے کہ وہ تھوڑے ہیں۔ ہرقل نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ یہ مدعی نبوت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپ کی اس مسجد بیت المقدس میں پہنچے اور کچھ اسی رات میں صبح سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہمارے پاس پہنچ گئے۔

المیاد بیت المقدس کا سب سے بڑا عالم اس وقت شاہ روم ہرقل کے سرہانے پر قریب کھڑا ہوا تھا اس نے بیان کیا کہ میں اس رات سے واقف ہوں۔ شاہ روم اس کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپ کو اسکا علم کیسے اور کیونکر ہوا اس نے عرض کیا کہ میری عادت تھی کہ میں رات کو اس وقت تک ہوتا نہیں تھا جب تک بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کر دوں۔ اس رات میں نے حسب عادت تمام دروازے بند کر دیے مگر ایک دروازہ بند نہ ہو سکا تو میں نے اپنے عمار کے لوگوں کو بلایا انہوں نے ملکر کوشش کی مگر وہ ان سے بھی بند نہ ہو سکا دروازے کے کواڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی پہاڑ کو ہلا رہے ہیں میں نے عاجز ہو کر کارگیروں اور نجاردوں کو بلوایا انہوں نے دیکھ کر کہا کہ ان کواڑوں کے اوپر دروازہ کی عمارت کا بوجھ ٹپ گیا ہے اب جس سے پہلے اس کے بند ہونے کی کوئی تدبیر نہیں ہے صبح کو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح کیا جاوے۔ میں مجبور ہو کر لوٹ آیا اور دونوں کواڑ اس دروازے کے کھلے رہے۔ صبح ہوتے ہی میں پھر اس دروازہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ مسجد کے پاس ایک پتھر کی چٹان میں روکن کیا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی جانور باندھ دیا گیا ہے اس وقت میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ آج اس دروازہ کو اللہ تعالیٰ نے شاید اس سے بند ہونے سے روکا ہے کہ کوئی نبی یہاں آنے والے تھے اور پھر بیان کیا کہ اس رات آپ نے ہماری مسجد میں نماز پڑھی تھی اس کے بعد اور تفصیلات بیان کی ہیں (ابن کثیر ج ۳ ص ۱۳)

اسرا و معراج کی تاریخ | امام غزالی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ معراج کی تاریخ میں روایات بہت مختلف ہیں مولیٰ بن عقبہ کی روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے چھ ماہ قبل پیش آیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت خدیجہ ام المؤمنین کی وفات نمازوں کی فرضیت نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت خدیجہ کی وفات کا واقعہ بعثت نبوی کے سات سال بعد ہوا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ واقعہ معراج بعثت نبوی سے پانچ سال بعد میں ہوا ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ واقعہ معراج اس وقت پیش آیا جبکہ اسلام عام قبائل عرب میں پھیل چکا تھا ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ واقعہ معراج ہجرت مدینہ سے کئی سال پہلے کا ہے۔

حرلی کہتے ہیں کہ واقعہ اسرا و معراج ربیع الثانی کی تائیسویں شب میں ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا ہے اور ابن قاسم ذہبی کہتے ہیں کہ بعثت سے اٹھارہ مہینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ ہنرات

محدثین نے روایات مختلفہ ذکر کر کے بعد کوئی فیصلہ کن چیز نہیں لکھی اور مشہور، عام طور پر یہ ہے کہ ماہِ رجب کی تائبیسویں شب، شبِ معراج ہے واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ | حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے تو آپ نے فرمایا کہ ”مسجدِ حرام“ پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کونسی تو آپ نے فرمایا ”مسجدِ اقصیٰ“ میں نے دریافت کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے تو آپ نے فرمایا چالیس سال پھر فرمایا کہ مسجدِ کعبہ ترتیب تو یہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے سرزمین کو مسجد بنا دیا ہے جس جگہ نماز کا وقت آجائے وہیں نماز ادا کر لیا کرو۔ (ردِ داہم)

امامِ تفسیر بخاری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو پوری زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا ہے اور اس کی بنیادیں سالوں میں زمین کے اندر رکت نہجی ہوئی ہیں اور مسجدِ اقصیٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (تفسیر قرطبی ص ۱۳ ج ۴)

اور مسجدِ حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنی ہوئی ہے اور بعض اوقات پورے حرم کو بھی مسجدِ حرام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس دوسرے معنی کے اعتبار سے دو روایتوں کا یہ تعارض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ بعض روایات میں آپ کا اسرار کے لئے تشریف لیجانا صفتِ ام ہانی کے مکان سے منقول ہے اور بعض میں حلیم بیت اللہ سے اگر مسجدِ حرام کے عام معنی لئے جائیں تو یہ مسجد نہیں کہ پہلے آپ ام ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان میں ہوں وہاں سے قبل کہ حلیم کو یہ تشریف لائے پھر وہاں سے سفر اسرار کی ابتدا ہوئی واللہ اعلم۔

مسجدِ اقصیٰ اور ملک | آیت میں لَوْ كُنَّا كَوْنًا فِي مِثْلِ حَوْلٍ سے مراد پوری زمین شام ہے ایک حدیث شام کی برکات سے | میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش سے دریائے فرات تک مبارک زمین بنائی ہے اور اس میں سے فلسطین کی زمین کو تقدس خاص عطا فرمایا ہے (ردِ المحتار)

اس کی برکات دینی بھی ہیں اور دنیاوی بھی۔ دینی برکات تو یہ ہیں کہ وہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اور تمام انبیاء کا مسکن و مدفن ہے اور دنیاوی برکات اس کی زمین کا سرسبز ہونا اور اس میں عمدہ چشے بہہ رہنا باغات وغیرہ کا ہونا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ملک شام تو تمام شہروں میں سے میرا منتخب خطہ ہے اور میں تیری طرف اپنے منتخب بندوں کو بھیج دیاں گا۔ (قرطبی) اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ دجال ساری زمین میں پھیرے گا مگر چار مسجدوں تک اس کی رسائی نہ ہوگی۔

مسجد مدینہ مسجد مکہ مکرمہ مسجد اقصی مسجد طور

وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اُس کو ہدایت بنی اسرائیل

إِسْرَآءِيلَ إِلَّا تَتَّخِذُوا مِنْ دُونِي وَكِيلًا ⑤

کے واسطے کہ نہ تمہارا وہ میرے سوا کسی کو کارساز

ذُرِّيَّتَكَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّكَ كَانَ عَبْدًا

تم جو اولاد ہو اُن لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے نوح کے ساتھ بے شک وہ تھا بندہ

مَشْكُورًا ⑥

حق ماننے والا -

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (یعنی توریت) دی اور ہم نے اُس کو بنی اسرائیل کے لئے راہِ ہدایت بنایا جس میں اور احکام کے ساتھ یہ توحید کا عظیم الشان حکم بھی تھا کہ تم میرے سوا اپنا کوئی کارساز مت قرار دو، اے اُن لوگوں کی نسل جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، ہم تم سے خطاب کر رہے ہیں تاکہ اس نعمت کو یاد کرو کہ اگر ہم اُن کو کشتی پر سوار کر کے نہ بچاتے تو آج تم اُن کی نسل کہاں ہوتے اور نعمت کو یاد کر کے اس کا شکر کرو جس کی بڑی فو تو حید ہے اور وہ نوح (علیہ السلام) بڑے شکر گزار بندہ تھے (پس جب انبیاء شاکر کرتے رہے تو تم کیسے اُن کے تارک ہو سکتے ہو۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآءِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ

اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم حیرانی کرو گے

فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوقًا كَبِيرًا ⑦

دو بار اور سرکشی کرو گے بڑی سرکشی پھر جب

جَاءَ وَعْدُ أُولَئِمَّا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي بَأْسٍ

آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت ہتھیار والے

شَدِيدٍ فَيَأْخُذُوا خِلَالَ الدِّيارِ وَكَانَ وَعْدًا

والے پھر پھیل پڑے شہروں کے پنجے اور وہ وعدہ

مَفْعُولًا ⑤ ثُمَّ سَرَدَدْنَا لَكُمْ الْكُرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ

ہونا ہی تھا پھر ہم نے بھیج دی تمہاری باری اُن پر اور قوت دی تم کو

بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ⑥ إِنْ أَحْسَنْتُمْ

مال سے اور بیٹوں سے اور اُس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر اگر بھلائی کی تم نے

أَحْسَنْتُمْ لَا نُفْسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلِمَاءَ فَإِذَا جَاءَ

تو بھلا کیا اپنا اور اگر بُرائی کی تو اپنے لئے ہمارے جہنم

وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءَ أَوْجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ

وعدہ دوسرا بھیجے اور بندے کر ادا اس کر دیں تمہارے منہ اور گھس جائیں مسجد میں

كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ⑦

جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جس جگہ غالب ہوں پوری خرابی

عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَسَّرَ لَكُمُّهُ وَإِنْ عُثِرَ عَنْكُمْ

ہمید نہیں تمہارے رب سے کہ رُخ کرے تم پر اور اگر پھرو ہی کرو گے تو ہم پھر وہی کریں گے اور

جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ⑧

کیا ہے ہم نے دوزخ کو قید خانہ کافروں کا۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں (خواہ تو ریت میں) یاد دہا کر دیا بنی اسرائیل

کے پیغمبروں میں) یہ بات (بطور پیشین گوئی کے) بتلا دی تھی کہ تم مرزہ میں شام میں دو مرتبہ

(گناہوں کی کثرت سے) خرابی کرو گے (ابک مرتبہ شریعت موسویہ کی مخالفت اور دوسری مرتبہ

شریعت عیسویہ کی مخالفت) اور دوسروں پر بھی بڑا زور چلائے لگو گے (یعنی ظلم و زیادتی کرو گے)

اس طرح کُتبت میں حقوق اللہ کے خلاف کرنے کی طرف اور کُتبت میں حقوق العباد منسلک کرنے کی طرف اشارہ ہے اور یہی بتا دیا تھا کہ دونوں مرتبہ سخت سزاؤں میں مبتلا کئے جاؤ گے، پھر جب ان دو مرتبہ میں سے پہلی مرتبہ کی عیاد آئے گی تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیں گے جو بڑے جنگجو ہوں گے پھر وہ (تمہارے) گھروں میں گھس پڑیں گے (اور تم کو قتل و قید اور غارت کر دیں گے اور یہ وعدہ سزا ایک وعدہ ہے جس پر وہ نہ ہو کر رہے گا پھر جب ہم اپنے کئے پر نادم و تائب ہو جاؤ گے، تو ہم تم پر ان پر غلبہ کر دیں گے جو اب واسطہ ہے کہ جو قوم ان پر غالب آئے گی وہ تمہاری حامی ہو جائے گی اس طرح تمہارے دشمن اس قوم سے اور تم سے دونوں سے مغلوب ہو جائیں گے) اور مال اور بیویوں سے (جو قید اور غارت کئے گئے تھے) ہم تمہاری ادا کریں گے (یعنی یہ چیزیں تم کو واپس مل جائیں گی جن سے تمہیں قوت پہونچے گی) اور ہم تمہاری جماعت (یعنی تابعین) کو بڑھا دیں گے (پس جاہ و مال اور اولاد و تبعین سب میں ترقی ہوگی اور اس کتاب میں بطور نصیحت یہ بھی لکھا تھا کہ) اگر (اب آئندہ) اچھے کام کرتے رہو گے تو اپنے ہی نفع کے لئے اچھے کام کرو گے (یعنی دنیا و آخرت میں اس کا نفع حاصل ہوگا) اور اگر ابھر، تم بڑے کام کرو گے تو بھی اپنے ہی لئے ابراہی کرو گے (یعنی پھر سزا ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا جسکا آگے بیان ہے کہ) پھر جب مذکورہ دو مرتبہ کے فساد میں سے (آخری مرتبہ کا وقت آئے گا) اور اس وقت تم مشرکیت عیسویہ کی مخالفت کرو گے، تو پھر ہم دوسروں کو تم پر مسلط کر دیں گے تاکہ وہ تمہیں مارا کر (تمہارا پیچھا لگا دیں اور جس طرح وہ پہلے لوگ مسجد ربیت المقدس) میں (لوٹ مار کے ساتھ) گھسے تھے یہ (پچھلے لوگ بھی اس میں گھس پڑیں گے اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے سب کو ہلاک و برباد کر ڈالیں۔ اور اس کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر اس دوسری مرتبہ کے بعد جب دور شریعت محمدیہ کا ہونے کا وقت مخالفت و معصیت سے باز آکر شریعت محمدیہ کا اتباع کر لو تو، عجب نہیں (یعنی امید) کہ معنی وعدہ ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرما دے) اور تم کو دوبارہ ذلت سے نکال دے، اور اگر تم پھر وہی شرارت کرو گے تو ہم بھی پھر وہی سزا کا برتاؤ کریں گے (چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں انہوں نے آپ کی مخالفت کی تو پھر قتل و قید اور ذلیل ہونے پر تو دنیا کی سزا ہو گئی) اور آخرت میں (ہم نے جہنم کو) ایسے کافروں کا جہان بنا رکھا ہے۔

اس سے پہلی آیات جَعَلْنَا لَكَ ذِي الْقُرْبَىٰ اِسْرَآءِیْلَ میں احکام شرعیہ اور

رابطہ آیات

ہدایات الہیہ کے اتباع و اطاعت کی ترغیب تھی اور مذکورہ صدر آیات میں ان کی مخالفت سے مزہیب و زجر کا مضمون ہے ان آیات میں بنی اسرائیل کے دو واقعے عبرت و نصیحت کے لئے ذکر کئے گئے کہ انہوں نے ایک مرتبہ معاصی اور حکم ربانی کی مخالفت میں انہماک کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کر دیا جنہوں نے ان کو تباہ کیا پھر ان کو کچھ تنبیہ ہو گئی اور شرارت

کم کر دی تو سنبھل گئے مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی شرارتیں اور بد اعمالیاں انہیں پھیل گئیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے دشمن کے ہاتھ سے مزا دلانی قرآن کریم میں دو واقعوں کا ذکر ہے مگر تاریخ میں اسطرح کے چھ واقعات مذکور ہیں۔

پہلا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام بانی مسجد انصاری کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد پیش آیا کہ بیت المقدس کے حاکم نے بے دینی اور بد عملی اختیار کر لی تو مصر کا ایک بادشاہ اس پر چڑھ آیا اور بیت المقدس کا سامان سونے چاندی کا لوٹ کر لے گیا مگر شبہ اور مسجد کو منہ نہ نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ اس سے تقریباً چار سو سال بعد کا ہے کہ بیت المقدس میں بسند واسے بعض یہودیوں نے بت پرستی شروع کر دی اور باقیوں میں نا اتفاقی اور باہمی جھگڑا سے ہونے لگے اسکی حکومت سے پھر مصر کے کسی بادشاہ نے ان پر چڑھائی کر دی اور کسی قدر شہر اور مسجد کی عمارت کو بھی نقصان پہنچایا پھر انکی حالت کچھ سنبھل گئی۔

تیسرا واقعہ اس کے چند سال بعد جب بخت نصر شاہ بابل نے بیت المقدس پر چڑھائی کر دی اور شہر کو لوٹ کر بہت سامان لوٹ لیا اور بہت سے لوگوں کو قید کر بنا کر لے گیا اور پہلے بادشاہ کے خاندان کے ایک فرد کو اپنے قائم مقام کی حیثیت سے اس شہر کا حاکم بنا دیا۔

چوتھا واقعہ اس نے بادشاہ نے جو بہت پرست اور بد عمل تھا بخت نصر سے بغاوت کی تو بخت نصر دوبارہ چڑھ آیا اور کشت و خون اور قتل و غارت کی کوئی حد نہ پیشہ میں آگ لگا کر میدان کر دیا یہ حادثہ تعمیر مسجد سے تقریباً چار سو پندرہ سال کے بعد پیش آیا اس کے بعد حبیب دیہاں سے جلا وطن ہو کر بابل چلے گئے جہاں نہایت ذلت و خواری سے رہنے پڑے ستر سال گزر گئے اس کے بعد شاہ ایران نے شاہ بابل پر چڑھائی کر کے بابل فتح کر لیا پھر شاہ ایران کو ان جلا وطن یہودیوں پر رحم آیا اور انکو واپس ملک شام میں پہنچا دیا اور ان کا اٹھا ہوا سامان بھی واپس کر دیا۔ اب یہودی اپنے اعمال بد اور مباحی سے تائب ہو چکے تھے یہاں نئے سرے سے آباد ہوئے تو شاہ ایران کے تعاون سے پھر مسجد انصاری کو سابق نمونہ کے مطابق بنا دیا۔

پانچواں واقعہ یہ پیش آیا کہ جب یہودی کو یہاں زمینان اور آسودگی دوبارہ حاصل ہو گئی تو اپنے ماضی کو بھول گئے اور پھر بد کاری اور بد اعمالیاں میں ہلک ہو گئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے ایک سو ستر سال پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ جس بادشاہ نے انکا کبر آباد کیا تھا اس نے چڑھائی کر دی اور چالیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا چالیس ہزار کو قید کر اور غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا اور مسجد کی بجائے بیت پرستی کی مگر عمارت مسجد کی بنی گئی مگر پھر اس بادشاہ کے جانشینوں نے شہر اور مسجد کو بابل میں آباد کر دیا اس کے کچھ عرصہ کے بعد بیت المقدس پر سلاطین روم کی حکومت ہو گئی انھوں نے مسجد کو پھر درست کیا اور اس کے آٹھ سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

پیشا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معبود اور رفیع جسمانی کے چالیس برس بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ یہودیوں نے اپنے حکمران سلاطین روم سے بغاوت اختیار کر لی رومیوں نے پھر شہر اور مسجد کو مباد کر کے وہاں حالت بناد کی جو پہلے تھی اس وقت کے بادشاہ کا نام ملیطس تھا جو نہ یہودی کی تھی نہ نصرانی کی بلکہ اس کے بہت روز کے بعد قسطنطین اول عیسائی ہوا ہے اور اس کے بعد سے حضرت عثمان خطابؓ کے زمانہ تک یہ مسجد ویران پڑی رہی یہاں تک کہ آپ نے اس کی تعمیر کرائی۔ یہ چھ واقعات تفسیر بیان القرآن میں بحوالہ تفسیر حقانی لکھے گئے ہیں۔

اب یہ بات کہ قرآن کریم نے جن دو واقعوں کا ذکر کیا ہے وہ ان میں سے کون سے ہیں اس کی قطعی تعیین تو مشکل ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان میں سے جو واقعات زیادہ سنگین اور بڑے ہیں جنہیں یہودی شریک بھی زیادہ آویں اور مزاحمت ملی ان پر محمول کیا جائے اور وہ چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے۔ تفسیر قرطبی میں یہاں ایک طویل حدیث مرفوعہ بروایت حذیفہ رضی اللہ عنہ نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تعیین ہوتی ہے کہ ان دو واقعوں سے مراد چوتھا اور چھٹا واقعہ ہے اس طویل حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظیم القدر مسجد ہے آپ نے فرمایا کہ وہ دنیا کے سب گھروں میں ایک ممتاز عظمت والا گھر ہے جسکو اللہ تعالیٰ نے سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے سونے چاندی اور جوہرات یا قوت و زبردست بنایا تھا اور یہ اس شہر کی وجہ سے کہ جب سلیمان علیہ السلام نے اس کی تعمیر شروع کی تو حق تعالیٰ نے جنات کو ان کے تالان کر دیا جنات نے یہ تمام جوہرات اور سونے چاندی جمع کر کے ان سے مسجد بنائی۔ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ بیت المقدس سے یہ سونا چاندی اور جوہرات کہاں اور کس طرح گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور گناہوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا ہو گئے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت سزا بادشاہ کو مسلط کر دیا جو یہودی بھی تھا اس نے سات سو برس بیت المقدس پر حکومت کی اور قرآن کریم میں یہ آیت خذ اجماعاً و عذراً اولہما ہمنا علیکم عبادنا اولی سانس منکم بلکہ یہی واقعہ مراد ہے نہایت نصرت کا اسکا مسجد قدس میں داخل ہوا مردوں کی قتل اور عورتوں بچوں کو قید کیا اور بیت المقدس کے تمام اموال اور سونے چاندی جوہرات کو ایک لاکھ ستر ہزار گھاڑیوں میں بھر کر لے گیا اور اپنے ملک بابل میں رکھ لیا۔ اور سو برس تک ان بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا کر طرح طرح کی بامشقت خدمت و ذلت کے ساتھ ان سے لیتا رہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو اس کے نقاب کے لئے کھڑا کر دیا جس نے بابل کو فتح کیا اور باقیماندہ بنی اسرائیل کو تختہ سر کی قید سے آزاد کر لیا اور اپنے احوال وہ

بیت المقدس سے لایا تھا وہ سب واپس بیت المقدس میں پہنچا دیئے اور پھر بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اگر تم پھر نافرمانی اور گناہوں کی طرف لوٹ جاؤ گے تو ہم بھی پھر قتل و قید کا عذاب تم پر لوٹا دیں گے آیت قرآن عسی ربکم ان یشرحکم و ان عذنا عنکم نا سے یہی مراد ہے۔

پھر جب بنی اسرائیل بیت المقدس میں لوٹ آئے اور سب اموال و سامان بھی قبضہ میں آگیا، تو پھر معافی اور بد اعمالیوں کی طرف لوٹ گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر شاہ روم قیصر کو تسلط کر دیا آیت فَاِذَا جَاؤْاْ وَ عَذُّ الْاٰخِرَةِ لِيَسْكُوْاْ وُجُوْهُهُمْ سے یہی مراد ہے شاہ روم نے ان لوگوں سے بڑی اور بھری دونوں راستوں پر جنگ کی اور بہت سے لوگوں کو قتل اور قید کیا اور پھر تمام ان اموال بیت المقدس کو ایک لاکھ ستر ہزار گالیوں پر لا کر لے گیا اور اپنے کنیسہ الذہب میں رکھ دیا یہ سب اموال ابھی تک وہیں ہیں اور وہیں رہیں گے یہاں تک کہ حضرت مہدیؑ پھر بیت المقدس میں ایک لاکھ ستر ہزار کشتیوں میں واپس لائیں گے اور اسی جگہ اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو جمع کر دیں گے۔ (الحديث بطوله رواه القرطبي في تفسيره)

بیان القرآن میں ہے کہ دو واقعے جنکا ذکر قرآن میں آیا ہے اس سے مراد دو شریعتوں کی مخالفت ہے پہلی شریعت موسوی کی مخالفت اور پھر عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شریعت عیسویہ کی مخالفت اس طرح پہلی مخالفت میں وہ سب واقعات درج ہو سکتے ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، واقعات کی تفصیل کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر دیکھئے۔

معارف و مسائل

مذکورہ امور واقعات کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے متعلق حق تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا تھا کہ وہ جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے بن و دنیا میں خائز المرام اور کامیاب رہیں گے اور جب کبھی دین سے انحراف کریں گے ذلیل و خوار کئے جاویں گے اور دشمنوں کا فروں کے ہاتھوں ان پر مار ڈالی جائے گی اور صرف یہی نہیں کہ دشمن ان پر غالب ہو کر ان کی جان و مال کو نقصان پہنچائیں بلکہ ان کے ساتھ ان کا قبلا جو بیت المقدس ہے وہ بھی اس دشمن کی زد سے محفوظ نہیں رہے گا ان کے کافر دشمن مسجد بیت المقدس میں گھس کر اس کی بے حرمتی اور توڑ پھوڑ کریں گے یہ بھی بنی اسرائیل کی سزا ہی کا ایک جز ہو گا۔ قرآن کریم نے ان کے دو واقعے بیان فرمائے پہلا واقعہ شریعت موسویہ کے زمانے کا ہے دوسرا شریعت عیسویہ کے زمانے کا ان دونوں میں بنی اسرائیل نے اپنے وقت کی شریعت الہیہ سے انحراف کر کے سرکشی اختیار کی تو پہلے واقعہ میں ایک مجوسی کافر بادشاہ کو ان پر اور بیت المقدس پر تسلط کر دیا گیا جسے تباہی پائی اور دوسرے واقعہ میں ایک رومی بادشاہ کو

مسلط کیا جس نے ان کو قتل و غارت کیا اور بیت المقدس کو منہدم اور ویران کیا اسی کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ دونوں مرتبہ جب بنی اسرائیل اپنی بد اعمالیوں پر نادم ہو کر تائب ہوئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ملک و دولت اور آل و اولاد کو بحال کر دیا۔

ان دونوں واقعات کے ذکر کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان معاملات میں اپنا ضابطہ بیان فرمایا **وَإِنْ تَحَرَّ عَٰدُ نَٰعِيًّا** یعنی اگر تم پھر نافرمانی اور سرکشی کی طرف لوٹو گے تو ہم پھر اس طرح کی سزا و عذاب تم پر لوٹا دیں گے یہ ضابطہ قیامت تک کے لئے ارشاد ہوا ہے اور اس کے مخاطب وہ بنی اسرائیل تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھے جس میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جس طرح پہلے شریعت موسویہ کی مخالفت سے اور دوسری مرتبہ شریعت عیسویہ کی مخالفت سے تم لوگ سزا و عذاب میں گرفتار ہوئے تھے اب تیسرا دور شریعت محمدیہ کا ہے جو قیامت تک چلیگا اس کی مخالفت کرنے کا بھی وہی انجام ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان لوگوں نے شریعت محمدیہ اور اسلام کی مخالفت کی تو مسلمانوں کے ہاتھوں جلا وطن اور ذلیل و خوار ہوئے اور بالآخر ان کے قبلہ بیت المقدس پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ فرق یہ رہا کہ پہلے بادشاہوں نے ان کو بھی ذلیل و خوار کیا تھا اور ان کے قبلہ بیت المقدس کی بے حرمتی بھی کی تھی اب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو مسجد بیت المقدس جو صدیوں سے منہدم اور غیر آباد پڑی تھی اس کو از سر نو تعمیر کیا اور اس قبلہ انبیاء کے احترام کو بحال کیا۔

واقعات بنی اسرائیل مسلمانوں کے لئے عبرت ہیں | بنی اسرائیل کے یہ واقعات قرآن کریم میں بیان کرنے موجودہ واقعہ بیت المقدس اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور مسلمانوں کو سنانے سے بظاہر مقصد یہی ہے کہ مسلمان

بھی اس ضابطہ الہیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ دنیا و دین میں ان کی عزت و شوکت اور مال و دولت اطاعت خداوندی کے ساتھ وابستہ ہیں جب وہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انحراف کریں گے تو ان کے دشمنوں اور کافروں کو ان پر غالب اور مسلط کر دیا جائے گا جن کے ہاتھوں ان کے معابد و مساجد کی بے حرمتی بھی ہوگی۔

آج کل جو حادثہ فاجعہ بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ کا اور پھر اس کو آگ لگانے کا سارے عالم اسلام کو پریشان کئے ہوئے ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی قرآنی ارشاد کی تصدیق ہو رہی ہے مسلمانوں نے فی اور رسول کو بھلایا آخرت سے غافل ہو کر دنیا کی شان و شوکت میں لگ گئے اور قرآن و سنت کے احکام سے بیگانہ ہو گئے تو وہ ہی ضابطہ قدرت الہیہ سامنے آیا کہ کر و در و عیالوں پر چند لاکھ یہودی غالب آگئے انہوں نے ان کی جان و مال کو بھی نقصان پہنچایا اور شریعت اسلام کی رو سے دنیا کی تین عظیم الشان مسجدوں میں سے ایک جو تمام انبیاء کا قبلہ رہا ہے وہ ان

سے چھین لیا گیا اور ایک ایسی قوم غالب آگئی جو دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار سمجھی جاتی رہی ہے یعنی یہود۔ اس پر مزید یہ مشاہدہ ہے کہ وہ قوم نہ اتحاد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھتی ہے اور نہ مسلمانوں کے مجبور و غلامان حرب کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ واقعہ یہود کو کوئی عزت کا مقام نہیں دیتا البتہ مسلمانوں کے لئے ان کی سرکشی کی سزا ضرور ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہماری بد اعمالیوں کی سزا کے طور پر ہوا اور اس کا علاج جزا کے کچھ نہیں کہ ہم چہ اپنی بد اعمالیوں پر نادم ہو کر بھی تو یہ کریں احکام الہیہ کی اطاعت میں لگ جائیں یہ مسلمان بنیں غیروں کی نقالی اور غیروں پر اعتماد کے گناہ عظیم سے باز آجائیں تو حسب وعدہ ربانی انشاء اللہ تعالیٰ بیت المقدس اور فلسطین پھر ہمارے قبضہ میں آئے گا مگر انہیں یہ ہے کہ آج کل کے عرب حکمران اور وہاں کے عام مسلمان اب تک بھی اس حقیقت پر متنبہ نہیں ہوئے کہ وہ اب بھی غیروں کی امداد پر ہمارا لگائے ہوئے بیت المقدس کی داپسی کے پلان اور نقشے بنا رہے ہیں جس کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ فالی اللہ المشتکی۔

وہ اسلحہ اور سامان جس سے بیت المقدس اور فلسطین پھر مسلمانوں کو واپس مل سکتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف انابت و رجوع آخرت پر یقین، احکام شرعیہ کا اتباع اپنی معاشرت اور سیاست میں غیروں پر اعتماد اور ان کی نقالی سے اجتناب اور پھر اللہ پر بھروسہ کر کے خاص اسلامی اور شرعی جہاد ہے اللہ تعالیٰ ہمارے عرب حکمرانوں اور دوسرے مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمادیں۔ ایک عجیب معاملہ | اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں اپنی عبادت کے لئے دو جگہوں کو عبادت کرنے والوں کا قبلہ بنایا ہے ایک بیت المقدس دوسرا بیت اللہ مگر قانون قدرت دونوں کے متعلق الگ الگ ہے بیت اللہ کی حفاظت اور کفار کا اس پر غالب نہ آنا یہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذمہ لے لیا ہے اس کا نتیجہ وہ واقعہ فیصل ہے جو قرآن کریم کی سورہ فیل میں ذکر کیا گیا ہے کہ کین کے نصرانی بادشاہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تو اللہ تعالیٰ نے محمد اس کے ہاتھیوں کی فوج کے بیت اللہ کے قریب تک جانے سے پہلے ہی پرندے جالوروں کے ذریعہ ہلاک و برباد کر دیا۔

لیکن بیت المقدس کے متعلق یہ قانون نہیں بلکہ آیات مذکورہ سے معلوم ہوا ہے کہ جب مسلمان گمراہی اور معاصی میں مبتلا ہوں گے تو ان کی سزا کے طور پر ان سے یہ قبلہ بھی چھین لیا جائے گا اور کفار اس پر غالب آجائیں گے۔

مذکورہ صدر خطبہ واقعہ میں قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب اہل دین فتنہ و فساد پر اترائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کر دیں گے جو ان کے گھروں میں شمس کران کو قتل و غارت کریں گے اس جگہ قرآن کریم نے لفظ عباد اللہ

فرمایا ہے عبادنا نہیں کہا حالانکہ وہ مختصر تھا حکمت یہ ہے کہ کسی بندہ کی اضافت و نسبت اللہ کی طرف ہو جانا اس کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے جیسا کہ اسی سورۃ کے شروع میں آنسوئی بَعْدَ کے تحت میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو انتہائی اعزاز اور غایت قرب شب معراج میں نصیب ہوا قرآن نے اس واقعہ کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی یا کوئی صفت بیان کرنے کے بجائے صرف عِبَادَہ کہہ کر یہ بتلادیا کہ انسان کا آخری کمال اور انتہائی اونچا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو اپنا بندہ کہہ کر نوازیں آیت مذکورہ میں جن لوگوں سے بنی اسرائیل کی مزار کا کام لیا گیا یہ خود بھی کافر تھے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو عِبَادَہ کے لفظ سے تعبیر فرمانے کے بجائے اضافت و نسبت کو توڑ کر عِبَادُ اللہ فرمایا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تکوینی طور پر تو سارے ہی انسان اللہ کے بندے ہیں مگر بغیر ایمان کے مقبول بندے نہیں ہوتے جن کی نسبت و اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا سکے۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ

یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راہ جو سب سے سیدھی ہے اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو

الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ⑨

جو عمل کرتے ہیں اچھے کہ ان کے لئے ہے ثواب بڑا

وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا

اور یہ کہ جو نہیں مانتے آخرت کو ان کے لئے تیار کیا ہے ہم نے عذاب

أَلِيمًا ⑩ وَيَذَرُ الْإِنْسَانَ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ

دردناک اور مانگتا ہے آدمی بُرائی جیسے مانگتا ہے بھلائی اور ہے

الْإِنْسَانُ عَجُولًا ⑪

انسان جلد باز۔

شروع سورت میں معجزہ معراج سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت کا بیان تھا ان آیات میں معجزہ

ربط آیات

قرآن سے اسکا اثبات ہے۔

خلاصہ تفسیر

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے (یعنی اسلام) اور اس طریقہ کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزاء و سزا بھی بتلاتا ہے کہ، اُن ایمان والوں کو جو نیک کام کرنے میں یہ خوشنبری دیتا ہے کہ ان کو بڑا بھاری ثواب ملے گا اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لئے ایک دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔ اور (بعض) انسان (جیسے کفار ہیں) برائی (یعنی عذاب) کی ایسی دعا کرتا ہے جس طرح بھلائی کی دعا (کیجاتی ہے) اور انسان کچھ کچھ طبعاً ہی (جلد باز ہوتا) ہے۔

معارف و مسائل

طریق اقوام | قرآن جس طریقہ کی ہدایت کرتا ہے اُس کو اقوام کہا گیا ہے اقوام کی تفسیر یہ ہے کہ وہ راستہ جو انزال مقصود تک پہنچانے میں قریب بھی ہو، آسان بھی ہو، خطرات سے خالی بھی ہو، درستی اس سے معلوم ہو کہ قرآن کریم انسانی زندگی کے لئے جو احکام دیتا ہے وہ ان تینوں اوصاف کے جامع ہیں اگرچہ انسان اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے بعض اوقات اس راستہ کو دشوار یا پرخطر سمجھنے لگے لیکن رب العالمین جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم رکھتا ہے اور ماضی و مستقبل اس کے سامنے یکساں ہے وہ ہی اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ انسان کا نفع کس کام اور کس صورت میں زیادہ ہے اور خود انسان چونکہ مجموعی حالت سے واقف نہیں وہ اپنے بھلے بڑے کو بھی پوری طرح نہیں پہچان سکتا۔

شاید اسی مناسبت سے مذکورہ آیات میں سے آخری آیت میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ انسان تو بعض اوقات جلد بازی میں اپنے لئے ایسی دعا مانگ لیتا ہے جو اس کے لئے تباہی و بربادی کا سبب ہے اگر اللہ تعالیٰ اس کی ایسی دعا کو قبول فرمالیں تو یہ برباد ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ اکثر ایسی دعاؤں کو فوراً قبول نہیں فرماتا یہاں تک کہ خود انسان سمجھ لیتا ہے کہ میری یہ درخواست غلط اور میرے لئے سخت ضرر نفعی اور آیت کے آخری جملہ میں انسان کی ایک طبعی کمزوری کو بطور ضابطہ کے بھی ذکر فرمایا کہ انسان اپنی طبیعت سے ہی جلد باز واقع ہوا ہے مگر میری نفع نقصان پر نظر رکھتا ہے انجام میں اور عاقبت اندیشی میں کوتاہی کرتا ہے فوری راحت چاہتے کھوڑے ہو اس کو بڑی دردناکی و راحت پر ترجیح دینے لگتا ہے اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں عام انسانوں کی ایک طبعی کمزوری کا بیان ہے۔

اور بعض ائمہ تفسیر نے اس آیت کو ایک خاص واقعہ کے متعلق قرار دیا ہے وہ یہ کہ
نضر بن حارث نے اسلام کی مخالفت میں ایک مرتبہ یہ دعا کر ڈالی۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هَذَا
هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَاقْطِعْ عَلَيْنَا حِجَابًا سَدَّ قُلُوبَنَا مِنَ التَّوْبَةِ اَوْ اَنْتَابِذْ اِلَيْهِمُ لَعْنَتِي بِاللّٰهِ الرَّابِّ
کے نزدیک یہ اسلام ہی حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برساده یا کوئی اور دردناک عذاب بھیجے۔
اس صورت میں انسان سے یہ خاص انسان یا جو اس کے ہم طبع ہوں مراد ہوں گے۔

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا

اور ہم نے بنائے رات اور دن دو نمونے پھر مٹا دیا رات کا نمونہ اور بنا دیا

آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَسْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا

دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو

عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ وَكُلُّ شَيْءٍ فَضْلُنَا تَفْصِيلًا ۝۱۳

گنتی برسوں کی اور حساب اور سب چیزیں سنائیں ہم نے کھول کر

وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ

اور جو آدمی ہے لگا دی ہو ہم نے اُسکی بُری قسمت اُس کی گردن سے اور نکال دکھائیں گے اس کو

الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝۱۴ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ

قیامت کے دن ایک کتاب کو دیکھے گا اسکو کھلی ہوئی پڑھ لے کتاب اپنی تو ہی بس ہے

الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝۱۵ مَن اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ

آج کے دن اپنا حساب لینے والا جو کوئی راہ پر آیا تو آیا اپنے ہی بھلے کو

وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ

اور جو کوئی بہکا رہا تو بہکا رہا اپنے ہی بُرے کو اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے

أُخْرَىٰ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝۱۶

کا اور ہم نہیں ڈالتے بلا جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول۔

خلاصہ تفسیر

ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں بنایا۔ سورات کی نشانی (یعنی خود رات) کو ہم نے دھندلا بنا دیا اور دن کی نشانی کو روشن بنایا کہ اس میں سب چیزیں بے تکلف دکھائی دیں، تاکہ (دن میں) اپنے رب کی روزی تلاش کرو اور (رات اور دن کی آمد و رفت اور دنوں کے رنگ میں) امتیاز کہ ایک روشن دوسرا اندھیرا ہے اور دونوں کی مقداروں میں اختلاف ہے) ہر سو کا شمار اور (دوسرے چھوٹے چھوٹے) حساب معلوم کر لو (جیسا کہ سورۃ یونس کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے) اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (لوح محفوظ میں تو تمام کائنات کی مکمل تفصیل بغیر کسی استثناء کے ہے اور قرآن کریم میں تفصیل بقدر ضرورت ہے اس لئے یہ بیان دونوں کی طرف منسوب ہو سکتا ہے) اور ہم نے ہر عمل کرنے والے انسان کا عمل نیک ہو یا بد اس کے گھلے کا ہار بنا رکھا ہے (یعنی ہر شخص کا عمل اس کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور پھر قیامت کے دن اس کا اعمال نامہ اس کے (دیکھنے کے واسطے نکال کر سامنے کر دیں گے جسکو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا اور اس سے کہا جاوے گا کہ اے اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب جائزے کے لئے کافی ہے (یعنی اس کی ضرورت نہیں کہ تیسرے اعمال کو کوئی دوسرا آدمی گناوے بلکہ تو خود ہی اپنا نامہ اعمال پڑھتا جا اور حساب لگاتا جا کہ تجھے کتنی سزا اور کتنی جزا ملنی چاہیے مطالب یہ ہے کہ اگرچہ ابھی عذاب سامنے نہیں آیا مگر وہ ٹلنے والا نہیں ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ انسان اپنے سب اعمال کو کھلی آنکھوں دیکھ لیگا، اور عذاب کی جہت اس پر قائم ہو جائے گی اور جو شخص دنیا میں سیدھی راہ پر چلتا ہے وہ اپنے ہی نفع کے لئے چلتا ہے اور جو شخص بے راہی اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی نقصان کے لئے بے راہ ہوتا ہے (وہ اس وقت اس کا خمیازہ بھگتے گا کسی دوسرے کا کچھ نقصان نہیں کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہ اٹھا دے گا اور جس کسی کو کوئی سزا دی جاتی ہے وہ اس پر مجتہد تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے کیونکہ ہمارا قانون یہ ہو کہ ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو اس کی ہدایت کے لئے نہیں بھیج لیتے۔

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اول رات اور دن کے اختلاف کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نشانی قرار دیا اور پھر بتلایا کہ رات کو تاریک اور دن کو روشن کرنے میں بڑی حکمتیں ہیں۔ رات کے تاریک کرنے کی

حکمت تو اس جگہ بیان نہیں فرمائی۔ دوسری آیات میں مذکور ہے کہ رات کی تاریکی نیند اور آرام کے لئے مناسب ہے اور قدرت نے ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ہر انسان اور جانور کو اسی راست کی تاریکی میں نیند آتی ہے پورا عالم بیک وقت بخواب ہوتا ہے اگر مختلف لوگوں کی نیند کے مختلف اوقات ہوتے تو جانگنے والوں کے شور و شغب اور کام کاج کی وجہ سے سونے والوں کی نیند بھی حرام ہو جاتی۔

اور دن کو روشن کرنے کی اس جگہ دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں اول یہ کہ دن کی روشنی میں آدمی اپنی روزی تلاش کر سکتا ہے محنت مزدوری بصنعت و حرفت سب کے لئے روشنی کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ رات دن کی آمد و رفت سے سالوں اور برسوں کی تعداد معلوم کیا سکے کہ تین سو ساٹھ دن پورے ہونے پر مثلاً ایک سال پورا ہو گیا۔

اسی طرح دوسرے سب حسابات بھی رات دن کی آمد و رفت سے متعلق ہیں اگر رات دن کا یہ اختلاف نہ ہو تو مزدور کی مزدوری ملازم کی ملازمت معاملات کی میعادیں متعین کرنا سب مشکل ہو جائے گا۔

نامہ اعمال گئے کا بار | یہ ہے کہ انسان کسی جگہ کس حال میں رہے اس کا صحیحہ عمل اس کے ساتھ رہتا ہو | اس کا عمل لکھا جاتا رہتا ہے جب وہ مرتا ہے تو بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے
چہ قیامت کے روز یہ صحیفہ عمل ہر ایک کے ہاتھ میں دیدیا جائیگا کہ خود پڑھ کر خود ہی اپنے دل میں فیصلہ کرے کہ دوستی ثواب ہے یا مستحق عذاب حضرت قتادہ سے منقول ہے کہ اس روز بے پڑھا آدمی بھی نامہ اعمال پڑھ لیگا۔ اس موقع پر اصیہانی نے بروایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض لوگوں کا نامہ اعمال جب ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ دیکھے گا کہ اس کے بعض اعمال صالوہ اس میں لکھے ہوئے نہیں ہیں تو عرض کرے گا کہ میرے پروردگار اس میں میرے فلاں فلاں عمل درج نہیں ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا کہ ہم نے ان اعمال کو اس لئے مٹا دیا کہ تم لوگوں کی غیبت کیا کرتے تھے (ظہری)

بعثت رسل کے بغیر عذاب | اس آیت کی بناء پر بعض ائمہ فقہار کے نزدیک ان لوگوں کو کفر کے باوجود نہ ہونے کی تشریح | کوئی عذاب نہیں ہوگا جن کے پاس کسی نبی اور رسول کی دعوت نہیں پہنچی اور بعض ائمہ کے نزدیک جیسا اسلامی عقائد عقل سے سمجھے جاسکتے ہیں مثلاً خدا کا وجود اس کی توحید وغیرہ سب جو لوگ اسکے منکر ہوں گے ان کو کفر پر عذاب ہوگا اگرچہ ان کو کسی نبی و رسول کی دعوت نہ پہنچی ہو البتہ عام محاسن اور گناہوں پر سزا بغیر دعوت و تبلیغ انبیاء کے نہیں ہوگی اور بعض حضرات نے اس جگہ رسول سے مراد عام لی ہے خواہ وہ رسول دینی ہو خواہ انسانی عقل کہ وہ بھی ایک حیثیت سے اللہ

کا رسول ہی ہے۔

اولاد مشرکین کو عذاب نہ ہوگا | آیت لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰی کے تحت تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین و کفار کی اولاد جو بالغ ہونے سے پہلے مر جائیں ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ ماں باپ کے کفر سے وہ سزاوار کے مستحق نہیں ہوں گے۔ اس مسئلہ میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

وَإِذَا أَسْرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا

اور جب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو حکم بھیج دیا اُس کے پیش کرنے والوں کو پھر انہوں نے

فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فَنَفَخْنَا فِيهَا تَدْمِيرًا ۝۱۱

نا فرما لی اُس میں تب ثابت ہوئی اُن پر بات پھر اکھاڑ مارا ہم نے ان کو اٹھا کر اور بہت

أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ۝ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبٍ

غارت کر دیے ہم نے قرن نوح کے پیچھے اور کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کے گناہ

بِعِبَادِهِ خَيْرًا بَصِيرًا ۝۱۲

جاننے والا دیکھنے والا -

اس سے پہلی آیات میں اس کا بیان تھا کہ حق تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات نہ پہنچ جائیں اور پھر بھی وہ اطاعت نہ کریں اس وقت تک اُن پر عذاب نہیں بھیجتے مذکورہ آیات میں اس کے دوسرے رخ کا بیان ہے کہ جب کسی قوم کے پاس رسول اور اللہ کے پیغام پہنچ گئے اور پھر بھی انہوں نے سرکشی سے کام لیا تو اس پر عذاب عام بھیج دیا جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور جب ہم کسی بستی کو (جو اپنے کفر و نافرمانی کی وجہ سے بمقتضائے حکمتِ الہیہ ہلاک کرنے کے قابل ہو) ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اُس کو بعثتِ رسل سے پہلے ہلاک نہیں کرتے بلکہ پہلے کسی رسول کی معرفت اس (بستی) کے خوش عیش (یعنی امیر و رئیس) لوگوں کو (مخصوصاً اور دوسرے عوام کو عموماً ایمان و اطاعت کا حکم دیتے ہیں پھر جب وہ لوگ کہنا نہیں مانتے بلکہ وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر عجزت تمام ہو جاتی ہے پھر اس بستی کو تباہ و غارت کر ڈالتے ہیں اور اسی عادت کے موافق ہم نے بہت سی

امتوں کو نوح علیہ السلام کے زمانہ کے بعد ان کے کفر و معصیت کے سبب ہلاک کیا ہے (جیسے عاد و ثمود وغیرہ اور نوح علیہ السلام کی قوم کا غرق ہو کر ہلاک ہونا مشہور و معروف ہے اس لئے **هٰنَ بَعَثْنَا نُوْحًا** پر اکتفا کیا گیا خود قوم نوح کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مشروع سورت میں آیت **ذُرِّیَّتَکَ** **هٰنَ حَمَلْنَا هَمَّ نُوْحٍ** میں لفظ **حَمَلْنَا** سے ظہور ان نوح کی طرف اشارہ موجود ہے اس کو قوم نوح کی ہلاکت کا بیان قرار دیکر یہاں ما بعد نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا، اور آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کا جاننے والا دیکھنے والا کافی ہے۔ (تو جیسا کسی قوم کا گناہ ہوتا ہے ویسی سزا دیتا ہے)

معارف ومسائل

ایک شبہ اور اس کا جواب | الفاظ آیت **اِذَا اَسْرَدْنَا** اور اس کے بعد **اَهْرَیْنَا** کے ظاہر سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا ہلاک کرنا ہی مقصد و خداوندی تھا اس لئے ان کو اول بذریعہ انبیاء ایمان و اطاعت کا حکم دینا پھر ان کے فسق و فجور کو عذاب کا سبب بنانا یہ سبب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا تو اس صورت میں یہ بچارے معذور و مجبور رہتے اس کے جواب کی طرف ترجمہ اور خلاصہ تفسیر کے ضمن میں یہ اشارہ آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و اختیار دیا اور عذاب و ثواب کے راستے متعین کر دیے جب کوئی اپنے اختیار سے عذاب ہی کے کام کا غم کرے تو عادات اللہ یہ ہے کہ وہ اسی عذاب کے اسباب متبیا کر دیتے ہیں تو اصلی سبب عذاب کا خود ان کا غم اور قصد کفر و معصیت کا نہ کہ محض ارادہ اس لئے وہ معذور نہیں ہو سکتے۔

آیت مذکورہ کی | لفظ **اَهْرَیْنَا** کا مشہور مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی حکم دیا ہے لیکن اس ایک دوسری تفسیر | آیت میں اس لفظ کی قراءتیں مختلف ہیں ایک قراءت میں جسکو ابو عثمان ہندی ابو رجاء ابو العالیہ اور رجاء نے اختیار کیا ہے یہ لفظ بفتح یاء معین **اَهْرَیْنَا** جسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے امیر و حاکم بنا دیا خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کو جو فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے اور سب قوم کے لئے عذاب کا سبب بنے۔

اور حضرت علی و ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک قراءت میں یہ لفظ **اَهْرَیْنَا** پڑھا گیا جس کی تفسیر انھیں حضرات سے اکثر نا نقل کی گئی ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم میں خوش عیش سرمایہ دار لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے اور وہ اپنے فسق و فجور کے ذریعہ پوری قوم کو عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

انھیں سے پہلی قراءت کا حاصل تو یہ ہوا کہ ایسے خوش عیش سرمایہ داروں کو قوم کا حاکم بنا دیا جاتا ہے اور دوسری قراءت کا حاصل یہ ہے کہ قوم میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دی جاتی ہے۔ ان دونوں سے یہ معلوم ہوا کہ عیش پسند لوگوں کی حکومت یا ایسے لوگوں کی قوم میں کثرت کچھ خوشی کی چیز نہیں

عذاب الہی کی علامت ہے حق تعالیٰ جب کسی قوم پر ناراض ہوئے ہیں اور اس کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ابتدائی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے حاکم درجہ ایسے لوگ بنادیتے جاتے ہیں جو عیش پسند، عیاش ہوں یا حاکم بھی نہ بنیں تو اس قوم کے افراد میں ایسے لوگوں کی کثرت کر دیجاتی ہے۔ دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہوات و لذات میں مست ہو کر اللہ کی نافرمانیاں خود بخوبی کرتے ہیں دوسروں کے لئے بھی اس کی راہ ہموار کرتے ہیں بالآخر ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے۔

مال واردوں کا قوم پر اثر ہونا | آیت میں خوش عیش مالداروں کا خصوصیت سے ذکر کرنا اس طرف اشارہ ایک طبعی امر ہے | ہے کہ فطری طور پر عوام اپنے مال و اموال اور حاکموں کے اخلاق و اعمال سے متاثر ہوتے ہیں جب یہ لوگ بد عمل ہو جائیں تو پوری قوم بد عمل ہو جاتی ہے اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دیا ہے ان کو اس کی زیادہ فکر ہونا چاہئے کہ اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرتے رہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عیش پرستی میں پڑ کر اس سے غافل ہو جائیں اور پوری قوم ان کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ جائے تو قوم کے اعمال بد کا وبال بھی ان پر پڑے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيْمَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُّرِيدُ

جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلد دے دیں ہم اس کو اُسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں

ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مِنْ مُّوْمِنًا مَّدْحُوْرًا ۝۱۸ وَمَنْ

پھر ہم نے اس کے واسطے دوزخ داخل ہو گا اس میں اپنی برائی سن کر دھکیلا جا کر اور جس نے

اَسْرَادَ الْاٰخِرَةِ وَسَعٰى لَهَا سَعِيْهَا وَهُوَ مُّوْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ

چاہا پہلا گھر اور دوزخ کی اُس کے واسطے جو اُسکی دوزخ ہے اور وہ یقین پر ہے سو

كَانَ سَعِيْهُمْ مَشْكَوْرًا ۝۱۹ كَلَّا نَسِيْدُ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ

ایسوں کی دوزخ ٹھکانے لگی ہے ہر ایک کو ہم پہچانے جاتے ہیں ان کو اور ان کو تیرے

عَطَاۤءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاۤءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝۲۰ اَنْظُرْ كَيْفَ

رب کی بخشش میں سے اور تیرے رب کی بخشش کسی نے نہیں روک لی دیکھ کیسا

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۚ وَلِلْاٰخِرَةِ الْكِبْرُ دَرَجٰتٍ وَّ الْكِبْرُ تَفْضِيْلًا ۝۲۱

ہم نے ایک کو ایک سے اور کچھ گھر میں تو اور بڑے درجے میں اور بڑی فضیلت

خلاصہ تفسیر

جو شخص اپنے نیک اعمال سے صرف دنیا کے نفع کی نیت رکھے گا، خواہ اس نے کہ وہ آخرت کا منکر ہے یا اس نے کہ آخرت سے غافل ہے، ہم ایسے شخص کو دنیا ہی میں جتنا چاہیں گے پھر یہ سب کے لئے نہیں بلکہ جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے یعنی دنیا ہی میں کچھ جزا مل جاوے گی) پھر آخرت میں خاک نہ ملے گا بلکہ وہاں ہم اس کے لئے بہت کم تجویز کر دیں گے وہ اس میں بد حال راندہ درگاہ ہو کر داخل ہو گا اور جو شخص اپنے اعمال میں آخرت کے ثواب کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنی چاہیے ویسی ہی کوشش بھی کرے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر کوشش بھی مفید نہیں بلکہ کوشش صرف وہی مفید ہے جو شریعت اور سنت کے موافق ہو کیونکہ حکم ایسی ہی کوشش کا دیا گیا ہے جو عمل اور سعی شریعت و سنت کے خلاف ہو وہ مقبول نہیں) بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی سعی مقبول ہوگی، غرض اللہ کے یہاں کامیابی کی شرطیں چار ہوں اول تصحیح نیت یعنی خالص ثواب آخرت کی نیت ہونا جس میں اغراض انسانی شامل ہوں دوسرے اس نیت کے لئے عمل اور کوشش کرنا صرف نیت و ارادہ سے کوئی کام نہیں ہوتا جب تک اس کے لئے عمل نہ کرے تیسرے تصحیح عمل یعنی سعی و عمل کا شریعت اور سنت کے مطابق ہونا کیونکہ مقصد کے خلاف سمت میں دوڑنا اور کوشش کرنا بجائے مفید ہونے کے مقصد سے اور دور کر دیتا ہے چوتھی شرط جو سب سے اہم اور سب کا مدار ہے وہ تصحیح عقیدہ یعنی ایمان ہے ان شرائط کے بغیر کوئی عمل اللہ کے نزدیک مقبول نہیں اور کفار کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہونا ان کے اعمال کی قبولیت کی علامت نہیں کیونکہ دنیا کی نعمتیں مقبولین بارگاہ کے لئے مخصوص نہیں بلکہ آپ کے رب کی عطا کردہ نعمتیں ہیں تو ہم ان (مقبولین) کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان (غیر مقبولین) کی بھی (امداد کرتے ہیں) اور آپ کے رب کی عطا کردہ نعمتیں کسی پر بند نہیں آپ دیکھ لیجئے کہ ہم نے اس دنیا کی عطا میں بلا شرط ایمان و کفر کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے یہاں تک کہ اکثر کفار اکثر مومنین سے زیادہ نعمت و دولت رکھتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں قابل وقعت نہیں) اور البتہ آخرت (جو مقبولین بارگاہ کے ساتھ خاص ہے وہ درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی اس لئے اہتمام اسی کا کرنا چاہیے)

معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں اپنے عمل سے صرف دنیا کا ارادہ کرنے والوں کا اور ان کی سزا کا جو بیان

فرمایا ہے اس کے لئے تو الفاظ مَن كَانَ يُرِيدَ الْعَاقِبَةَ استعمال فرمائے جو استمرار و دوام پر دلالت کرتے ہیں جس کے مطلب یہ ہے کہ یہ سزا جہنم صرف اس صورت میں ہے کہ اس کے ہر عمل میں ہر وقت صرف دنیا ہی کی غرض چھائی ہوئی ہو آخرت کی طرف کوئی دھیان ہی نہ ہو ورنہ ارادہ آخرت کئے اور اس کی جزاء کے بیان میں لفظ اَمَّا اِذَا الْآخِرَةُ کا استعمال فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن جس وقت بھی جس عمل میں آخرت کا ارادہ اور نیت کر لیا اس کا وہ عمل مقبول ہو جائے گا خواہ کسی دوسرے عمل کی نیت میں کوئی فساد بھی شامل ہو گیا ہو۔

پہلا حال صرف کافر منکر آخرت کا ہو سکتا ہے اس لئے اس کا کوئی بھی عمل مقبول نہیں اور دوسرا حال مومن کا ہے اُس کا وہ عمل جو اخلاص میں نیت کے ساتھ آخرت کے لئے ہو اور باقی شرائط بھی موجود ہوں وہ مقبول ہو جائے گا اور اس کے بھی جس عمل میں اخلاص نہ ہو یا دوسری شرطیں مفقود ہوں وہ مقبول نہیں ہوگا۔

بدعت اور خود رائی کا عمل کتنا
اس آیت میں سعی و عمل کے ساتھ لفظ سَعِيَهَا بڑھا کر یہ بتلادیا گیا
ہے کہ ہر عمل اور ہر کوشش نہ مفید ہوتی ہے نہ عند اللہ مقبول بلکہ عمل و سعی وہی مفید ہے جو مقصد آخرت کے مناسب ہو اور مناسب ہونا یا نہ ہونا یہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اس لئے جو نیک اعمال خود رائی اور منکھلت طبعوں سے کئے جاتے ہیں جن میں بدعات کی عام رسوم شامل ہیں وہ دیکھنے میں کتنے ہی بھلے اور غیب نظر آئیں مگر آخرت کے لئے سعی مناسب نہیں اس لئے نہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہیں اور نہ آخرت میں کار آمد۔

اور تفسیر المغان نے سَعِيَهَا کی تشریح میں سعی کے مطابق سنت ہونے کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس عمل میں انتقامت بھی ہو یعنی عمل مفید مطابق سنت بھی ہو اور اس پر انتقامت اور مداومت بھی ہو بد نظمی کے ساتھ کبھی کر لیا کبھی نہ کیا اس سے پورا فائدہ نہیں ہوتا۔

۳۲

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخَذُولاً ۝

مت شہرا اللہ کے ساتھ دوسرا حاکم بھر بیٹھ رہے گا تو الزام کھا کر بیکس ہو کر

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا

اور حکم کر چکا تھا کہ نہ ہو جو اُس کے سوائے اور ان باب کے ساتھ بھلائی کرو

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ

مگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں تو نہ کہ

لَهُمَا أَفْتٌ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝۲۵ وَخُفِضَ

اُن کو جوں اور نہ جھڑک اُن کو اور کہہ اُن سے بات ادب کی اور جھکا دے

لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا

اُن کے آگے کندھے عاجزی کر کر نیاز مندی سے اور کہہ اے رب اُن پر رحم کر جیسا

رَبِّيَنِي صَغِيرًا ۝۲۶ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ وَإِنْ

پارا انہوں نے مجھ کو چھوٹا سا تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے اگر

تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ۝۲۷

تم نیک ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے ۔

رابطہ آیات سابقہ آیات میں قبول اعمال کے لئے چند شرط کا بیان آیا ہے جنہیں ایک شرط یہ بھی تھی کہ عمل مقبول وہی ہو سکتا ہے جو ایمان کے ساتھ ہو اور شریعت و سنت کے مطابق ہو۔ ان آیات میں ایسے ہی خاص خاص اعمال کی ہدایت کی گئی ہے جو شریعت کے بتائے ہوئے احکام ہیں ان کی تعمیل آخرت کی فلاح اور ان کی خلاف ورزی آخرت کی ہلاکت کا سبب ہے اور چونکہ شرط مذکورہ میں سب سے اہم شرط ایمان کی ہے اس لئے سب سے پہلا حکم بھی توحید کی بیان فرمایا۔ اس کے بعد حقوق العباد سے متعلقہ احکام ہیں۔

خلاصہ تفسیر

حکم اول توحید لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ (اے مخاطب، اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ دے یعنی شک نہ کر، در نہ تو بد حال ہے یا رومدوگا رہو کہ بڑھ رہے گا) (آگے پورا بیکی تاکید ہے کہ اللہ سے سب سے ستم کر دیا ہے کہ بجز اُس (موجود بحق) کے کسی کی عبادت مت کر یہ سچی آخرت کے طریقہ کی تفصیل ہے)

حکم دوم، ادا حقوق والدین وَ بِأَنوَاعٍ آلِدَيْنِ إِحْسَانًا (اور تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو اگر وہ) تیرے پاس (ہوں اور) ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں، انہیں کی وجہ سے تمنا یا خدمت ہو جائیں اور جبکہ طبعا ان کی خدمت کرنا سباری معلوم ہو تو اس وقت بھی اتنا ادب کر دو کہ) ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی منت کہنا اور نہ اُن کو جھڑکنا اور اُن سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھک رہنا اور ان کے لئے حق تعالیٰ

ہے، یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرما بیٹے جیسا! انھوں نے بھٹک چکے ہیں (کی عمر) میں پالا پرورش کیا ہے۔ اور حضرت اس ظاہری توقیر و تعظیم پر اکتفا مت کرنا دل میں بھی انکا ادب اور قصد اطاعت رکھنا کیونکہ، تمہارا رب تمہارے دلیوں کی بات کو خوب جانتا ہے (اور اسی وجہ سے تمہارے لئے اس کی تعمیل آسان کرنے کے واسطے ایک تخفیف کا حکم بھی سناتے ہیں کہ، اگر تم احتیقت میں دل ہی سے، سعادتمند ہو (اور غلطی یا تنگ مزاجی یا دل تنگی سے کوئی ظاہری کوتاہی ہو جائے اور پھر نادان ہو کر معذرت کر لو، تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

معارف و مسائل

والدین کے ادب و احترام اور اطاعت کی بڑی اہمیت

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے والدین کے ادب و احترام اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو اپنی عبادت کے ساتھ ملا کر واجب فرمایا ہے جیسا کہ سورۃ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے اِنْ اَشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْنَاۙ (یعنی میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت سب سے اہم اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی سب سے زیادہ واجب ہے صحیح بخاری کی یہ حدیث بھی اسی پر شاہد ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "نماز اپنے وقت (مستحب) میں اُس نے پھر دریافت کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے تو آپ نے فرمایا "والدین کے ساتھ اچھا سلوک" قرطبی،

والدین کی اطاعت و خدمت کے فضائل و ایات حدیث میں

(۱) مسند احمد - ترمذی - ابن ماجہ - مستدرک حاکم میں بند صحیح حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کی حفاظت کرو یا منات کر دو (ظہری، ۱۲۱) اور جامع ترمذی - مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ ابن عمر کی روایت ہے اور حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ کی رضا باپ کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں۔"

(۲) ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے، آپ نے فرمایا کہ "وہ دونوں ہی تیری جنت یا دوزخ ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کی اطاعت و خدمت جنت میں لیجاتی ہے اور ان کی بے ادبی اور ناراضی دوزخ میں۔"

(۳۴) یہ بھی نے شعب الایمان میں اور ابن عباس نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے لئے اپنے ماں باپ کا فرمانبردار رہا اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور جو ان کا نافرمان ہو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں گے اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی سختی تو ایک دروازہ جنت یا دوزخ کا کھلا رہے گا اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ جہنم کی وعید کیا اس صورت میں بھی ہے کہ ماں باپ نے اس شخص پر ظلم کیا ہو تو آپ نے تین مرتبہ فرمایا **وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا** یعنی ماں باپ کی نافرمانی اور ان کو ایذا رسانی پر جہنم کی وعید ہے خواہ ماں باپ نے ہی بڑے پر ظلم کیا ہو جس کا حاصل یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے انتقام لینے کا حق نہیں کہ انہوں نے ظلم کیا تو یہ بھی ان کی خدمت و اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں۔

(۳۵) یہ بھی نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ضد متکذار بتا اپنے والدین پر رحمت و شفقت سے نظر ڈالتا ہے تو ہر نظر کے بدلے میں ایک حج مقبول کا ثواب پاتا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اس طرح نظر کرے، آپ نے فرمایا کہ "یاں سو مرتبہ بھی ہر نظر پر یہی ثواب ملتا رہے گا، اللہ تعالیٰ بڑا ہے (اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی) والدین کی حق تلفی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے۔"

(۳۶) یہ بھی نے شعب الایمان میں بروایت ابی بکرہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سب گناہوں کی سزا تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہیں قیامت تک مؤخر کر دیتے ہیں سب والدین کی حق تلفی اور نافرمانی کے کراسی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دیجاتی ہے یہ سب روایات تفسیر مظہری سے نقل کی گئی ہیں،

والدین کی اطاعت کن چیزوں میں اس پر علماء و فقہاء کا اتفاق ہے کہ والدین کی اطاعت صرف جائز واجب اور کہاں مخالفت کی گنجائش ہے کاموں میں واجب ہے ناجائز یا گناہ کے کام میں طاعت واجب تو کیا جائز بھی نہیں حدیث میں ہے **لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ** یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

والدین کی خدمت اور اچھے سلوک کے امام قرطبی نے اس مسئلہ کی شہادت میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ صحیح بخاری سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ان کا مسلمان ہونا ضروری نہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفتا کیا کہ میری والدہ جو مشرک ہے مجھ سے ملنے کے لئے آتی ہے کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی خاطر مدارات کروں آپ نے فرمایا **"صِلِيْ اُمَّكَ"** یعنی اپنی ماں کی صلہ دے اور خاطر مدارات کرو اور کافر ماں باپ کے بارے میں خود قرآن کریم کا یہ ارشاد موجود ہے **وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْصَرًا وَفَاً** یعنی جس کے ماں باپ کافر ہوں اور اسکو بھی کافر مچھنے کا حکم

دیں تو ان کا اس معاملے میں حکم ماننا تو جائز نہیں مگر دنیا میں ان کے ساتھ خدمت طریقیہ کا برتاؤ کیا جائے
ظاہر ہے کہ خدمت طریقیہ سے یہی مراد ہے کہ ان کے ساتھ مدارات کا معاملہ کریں۔

مسئلہ: جب تک جہاد فرض العین نہ ہو جائے فرض کفایہ کے درجے میں رہے اس وقت تک کسی
لوگ کے لئے بغیر ان کی اجازت کے جہاد میں شریک ہو جانا جائز نہیں صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر
سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شریک جہاد ہونے کی اجازت
لینے کے لئے حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں اس نے عرض کیا
کہ ہاں زندہ ہیں آپ نے فرمایا فلیصحبنا ہذا۔ یعنی اس تو اب تم ماں باپ کی خدمت میں رہ کر
جہاد کرو مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت میں نہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ دوسری روایت میں
اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ اس شخص نے یہ بیان کیا کہ میں اپنے ماں باپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں
اس پر آپ نے فرمایا کہ جہاد ان کو ہنسنا دیکھو یہاں کہ ان کو رونا بہت "یعنی ان سے جاکر کہہ دو کہ میں آپ کی مرضی کے
خلاف جہاد میں نہیں جاؤنگا۔ (قرطبی)

مسئلہ: اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی چیز فرض میں یا واجب علی العین ہو کفایہ کے
درجہ میں ہو تو اولاد کے لئے وہ کام بغیر ماں باپ کی اجازت کے جائز نہیں ابھیں کچھ علم دین حاصل کرنا
اور تبلیغ دین کے لئے سفر کرنے کا حکم بھی شامل ہے کہ بقدر فرض علم دین جسکو حاصل ہو وہ عالم بننے
کے لئے سفر کرے یا لوگوں کو تبلیغ و دعوت کے لئے سفر کرے تو بغیر اجازت والدین کے جائز نہیں۔
مسئلہ: والدین کے ساتھ جو حسن سلوک کا حکم قرآن و حدیث میں آیا ہے ان میں یہ بھی داخل
ہے کہ جن لوگوں سے والدین کی قرابت یا دوستی تھی ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا معاملہ کرے خصوصاً
ان کی وفات کے بعد صحیح بخاری میں ہر روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ "باپ کے ساتھ بڑا سلوک یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کے
ساتھ اچھا سلوک کرے اور حضرت ابواسید بدری رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ بیٹھا تھا ایک انصاری شخص آیا اور سوال کیا یا رسول اللہ! ماں باپ کے انتقال کے بعد بھی انکا
کوئی حق میرے ذمہ باقی ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ ان کے لئے دعا اور استغفار کرنا اور جو عہد انھوں نے
کسی سے کیا تھا اس کو پورا کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا اور ان کے ایسے رشتہ داروں
کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا جنکا رشتہ قرابت صرف انھیں کے واسطے ہے والدین کے یہ حقوق
ہیں جو ان کے بعد بھی تمہارے ذمہ باقی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ حضرت خدیجہ ام المومنین کی وفات کے بعد ان کی
سہیلیوں کے پاس ہر یہ بھیجی کرتے تھے جس سے حضرت خدیجہ کا حق ادا کرنا مقصود تھا۔

والدین کے ادب کی رعایت | والدین کی خدمت و اطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے
خصوصاً بڑھاپے میں | اور کسی عمر کے ساتھ مفید نہیں ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا
سلوک واجب ہے لیکن واجبات و فریض کی ادائیگی میں جو حالات عادتہ رکاوٹ بنا کر تھے ہیں ان حالات
میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت
بھی کرتا ہے اور ایسے حالات میں تعمیل احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی۔

والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں ان کی زندگی اولاد کے
رحم و کرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل
کا زخم بن جاتی ہے۔ دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑچڑاہٹ دیتے ہیں تیسرے
بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل و فہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات و مطالبات کچھ
ایسے بھی ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لئے مشکل ہوتا ہے قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین
کی دلجوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ
کسی وقت تم بھی اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح
انہوں نے اپنی راحت و خواہشات کو اُس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے
ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل و شرافت کا اتنا مذا ہے کہ ان کے اس
سابق احسان کا بدلہ ادا کرو آیت میں کَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور
آیات مذکورہ میں والدین کے بڑھاپے کی حالت کو پہنچنے کے وقت چند تاکیدیں احکام دیئے گئے ہیں
اول یہ کہ ان کو اُن بھی نہ کہے لفظ اُن سے مراد ہر ایسا کلمہ ہے جس سے اپنی ناگواری کا
اظہار ہو یہاں تک کہ ان کی بات سکر اس طرح لمبا سانس لینا جس سے اپنی ناگواری کا اظہار ہو وہ بھی اسی کلمہ
اُن میں داخل ہے ایک حدیث میں بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
ایذا و رسانی میں اُن کہنے سے بھی کم کوئی درجہ ہوتا تو یقیناً وہ بھی ذکر کیا جاتا حاصل یہ ہے کہ جس چیز سے
ماں باپ کو کم سے کم بھی اذیت پہنچے وہ بھی ممنوع ہے۔

دوسرا حکم ہے وَلَا تَسْمُرُوا لَهَا لَفْظِ نَعْرِ کے معنی جھڑکنے ڈانٹنے کہیں اس کا سبب ایذا ہو ناظر ہر
تیسرا حکم وَقُلْ لَهَا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ہے پہلے دو حکم منفی پہلو سے متعلق تھے جنہیں والدین کی ادنیٰ سے ادنیٰ باز خاطر
کو روکا گیا ہے اس تیسرے حکم میں مثبت انداز سے والدین کے ساتھ گفتگو کا ادب سکھایا گیا ہے کہ ان سے
محبت و شفقت کے نرم لہجہ میں بات کی جائے حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا جس طرح کوئی غلام انگوخت نرغ آقا کی بات کرتا ہے
چوتھا حکم وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذِّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے
سامنے اپنے آپ کو عاجز و ذلیل آدمی کی صورت میں پیش کرے جیسے غلام آقا کے سامنے، جناح کے معنی

بازو کے ذہنی لفظی معنی یہ ہیں کہ والدین کے لئے اپنے بازو و عاجزی اور ذلت کے ساتھ جھکائے آئندہ میں
 من الرحمة کے لفظ سے ایک تو اس پر متنبہ کیا کہ والدین کے ساتھ یہ معاملہ محض دکھاوے کا نہ ہو
 بلکہ قلبی رحمت و عزت کی بنیاد پر ہو دوسرے شاید اشارہ اس طرف بھی ہے کہ والدین کے سامنے
 ذلت کے ساتھ پیش آنا حقیقی عزت کا مفہوم ہے کیونکہ یہ واقعی ذلت نہیں بلکہ اس کا سبب شفقت و
 رحمت ہے۔

پانچواں حکم وَ قُلْ رَبِّ ارْحَمْنِي ۝ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ والدین کی پوری راحت
 رسائی تو انسان کے بس کی بات نہیں اپنی مقدر و بھر راحت رسائی کی فکر کے ساتھ ان کے لئے اللہ تعالیٰ
 سے بھی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی سب مشکلات کو آسان اور تکلیفوں کو دور فرمائے
 یہ آخری حکم ایسا وسیع اور عام ہے کہ والدین کی وفات کے بعد بھی جاری ہے جس کے ذریعہ وہ ہمیشہ
 والدین کی خدمت کر سکتا ہے۔

مسئلہ والدین اگر مسلمان ہوں تو ان کے لئے رحمت کی دعا ظاہر ہے لیکن اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو ان کی
 زندگی میں یہ دعا اس نیت سے جائز ہوگی کہ ان کو دنیوی تکلیف سے نجات ہو اور ایمان کی توفیق ہو مرنے
 کے بعد ان کے لئے دعا رحمت جائز نہیں (قرطبی لمخصا)

ایک واقعہ عجیب قرطبی نے اپنی اسناد منطل کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے
 کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ میرے باپ نے
 میرا مال لے لیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے والد کو بلا کر لاؤ اسی وقت جبہ پہل اس میں تشریف لائے اور
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جب اس کا باپ آجائے تو آپ اس سے پوچھیں کہ وہ کلمات
 کیا ہیں جو اس نے دل میں کہے ہیں خود اس کے کانوں نے بھی ان کو نہیں سنا جب یہ شخص اپنے والد
 کو لیکر پہنچا تو آپ نے والد سے کہا کہ کیا بات ہے آپکا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے کیا آپ چاہتے ہیں
 کہ اس کا مال مجھ میں لیں والد نے عرض کیا کہ آپ اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اسکی بھوپھی خاں یا اپنے
 نفس کے ہوا کہاں خرچ کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایشک جبکہ مطلب یہ
 تھا کہ جس حقیقت معلوم ہو گئی اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، اس کے بعد اس کے والد سے
 دریافت کیا کہ وہ کلمات کیا ہیں جبکہ ابھی تک خود تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا۔ اس شخص نے عرض کیا کہ
 یا رسول اللہ میں ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ آپ پر ہمارا ایمان اور یقین بڑھا دیتے ہیں جو بات کسی نے نہیں سنی
 اسکی آپ کو اطلاع ہو گئی جو ایک معجزہ ہے، پھر اس نے عرض کیا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند اشعار
 دل میں کہے تھے جبکہ میرے کانوں نے بھی نہیں سنا آپ نے فرمایا کہ وہ ہمیں سناؤ اس وقت اس نے یہ اشعار
 ذیل سنائے۔

فَإِنَّكَ مَوْلُودٌ اَرْمٰنُكَ يَا فَعَا تُعَلِّمًا اَجْنِي عَلِيكَ وَتَنْهَلُ

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی

تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا

اِذَا لَيْلَةٌ ضَاوَتْكَ بِالسُّعْرِ اَبَتِ لَسَقُكَ اِلَّا سَاهِرًا اَتَمَلُّ

جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری

کے سبب بیداری اور بقیاری میں گزاری

كَأَنِّي اَنَا الْمَطْرُوقُ دُونَكَ بِالَّذِي طُرِقْتُ بِهِ دُونَِي فَعِيْنِي تَهْمَلُ

گو یا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا۔

تَخَافُ السُّرُوحَ نَفْسِي عَلِيكَ وَاَنْهَا لَتُخْلَعَنَّ اَلْمَوْتَ وَقْتُ مَوْجَلُ

میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے پیچھے نہیں ہو سکتی

فَلَمَّا بَلَغْتَ اَلسِّنَّ وَاَلْخَايَةَ اَلنِّبْيَ اِلَيْهَا مَدَى مَا كُنْتَ فِيكَ اَوْ قَبْلُ

پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

جَعَلْتُ جَزَائِي غَافِلَةً وَفَظًّا ظَنَّةً كَاَنَّهُ اَنْتَ الْمُنْعَرِ الْمُنْقَطِلُ

تو تم نے میرا بدلہ نہ سنبھالا اور سخت کھامی بنا دیا گو یا کہ تمہیں مجھ پر احسان و انعام کر رہے ہو۔

فَلَيْتَكَ اِذَا لَحَرْتُمْ حَقُّ اُبُوْتِي فَعَلْتَ كَمَا اَلْجَاسُ الْمَصَاقِبُ يَفْعَلُ

کاش اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا

ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے

فَاَوْكَيْتَنِي حَقَّ اَلْجَوَارِ اِذَا لَحَرْتُمْ عَلَيَّ بِمَالِ دُونَ مَالِكَ تَبْخُلُ

تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں نخل سے کام نہ لیا ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشعار سننے کے بعد بیٹے کا گریبان کھڑ لیا اور فرمایا: انت و

مالک لا بیک یعنی جا تو بھی اور میرا مال بھی سب باپ کا ہے (تفسیر قرطبی ص ۱۱۲) یہ اشعار عربی

ادب کی مشہور کتاب حماسہ میں بھی نقل کئے گئے مگر ان کو امیہ ابن ابی الصلت شاعر کی طرف منسوب کیا

ہے اور بعض نے کہا کہ یہ عبد الاعلیٰ کے اشعار میں بعض نے انکی نسبت ابو العباس اعلیٰ کی طرف کی ہے (حاشیہ قرطبی)

مذکورہ آیات میں سے آخری آیت وَتَبْكَرُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نَفْسِيْ کے حُج میں اس دل تنگی کو

رفع فرما دیا گیا ہے جو والدین کے ادب و تعلیم کے متعلقہ احکام مذکورہ سے اولاد کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ

والدین کے ساتھ ہر وقت رہنا ہے ان کے اور اپنے عادات کی ہر وقت یکساں نہیں ہونے کی وجہ سے دقت زبان

سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو مذکور الصدر آداب کے خلاف ہو تو اس پر جہنم کی وعید ہے اس طرح گناہ

سے بچنا سخت مشکل ہوگا اس آیت میں اس فتنہ اور اس سے دشمنی کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ بغیر ارادہ بے ادبی کے کبھی کسی پریشانی یا غفلت سے کوئی کلمہ صادر نہ ہو جائے اور پھر اس سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے واقف ہیں کہ وہ کلمہ بے ادبی یا ایذا کے لئے نہیں کہا تھا وہ معاف فرماتے والے ہیں لفظ اوابین یعنی تو ابین ہے حدیث میں بعد مغرب کی چہ رکعات اور اشراق کی نوافل کو صلوات الاوابین کہا گیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ ان نمازوں کی توفیق انہیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اوابین اور تو ابین ہیں۔

وَاِتِّذْنَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا

اور دے قربت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسکین کو اور مت

تَبَذَّ رَبُّنَا ۝۲۱ اِنَّ الْمُبَذَّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ

اُڑا بے جا بے شک اڑانے والے بھائی ہیں

الشَّيْطٰنُ ۝ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهِ كَفُوْرًا ۝۲۲

شیطانوں کے اور شیطان ہے اپنے رب کا ناشکر۔

خلاصہ تفسیر

ان دونوں آیتوں میں حقوق عباد کے متعلق دو مزید حکم مذکور ہیں اول والدین کے علاوہ دیگر رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق۔ دوسرے خرچ کرنے میں فضول خرچی کی ممانعت مختصر تفسیر یہ ہے اور قربت دار کو اس کا حق مالی وغیر مالی، دیتے رہنا اور محتاج و مسافر کو بھی (ادان کے حقوق) دیتے رہنا اور مال کو بے موقع مت اڑا بیٹھ بے موقع مال اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں (یعنی اس کے مشابہ ہوتے ہیں) اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو دولت عقل کی دی اس نے اس دولت عقل کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کیا اسے بطرح فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دولت مال کی دی مگر وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

عام رشتہ داروں کے حقوق کا اہتمام	پہلی آیتوں میں والدین کے حقوق اور ان کے ادب و احترام کی تعلیم تھی اس آیت میں عام رشتہ داروں کے حقوق کا بیان ہے کہ ہر رشتہ کا حق ادا کیا جائے
----------------------------------	--

جو کم سے کم ان کے ساتھ حسن معاشرت اور عمدہ سلوک ہے اور وہ اگر حاجت مند ہوں تو ان کی مالی امداد بھی اپنی وسعت کے مطابق اس میں داخل ہے اس آیت سے اتنی بات تو ثابت ہو گئی کہ ہر شخص پر اس کے عام رشتہ دار عزیزوں کا بھی حق ہے۔ وہ کیا اور کتنا ہے اس کی تفصیل مذکور نہیں مگر عام تعلق میں اور حسن معاشرت کا اس میں داخل ہونا واضح ہے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک اسی فرمان کے تحت جو رشتہ دار ذمی رحمہ محرم ہو اگر وہ عورت یا بچہ ہے جن کے پاس اپنے گزارہ کا سامان نہیں اور کمانے پر بھی قدرت نہیں اسی طرح جو رشتہ دار ذمی رحمہ محرم اپنا راج یا اندھا ہوا اور اس کی مالک میں اتنا مال نہیں جس سے اس کا گزارہ ہو سکے تو ان کے جن رشتہ داروں میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں ان پر ان سب کا نفقہ فرض ہے اگر ایک ہی درجہ کے کئی رشتہ دار صاحب وسعت ہوں تو ان سب پر تقسیم کر کے ان کا گزارہ نفقہ دیا جائے گا سورہ بقرہ کی آیت **وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ** سے بھی یہ حکم ثابت ہے (تفسیر مظہری)۔

اس آیت میں اہل قرابت اور مسکین و مسافر کو مال مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے کو ان کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ دینے والے کو ان پر احسان جتانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ ان کا حق اس کے ذمہ فرض ہے دینے والا اپنا فرض ادا کر رہا ہے کسی پر احسان نہیں کر رہا۔

تنبذ برجی فضول خرچی | فضول خرچی کے معنی کو قرآن حکیم نے دو لفظوں سے تعبیر فرمایا ہے ایک تنبذ پر اور دوسرے اسراف تنبذ پر کی ممانعت تو اس آیت مذکورہ میں واضح ہے اسراف کی ممانعت آیت **وَلَا تُسْرِفُوا** سے ثابت ہے بعض حضرات نے فرمایا کہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں کسی مصیبت میں یا بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تنبذ پر و اسراف کہا جاتا ہے اور بعض حضرات نے یہ نہیں کہے کہ کسی گناہ میں یا بالکل بے موقع بے محل خرچ کرنے کو تنبذ پر کہتے ہیں اور جہاں خرچ کرنے کا جائز موقع تو ہو مگر ضرورت زائد خرچ کیا جائے اس کو اسراف کہتے ہیں ایسے تنبذ پر نسبت اسراف کے اشرار و مبدین کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے امام غصیہ حضرت مجاہد رحمہ نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنا سارا مال حق کے لئے خرچ کر دے تو وہ تنبذ پر نہیں اور اگر باطل کے لئے ایک **هُدًی** (آدھ سیر) بھی خرچ کرے تو وہ تنبذ پر ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ غیہ حق میں بے موقع خرچ کرنے کا نام تنبذ پر ہے (مظہری) امام مالک رحمہ نے فرمایا کہ تنبذ پر یہ ہے کہ انسان مال کو حاصل تو حق کے مطابق کرے مگر خلاف حق خرچ کر ڈالے اور اس کا نام اسراف بھی ہے اور یہ حرام ہے۔ (قرطبی)

امام قرطبی رحمہ نے فرمایا کہ حرام دنا جائز کام میں تو ایک درہم خرچ کرنا بھی تنبذ پر ہے اور جائز و مباح خواہشات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا جس سے آئندہ محتاج فقیر ہو جانے کا خطرہ ہو جائے یہ بھی تنبذ پر میں داخل ہے ہاں اگر کوئی شخص اصل راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے منافع کو اپنی جائز خواہشات میں وسعت کے ساتھ خرچ کرتا ہے تو وہ تنبذ پر میں داخل نہیں (قرطبی ج ۱ ص ۱۷۷)۔

وَأَمَّا نَعْرُضَنَّ عَنْهُمْ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا

اور اگر کبھی تنہا کرے تو ان کی طرف سے انتظار میں اپنے رب کی مہربانی کے جس کی تمکو

فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ۲۸

تو قہ ہے تو کہہ دے ان کو بات نرمی کی ۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت میں حقوق العباد سے متعلق پانچوں حکم یہ دیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت حاجتمندوں کو انکی ضرورت کے مطابق دینے کا انتظام نہ ہو سکے تو اس وقت بھی ان کو روکھا جواب نہ دیا جائے بلکہ ہمدردی کے ساتھ آئندہ سہولت کی امید دلائی جائے۔ آیت کی تفسیر یہ ہے ۔

اور اگر کسی وقت تمہارے پاس ان لوگوں کو دینے کے لئے مال نہ ہو اور اس لئے تم کو اس رزق کے انتظار میں جسکی اپنے پروردگار سے توقع ہو اور اس کے نہ آنے تک، ان سے پہلو تہی کرنا پڑے تو (اتنا خیال رکھنا کہ ان سے نرمی کی بات کہہ دینا یعنی دبیوئی کے ساتھ ان سے وعدہ کر لینا کہ انشاء اللہ تعالیٰ کہیں سے آئینگا تو دیں گے دل آزار جواب مت دینا)

معارف و مسائل

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے واسطے سے پوری امت کی عجیب اختلافی تزیینت ہے کہ اگر کسی وقت ضرورت مند لوگ سوال کریں اور آپ کے پاس دینے کو کچھ نہ ہو اس لئے ان لوگوں سے اعراض کرنے پر مجبور ہو تو بھی آپ کا یہ سرائس مستغنیانہ یا مخاطب کے لئے تو ہیں آمیز نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ پہلو تہی کرنا اپنے عجز و مجبوری کے اظہار کے ساتھ ہونا چاہئے۔

اس آیت کے شان نزول میں ابن زید کی روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا سوال کیا کرتے تھے اور آپ کو معلوم تھا کہ ان کو دیا جائے گا تو یہ فساد میں خرچ کریں گے اس لئے آپ ان کو دینے سے انکار کر دیتے تھے کہ یہ انکار ان کو فساد سے روکنے کا ذریعہ ہے اس پر یہ

آیت نازل ہوئی (قرطبی)

مسند سعید بن منصور میں بروایت مبارک بن حکم مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ کپڑا تھا آپ نے اس کو مستحقین میں تقسیم فرمادیا اس کے بعد کچھ اور لوگ آئے جبکہ آپ فارغ ہو چکے تھے اور کپڑا ختم ہو چکا تھا ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْ يَدَكَ

اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھولے اس کو بائیں کھول دینا

الْبَسِطُ فَتَقْعُدَ مَأْمُومًا قَحْشُورًا ۝۲۹ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ

پھرتو بیٹھ رہے الزام کھایا بار بار جدا تیرا رب کھول دیتا ہے روزی جس

لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۝ اِنَّكَ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ۝۳۰

کے واسطے چاہے اور تنگ بھی دہی کرتا ہے وہی ہے اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا

خلاصہ تفسیر

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو کہ انتہائی غلی سے باطل ہاتھ خرچ کرنے سے روک لو، اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اسراف کیا جائے، اور نہ الزام خورہ (انہ) تہید دست ہو کر بیٹھ رہو گے اور کسی کے فقر و احتیاج پر اتنا اثر لینا کہ اپنے کو پریشانی میں ڈال لو کوئی معقول بات نہیں کہیونکہ بلاشبہ تیرا رب جسکو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی جس پر چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں کی حالت اور ان کی مصیبت کو خوب جانتا ہے دیکھتا ہے سارے عالم کی حاجات پورا کرنا تو رب العالیوں ہی کا کام ہے تم اس فکر میں کیوں پڑے کہ اپنے سے ہو سکے یا نہ ہو سکے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر بسکی حاجتیں پوری ہی کر دو۔ یہ صورت اس لئے بیکار ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی بسکی حاجتیں پوری کر دینا تمہارے بس کی بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کسی کا غم نہ کرے۔ اس کے لئے تدبیر نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ سب کی حاجتیں پوری کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں خواہ وہ اپنے اوپر کتنی ہی مصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار رہے ہو کہ یہ کام تو صرف مالک کائنات ہی کا ہے کہ سب کی حاجتوں کو جانتا بھی ہے اور سب کی مصیبتوں سے بھی واقف ہے کہ کس وقت کس شخص کی کس حاجت کو کس مقدار میں پورا کرنا چاہیے اس لئے انسان کا کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ میانہ روی سے کام لے نہ خرچ کرنے کے موقع میں بخل کرے اور نہ اتنا خرچ کرے کہ کل کو خوار ہی فقیر ہو جائے اور اہل دنیا جن کے حقوق اس کے ذمہ ہیں ان کے حقوق ادا نہ ہو سکیں اور بعد میں پچھتا نا پڑے۔

معارف و مسائل

خرچ کرنے میں اعتدال کی ہدایت | اس آیت میں بلا واسطہ مخاطب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

اور آپ سے واسطے سے پوری اُمت مناسبت ہے اور مشفق و انتقاد کی ایسی تعلیم ہے جو دوسروں کی اصلاح میں
 حائل ہی نہ ہو اور خود اپنے لئے بھی مصیبت نہ بنے اس آیت کے شان نزول میں ابن مردودیه نے بروایت
 حضرت عبداللہ بن مسعود اور بخاری نے بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی خدمت میں ایک لڑکا حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری والدہ آپ سے ایک کرتے کا سوال کرتی ہیں۔ اس
 وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی کرتا اس کے سوا نہیں تھا جو آپ کے بدن مبارک پر تھا آپ نے
 بڑے کوچہ کہا کہ پھر کسی وقت آؤ جبکہ ہمارے پاس اتنی وسعت ہو کہ تمہاری والدہ کا سوال پورا کر سکیں۔ لڑکا گھر
 گیا اور واپس آیا اور کہا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ آپ کے بدن مبارک پر جو کرتا ہے وہی عنایت فرمادیں۔ یہ
 شکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک سے کرتہ اتار کر اس کے حوالے کر دیا آپ نے گئے بدن سے
 گئے نماز کا وقت آیا حضرت بلالؓ نے اذان دی مگر آپ حسب عادت باہر تشریف نہ لائے تو لوگوں کو خبر
 ہوئی بعض لوگ اندر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کرتے کے بغیر گئے بدن بیٹھے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔
 اللہ کی راہ میں اتنا خرچ کرنا کہ خود | اس آیت سے بظاہر اس طرح خرچ کرنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے
 پریشانی میں پڑ جائے اس کا وجہ | جس کے بعد خود ذخیرہ و محتات ہو جائے اور پریشانی میں پڑ جائے امام
 غسیہ قرطبی نے فرمایا کہ یہ حکم مسلمانوں کے عام حالات کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد کلیفوں سے پریشان
 ہو کر پچھلے خرچ کے مزے پر پوچھنا میں اور افسوس کریں قرآن کریم کے لفظ حَسْبُو میں اس کی طرف اشارہ
 موجود ہے کہ قال المظہری اور جو لوگ اتنے بلت جو مسلمہ ہوں کہ بعد کی پریشانی سے نہ گھبرائیں اور اہل حقوق کے
 حقوق بھی ادا کر سکیں ان کے لئے یہ پابندی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت
 یہ تھی کہ کل کے لئے کچھ ذخیرہ نہ کرتے تھے جو کچھ آتا آیا آج ہی خرچ فرما دیتے تھے اور با اذنان حبیب اور فی فہ
 کی تکلیف تھی پیش آتی تھی پر پھر باندھنے کی نوبت بھی آجاتی تھی اور صحابہ کرام میں بھی بہت سے ایسے حضرات
 ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اسکو منع فرمایا نہ ان کو ملامت کی اس سے معلوم ہو کہ اس آیت کی ممانعت ان لوگوں کے
 لئے ہے جو فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت نہ کر سکیں اور خرچ کرنے کے بعد ان کو مسرت ہو کہ کاش ہم خرچ نہ کرتے یہ
 صورت اُن کے پچھلے عمل کو ناسد کر دیگی اس لئے اس سے منع فرمایا گیا۔

خرچ میں بذاتیں موقوف ہے | اور اس بات یہ ہے کہ اس آیت نے بذاتیں کے ساتھ خرچ کرنے کو منع کیا ہے کہ آگے
 آنے والے حالات سے قطع نظر کہ جو کچھ پاس ہے اُسے ایسی وقت خرچ کر ڈالے کہ دوسرے صاحب
 حاجت لوگ آئیں اور کوئی دینی ضرورت اہم پیش آجائے تو اب اس کے لئے قدرت نہ رہے بلکہ یہی اہل
 و خیال جسکے حقوق اس کے ذمہ واجب ہیں ان کے حق ادا کرنے سے عاجز ہو جائے (مظہری) مَلُوكًا مَّشْكُورًا
 کے الفاظ کے متعلق تفسیر مظہری میں ہے کہ مَلُوكًا کا تعلق پہلی حالت یعنی قبل سے ہے کہ اگر مال کو داخل سے باہر

روک لے گا تو لوگ ملامت کریں گے اور محسوسا کا تعلق کسی دوسری حالت سے ہے کہ خرچ کرنے میں اتنی زیادتی کرے کہ خود فقیر ہو جائے تو یہ محسوسا یعنی تمہکا ماندہ عاجز یا حسرت زدہ ہو جائے گا۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةً إِمْلَاقٍ ۖ تَحْنُ نَزْرٌ قَهْرٌ ۖ

اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور

إِنَّا كُمْ ۖ إِن قَتَلْتُمْهُمْ كَانَ خَطَاً كَبِيراً ۝۳۱

تم کو بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو کیونکہ سب کے رازق ہم ہیں، ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی اگر رازق تم ہوئے تو ایسی باتیں سوچتے، بیشک انکا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

معارف و مسائل

سابقہ آیات میں انسانی حقوق کے متعلق ہدایات کا ایک سلسلہ ہے یہ چچا حکم اہل جاہلیت کی ایک ظالمانہ عادت کی اصلاح کے لئے ہے زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ ابتداء ولادت کے وقت اپنی اولاد خصوصاً بیٹیوں کو اس خوف سے قتل کر ڈالتے تھے کہ ان کے مصارف کا بار ہم پر پڑے گا، آیت مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی جہالت کو واضح کیا ہے کہ رزق دینے والے تم کون، یہ تو خالص اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تمہیں بھی تو وہی رزق دیتا ہے جو تمہیں دیتا ہے وہی ان کو بھی دیگا تم کیوں اس نکر میں قتل اولاد کے مجرم بنتے ہو بلکہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے رزق دینے میں اولاد کا ذکر مقدم کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا ہے ہم پہلے ان کو بچہ نہیں دیں گے جسکا مطلب وہ اسل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اہل و عیال کا تکفل یا دوسرے غریبوں و یتیموں کی امداد کرتا ہے تو اس کو اسی حساب سے دیتے ہیں کہ وہ اپنے ضروریات بھی پوری کر سکے اور دوسروں کی امداد بھی کر سکے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے إِنْ شَاءَ تَخْرُجُونَ وَ تَزْنِ تَوْنٌ بِضَعْفَائِكُمْ یعنی تمہارے ضعیف و کمزور طبقہ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری امداد ہوتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہل و عیال کے تکفل والدین کو جو کچھ ملتا ہے وہ کمزور و غورنوں بچوں کی خاطر ہی ملتا ہے مسئلہ قرآن کریم کے اس ارشاد سے اس معاملے پر بھی روشنی پڑتی ہے جس میں آج کی دنیا گرفت

ہے کہ کثرت آبادی کے خوف سے ضبط تولید اور منسوبہ بندی کو رذائے دسویں ہے اسکی بنیاد بھی اسی جاہلانہ فلسفہ پر ہے کہ رزق کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھ لیا گیا ہے یہ معاملہ قتل اولاد کی برابر گناہ نہ سہی مگر اس کے مذموم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزَّانِيَ إِنَّكَ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ③۲

اور پاس نہ جاؤ زانی کے وہ بے حیائی اور بُری راہ ہے۔

خلاصہ تفسیر

اور زنا کے پاس بھی مست کھینکو (یعنی اس کے مبادی اور مقدمات سے بھی بچو) بلاشبہ وہ (خود بھی، بڑی بے حیائی کی بات ہو اور) دوسرے مفاسد کے اعتبار سے بھی، بُری راہ ہے کیونکہ اس پر عداوتیں اور فتنے اور تفتیشیں نسبت مرتب ہوتے ہیں۔

معارف و مسائل

یہ ساتواں حکم زنا کی حرمت کے متعلق ہے جس کے حرام ہونے کی دو وجہ بیان کی گئی ہیں اول یہ کہ وہ بے حیائی ہے اور انسان میں حیاء نہ رہتی تو وہ انسانیت ہی سے محروم ہو جاتا ہے پھر اس کے لئے کسی بھٹے بڑے کام کا اختیار نہیں رہتا اس معنی کے لئے حدیث میں ارشاد ہے اِذَا فَاتَكَ الْحَيَاءُ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ یعنی جب تیری حیاء جاتی رہی تو کسی برائی سے رکاوٹ کا کوئی پردہ نہ رہا تو جو چاہو گے کرو گے اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء کو ایمان کا ایک اہم شعبہ قرار دیا ہے وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ (بخاری) دوسری وجہ معاشرتی فساد ہے جو زنا کی وجہ سے آتا پھیلتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس کے نتائج بد بعض اوقات پورے قبیلوں اور قوموں کو برباد کر دیتے ہیں فقہ چوکی، لاکھ قتل کی جتنی کثرت آج دنیا میں بڑھ گئی ہے اس کے حالات کی تحقیق کجائے تو آدھے سے زیادہ واقعات کا سبب کوئی عورت و مرد نہ لگتے ہیں جو اس جرم کے مرتکب ہوئے۔ اس جرم کا تعلق اگرچہ بلا واسطہ حقوق العباد سے نہیں مگر اس جگہ حقوق العباد سے متعلقہ احکام کے ضمن میں اسکا ذکر کرنا شاید اس بنا پر ہو کہ یہ جرم بہت سے ایسے جرائم کا آغاز ہے جس سے حقوق العباد متاثر ہوتے ہیں اور قتل و غارتگری کے ہنگامے برپا ہوتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے اس جرم کو تمام جرائم سے اشد قرار دیا ہے اس کی سزا بھی سارے جرائم کی سزائوں سے زیادہ سخت رکھی ہے کیونکہ یہ ایک جرم دوسرے سینکڑوں جرائم کو اپنے میں سمو کے ہوئے ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتواں آسمان اور ساتواں زمینیں شادی شدہ

زنا کا پراحت کرنا ہے اور جہنم میں ایسے لوگوں کی نذر لگائے ہوں گے ایسی سخت بدلہ پھیلے گی کہ اہل جہنم بھی اس سے پریشان ہوں گے اور آگ کے مذاپ کے ساتھ ان کی رسوائی جہنم میں بھی ہوتی رہے گی (رد داہ البزازی عن بریدہ منہری) ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زنا کرنے والا زنا کرنے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا چوری کرنے والا چوری کرنے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا اور شراب پینے والا شراب پینے کے وقت مؤمن نہیں ہوتا یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے اس کی شرح ابو داؤد کی روایت میں یہ ہے کہ ان جرائم کے کرنے والے جہنم بنائے جرم ہونے میں تو ایمان ان کے قلب سے نکل کر باہر آجاتا ہے اور پھر جب اس سے لوٹ جاتے ہیں تو ایمان واپس آجاتا ہے (منہری)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ وَمَنْ

اور نہ مارو اس جان کو جس کو منع کر دیا ہے اللہ نے مگر حق پر اور جو

قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيٍّ سُلْطَانًا فَلَا يَسْرِفُ

مارا گیا ظلم سے تو دیا ہم نے اس کے وارث کو زور سوحہ سے نہ نکل جائے

فِي الْقَتْلِ ۚ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ﴿۳۳﴾

قتل کرنے میں اس کو مدد ملتی ہے -

خلاصہ تفسیر

اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق پر قتل کرنا درست ہے یعنی جب کس شرعی حکم سے قتل کرنا واجب یا جائز ہو جائے تو وہ حرم اللہ میں داخل نہیں اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث (حقیقی یا تکمیلی) کو اختیار دیا ہے (نقصا من لیے گا) سو اس کو قتل کے بارے میں حد و مثلاً سے تجاوز نہ کرنا چاہیے یعنی قاتل پر قتل کا یقینی ثبوت ملے بغیر قتل نہ کرے اور اس کے اعتراف و اقارب وغیرہ کو جو قتل میں شریک نہیں ہیں محض جو شہ انتقام سے قتل نہ کرے اور قاتل کو بھی صریح قتل نہ کرے ناک کاٹ یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ کر نہ کرے۔ کیونکہ وہ شخص (نقصا من) میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی صورت میں تو شرعاً مدد کے قابل ہے (اور اس نے زیادتی کی تو پھر ذریعہ ثانی معلوم ہو کر اللہ کی مدد کا مستحق ہو جائے گا اس لئے ولی مقتول کو چاہیے کہ وہ اپنے منصور حق ہونے کی قدر کرے حد سے بڑھ کر اس نعمت حق کو ضائع نہ کرے)

معارف و مسائل

یہ آٹھواں حکم قتل ناحق کی حرمت کے بیان میں ہے جسکا جرم عظیم ہونا دنیا کی ساری ہی جماعتوں اور مذہبوں اور فرقوں میں مسلم ہے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک اس سے اہم (یعنی) ہے کہ کسی مومن کو ناحق قتل کیا جائے اور بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کے باشندے کسی مومن کے قتل ناحق میں شریک ہو جائیں تو ان سب کو اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کر دینگے۔ (ابن ماجہ بنہ حسن والبیہقی۔ از مظہری)۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں قاتل کی امداد ایک کلمہ سے بھی کی تو میدانِ حشر میں جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا اس کی بیانی پر لکھا ہوگا اَنْسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ یعنی یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کر دیا گیا ہے۔ (مظہری از ابن ماجہ واصبہانی)۔

ادبیہ نے بروایت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک گناہ کو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے مگر وہ آدمی جو حالت کفر میں مر گیا یا جس نے جان بوجھ کر قصد کسی مسلمان کو ناحق قتل کیا۔

قتل ناحق کی تفسیر | امام بخاری وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں جو اللہ کے ایک ہونے اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو مجھ پر عورتوں کے۔ ایک یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کیا ہو کہ اسکی شہمی مزار یہ ہے کہ چراؤ کر کے اسکو مار دیا جائے، دوسرے وہ جسے کسی انسان کو ناحق قتل کیا ہو کہ اس کی مزار یہ ہے کہ ولی مقتول اسکو قصاص میں قتل کر سکتا ہے، تیسرے وہ شخص جو دین اسلام سے مزید ہو گیا ہو کہ اس کی مزار بھی قتل ہے۔

قصاص لینے کا حق کسکو ہے | آیت مذکورہ میں بتلایا گیا ہے کہ یہ حق مقتول کے ولی کا ہے۔ اگر کسی ولی کوئی موجود نہیں تو اسلامی حکومت کے سربراہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بھی ایک حیثیت سے سب مسلمانوں کا دلی ہے اسی لئے خلاصہ تفسیر میں دلی حقیقی یا حکی لکھا گیا ہے۔

ظلم کا جواب ظلم نہیں انصاف ہے | **فَلَا يُبْرِرُ فِي الْقَتْلِ** اسلامی قانون کی ایک خاص ہدایت ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے اپنا جائز نہیں بلکہ میں بھی انصاف کی رعایت لازمی ہے جب تک دلی مقتول انصاف کے ساتھ اپنے مقتول کا انتقام شرعی قصاص کے ساتھ لینا چاہے تو قانون شریعت اس کے حق میں ہے یہ تصور حق ہے اللہ تعالیٰ اس

کا مددگار نہ ہو اور اگر اس نے جوش انتقام میں شرعی قصاص سے تجاوز کیا تو اب یہ مظلوم کے بجائے ظالم ہو گیا اور ظالم اس کا مظلوم بن گیا اب معاملہ برعکس ہو جائے گا اللہ تعالیٰ اور اس کا قانون اب اس کی مدد کرنے کے بجائے دوسرے فریق کی مدد کرے گا کہ اس کو ظلم سے بچائے گا۔

جاہلیت عرب میں یہ بات عام تھی کہ ایک شخص قتل ہوا تو اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان یا ساتھیوں میں جو بھی ہاتھ لگے اس کو قتل کر دیتے تھے بعض جگہ یہ عورت پر بھی کہ جس کو قتل کیا گیا وہ قوم کا کوئی بڑا آدمی ہے تو اس کے بدلہ میں صرف ایک قاتل کو قصاصاً قتل کرنا کافی نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک خون کے بدلہ دو تین یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی جان لی جاتی تھی بعض لوگ جوش انتقام میں قاتل کے صرف قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی ناک کان وغیرہ کاٹ کر منسلک کر دیتے تھے یہ سب چیزیں اسلامی قصاص کی حد سے زائد اور حرام ہیں اس لئے آیت فَلَا يُؤْتَوْنَ فِي الْقَتْلِ ہیں ان کو رد کیا گیا ہے۔

یاد رکھنے کے قابل ایک حکایت | بعض ائمہ مجتہدین کے سامنے کسی شخص نے حجاج بن یوسف پر کوئی الزام لگایا حجاج بن یوسف اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا ظالم اور انتہائی بدنام شخص ہے جس نے ہزاروں مسلمانوں کو ناحق قتل کیا ہے اس نے عام طور پر سکو بڑا کہنے کی برائی لوگوں کے ذہن میں نہیں رہتی جس بزرگ کے سامنے یہ الزام حجاج بن یوسف پر لگایا گیا انھوں نے الزام لگانے والے سے پوچھا کہ تمہارے پاس اس الزام کی کوئی سند یا شہادت موجود ہے انھوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ حجاج بن یوسف ظالم سے ہزاروں مقتولین بے گناہ کا انتقام لے گا تو یاد رکھو کہ جو شخص حجاج پر کوئی ظلم کرتا ہے اس کو بھی انتقام سے نہیں بچوڑا جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی لیں گے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کوئی جنبہ داری نہیں ہے کہ بڑے اور گناہگار بندوں پر دھڑل کو آزاد چھوڑ دیں اور وہ جو چاہیں الزام و اثہام لگا دیا کریں۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر جس طرح کہ بہتر ہو جب تک وہ پہنچے اپنی جوانی کو

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝۳۴ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا

اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد کی پوری ہوگی اور پورا بھرو واپ جب

کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم ذلک خیر وأحسن تأویلاً ۝۳۵

اپ کر دینے لگو اور تولو سبھی ترازو سے یہ بہتر ہے اور اچھا ہے اس کا انجام -

خلاصہ تفسیر

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یعنی اس پر تصرف نہ کرو، مگر ایسے طریقہ سے جو کہ (شرعاً) مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے اور عہد (جائز) کو پورا کیا کرو بیشک عہد کی قیامت میں باز پرس ہونے والی ہے (عہد میں وہ تمام عہد گبی داخل ہیں جو بندہ نے اپنے اللہ سے کئے ہیں اور وہ بھی جو کسی انسان سے کئے ہیں) اور (ناپسے کی چیزوں کو) جب ناپ کر دو تو پورا ناپو اور (تو لنے کی چیزوں کو) صحیح ترازو سے تول کر دو یہ دینی نفسہ تھی، اچھی بات ہے اور انجام گبی اسکا اچھا ہے آخرت میں تو ثواب اور دنیا میں نیکنامی کی شہرت جو ترقی تہارت کا ذریعہ ہے،

معارف و مسائل

ان دو آیتوں میں تین حکم نواں۔ دسواں گیارہواں مالی حقوق کے متعلق مذکور ہیں سابقہ آیات میں بدنی اور جسمانی حقوق کا ذکر تھا یہ مالی حقوق کا بیان ہے۔ یتیموں کے مال میں احتیاط | ان میں پہلی آیت میں نواں حکم یتیموں کے اموال کی حفاظت اور انہیں احتیاط کا ہے جس میں بڑی تاکید ہے یہ فرمایا کہ یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ یعنی ان میں خلافت شرع یا بچوں کی مصلحت کے خلاف کوئی تصرف نہ ہونے پاوے یتیموں کے مال کی حفاظت اور انتظام جن کے ذمہ ہے ان پر لازم ہے کہ ان میں بڑی احتیاط سے کام لیں شرعاً یتیموں کی مصلحت کو دیکھ کر خرچ کریں اپنی خواہش یا بے فکری سے خرچ نہ کریں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ یتیم بچے جوان ہو کر اپنے مال کی حفاظت خود نہ کر سکیں جسکا ادنیٰ درجہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچنا اور زیادہ اٹھارہ سال تک ہے۔

نا جائز طریقہ پر کسی کا مال بھی خرچ کرنا جائز نہیں، یہاں یتیموں کا خصوصیت سے ذکر اسلئے کیا کہ وہ تو خود کوئی حساب لینے کے قابل نہیں دوسروں کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی جس جگہ کوئی انسان اپنے حق کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو وہاں حق تعالیٰ کا مطالبہ اشد ہو جاتا ہے اس میں کوتاہی عام لوگوں کے حقوق کی نسبت سے زیادہ گناہ ہو جاتی ہے۔

معاهدات کی تکمیل و تمیل کا حکم | دسواں حکم عہد پورا کرنے کی تاکید ہے۔ عہد دو طرح کے ہیں ایک وہ جو بندہ اور اللہ کے درمیان ہیں جیسے ازل میں بندہ کا یہ عہد کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے اس عہد کا لازمی اثر اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی ہوتا ہے۔ یہ عہد تو ہر انسان نے ازل میں کیا

ہے خواہ دنیا میں وہ مومن ہو یا کافر۔ دوسرا عہد مومن کا ہے جو شہادت ان لا الہ الا اللہ کے ذریعہ
کیا گیا ہے جس کا سبب احکام الہیہ کا مکمل اتباع اور اس کی رضا جوئی ہے۔
دوسری قسم عہد کی وہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے جس میں تمام معاہدات سیاسی،
تجارتی، معاملاتی شامل ہیں جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں۔

پہلی قسم کے تمام معاہدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاہدات
خلافت شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب اور جو خلافت شرع ہوں ان کا فریق ثانی کو اطاعت کر کے ختم
کر دینا واجب ہے جس معاہدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فریق پورا نہ کرے تو دوسرے کو فاقہ
کہ عدالت میں مراجعہ کر کے اسکو پورا کرنے پر مجبور کرے معاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فریق کے درمیان
کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عہد ہو اور جو کوئی شخص کسی سے یکطرفہ وعدہ کر لیتا ہے کہ میں آپکو
فلان چیز دوں گا یا فلاں وقت آپ سے ملوں گا یا آپکا فلاں کام کر دوں گا اس کا پورا کرنا بھی واجب ہے
اور جس حضرات نے اسکو بھی عہد کے اس مفہوم میں داخل کیا ہے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ معاہدہ
فریقین کی صورت میں اگر کوئی خلافت درازی کرے تو دوسرا فریق اسکو بذریعہ عدالت تکمیل معاہدہ پر
مجبور کر سکتا ہے مگر یکطرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعہ جبراً پورا نہیں کر سکتا ہاں بلا عذر شرعی کے کسی سے
وعدہ کر کے جو خلافت درازی کرے گا وہ شرعاً گناہگار ہوگا حدیث میں اسکو عملی نفاق قرار دیا گیا ہے
اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا یعنی قیامت میں جیسا
فرائض و واجبات اور احکام الہیہ کے پورا کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہوگا ایسا ہی باقی معاہدات کے
متعلق بھی سوال ہوگا یہاں صورت اتنا کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ اس کا سوال ہوگا آگے سوال کے بعد کیا ہونا
ہے اسکو مبہم رکھنے میں خطرہ کے عظیم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

گیا رہو ان حکم لین دین کے معاملات میں ناپ تول پورا کرنے کی ہدایت اور اس میں
کمی کرنے کی ممانعت کا ہے جس کی پوری تفصیل سورۃ المطففین میں مذکور ہے۔
مسئلہ۔ حضرات فقہانہ فرمایا کہ آیت میں ناپ تول میں کمی کا جو حکم ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ
جسکا جانا حق ہے اس سے کم دینا حرام ہے اس لئے ہمیں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی ملازم اپنے مفوضہ
اور رقمہ کام میں کمی کرے یا جتنا وقت دینا ہے اس سے کم دے یا مزدور اپنی مزدوری میں کام چھوڑ
کرے۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت | مسئلہ: اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كَلْتُمْ تَغْيِيزَ مِحْطٍ مِّنْ الْبُحْيَانِ مَن
فرمایا کہ اس آیت میں ناپ تول پورا کرنے کی ذمہ داری بائع (بیچنے والے) پر ڈالی گئی ہے جس سے
معاہدہ ہو کہ ناپ تول لے اور اس کو پورا کرنے کا ذمہ دار بائع ہے۔

آخر آیت میں ناپ تولیہ پر اکرنے کے مطلق فرمایا اور کہ حقیقتاً احسن ناپ تو اس میں ناپ تولیہ کے اور برابر کرنے کے مطلق و باتیں فرمائیں ایک اس کا غیر بہتر ہونا اس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا کرنا اپنی ذات میں اچھا اور بہتر ہے شرعی کے علاوہ عقلی اور طبیعی طور پر بھی کوئی شرافت انسان ناپ تولیہ کی کہ ناپ اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ مال اور انجام اس کا بہتر ہے جس میں آخرت کا انجام اور حصول ثواب و حیات تو داخل ہے ہی اس کے ساتھ دنیا کے انجام کی بہتری کی طرف بھی اشارہ ہے کسی تجارت کو اس وقت تک فروغ نہیں ہو سکتا جب تک بازار میں اس کی ساکھ اور اعتبار قائم نہ ہو اور وہ اس تجارتی دیانت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تَقِفْ مَالِيكَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ

اور نہ بیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو بے شک کان اور آنکھ اور دل

كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ سُوْرًا ۝ وَلَا تَنْشِ فِي الْأَرْضِ مَرْحًا

ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی اور امت جیل نہیں پڑا کرتا تھا

إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ كُلُّ ذَٰلِكَ

تو جسٹ نہ ڈالے گا زمین کو اور نہ پہنچے گا پہاڑوں تک لمبا جو کر یہ جتنی باتیں ہیں

كَانَ مَعِيكَ عِنْدَ رَبِّكَ فَكَرِهًا ۝

ان سب میں جو کسی چیز سے تیرے رب کی بیزار تھی۔

خلاصہ تفسیر

اور جس بات کی جسکو تحقیق نہ ہو اس پر میں دست کیا کرو (کیونکہ) کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی قیامت کے دن پوچھ ہوگی (کہ) آنکھ اور کان کا استعمال کس کام میں کیا وہ کام اچھے تھے یا بُرے اور جس دلیل بات کا خیال دل میں کیوں جمایا اور زمین پر اتنا ہوا امت پل (کیونکہ) تو زمین پر زور سے پاؤں رکھ کر نہ زمین کو بھاگ سکتا ہے اور نہ اپنے بدن کو تان کر پہاڑوں کی بندھن کو پھینچ سکتا ہو پھر اتنا عیش پر سار سدا گورہ ہرے کام تیرے رب کے نزدیک بالکل ناپسند ہیں۔

معارف و مسائل

ان آیات میں دو حکم بارہ حوالہ اور تیرہ حوالہ عام معاشرت سے مطلق ہیں۔ بارہویں حکم

میں بغیر تحقیق کے کسی بات پر عمل کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

یہاں یہ بات سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تحقیق کے درجات مختلف ہوتے ہیں ایک ایسی تحقیق کہ یقین کامل کہ درجہ کو پہنچ جائے مخالفت جانب کا کوئی شبہ بھی نہ رہے دوسرے یہ کہ گمان غالب کے درجہ میں آجائے اگرچہ جانب مخالفت کا احتمال بھی موجود ہو اس طرح احکام میں بھی دو قسم ہیں ایک قطعیات اور یقینیات ہیں جیسے عقائد اور اصول دین، انہیں پہلے درجہ کی تحقیق مطابق ہے اس کے بغیر عمل کرنا جائز نہیں۔ دوسرے ظنیات جیسے فروعی اعمال سے متعلق احکام، اس تفصیل کے بعد تفصیلی آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ یقینی اور قطعی احکام میں تحقیق بھی درجہ اول کی ہو یعنی قطعیت اور یقین کامل کے درجہ کو پہنچ جائے اور جب تک ایسا ہو عقائد اور اصول اسلام میں اس تحقیق کا اعتبار نہیں اس کے تقاضی پر عمل جائز نہیں اور ظنی فروعی امور میں دوسرے درجہ یعنی ظن غالب کے درجہ کی تحقیق کافی ہے۔ بیان القرآن۔

کَانَ آتِكَ اور دل کے متعلق | رَانَ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ كُلٌّ اِذَا رَجَعَا اِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَتِ کے روز سوال میں بتلایا ہے کہ قیامت کے روز کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا

مطلب یہ ہے کہ کان سے سوال ہو گا کہ تو نے عمر میں کیا کیا سنا آنکھ سے سوال ہو گا کہ تمام عمر میں کیا کیا دیکھا دل سے سوال ہو گا کہ تمام عمر دل میں کیسے کیسے خیالات پکڑے اور کن کن چیزوں پر یقین کیا۔ اگر کان سے ایسی باتیں سنیں جنکا سننا شرعاً جائز نہیں تھا جیسے کسی کی غیبت یا حرام کھانا، بے نام وغیرہ یا آنکھ سے ایسی چیزیں دیکھیں جنکا دیکھنا شرعاً حلال نہ تھا جیسے غیر مہرم عورت یا مرد لڑکے پر نظر بد کرنا وغیرہ یا دل میں کوئی ایسا عقیدہ جمایا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو یا کسی کے متعلق اپنے دل میں بلا دلیل کوئی الزام قائم کر لیا تو اس سوال کے نتیجے میں گرفتار عذاب ہو گا قیامت کے روز اللہ کی دسی ہوئی ساری ہی نعمتوں کا سوال ہو گا۔ لَسْئَلُكَ يَوْمَئِذٍ عَنْ تَحْسِبُكَ یعنی تم سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی سب نعمتوں کا سوال ہو گا، کان، آنکھ، دل ان نعمتوں میں سب سے زیادہ اہم ہیں اس لئے یہاں ان کا خصوصیت سے ذکر فرمایا گیا ہے۔

تفسیر قرطبی اور ظہری میں اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے جملہ میں جو یہ ارشاد آیا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ یعنی جس چیز کا تمہیں علم اور تحقیق نہیں اس پر عمل نہ کرو، اس کے متعلق کان، آنکھ اور دل سے سوال کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بے تحقیق شہادت کسی شخص پر کوئی الزام لگایا اور بلا تحقیق کسی بات پر عمل کیا اگر وہ ایسی چیز ہے متعلق بہ نہ ہو کان، آنکھ، دل سے سوال ہو گا اور آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے تو آنکھ اور دل سے سمجھنے کی چیز ہے تو دل سے سوال ہو گا کہ جس شخص اپنے الزام اور اپنے دل میں جاسے ہوئے خیال میں سچا ہے یا جھوٹا اس پر انسان کے یہ اعضاء خود شہادت دیں گے جو شر کے میدان میں بے تحقیق الزام لگانے والے

نہیں ہو گا وہ آدمی جس کے دل میں فزہ کی بڑبڑتی کجی ہو گا۔ منظر ہی بھوالہ علیہ السلام اور ایک حدیث قدسی میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار جو شخص مجھ سے انکو چھیننا چاہے تو میں اسکو جہنم میں داخل کر دوں گا چادر اور ازار سے مراد لباس ہے اور اللہ تعالیٰ نہ ہم سے نہ جہان سے جسکے لئے لباس درکار ہو اس لئے اس سے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفت کہ پائی ہے جو شخص اس صفت میں اللہ تعالیٰ کا شریک بننا چاہے وہ جہنمی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کجی کرنے والے قیامت کے دن چھوٹی چیزوں کے برابر انسانوں کی شکل میں اٹھائے جاویں گے پھر ہر طرف سے ذات و خوار کی برکتی ہوگی ان کو جہنم کے ایک سیخانہ کی طرف ہانکا جائے گا جس کا نام بولیس ہے ان پر سب آگوں سے بڑی تیز آگ چڑھی ہوگی اور پینے کے لئے ان کو اہل جہنم کے بدن سے نکالا ہو اسیپا ہوا دیا جائے گا (ترمذی بروایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جابرہ از منظرہ)

ادھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر پر چڑھ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو سر بلند فرماتے ہیں تو وہ اپنے نزدیک تو چھوٹا مگر سب لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو شخص تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو ذلیل کرتے ہیں تو وہ خود اپنی نظر میں بڑا ہوتا ہے اور لوگوں کی نظر میں وہ کتے اور منہ زور سے بھی بڑا ہوتا ہے (مظہری) احکام مذکورہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخری آیتیں فرمائی گئیں کہ لَنْ يَنْفَعَكَ دِينَكَ وَالْجَنَّةُ بَعْدَ الدَّيْنِ مذکورہ تمام برے کام اللہ کے نزدیک مکروہ و ناپسند ہیں۔

مذکورہ احکام میں جو محرمات و منہیات ہیں ان کا بار اور ناپسند ہونا تو ظاہر ہے مگر انہیں کچھ احکام اور امر ہیں جیسے والدین اور اقرباء کے حقوق ادا کرنا اور وفائے عہد وغیرہ انہیں بھی چھوڑنا قصود ان کی طرف سے بچنا ہے کہ والدین کی ایذا سے زشتہ داروں کی قطع رحمی سے نفی عہد سے پرہیز کر دینے میں سب حرام و ناپسند ہیں اس لئے مجبوراً کہہ کر وہ فرمایا گیا ہے (بیان القرآن)

تنبیہ مذکورہ پندرہ آیتوں میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ ایک حیثیت سے اس سہی و عمل کی نشانی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغبول ہوں جسکا ذکر و شمار آیتوں سے پیش آ رہا ہے و سَلٰی لِحَاسْعَفٰی ہمیں یہ بتلایا گیا تھا کہ ہر سہی و عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغبول نہیں بلکہ ضرورت وہی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیم کے مطابق ہوں ان کے ہم میں اس مغبول سہی و عمل کے اہم ابواب کا ذکر کیا ہے جس میں پہلے حقوق اللہ کا پھر حقوق العباد کا بیان ہے۔

پندرہ آیتیں پوری تورات کا خلاصہ ہیں | حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پوری تورات کے احکام

سورۃ بنی اسرائیل کی پندرہ آیتوں میں جمع کر دیئے گئے ہیں (منظر ہی)

ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ

یہ ہے ان باتوں میں جو وحی تھی میری۔ یہ ہے تیری حکمتوں میں سے اور یہ تمہارا اللہ کے

اللَّهُ إِلَهًا آخَرَ فَتَلَفَتْ فِي جِهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا ۝۳۰

سوا کسی اور الٰہی بندگی کے تو روزِ آخر میں (اور ہم تمہارا دھکیلا جا کر

أَفْأَصْفَاكُمْ رَبُّكُمُ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا

کیا تم کو چن کر دے دیتے تمہارے رب نے بیٹے اور اپنے سے کریم فرشتوں کو بنیاں

إِنَّا كُنَّا نَقُولُونَ نُوَلِّ الْأَعْقِبِيَّ ۝۳۱ وَلَقَدْ عَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ

تم کہتے ہو بھاری بات اور یہ کہہ کر بھیجا ہم نے اس قرآن میں

لِيَذْكُرُوا أَنَّهُمْ يُزَيَّدُ هُمْ إِلَّا نَفُورًا ۝۳۲ قُلْ لَوْ كَانَ

تاکر وہ سوچیں اور ان کو زیادہ ہوتا ہے وہی بدگمان کہہ کر ہوتے اس کے

مَعَهُ إِلَهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذْ الْأُبُغُورُ إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ

ساتھ اور ماکم جیسا یہ بتاتے ہیں تو نکالنے صاحب عرش کی طرف سے

سَبِيلًا ۝۳۳ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝۳۴

راہ وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کی باتوں سے بے نہایت

نُسَبِّحُ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ وَإِن

اُس کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے اور

مِن نَّشَأٍ إِلَّا يَسْبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۝۳۵

چیز نہیں جو نہیں پڑھتی خیریاں اس کی سبکیں تم نہیں سمجھتے ان کا پڑھنا

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ۝۳۶

بے شک وہ ہے مہمل والا بخشنے والا -

خلاصہ تفسیر

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، یہ باتیں (یعنی احکام مذکورہ)، اس نکتہ میں کی ہیں جو خدا تعالیٰ

نے آپ پر حق سکڑا دیا ہے اور اسے غائب اور غائب سے مانتا تھا کوئی اور وجود تو بڑا کرنا دے نہ تو الزام خود داد اور رائے ہو کر جنہیں چھینا دیا جائے گا احکام مذکورہ کو شرم و عار کی توجہ کے مضمون سے کیا گیا تھا ختم بھی اسی پر کیا گیا اور اسے بھی اسی مضمون توحید کا بیان ہے کہ جب اوپر شرف کا نتیجہ اور باطن ہوتا ہے تو ایک ہی چیز ہے ایسی باتوں کے قائل ہوتے ہو جو توحید کے خلاف ہیں مثلاً یہ کہ ہر شے سے رب نے تم کو توفیقوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور خود فرشتوں کو اپنی ایشیاں بنائی ہیں جیسا کہ غیب کے ہاں فرشتوں کو اللہ کی جلیاں کی کرتے تھے جو وہ سے باطن ہے اول تو ات کے لئے اولاد قرار دینا پھر اولاد بھی لڑکیاں جن کو لوگ اپنے لئے پسند نہیں کرتے مگر وہ بگتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی طرف ایک اور نقص کی نسبت ہوتی ہے، بیشک تم بڑی بات کہتے ہو اور دانشور تو یہ سمجھ کر اس مضمون توحید اور شرف کے ابطال کو ہر سہ اس قرآن میں طوطا طوطا سے بیان کر دیا ہے تاکہ اچھی طرح سمجھیں اور مختلف طریقوں سے بار بار توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کے باوجود توحید سے ان کو نفرت نہ ہو برحق جاتی ہے آپ و ابطال شرک کے لئے ان سے اذیت کرنا اس وجود برحق کے ساتھ اور وجود بھی (شریک) ہونے سے یہ لوگ کہتے ہیں تو اس حالت میں عرض واسطے مختلف فیہ خدا ایک افروز رہی و نہ کہ وجودوں نے بھی کہا) راستہ دھو لیا ہوتا یعنی بن کو تمام اس کے ساتھ خدائی کا شریک قرار دیتے ہو اگر وہ واقعی شریک ہوتے تو عرش واسطے خدا پر چڑھائی کر دیتے اور راستہ دھو لیتے اور جب خداؤں میں جنگ ہو جاتی تو دنیا کا نظام کس طرح چلتا جس کا ایک خاص نظام حکم کے ساتھ چلنا ہر شخص شاہد کہ رہا ہے اس سے نظام عالم کا کس طرح چلتا رہتا خدا اس کی دلیل ہے کہ ایک خدا کے ہوا کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے اس سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور اس سے بہت زیادہ بالا و برتر ہے وہ ایسا پاک ہے کہ تمام ساتوں آسمان اور زمین اور جتنے فرشتے آدمی اور جن ان ہیں موجود ہیں سب کے سب تالیا یا تالیا اس کی پاکی بیان کر رہے ہیں اور یہ تسبیح صرف عقل واسطے انسان اور جن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ زمین و آسمان کی کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہ کرتی ہو لیکن تم لوگ ان کی تسبیح و پاکی بیان کر لگو، کہتے نہیں ہو بیشک وہ بڑا علیم بڑا غفور ہے۔

معارف و مسائل

توحید کی جو دلیل آیت اذ لا یستحوٰ ایں بیان فرمائی ہے کہ اگر تم سمجھو کہ عالم کا خالق ایک اور مختلف صورت ایک ذات اللہ کی ہو بلا اس خدائی میں اور بھی شریک ہے تو ضرور سمجھ کر نہیں سمجھیں اختلاف بھی ہو گا اور اختلاف کی صورتیں سامان نظام عالم پر بادیہ ہو جائے گا کیونکہ ان سب میں دائمی

صلح ہونا اور ہمیشہ باقی رہنا عادتہ منتخبت ہے یہ دلیل یہاں اگرچہ انتہائی انداز میں بیان کی گئی ہے مگر علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کا برہانی اور منطقی ہونا بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اہل علم و اہل دیکھ سکتے ہیں۔

زمین و آسمان اور ان میں موجود تمام چیزوں کے تسبیح کرنے کا مطلب | ان چیزوں میں فرشتے سب کے سب اور انسان و جن و دھن ہیں ان کا اللہ کی تسبیح کرنا تو بدیہی ہے بھی جانتے ہیں کافر انسان اور جن جو بظاہر تسبیح نہیں کرتے اسی طرح عالم کی دوسری چیزیں جنکو کیا جاتا ہے کہ ان میں عقل و شعور نہیں ہے ان کے تسبیح پر غصے کا مطلب کیا ہے بعض علماء نے فرمایا کہ ان کی تسبیح سے مراد تسبیح حال یعنی ان کے حالات کی شہادت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا مجموعی حال بتلا رہا ہے کہ وہ نہ اپنے وجود میں مستقل ہے نہ اپنے باقی رہنے میں وہ کسی بڑی قدرت کے تابع چل رہا ہے یہی شہادت حال اس کی تسبیح ہے۔

مگر دوسرا اہل تحقیق کا قول یہ ہے کہ تسبیح انتہائی تو صریح فرشتے اور مومن جن وانس کے لئے مخصوص ہے مگر ”تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنا تسبیح خواں بنا رکھا ہے“ کا فہمی اول تو عموماً خدا تعالیٰ کو ماننے اور اس کی عظمت کے قائل ہیں اور جو مادہ پرست دہریے یا آجکل کے کیڑے خدا کے وجود کے بظاہر قائل نہیں مگر ان کے وجود کا ہر جز جو جبریں طور پر اللہ کی تسبیح کر رہا ہے جیسے درخت اور پتھر کی وغیرہ سب چیزیں تسبیح حق میں مشغول ہیں مگر ان کی یہ تسبیح جو جبری اور تکوینی ہے یہ عام لوگ سنتے نہیں قرآن کریم کا ارشاد دیکھو لَا تَقْضُوا فَلَاحًا وَلَا فُلُوحًا اِنْ تَبْغُوا فَتًى يَسْعٰی دلائل کرتا ہے کہ یہ ہر ذرہ ذرہ کی تسبیح تکوینی کوئی ایسی چیز ہے جسکو عام انسان سمجھ نہیں سکتے تسبیح جمالی کو تو اہل عقل و فہم جان سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ تسبیح صرف جمالی نہیں حقیقی ہے مگر ہمارے فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ (ذکرہ القزلبی)

حدیث میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مجزہ مذکور ہے کہ آپ کی ٹٹھی میں کنکروں کا تسبیح کرنا صحابہ کرام نے کانوں سے سنا اس کا مجزہ ہونا تو ظاہر ہے مگر فصاحت کبریٰ میں شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ نے فرمایا کہ کنکروں کا تسبیح پڑھنا حضور کا مجزہ نہیں وہ تو جہاں کہیں بھی ہیں تسبیح پڑھتی ہیں بلکہ مجزہ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے دست مبارک پر آنے کے بعد ان کی وہ تسبیح کانوں سے سنی جانے لگی۔

امام قزلبی نے اسی تحقیق کو راجع قرار دیا ہے اور اس پر قرآن و سنت کے بہت دلائل پیش کئے ہیں مثلاً سورہ ہود میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے اِنَّا عَلَّمْنَاهُ اِلْقَالَ مَعْلَیْہِ بِالْبَیِّنِ وَ اِلْقَالَ اَب (یعنی ہم نے پہاڑوں کو سنا کر دیا کہ وہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ صبح و شام تسبیح کرتے ہیں اور

سورۃ بنی اسرائیل کے پہلے دوں کے پھر دوں کے متعلق اشارہ ہے ان میں سے ایک کھٹکتا ہے خشیۃ اللہ یعنی پہاڑ کے بعض پتھر اللہ کے خوف سے ہلنے لگ جاتے ہیں جن سے پتھروں میں شعور و ادراک اور خدا کا خوف ہوتا ثابت ہوا اور سورۃ صافات میں قصص کے تحت میں مدیہ الہیہ کو خدا کا بیٹا کہنے کو نردیہ میں فرمایا و تفرجوا لعلکم ترحموا یعنی یہ لوگ اشر کیسے بیٹا تجویز کرتے ہیں انکے اس عمل کو کفر سے پہاڑ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ گرنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ خوف انکے شعور و ادراک کا پتہ دیتا ہے اور شعور و ادراک کے بعد تسبیح کرنا کوئی اور شے نہیں رہتا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ سے کہتا ہے کہ اس فلاں کی تیسے اوپر کوئی ایسا آدمی گذرے جو اللہ کو یاد کرنے والا ہو اگر وہ کہتا ہے کہ اس تو یہ پہاڑ اس سے خوش ہوتا ہے پھر استدلال کے لئے حضرت عبداللہ بن مسعود نے یہ آیت پڑھی و قالوا اتخذ الرحمن ولداً اور پھر فرمایا کہ جب اس آیت سے یقین ہو کہ پہاڑ کلمات کفر سننے سے متاثر ہوتے ہیں ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ باطل کلمات کو سننے میں حق بات اور ذکر اللہ نہیں سنتے اور اس سے متاثر نہیں ہوتے قرطبی جو روایتی ابن مبارک اور مولی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بن اور انسان درودِ رحمت اور تحیر اور گھبراہٹ الیا نہیں جو موقد کی آواز سنتا ہے اور قیامت کے روز اس کے ایمان اور نیک ہونے کی شہادت ہے۔ مولی امام مالک و سنن بن ماجہ بروایت ابی سعید خدری رضی

امام بخاری نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود نقل کیا ہے کہ ہم نے اس کی تسبیح کی آواز سن کر تے تے جبکہ وہ کھایا جا رہا تھا اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح کی آواز سن کر تے تے اور تسبیح مسلم میں بروایت حضرت جابر بن عبد اللہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مکہ مکرمہ کے اس پتھر کو چاہتا ہوں جو جنت و نہشت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں اب بھی اس کو چاہتا ہوں جس منکرات نے کہا کہ اس سے مراد حجر اسود ہے واللہ اعلم۔

امام قرطبی نے فرمایا کہ روایات حدیث اس طرح کے معجزات میں بہت ہیں اور اسطرح خانہ کی حکایت تو ہم مسلمانوں کی زبان زدِ سب سے کہنے کی آواز صحابہ کرام نے سنی جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے وقت اسکو چھو کر زنبیر بن جحش نے یہاں شروع کیا۔

ان روایات کے بعد اسکی کیا اہمیت ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز میں شعور و ادراک ہے اور ہر چیز حقیقی طور پر ان کی تسبیح کرتی ہے اور ہر چیز اپنے لئے فرمایا کہ یہ تسبیح عام ہے ذی و عیون چیزیں ہیں جسکی درغیر انکی روئے چیزیں ہیں جسکی یہاں تک کہ دروازے کے کواڑوں کی آوازیں بھی تسبیح

یہ تمام قرآنی نغمے فرمایا کہ قرآنی نغمے سے ہر وقت جان ہوتی تو مذکورہ آیت میں حضرت ادا کی کیا تفسیر
 دینی تفسیر والی تو ہر زمانہ کی شہرہ پر ہر چیز سے معلوم کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوا ہے کہ یہ تفسیر قولی تفسیر اور
 اور یہاں کہ اور اس تفسیر کی بھی اور پتہ کیا ہے کہ انکسوں کا تفسیر پر ہر چیز نہیں وہ ہر جگہ ہر حال اور
 ہر وقت میں رہتے آتھیں تفسیر میں اس تفسیر و ہم کا ہر چیز یہ تھا کہ اپنے کے دوست مبارک میں اس کے
 بعد ان کی تفسیر میں اس طرح ہو گئی کہ عام لوگوں نے کانوں سے نہ سنی تھی پہلوؤں کی تفسیر بھی سنت
 داد و علیہ السلام کا ہر چیز اسی حیثیت سے ہے کہ ان کے ہر چیز وہ تفسیر کانوں سے سننے کے قابل
 ہو گئی والہ اعلم

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور جب تو پڑھتا ہے قرآن کرہ تو ہم تجھ میں تیرے اور ان لوگوں کے جو نہیں

يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ جَعَلْنَا مَسُورًا ۝۱۰ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ

ساتھ آخرت کو ایک پردہ چھپا ہوا اور ہم رکھتے ہیں ان کے دلوں پر

أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِذَا ذُكِّرْتُ

پردہ کر اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ اور جب ذکر کرتا ہے تو

رَبِّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَكَ وَلَوْ أَنَّ عَلَىٰ آذَانِهِمْ لَقُورًا ۝۱۱

قرآن میں اپنے رب کا اکیلا کر کہ بھانٹتے ہیں اپنی ہیئت پر ایک کہ

لَخَنَّ آعَابُهُمْ يَسْتَفْتِعُونَ بِكَ إِذْ يَسْتَفْتِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ خَوَّضُونَ

ہم خوب جانتے ہیں جس واسطے مدد سے ہیں میں وقت کان رکھتے ہیں تیری طرف اور اب وہ دھڑکتے

إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنْ تَشَاءُ نَحْنُ غَافِلُونَ ۚ أَلَمْ تَنْظُرْ

میں جبکہ کہتے ہیں اے ظالمین اگر تم چاہو تو ہم غافل ہیں کیا تم نے نہ

كَيْفَ ضَرَبْتَ بَنِي إِسْرَءِيلَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ۝۱۲

کیسے جھڑپتے ہیں تم پر مثلیں اور جیسے پھرتے ہیں سو راہ نہیں پاسکتے

خلاصہ تفسیر

ماہذ آیات میں یہ ذکر تھا کہ توحید کا عقیدہ قرآن مجید میں مختلف عنوانات و مختلف درجوں کے

ساتھ بار بار ذکر ہونے کے باوجود یہ بدشیرب مشرکین، سکون نہیں مانتے، ان آیات میں ان کے نہ ماننے کی وجہ بتلائی گئی ہے کہ یہ ان آیات میں غور و فکر ہی نہیں کرتے بلکہ ان سے نفرت اور تمسخر کرتے ہیں اس لئے ان کو علم حقیقت سے اندھا کر دیا گیا ہے، خلاصہ تفسیر یہ ہے۔

اور جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ پردہ یہ ہے کہ ہم ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیتے ہیں اس سے کہ وہ اس قرآن کے مقصود کو سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوتھو ڈال دیتے ہیں اس سے کہ وہ ان کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے ہمیں مطلب یہ ہے کہ وہ پردہ ان کی ناہمی کا اور اس کا ہے کہ وہ سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے جس سے وہ آپ کی شان نبوت کو پہچان سکیں اور جب آپ قرآن میں صحت اپنے رب (کے اوصاف و کمالات) کا ذکر کرتے ہیں اور یہ لوگ جن معبودوں کی عبادت کرتے ہیں انہیں وہ اوصاف ہی نہیں، تو وہ لوگ (اپنی ناہمی بلکہ کفر) کے جب اس سے نفرت کرتے ہوئے پشت پھیر کر چلے جاتے ہیں، آگے ان کے اس عمل بالکل پروہید ہے کہ جس وقت یہ لوگ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں جس غرض سے یہ (قرآن کو) سنتے ہیں اگر وہ غرض محض اعتراض اور طعن و تکتہ چینی کی ہے، اور جس وقت یہ لوگ قرآن سنتے ہیں، بعد ازاں میں مگر و ثنیاں کرتے ہیں، ہم اس کو بھی خوب جانتے ہیں، جبکہ یہ ظالم یوں کہتے ہیں کہ تم لوگ نبی ان کی برادری میں سے ہو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگ گئے ہیں، محض ایسے شخص کا ساتھ دے رہے ہو جس پر جادو کا نفاذ تھا، (تو) یعنی جنوں کا) ہو گیا ہے (یعنی یہ جو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں یہ سب سنا لیا ہے، اسے کہہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا) آپ دیکھتے تو یہ لوگ آپ کے لئے کیسے کیسے القاب تجویز کرتے ہیں سو یہ لوگ بالکل ہی گمراہ ہو گئے تو اب حق کا راستہ نہیں پاسکتے کیونکہ ایسی ہٹ دھرمی اور فتنہ اور کھراڑا کہ رسول کے ساتھ ایسا معاملہ اس سے انسان کی استفادہ و فہم و ہدایت سلب ہو جاتی ہے۔

معارف و مسائل

پہنچہ پر جادو کا اثر ہو جانا ایسا ہی ممکن ہے جیسا بیماری کا اثر ہو جانا اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام بشر ہی تھے اس سے الگ نہیں ہوتے جیسے ان کو زہم لگ سکتا ہے، نار و درد ہو سکتا ہے ایسے ہی جادو کا اثر بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی خاص اسباب بطریقہ ہست و غیرہ کے اثر سے ہوتا ہے اور حدیث میں ثابت بھی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر کا اثر ہو گیا تھا آخری آیت میں جو کفار نے آپ کو کھراڑا کر دیا، اور قرآن نے اسکی تردید کی اسکا حاصل

وہ سبہاں کی طرف خلاصہ تفسیر میں اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ان کی مراد درحقیقت مسجور رکھنے سے مجتہدین کو بھٹکانے کی نیر دید قرآن نے فرمائی ہے اس لئے حدیث سحر اسکے خلاف اور متعارض نہیں۔

آیات مذکورہ میں سے پہلی دو دوسری آیت میں جو مثنویں آیات ہیں ایک خاص شان نزول ہے جو قرآن میں نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ جب قرآن میں سورہ تہمت پڑھا ابی اہب نماز پڑھ رہا تھا اس نے ابی اہب کی بیوی کی بھی خدمت میں بلایا اس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں گئی اس وقت سعید بن جبیر بھی وہاں تھے اس کو دور سے دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا کہ آپ یہاں سے اٹھ جائیں تو بہت سی عورت بڑی بد زبان بن رہی ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا نہیں اس کے اوپر میرے درمیان اللہ تعالیٰ پروردگار کر دیں گے چنانچہ وہ مجلس میں بھی نہ رہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکی تو صدیق اکبر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ آپ کے ساتھی نے ہمارے بیوی کی بہت بدایق اکبر نے فرمایا کہ واللہ وہ تو کوئی شہر بھی نہیں کہتے جیسے عادتہ جو کہ باقی ہے تو وہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ تم جو انکی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو اس کے چلے جانے کے بعد صدیق اکبر نے عرض کیا کہ کیا اس نے

آپ کو نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ یہاں رہی ایک فرشتہ نیت ہے اور اس کے درمیان پرودہ گزرا یا دشمنوں کی نظر سے مستور رہنے کا ایک عمل

[illegible]

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ میں نے ملک شام کے ایک شخص سے بیان کیا اسکو کس مندرت سے رومیوں کے ملک میں جانا تھا وہاں گیا اور ایک زمانہ تک وہاں مقیم رہا پھر وہی کفار نے اسکو ستایا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا ان لوگوں نے اسکا تعاقب کیا اس شخص کو وہ روایت یاد آئی اور مذکورہ تین آیتیں پڑھیں قدرت نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ جس راستہ پر پہل رہے تھے اس راستہ پر دشمن گذر رہے تھے مگر وہ ان کو نہ دیکھ سکتے تھے امام شعبی کہتے ہیں کہ حضرت کعب سے جو روایت نقل کی گئی ہے میں نے اسے کہہ سنا۔
 واسطہ ایک شخص کو بتلانی اتفاق سے ولیم کے کفار نے اسکو گرفتار کر لیا کچھ عرصہ ان کی قید میں رہا پھر

أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا ۝ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ

نزدیک ہی ہوگا جس دن تم کو پکارے گا پھر چہ آوازے اس کی تعریف کرتے ہوئے

وَتُظُنُّونَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۝

اور اکل کرو گے کہ دیر نہیں لگی تم کو مگر غلطی

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم (مکہ) بنیاں اور اہل یوں کا بھی پھر راہی دینے دینے رہے ہوں
جاویں گے تو کیا اس کے بعد قیامت میں ہم از سر نو پیدا اور زندہ گئے جاویں گے یعنی اول
تو مر کر زندہ ہونا ہی مشکل ہے کہ جسم میں زندگی کی صلاحیت نہیں رہی پھر جلد وہ جسم بھی ریزہ ریزہ
ہو کر اس کے اجزاء منتشر ہو جاویں تو اس کے زندہ ہونے کو کون مان سکتا ہے آپ ان کے
جواب میں فرمادیتے کہ تم تو ہڈیوں ہی کی حیات کو بعید سمجھتے ہو اور ہم کہتے ہیں کہ تم پتھر یا
لوا یا اور کوئی ایسی مخلوق ہو کر دیکھ لو جو تھارے ذہن میں (زندگی کی صلاحیت سے بہت ہی
بعید ہو پھر دیکھو کہ زندہ گئے جاؤ گے یا نہیں اور پھر اور لوہے کو بعید از حیات قرار دینا اس کے خلاف
ہے کہ انہیں کسی وقت بھی حیات حیوانی نہیں آتی خلافت ہڈیوں کے کہ ان میں پہلے اس وقت تک
حیات رہ چکی ہے تو جب پھر لوہے کا زندہ کرنا اللہ کے لئے مشکل نہیں تو اعضا کے انسانی کو دوبارہ
زندگی بخش دینا کیا مشکل ہو گا اور آیت میں لفظ کوذا جو بعید امر ہے اس سے مراد بنیاں اور نہیں
بلکہ ایک تعاقب اور شرط ہے کہ اگر تم باغرض پتھر اور لوا بھی پھاؤ تو اللہ تعالیٰ پھر بھی تمہیں دوبارہ زندہ کر دینے
پر قادر ہے اس آیت پر نہیں گے کہ وہ کون ہے جو دوبارہ ہم کو زندہ کرے گا آپ فرمادیتے کہ وہ وہ ہے جس نے
تم کو اول بار میں پیدا کیا تھا اصل بات یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود میں آنے کے لئے دو چیزیں درکار
ہیں ایک مادہ اور دوسری قیامت دومرے اس کو وجود میں لانے کے لئے قوت فاعلہ
پہلا سوال عمل کی قابلیت تھا کہ وہ مرنے کے بعد زندگی کے قابل نہیں رہا اس کو جو آ
دیکر عمل کی قابلیت ثابت کر دی گئی تو یہ دوسرا سوال فاعلیت کے متعلق کیا گیا کہ ایسا کونسا قوت و
قدرت والا ہے جو اپنی قوت فاعلیت سے یہ عجیب کام کر سکے اس کے جواب میں فرمادیا گیا کہ جس نے
پہلے تمہیں ایسے مادے سے پیدا کیا تھا جس میں قابلیت حیات کا کسی کو گمان بھی نہ تھا تو اس کو دوبارہ
پیدا کر دینا کیا مشکل ہے اور جب فاعل و فاعل دونوں کا سوال حل ہو گیا تو اب یہ لوگ نہ مانے
دفعہ کی تحقیق کے لئے آپ کے آگے سر مبارک رکھیں گے کہ اچھا یہ بتلائیے کہ یہ زندہ ہونا

وَالْأَرْضِ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۝

اور زمین میں اور ہم نے افضل کیا ہے بعض پیغمبروں کو بعضوں سے اور دی ہم نے داؤد کو زبور۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ میرے مسلمان بندوں سے کہہ دیجئے کہ اگر کفار کو جواب دیں تو ایسی بات کہیں جو انفاق کے اعتبار سے بہتر ہو یعنی ان میں سب و شتم اور تشدد اور اشتغال انگیزی نہ ہو کیونکہ شیطان سخت بات کہہ کر لوگوں میں فساد ڈال دیتا ہے۔ واقعی شیطان انسان کا کمال دشمن ہے اور وہ جو اس تعلیم کی یہ ہے کہ سختی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور ہدایت و گمراہی تو جنت ازلیہ کے تابع ہے، تم سب کا حال تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون کس قابل سے ہے، اگر وہ پاب تو تمہاری سے ہیں، پراپا ہے رحمت فرمادے (یعنی ہدایت کر دے) یا اگر وہ چاہے تو تم (میں سے جس) کو چاہے، عذاب دینے لگے (یعنی اسکو توفیق اور ہدایت نہ دے) اور ہم نے آپ (کے) کو ان کی ہدایت کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا اور جب باوجود نبی ہونے کے آپ ذمہ دار نہیں بنائے گئے تو وہ سمجھیں کہ کیا مجال ہے اس لئے کسی کے درپے ہونا اور سختی کرنا ہے فائدہ ہے۔

اور آپ کا رب خوب جانتا ہے ان کو دیکھی، جو کہ آسمانوں میں ہیں اور ان کو بھی جو کہ زمین میں ہیں، آسمان والوں سے مراد فرشتے اور زمین والوں سے مراد انسان اور جنات ہیں مطلب یہ کہ ہم خوب واقف ہیں کہ ان میں سے کس کو نبی اور رسول بنانا مناسب ہے کس کو نہیں اس لئے اگر ہم نے آپ کو نبی بنا دیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اور راسخ طبع اگر ہوتے آپ کو دوسروں پر فضیلت دینے کی تو تعجب کیا ہے کیونکہ ہم نے پہلے بھی بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور اسی طرح اگر ہم نے آپ کو قرآن دیا تو تعجب کی کیا بات ہے کیونکہ آپ سے پہلے ہم داؤد کو زبور دے چکے ہیں۔

معارف و مسائل

بدزبانی اور سخت کلامی | پہلی آیت میں جو مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ سخت کلامی سے منع کیا گیا ہے اسکی مراد یہ ہے کہ بے منہ و رت سختی نہ کی جائے اور نہ دُرا ہو تو قتل تک کرنے کی اجازت ہے۔

کہ بے حکم شرع آب خوردن خطاست و اگر خون بختوا کی بریزی رواست

قتل و قتل کے ذریعہ کفر کی شوکت اور اسلام کی مخالفت کو دبایا جاسکتا ہے اس لئے اسکی اجازت ہے۔ گمانی گلوٹ اور سخت کلامی سے نہ کوئی قلعہ فتح ہوتا ہے نہ کسیکو ہدایت ہوتی ہے اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔ امام قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ میں نازل ہوئی جسکی صورت یہ تھی کہ کسی شخص نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو گالی دی اس کے جواب میں انھوں نے بھی اسکو سخت جواب دیا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا اس کے نتیجہ میں خطرہ پیدا ہو گیا کہ دو قبیلوں میں جنگ چھڑ جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور قرطبی کی تحقیق یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو آپس میں خطاب کرنے کے متعلق ہدایت ہے کہ باہم اختلاف کے وقت سخت کلامی نہ کیا کریں کہ اس کے ذریعہ شیطان ان کے آپس میں جنگ و فساد پیدا کر دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَآذَوْا مُؤْمِنًا سِرًّا - یہاں خاص طور پر زبور کا ذکر شاید اس لئے کیا گیا ہے کہ زبور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ خبر دی گئی ہے کہ آپ رسول و پیغمبر ہونے کے ساتھ صاحب ماکہ و سلطنت بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے **وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ** **أَنْ أَتَىٰ حَكِيمٌ نَّسْرَ عِبَادِي الضَّالِّينَ** اور زبور میں بھی بعض حضرات نے اس کا ذکر ہونا ثابت کیا ہے۔ (تفسیر حقانی)

امام بخاری نے اپنی تفسیر میں اس جگہ لکھا ہے کہ زبور اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی انھیں ایک سو پچاس سورتیں ہیں اور تمام سورتیں صریح دعا و حمد و ثناء پر مشتمل ہیں انھیں حلال و حرام اور فراغ و حدود کا بیان نہیں ہے۔

قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضَّرِّ

کہہ پکارو جن کو تم کہتے ہو سوائے اُس کے سو وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کول دین سکین کہ

عَنْكُمْ وَلَا تَحْزَنْ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ

تم سے اور نہ بدل دیں وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے

رَبِّهِمْ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ

بے شک وہ سب کو نسا بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اسکی مہربانی کی اور ڈرتے ہیں

عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ۚ وَإِنْ مِنْ

اسکے عذاب کے بے شک قہر ہے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے اور کوئی بستی نہیں

کا ذریعہ بنایا جائے اور اللہ کے لئے وسیلہ یہ ہے کہ علم و عمل میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ہر قسم کی عداوت و کفر و
 احکام اللہ تعالیٰ کی پابندی کو اسے مطلوب ہے کہ یہ سب حضرات اپنے عمل صالح کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے
 تقرب کی طلب میں لگے ہوئے ہیں۔

لَرَجُلٌ وَاسْتَفْتَاهُ رَبُّهُ قَوْلًا تَدْعَاهُ فَأَنذَرْتَهُ قَوْلًا فَاسْتَفْتَاهُ قَوْلًا تَدْعَاهُ فَأَنذَرْتَهُ قَوْلًا فَاسْتَفْتَاهُ قَوْلًا تَدْعَاهُ
 اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ابد و ابد بھی رہنا اور اسے بھی رہنا یہ انسان کے دو ممکنہ حال ہیں جب یہ
 دونوں ہمارے درجے میں رہیں تو انسان سمجھ کر اپنے چاروں طرف سے گریز سے کوئی ایک مغلوب ہو جائے
 تو اسی مقدار سے انسان کے اعمال میں شریعت جاتی ہے۔ (قریبی)

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ كَذِبَ كِبَارٍ كَالَّذِينَ

اور ہم نے اس لئے موقوف نہیں کیا انہیں کہ انہوں نے ان کو جھٹلایا۔

أَتَيْنَا شُرُودَ النَّاقَةِ مُبْصِرًا فَظَلَمُوا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ

ہم نے دی تو وہ کو اذیتوں کے لئے کو ہر ظلم کیا جس پر اور نشانیاں جو ہم بھیجتے ہیں۔

تَحْوِيلًا ۝ وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّسُلَ

دہانے کو۔ اور جب کہ دیا ہم نے تجھے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اور وہ دیکھو اور جو تم کو

الَّتِي أَمْرُكَ الْأَفْتِدَّةَ لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ

دیکھا ہم نے سوچا تجھے کو لوگوں کے اور ایسے ہی وہ دشت جس پر پھرتے ہیں قرآن میں

وَنَحْنُ نَزِّلُهَا فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ۝

اور ہم ان کو لاتے ہیں تو ان کو زیادہ ہوتی ہے بڑی مشرکت۔

۱۰۰

خلاصہ تفسیر

اور ہم کو فاسد فرمایا اشیاء عجرات کے حیثیت سے یہ بات مانع ہے کہ پہلے لوگ
 ان کے ہم جنس فرمایا اشیاء عجرات کی تکذیب کر چکے ہیں اور مزاج و طبائع سب کافروں کے ملتے
 جلتے ہیں تو ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی تکذیب کر چکے، اور انہوں نے ان کو یہ بھی سمجھ لیا کہ ہم نے
 قوم خود کو ان کی فرمائش کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے طور پر، دینی دینی جو
 عجیب طور پر پیدا ہوئی اور جو کہ معجزہ ہونے کے سبب انہیں انجیریت کا ذریعہ بنی لوگوں

نے اس سے بصیرت حاصل نہ کی بلکہ اس کے ساتھ ظلم کیا کہ اس کو قتل کر ڈالا تو ظاہر یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کے فرمائشی معجزے دکھلائے گئے تو یہ بھی ایسا ہی کریں گے، اور ہم ایسے معجزات کو صرف اس بات سے ڈرانے کے لئے بھیج کر رہے ہیں کہ اگر یہ فرمائشی معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لاؤ گے تو فوراً ہلاک کر دئے جاؤ گے اور ہوتا یہی رہا ہے کہ بن لوگوں کے فرمائشی معجزات دکھلائے گئے وہ ایمان تو لائے نہیں ہیں معاملہ ان کی ہلاکت اور عذاب عام کا سبب بن گیا اور حکمت الہیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ لوگ ابھی ہلاک نہ کئے جاویں اس لئے ان کے فرمائشی معجزات نہیں دکھلائے جاتے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو ان لوگوں کو پہلے پیش آچکا ہے جس کا ذکر یہ ہے کہ آپ وہ وقت یاد کر لیجئے جبکہ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کا رب اپنے علم سے تمام لوگوں کے احوال ظاہر و باطنہ موجودہ و مستقبلہ کو محیط ہے اور احوال مستقبلہ میں ان کا ایمان نہ لانا بھی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جسکی ایک دلیل نہیں کا یہ واقعہ ہے کہ ہم نے واقعہ معراج میں جو تماشا بحالت بیداری آپ کو دکھلایا تھا اور جس درخت کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے (یعنی زقوم جو طعام کفار ہے) ہم نے ان دونوں چیزوں کو ان لوگوں کے لئے موجب گمراہی کر دیا یعنی ان لوگوں نے ان دونوں امر کو شکر تکذیب کی معراج کی تکذیب تو اس بنا پر کی کہ ایک رات کی قلیل مدت میں ملک شام جانا اور پھر آسمان پر جانا ان کے نزدیک ممکن نہ تھا اور شجرہ زقوم کی تکذیب اس بنا پر کی کہ اسکو دوزخ کے اندر بتلایا جاتا ہے آگ میں کوئی ذرت کیسے رہ سکتا ہے اگر موجدی تو جل جائے گا حالانکہ نہ ایک رات میں اتنا طویل سفر طے کرنا عقلاً محال ہے نہ آسمان پر جانا ناممکن ہے اور آگ کے اندر درخت کا وجود ان کی سمجھ میں نہ آیا حالانکہ کوئی محال بات نہیں کہ کسی درخت کا مزاج ہی اللہ تعالیٰ ایسا بنا دیں کہ وہ پانی کے بجائے آگ سے پرورش پائے پھر فرمایا، اور ہم ان لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں لیکن ان کی بڑی سرکشی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے شجرہ زقوم کے انکار کے ساتھ یہ لوگ استہزاء بھی کرتے تھے جس کا بیان مع زائد تحقیق کے سورۃ صافات میں آئے گا

معارف و مسائل

وَمَا جَعَلْنَا الزُّمَرِ بِأَلْسِنَةٍ أَرْبَعًا إِلَّا فِتْنَةً لِّمَا فِيهِمْ - یعنی شب معراج

میں جو تماشا ہم نے آپ کو دکھلایا تھا وہ لوگوں کے لئے ایک فتنہ تھا، لفظ فتنہ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کے ایک معنی وہ ہیں جو خلاصہ تفسیر میں لئے گئے ہیں گمراہی، ایک معنی آزمائش کے بھی آئے ہیں ایک معنی کسی ہنگامہ فساد کے پر پام ہونے کے بھی آئے ہیں یہاں ان سب معانی کا احتمال ہے حضرت عائشہ اور معاویہ اور حسن اور مجاہد وغیرہ ائمہ تفسیر نے

اس جگہ نکتہ ہے مراد یہی آخری معنی لئے ہیں اور فرمایا کہ یہ نکتہ ارتداد کا تھا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر جانے اور صبح سے پہلے واپس آنے کا ذکر کیا تو بہت سے نو مسلم لوگ تھیں ایمان نہ رکھ سکتے تھے اس کلام کی تکذیب کر کے مرتد ہو گئے۔ قرطبی اسی واقعہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لفظ رُغْیَا عربی زبان میں اگرچہ خواب کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن اس جگہ مراد خواب کا نکتہ نہیں کیونکہ ایسا ہوتا تو لوگوں کے مرتد ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں بنتی خواب تو ہر شخص ایسے دیکھ سکتا ہے جگہ اس جگہ مراد رُغْیَا سے ایک واقعہ عجیبہ کا حالت بیداری دکھانا ہے آیت مذکورہ کی تفسیر میں بعض حضرات نے اسکو واقعہ معراج کے سوا دوسرے واقعات پر بھی عمول کیا ہے مگر مجموعی اعتبار سے یہاں منطبق نہیں ہوتے اس لئے جمہور نے واقعہ معراج ہی کو اس آیت کا محمل قرار دیا ہے۔ (کما فصلہ القرطبی)

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس

قَالَ أَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ۖ قَالَ أَرَأَيْتَ هَذَا

بول کیا میں سجدہ کروں ایک شخص کو جسکو تو نے بنایا مٹی کا کہنے لگا بھلا دیکھ لو یہ شخص

الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَىٰ زَلَّاتٍ ۖ أَخْرَجْتَنِي إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا حُتَنَ لَكَ

جس کو تو نے مجھ سے بڑھا دیا اگر تو مجھ کو ڈھیل دیوے قیامت کے دن تک تو میں اُن کی اولاد

ذُرِّيَّتِهِ إِلَّا قَلِيلًا ۖ قَالَ أَذْهَبُ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ

کوڑھانتی دے لوں مگر تھوڑے سے فرمایا جا یہ جو کوئی تیرے ساتھ ہوا اُن میں سے سو

جَهَنَّمَ جَزَاءُ ۖ وَكَفَّ جَزَاءُ مَوْفُورًا ۖ وَاسْتَفِزُّ مِمَّنِ اسْتَطَعْتَ

دوزخ ہے تم سب کی سزا بدلہ لینا اور گھیر لے اُن میں جس کو تو

مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمُ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكِهِمْ

تیرا لے اپنی آواز سے اور لے آ اُن پر اپنے سوار اور پیادے اور ساتھ

فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمْ

اُن سے مال اور اولاد میں اور وعدہ دے اُن کو اور کچھ نہیں وعدہ دیتا اُن کو

الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ إِنَّ عِبَادِي لَإِيَّائِي لَآتٍ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ

شیدان مگر دعا بازی وہ جو میرے بندے ہیں اُن پر نہیں ہے تیری حکومت

وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ﴿٥٠﴾

اور بخیر کمالی ہے کام بنانے والا۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے، جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان
سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انہی اور کہا کہ کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کا آپ نے مٹی
سے بنایا ہے (اس پر مردود ہو گیا اس وقت) کہنے لگا کہ اس شخص کو جو آپ نے بھیجی ہو قیامت (میں
سے) اور اسی بنا پر اس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے، تو مجھ کو بتا دیجئے تو (اس میں کیا نصیحت ہے
جسکی وجہ سے میں مردود ہوا) اگر آپ ایم کی درخواست کے مطابق، کھڑے قیامت کے زمانے تک (تو تندرست
دیدیں تو میں) ابھی (بجز قدر قلیل لوگوں کے) جو خاص ہیں ہنگامی، مگر تمام اولاد کو اپنے قابو میں کر لو گا (یعنی گمراہ کروں گا)
ارشاد ہوا، (تو تجھ سے ہوسکے کرشمے) جو شخص انہیں سنیق سے سنا دے گا تو تم سب کی ہنزا جہنم پر پورے گا (اور ان میں سے
بہت تیرے قاتل ہو چکے) اپنی پہنچ پکارتے (یعنی اغوا اور وسوسہ سے) اس کا قیام (داد راست سے
انکار دینا اور ان پر اپنے سوار اور پیادے پڑھنا) اور کہتے ہیں سارا لشکر ملکر گمراہ کرنے میں خوب زور
لگاؤ گے اور ان کے مال اور اولاد میں پناہ مانگا کر دنیا یعنی مال و اولاد کو گمراہی کا ذریعہ بنا دینا
جیسا کہ اسکا مشاہدہ ہوا۔ اور ان سے (جیسے جیسے) وعدے کرنا کہ قیامت میں گناہ پر
مواخذہ نہ ہوگا اور یہ سب باتیں شیطان کو بے زجر و تنبیہ سکھائی گئی ہیں، اور شیطان ان لوگوں
سے بالکل جھوٹے وعدے کرتا ہے، یہ بلوئے جلاوت خدا کے کئے تھے آگے چھوڑ دیا ان کو خطاب ہے، یہ ہے
نفاق بندوں پر تیرا حق اور نہ چلے گا اور اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کا قاتل و خلیفہ بن کر پکڑ لے گا آپ
کارب (ان کا) کار ساز کافی ہے۔

معارف و مسائل

[illegible]

حاصل کیا جائے یا حرام کاموں میں خرچ کیا جائے یہی شیطان کی ہمیں شہرت ہے اور اولاد میں شیطان کی شہرت اولاد حرام ہونے سے بھی ہوتی ہے اور اس سے بھی کہ اولاد کے نام مشرکانہ رکھے یا انکی حفاظت کے لئے مشرکانہ رسوم ادا کرے یا ان کی پرورش کے لئے حرام ذرائع آمدنی اختیار کرے (قرطبی)

رَبُّكُمُ الَّذِي يُرْجِي لَكُمْ الْفَلَكَ فِي الْبَحْرِ لِيَسْتَعْمَلَ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ

تبار رب وہ ہے جو پہلاتا ہے تمہارے واسطے کشتی دیا میں تاکہ تلاش کرو اس کا فضل وہی

كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝ وَإِذَا امْسَكُ الْبُحْرُ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ

ہے تم پر مہربان اور جب آتی ہے تم پر آفت دیا میں بھول جاتے ہو جگو تم پکارا کرتے تھے

إِلَّا آيَاتَهُ فَلَمَّا نَجَّيْكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ

اللہ کے سوائے پھر جب بچا لیا تم کو خشکی میں پھر جاتے ہو اور ہے انسان

كَفُورًا ۝ أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يُخْشِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ

بڑا ناشکر سو کیا تم بے ڈر ہو گئے اس سے کہ رخصا دے لگو جہل کے کنارے یا بھیج دے

عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُ وَالْكُمْ وَكَيْلًا ۝ أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ

تم پر آنے والی تھم بسانے والی بھڑ پاد اپنا کوئی بچیان یا بے ڈر ہو گئے ہو اس سے کہ پھر بچائے

فِيهِ تَارَةً أُخْرَى فَايُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُمْ

تھم دیا میں دوسری بار پھر بھیجے تم پر ایک سخت جھونکا ہوا کا پھر ڈبا دے تم کو

بِمَا كُفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُ وَالْكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ۝ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

بہلے میں اس ناشکی کے پھر نہ پاؤ اپنی طرف سے ہم پر اس کا کوئی باز نہیں کرنا والا اور ہم نے عزت دی ہے

بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ

آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستمی چیزوں سے

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝

اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر

خلاصہ تفسیر

سابقہ آیات میں تو حیدر کا اثبات اور شرک کا ابطال مختار آیات مذکورہ میں یہی مضمون ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بیشمار فیضیں انسان نفع میں ہونے والی ہر وقت مہذول ہیں ان کو بیان کر کے یہ بتلانا منظور ہے کہ ان تمام نعمتوں کا بٹنے والا بجز ایک حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا اور سب نعمتیں اسکی ہیں تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو نہ ایک ٹھکانا بڑی گمراہی ہے ارشاد فرمایا کہ تمہارا رب ایسا (منعم) ہے کہ تمہارے (نفع کے) لئے کشتی کو دریا میں سے چلتا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ رزق کی تلاش کرو اور اس میں اشارہ ہے کہ بحری سفر تجارت کے لئے عموماً بڑے نفع کا سبب ہوتا ہے، بیشک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے اور جب تم کو دریا میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے مثلاً دریا کی موج اور ہوا کے طوفان سے غرق ہونے کا خطرہ، تو بجز خدا کے اور جس جس کی تم عبادت کرتے تھے سب غائب ہو جاتے ہیں کہ تمہیں خود ہی اس وقت انکا خیال آتا ہے نہ ان کو پکارتے ہو اور پکار بھی تو ان سے کسی امداد کی ذرہ برابر توقع نہیں یہ خود عمل طور پر تمہاری طرف سے تو حیدر کا اقرار اور شرک کا ابطال ہے، چر جب تم کو خشکی کی طرف پھالالت ہے تو تم پھر اس سے رخ پھیر لیتے ہو اور انسان ہے بڑا ناشکر کہ اتنی جلدی اللہ کے انعام اور اپنی انعام و ناز کی کو بھول جاتا ہے اور تم جو خشکی میں پہنچ کر اس سے اپنا رخ پھیر لیتے ہو، تو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ تم کو خشکی میں لاکر ہی زمین میں دھنسا دے کہ طالب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دریا اور خشکی میں کوئی فرق نہیں وہ جیسے دریا میں غرق کر سکتا ہے ایسا ہی خشکی میں بھی زمین میں دھنسا کر غرق کر سکتا ہے۔ یا تم پر کوئی ایسی سخت ہوا بھیجے کہ جو انکر قبضہ برساتے تھے جیسا کہ قوم عاد ایسے ہی ہوا کے طوفان سے ہلاک کی گئی تھی پھر تم کیسے گوارا بنا کر ساز خدا کے سوا نہ پاؤ یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ فی الواقع پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لیجا دے پھر تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے پھر تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے پھر اس بات پر کہ تم غرق کر دیتے ہیں کوئی ہمارا پیچھا کرنے والا بھی نہ ہو نہ ملے جو ہم سے تمہارا بدلہ لے سکے، اور ہم نے اولاد آدم کو رخصت و من مغان سے بھر، عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں جانوروں اور کشتیوں پر سوار کیا اور پاکیزہ نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی

معارف و مسائل

بنی آدم کی فضیلت اکثر مخلوقات پر کس وجہ سے ہے | آخری آیت میں اولاد آدم کی اکثر مخلوقات پر فوقیت

اور انصافیت کا ذکر ہے اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ یہ انصافیت کن صفات اور کن وجوہ کی بنا پر ہے۔ دوم یہ کہ اس میں انصافیت کون کونساں مخلوقات پر دینا بیان فرما رہا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ پہلی بات کی تفصیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی آدم کو مختلف حیثیات سے ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں جو وہ جس میں مخلوقات میں نہیں ملتا۔ مثلاً حسن صورت، اعتدال جسم، اعتدال مزاج، اعتدال قدر و قیامت جو انسان کو عطا ہوا ہے کسی دوسرے حیوان میں نہیں اس کے علاوہ عقل و شعور میں اس کو خاص امتیاز بخشا گیا ہے جس کے ذریعہ وہ تمام کمالات علویہ اور خلیفہ اپنے کام کا ہے الگو اشرف المخلوقات اس کی قدرت کاشی ہے کہ مخلوقات الہیہ سے ایسے مرکبات اور مصنوعات تیار کرے جو اس کے رہنے سے اور نقل و حرکت اور طعام و لہب میں اس کے فوائد کا مآب آئیں۔

نطق و گویائی اور انعام و تنہیم کا جو ملکہ اس کو عطا ہوا ہے وہ کسی دوسرے حیوان میں نہیں ملتا۔ اس کے ذریعہ اپنے دل کی بات دوسروں کو بتا دینا، شریر اور غلط کے ذریعہ دل کی بات دوسروں تک پہنچانا یہ سب انسان ہی کی امتیازات ہیں بعض علماء نے فرمایا کہ ہاتھ کی انگلیوں سے کھانا بھی انسان ہی کی منت مخصوص ہے اس کے سوا تمام جانور اپنے منہ سے کھاتے ہیں اپنے کھانے کی چیزوں کو مختلف اشیاء سے مرکب کر کے لذیذ اور مفید بناتے گا کام بھی انسان ہی کرتا ہے باقی سب جانور مفرد چیزیں کھاتے ہیں کوئی کپا گوشت کھتا ہے کوئی گندہ میں کوئی پھل وغیرہ جو ہاں سب غذائیں کھاتے ہیں انسان ہی اپنی غذا کے لئے ان سب چیزوں کے مرکب سے تیار کرتا ہے اور سب سے بڑی انصافیت عقل و شعور کی ہے جس سے وہ اپنے خالق اور مالک کو چاہنے اور اس کی مرضی اور منہی کو معلوم کر کے مہنیاں کا اتباع کرے نامہنیاں سے پرہیز کرے اور عقل و شعور کے اعتبار سے مخلوقات کی تقسیم اس طرح ہے کہ عام جانوروں میں حیوانات اور خواہشات میں عقل و شعور نہیں فرشتوں میں عقل و شعور ہے شہوات و خواہشات نہیں۔ انسان میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں عقل و شعور بھی ہے شہوات و خواہشات بھی ہیں اس کے سبب وہ شہوات و خواہشات کو عقل و شعور کے ذریعہ مغلوب کر لیتا ہے اور اللہ کی راہ میں اپنا بدن و جان و مال قربان کر دیتا ہے اس کے لئے اس کا مقصد ہے کہ فرشتوں سے بھی اونچا ہو جاتا ہے۔

دوسری بات کہ اولاد آدم کو اکثر مخلوقات پر نصیحت دینے کا کیا مطلب ہے اس میں تو کس کو اندازہ ہے؟ کیا شیعہ کہ دنیا کی تمام مخلوقات صوریہ اور خلیفہ اور تمام جانوروں پر اولاد آدم کو نصیحت ہے جس میں عقل و شعور ہیں انسان ہی کی طرف ہیں ان پر بھی انسان کا عقل ہونا سب کے لئے ایک شرط ہے۔ یہ صورت و طرز فرشتوں پر دیا گیا ہے کہ انسان اور فرشتہ میں کون عقل ہے اور کون نہیں؟ انسان میں عام انسان کا عقل ہے جیسے نر یا عورت اور عام فرشتوں کے عقل

ہیں مگر خواہ اس مال کے جیسے بہ نعل میکانیل وغیرہ ان عام صالحین سے افضل ہیں اور خواہ اس میں زمین و آسمان
انبیاء علیہم السلام وہ خواہ اس مال کے جیسے افضل ہیں باقی رہے کفار و فجار انسان وہ ظالم ہیں کہ
فرشتوں سے تو کیا افضل ہوتے وہ تو جانوروں سے بھی افضل و متعدد فلاح و تجارت میں افضل ہیں
ان کے تعلق تو قرآن کا فیصلہ ہے۔ اُولَئِكَ كَانُوا لَنَا عَنَامًا إِنَّهُمْ أَهْلُ عَذَابٍ إِنَّ يَوْمَ تَوَدُّ
یہ پاپ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ تنفیہ ظلم کی اور اللہ اعلم۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِمَا صَحَرَ فَمَنْ أُوْتِيَ كِتَابًا بِيَمِينِنَا

جس دن ہم بلاؤں گے ہر فرقہ کو ان کے سرداروں کے ساتھ سوچیں کہ اس کا حال کیا ہے دینے والے ہاتھ سے

فَأُولَئِكَ يَفْرَهُونَ كِتَابَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝۱۷

سو وہ لوگ پارسیں گے اپنا کتاب اور ظلم نہ ہوگا ان پر ایک تائید کہ اور جو کوئی ۔

فِي هَذِهِ أَعْمَى فَمَوْفَى الْأَخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝۱۸

اس جہان میں اندھا سو وہ پچھتے جہان میں بھی اندھا ہے اور بہت دور ہٹا ہوا راہ سے ۔

خلاصہ تفسیر

اس دن کو یاد کرنا چاہیے جس روز ہم تمام آدمیوں کو ان کے نامہ اعمال سمیت
دب ان ہتھ میں ، بلاؤں گے اور وہ نامہ اعمال ان کو پیش کیا جائے گا کہ کچھ کس کے ہاتھ ہاتھ اور کسی
کے بائیں ہاتھ میں آبادیں گے ، پھر یہ نامہ اعمال کے ہاتھ ہاتھ میں دیا جائے گا ، اور یہاں
ایمان ہوں گے ، اُولَئِكَ یَفْرَهُونَ کِتَابَهُمْ پھر یہ نامہ اعمال ان کو پیش ہو کر ، پڑھیں گے اور ان کا ذکر انھیں ان کا کیا
جاوے گا یعنی ان کے ایمان اور اعمال کا ثواب پورا پورا ملے گا ذرا کم نہ ہوگا خود زیادہ مل جائے
اور عذاب سے نجات بھی ہوگی خواہ ان کی یا ان کی سزا جھگڑنے کے بعد ، اور جو شخص دنیا میں راہ
نجات دیکھتے ، اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی ، منزل نجات تک پہنچے ، اندھا رہے گا اور وہ بلکہ
وہاں دنیا سے بھی زیادہ گمراہ ہوگا کیونکہ دنیا میں تو گمراہی کا علاج مکان تھا وہاں یہ بھی نہ ہو سکے گا
یہ وہ لوگ ہوں گے جو نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

معارف و مسائل

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِمَا صَحَرَ اس آیت میں خدا کا نام لیتے ہیں کہ

سورہ یسین میں ہے وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ إِذْ آمَرُ الْقَبِيلِينَ اسمین امام مبین سے مراد واضح کتاب ہے اور کتاب کو امام اس لئے کہا جاتا ہے کہ بھول چوک اور اختلاف کے وقت کتاب ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جیسے کسی امام مقتدا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ (قرطبی)
اور ترمذی کی حدیث بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (جو کہ ترمذی نے حسن غریب کہا ہے) اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام سے مراد اس آیت میں کتاب ہے۔ الفاظ حدیث کے یہ ہیں۔

يَوْمَ نَذَعُوَا كُلَّ اَنَابٍ
بِاِمَامِهِمْ قَالِ بِيَدِنَا
اَحَدُهُمْ فَيَقْطَعُ كِتَابَهُ
بِيَمِينِهِ (الحديث بطوله)

آیت یَوْمَ نَذَعُوَا كُلَّ اَنَابٍ بِاِمَامِهِمْ قَالِ بِيَدِنَا
تفسیر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ہے کہ ایک شخص کو بلایا جائے گا اور اس کا نامہ اعمال
دائیں ہاتھ میں دیدیا جائے گا۔

اس حدیث سے یہ بھی متعین ہو گیا کہ امام بمعنی کتاب ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کتاب سے مراد نامہ اعمال ہے اسی لئے خلافت تفسیر از بیان القرآن میں اس کا ترجمہ نامہ اعمال سے کر دیا گیا ہے۔
اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مجاہد و غیرہ نے یہاں لفظ امام کے معنی مقتدا اور پیشوا کے بھی منقول ہیں کہ ہر شخص کو اس کے مقتدا و پیشوا کا نام لیکر پکارا جائے خواہ وہ مقتدا و پیشوا انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب مشائخ و علماء ہوں یا گمراہی اور معصیت کی طرف دعوت دینے والے پیشوا۔ (قرطبی)

اس معنی کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہو گا کہ میدان حشر میں ہر شخص کو اس کے مقتدا اور پیشوا کے نام سے پکارا جائے گا۔ اور سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے گا مثلاً تبعین ابراہیم علیہ السلام تبعین موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام و تبعین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پھر ان کے ذیل میں مکمل ہونے والے ان تبعین کے بلا واسطہ مقتداؤں کا نام بھی لیا جائے۔

نامہ اعمال | قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال صرف کفار کو دیا جائیگا جبکہ ایک آیت میں ہے اِنَّكَ تَكْتُمُ لَآيُوتُكَ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ اور ایک دوسری آیت میں ہے اِنَّكَ تَكْتُمُ لَآيُوتُكَ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ پہلی آیت میں صراحتہ ایمان کی نفی کی گئی ہے اور دوسری میں انکارِ آخرت مذکور ہے وہ بھی کفر ہی ہے اس تقابل سے معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ میں نامہ اعمال اہل ایمان کو دیا جائیگا خود بخود ہوں یا گمراہی کے موطن اپنے نامہ اعمال کو خوشی کے ساتھ پڑھے گا بلکہ دوسروں کو بھی پڑھوائے گا یہ خوشی ایمان کی وجہ سے ہے نہ نجات کی ہوگی جو بعض اعمال پر سزا بھی ہوگی۔

لہذا یہ کہ بعض نامہ اعمال داہنے یا بائیں ہاتھ میں دیئے جائے گی کی کیفیت مذکور نہیں لیکن بعض روایات میں یہ تصریح الکتب کا لفظ آیا ہے درود احمد عن عائشہ رضی اللہ عنہا (اور بعض

روایات حدیث میں ہے کہ سب نانہ اعمال عرش کے نیچے جمع ہوں گے پھر ایک ہوا چلے گی جو سب کو اڑا کر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا دے گی کیسے دہشتناک ہاتھ میں کسی کے ہاتھ میں راجہ عقیلی عن انس مرفوعاً، (بیان القرآن از روح المعانی)

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُوكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ

اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بہلا دیں اُس چیز سے کہ جو وحی کہیں بھی ہم نے تیری طرف

لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَةً وَإِذَا لَا تَأْخُذُكَ خَلِيلًا ۝۴۲

تاکہ جھوٹ بنالائے تو ہم پر وحی کے سوا اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست اور اگر

لَا أَنْ تَبْتَئِكَ لَقَدْ كَرِهْتَ تَرْكُنَ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝۴۳

نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے اُن کی طرف خود اس

إِذَا لَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ

تب تو غمزدہ دیکھتے ہم تجھ کو دونا مزد زندگی میں اور دونا مرنے میں کچھ نہ پاتا تو اپنے

لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ۝۴۴ وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّوكَ مِنَ

واستے ہم پر مدد کرنے والا اور وہ تو چاہتے تھے کہ کھجھادیں تجھ کو اس

الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذَا لَا يَلْبَثُونَ خَلْفَكَ إِلَّا قَلِيلًا ۝۴۵

زمین سے تاکہ نکال دیں تجھ کو یہاں سے اور اس وقت نہ ٹھہریں گے وہ بھی تیرے پیچھے مگر مختصر

سُنَّةٌ مِمَّنْ قَدْ آرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ۝۴۶

دستور پہلا آتا ہے اُن رسولوں کا جو تجھ سے پہلے بھیجے ہم نے اپنے پیچھے اور نہ پالے گا تو ہمارے دستور میں تغاوت۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ کافر لوگ (اپنی قوی تدبیروں کے ذریعہ) آپ کو اس چیز سے بھلائے (اور ٹھانے)

ہی لگے جو ہم نے آپ پر نذر ایجہ و حی بھیجی ہے یعنی اس کوشش میں لگے تھے کہ آپ سے حکم خداوندی کے خلاف عمل کراویں اور تاکہ آپ اس حکم الہی کے سوا ہماری طرف (عملاً) غلط بات کی نسبت کراویں کیونکہ نبی کا فعل خلاف شرع ہوتا نہیں اسلئے اگر عیوضاً آپ سے کوئی عمل خلاف شرع ہو جاتا تو یہ لازم آتا کہ اس خلاف شرع عمل کو گویا اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں) اور اسی حالت میں آپ کو

خالص درست بنائیت اور ان کی یہ شہادت ایسی سخت تھی کہ اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا
یعنی معصوم نہ کیا ہوتا، تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا چھو پختہ (اور) اگر ایسا ہو جاتا کہ
آپ کا کچھ میلان ان کی بات کی طرف ہوتا، تو ہم آپ کو راسخوہ سے کہ فقر بان بارگاہ کا مقام بہت بلند
ہے، حالت حیات میں بھی اور بعد موت کے بھی دوسرا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی
دگاہی نہ پاسے نہ کر چو نہ آ پکو ہم نے معصوم اور ثابت قدم بنایا، اس لئے ان کی طرف ذرا بھی میلان نہ ہوا
اور اس عذاب سے بچ گئے،

اور یہ (کافروں) لوگ اس سرزمین (مکہ یا مدینہ) سے آپ کے قدم ہی اکھاڑنے لگے تھے تاکہ
آپ کو اس سے نکال دیں اور اگر ایسا ہو جاتا تو آپ کے بعد یہ بھی بہت کم (یہاں) ٹھہرنے پاتے جیسا ان
انبیاء کے بارے میں دہرا، قاعدہ رہا ہے جبکہ آپ سے پہلے رسولوں بنا کر بھیجا تھا کہ جب ان کی قوم
نے ان کو ملن کا اتو پھرنس قوم کو بھیجیاں رہنا نصیب نہیں ہوا اور آپ ہمارے قاعدے میں تغیر تبدل
نہ پائیں گے۔

معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں سے پہلی تین آیتیں ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں تفسیر مظہری میں
اس واقعہ کی تعبیر کے متعلق چند روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے اقرب اور مؤید بات قرآن
یہ واقعہ ہے جو تھوخیج ابن ابی حاتم بروایت جمیر ابن نفیر نقل کیا ہے کہ قریش مکہ کے چند سردار
آسمان سے علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپ واقعی ہماری طرف
جیسے گئے ہیں تو پھر اپنی لباس سے ان غریب شکستہ حال لوگوں کو ہٹا دیجئے جیسے ساتھ بیٹھنا ہمارے
لئے توہین ہے تو پھر ہم بھی آپ کے اصحاب اور دوست ہو جائیں گے۔ ان کی اس بات پر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ خیال پیدا ہوا کہ ان کی بات سچہ کی کہ دیں شاید یہ مسلمان ہو جائیں جس پر یہ
آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں آسمان سے علیہ وسلم کو باخبر کر دیا گیا کہ ان کی بات فتنہ ہے ان کی
دوستی بھی فتنہ ہے آپ کو ان کی بات نہیں ماننی چاہئے۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ اگر ہمارے طرف سے
آپ کی تربیت اور ثابت قدم رکھنے کا اہتمام نہ ہوتا تو کچھ بعید نہیں تھا کہ آپ ان کی بات کی طرف
میلان کے مقوڑے سے قریب ہو جاتے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر بھی جاتی ہے کہ کفار قریش کی
لغویات کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میلان کا تو کوئی احتمال ہی نہ تھا ہاں میلان کے

کہ مصداقِ آیت ہونا اس قدر دیا ہے اور پھر بتلایا کہ قرآن کریم کی یہ وعید بھی کفار کو لے کر آگے لے گئی ہے
دیکھ لی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی تو مکہ والے ایک دن بھی مکہ
میں چین سے نہیں بیٹھ سکے نہ مٹ ڈیڑھ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ ان بدر میں جمع کر دیا جہاں
ان کے ستر ہزار مارے گئے اور ان کی قوت ٹوٹ گئی پھر غزوہ اُحد کے آخر کی نتیجہ میں ان پر زید بیت
طاری ہو گئی اور غزوہ احزاب کے آخری معرکہ نے تو ان کی کہہ ہی توڑ دی اور ہجرت کے آنکھوں میں سال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مکہ مکرمہ فتح کر لیا۔

مُسْتَقْدَمَاتُ قَدْ آمَرَ مَلَكُنَا اس آیت میں بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت اور قاعدہ پہلے
سے ہی چلا آیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی کو اسکے وطن سے نکالتی یا نکالنے پر مجبور کرتی ہے تو پھر وہ
قوم بھی وہاں باقی نہیں رہتی اس پر فی الواقعہ کا عذاب آتا ہے۔

اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِكَ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ

پہلے شام کو سورہ شوریٰ پڑھنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا

إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ

بے شک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے۔ اور پھر رات جاگت رہے قرآن کے ساتھ

نَافِلَةً لَّكَ ۚ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ۝ وَ

بزیاری ہے یہ ہے قریب ہے کہ کھڑا کر دے تجھ کو تیرا رب مقامِ محمود میں اور

قُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مَدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مَخْرَجَ

کہہ اسے رب داخل کر مجھ کو سچا داخل کرنا اور نکال مجھ کو سچ

صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِّي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ۝ وَ

نکالنا اور عطا کر دے مجھ کو اپنے پاس سے حکومت کی مدد اور

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّتِ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوْقًا ۝

کہہ آیا سچ اور نکال سہاگہ جھوٹ بے شک جھوٹ ہے نکل سہاگے وہ

وَنُزِّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے بھی سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے اور

يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ۝

بڑھائے دے ان کو تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

آفتاب ڈھلنے کے بعد رات کے اندھیرے تک نمازیں ادا کیا کیجئے، راسمیں ظہر، عصر، مغرب، عشاء، چار نمازیں آگئیں جیسا کہ حدیث میں اس اجمال کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے، اور صبح کی نماز بھی (ادا کریں) بیشک صبح کی نماز فرشتوں کے، حاضر ہونے کا وقت ہے (صبح کا وقت چونکہ نیند سے بیدار ہونے کا وقت ہے جس میں سستی کا خطرہ تھا اسلئے اسکو الگ کر کے اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا اور اسکی ایک مزید تفصیلت بھی یہ بیان کر دی کہ اس وقت میں فرشتے جمع ہوتے ہیں اسکی تفصیل حدیث سے یہ معلوم ہوتی کہ انسان کی حفاظت اور اسکے اعمال کو لکھنے والے فرشتے دن کے الگ اور رات کے الگ ہیں صبح کی نماز میں دونوں جماعتیں فرشتوں کی جمع ہوتی ہیں رات کے فرشتے اپنا کام ختم کر کے اور دن کے فرشتے اپنا کام سنبھالنے کے لئے مجتمع ہو جاتے ہیں اسی طرح شام کو عصر کی نماز میں دونوں جماعتیں جمع ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کا اجتماع باعث برکات ہے، اور کیقدر رات کے حصے میں بھی (نماز ادا کریں) یعنی انہیں نماز تہجد پڑھنا کہیں جو کہ آپ کے لئے (پانچ نمازوں کے علاوہ) ایک زائد چیز ہے، (اس زائد سے مراد بعض کے نزدیک ایک زائد فرض ہے جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض کیا گیا اور بعض نے مراد زائد سے نفل لی ہے) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ آپ کا مقام محمود میں بجا دے گا، مقام محمود سے مراد شفاعت کبریٰ کا مقام ہے جو عشر میں تمام بنی آدم کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہو گا، اور آپ یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب (مکہ بجانے کے بعد) مجھکو (جہاں لیجانا ہو) ثوابی (یعنی راحت) کے ساتھ پہنچا دے اور جب مکہ سے لیجانا ہو تو مجھکو ثوابی (یعنی راحت) کے ساتھ لیجا دے اور مجھکو اپنا پاس سے (ان کفار میں ایسا غلبہ دیکھو جس کے ساتھ آپ کی) نصرت (اور مدد) ہو جس سے وہ غلبہ پا کر اور ترقی پذیر ہو ورنہ عارضی غلبہ تو کبھی کفار کو بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ اللہ کی نصرت نہیں ہوتی اسلئے پایدار نہیں ہوتا، اور کہہ دیجئے کہ (بس اب دین حق) غالب ہونے کو، آیا اور باطل گیا گذر ہوا واقعی باطل چیز تو یوں ہی آتی جاتی رہتی ہے (ہجرت کے بعد مکہ فتح ہوا تو یہ سب وعدہ سچ ہو گئے) اور ہم ایسی چیز یعنی قرآن نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو نشا اور موت ہے کیونکہ وہ اسکو مانتے اور اسپر عمل کرتے ہیں جس سے ان پر رحمت ہوتی اور عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ سے شفا ہوتی ہے، اور ظالموں کو اس سے اور الٹا نقصان بڑھتا ہے، (کہ جب وہ اسکو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں)

معارف و مسائل

دشمنوں کے مکر و کید سے بچنے کا بہترین علاج نماز ہے

سابقہ آیات میں اعداء اسلام کی مخالفت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کرنے کی تدبیریں اور اسکا جواب

مذکور تھا اس کے بعد آیات صدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اقامت صلوٰۃ کا حکم دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دشمنوں کے مکر و کید اور ایذاؤں سے بچنے کا بہترین علاج نماز کی اقامت ہے جیسا کہ سورہ حجر کی آیت میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں یہ ارشاد ہے وَ لَقَدْ عَلَّمْتُمَا بِمَا يَفْعُلُونَ فَسَيَتَمَّ بِخُتْمِ رَبِّكَ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُشْجِدِينَ

یعنی ہم جانتے ہیں کہ کفار کے دل آزار اقوال سے آپ و لنگت ہوئے ہیں تو آپ اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح کیا کریں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ (قرطبی)

اس آیت میں دشمنوں کی ایذاؤں کا علاج اللہ کے ذکر و حمد و تسبیح اور نماز میں مشغول ہو جانے کو قرار دیا ہے ذکر اللہ اور نماز بالخصوص ان سے بچنے کا علاج ہے اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ دشمنوں کی ایذاؤں سے بچنا اللہ تعالیٰ کی مدد پر موقوف ہے اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا سب سے افضل ذریعہ نماز ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَ الشَّلَوةِ (یعنی مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ذریعہ)

نماز پنجگانہ کا حکم جمہور ائمہ تفسیر نے اس آیت کو پانچوں نمازوں کے لئے جامع حکم قرار دیا ہے کیونکہ دَلْوٰك كَمَا لَفْظٌ اَكْرَحُ اَصْلٌ فِي مِيلَانِ كَمَا فِي مِيلَانِ آفتاب زوال کے وقت شروع ہوتا ہے اور غروب کو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن جمہور صحابہ و تابعین نے اس جگہ لفظ دَلْوٰك کے معنی زوال آفتاب ہی کے لئے ہیں۔ دَلْوٰك فَاصْلٌ الْقُرْطُبِي وَ النُّظْمِي وَ ابْنِ كَثِيرٍ

اِلَى غَسَقِ الْكَيْلِ لَفْظٌ غَسَقِ كَمَا فِي مَعْنَى رَاتِ كَمَا فِي تَارِيخِ مَكْمَلِ مَوْجَانِ كَمَا فِي اَمَامِ مَالِكٍ

نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے غَسَقِ کی یہی تفسیر نقل فرمائی ہے۔

اس طرح دَلْوٰك الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ الْكَيْلِ میں چار نمازیں آگئیں پہلے عصر مغرب عشاء اور انہیں سے دو نمازوں کا ابتدائی وقت بھی بتلادیا گیا کہ پہلے کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور عشاء کا وقت غَسَقِ الْكَيْلِ سے یعنی جس وقت رات کی تاریکی مکمل ہو جائے اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے وقت عشاء کی ابتدا اس وقت سے قرار دی ہے جبکہ شافعی احمد کے بعد شافعی ابن حبان بھی غروب ہو جانے پر سب جانتے ہیں کہ غروب آفتاب کے منقل اتق مغرب پر ایک سرخی نمودار ہوتی ہے اور اس سرخی کے بعد ایک قسم کی سفیدی اتق پھیل جاتی ہے پھر وہ سفیدی

جی غروب ہو جاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ رات کی تاریکی مکمل اس وقت ہوگی جبکہ افق کی سفیدی بھی ختم ہو جائے اس لئے اس لفظ میں امام اعظم ابو حنیفہ کے مسلک کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ دوسرے ائمہ نے مشتق الحمد کے غروب ہونے پر وقت عشاء کی ابتداء قرار دی ہے اور اسی کو عَشِيقُ اللَّيْلِ کی تفسیر قرار دیا ہے۔

وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اس جگہ لفظ قرآن ہو لکن نماز مراد لی گئی ہے کیونکہ قرآن نماز کا جزا ہے اکثر ائمہ تفسیر ابن کثیر قرطبی و مظہری وغیرہ نے یہی معنی لکھے ہیں اس لئے مطلب آیت کا یہ ہو گیا کہ ذَلِيلُ الْمُنَاسِ إِلَى خَلْقِ الْبَيْتِ کے الفاظ میں چار نمازوں کا بیان تھا یہ پانچویں نماز فجر کا بیان ہے اسکو الگ کر کے بیان کر نے میں اس نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

كَانَ مَشْهُودًا یہ لفظ شہادت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حاضر ہونا اس وقت میں جب نضر بن احادیث صحیحہ رات اور دن کے دونوں فرشتوں کی جماعتیں حاضر نماز ہوتی ہیں اس لئے مکہ مشہور دکھایا گیا ہے اس آیت میں پانچ نمازوں کا حکم اجمال کے ساتھ آیا ہے جسکی مکمل تفسیر و تشریح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے بتلائی ہیں اور جب تک اس تشریح پر عمل نہ کیا جائے کوئی شخص نماز ادا ہی نہیں کر سکتا معاذم نہیں کہ جو لوگ قرآن کو بغیر حدیث اور بیان رسول کے سمجھنے کا دعوٰی کرتے ہیں وہ نماز کیسے پڑھتے ہیں اس طرح اس آیت میں نماز کے اندر قرأت قرآن کا ذکر بھی اجمالاً آیا ہے اسکی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے ثابت ہوئی کہ نماز فجر میں قرأت طویل کی جائے بقدر استطاعت اور طہ و جمعہ میں اس سے کم اور جمعہ و عشاء میں متوسط اور مغرب میں بہت مختصر و مغرب میں طویل قرأت اور فجر میں اختصار جو بعض روایات میں آیا ہے وہ عملاً متروک ہے امام قرطبی نے صحیح مسلم کی وہ روایت جس میں مغرب کی نماز میں سورۃ اعراف اور مرسلات وغیرہ طویل سورتوں کا پڑھنا یا سننے کی نماز میں صحت معوذتین پر اتفاق کرنا منقول ہے اسکو نقل کر کے فرمایا ہے فَتَدْرِكُ بِالْعَمَلِ وَلَا تَنْكَرُ عَلَى مَعَاذِ الطَّوِيلِ وَبِأَمَّا الْأَشْهُةُ بِالْخَفِيفِ یعنی یہ اتفاقی واقعات مغرب میں طویل قرأت اور فجر میں اختصار کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی عمل سے نیز زبانی ارشادات کی وجہ سے متروک ہیں۔ (قرطبی)

نماز تہجد کا وقت اور | وَمِنَ اللَّيْلِ فَسُجِّدْ لَهُ لفظ تہجد مجہول سے مشتق ہے اور یہ اس کے احکام و مسائل | لفظ و متضاد سے کیلئے استعمال ہوتا ہے اس کے معنی سونے کے بھی آتے ہیں اور جاگنے بید رہنے کے بھی اس جگہ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسُجِّدْ لَهُ کے معنی یہ ہیں کہ آتے سے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو کیونکہ سجدہ کی تفسیر قرآن کی طرف راجع ہے (مظہری) قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے اسی رات کی نماز کو اصطلاح شرع میں نماز تہجد

کہا جاتا ہے اور عموماً اسکا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے وہ نماز تہجد ہے لیکن تفسیر مظہری میں ہے کہ مفہوم اس آیت کا اتنا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں نماز کے لئے سوئے کہ ترک کر دو اور یہ مفہوم جس طرح کچھ دیر سوئے کے بعد جاگ کر نماز پڑھنے پر صادق آتا ہے اسی طرح شروع ہی میں نماز کے لئے نیند کو موخر کر کے نماز پڑھنے پر بھی صادق ہے اس لئے نماز تہجد کے لئے پہلے نیند مٹانے کی شرط قرآن کا ماحول نہیں پھر بعض روایات حدیث سے بھی تہجد کے اسی عام معنی پر استدلال کیا ہے۔

اور امام ابن کثیر نے حضرت حسن بصری سے نماز تہجد کی جو تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے اسکے الفاظ یہ ہیں۔

قال الحسن البصري هو ما كان
بعد العشاء ويحتمل على ما كان
بعد النوم (ابن کثیر)

حسن بصری فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اس نماز پر صادق ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے البتہ تعامل کی وجہ سے اسکو کچھ نیند کے بعد پر محمول کیا جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ نماز تہجد کے اصل مفہوم میں بعد النوم ہونا شرط نہیں اور الفاظ قرآن میں بھی یہ شرط موجود نہیں لیکن عموماً تعامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا یہی رہا ہے کہ نماز آخر رات میں بیدار ہو کر پڑھتے تھے اس لئے اسکی افضل صورت یہ ہوگی۔

نماز تہجد فرض ہے یا نفل | نَفْلًا أَوْ نَفْلًا - لفظ نفل اور نافلة کے لغوی معنی زائد کے ہیں اسی لئے اس نماز اور صدقہ خیرات وغیرہ کو نفل کہتے ہیں جو شرعاً واجب اور ضروری نہ ہو جبکہ کرنے میں ثواب ہے اور نہ کرنے میں نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کسی قسم کی برائی، اس آیت میں نماز تہجد کے ساتھ نَفْلًا نَفْلًا آئے کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ نماز تہجد خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نفل ہے حالانکہ اس کے نفل ہونے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت سب ہی شریک ہیں اسی لئے بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ نافلة کو فریضہ کی صفت قرار دیکر یعنی یہ قرار دیے ہیں کہ عام امت پر تو صرف پانچ وقت کی نماز فرض ہو مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد بھی ایک زائد فرض ہے تو یہاں لفظ نافلة سمجھنے فرض زائد کے ہے نفل کے عام معنی میں نہیں۔

اور تحقیق صحیح اس معاملہ کی یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں جب سورہ منزل نازل ہوئی تو اس وقت پانچ نمازیں تو فرض ہوئی نہ تھیں صرف تہجد کی نماز سب پر فرض تھی اسی فرض کا ذکر سورہ منزل میں ہے پھر شب معراج میں پانچ نمازیں فرض کر دی گئیں تو تہجد کی فرضیت عام امت سے تو باتفاق منسوخ ہو گئی، اور اس میں اختلاف رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسکی فرضیت منسوخ ہوئی یا یہ خصوصیت طور پر آپ کے ذمہ فرض رہا اور اس آیت میں نَفْلًا أَوْ نَفْلًا کے یہی معنی ہیں کہ نماز تہجد

آپ کے ذمہ ایک زائد فرض ہے مگر تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ کسی وجہ سے صحیح نہیں اول یہ کہ فرض کو نفل سے تعبیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر کہا جائے کہ باز ہے تو یہ ایک ایسا مجاز ہوگا جسکی کوئی حقیقت نہیں دوسرے احادیث مجہمہ میں صرف پانچ نمازوں کی تعیین کے ساتھ فرض ہونے کا ذکر ہے اور ایک حدیث میں اس کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ شب حراج میں جو اول پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں پھر تخفیف کر کے پانچ کر دی گئیں تو اگرچہ عد و گٹھا دیا گیا مگر ثواب پچاس ہی کاٹے گا اور پھر فرمایا لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ اِنِّیْ مِرَاقِلٌ بَدَلَا نَهْنِیْ كَرَّاجِبٍ پچاس کا حکم دیا تھا تو ثواب پچاس ہی کا دیا جائے گا اگرچہ عمل میں کمی کر دی گئی۔

ان روایات کا حاصل یہ ہے کہ عام امت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پانچ نمازوں کے سوا کوئی اور نماز فرض نہیں ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نافلة کا لفظ اگر اس جگہ فریضہ زائد کے معنی میں ہوتا تو اس کے بعد لفظ لَکَ کے بجائے عَلَیْکَ ہونا چاہیے تھا جو وجوب پر دلالت کرتا ہے لفظ لَکَ تو صرف جواز اور اجازت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں صحیح اسکو قرار دیا ہے کہ جب تہجد کی فرضیت امت سے منسوخ ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منسوخ ہو گئی اور سب کے لئے نفل رہ گیا مگر اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کیا ہے نفل ہونا تو سب ہی کے لئے ثابت ہے پھر نَافِلَہُ لَکَ فرمانے کا کیا حاصل ہوگا جواب یہ ہے کہ حسب تصریح احادیث تمام امت کی نوافل اور تمام نفل عبادات ان کے گناہوں کا کفارہ اور فرض نمازوں میں جو کوتاہی کمی رہ جائے اسکی تکمیل کا کام دیتی ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے بھی معصوم ہیں اور نماز کے آداب میں کوتاہی سے بھی اس کو آپ کے حق میں نفل عبادت بالکل زائد ہی ہے جو کسی کوتاہی کا نذر رک نہیں بلکہ محض زیادت تقرب کا ذریعہ ہے۔ وقرطبی و مظہری نماز تہجد نفل ہے سنت مؤکدہ کے لئے جو عام ضابطہ فقہاء رکات ہے کہ جس کام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا وہ امت فرمائی ہو اور بلا مجبوری کے نہ چھوڑا ہو وہ

سنت مؤکدہ ہے ہر اس کے لئے کسی دلیل شرعی سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا عام امت کے لئے نہیں تھا اس ضابطہ کا تقاضا بظاہر یہی ہے کہ نماز تہجد بھی سب کیلئے سنت مؤکدہ قرار پائے نہ کہ صرف نفل کیونکہ اس نماز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداومت سنت متواترہ سے ثابت ہو اور خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں اسلئے عام امت کے لئے بھی سنت مؤکدہ ہونا چاہئے۔ تفسیر مظہری میں اسکو مختار اور رائج قرار دیا ہے اور اس کے مؤکدہ ہونے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے تبیین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس شخص کے بارے میں جو پہلے تہجد پڑھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا یہ ارشاد فرمایا کہ "اسکے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے" اس طرح کی وعید اور تنبیہ صرف نفل میں نہیں ہو سکتی اس سے محال ہے۔

اور جن حضرات نے تہجد کو صرف نفل قرار دیا ہے وہ اس مواعظت اور مداومت کو آٹھ تہجد صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیتے ہیں اور تہجد پڑھنے والے کے ترک تہجد پر جو زجر کے الفاظ ارشاد فرمائے وہ دراصل مطلقاً ترک پر نہیں بلکہ اول عادت ڈالنے کے بعد ترک کرنے پر ہیں کیونکہ آدمی جس نفل کی عادت ڈال لے باتفاق امت اس کو چاہئے کہ اس پر مداومت کرنے اگر عادت ڈالنے کے بعد چھوڑ دے یا تو قابل ملامت ہو گا کیونکہ عادت کے بعد بلا غدر ترک ایک قسم کے اعراض کی علامت ہے اور جو شروع سے عادی نہ ہو تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ واللہ اعلم۔

تہجد کی تعداد رکعات | صحیح بخاری و مسلم میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان یا غیر رمضان میں کبھی گیارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھتے تھے ان گیارہ رکعات میں حنفیہ کے نزدیک تین رکعتیں و ترک ہوئی تھیں باقی آٹھ تہجد کی۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں دو رکعتیں شامل ہیں اور دو رکعتیں سنت فجر کی بھی (منظہری) سنت فجر کو رات کی نمازیں بوجہ رمضان کے شمار کر لیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ عام عادت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ تہجد کی نمازیں آٹھ رکعات ادا فرماتے تھے۔

لیکن صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے یہ بھی ثابت ہے کہ کبھی کبھی اس تعداد سے کم چار یا تھ رکعات پر بھی اتنا فرمایا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آپ سے یہ منقول ہے کہ حضرت مسروق نے صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہی کہ نماز کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ سات، نو، اور گیارہ رکعات ہوتی تھیں علاوہ سنت فجر کے (منظہری عن البخاری) حنفیہ کے قاعدہ کے مطابق تین رکعت و ترک ہوئی تو سات میں سے چار نو میں سے چھ، گیارہ میں سے آٹھ تہجد کی رکعتیں رہ جاتی ہیں۔

نماز تہجد کی کیفیت | جو عام روایات حدیث سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ابتداء میں دو رکعت بلکہ مختصر قرات کے ساتھ پھر باقی رکعات میں قرات بھی طویل اور رکوع سجدہ بھی طویل ہوتا اور یہ طویل بسا اوقات بہت زیادہ ہو جاتا تھا کبھی کبھار کم (یہ علامہ ان روایات حدیث کا ہے جو اس جگہ تفسیر منظہری میں نقل کی گئی ہیں)۔

مقام محمود | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت میں مقام محمود کا وعدہ کیا گیا ہے اور یہ تمام

تمام انبیاء میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے اس کی تفسیر میں اقوال مختلف ہیں مگر صحیح وہ ہے جو اہل حدیث صحیحہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے یہ مقام شفاعت کبریٰ کا ہے کہ میں ان حضراتِ مسوقت تمام بنی آدم جتنے ہوں گے اور ہر نبی و پیغمبر و شفاعت کی درخواست کریں گے تو تمام انبیاء علیہم السلام عذر کر دیں گے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف عطا ہوگا کہ تمام بنی آدم کی شفاعت فرمائیے تفصیل اس کی روایات حدیث میں طویل ہے جو اس جگہ ابن کثیر اور تفسیر منطہری میں لکھی ہے۔

انبیاء اور صلحاء امت کی شفاعت مقبول ہوگی | اسلامی فرقوں میں سے خوارج اور معتزلہ شفاعت انبیاء کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کسی کی شفاعت سے معاف نہیں ہوگا مگر اہل حدیث متواترہ اس پر شاہد ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بلکہ صلحاء امت کی بھی شفاعت گناہگاروں کے حق میں مقبول ہوگی بہت سے لوگوں کے گناہ شفاعت سے معاف کر دیئے جا دیں گے۔

ابن ماجہ الاذنی میں بروایت عثمان رضی عنہ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اول انبیاء علیہم السلام گناہگاروں کی شفاعت کریں گے پھر علماء پھر شہداء اور دہلی نے بروایت ابن عمر رضی عنہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم سے کہا جائے گا کہ آپ اپنے شاگردوں کی شفاعت کر سکتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کی برابر ہو۔ اور ابو داؤد اور ابن حبان نے بروایت ابی الدرداء رضی عنہ منقول کیا ہے کہ شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر آدمیوں کے متعلق قبول کیجاسے گی۔

مسند احمد۔ طبرانی اور بیہقی نے ابن مسیح بن حنفیہ ابو امانہ رضی عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے ایک آدمی کی شفاعت پر قبیلہ ربیعہ اور منیر کے تمام لوگوں سے زیادہ آدمی جنت میں داخل کئے جا دیں گے۔

ایک سوال و جواب | یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمادیں گے اور آپ کی شفاعت سے کوئی دوزخ میں نہ رہ جاوے گا تو پھر امت کے علماء و صلحاء کی شفاعت کس لئے اور کیوں ہوگی۔ تفسیر منطہری میں ہے کہ غالباً صورت یہ ہوگی کہ علماء اور صلحاء امت جن لوگوں کی شفاعت کرنا چاہیں گے وہ اپنی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کریں گے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت فرمادیں گے۔

فائدہ | ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شفاعتی لا یصل الکبار من اہل بیتی یعنی میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جنہوں نے کبیرہ گناہ

کئے تھے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کبار کی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہوگی کوئی فرشتہ یا امت کا فرد اہل کبار کی شفاعت نہ کر سکے گا بلکہ مسلمان امت کی شفاعت صغیر و کناہ والوں کے لئے ہوگی۔

نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل ہے | حضرت مجدد الف ثانی رحمہ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اول نماز تہجد کا حکم دیا گیا پھر مقام محمودی شفاعت کبریٰ کا وعدہ کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تہجد کو مقام شفاعت حاصل ہونے میں خاص دخل ہے۔

وَقُلْ رَبِّ ادْخُلْنِيْ ۝۱۰۰ سابقہ آیات میں اول کفار مکہ کی ایذاؤں اور ان تدبیروں کا ذکر تھا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کے لئے کرتے تھے اسکے ساتھ یہ بھی مذکور ہوا کہ ان کی یہ تدبیریں کامیاب نہیں ہوں گی اور ان کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل تدبیر کے درجہ میں تو صرف نیکانہ نماز قائم کرنے اور تہجد گزاری کی تلقین فرمائی اسکے بعد آخرت میں آپ کو سب انبیاء سے اعلیٰ مقام یعنی مقام محمود عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا جو آخرت میں پورا ہو گا مذکورہ آیت وَقُلْ رَبِّ میں حق تعالیٰ نے اسی دنیا میں اول آپ کو کفار کے مکائد اور ایذاؤں سے نجات دینے کی تدبیر بصورت ہجرت مدینہ ارشاد فرمائی اور اسکے بعد فتح مکہ کی بشارت وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ میں ارشاد فرمائی گئی۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تھے پھر آپ کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَقُلْ رَبِّ ادْخُلْنِيْ مِنْ خَلٍّ صَدَقٍ وَ اَخْرِجْنِيْ مِنْ خَلٍّ جَدِّقٍ اس میں لفظا مَدْخُلٌ خَلٌّ اور مُخْرِجٌ وَ اَخْلٌ ہونے اور خارج ہونے کی جگہ ہیں مَذْخُولٌ ہے اور ان کے ساتھ صفت صدق و جبرحانے سے مراد یہ ہے کہ یہ نیکانہ اور داخل ہونا سب اللہ کی مرضی کے مطابق خیر و خوبی کے ساتھ ہو کیونکہ لفظ صدق عربی زبان میں ہر ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو ظاہراً اور بالظن درست اور بہتر ہو قرآن کریم میں قدم صدق اور لسان صدق اور مقعد صدق کے الفاظ ایسی جہی استعمال ہوئے ہیں۔

داخل ہونے کی جگہ سے مراد مدینہ اور خارج ہونے کی جگہ سے مراد مکہ ہے مطلب یہ ہے کہ یا اللہ مدینہ میں میرا داخلہ خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے وہاں کوئی خلاف طبع اور ناگوار صورت پیش نہ آئے اور مکہ مکرمہ سے میرا نکلنا خیر و خوبی کے ساتھ ہو جائے کہ وطن اور گھر بار کی محبت میں دل ابھانہ رہے اس آیت کی تفسیر میں کچھ اور اقوال بھی آئے ہیں مگر یہ تفسیر حضرت حسن بصری اور قتادہ سے منقول ہے ابن اثیر نے اسی کو اصح الاقوال کہا ہے ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ترتیب کا تقاضا یہ تھا

کہ پہلے مخرج پھر مدخل کا ذکر ہونا مگر یہاں مدخل کو مقدم اور مخرج کو مؤخر کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ مکہ مکرمہ سے نکلنا خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ بیت اللہ کو چھوڑنا انتہائی صدمہ کی چیز تھی البتہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے مامن تلاش کرنا مقصد تھا جو داخلہ مدینہ کو ذریعہ حاصل ہو چکی امید تھی اسلئے جو مقصد تھا اسکو مقدم رکھا گیا۔

فائدہ | ہر مقاصد کے لئے مقبول دعا | ہجرت مدینہ کے وقت حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین فرمائی کہ مکہ سے نکلنا اور پھر مدینہ پہنچنا دونوں خیر و ثوابی اور عافیت کے ساتھ ہوں اسی دعا کا ثمرہ تھا کہ ہجرت کے وقت تعاقب کرنے والے کفار کی زد سے اللہ تعالیٰ نے ہر قدم پر بچایا اور مدینہ طیبہ کو ظاہراً و باطناً آپ کے اور سب مسلمانوں کے لئے سازگار بنایا۔ اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ یہ دعا ہر مسلمان کو اپنے تمام مقاصد کے شروع میں یاد رکھنا چاہئے اور ہر مقصد کے لئے یہ دعا مفید ہے اسی دعا کا نکتہ بعد کا جملہ ہے **وَاَجْعَلْ لِّي قِيَمًا لِّكَ مُلْكًا مَّجِيدًا** حضرت تنادہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ منصب رسالت کے فرائض کی ادائیگی اور دشمنوں کے نزغے میں کام کرنا اپنے بس کا نہیں اس لئے حق تعالیٰ سے غلبہ و نصرت کی دعا فرمائی جو قبول ہوئی اور اس کے آثار سب کے سامنے آ گئے۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّقَ الْبَاطِلُ . یہ آیت ہجرت کے بعد فتح مکہ کے بارے میں نازل ہوئی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بیت اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بتوں کے جیسے کھڑے ہوئے تھے بعض علماء نے اس خاص تعداد کو وجہ یہ بتلایا ہے کہ مشرکین مکہ سال بھر کے دنوں میں ہر دن کا بت الگ رکھتے تھے اس دن میں اسکی پرستش کرتے تھے۔ (قرطبی) آپ جب وہاں پہنچے تو یہ آیت آپ کی زبان مبارک پر تھی **جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَّقَ الْبَاطِلُ** اور اپنی لکڑی ایک ایک بت کے سینے میں مار رہے تھے جاتے تھے (بخاری و مسلم) بعض روایات میں ہے کہ اس چھڑی کے نیچے رنگ یا لوسے کی شام لگی ہوئی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بت کے سینے میں اس کو مار رہے تو وہ اٹا کر جاتا تھا یہاں تک کہ یہ سب بت گر گئے اور پھر آپ نے ان کے توڑنے کا حکم دیدیا (قرطبی بحوالہ قاضی عیاض و قشیری) مشرک و کفر اور باطل کی رسوم | امام قرطبی نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ مشرکین و نشانات کا مٹانا واجب ہے | کے بت اور دوسرے مشرک نشانات کو مٹانا واجب ہے اور تمام

وہ آلات باطلہ جنکا مصروف صرف معصیت ہونا تھا مٹنا بھی اسی حکم میں ہے ابن منذر نے فرمایا کہ تصویریں اور جیسے جو لکڑی پتیل وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں وہ بھی بتوں ہی کے حکم میں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر دسے کو چھڑیا لایا جس پر تصویریں نقش و رنگ سے بنائی گئی تھیں۔ اس سے عام تصاویر کا حکم معلوم ہو گیا۔ حضرت ابن علیہ السلام آخر زمانے میں تشریف لادینگے تو صحیح حدیث کے مطابق

میلہ جوں کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے یہ سب امور اسکی دلیل ہیں کہ شرک و کفر اور باطل کے آلات کو توڑنا اور ضائع کر دینا واجب ہے۔

وَنَزَّلَ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ - قرآن کریم کا قلوب کے لئے شفا دہونا، شرک و کفر اور افلاقِ رذیلہ اور امراضِ باطنہ سے نفوس کی نجات کا ذریعہ ہونا تو کھلا ہوا معاملہ ہے اور تمام اُمت اس پر متفق ہے اور بعض علماء کے نزدیک قرآن جس طرح امراضِ باطنہ کی شفا ہے امراضِ ظاہرہ کی بھی شفا ہے کہ آیات قرآن پڑھ کر مریض پر دم کرنا اور تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا امراضِ ظاہرہ کے لئے بھی شفا ہوتا ہے روایات حدیث اس پر شاہد ہیں تمام کتب حدیث میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث موجود ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت سفر میں تھی کسی گاؤں کے رئیس کو بچھونے کا ٹ لیا تھا۔ لوگوں نے حشر اُٹھا ہوا دیکھا کہ آپ کچھ اسکا علاج کر سکتے ہیں انہوں نے سات مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر اس پر دم کیا مریض اچھا ہو گیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسکا تذکرہ آیا تو آپ نے صحابہ کرام کے اس عمل کو بجا قرار دیا۔

اسی طرح دوسری متعدد روایات حدیث سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معوذات پڑھ کر دم کرنا ثابت ہے اور صحابہ و تابعین سے معوذات اور دوسری آیات قرآن کے ذریعہ مریضوں کا علاج کرنا لکھ کر گلے میں ڈالنا ثابت ہے جبکہ اس آیت کے تحت قرطبی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

وَلَا يَزِيدُ الْخَلِيلِينَ إِلَّا خَسَارًا اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کو جب اعتقاد و احترام کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا شفا دہونا جس طرح ظاہر اور ثابت ہے اسی طرح قرآن کا انکار یا بے ادبی خسارہ اور آفات کا ذریعہ بھی ہے۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَا جَانِبًا ۚ وَإِذَا

اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو مال جائے اور سچائے اپنا پہلو اور جب

مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يُوسَىٰ ۝۸۳ قُلْ كُلُّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ

پہنچے اس کو بُرائی تو رہ جائے بائوس ہو کر تو کہہ ہر ایک کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر

فَرَبِّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا ۝۸۴

سو تیرا رب خوب جانتا ہے کس نے خوب پایا راستہ ۔

خلاصہ تفسیر

اور (بعض) آدمی (یعنی کافر ایسا ہوتا ہے کہ اس) کو جب ہم نعمت عطا کر دیتے ہیں تو رہم سے

اور ہمارے احکام سے، منہ موڑ لیتا ہے اور گردن پھیر لیتا ہے اور جب اسکو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بالکل حسرت سے، ناامید ہو جاتا ہے اور یہ دونوں حالتیں دلیل ہیں اللہ تعالیٰ سے بے تعلقی کی اور وہی بنیاد ہے ہر کفر و گمراہی کی، آپ فرمادیجئے کہ مومنین اور کفار اور اخبار و اشرا میں سے ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کر رہا ہے، یعنی اپنی اپنی عقل و معیاریت پر عقیم اور علم یا جہل کی بنیاد پر مختلف طرح کے کام کر رہے ہیں، تو آپ کا رب خوب جانتا ہے اسکو جو زیادہ ٹھیک اور درست راستہ پر چڑھ کر اسی طرح جو ٹھیک راستہ پر چڑھ اسکو بھی جانتا ہے اور ہر ایک کو اسکے عمل کے موافق جزا یا سزا دیگا یہ نہیں کہ جسکا دل چاہے بلا کسی دلیل کے اپنے کو ٹھیک راستہ پر سمجھنے لگے۔

معارف و مسائل

كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ - لفظ شاکلۃ کی تفسیر میں ائمہ سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں

طبیعت، عادات، جبلت، نیت، طریقہ وغیرہ اور حاصل یہ کہ ہر انسان کی اپنے ماحول اور عادات اور رسم و رواج کے اعتبار سے ایک عادت اور طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اسکا عمل اسی کے تابع رہتا ہے (فطری) اسی انسان کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بڑے ماحول بری صحبت اور بری عادتوں سے پرہیز کرے نیک لوگوں کی صحبت اور اچھی عادات کا نوکر بنے، بھلاص) کیونکہ اپنے ماحول اور صحبت اور رسم و رواج سے انسان کی ایک طبیعت بن جاتی ہے اسکا ہر عمل اسی کے تابع چلتا ہے امام جناس نے اس جگہ شاکلہ کے ایک معنی ہم شکل کے بھی کئے ہیں اس معنی کے لحاظ سے مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق آدمی سے مانوس ہوتا ہے نیک آدمی نیک سے اور شریر شریر سے مانوس ہوتا ہے اسی کے طریقہ پر چلتا ہے اور اسکی نظیر حق تعالیٰ کا یہ قول ہے:

الْحَبِیْثَاتُ الرِّجْسَاتُ الْمُحْجَبَاتُ وَ الطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ یعنی خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے یہ مراد یہ ہے کہ ہر ایک اپنے مزاج کے مطابق مرد و عورت سے مانوس ہوتا ہے اور حاصل مطلب اسکا بھی اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ خراب صحبت اور خراب عادت سے پرہیز کا اہتمام کرے۔

وَسْئَلُكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۵﴾

اور تجھے سے پوچھتے ہیں روح کو کہہ دے روت ہے میرے رب کے حکم سے اور تو کو سے دیا ہے تمھارا سا اور اگر تم چاہیں تو ملے جائیں

بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ تَحَرَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ﴿٨٧﴾

اُس چیز کو جو ہم نے تجھ کو وحی بھیجی پھر تو نہ پائے اپنے واسطے اُس کے لاشعے کو ہم پر کوئی ذمہ دار

إِلَّا رَحْمَةً مِن رَّبِّكَ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا ﴿٨٨﴾

مگر مہربانی سے تیرے رب کی اُس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے

قُلْ لِّمَنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ

کہہ اگر جمع ہوں آدمی اور جن اس پر کہ لائیں ایسا

هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ

قرآن ہرگز نہ لائیں گے ایسا قرآن اور پڑے نہ کیا کریں ایک دوسرے

ظَاهِرًا ﴿٨٩﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ

کی اور ہم نے پیچیدہ پیچیدہ کر سمجھائی لوگوں کو اس مشران میں ہر

كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ﴿٩٠﴾

مثال سو نہیں رہتے بہت لوگ بن ناشکری گئے ۔

خلاصہ تفسیر

اور یہ لوگ آپ سے (امتحاناً) روح کی حقیقت کو پوچھتے ہیں آپ (جواب میں) فرمادیکھئے

کہ روح کے متعلق بس اتنا اجمالاً سمجھ لو کہ وہ ایک چیز ہے جو میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور

ربانی اس کی مفصل حقیقت سو، مگر بہت تھوڑا علم (بقدر تمہاری فہم اور ضرورت کے) دیا گیا

ہے (اور روح کی حقیقت کا معلوم کرنا کوئی ضرورت کی چیز نہیں اور نہ اسکی حقیقت عام طور پر

سمجھ میں آ سکتی ہے اسلئے قرآن اسکی حقیقت کو بیان نہیں کرتا)

اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر آپ پر ہم نے وحی بھیجی ہے (اور اسکے ذریعہ آپ کو علم دیا

ہے) سب سلب کر لیں پھر اس (وحی) کے (واپس لانے کے لئے) آپ کو ہمارے مقابلہ میں

کوئی حمایت بھی نہ ملے گا مگر دیہ، آپ کے رب ہی کی رحمت ہے (کہ ایسا نہیں کیا) بیشک

آپ پر اسکا بڑا فضل ہے (مطلب یہ ہے کہ انسان کو روح وغیرہ ہر چیز کی حقیقت کا تو کیا علم ہوتا اسکو

جو تھوڑا سا علم بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے وہ بھی اس کی کوئی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ

چاہئے تو دینے کے بعد بھی سلب کر سکتا ہے مگر وہ اپنی رحمت سے ایسا کرتا نہیں و جب یہ ہے کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے، آپ فرمادیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات سب اس بات کے لئے جمع ہو جائیں کہ ایسا قرآن بنا لادیں تب بھی وہ ایسا نہ کر سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے کامدگار بھی بن جائے یعنی ان میں سے ہر ایک الگ الگ کوشش کر کے لڑکھائی کا میاں بہ موتا سب کے سب ایک دوسرے کی مدد سے کام کر کے بھی قرآن کا مثل نہیں بنا سکتے، اور ہم نے لوگوں کے دیکھانے کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے عمدہ مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے پھر بھی اکثر لوگ بے انکار کئے نہ رہتے

معارف و مسائل

آیات عدد ۲۱ پہلی آیت میں کفار کی طرف سے روح کے متعلق ایک سوال اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب مذکور ہے لفظ روح لغات و محاورات میں نیز قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے معروف و مشہور معنی تو وہی ہیں جو عام طور پر اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں یعنی جان جس سے حیات اور زندگی قائم ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جبریل امین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی کئی آیات میں استعمال ہوا ہے اور خود قرآن کریم اور وحی کو بھی روح کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَهْرَآئِنَا۔

روح سے مراد کیا ہے سوال کس معنی کے لحاظ سے کیا تھا بعض حضرات مفسرین نے بیاق و سباق کی رعایت سے یہ سوال وحی اور قرآن یا وحی لانے والے فرشتے جبریل کے متعلق قرار دیا ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ فِي قرآن کا ذکر تھا اور بعد کی آیات میں پھر قرآن ہی کا ذکر ہے اس کے مناسب اسکو سمجھا کہ اس سوال میں بھی روح سے مراد وحی و قرآن یا جبریل ہی ہیں، اور مطلب سوال کا یہ ہو گا کہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے کون لانا ہے قرآن کریم نے اس کے جواب میں اس پر اکتفا کیا کہ اللہ کے حکم سے وحی آتی ہے تفصیلات اور کیفیات جن کا سوال تھا وہ نہیں بتلائیں۔

لیکن احادیث صحیحہ مرفوعہ میں جو اس آیت کا شان نزول بتلایا گیا ہے وہ تقریباً اس طرح ہے کہ سوال کرنے والوں نے روح حیوانی کا سوال کیا تھا اور مقصد سوال کا روح کی حقیقت معلوم کرنا تھا کہ وہ کیا چیز ہے بدن انسانی میں کس طرح آتی جاتی ہے اور کس طرح اس سے حیوان اور انسان زندہ ہو جاتا ہے صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے غیر آباد حصے میں چل رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں ایک چھڑی کھجور کی شاخ کی تھی آپ کا گزر چند یہودیوں پر ہوا۔ یہ لوگ آپہیں کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آ رہے ہیں ان سے روح کے متعلق سوال کرو دوسروں نے منع کیا مگر سوال کرنے والوں نے سوال کر ہی ڈالا یہ سوال سکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکڑی پر ٹیک لگا کر خاموش کھڑے ہو گئے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ بروح نازل ہونے والے ہیں کچھ وقفہ کے بعد وحی نازل ہوئی تو آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی **وَيَسْأَلُكَ عَنِ الرُّوحِ** یہاں ظاہر ہے کہ قرآن یا وحی کو روح کہنا یہ قرآن کی ایک خاص اصطلاح تھی ان لوگوں کے سوال کو اس پر محمول کرنا بہت بعید ہے البتہ روح حیوانی و انسانی کا معاملہ ایسا ہے کہ اسکا سوال ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اسی لئے جمہور مفسرین ابن کثیر ابن جریر قرطبی بحر محیط روح المعانی بھی نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ سوال روح حیوانی کی حقیقت سے تمنا یہ معاملہ کہ سیاق و سباق میں ذکر قرآن کا چلا آیا ہے درمیان میں روح کا سوال جواب بے جوڑ ہے تو اسکا جواب واضح ہے کہ اس سے پہلی آیات میں کفار و مشرکین کی مخالفت اور معاندانہ سوالات کا ذکر آیا ہے جن سے منظور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوبارہ رسالت امتحان کرنا تھا یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس لئے بے جوڑ نہیں خصوصاً شان نزول کے متعلق ایک دوسری حدیث صحیح منقول ہے کہ یہ بات زیادہ وضاحت سے کہی گئی ہے کہ سوال کرنے والوں کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا امتحان لینا تھا چنانچہ سند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ قریش مکہ جو جاوے جا سوالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہتے تھے انکو خیال پیدا ہوا کہ یہو و علم واسے ہیں انکو پچھلی کتابوں کا بھی علم ہے ان سے کچھ سوالات حاصل کئے جا دیں جنکے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لیا جائے اسلئے قریش نے یہود سے دریافت کرنے کے لئے اپنے آدمی بھیجے انھوں نے کہا کہ تم ان سے روح کے متعلق سوال کرو (ابن کثیر) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے سوال میں یہ بھی کہا تھا کہ آپ ہمیں یہ بتلائیں کہ روح پر عذاب کس طرح ہوتا ہے اسوقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بارے میں کوئی بات نازل نہ ہوئی تھی اسلئے اسوقت آپ نے فوری جواب نہیں دیا پھر جب یہ آیت بیکر نازل ہوئے **قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي** (ابن کثیر مفسر) واقعہ سوال مکہ میں پیش اس سے پہلے یہاں ایک بات اور قابل نظر ہے کہ شان نزول کے متعلق آیا یا مدینہ میں جو دو حدیثیں ابن مسعود و ابن عباس کی اور نقل کی گئیں ہیں ان میں ابن مسعود

کی روایت کے مطابق یہ واقعہ موال مدینہ میں پیش آیا اور اسی لئے بعض مفسرین نے اس آیت کو مانی قرار دیا ہے اگرچہ اکثر حصہ سورہ بنی اسرائیل کا مکی ہے اور ابن عباس رضی کی روایت کا تعلق مکہ مکرمہ کے واقعہ سے ہے اسکے مطابق یہ آیت بھی پوری سورت کی طرح مکی باقی رہتی ہے اسی لئے ابن کثیر نے اسی احتمال کو رائج قرار دیا ہے اور ابن مسعود رضی کی روایت کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس آیت کا نزول مدینہ میں دوسری مرتبہ ہوا ہو جیسا کہ بہت سی آیات قرآن کا نزول مکہ و مدینہ کے نزدیک مسلم ہے اور تفسیر مظہری نے ابن مسعود رضی کی روایت کو رائج قرار دیکر واقعہ مدینہ کا اور آیت کو مدنی قرار دیا ہے جس کی دو وجہ تلافی ایک یہ کہ یہ روایت صحیحین میں ہے اور سند اس کی روایت ابن عباس رضی سے زیادہ قوی ہے دوسرے یہ کہ اس میں خود صاحب واقعہ ابن مسعود رضی اپنا واقعہ بیان کر رہے بخلاف روایت ابن عباس رضی کے کہ اس میں ظاہر ہی ہے کہ ابن عباس رضی نے یہ بات کسی سے سنی ہوگی۔

سوال مذکور کا جواب | قرآن کریم نے یہ دیا ہے **قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي** اس جواب کی تشریح

میں حضرات مفسرین کے کلمات اور تعبیرات مختلف ہیں ان میں سب سے زیادہ اقرب اور واضح وہ ہے جو تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس جواب میں جتنی بات کا بتلانا ضروری تھا اور جو عام لوگوں کی سمجھ میں آنے کے قابل ہے صرف وہ بتلا دی گئی اور روح کی مکمل حقیقت جس کا سوال تھا اس کو اس لئے نہیں بتلایا کہ وہ عوام کی سمجھ سے باہر بھی تھی اور ان کی کوئی ضرورت اس کے سمجھنے پر موقوف بھی نہ تھی یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ہوا کہ آپ ان کے جواب میں یہ فرما دیجئے کہ "روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے" یعنی وہ عام مخلوقات کی طرح نہیں جو مادہ کے نظریات اور توالد و تناسل کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں بلکہ وہ بالاد اسطر حق تعالیٰ کے حکم کن سے پیدا ہونے والی چیز ہے۔ اس جواب نے یہ نو واضح کر دیا کہ روح کو عام مادیات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جس سے وہ تمام شبہات رفع ہو گئے جو روح کو عام مادیات پر قیاس کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں اور انسان کے لئے اتنا ہی علم روح کے متعلق کافی ہے اس سے زائد علم کے ساتھ اس کا کوئی دینی یا دنیوی کام آسکا ہوا نہیں اس لئے وہ مسئلہ سوال فصول اور لایعنی قرار دیکر اس کا جواب نہیں دیا گیا خصوصاً جبکہ اس کی حقیقت کا سمجھنا عوام کے لئے تو کیا بڑے بڑے حکماء و عقلا کے لئے بھی آسان نہیں۔

سوال کا جواب دینا ضروری نہیں | امام جنساص نے اس جواب سے یہ مسئلہ نکالا کہ مفسر اور سائل کی دینی مسکنیت کی رعایت لازم ہو اس کی ہر شق کا جواب ضرور دے بلکہ دینی مصالح پر نظر رکھ کر جواب دینا چاہئے جو جواب

مخاطب کے فہم سے بالاتر ہو یا اسکے غلط فہمی میں پڑ جائے گا خطرہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہئے
اسی طرح بے ضرورت یا لائق سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہئے البتہ جس شخص کو کوئی ایسا
داعیہ پیش آیا جسے متعلق اسکو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو مفتی اور عالم کو اپنے علم کے
مطابق اسکا جواب دینا ضروری ہے (جصاص) امام بخاری نے کتاب العلم میں اس مسئلے کا ایک مختصر
ترجمہ الباب رکھ کر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب کے مخاطب میں پڑنے کا خطرہ ہو اسکا جواب نہیں دینا چاہئے۔

روح کی حقیقت کا علم کسی کو ہو سکتا ہے یا نہیں

قرآن کریم نے اس سوال کا جواب مخاطب کی ضرورت اور فہم کے مطابق دیا حقیقت روح کو بیان نہیں فرمایا مگر اس سے

یہ لازم نہیں آتا کہ روح کی حقیقت کو کوئی انسان سمجھ ہی نہیں سکتا اور یہ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی حقیقت معلوم نہیں تھی صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت نہ اسکی نفی کرتی ہے نہ اثبات اگر کسی نبی و رسول کو وحی کے ذریعہ یا کسی ولی کو کشف و الہام کے ذریعہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ عقل و فلسفہ کی رو سے بھی اسپر کوئی بحث و تحقیق کی جائے تو اسکو مفہول اور لایعنی تو کہا جائے گا مگر ناجائز نہیں کہا جاسکتا اسی لئے بہت سے علماء متقدمین و متاخرین نے روح کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں آخری دور میں ہمارے استاد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ایک مختصر سے رسالے میں اس مسئلے کو بہترین انداز سے لکھا ہے اور اس میں جس قدر حقیقت سمجھنا عام انسان کے لئے ممکن ہے وہ سمجھا دی ہے جس پر ایک تعلیم یافتہ انسان قناعت کر سکتا ہے اور شہادت و اشکالات سے بچ سکتا ہے۔

مسئلہ ۱ امام بخاری رحمہ اللہ اس جگہ حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایک مختصر روایت

اس طرح نقل فرمائی ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی جبکہ مکہ کے قریشی سرداروں نے مجمع ہو کر مشورہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اندر پیدا ہوئے اور جو ان موسےٰ ان کی امانت دیا مت اور سچائی میں کبھی کسی کو شبہ نہیں ہوا اور کبھی ان کے متعلق جھوٹ بولنے کی تہمت بھی کسی نے نہیں لگائی اور اس کے باوجود اس جو دعویٰ نبوت کا وہ کر رہے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے ایسا کرو کہ اپنا ایک وفد مدینہ طیبہ کے علماء ربیعہ دے کہ پاس پہنچکر ان سے ان کے بارے میں تحقیقات کرو چنانچہ قریش کا ایک وفد علماء ربیعہ دے کہ پاس مدینہ پہنچا علماء ربیعہ و ان کو مشورہ دیا کہ تم تمہیں تین چیزیں بتلاتے ہیں تم ان سے ان تینوں کا سوال کرو۔ اگر انھوں نے تینوں کا جواب دیا تو وہ نبی نہیں اس طرح تینوں میں سے کسی کا جواب نہ دیا تو بھی نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیا تو سب کی چیز کا جواب نہ دیا تو سمجھ لو کہ وہ نبی نہیں وہ تین سوال یہ بتلاتے کہ ایک تو ان سے ان لوگوں کا حال پوچھو جو متدین

لے یہ مختصر عالم اسلام ص ۱۲۲ ج ۲ کے مطابق ہے۔ مؤلفی عثمانی

زمانہ میں شرک سے بچنے کے لئے کسی غار میں چھپ گئے تھے کیونکہ انکا واقعہ عجیب ہے
دوسرے اس شخص کا حال پوچھتے ہیں کہ مشرق و مغرب کا سفر طے کیا کہ اس کا کیا واقعہ
ہے تیسرے روح کے متعلق دریافت کرو۔

یہ وفد واپس آیا اور تیوں سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیئے
آپ نے فرمایا کہ میں اسکا جواب نہیں کل دوں گا۔ مگر اس پر انشاء اللہ نہیں کہا اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ چند روز تک وہی کاسلہ منقطع ہو گیا بارہ پندرہ سے لیکر چالیس دن تک کی مختلف روایات
میں جنہیں سلسلہ وہی بند رہا قریش مکہ کو لعنہ شنیع کا مونہ ملا کہ کل جواب دینے کو کہا تھا آج
ستہ دن ہو گئے جواب نہیں ملا۔ سوال اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پریشان ہوئی پھر حضرت جبریل
امین یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنَّا لَا نَشَاءُ إِنَّا فَاعِلُونَ ذَلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ
جس میں آپ کو یہ یقین کی گئی کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کیا جائے اور اس کے بعد
روح کے متعلق یہ آیت سنانی جو اوپر مذکور ہوئی اور غار میں چھپنے والوں کے متعلق اصحاب کہف کا
واقعہ اور مشرق سے مغرب تک سفر کرنے والے ذوالقرنین کا واقعہ جو سورہ کہف میں آئے والہ
اس کی آیات نازل ہوئیں جنہیں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ جواب
میں بیان فرمایا گیا اور روح کے متعلق جس حقیقت کا سوال تھا اس کا جواب نہیں دیا گیا جس سے ہود
کی بتلائی ہوئی علامت صدق نبوت کی ظاہر ہو گئی۔ اس واقعہ کو ترمذی نے بھی مختصر بیان کیا ہے (منہجہ)
سورہ حجر کی آیت ۲۹ نَفْثَاتٍ فِتْنٍ هُنَّ أُفُجِيْنَ كَذِبَتْ أَرْوَاحُكُمْ فِيهِ لَمَجِدَّاهُ لَمَجِدَّاهُ لَمَجِدَّاهُ
کے متعلق ایک تحقیق جو افسانہ ظہری پہلے گزری ہے جس میں روح کی اقسام اور ہر ایک کی حقیقت کو کافی حد تک بیان کر دیا
وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنَّا لَا نَشَاءُ إِنَّا فَاعِلُونَ کہ سوال پر بقدر ضرورت جواب دیکر روح
کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش سے یہ کہہ کر روک دیا گیا تھا کہ انسان کا علم کتنا ہی زیادہ ہو جائے
مگر مقادیر الٰہیہ کی ہمہ گیری کے اعتبار سے کم ہی رہتا ہے اس لئے غیر ضروری مباحث اور تحقیقات
میں الجھنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ آیت وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنَّا لَا نَشَاءُ إِنَّا فَاعِلُونَ کہ انسان کو بقدر
بھی علم ملا ہے وہ بھی اسکی ذاتی جاگیر نہیں اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسکو بھی سلب کر سکتے ہیں اس لئے اسکو چاہئے
کہ موجودہ علم پر اللہ کا شکر ادا کرے اور فضول دلائل یعنی تحقیقات میں وقت ضائع نہ کرے خصوصاً جبکہ
مقصود تحقیق کرنا بھی نہ ہو بلکہ دوسرے کا امتحان لینا یا اسکو خفیف کرنا مقصود ہو اگر اس نے ایسا کیا
تو کچھ بعید نہیں کہ اس کج روی کے نتیجہ میں جتنا علم حاصل ہے وہ سب سلب ہو جائے اس آیت
میں خطاب اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر اصل سنانا امت کو مقصود ہے کہ جب رسول کا
علم بھی انکے اختیار میں نہیں تو دوسروں کا کیا کہنا ہے۔

قُلْ لِّدِينِ اجْتَمَعَتْ الْاِنْسُ وَالْحَيُّ يَمْشُونَ قُرْآن مجید کی چند آیات میں آیا ہے جس میں پوری دنیا نے انسان کو خطاب کر کے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر تم قرآن کو الٹ سکا کلام نہیں مانتے بلکہ کسی انسان کا بنایا ہوا مانستے ہو تو پھر تم ہی انسان ہو اسکی مثال بنا کے دکھلا دو۔ اس آیت میں اس دعوئی کے ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا کہ صرف انسان نہیں جنات کو بھی اپنے ساتھ ملا لو اور پھر تم سب ملکر قرآن کی ایک صورت بلکہ ایک آیت کی مثال ہی نہ بنا سکو گے۔

اس مضمون کا اس جگہ پر اعادہ ممکن ہے کہ یہ بتلانے کے لئے ہو کہ تم جو ہمارے رسول سے مختلف قسم کے سوالات روح وغیرہ کے متعلق ان کی رسالت و نبوت کی آزمائش کے لئے کرتے ہو کیوں ان فضول قصوں میں پڑے ہو خود قرآن کریم کہ دیکھ لو تو آپ کی نبوت و رسالت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ جب ساری دنیا کے جن و انس اس کی ادنیٰ سی مثال بنانے سے عاجز ہیں تو اسکے کلام الہی ہونے میں کیا شبہ رہتا ہے اور جب قرآن کریم کا کلام الہی ہونا اس بدابہت سے ثابت ہو گیا تو آپ کی نبوت و رسالت میں کسی شبہ کی کیا گنجائش رہتی ہے۔

آخری آیت **وَلَقَدْ كَذَّبْنَا** میں یہ بتلادیا کہ اگرچہ قرآن کریم کا معجزہ اتنا کھلا ہوا ہے کہ اس کے بعد کسی سوال اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی مگر سو یہ رہا ہے کہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے نعمت قرآن کی بھی قدر نہیں چھپاتے اس لئے گمراہی میں جھٹکتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّى تُبْرِئَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوءًا ۙ (٩٠)

اور بولے ہم : مائیں گے تیرا کہا جب تک تو نہ جاری کر دے ہمارے واسطے زمین سے ایک چٹنہ

أَوْ تَكُونُ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّحِيلٍ وَعَذَابٌ فَتُفَجِّرُ الْأَنْهَارَ خِلْمًا

یا ہو جائے تیرے واسطے ایک باغ کبھی اور انور کا پھر یہاں تو اس کے بیچ نہیں

تَفْجِيرًا ۙ ۝٩١ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زُرَّجَتْ عَلَيْنَا كِسْفًا أَوْ

جلا کر یا گرا دے ہم پر آسمان جیسا کہ تو کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے یا

تَأْتِي بِاللهِ وَالْمَلِكَةِ قَبِيلًا ۖ أَوْ يَكُونُ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ

لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے یا ہو جائے تیرے لئے ایک گھر سبھرا

مِنْ خُرُوفٍ أَوْ تَرَفٍّ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ بِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ

یا چڑھ جائے تو آسمان میں اور ہم زمین کے تیرے چڑھ جانے کو جب تک

تَنْزِيلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرُؤُا ۚ قُلْ سُبْحَنَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ

نہ اتار لائے ہم پر ایک کتاب جو ہم پڑھیں تو کہہ سبحان اللہ میں کون ہوں

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْرُ سُوْلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ

مگر ایک آدمی جیسا ہوا اور لوگوں کو روکا نہیں ایمان لانے سے جب پہنچی

الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا سُوْلًا ۝ قُلْ لَوْ

ان کو ہدایت مگر اسی بات نے کہ کہنے لگے کیا اللہ نے جیسا آدمی کو پیغام دے کہ کہ اگر

كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يُّسْمِعُونَ مَطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ

ہوتے زمین میں فرشتے سمجھتے ہوتے تو ہم اتارتے ان پر

مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا سُوْلًا ۝

آسمان سے کوئی فرشتہ پیغام دے کہ

خلاصہ تفسیر

سابقہ آیات میں کفار کے چند سوالات اور ان کے جوابات ذکر کئے گئے ہیں مذکورہ اندر آیات میں ان کے چند محاذات سوالات اور بے سرو پا فرمائشوں کا ذکر اور ان کا جواب ہے (ترجمہ ابن جریر رحمہ اللہ ابن عباس) اور یہ لوگ ربا و جود اسکے کہ اعجاز قرآنی کے ذریعہ آپ کی نبوت و رسالت کا کافی اور واضح ثبوت ان کو مل چکا ہے بھی ازراہ عناد ایمان نہیں لاتے اور یہ بہانے کرتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ ہم آپ پر سرگز ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپ ہمارے لئے (مکہ کی) زمین سے کوئی چیز جاری نہ کر دیں یا فاس آپ کے لئے کھجور اور انگور کا کوئی باغ نہ بھیجیں اس باغ کے بیج بیج میں جگہ جگہ بہت سی نہیں آپ جاری کر دیں یا جیسا آپ کہا کرتے ہیں آپ آسمان کے کھڑے ہم پر نہ گرا دیں (جیسا کہ اس آیت قرآن میں ارشاد ہے إِنَّ لَنَا خَلِيفًا بِمِثْلِ الْأَرْضِ أَوْ نَسْقِطُ عَلَيْهِمُ صَعْفًا مِّنَ السَّمَاءِ) یعنی ہم چاہیں تو ان کو زمین کے اندر دھنسا دیں یا ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں یا آپ اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لا کر دکھادیں (کہ ہم کھلم کھلا دیکھ لیں) یا آپ کے پاس کوئی سونے کا بنا ہوا گھر نہ ہو یا آپ آسمان پر ہمارے سامنے نہ چڑھ جاویں اور ہم تو آپ کے (آسمان پر) چڑھنے کا کبھی بھی یقین نہ کریں گے جب تک کہ وہاں سے آپ ہمارے پاس ایک کتاب نہ لاویں جسکو ہم پڑھ سکیں (اور اس میں آپ کے آسمان پر پہنچنے کی تصدیق بطور رسد لکھی ہوئی ہو) آپ

ان سب خرافات کے جواب میں، فرمادیکئے کہ سحان اللہ میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں (مگر پیغمبر ہوں) اور کیا ہوں کہ ان فرمائشوں کو پورا کرنا میری قدرت میں ہو یہ قدرت مطلقہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے بشریت اپنی ذات میں خود بخود بے اختیار ہی کو مقتضی ہے و یا رسالت کا معاملہ تو وہ بھی اسکو مقتضی نہیں ہے کہ اللہ کے رسول کو ہر چیز کا مکمل اختیار ہو بلکہ نبوت و رسالت کے لئے تو اتنی بات کافی ہے کہ رسالت کی کوئی صاف واضح دلیل آجاد سے حیرانہل عقل کو اعتراض نہ ہو سکے اور وہ دلیل اعجاز قرآنی اور دوسرے معجزات کی صورت میں بارہا پیش کی جا چکی ہے اس لئے نبوت رسالت کے لئے ان فرمائشوں کا مطالبہ محض لغو ہے ہاں اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر اس سے کسی کو مطالبہ کا حق نہیں جس چیز کو وہ حکمت کے مطابق دیکھتے ہیں ظاہر بھی کر دیتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ تمہاری سب فرمائشیں پوری کریں اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت یعنی رسالت کی صحیح دلیل مشاعرا قرآن کے) پہنچ چکی اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کوئی مقابل التفات بات مانع نہیں ہوتی کہ انہوں نے بشریت کو رسالت کے منافی سمجھا اس لئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا آپ (جو) میں ہماری طرف سے، فرمادیکئے کہ اگر زمین پر فرشتے رہتے ہوتے کہ اس پر چلتے بستے تو ہم اپنے ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

معارف و مسائل

بے سہرو پامعاندانہ سوالات کا پیغمبرانہ جواب

آیات مذکورہ میں جو سوالات اور فرمائشیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایمان لانے کی شرط قرار دیکر کی گئیں وہ سب ایسی ہیں کہ ہر انسان ان کو منکر ایک قسم کا تمسخر اور ایمان نہ لانے کا یہودہ بہانے کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا ایسے سوالات کے جواب میں انسان کو فطرۃ غصۃ آتا ہے اور جواب بھی اسی انداز کا دیتا ہے۔ مگر ان آیات میں ان کے یہودہ سوالات کا جو جواب حق تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمایا وہ قابل نظر اور مصلحین امت کے لئے ہمیشہ یاد رکھنے اور لائحہ عمل بنانے کی چیز ہے کہ ان سب کے جواب میں نہ ان کی بے وقوفی کا اظہار کیا گیا نہ ان کی معاندانہ شرارت کا نہ ان پر کوئی فقرہ کسا گیا بلکہ نہایت سادہ الفاظ میں اصل حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ جو شخص خدا کا رسول ہو کر آئے اسے سارے خدائی اختیارات کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہونا چاہئے یہ خیال غلط ہے رسول کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے اللہ تعالیٰ ان کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے بہت سے معجزات بھی بھیجتے ہیں مگر وہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت

واختیار ہے۔ ہوتا ہے رسول کو خدائی کے اختیارات نہیں ملتے وہ ایک انسان ہوتا ہے اور انسانی قوت و قدرت سے باہر نہیں ہوتا۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسکی امداد کے لئے اپنی قوت ظاہر کو ظاہر فرمادیں۔

اللہ کا رسول انسان ہی ہو سکتا ہے | عام کفار و مشرکین کا خیال تھا کہ بشر یعنی آدمی اللہ کا رسول نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو ہماری طرح تمام حوائج انسانی کا عادی ہوتا ہے پھر اس کو ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے کہ ہم اسکو اللہ کا رسول سمجھیں اور اپنا مقتدا بنالیں۔ ان کے اس خیال کا جواب قرآن کریم میں کئی جگہ مختلف عنوانات سے دیا گیا ہے یہاں آیت صاف اللہ اس میں جو جواب دیا گیا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول جن لوگوں کی طرف بھیجا جائے وہ انھیں کی جنس میں سے ہونا ضروری ہے اگر یہ آدمی ہیں تو رسول بھی آدمی ہونا چاہئے کیونکہ غیر جنس کے ساتھ باہم مناسبت نہیں ہوتی اور بلا مناسبت کے رشد و ہدایت کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اگر آدمیوں کی طرف کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیں جو نہ بھوک کو جانتا ہے نہ پیاس کو نہ جنسی خواہشات کو نہ مردی گری کے احساس کو نہ اس کو کبھی محنت سے نکلان لائق ہوتا ہے تو وہ انسانوں سے بھی ایسے ہی عمل کی توقع رکھتا انکی کمزوری و مجبوری کا احساس نہ کرتا۔ اسی طرح انسان جب یہ سمجھتا کہ یہ تو فرشتہ ہے ہم اسے کامیوں کی نقل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تو اس کا اتباع خاک کرتے۔ یہ فائدہ اصلاح اور رشد و ہدایت کا صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ کا رسول ہو تو جنس بشر سے جو تمام انسانی جذبات اور طبعی خواہشات کا قود بھی حامل ہو مگر ساتھ ہی اسکو ایک شان ملکیت کی بھی حاصل ہو کہ عام انسانوں اور فرشتوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام کر سکے، وحی لانے والے فرشتوں سے وحی حاصل کرے اور اپنے ہم جنس انسانوں کو چھوڑ دے۔

اس تقریر سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ جب انسان فرشتہ سے نہیں حاصل نہیں کر سکتا تو پھر رسول باوجود انسان ہونے کے کس طرح ان سے نہیں وحی حاصل کر سکے گا۔

یہاں یہ شبہ کہ جب رسول اور امت میں مجاہدت شرط ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنات کا رسول کس طرح بنایا گیا جنات تو انسان کے ہم جنس نہیں تو جواب یہ ہے کہ رسول صرف انسان نہیں بلکہ اس میں ایک شان ملکیت کی بھی ہوتی ہے اس کی وجہ سے جنات کو بھی مناسبت ان سے ہو سکتی ہے۔

آخر آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ تم انسان ہونے کے باوجود جو یہ مطالبہ کرتے ہو کہ ہمارا رسول فرشتہ ہونا چاہیے یہ مطالبہ تو نا عقل ہے البتہ اگر اس زمین پر فرشتے آباد ہوتے اور ان کی طرف

رسول بھیجنے کی ضرورت ہوتی تو فرشتہ ہی کو رسول بنایا جاتا اس میں جو زمین پر بسنے والے فرشتوں کا یہ وصف ذکر کیا گیا ہے کہ یَمْشُونَ عَلَى بُرُوجٍ عِزٍّ یعنی وہ فرشتے زمین پر طعن ہو کر چلتے پھر تھے اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی طرف فرشتوں کو رسول بنانے کی ضرورت اسی وقت ہو سکتی تھی جبکہ زمین کے فرشتے خود آسمان پر نہ جاسکتے بلکہ زمین ہی پر چلتے پھرتے رہتے ورنہ اگر وہ خود آسمان پر جانے کی قدرت رکھتے تو زمین پر رسول بھیجنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ

کہہ اللہ کافی ہے حق ثابت کرنے والا میرے اور تمہارے بیچ میں وہ ہے اپنے بندوں سے

خَيْرًا أَبْصِيرًا ۝۶۹ وَمَنْ يَّمُدَّ اللّٰهُ فَمَوْمِئَةً ۚ وَمَنْ يُضِلُّ

خیر دار دیکھنے والا اور جس کو راہ دکھائے اللہ وہی ہر راہ پالنے والا اور جس کو ہٹکائے

فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِهِ ۚ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

پھر تو نہ پائے ان کے واسطے کوئی رفیق اللہ کے سوائے اور اٹھائیں گے ہم ان کو دن قیامت کے

عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عَمِيًّا ۚ وَبُكْمًا وَصُمًّا ۚ مَا وَلَهُمْ جَهَنَّمُ ۚ كُلَّمَا

چلیں گے منہ کے بل اندر سے اور گونگی اور بہرے ٹھکانا ان کا دوزخ ہے جب لگے گی

خَبَتْ نَرِدُّهُمْ سَعِيرًا ۝۷۰ ذٰلِكَ جَزَاءُ الْاِثْمِ بِالَّذِينَ كَفَرُوا

بکھنے اور بھڑکا دیں گے ان پر یہ ان کی سزا ہے اس واسطے کہ منکر ہوئے

بِاٰتِنَا وَقَالُوْا اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ۗ اِنَّا لَبَعُوثُونَ خَلَقْنَا

ہماری آیتوں سے اور بولے کیا جب ہم بونگے ہوں گے اور چھوڑا جائے ہم کو اٹھائیں گے

جَدِيدًا ۝۷۱ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ

ہے بنا کر کما نہیں دیکھ چکے کہ جس اللہ نے بنائے آسمان اور زمین وہ بنا

عَلٰی اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَا رَيْبَ فِیْهِ ۚ فَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ

کرتے ہیں ایسوں کو اور مقرر کیا ہے ان کے واسطے ایک وقت بے شبہ سو نہیں رہا جاتا ہے انھوں

اِلَّا كُفُوْرًا ۝۷۲ قُلْ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَاۤیِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ اِذَا

سے بے ناشکری کرتے کہہ اگر تمہارے ہاتھ میں ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانے تو ضرور

الصف

لَا مَسَکُتُ خَشْيَةٍ إِلَّا نَفَاقٌ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا ۝

بند کر رکھتے اس ڈر سے کہ خریج نہ ہو جائیں اور ہے انسان دل کا تنگ ۔

خلاصہ تفسیر

جب یہ لوگ رسالت و نبوت کی دلائل واضح آجائے اور تمام شبہات دور ہو جائے کہ بعد بھی نہیں مانتے تو آپ (آخری بات) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرے ہمارے درمیان کے اختلاف میں کافی گواہ ہے (یعنی خدا جانتا ہے کہ میں واقع میں اللہ کا رسول ہوں کیونکہ وہ اپنے بندوں کے احوال) کو خوب جانتا خوب دیکھتا ہے تمہارے غناد کو بھی دیکھتا ہے، اور اللہ جسکو راہ پر لادو وہ ہی راہ پر آتا ہے اور جسکو بنے راہ کر دے تو خدا کے سوا آپ کیسے بھی ایسوں کا مددگار نہ پاویں گے اور اگر جہنم کے یہ خدا کی مدد سے مژدم رہتے مطلب یہ ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کی طرف سے دشمنی نہ ہو نہ ہدایت ہو سکتی ہے نہ عذاب سے نجات، اور ہم قیامت کے روز انکو اندھا بنا گونگا بہرہ کر کے منہ کے بل چلائیں گے انکا ہکا نا دوزخ ہے جسکی یہ کیفیت ہوگی کہ وہ یعنی دوزخ کی آگ جب ذرا دھیمی ہونے لگے گی اسوقت ہم ان کے لئے اور زیادہ بھڑکادیں گے یہ ہے اُنکی سزا اس سبب سے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا اور یوں کہا تھا کہ کیا ہم بڑیاں او (وہ بھی) بالکل ریزہ ریزہ ہو جاویں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے (قبروں سے) اٹھائے جاویں گے کیا ان لوگوں کو اتنا معلوم نہیں کہ جس اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کئے وہ اس بات پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی دوبارہ پیدا کر دے اور انکرمین کو شاید یہ دوسو سہ سو کہ ہزاروں لاکھوں مر گئے مگر اب تک تو یہ وعدہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا پورا ہوا نہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کے دوبارہ پیدا کرنے کے لئے ایک معاد معین کر رکھی ہے کہ اس معیاد میں ان کے آئے ہیں ذرا بھی شک نہیں۔ اس پر بھی ظالم لوگ بے انکار کئے نہ رہے آپ فرمادیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہو سکتے (کہ جسکو چاہتے دیتے جسکو چاہتے نہ دیتے) تو اس صورت میں تم اس کے (خرچ ہو جانے کے اندیشے سے منور ہاتھ روک لینے) کو بھی کیونہ دیتے حالانکہ یہ چیز کسیکو دینے سے گھٹتی بھی نہیں، اور آدمی بہت بڑا تشدد لے کہ نہ گھٹنے والی چیز کو بھی عطا کرنے سے دریغ کرتا ہے جس کی وجہ سے رسولوں سے عداوت اور بغل کے علاوہ شاید یہ بھی ہو کہ اگر کسی کو نبی اور رسول بنایا تو پھر اس کے احکام کی پابندی کرنا پڑے گی جیسے کوئی قوم باہم اتفاق کر کے کسیکو اپنا بادشاہ بنائے تو گو بنایا انھوں نے ہے مگر جب

وہ بادشاہ بن گیا تو اسکی اطاعت کرنی پڑتی ہے)

معارف و مسائل

آخری آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اگر تم لوگ اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہو جاؤ تو تم بخل کرو گے کیونکہ دو گے اس خطرہ سے کہ اگر لوگوں کو دیتے رہے تو یہ خزانہ ختم ہو جائے گا اگرچہ رحمت رب کا خزانہ ختم ہونے والا نہیں مگر انسان اپنی طبیعت سے تنگدل کم حوصلہ ہوتا ہے اسکو فراشی کے ساتھ لوگوں کے دینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

اسی خزانہ رحمت رب کے لفظ سے عام مفسرین نے مال و دولت کے خزانے مراد لئے ہیں اور اسکا ربط سابق سے یہ ہے کہ کفار مکہ نے اسکی فرمائش کی تھی کہ اگر آپ واقعی نبی حق ہیں تو آپ اس مکہ کے خشک ریگستان میں نہریں جاری کر کے اسکی سرسبز باغات میں منتقل کر دیں جیسا ملک شام کا خطرہ ہے جسکا جواب پہلے آچکا ہے کہ تم نے تو گویا مجھے خدا ہی سمجھ لیا کہ خدائی کے اختیارات کا مجھے مطابق کر رہے ہو میں تو صرف ایک رسول ہوں خدا نہیں کہ جو چاہوں کر دوں یہ آیت بھی اگر اسی کے متعلق قرار دی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ سرزمین مکہ کو نہری زمین اور سبزہ زار بنانے کی فرمائش اگر میری نبوت و رسالت کے امتحان کے لئے ہے تو اسکے لئے اعجاز قرآن کا معجزہ کافی ہے دوسری فرمائشوں کی ضرورت نہیں اور اگر اپنی قومی اور ملکی ضرورت رفع کرنے کے لئے ہے تو یاد رکھو کہ اگر تمہاری فرمائش کے مطابق تمہیں زمین مکہ میں سب کچھ دے بھی دیا جائے اور خزانے کا مالک تمہیں بنا دیا جائے تو اسکا انجام بھی قومی اور ملک کے عوام کی خوشحالی نہیں ہوگی بلکہ انسانی عادت کے مطابق جس قبضہ میں یہ خزانے آجاویں گے وہ ان پر سانپ بکریٹھ جاویں گے عوام پر خرچ کرتے ہوئے افلاس کا خوف ان کو مانع ہو گا ایسی صورت میں مجرا اسکے کہ مکہ کے چند رئیس اور زیادہ امیر اور خوشحال ہو جائیں عوام کا کیا فائدہ ہو گا اکثر مفسرین نے اس آیت کا یہی مفہوم قرار دیا ہے۔

یہی حضرت حکیم الامتہ عثمانوی نے بیان القرآن میں اس جگہ رحمت رب سے مراد نبوت و رسالت اور خزانہ رحمت سے مراد کمالات نبوت لئے ہیں اس تفسیر کے مطابق اسکا ربط آیات سابقہ سے یہ ہو گا کہ تم جو نبوت و رسالت کے لئے مہر و پاؤں دی ہو وہ مطالبات کر رہے ہو اسکا حاصل یہ ہے کہ میری نبوت کو ماننا نہیں چاہتے تو کیا پھر تمہاری خواہش یہ ہے کہ نبوت کا نظام تمہارے ہاتھوں میں دیدیا جائے جسکو تم پاپہو نبی بنا لو۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم کیونکہ نبوت و رسالت نہ دو گے بخل کرو گے پیچھا جاؤ گے حضرت نے اس تفسیر کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ تفسیر ہوا سبب الہیہ میں سے ہے کہ مقام کے ساتھ نہایت چسپاں ہے اس میں نبوت کو رحمت کے ساتھ تعبیر کرنا ایسا ہی ہو گا

جیسا آیت اَھْمَرِیْضَمُونَ رَحْمَۃَ رَبِّکُمْ میں بالاجماع رحمت سے مراد نبوت ہے واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰی تِسْعَ اَیَّاتٍ بَیِّنٰتٍ فَمَنْ لِّبَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ اِذَا

اور ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں صاف پھر پوچھ بنی اسرائیل سے جب

جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاطْنٰکَ یٰمُوسٰی هَسْحُوْرًا ۝۱۱ قَالَ اَلَقَدْ

آیا وہ اُن کے پاس تو کہا اُس کو فرعون نے میری آنکھ میں تو موسیٰ تجھ پر جادو ہوا بولا تو جان

عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ هٰؤُلَاءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بِصَآءِرٍ وَّ

پکا ہے کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان اور زمین کے مالک نے سمجھانے کو اور

اِنِّیْ لَاطْنٰکَ یَفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝۱۲ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِیْزَھُمْ مِّنَ الْاَرْضِ

میری آنکھ میں فرعون تو غارت ہوا چاہتا ہے پھر چاہا کہ بنی اسرائیل کو چین زد کرے اُس زمین میں

فَاَغْرَقْنٰہُ وَّمَنْ مَّعَہٗ جَمِیْعًا ۝۱۳ وَ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ اِلٰی بَنِیْ

پھر ڈوبا دیا ہم نے اُس کو اور اسکے ساتھ والوں کو سب کو اور کہا ہم نے اس کے چچے بنی

اِسْرَآءِیْلَ اَسْكُنُوْا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِکُمْ

اسرائیل کو آباد رہو تم زمین میں پھر جب آئے گا وعدہ آخرت کا لے آئیں گے ہم تم کو

لَفِیْفًا ۝۱۴ وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَ بِالْحَقِّ نَزَّلُ وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا

مہیض کر اور سچ کے ساتھ اتارا ہم نے یہ قرآن اور سچ کے ساتھ اتارا اور تجھ کو جو کیسا ہم نے سو

مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۝۱۵ وَ قُرْاٰنَا فَرَقْنٰہُ لِتَقْرَآ عَلَی النَّاسِ عَلٰی

خوشی اور ڈر سنانے کو اور پڑھنے کا وسیلہ کیا ہم نے قرآن کو جدا جدا کر کے کہ پڑھے تو اُس کو لوگوں پر

مُکِتٍ وَ نَزَلْنٰہُ تَنْزِیْلًا ۝۱۶ قُلْ اِمَّا بِنِعْمَةِ اَوْلَآئِکُمْ مِّنْ

ٹھہر ٹھہر کر اور ہم نے اس کو اتارتے اتارتے اتارا کہہ تم اس کو مانو یا نہ مانو

اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِہٖ اِذَا اُیْتُوْا عَلَیْھِمْ

جن کو علم ملا ہے اس کے پہلے سے جب اُن کے پاس اس کو پڑھتے

یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُبْحٰنًا ۝۱۷ وَ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَا

مگرتے ہیں ٹھوڑیوں پر سجدہ میں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب

اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ۝۱۰۸ وَيَخْرُونَ لِلْأَذْفَانِ

بے شک ہمارے رب کا وعدہ ہو کر رہے گا اور گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر

يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۝۱۰۹

روتے ہوتے اور زیادہ ہوتی ہے ان کو عاجزی -

السنبلۃ ۴

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کھلے ہوئے تو معجزے دیئے (جکا ذکر پارہ پنجم کے رکوع ۱۰۸ ششم آیت اول میں ہے) جبکہ وہ بنی اسرائیل کے پاس آئے تھے سو آپ بنی اسرائیل سے (جی چاہے) یوتھ دیکھتے (اور چونکہ آپ فرعون کی طرف بھی بھیجے گئے تھے اور فرعون و آل فرعون کے ایمان نہ لائے) وہ عجاibat معجزات ظاہر ہونے لگے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دوبارہ ایمان لانے کے لئے یاد دہانی کی اور ان آیات پہنچنے سے ڈرایا، تو فرعون نے ان سے کہا کہ اے موسیٰ میرے خیال میں تو نہ تو تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (جس سے تمہاری عقل مضبوط ہو گئی کہ ایسی بہکی باتیں کرتے ہو) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تو (دل میں) خوب جانتا ہے (گو غار کیو جم سے زبان سے اقرار نہیں کرتا کہ یہ عجاibat خاص آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے کافی) ذرا غور میں اور میرے خیال میں غور تیری کجمنی کے دن آگئے ہیں (اور یا تو فرعون کی یہ حالت تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر بھی بنی اسرائیل کو مصر سے جانکی اجازت نہ دیتا تھا اور) پھر یہ ہوا کہ اس نے اس احتمال سے کہ نہیں بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے اثر سے قوت نہ پکڑ جاویں خود ہی چاہا کہ بنی اسرائیل کا اس سرزمین سے قدم اکھاڑ دے (یعنی ان کو شہر بدر کر دے) سو ہم نے (قبل اسکے) کہ وہ کامیاب نہ ہو خود اس رہی، کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا اور اس کے غرق کرنے کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہہ دیا کہ (اب) تم اس سرزمین کے جہاں سے تم کو نکالنا چاہتا تھا الگ ہو تم ہی اس میں رہو سو (خواہ بالقوہ یا بالفعل مگر یہ ملکیت حیوۃ دنیا تک ہے) پھر جب آخرت کا وعدہ آجیا دینا تو ہم سب کو جمع کر کے (قیامت کے میدان میں) ہمارے حکومان (الکریمانہ کریمے) (یہ ابتداء ہوگا) پھر مومن و کافر اور نیک و بد کو الگ الگ کر دیا جاوے گا، اور (پھر) طوفان ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزے دیئے اسی طرح آپ کو بھی بہت سے معجزات دیئے جن میں عظیم الشان معجزہ قرآن ہے کہ ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ تو نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ (آپ پر) نازل ہو گیا (یعنی جیسا کاتب کے پاس سے چلا تھا اسی طرح مکتوب الیہ تک پہنچ گیا اور درمیان میں کوئی تغیر و تبدل و تصرف

نہیں ہوا پس ہر راستی ہی راستی ہے، اور جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنایا تھا اور ہدایت ان کے اختیار میں نہ تھی اسی طرح، ہم نے آپ کو بھی، صرف ایمان پر ثواب کی خوشی ملانے والا اور کفر پر عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (اگر کوئی ایمان نہ لائے کچھ غم نہ کیجئے) اور قرآن میں صفت راستی کے ساتھ بمقتضائی رحمت اور بھی ایسے صفات کی رعایت کی گئی ہے کہ اس سے ہدایت زیادہ آسان ہو چنانچہ ایک تو یہ کہ اس میں ہم نے آیات وغیرہ کا جابجا فصل رکھا تاکہ آپ اسکو لوگوں کے سامنے ٹھہر کر پڑھیں جس میں وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کیونکہ تقریر بطویل مسلسل بعض اوقات مضبوط نہیں آتی، اور دوسرے یہ کہ ہم نے اسکو اتارنے میں بھی حسب واقعات، تدریجاً اتارا تاکہ معالیٰ کا خوب انکشاف ہو اب ان سب امور کا مقتضایہ تھا کہ یہ لوگ ایمان لے آتے لیکن اس پر بھی ایمان نہ لادیں تو آپ کچھ پروا نہ کیجئے بلکہ صاف کہہ دیجئے کہ تم اس قرآن پر خواہ ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، مجھ کو کوئی پروا نہیں دو وجہ سے اول تو یہ کہ میرا کیا ضرر کیا، دوسرے یہ کہ تم ایمان نہ لائے تو کیا ہوا دوسرے لوگ ایمان لے آئے چنانچہ جن لوگوں کو قرآن (کے نزول) سے پہلے دین کا علم دیا گیا تھا یعنی منتخب علماء اہل کتاب یہ قرآن جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھہریلوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب، وعدہ خلافی سے، پاک ہے بیشک ہمارا رب کا وعدہ ضرور پورا ہی ہوتا ہے، سو جس کتاب کا جس نبی پر نازل کرنے کا وعدہ کتب سابقہ میں کیا تھا اسکو پورا فرمادیا، اور ٹھہریلوں کے بل (جو گرتے ہیں) تو روتے ہوئے گرتے ہیں، اور یہ قرآن (یعنی اسکا سننا، ان کا ادلی، نشو و نما اور بڑھاتا ہے) کیونکہ ظاہر و باطن کا توافیق کیفیت کو قوی کر دیتا ہے۔

معارف و مسائل

وَأَنذَرْتُ مُوسَىٰ لِقَائِ اللَّهِ (۱) اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو آیات بینات عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ آیت کا لفظ معجزے کے معنی میں بھی آتا ہے اور آیات قرآن یعنی احکام الہیہ کے معنی میں بھی اس جگہ دونوں معنی کا احتمال ہے اسی لئے ایک جماعت مفسرین نے اس جگہ آیات سے مراد معجزات لئے ہیں اور نو کے عدد سے یہ ضرور نہیں کہ نو سے زائد ہوں مگر اس جگہ نو کا ذکر کسی خاص اہمیت کی بنا پر کیا گیا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ نو معجزات اس طرح شمار فرمائے ہیں (۱) عصائی موسیٰ جو اشد بانجانی تھی (۲) بدینیا جسکو گریبان میں ڈال کر نکالنے سے چمکے لگتا تھا، (۳) زبان میں لکنت تھی وہ دور کر دی گئی (۴) بنی اسرائیل کے دریا پار کرنے کے لئے دریا کو بھاڑ کر اسکے دو حصے لگ کر دیئے اور انہیں دیدیا، (۵) ٹہی دل کا غذا غیر معمولی صورت میں بھیج دیا گیا، (۶) طوفان صہبہ یا گیا، (۷) بدن سے چروں میں سمجھ جوتیں پیدا کر دی گئیں جن سے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا، (۸) سینہ کون کا ایک عذاب مسلط کر دیا گیا کہ ہر کھانے پینے کی

چیزیں میٹک آجاتے تھے (۹) خون کا عذاب بھیجا گیا کہ ہر مرتبہ اور کھانے پینے میں خون ملتا تھا۔

اور ایک صحیح حدیث کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیات سے مراد احکام الہیہ ہیں

یہ حدیث ابو داؤد نسائی، ترمذی، ابن ماجہ میں بسند صحیح حضرت سعید بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے

وہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ مجھے اس نبی کے پاس ایسا پورا ساتھی نے کہا

کہ نبی نہ کہو اگر ان کو خیر ہوگی کہ ہم بھی انکو نبی کہتے ہیں تو ان کی چار آنکھیں ہو جاویں گی یعنی انکو فخر و

مسرّت کا موقع مل جاوے گا۔ پھر یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور دریافت کیا کہ نبی علیہ السلام کو جو نو آیات بینات دی گئی تھیں وہ کیا ہیں رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴)

جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسکو ناحق قتل نہ کرو (۵) کسی بے گناہ پر جھوٹا الزام لگا کر قتل و سزا

کے لئے پیش نہ کرو (۶) جادو نہ کرو (۷) سود نہ کھاؤ (۸) پاکدامن عورت پر بدکاری کا بہتان

نہ باندھو (۹) میدان جہاد سے جان بچا کر نہ بھاگو۔ اور اسے یہود و خاکر تمہارے لئے یہ بھی حکم ہے

کہ یوم السبت، رینچر کے جو خاص احکام تھے دینے گئے انکی خلاف ورزی نہ کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سکر دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں

اور پاؤں کو پوس دیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں میرا اتباع

کرنے سے کیا چیز روکتی ہے کہنے لگے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعا کی تھی کہ ان کی

ذرت میں ہمیشہ نبی ہوتے رہیں اور وہیں خطرہ ہے کہ اگر ہم آپکا اتباع کرنے لگیں تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے۔

چونکہ یہ تفسیر صحیح حدیث سے ثابت ہے اس لئے بہت سے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

يَبْكُونَ وَيَرْبُّوْا هُمْ خَشُوْا تَقْصِيْرُ مَنَظَرِيْ فِيْ هٰذَا كَلَامُ الْقُرْآنِ كَيْفَ رَوْنَا مَسْتَحْبَبٌ هُوَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم میں نہ جاوے گا وہ

شخص جو اللہ کے خوف سے رو یا جب تک کہ دو بار دو بارہ گناہوں میں واپس نہ لوٹ جائے

(یعنی جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ گناہوں سے نکالا ہو اور وہ پھر گناہوں میں واپس ڈال دیا جائے اسی طرح یہ بھی

نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے خوف سے رونے والا جہنم میں چلا جائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے دو آنکھوں پر جہنم کی آگ حرام کر دی ایک وہ جو اللہ کے خوف سے روئے دوسرے جو اسلامی

سرحد کی حفاظت کے لئے رات کو بیدار رہے، بیوقوفی و حاکم و سمجھ اور حضرت نصر بن سعد فرماتے ہیں

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس قوم میں کوئی اللہ کے خوف سے رونے والا ہو تو اللہ تعالیٰ

اس قوم کو اس کی وجہ سے آگ سے نجات عطا فرماویں گے۔ (روح عن الحکیم الترمذی)

آج سب سے بڑی مصیبت جو مسلمانوں پر پڑی ہے اسکا سبب یہی ہے کہ انہیں خدا کے خوف

سے رونے والے بہت کم رہ گئے صاحب روح المعانی اس موقع پر خدا کے خوف سے رونے کے فضائل کی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ وینبغی ان یکون ذلک حال العلماء یعنی علماء دین کا یہی حال ہونا چاہئے کیونکہ ابن جریر ابن منذر وغیرہ نے عبد اللہ علی بن ابی رہ کا یہ منقولہ نقل کیا ہے۔ ”جس شخص کو صرغ ایسا علم ملا ہو جو اسکو راتا نہیں تو سمجھ لو کہ اسکو علم نافع نہیں ملا۔“

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِادْعُوا الرَّحْمَنَ ۖ أَيًّا مَاتَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ

کہ اللہ بیکار و یا رحمن کہ کہ جو کہ کر بکارو گے سو اسی کے ہیں سب

الْحُسْنَى ۖ وَلَا تَجْمُرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافُ بِمَا وَابْتَغِ بَيْنَ

نام خاصے اور پکار مت پڑھ اپنی نماز اور نہ چکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے

ذَلِكَ سَبِيلًا ﴿١١٠﴾ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَفَّرَ عَنْكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَأَلْهَمَكُمْ هَذَا الْقُرْآنَ الَّذِي تَقْرَأُونَ

ہیں۔ سب تعریفیں اللہ کے جو نہیں رکھتا اولاد اور نہ کوئی اس

لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَكَمْ يُكُنُّ لَهُ وِلِيُّ مِمَّنْ الذَّلِيلُ

کا مائشی سلطنت میں اور نہ کوئی اس کا مردگار وقت کے وقت پر

وَكَبِيرٌ تَكْبِيرًا ۝

ادرس کی بڑائی کو بڑا جان کر ۔

خلاصہ فقیر

آپ فرمادیجئے کہ خواہاں لکھ کر پکار دیا جن کہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گئے (تو بہتر ہے
کیونکہ) اس کے بہت سے اچھے نام ہیں اور اس کا شرک سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ ایک ہی ذات
کے کئی نام ہونے سے اسکی توحید میں کوئی فرق نہیں آتا، اور اپنی جہری نماز میں نہ تو بہت پکار کر بیٹھے
کہ مشرکین سنیں اور خرافات بکھیں اور نماز میں قلب مشغوش ہو، اور نہ بالکل ہی آہستہ پڑھیے (کہ
مقتدی نمازیوں کو بھی سنائی نہ دے، کیونکہ اس سے انکی تعلیم و تربیت میں کمی آتی ہے) اور دو لوگوں
کے درمیان ایک (متوسط) طریقہ اختیار کر لیجئے (تاکہ مصلحت فوت نہ ہو اور حضرت پیش نہ آئے)
اور رکوع پر رد کرنے کے لئے علی الاعلان کہہ دیجئے کہ تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے (خاص)
ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اس کا کوئی شریک سلطنت ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے کوئی اس کا

مددگار رہے اور اسکی خوب بڑائی بیان کیا گئے۔

معارف و مسائل

یہ سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیات ہیں اس سورت کے شروع میں بھی حق تعالیٰ کی تعظیم اور توحید کا بیان تھا ان آخری آیات میں بھی اسی پر ختم کیا جا رہا ہے ان آیتوں کا نزول چند واقعات کی بناء پر ہوا۔ اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز دعا میں یا اللہ اور یا محمد کہہ کر پکارا تو مشرکین نے سمجھا کہ یہ دو خداؤں کو پکارتے ہیں اور کہنے لگے کہ ہیں تو ایک کے ہوا کس اور کو پکارتے سے منع کرتے ہیں اور خود دو معبودوں کو پکارتے ہیں اسکا جواب آیت کے پہلے حصہ میں دیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہ کے دو ہی نہیں اور بھی بہت سے اچھے نام ہیں کسی نام سے بھی پکاریں مراد ایک ہی ذات ہے تمہارا وہم غلط ہے۔

دوسرا حصہ یہ ہے کہ جب مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں بلند آواز سے تلاوت قرآن فرماتے تو مشرکین تمسخر و استہزاء کرتے اور قرآن اور جبریل امین اور خود حق تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ باتیں کہتے تھے اس کے جواب میں اسی آیت کا آخری حصہ نازل ہوا جس میں آپ کو جہر و اخفار میں میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی کہ ضرورت تو اس درمیانہ آواز سے پوری ہو جاتی ہے اور زیادہ بلند آواز سے جو مشرکین کو موقع ایذا رسانی کا ملتا تھا اس سے نجات ہو۔

تیسرا حصہ یہ ہے کہ یہ دو نصاریٰ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد قرار دیتے تھے اور عرب بتوں کو اللہ کا شریک کہتے تھے اور عیسائی اور مجوسی کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے مخصوص مقرب ہوں تو اسکی قدر و عزت میں کمی آجائے ان تینوں فرقوں کے جواب میں آہنری آیت نازل ہوئی جس میں تینوں چیزوں کی نفی ذکر کی گئی ہے۔

دنیا میں جس سے مخلوق کو کس قدر قوت پہونچا کرتی ہے وہ بھی تو اپنے سے چھوٹا ہوتا ہے جیسے اولاد اور بھی اپنی برابر ہوتا ہے جیسے شریک اور بھی اپنے سے بڑا ہوتا ہے جیسے حامی مددگار حق تعالیٰ نے اس آیت میں یہ ترتیب تینوں کی نفی فرمادی۔

مسئلہ: آیت مذکورہ میں نماز کے اندر تلاوت کرنے کا یہ ادب بتلایا گیا ہے کہ بہت بلند آواز سے ہونہ بہت آہستہ جسکو مقتدی زن سکیں۔ یہ حکم ظاہر ہے کہ چہری نمازوں کے ساتھ مخصوص ہے ظہر اور عصر کی نمازوں میں تو بالکل اخفار ہونا سنت متواترہ سے ثابت ہے۔

چہری نماز میں مغرب عشاء اور فجر کے فرض بھی داخل ہیں اور نماز تہجد بھی جیسا کہ ایک حدیث میں

کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد کے وقت صدیق اور فاروق اعظم کے پاس سے گذرے تو صدیق اکبر تلاوت آہستہ کر رہے تھے اور فاروق اعظم خوب بلند آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق سے فرمایا کہ آپ ایسا آہستہ کیوں پڑھتے ہیں صدیق نے عرض کیا کہ مجھے بسکون ملتا تھا اسکو سنا دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر غشی سے غشی آواز کو بھی سنتے ہیں آپ نے فرمایا کہ کسی قدر جہ سے پڑھا کرو پھر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں نیند اور شیطان کو دفع کرنے کے لئے بلند آواز سے پڑھتا ہوں آپ نے ان کو بھی حکم دیا کہ کچھ پست آواز سے پڑھا کرو۔ (ترمذی از منظر ہی)

نماز اور غیر نماز میں تلاوت قرآن کو ہر سے اور اخذ سے ادا کرنے کے متعلق مسائل سورۃ اعراف میں بیان ہو چکے ہیں آخری آیت **قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ** کے متعلق حدیث میں ہے کہ آیت عزت یہ آیت ہے **الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي الْمَوْدُ وَالْمِيزَانِ** معاذ اللہ یعنی کذا فی المنظر ہی، اس آیت میں یہ ہدایت بھی ہے کہ کوئی انسان کتنی ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح و تحمید کرے۔ اپنے نفس کو اس کے حق کے مقابلہ میں کم سمجھنا اور قصور کا اعتراف کرنا اس کے لئے لازم ہے (منظر ہی)

اور سنت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی عربیہ میں جب کوئی بچہ زبان کھولنے کے قابل ہو جاتا تو اسکو آپ یہ آیت سکھا دیتے تھے **وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَخْلُقْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ شَرِيْكًَا فِي الْمَلٰٓئِكَةِ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ وَلِيٌّ شَرِيْكًَا فِي الدَّٰلِ وَكَثِيْرًا تَكْبِيْرًا** (منظر ہی)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلا اس طرح کہ یہ ایات آپ کے ہاتھ میں تھیں آپ کا گدرا ایک ایسے شخص پر ہوا جو بہت ننگستہ حال اور پریشان تھا آپ نے پوچھا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہو گیا اس شخص نے عرض کیا کہ بیماری اور ننگدستی نے یہ حال کر دیا آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں چند کلمات بتاتا ہوں وہ پڑھو گے تو تمہاری بیماری اور ننگدستی جاتی رہے گی وہ کلمات یہ تھے **اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ لَا یُؤْتِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَخْلُقْ وَلَدًا وَلَمْ یَكُنْ لَهٗ شَرِیْکًا فِی الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ لَمْ یَكُنْ لَهٗ وَ لِیٌّ شَرِیْکًا فِی الدَّالِ وَ کَثِیْرًا تَکْبِیْرًا** (ابو یعلیٰ وابن سنی، از منظر ہی)

تم تفسیر سورۃ بنی اسرائیل بعون اللہ و حمدہ بعد العشاء لعاش

جمادی الاولیٰ سنہ ۳۹ھ فالحمد للہ اولہ و آخرہ۔

عرض حال | آج ۳۹ شعبان ۱۴۱۱ھ یوم السبت میں بحمد اللہ معارف القرآن کے مسودہ پر نظر ثانی از مولف
بھی مکمل ہو گئی ہے اب یہ نعمت قرآن کریم کی تفسیر حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے پوری کرادی جس کی بظاہر اسباب کوئی امید نہیں تھی کیونکہ رمضان ۱۴۱۰ھ کے آخر میں یہ ناکارہ ایسے محنت

امراض میں مبتلا ہو کہ تقریباً ایک سال تو بستر ہی پر موت و حیات کی کشمکش میں گزارا اس وقت مجبوری و معذرت کی
کے عالم میں بار بار یہ سرت ہوتی تھی کہ بعض تصانیف کے مسودات جو قریب تکمیل تھے کاش ان کی تکمیل
ہو جاتی تعارف القرآن کے نام سے جو درس قرآن عرصہ دراز تک ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا رہا بہت
سے دوستوں کے تقاضے سے اس پر نظر ثانی اور درمیان سے باقی رہی ہوئی آیات کی تفسیر کی تکمیل کا جو سلسلہ
پہل رہا تھا کسی طرح اس کی تکمیل ہو جاتی اسی طرح سب کی حضرت حکیم الامتہ تھانوی قدس سرہ نے قرآن کریم
کی دو منزلیں یا نحویں اور تھیلی کے احکام القرآن بزبان عربی لکھنے کے لئے انگریزوں کو مامور فرمایا تھا اس کا
بھرا آخری حصہ لکھنے سے باقی رہ گیا تھا موت و حیات کی کشمکش اٹھنے بیٹھنے سے معذوری ہی کے عالم میں
شاید اس سرت نایافت کی شنوائی بارگاہ رب العزت میں ہو گئی اور یہ خیال غالب آیا کہ جو کچھ جنت ابن
پڑے وہ کام کر لیا جائے یہ فکر چھوڑ دی جائے کہ جو رہ جائے گا اس کا کیا ہو گا اس خیال نے ایک عزم کی
صورت اختیار کر لی بستر پر لیٹے ہوئے ہی تفسیر پر نظر ثانی اور احکام القرآن کی تکمیل کا کام شروع کر دیا
مجاہد قدرت سے ہے کہ اس بیماری کے زمانے میں کام اتنی سرعت سے چلا کہ تندرستی میں بھی یہ رفتار
نہ تھی اور پھر شاید اسی کی برکت سے حق تعالیٰ نے ان معذور و مجبور کو دینے والے امراض سے شفا رکھی
فرمادی اور ایک حد تک تندرستی کی صورت حاصل ہو گئی، تو اب وقت کی قدر چاہی اور ان کاموں پر
بقدر استطاعت وقت صرف کیا یہ محض حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہی تھا کہ احکام القرآن کی دونوں منزلیں
کی تکمیل بھی ہو گئی اور اسی عرصہ میں یہ دونوں جلدیں چھپ کر نکلیں ہو گئی اور تفسیر معارف القرآن کی دو
جلدیں سورہ نسا تک چھپ کر نکلیں ہو گئی ہیں تیسری جلد سورہ اعراف تک زیر طباعت ہے اور آج حضرت
قرآن کے مسودہ تفسیر پر نظر ثانی کی بھی تکمیل ہو گئی۔ (فلسفہ الہدایہ و آخرہ)

اس وقت جبکہ یہ سطور زیر تحریر ہیں احتراماً کارہ کی عمر کے ۵۰ سال پورے ہو کر ۵۱ شعبان ۱۳۹۰ھ
کو عمر کی چھتہ دہائی منزل شروع ہو گئی، مختلف امراض میں ابتلا و ضعف طبعی اس پر مشاغل و افکار کا
ہجوم ہے اب آگے کسی تصنیف و تالیف کی توقع رکھنا امید ہو ہوم سے زائد کچھ نہیں ہو سکتا لیکن خیر
قرآن کے نام پر خوار فرمائی گئی ہیں ناقص در ناقص محدث ہو لکھنے والے کیلئے سعادت ہی سعادت اس خیال
نے اس پر آمادہ کر دیا کہ سورہ کہف کی تفسیر بھی بنام خدا تعالیٰ شروع کر دی جائے اور باقیہ عمر میں جو کچھ ہو سکے
اس کو تلخیص سمجھا جائے کیونکہ قصہ قرآن ختم کرنا نہیں قرآن میں اپنی عمر و توانائی ختم کرنا ہے واللہ
الموفق والعین۔

سورہ بنی اسرائیل ختم شد

سُورَةُ الْكَهْفِ

سُورَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَعِشْرُونَ آيَةً اثْنَا عَشَرَ رُكُوعًا

سورۃ کہف مکہ میں اتری اور اس کی ایک سو دس آیتیں ہیں اور بارہ رکوع

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ

سب تعریف اللہ کو جس نے اتاری اپنے بندے پر کتاب اور نہ رکھی

لَهُ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ رَابِئًا شَدِيدًا مِّمَّنْ لَدُنْهُ وَيُنَبِّئَ

اس میں کچھ کجی ۔ ٹھیک اتاری تاکہ ڈر سنائے ایک آفت کا اللہ کی طرف سے اور خوش خبری دے

الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ۝

ایمان لانے والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں کہ ان کے لئے اچھا بدلہ ہے ،

مَّا كُنْتُمْ فِيهِ أَبَدًا ۝ وَيُنْذِرُ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۝

جس میں رہا کریں ہمیشہ ، اور ڈر سنائے ان کو جو کہتے ہیں اللہ بکھتا ہے اولاد

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ

کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی اور نہ ان کے باپ دادوں کو ، کیا بڑی بات نکلتی ہے

أَفْوَاهِهِمْ إِنَّ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ۝ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ بِفُسْكَ

ان کے منہ سے سب جھٹ ہے جو کہتے ہیں ، سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو

عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ۝ إِنَّا جَعَلْنَا

ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچھتا پچھتا کر ، ہم نے بنایا ہر

مَاعَلَى الْأَرْضِ زَيْنَةً لِّهَآلِنَبِّئِهِمْ أَن يَكْتُمَ أَحْسَنَ عَمَلًا ۝ وَإِنَّا

جو کچھ زمین پر ہے اس کی رونق تاکہ جنہیں لوگوں کو کون ان میں اچھا کرتا ہی کام ، اور ہر کو

لَجَعَلُونَ مَاعَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝

کرنا ہے جو کچھ اس پر ہے میدان پھانت کر۔

سورۃ کہف کی خصوصیات
اور فضائل

مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مسند احمد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ جس شخص نے سورۃ کہف کی پہلی دس آیتیں حفظ کر لیں وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا، اور کتب مذکورہ میں حضرت ابوالدرداء

ہی سے ایک دوسری روایت میں یہی مضمون سورۃ کہف کی آخری دس آیتیں یاد کرنے کے متعلق منقول ہے اور مسند احمد میں بروایت حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۃ کہف کی پہلی اور آخری آیتیں پڑھ لے اس کے لئے اس کے قدم سے سر تک ایک نور ہو جاتا ہے، اور جو پوری سورت پڑھ لے تو اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہو جاتا ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۃ کہف کی تلاوت کرے، اس کے قدم سے آسمان کی بلندی تک نور ہو جاتا ہے گا، جو قیامت کے دن روشنی دے گا، اور پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک کے اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے، (امام ابن کثیر نے اس روایت کو موقوف قرار دیا ہے) اور حافظ ضیاء المقدسی نے اپنی کتاب منتارہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۃ کہف پڑھ لے وہ آٹھ روز تک ہر فتنے سے معصوم رہے گا، اور اگر دجال نکل آئے تو یہ اس کے فتنے سے بھی معصوم رہے گا۔ (یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)۔

روح المعانی میں دیلی سے بروایت حضرت انس نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ کہف پوری کی پوری ایک وقت میں نازل ہوئی، اور ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ آئے جس سے اس کی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے۔

امام ابن جریر طبری نے بروایت حضرت ابن عباس نقل کیا ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا ہوا اور قریش مکہ اس

شان نزول

پریشان ہوتے تو انھوں نے اپنے دو آدمی نصر بن حارث اور عقبہ ابن ابی معیط کو مدینہ طیبہ کے علماء یہود کے پاس بھیجا کہ وہ لوگ کتب سابقہ تورات و انجیل کے عالم ہیں وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ علماء یہود نے ان کو بتلایا کہ تم لوگ ان سے تین سوالات کرو، اگر انھوں نے ان کا جواب صحیح دیا تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے نبی و رسول ہیں اور یہ نہ کر سکتے تو یہ سمجھ لو کہ یہ بات بنانے والے ہیں رسول نہیں۔ ایک تو ان سے ان نوجوانوں کا حال دریافت کرو جو قدیم زمانے میں اپنے شہر سے نکل گئے تھے، ان کا کیا واقعہ ہے، کیونکہ یہ واقعہ عجیبہ ہے، دوسرے ان سے اس شخص کا حال پوچھو جس نے دنیا کی مشرق و مغرب اور تمام زمین کا سفر کیا اس کا کیا واقعہ ہے، تیسرے ان سے روح کے متعلق سوال کرو کہ وہ کیا چیز ہے؟

یہ دونوں قریشی مکہ مکرمہ واپس آئے اور اپنی برادری کے لوگوں سے کہا کہ ہم ایک فیصلہ کن صورت حال لے کر آئے ہیں، اور علماء یہود کا پورا قصہ سنایا، پھر یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ سوالات لے کر حاضر ہوئے، آپ نے سن کر فرمایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا، مگر آپ اس وقت انشاء اللہ کہنا بھول گئے، یہ لوگ لوٹ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی الہی کے انتظار میں رہے کہ ان سوالات کا جواب وحی سے بتلادیا جائے گا، مگر وعدہ کے مطابق اگلے دن تک کوئی وحی نہ آئی، بلکہ پندرہ دن اسی حال پر گزر گئے، کہ نہ جبرئیل امین آئے نہ کوئی وحی نازل ہوئی، قریش مکہ نے مذاق اڑانا شروع کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت بے و غم پہنچا۔

پندرہ دن کے بعد جبرئیل امین سورۃ کہف لے کر نازل ہوئے جس میں تاخیر وحی کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو انشاء اللہ کہنا چاہئے، اس واقعہ میں چونکہ ایسا نہ ہوا اس پر تنبیہ کرنے کے لئے وحی میں تاخیر ہوئی، اس سورۃ میں اس معاملہ کے متعلق یہ آیتیں آگے آئیں گی وَلَا تَقُولَنَّ لِإِنِّیْ ذٰلِکَ عَدَآءٌ اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اور اس سورۃ میں نوجوانوں کا واقعہ بھی پورا بتلادیا گیا، جن کو اصحاب کہف کہا جاتا ہے، اور مشرق و مغرب کے سفر کرنے والے ذی القرنین کے واقعہ کا بھی مفصل بیان آگیا، اور روح کے سوال کا جواب بھی، (قرطبی و منہرجی بحوالہ ابن جریر) مگر روح کے سوال کا جواب اجمال کے ساتھ دینا مقتضائے حکمت تھا، اس کو سورۃ بنی اسرائیل کے آخر میں علیحدہ کر کے بیان کر دیا گیا، اور اسی سبب سورۃ کہف کو سورۃ بنی اسرائیل کے بعد لکھا گیا ہے، کذا ذکر السیوطی

یعنی جو جواب انہیں دیا جائیگا وہ دیدیا اور روح کے بارے میں ان کا نتیجہ جواب یہ ہونا کہ اصلی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ روایت جو تفسیر طبری ص ۱۹۱ ج ۱۵ میں منقول ہے اس روایت کے منافی نہیں جو کچھ اسی جلد کے صفحہ ۵۲۸ پر سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر ۸ کے تحت گذری ہے۔ محمد تقی عثمانی

خلاصہ تفسیر

تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ثابت ہیں جس نے اپنے (خاص) بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب نازل فرمائی، اور اس (کتاب) میں (کسی قسم کی) ذرا بہن کچی نہیں رکھی نہ لفظی کہ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہو، اور نہ معنوی کہ اس کا کوئی حکم حکمت کے خلاف ہو بلکہ اس کو بالکل استقامت کے ساتھ موصوف بنایا اور نازل اس لئے کیا کہ تاکہ وہ (کتاب کافروں کو عیاں) ایک سخت عذاب جو بجانب اللہ ان کو آخرت میں ہوگا ڈرائے اور ان ایمان کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ خوشخبری دے کہ ان کو (آخرت میں) اچھا اجر ملے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور تاکہ (کفار میں سے بالخصوص) ان لوگوں کو (عذاب) ڈرائے جو یوں کہتے ہیں کہ (خیر بالہ) اللہ تعالیٰ اولاد دیکھتا ہے (اور اولاد کا عقیدہ رکھنے والے کافروں کا عام کافروں سے الگ کر کے اس لئے بیان کیا گیا کہ اس باطل عقیدہ میں عرب کے عام لوگ مشرکین، یہود، نصاریٰ سب ہی مبتلا تھے) نہ تو اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے، اور نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی، بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، (اور) وہ لوگ بالکل (ہی) بھوٹ بکتے ہیں (جو عقلاً سمجھی ناممکن ہے، کوئی ادنیٰ عقل والا بھی اس کا قائل نہیں ہو سکتا، اور آپ جو ان لوگوں کے کفر و انکار پر اتنا غم کرتے ہیں کہ شاید آپ انکے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآنی) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دیدیں گے) یعنی اتنا غم نہ کیجئے کہ ہلاکت کے قریب کر دے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا عالم امتحان ہے، اس میں ایمان و کفر اور خیر و شر دونوں کا مجموعہ ہی رہے گا، سبھی مومن ہو جائیں گے ایسا نہ ہوگا، اسی امتحان کے لئے ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس (زمین) کے لئے باعث رونق بنایا، تاکہ ہم (اس کے ذریعہ) لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے یہ امتحان کرنا ہے کہ کون اس دنیا کی زینت اور رونق پر مفتون ہو کر اللہ سے اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اور کون نہیں، غرض یہ کہ یہ عالم ابتلا رہے، مگر دنیا اس میں کوئی مومن ہوگا کوئی کافر رہے گا، پھر غم بیکار ہو آپ اپنا کام کئے جائیے، اور ان کے کفر کا نتیجہ دنیا ہی میں ظاہر ہو جانے کا انتظار نہ کیجئے، کیونکہ وہ ہمارا کام ہے، ایک مقرر وقت پر ہوگا چنانچہ ایک روز وہ آئے گا کہ ہم زمین پر کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان کر دیں گے، (نہ اس پر کوئی بسنے والا ہوگا نہ کوئی درخت اور پہاڑ اور نہ کوئی مکان و تعمیر، خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنا کام تبلیغ کا کرتے رہئے، منکرین کے انجام بد کا اتنا غم نہ کیجئے)۔

معارف و مسائل

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا قَيِّمًا، لفظ عوج کے معنی کسی قسم کی کبی اور ایک طرف جھکاؤ کے ہیں، قرآن کریم اپنے لفظی اور معنوی کمال میں اس سے پاک ہے، نہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کسی جگہ ذرہ برابر کبی ہو سکتی ہے نہ علم و حکمت کے لحاظ سے، جو مفہوم لفظ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا سے ایک منفی صورت میں بتایا گیا ہے، پھر تاکید کے لئے اسی مضمون کو مثبت طور پر لفظ قَيِّمًا سے واضح کر دیا ہے، کیونکہ قَيِّمًا کے معنی ہیں مُسْتَقِيمًا اور مستقیم وہی ہے جس میں کوئی ادنیٰ کبی اور میلان کسی جانب نہ ہو، اور یہاں قَیِّم کے ایک دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں، یعنی نگران اور محافظ، اس معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن کریم جیسا اپنی ذات میں کامل مکمل ہر قسم کی کبی اور افرات و تفریط سے پاک ہے، اسی طرح یہ دوسروں کو بھی استقامت پر رکھنے والا اور بندوں کی تمام مصالح کی حفاظت کرنے والا ہے، اب خلاصہ ان دونوں لفظوں کا یہ ہو جائے گا کہ قرآن کریم خود بھی کامل و مکمل ہے اور مخلوق خدا کو بھی کامل و مکمل بنانے والا ہے (منظری)

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا، یعنی زمین پر جو مخلوقات حیوانات، نباتات، سمادات اور زمین کے اندر مختلف چیزوں کی کانیں موجود ہیں وہ سب زمین کے لئے زینت اور رونق بنائی گئی ہیں، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ مخلوقاتِ ارضیہ میں تو سانپ، بچھو، درندے جانور اور بہت سی مضر اور مہلک چیزیں بھی ہیں ان کو زمین کی زینت اور رونق کیسے کہا جاسکتا ہے کیونکہ جتنی چیزیں دنیا میں مضر اور مہلک اور خراب سمجھی جاتی ہیں وہ ایک اعتبار سے بیشک خراب ہیں مگر مجموعہ عالم کے لحاظ سے کوئی چیز خراب نہیں، کیونکہ ہر بُری سے بُری چیز میں دوسری حیثیات سے بہت سے فوائد بھی اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں، کیا زہریے جانوروں اور درندوں سے ہزاروں انسانی ضروریات معالجات وغیرہ میں پوری نہیں کی جاتیں، اس لئے جو چیزیں کسی ایک حیثیت سے بُری بھی ہیں لیکن مجموعہ عالم کے کارخانے کے لحاظ سے وہ بھی بُری نہیں، کسی نے خوب کہا ہے ۵

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ۶ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَرْبَةِ وَالرَّقِیْمِ كَانُوا مِنِ الْإِیْتِنَا

کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور کھوہ کے رہنے والے ہماری قدرتوں میں

لَجِبًا ۙ اِذَا وَاى الْغُفْيَةِ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا اِنَّا مِن لَّدُنكَ

جسباً چھٹے، جب جاہتے وہ جوان پہاڑ کی کھود میں پھر بولے اے رب ہم کو نے اپنے پاس

رَحْمَةً وَهَيَّا لَنَا مِنْ اَمْرِ نَارِشَدًا ۙ ۱۰ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ اُذُنِهِمُ

سے بخشش اور پوری کر دے ہمارے کام کی درستی، پھر قہقہہ دیتے ہم نے ان کے کان

فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۙ ۱۱ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْهُمُ لِنُعَلِّمَهُمُ الْكِتَابَ

اس کھود میں چند برس گنتی کے، پھر ہم نے ان کو اٹھایا کہ معلوم کریں دو فرقوں میں

اَحْصٰى لِمَا كُتِبَ عَلَيْهِمُ ۙ ۱۲

کس نے یاد رکھی ہر جتنی مدت وہ رہے۔

تشریح اللغات

کہف: پہاڑی غار جو وسیع ہو اس کو کہف کہتے ہیں، جو وسیع نہ ہو اس کو غار کہا جاتا ہے، رقیم: انظلی اعتبار سے بہنے المرقوم ہے، یعنی لکھی ہوئی چیز

اس مقام پر اس کی مروت، اس میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، ضحاک اور سہمی اور ابن جریر بروایت ابن عباسؓ اس کے معنی ایک لکھی ہوئی تختی کے قرار دیتے ہیں جس پر بادشاہ وقت نے اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دروازہ پر لگا دیا تھا، اسی وجہ سے اصحاب کہف کو اصحاب الرقیم بھی کہا جاتا ہے، قتادہ، عطیہ، عوفی، مجاہد کا قول یہ ہے کہ رقیم اس پہاڑ کے نیچے کی وادی کا نام ہے جس میں اصحاب کہف کا غار تھا، بعض نے خود اس پہاڑ کو رقیم کہا ہے، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ رقیم کسی لکھی ہوئی تختی کا نام ہے یا کسی بستی کا، کعب ابن بکر بن مسلمہ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رقیم، ایلہ یعنی عقبہ کے قریب ایک شہر کا نام ہے جو بلاد روم میں واقع ہے۔

فُتِيَتْ، فُتِيَتْ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں نوجوان

فَضَرَبْنَا عَلَىٰ اُذُنِهِمُ ۙ اِذَا اِنْيَمُ ۙ ۱۰ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ اُذُنِهِمُ ۙ ۱۰

ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ نیند کے وقت سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے، مگر کان

اپنا کام کرتے رہتے ہیں، آواز سنائی دیتی ہے، جب نیند مکمل اور غالب ہو جاتی ہے تو کان بھی

اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر بیداری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کرتے ہیں کہ آواز سے

سرنے والا چونکتا ہے پھر بیدار ہوتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے (یہ دونوں ایک ہی جماعت کے لقب ہیں) ہماری عجائبات (قدرت) میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے (جیسا کہ یہود نے کہا تھا کہ ان کا واقعہ عجیب ہی یا خود ہی سوال کرنے والے کفار قریش نے اس کو عجیب سمجھ کر سوال کیا تھا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو شناسنا مقصود ہے کہ یہ واقعہ بھی اگرچہ عجیب ضرور ہے مگر اللہ تعالیٰ کی دوسری عجائبات قدرت کے مقابلہ میں ایسا قابل تعجب نہیں جیسا ان لوگوں نے سمجھا ہے، کیونکہ زمین و آسمان اور چاند و سورج اور تمام کائنات زمین و آسمان کو رحم سے وجود میں لانا اصل عجائب میں سے ہے، چند نوجوانوں کا زمانہ دراز تک سوتے رہنا پھر بیدار ہونا اس کے مقابلہ میں کچھ عجیب نہیں، اس تمہید کے بعد اصحاب کہف کا قصہ اس طرح بیان فرمایا اور وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے (ایک بے دین بادشاہ کی گرفت سے بھاگ کر) اس غار میں (جس کا قصہ آگے آتا ہے) جا کر پناہ لی پھر اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا مانگی کہ: کما کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے (اس ہکم) میں درستی کا سامان مہیا کر دیجئے (غالباً رحمت سے مراد حصول مقصود ہے، اور درستی کے سامان سے مراد وہ اسباب و مقدمات ہیں جو حصول مقصد کے لئے عادتاً ضروری ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا، اور ان کی حفاظت اور تمام پریشانیوں سے نجات دینے کی صورت اس طرح بیان فرمائی کہ) سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو رنیدت (اٹھایا تاکہ ہم (ظاہری طور پر بھی) معلوم کر لیں کہ (غار میں رہنے کی مدت میں بحث و اختلاف کرنے والوں میں سے) کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا، (نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان میں ایک گروہ کا قول تو یہ تھا کہ ہم پر اردن یا کچھ حصہ ایک دن کا سوتے ہیں، دوسرے گروہ نے کہا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ تم کتنے دن سوتے رہے، آیت میں اشارہ اسی طرف ہے کہ یہ دوسرا گروہ ہی زیادہ حقیقت شناس تھا جس نے مدت کی تعیین کو اللہ کے سوال کیا، کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہ تھی)۔

معارف و مسائل

قصہ اصحاب کہف و رقیہ | اس قصہ میں چند مباحث ہیں، اول یہ کہ اصحاب کہف و اصحاب رقیہ ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں، یا یہ الگ الگ دو جماعتیں ہیں، اگرچہ کسی صحیح حدیث میں اسکی

کوئی تصریح نہیں، مگر امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح میں اصحاب الکہف اور اصحاب الرقیم و دوحیان الگ الگ دیئے، پھر اصحاب الرقیم کے تحت وہ مشہور قصہ میں شخصوں کے غار میں بند ہو جانے پھر دعاؤں کے ذریعہ راستہ کھل جانے کا ذکر کیا ہے، جو تمام کتب حدیث میں مفصل موجود ہے، امام بخاری کی اس صبیح سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک اصحاب کہف ایک جماعت ہے، اور اصحاب الرقیم ان تین شخصوں کو کہا گیا ہے جو کسی زمانے میں غار میں چھپے تھے، پھر پہاڑ سے ایک بڑا پتھر اس غار کے دھانے پر آگرا جس سے غار بالکل بند ہو گیا، ان کے نکلنے کا راستہ نہ رہا، ان تینوں نے اپنے اپنے خاص نیک اعمال کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کی کہ یہ کام اگر ہم نے خاص آپ کی رضا کے لئے کیا تھا تو اپنے فضل سے ہمارا راستہ کھول دے، پہلے شخص کی دعا سے پتھر کچھ ہل گیا، روشنی آنے لگی، دوسرے کی دعا سے اور زیادہ ہل گیا، پھر تیسرے کی دعا سے راستہ بالکل کھل گیا۔

لیکن حافظ ابن جریر نے شرح بخاری میں یہ واضح کیا ہے کہ از روئے روایت حدیث اس کی کوئی تصریح دلیل نہیں ہے کہ اصحاب الرقیم مذکورہ تین شخصوں کا نام ہے، بات صرف اتنی ہے کہ واقعہ غار کے ایک راوی حضرت نعمان بن بشیر کی روایت میں بعض راویوں نے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا، آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سن رہے تھے، یہ اضافہ فتح الباری میں بزار اور طبرانی کی روایت سے نقل کیا ہے، مگر اول تو اس حدیث کے عام راویوں کی روایات جو صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مفصل موجود ہیں، ان میں کسی نے حضرت نعمان بن بشیر کا یہ اضافہ نقل نہیں کیا، خود بخاری کی روایت بھی اس جملے سے خالی ہے، پھر اس جملے میں بھی اس کی تصریح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار میں بند ہونے والے ان تین شخصوں کو

اصحاب الرقیم فرمایا تھا، بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ آپ رقیم کا ذکر فرما رہے تھے، اس ضمن میں ان تین شخصوں کا ذکر فرمایا، لفظ رقیم کی مراد کے متعلق صحابہ و تابعین اور عام مفسرین میں جو اختلاف اقوال اور نقل کیا گیا ہے وہ خود اس کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رقیم کی کوئی مراد متعین کرنے کے بارے میں کوئی روایت حدیث نہیں تھی، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک لفظ کی مراد خود متعین فرمادیں، پھر صحابہ و تابعین اور دوسرے مفسرین اس کے خلاف کوئی قول اختیار کریں، اسی لئے حافظ ابن جریر شارح بخاری نے اصحاب کہف و رقیم کے دو الگ الگ جماعتیں ہونے سے انکار فرمایا، اور صحیح یہ قرار دیا کہ یہ دونوں ایک ہی جماعت کے نام ہیں، غار میں بند ہو جانے والے تین شخصوں کا ذکر رقیم کے ذکر کے ساتھ آگیا ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہی تین شخص اصحاب الرقیم تھے۔

حافظ ابن جر نے اس جگہ یہ بھی واضح کر دیا کہ قرآن نے جو قصہ اصحاب کہف کا بیان کیا ہے اس کا سیاق خود یہ بتلا رہا ہے کہ اصحاب کہف درقیم ایک ہی جماعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہور مفسرین اور محدثین ان دونوں کے ایک ہی ہونے پر متفق ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس جگہ خود اس قصے کی تفصیلات کا ہے جس کے ڈھسے میں ایک وہ جو اس قصہ کی روح اور اصل مقصود ہے، جس سے یہود کے سوال کا جواب بھی ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایات و نصائح بھی، دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق اس قصہ کی صرف تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے ہے، بیان مقصود میں اس کا کوئی خاص دخل نہیں، مثلاً یہ قصہ کس زمانے میں اور کس شہر اور بستی میں پیش آیا، جس کا فریاد شاہ سے بھاگ گئے ان لوگوں نے غار میں پناہ لی تھی وہ کون تھا، اس کے کیا عقائد و خیالات تھے، اور اس نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جس سے یہ بھاگنے اور غار میں چھپنے پر مجبور ہو گئے، پھر یہ کہ ان لوگوں کی تعداد کیا تھی، اور زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا کُل زمانہ کتنا تھا، اور پھر یہ لوگ اب تک زندہ ہیں یا مر گئے۔

قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوب خاص کے تحت سارے قرآن میں ایک قصہ یوسف علیہ السلام کے سوا کسی قصے کو پوری تفصیل اور ترتیب سے بیان نہیں کیا، جو عام تاریخی کتابوں کا طریقہ ہے، بلکہ ہر قصے کے صرف وہ اجزاء موقع بموقع بیان فرمائے ہیں جن سے انسانی ہدایات اور تعلیمات کا تعلق تھا۔ (قصہ یوسف علیہ السلام کو اس اسلوب سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ سورۃ یوسف کی تفسیر میں گذر چکی ہے)۔

قصہ اصحاب کہف میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن میں اس کے صرف وہ اجزاء بیان کئے گئے جو مقصود اصلی سے متعلق تھے، باقی اجزاء جو خالص تاریخی یا جغرافیائی تھے ان کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اصحاب کہف کی تعداد اور سونے کے زمانے کی مدت کے سوالات کا ذکر تو فرمایا اور جواب کی طرف اشارہ بھی فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی کہ ایسے مسائل میں زیادہ غور و فکر اور بحث و تکرار مناسب نہیں ان کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنا چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا فرض منصبی معانی قرآن کو بیان کرنا اور آپ نے بھی کسی حدیث میں ان اجزاء قصہ کو بیان نہیں فرمایا، اور اکابر صحابہ و تابعین نے اسی شرآنی اسلوب کی بناء پر ایسے معاملات میں ضابطہ کا یہی قرار دیا کہ:

”یعنی جس غیر ضروری چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا تم بھی اسے مبہم رہنے دو
رکھ اس میں بحث و تحقیق کچھ مفید نہیں“

اَبْهَمُوا مَا ابْهَمَهُ اللّٰهُ،
(التقان، سیوطی)

اکابر صحابہ و تابعین کے اس طرز عمل کا مقتضی یہ تھا کہ اس تفسیر میں بھی ان اجزاء قصہ کو نظر انداز کر دیا جائے جن کو قرآن اور حدیث نے نظر انداز کیا ہے، لیکن یہ زمانہ وہ ہے جس میں تاریخی اور جغرافیائی انکشافات ہی کو سب بڑا کمال سمجھ لیا گیا ہے، اور متاخرین علمائے تفسیر نے اس کو کم و بیش ان اجزاء کو بھی بیان فرمادیا ہے، اس لئے زیر نظر تفسیر میں قصے کے وہ اجزاء جو خود قرآن میں مذکور ہیں ان کا بیان تو آیات قرآن کی تفسیر کے تحت آجائے گا، باقی تاریخی اور جغرافیائی اجزاء سے قصہ کو یہاں بقدر ضرورت بیان کیا جاتا ہے، اور بیان کرنے کے بعد بھی آخری نتیجہ وہی رہے گا کہ ان معاملات میں کوئی قطعی فیصلہ ناممکن ہے، کیونکہ اسلامی اور پھر مسیحی تاریخوں میں اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خود اس قدر مختلف اور متضاد ہے کہ ایک مصنف اپنی تحقیق و رائے کے پیش نظر مقدمات و قرائن کی مدد سے کسی ایک چیز کو مستحکم کرتا ہے تو دوسرا اسی طرح دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہے۔

دین کی حفاظت کے لئے غاروں میں پناہ لینے والوں کے واقعات مختلف شہروں اور خطوں میں مندرجہ ہوئے ہیں۔	مورخین کے اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دین مسیح علیہ السلام میں چونکہ رہبانیت کو دین کا سب بڑا کام سمجھ لیا گیا تھا تو ہر خطے اور ہر ملک میں ایسے واقعات متعدد پیش آئے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے غاروں میں پناہ گزین ہو گئے وہیں عمریں گزار دیں، اب جہاں جہاں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے اس پر مورخ کو اصحاب کہف کا گمان ہو جانا کچھ بعید نہیں تھا۔
---	--

اصحاب کہف کا گمان ہو جانا کچھ بعید نہیں تھا۔

اصحاب کہف کی جگہ اور ان کا زمانہ	امام تفسیر قرطبی اندلس نے اپنی تفسیر میں اس جگہ چند واقعات کچھ سماعی کچھ چشم دید نقل کئے ہیں، جو مختلف شہروں سے متعلق ہیں، قرطبی نے سب سے پہلے تونسواک کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ رقیم روم کے ایک شہر کا نام ہے، جس کے ایک غار میں اکیس آدمی لیٹے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورہ ہے، پھر امام تفسیر ابن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ شام میں ایک غار ہے جس میں کچھ مردہ لاشیں ہیں، وہاں کے مجاورین یہ کہتے ہیں کہ یہی لوگ اصحاب کہف ہیں، اور اس غار کے پاس ایک مسجد اور مکان کی تعمیر ہے جس کو رقیم کہا جاتا ہے، اور ان مردہ لاشوں کے ساتھ ایک مردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے۔
----------------------------------	--

اور دوسرا واقعہ اندلس غرناطہ کا نقل کیا ہے، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ غرناطہ میں ایک خوش نامی حکماء کے قریب ایک غار ہے جس میں کچھ مردہ لاشیں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے، ان میں سے اکثر لاشوں پر گوشت باقی نہیں رہا، مرنڈیوں کے ڈھانچے ہیں اور بعض پر اب تک گوشت پست بھی موجود ہے اس پر صدیا گزر گئیں مگر حیرت انگیز حال معلوم نہیں کچھ لوگ یہ کہتی ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں،

اور دوسرا واقعہ اندلس غرناطہ کا نقل کیا ہے، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ غرناطہ میں ایک خوش نامی حکماء کے قریب ایک غار ہے جس میں کچھ مردہ لاشیں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے، ان میں سے اکثر لاشوں پر گوشت باقی نہیں رہا، مرنڈیوں کے ڈھانچے ہیں اور بعض پر اب تک گوشت پست بھی موجود ہے اس پر صدیا گزر گئیں مگر حیرت انگیز حال معلوم نہیں کچھ لوگ یہ کہتی ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں،

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ خبر سنکر میں نے ہاں پہنچا تو دیکھی یہ لاشیں اسی حالت میں تھیں اور ان کے قریب ہی ایک مسجد بھی ہے، اور ایک رومی زمانے کی تعمیر بھی ہے جسکو رقیم کہا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں کوئی عالیشان نخل ہو گا اس وقت تک بھی اس کی بعض دیواریں موجود ہیں، اور یہ ایک غیر آباد جنگل میں ہے، اور فرمایا کہ غرناطہ کے بالائی حصہ میں ایک قدیم شہر کے آثار و نشانات پائے جاتے ہیں، جو رومیوں کے طرز کے ہیں، اس شہر کا نام رقیوس بتلایا جاتا ہے، ہم نے اس کے کھنڈروں میں بہت سے عجائبات اور قبریں دیکھی ہیں، قرطبی جو اندلس ہی کے رہنے والے ہیں ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد بھی کسی کو تعجب نہ ہو کہ یہاں پر اصحاب کہف کہنے سے گریز کرتے ہیں، اور خود ابن عطیہ نے بھی اپنے مشاہدے کے باوجود یہ جزم نہیں کیا کہ یہی لوگ اصحاب کہف ہیں، محقق عام شہرت نقل کی ہے، مگر وہ اندلسی فہرست ابوحیان جو ساتویں صدی ۶۵۲ھ میں خاص غرناطہ میں پیدا ہوئے وہیں رہے، اسے ہیں وہ بھی اپنی تفسیر بحر محیط میں غرناطہ کے اس غار کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح قرطبی نے کیا ہے، اور ابن عطیہ کے اپنے مشاہدہ کا ذکر لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہم جب اندلس میں تھے (یعنی قاہرہ منتقل ہونے سے پہلے) تو بہت لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اگرچہ وہ لاشیں اب تک وہاں موجود ہیں، اور زیارت کرنے والے ان کو شمار بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ ان کی تعداد بتانے میں غلطی کرتے ہیں، پھر فرمایا کہ ابن عطیہ نے جس شہر رقیوس کا ذکر کیا ہے جو غرناطہ کی جانب قبلہ میں واقع ہے تو اس شہر سے میں خود بے شمار مرتبہ گزرا ہوں، اور اس میں بڑے بڑے غیر معمولی پتھر دیکھے ہیں، اس کے بعد کہتے ہیں ویتویم کون اهل الکھف بالاندلس لکثرتا دین النصارى بها حتى هي بلاد مملكتهم العظيمة (تفسیر بحر محیط ص ۱۰۲ ج ۶) ”یعنی اصحاب کہف کے اندلس میں ہونے کی ترجیح کے لئے یہ بھی قرینہ ہے کہ وہاں نصرانیت کا غلبہ ہے، یہاں تک کہ یہی خط ان کی سب سے بڑی مذہبی ملکوت ہے“ اس میں یہ بات واضح ہے کہ ابوحیان کے نزدیک اصحاب کہف کا اندلس میں ہونا راسخ ہے۔ (تفسیر قرطبی، ص ۳۵۶ ج ۹)

امام تفسیر ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رقیم ایک داوی کا نام ہے جو فلسطین سے نیچے آنیلہ (عقبہ) کے قریب ہے، اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور چند دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ ”میں نہیں جانتا کہ رقیم کیا ہے، لیکن میں نے کعب احبار سے پوچھا تو انھوں نے بتلایا کہ رقیم اس بستی کا نام ہے جس میں اصحاب کہف غار میں جانے سے پہلے مقیم تھے۔ (روح المعانی)

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت معاذ بن کے ساتھ رومیوں کے مقابلے میں ایک جہاد کیا جس غزوہ اشقی

کہتے ہیں، اس موقع پر ہمارا گذر اس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف میں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے حضرت معادینہ نے ارادہ کیا کہ غار کے اندر جائیں اور اصحاب کہف کی لاشوں کا مشاہدہ کریں، مگر ابن عباس نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مشاہدہ کرنے سے اس ہستی کو بھی منع کر دیا ہے جو آپ سے بہتر تھی، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیونکہ حق تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا **لَوْ كُنْتُمْ مِنْهُمْ فِرَارًا لَّكُنْتُمْ مِنْهُمْ رُجُوبًا** (یعنی اگر آپ ان کو دیکھیں تو آپ ان سے بھاگیں گے اور رعب و ہیبیت سے مغلوب ہو جائیں گے) مگر حضرت معادینہ نے ابن عباسؓ کی اس بات کو شاید اس لئے قبول نہیں کیا کہ قرآن کریم نے ان کی جو حالت بیان کی ہے وہ جو ان کی زندگی کے وقت تھی یہ کیا ضروری ہے کہ اب بھی وہی حالت ہو، اس لئے کچھ آدمیوں کو دیکھنے کے لئے بھیجا، وہ غار پر پہنچے، مگر جب غار میں داخل ہونا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت ہوا بھیج دی جس نے ان سب کو غار سے نکال دیا (روح المعانی، ص ۲۲۷ ج ۱۵)

مذکورہ روایات و حکایات سے اتنی بات ثابت ہوئی کہ حضرات مفسرین میں سے جن حضرات نے اصحاب کہف کے غار کی جگہ کا پتہ دیا ہے ان کے اقوال تین مقامات کا پتہ دیتے ہیں، ایک خلیج فارس کے ساحل عقبہ (انلیہ) کے قریب، حضرت ابن عباسؓ کی بیشتر روایات اسی کی تائید میں ہیں، جیسا کہ مذکورہ روایات میں گذر چکا ہے۔

ابن عطیہ کے مشاہدے اور ابو حیان کی تائید سے یہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار غرناطہ اندلس میں ہے، ان دونوں جگہوں میں سے عقبہ میں ایک شہر یا کسی خاص عمارت کا نام رقیم ہونا بھی بتلایا گیا ہے، اسی طرح غرناطہ میں غار کے متصل عظیم الشان شکستہ عمارت کا نام رقیم بتلایا گیا ہے، اور دونوں قسم کی روایات میں کسی نے بھی اس کا قطعی فیصلہ اور جزم نہیں کیا، کہ یہی غار اصحاب کہف کا غار ہے، بلکہ دونوں قسم کی روایات کا مدار مقامی شہرت اور سماعی روایات پر ہے، اور تقریباً تمام تفاسیر قرطبی، ابو حیان، ابن جریر وغیرہ کی روایات میں اصحاب کہف جس شہر میں رہتے تھے اس کا قدیم نام افسوس اور اسلامی نام طرسوس بتلایا گیا ہے، اس شہر کا ایشیا کوچک کے مغربی ساحل پر ہونا اہل تاریخ کے نزدیک مسلم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار بھی ایشیائے کوچک میں ہے، اس لئے کسی ایک کو قطعی طور پر صحیح اور باقی کو غلط کہنے کی کوئی دلیل نہیں، احتمال تینوں جگہ کا ہو سکتا ہے، بلکہ اس احتمال کی بھی کوئی نفی نہیں کر سکتا کہ ان غاروں کے واقعات صحیح ہونیکے باوجود بھی یہ اُن اصحاب کہف کے غار نہ ہوں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ اور کسی جگہ ہو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ رقیم اس جگہ کسی شہر یا عمارت ہی کا نام ہو بلکہ اس احتمال کی بھی نفی نہیں کی جاسکتی کہ رقیم سے مراد وہ کتبہ ہو جس پر اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دہانے پر

کسی بادشاہ نے لگا دیا تھا۔

جدید مورخین کی تحقیق | عصر حاضر کے بعض مورخین اور علماء نے مسیحی تاریخوں اور اہل یورپ کی تاریخ کی مدد سے غارِ اصحاب کی جگہ اور زمانہ متعین کرنے کے لئے کافی بحث و تحقیق کی ہے۔

ابوالکلام صاحب آزاد نے ائیکہ (عقبہ) کے قریب موجودہ شہر ٹیرا جس کو عرب مورخین بطرا لکھتے ہیں، اس کو قدیم شہر رقیم قرار دیا ہے، اور موجودہ تاریخوں سے اس کے قریب پہاڑ میں ایک غار کے آثار بھی بتلائے ہیں، جس کے ساتھ کسی مسجد کی تعمیر کے آثار بھی بتلائے جاتے ہیں، اس کی شہادت میں لکھا ہے کہ بائبل کی کتاب یسوع (باب ۱۸، آیت ۲۷) میں جس جگہ کو رقیم یا راقم کہا ہے یہ وہی مقام ہے جس کو اب ٹیرا کہا جاتا ہے، مگر اس پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ کتاب یسوع میں جو رقیم یا راقم کا ذکر بنی بن یس کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور یہ علاقہ دریائے اردن کے اور بحرِ قحط کے مغرب میں واقع تھا جس میں شہر ٹیرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس لئے اس زمانے کے محققین آثارِ قدیمہ نے اس بات کے ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ ٹیرا اور راقم ایک چیز ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۲۶ء جلد ۱، ص ۶۵۸

اور عام مفسرین نے اصحاب کہف کی جگہ شہرِ افسوس کو قرار دیا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رزمیوں کا سب سے بڑا شہر تھا، جس کے کھنڈراب بھی موجودہ ترکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۵،۲۰ میل بچانے جنوب پائے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے بھی اقصیٰ ہستراں میں شہر ٹیرا کا ذکر کرتے ہوئے بین القوسین (رقیم) لکھا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت پیش نہیں کی کہ شہر ٹیرا کا پرانا نام رقیم تھا، مولانا حفظ الرحمن سہاروی نے اپنی کتاب قصص ہستراں میں اسی کو اختیار فرمایا اور اس کی شہادت میں تورات سفرہ داود صیغہ ستیاء کے حوالہ سے شہر ٹیرا کا نام راقم بیان کیا ہے (ماخوذ از دائرۃ المعارف عرب)

مملکت اردن میں عمان کے قریب ایک سنان جنگل میں ایک غار کا پتہ لگا تو حکومت کے محکمہ آثارِ قدیمہ نے ۱۹۶۳ء میں اس جگہ کھدائی کا کام جاری کیا تو اس میں مٹی اور پتھروں کے بٹانے کے بعد ٹائیوں اور پتھروں سے بھرے ہوئے چھ تابوت اور دو قبریں برآمد ہوئیں، غار کی جنوبی سمت میں پتھروں پر کندہ کچھ نقوش بھی دریافت ہوئے جو بزنطینی زبان میں ہیں، یہاں کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہی جگہ رقیم ہے، جس کے پاس اصحاب کہف کا یہ غار ہے۔ واللہ اعلم

حضرت سید ہی حکیم الامت متھافوسی نے بیان ہستراں میں تفسیرِ حسانی کے حوالہ سے اصحاب کہف کی جگہ اور مقام کی تاریخی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ظالم بادشاہ جس کے خوف سے بھاگ کر اصحاب کہف

نے غار میں پناہ لی تھی، اس کا زمانہ ۳۵۰۰ تھا، پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے، تو مجموعہ ۳۵۰۰ ہو گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۶۰۰ میں ہوئی، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بیس سال پہلے یہ واقعہ ان کے بیدار ہونے کا پیش آیا، اور تفسیر حقیقی میں بھی ان کا مقام شہر افسوس یا طرئوس کو قرار دیا ہے، جو ایشیائے کوچک میں تھا، اب اس کے کھنڈرات موجود ہیں، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

یہ تمام تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات ہیں جو قدمائے مفسرین کی روایات سے پھر جدید مؤرخین کے بیانات سے پیش کی گئی ہیں احقر نے پہلے ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ نہ قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا ان پر موقوف ہے نہ اس مقصد کا کوئی ضروری حصہ ان سے متعلق ہے جس کے لئے قرآن کریم نے یہ قصہ بیان کیا ہے، پھر روایات و حکایات اور ان کے آثار و قرائن اس درجہ مختلف ہیں کہ ساری تحقیق و کاوش کے بعد بھی اس کا کوئی قطع فیصلہ ممکن نہیں، صرف ترجیحات اور رجحانات ہی ہو سکتے ہیں، لیکن آجکل تعلیم یافتہ طبقہ میں تاریخی تحقیقات کا ذوق بہت بڑھا ہوا ہے، اس کی تسکین کے لئے یہ تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں جن سے تقریبی اور تخمینہ طور پر اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب پیش آیا، اور بیشتر روایات اس کے شہر افسوس یا طرئوس کے قریب ہو پڑتی ہیں، اللہ اعلم، اور حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تحقیقات کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے گئے کہ مقام متعین کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کی تحسین کسی یقینی ذریعہ سے کی جاسکتی ہے، امام تفسیر و حدیث ابن کثیر نے اس کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ:

یعنی اللہ تعالیٰ نے، میں اصحاب کہف کے ان حالات کی خبر دی جن کا ذکر قرآن میں ہے تاکہ ہم ان کو سمجھیں اور ان میں تدبر کریں اور اس کی خبر نہیں دی کہ یہ کہف کس زمین اور کس شہر میں ہے، کیونکہ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں اور نہ کوئی شرعی

قَدْ أَخْبَرَنَا اللَّهُ تَعَالَى بِذَلِكَ
وَأَرَادَ مِنَّا فَهْمَهُ وَتَدَبُّرَهُ
لَمْ يُخْبِرْنَا بِمَكَانِ هَذَا الْكَهْفِ
فِي آيِ الْبَلَادِ مِنَ الْأَرْضِ
إِذْ لَا فَاِئِدَةً لَنَا فِيهِ وَلَا قَصْدًا
شَرْعِيًّا

(ابن کثیر ج ۳ ص ۷۵)

مقصد اس سے متعلق ہے

اصحاب کہف کا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا؟ اور غار میں پناہ لینے کے اسباب کیا تھے؟ قصہ کا یہ ٹکڑا ابھی وہی ہے جس پر نہ کسی آیت قرآن کا سمجھنا موقوف ہے، نہ مقصد قصہ پر اس کا کوئی خاص اثر ہے، اور نہ قرآن و سنت میں اس کا بیان ہے، صرف تاریخی حکایات ہیں، اسی لئے ابوحیان نے تفسیر المحیط میں فرمایا:-

وَالرَّوَاةَ مُخْتَلِفُونَ فِي قَصَصِهِمْ
وَكَيْفَ كَانَ اجْتِمَاعُهُمْ وَ
خُرُوجُهُمْ وَلَمَّا بَاتَ فِي الْحَلِيِّ
الصَّحِيحِ كَيْفِيَّتَهُ ذَلِكَ وَلَا فِي
الْقُرْآنِ (تجربہ خط ص ۱۶)

”ان حضرات کے قصہ میں راویوں کا سخت
اختلاف ہے، اور اس میں کہ یہ اپنی اس
پردہ گرام پر کس طرح متفق ہوئے، اور
کس طرح نکلے، نہ کسی صحیح حدیث
میں اس کی کیفیت مذکور ہو نہ قرآن میں۔“

تاہم موجودہ لمباح کی دلچسپی کے لئے جیسے اوپر اصحاب کہف کے مقام سے متعلق کچھ معلومات
لکھی گئی ہیں، اس واقعہ کے زمانہ وقوع اور اسباب وقوع کے متعلق بھی مختصر معلومات
تفسیری اور تاریخی روایات سے نقل کی جاتی ہیں، اس قصہ کو پوری تفصیل اور استیعاب کے ساتھ
حضرت قاضی شہداء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں مختلف روایات سے نقل فرمایا ہے، مگر یہاں
صرف وہ مختصر واقعہ لکھا جاتا ہے جس کو ابن کثیر نے سلف و خلف کے بہت سے مفسرین کے حوالہ
سے پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ :-

”اصحاب کہف بادشاہوں کی اولاد اور اپنی قوم کے سردار تھے، قوم نبوت پرست تھی،
ایک روز ان کی قوم اپنے کسی مذہبی میلے کے لئے شہر سے باہر نکلی، جہاں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا
تھا، وہاں جا کر یہ لوگ اپنے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے، اور ان کے لئے جانوروں کی قربانی دیتے تھے
ان کا بادشاہ ایک جبار ظالم دقیانوس نامی تھا، جو قوم کو اس بت پرستی پر مجبور کرتا تھا، اس سال جبکہ
پوری قوم اس میلے میں جمع ہوئی، تو یہ اصحاب کہف نوجوان بھی پہنچے، اور وہاں اپنی قوم کی یہ حرکتیں
دیکھیں کہ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے، اور ان کی عبادت کرتے اور ان کے لئے
قربانی کرتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عقل سلیم عطا فرمادی کہ قوم کی اس احمقانہ حرکت
سے ان کو نفرت ہوئی، اور عقل سے کام لیا تو ان کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ عبادت تو صرف اس ذات
کی ہونی چاہئے جس نے زمین و آسمان اور ساری مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، یہ خیال بیک وقت
ان چند نوجوانوں کے دل میں آیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قوم کی اس احمقانہ عبادت سے بچنے
کے لئے اس جگہ سے ہٹنا شروع کیا، ان میں سب سے پہلے ایک نوجوان مجمع سے دور ایک درخت
کے نیچے جا کر بیٹھ گیا، اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور وہ بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا، اسی
طرح پھر تیسرا اور چوتھا آدمی آتا گیا، اور درخت کے نیچے بیٹھتا رہا، مگر ان میں کوئی دوسرے کو پہچانتا
تھا اور نہ یہ کہ یہاں کیوں آیا ہے، مگر ان کو درحقیقت اس قدرت نے یہاں جمع کیا تھا
جس نے ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرمایا۔“

قیمت اور اجتماعیت کی اصل بنیاد ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ لوگ تو باہمی اجتماع کا سبب

قومیت اور جنسیت کو سمجھتے ہیں، مگر حقیقت وہ ہے جو صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ درحقیقت اتفاق و افتراق اول ارواح میں پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر اس عالم کے ابدان میں پڑتا ہے، جن روتوں کے درمیان ازل میں مناسبت اور اتفاق پیدا ہوا وہ یہاں بھی باہم مربوط اور ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور جن میں یہ مناسبت اور باہمی توافق نہ ہو بلکہ وہاں علیحدگی رہی ان میں یہاں بھی علیحدگی رہے گی، اسی واقعہ کی مثال کو دیکھو کہ کس طرح الگ الگ ہر شخص کے دل میں ایک ہی خیال پیدا ہوا اس خیال نے ان سب کو غیر شعوری طور پر ایک جگہ جمع کر دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ ایک جگہ جمع تو ہو گئے، مگر ہر ایک اپنے عقیدہ کو دوسرے سے اس لئے چھپاتا تھا کہ یہ کہیں جا کر بادشاہ کے پاس منبری نہ کر دے، اور میں گرفتار ہو جاؤں، کچھ دیر کوتاہی کے عالم میں جمع رہنے کے بعد ان میں سے ایک شخص بولا کہ بھائی ہم سب کے سب قوم سے علیحدہ ہو کر یہاں پہنچنے کا کوئی سبب تو ضرور ہے، مناسب یہ ہے کہ ہم سب باہم ایک دوسرے کے خیال سے واقف ہو جائیں، اس پر ایک شخص بول اٹھا کہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی قوم کو جس دین و مذہب اور جس عبادت میں مبتلا پایا مجھے یقین ہو گیا کہ یہ باطل ہے، عبادت تو صرف اللہ جل شانہ کی ہونی چاہئے، جس کا تخلیق کائنات میں کوئی شریک اور ساتھی نہیں، اب تو دوسروں کو بھی موقع مل گیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اقرار کیا کہ یہی عقیدہ اور خیال ہے جس نے مجھے قوم سے علیحدہ کر کے یہاں پہنچایا۔

اب ایک اتحاد خیال جماعت ایک دوسرے کی رفیق اور دوست ہو گئی، اور انہوں نے الگ اپنی ایک عبادت گاہ بنائی، جس میں جمع ہو کر یہ لوگ اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرنے لگے۔ مگر شدہ شدہ ان کی خبر شہر میں پھیل گئی، اور چل خوروں نے بادشاہ تک ان کی خبر پہنچا دی، بادشاہ نے ان سب کو حاضر ہونے کا حکم دیا، یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے ان کے عقیدے اور طریقے کے متعلق سوال کیا، اللہ نے ان کو بہت بخشی، انہوں نے بغیر کسی خوف و خطر کے اپنا عقیدہ توضیح بیان کر دیا، اور خود بادشاہ کو بھی اس کی طرف دعوت دی، اسی کا بیان قرآن کریم کی آیات میں اس طرح آیا ہے :- وَرَبَّنَا عَلَيَّ قُلُوبُ يَوْمَئِذٍ قَاطِعَاتُ الْوَارِثَاتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنُؤْمِنَنَّ بِدُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذَا شَطَطًا رَأَى قَوْلَهُ كَذِبًا ۖ

جب ان لوگوں نے بادشاہ کو مبارک ہو کر دعوت ایمان دی تو بادشاہ نے اس سے انکار کیا اور ان کو ڈرایا دھمکایا، اور ان کے بدن سے وہ عمدہ پوشاک جو ان شہزادوں کے بدن پر تھی اتر وادی، تاکہ یہ لوگ اپنے معاملہ میں غور کریں، اور غور کرنے کے لئے چند روز کی مہلت یہ کہہ کر دیدی کہ تم نوجوان ہو میں تمہارے قتل میں اس لئے جلدی نہیں کرتا کہ تم کو غور کرنے کا موقع مل جائے

اب بھی اگر تم اپنی قوم کے دین و مذہب پر آجاتے ہو تو تم اپنے حال پر رہو گے ورنہ قتل کر دیو جاؤ گے۔
یہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اپنے مؤمن بندوں پر تھا، کہ اس مہلت نے ان لوگوں کے لئے راہ
فرار کھول دی، اور یہ لوگ یہاں سے بھاگ کر ایک غار میں روپوش ہو گئے۔

تمام روایات مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ دین مسیح علیہ السلام پر تھے، ابن کثیر اور دیگر
تمام مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے اگرچہ ابن کثیر نے اس کو قبول اس لئے نہیں کیا کہ اگر یہ لوگ مسیحی دین پر
ہوتے تو یہودیہ ان سے عداوت کی بناء پر ان کے واقعہ کا سوال نہ کراتے اور ان کو اہمیت نہ دیتے
مگر یہ کوئی ایسی بنیاد نہیں جسکی وجہ سے تمام روایات کو رد کر دیا جائے، یہودیہ نے تو محض ایک
واقعہ عجیبہ ہونے کی حیثیت سے اس کا سوال کرایا، جیسے ذہن نشین کا سوال بھی اسی بناء پر ہی،
اس طرح کے سوالات میں یہودیت اور نصاریت کا تعصب درمیان میں نہ آنا ہی ظاہر ہے۔

تفسیر مظہری میں بروایت ابن اسحاق ان لوگوں کو ان موحدین میں شمار کیا ہے جو مسیحی دین
کے مٹ جانے کے بعد ان کے حق پرست لوگ خال خال رہ گئے تھے، جو صحیح دین مسیح اور توحید
پر قائم تھے، ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے، اور جس
شہر میں یہ نوجوان غار میں پھپھنے سے پہلے رہتے تھے اس کا نام افسوس بتلایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بھی واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے، اور بادشاہ
کا نام دقیانوس بتلایا ہے، ابن اسحاق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اصحابِ کہف کے بیدار ہونے
کے وقت ملک پر دین مسیح علیہ السلام کے پابند جن لوگوں کا قبضہ ہو گیا تھا ان کے بادشاہ کا نام
بیدوسیس تھا۔

مجموعہ روایات سے یہ بات تو بظن غالب ثابت ہو جاتی ہے کہ اصحابِ کہف مسیح دین مسیح
علیہ السلام پر تھے اور ان کا زمانہ بعلم مسیح ہے، اور جس بادشاہ مشرک سے بھاگے تھے اس کا نام
دقیانوس تھا، تین سو نو سال کے بعد بیدار ہونے کے وقت جس نیک مؤمن بادشاہ کی حکومت
تھی ابن اسحاق کی روایت میں اس کا نام بیدوسیس بتلایا ہے، اس کے ساتھ موجودہ زمانے کی
تاریخوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تخمینہ اور تقریبی طور پر ان کا زمانہ متعین ہو سکتا ہے، اس سے
زیادہ تعین کی نہ ضرورت ہو اور نہ اس کے علم کے اسباب موجود ہیں۔

کیا اصحابِ کہف اب بھی زندہ ہیں | اس معاملے میں صحیح اور ظاہر یہی ہے کہ انکی وفات ہو چکی ہے، تفسیر مظہری
میں ابن اسحاق کی مفصل روایت میں ہے کہ اصحابِ کہف کی بیداری اور شہر میں ان کے واقعہ
عجیبہ کی شہرت ہو جانے اور اس وقت کے بادشاہ بیدوسیس کے پاس پہنچ کر ملاقات کرنے
کے بعد اصحابِ کہف نے ملک بیدوسیس سے رخصت چاہی، اور رخصتی سلام کے ساتھ اس کے

لئے دعا کی، اور ابھی بادشاہ اسی جگہ موجود تھا کہ یہ لوگ اپنے لیٹنے کی جگہوں پر جا کر لیٹ گئے، اور اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دیدی۔

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ بھی مختلفہ میں نقل کی ہوئی ہے:

قَالَ قَتَادَةُ غَزَا ابْنُ عَبَّاسٍ مَعَ حَبِيبِ بْنِ مُسْلِمَةَ فَمَرُّوا بِكَوْثٍ فِي بِلَادِ الرُّومِ فَرَأَوْا فِيهِ عِظَامًا فَقَالَ قَائِلٌ هَذِهِ عِظَامُ أَهْلِ نَكَهْتِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ بَدِئْتُ بِعِظَامِ بَنِي إِسْرَءِيلَ ثَلَاثِينَ سَنَةً (ابن کثیر)	”قَتَادَةُ كَهْتُمْ فِي أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ فِي حَبِيبِ بْنِ مُسْلِمَةَ كَهْتُمْ فِي بِلَادِ الرُّومِ فِي بِلَادِ الرُّومِ فَرَأَوْا فِيهِ عِظَامًا فَقَالَ قَائِلٌ هَذِهِ عِظَامُ أَهْلِ نَكَهْتِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ بَدِئْتُ بِعِظَامِ بَنِي إِسْرَءِيلَ ثَلَاثِينَ سَنَةً“
---	---

پہلے خاک ہو چکی ہیں

یہ سب اس تاریخی قصے کے وہ اجزاء تھے جن کو نہ قرآن نے بیان کیا نہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ اس واقعہ کا کوئی خاص مقصد یا قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے، اور نہ تاریخی روایات سے ان چیزوں کا کوئی قطعی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، باقی رہے قصے کے وہ اجزاء جن کا وجود قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے ان کی تفصیل انہی آیات کے تحت آتی ہے۔ یہاں تک قرآن کریم نے اس قصے کا اجمالاً ذکر فرمایا تھا، آگے تفصیلی ذکر آتا ہے۔

فَمَنْ نَقَصْ عَلَيْكَ نَبَاهَهُم بِالْحَقِّ أَتَمَّ فِتْنَةً أَمْ أَوْبَرَ كَيْدَهُمْ

ہم سنا دیں تجھ کو ان کا حال تحقیقی، وہ کئی جوان ہیں کہ یقین لاتے اپنے رب پر

وَزِدْهُمْ هُدًى ۱۳ وَ رَبَّنَا عَلَّاهُ قُلُوبُهُمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا

اور زیادہ دی ہم نے ان کو سوجھا، اور گروہ دی ان کے دل پر جب کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا رب

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوهُ مِنْ دُونِهِ إِلَهًا لَقَدْ

رب آسمان کا اور زمین کا، نہ پکاریں گے ہم اس کے سوا کسی کو معبود، نہیں تو

قُلْنَا إِذْ أَشْطَا ۱۴ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً

کہی ہم نے بات عقل سے دور، یہ ہماری قوم ہے ٹھہرائے انھوں نے اللہ کے سوا اور معبود

لَوْلَا يَاتُونَ عَلَيْهِمْ الْمَلٰٓئِكُۙنَ يُدۡنُوۙنَ فَمِنْۢ بَيْنِ يَدَيۡهِۦٓ اَخۡطَرُ مِمِّۤنۡ اَفۡتَرٰى عَلٰى اللّٰهِ

کہوں نہیں لاتے ان پر کوئی سند کھلی پھر اس سے بڑا گنہگار کون جس نے بانڈھا اللہ پر

کِیۡنَ بَاۗءًا ۝۱۵ وَاِذَا عَزَلۡتُمْۤ اَعۡزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاَوۡاۤ اِلٰی

تجھوت۔ اور جب تم نے کنارہ کر لیا ان سے اور جنکو وہ پوجتے ہیں اللہ کے۔ روانے تو اب جاؤ

اَلۡکُفۡرِیۡنَ یَنۡشُرۡ لَّکُمۡ رَبُّکُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِہٖ وَیُہِدِیۡ لَکُمۡ مِّنۡ

اس کفر میں پھیلانے تم پر تمہارا رب کچھ اپنی رحمت سے اور بنا دیوے تمہارے واسطے

اَمۡرِکُمۡ مَّرۡفُوقًا ۝۱۶

کام میں آرام۔

خلاصہ تفسیر

ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں (اس میں اشارہ کر دیا کہ اس کے خلاف جو کچھ دنیا میں مشہور ہے وہ درست نہیں) وہ لوگ (اصحاب کہف) چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر اس زمانے کے دین عیسوی کے مطابق ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی (کہ صفات ایمان ثابت قدمی اور بلاؤں پر صبر دنیا سے اعراض، آخرت کی فکر وغیرہ بھی عطا کر دیں، انہی صفات ایمان و ہدایت میں ایک بات یہ تھی کہ ہم ان کے دل مضبوط کر دیے جبکہ وہ چننے ہو کر آپس میں یا مخالف بادشاہ کے رد ہوا کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی مجبور کی عبادت نہ کریں گے (کیونکہ اگر خدا بخوہستہ ہم نے ایسا کیا) تو اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی بے جا بات کہی، اور یہ جو ہماری قوم ہے انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اور مجبور و قرار دے رکھے ہیں، (کیونکہ ان کی قوم اور بادشاہ وقت سب بہت پرست تھے، سو یہ لوگ اپنے مجبوروں کے مجبور ہونے پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے جیسا کہ موحّدین تو حید پر واضح اور یقینی دلیل رکھتے ہیں) تو اس سے زیادہ کون غضب دھانے والا ہو گا جو اللہ پر جھوٹا ہمت لگائے (کہ اس کے کچھ سا جھٹی اور شریک بھی ہیں) اور پھر آپس میں کہا کہ جب ہم ان لوگوں سے عقیدہ ہی میں الگ ہو گئے اور ان کے مجبوروں (کی عبادت) سے بھی (الگ ہو گئے ہو) مگر اللہ سے (الگ نہیں ہوتے، بلکہ اسی کی وجہ سے سب کو چھوڑا ہے) تو اب (مصلحت یہ

ہے کہ تم (فلاں) غار میں (جو مشورے سے ملے ہوا ہو) گام چل کر پناہ لو (تاکہ امن اور بے فکری کے تحت اللہ کی عبادت کر سکو) تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں کامیابی کے سامان درست کر دے گا اللہ تعالیٰ سے اسی امید اور توقع پر غار میں جانے کے وقت انہوں نے سب پہلے یہ دعا کی کہ رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

معارف و مسائل

اَتَّخَذْتُمْ فِتْنَةً، فتنہ کی جمع ہے، نوجوان کے معنی میں آتا ہے، علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس لفظ میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصلاح اعمال و اخلاق اور رشد و ہدایت کا زمانہ جوانی ہی کی عمر ہی بڑھاپے میں پچھلے اعمال و اخلاق ایسے پختہ ہو جاتے ہیں کہ کتنا ہی اس کے خلاف حق واضح ہو جائے ان سے نکلنا مشکل ہوتا ہے، صحابہ کرام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانیوالے بیشتر نوجوان ہی لوگ تھے (ابن کثیر، البو حیان)

وَرَبَّنَا عَلِّمْنَا لَدُنْكَ دِينًا، ابن کثیر کے حوالے سے جو واقعہ کی صورت اور بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف ان کے دلوں کو مضبوط کر دینے کا واقعہ اس وقت ہوا جب کہ بت پرست ظالم بادشاہ نے ان نوجوانوں کو اپنے دربار میں حاضر کر کے سوالات کئے، اس وقت حیات کی کشمکش اور قتل کے خوف کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر اپنی محبت اور ہیبت و عظمت ایسی مسلط کر دی کہ اس کے مقابلے میں قتل و موت اور ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو کر اپنے عقیدے کا صاف صاف اظہار کر دیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی معبود کی عبادت نہیں کرتے، اور آئندہ بھی نہ کریں گے، جو لوگ اللہ کے لئے کسی کام کا عزم پختہ کر لیتے ہیں تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی ایسی ہی امداد ہوا کرتی ہے۔

فَاُولَٰئِكَ اَلِیَ الْکُفْرِ، ابن کثیر نے فرمایا کہ اصحاب کہف نے جو صورت اختیار کی کہ جس شہر میں رہ کر اللہ کی عبادت نہ ہو سکتی تھی اس کو چھوڑ کر غار میں پناہ لی، یہی سنت ہو تمام انبیاء کی کہ ایسے مقامات سے ہجرت کر کے وہ جگہ اختیار کرتے ہیں جہاں عبادت کی جاسکے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَرْتُوْرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ

اور تو دیکھے دھوپ جب نکلتی ہے بچا کر جاتی ہے اُن کی کھوہ سے دائیں کو

وَ اِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فُجُوْرَةٍ مِّنْهُ

اور جب ڈوبتی ہے کترا جاتی ہے اُن سے بائیں کو اور وہ میدان میں ہیں اس کے،

ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَمْ يُضِلَّ

یہ ہے اللہ کی قدرتوں سے جسکو راہ دیوے اللہ وہی آتے راہ پر اور جسکو وہ بھلائے

فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝۱۷ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاطًا وَهَمًّا

پھر تو نہ پائے اس کا کوئی رفیق راہ پر لانے والا، اور تو سمجھے وہ جاگتے ہیں اور ۵۱

رُقُودًا وَنَعْلَهُمْ ذٰتَ الْيَمِيْنِ وَذٰتَ الشِّمَالِ صَیْۤیۡرٌ وَّكَلْبُهُمْ

سورہ ہیں اور کر دہیں دلاتے ہیں ہم ان کو داہنے اور بائیں اور سگ ان کا

بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ لَوِ اطَّلَعَتْ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتُ مِنْهُمْ

پسار رہا ہے اپنی بائیں جو کھٹ پر اگر تو جھانک کر دیکھے ان کو تو پیٹھ دے کر بھاگے

فِرَارًا وَّلَوْلِیَّتٌ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝۱۸

ان سے اور بھڑ جائے تھو میں ان کی دہشت

خلاصہ تفسیر

اور اے مخاطب (وہ غار ایسی وضع پر واقع ہوا ہے کہ) جب دھوپ نکلتی ہے تو تو اس کو دیکھے گا کہ وہ غار سے داہنی جانب کو بھی رہتی ہے (یعنی غار کے دروازے سے داہنی طرف الگ کو رہتی ہے) اور جب وہ چھپتی ہے تو (غار کے) بائیں طرف بھی رہتی ہے (یعنی اُس وقت بھی غار کے اندر دھوپ نہیں جاتی، تاکہ ان کو دھوپ کی تپش سے تکلیف نہ پہنچے) اور وہ لوگ اس غار کے ایک فراخ موقع میں تھے (یعنی ایسے غاروں میں جو عادتاً کہیں تنگ کہیں کشادہ ہوتے ہیں، تو وہ اس غار کے ایسے موقع پر تھے جو کشادہ تھا تاکہ ہوا بھی پہنچے اور جگہ کی تنگ سے جی بھی نہ گھبرائے) یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اسباب ظاہری کے خلاف ان کے لئے آرام کا سامان مہیا کر دیا پس معلوم ہوا کہ جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دیں تو آپ اس کے لئے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پائے گا۔ غار کی جو ہیئت بتلائی گئی ہے کہ اس میں نہ طلوع کے وقت صبح کو دھوپ اندر جاتی نہ شام کو غروب کے وقت، یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ غار شمال رو یا جنوب رو ہو، کیونکہ داہنی بائیں جانب غار میں داخل ہونے والے کی مراد ہو تو غار شمال رو ہو گا، اور داہنی بائیں

جانب غار سے نکلنے والے کی مراد ہوں تو غار جنوب رو یہ ہوگا)

اور اسے مخاطب (تو اگر اس وقت جبکہ وہ غار میں گئے اور ہم نے ان پر نیند مسلط کر دی
ان کو دیکھتا تو) ان کو جاگتا ہوا خیال کرتا حالانکہ وہ سوتے تھے (کیونکہ اللہ کی قدرت نے ان کو نیند
کے آثار و علامات سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ سانس کا تغیر، بدن کا ڈھیلنا، آنکھیں اگر بند بھی ہوں
تو سونے کی یقینی علامت نہیں) اور (اس نیند کے زمانہ دراز میں) ہم ان کو رکبھی (دراہنی طرف اور
رکبھی) باتیں صاف کر دیتے تھے اور (اس حالت میں) ان کا کتار جو کسی وجہ سے ان کے
ساتھ آگیا تھا غار کی (دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے رہیٹھا تھا) اور ان کے رعب و
جلال خداداد کی یہ حالت تھی کہ (اگر اسے مخاطب) تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیچھے ہٹ کر
بھاگ کھڑا ہوتا، اور تیرے اندر ان کی درجست سما جاتی (اس آیت میں خطاب عام مخاطبین
کو ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرعوب ہونا لازم نہیں آتا، اور یہ تمام سامان
حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی حفاظت کے لئے جمع کر دیئے تھے، کیونکہ جاگتے ہوئے آدمی پر حملہ
کرنا آسان نہیں ہوتا، اور نیند کے طویل زمانے میں کروٹیں نہ بدلی جاتیں تو مٹی ایک کر دٹ کر
کھا لیتی، اور غار کے دروازے پر کتے کا بیٹھا بھی سامان حفاظت ہونا ظاہر ہے)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے اصحاب کہف کے تین حال بتائے ہیں، اور تینوں عجیب
ہیں جو ان حضرات کی کرامت سے بطور خرق عادت ظاہر ہوئے۔
اول زمانہ دراز تک مسلسل نیند کا مسلط ہونا اور اس میں بغیر کسی غذا وغیرہ کے زندہ
رہنا سب سے بڑی کرامت اور خرق عادت ہے، اس کی تفصیل تو اگلی آیات میں آئے گی، یہاں
اس طویل نیند کی حالت میں ان کا ایک مال تو یہ بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غار کے اندر
اس طرح محفوظ رکھا تھا کہ صبح شام دھوپ ان کے قریب سے گذرتی مگر غار کے اندر ان کے
جسموں پر نہ پڑتی تھی، قریب سے گذرنے کے فوائد زندگی کے آثار کا قیام، ہوا اور سردی گرمی
کا اعتدال وغیرہ تھے، اور ان کے جسموں پر دھوپ نہ پڑنے سے جسموں کی اور ان کے لباس کی
حفاظت بھی تھی۔

دھوپ کے ان کے اوپر نہ پڑنے کی یہ صورت غار کی کسی خاص وضع کی بناء پر بھی ہو سکتی
ہے کہ اس کا دروازہ جنوب یا شمال میں ایسی وضع پر ہو کہ دھوپ طبعی اور عادی طور پر اس کے
اندر نہ پہنچے، ابن قتیبہ نے اس کی وضع خاص متعین کرنے کیلئے یکمکف کیا کہ ریاض کے اصول

کا حکم ہو ممکن ہے کہ دینِ سرخ علیہ السلام میں مسند نہ ہو، دو سکر یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ لوگ صحابہ جانا اور صاحبِ موشی تھے اُن کی حفاظت کے لئے گتیا لایا، اور جیسے کتے کی ونا شعاری مشہور ہے، یہ جب شہر سے چلے تو وہ بھی ساتھ لگ لیا۔

نیک صحبت کے برکات کہ اس نے ابنِ عطیہؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد نے بتلایا کہ میں ابو الفضل کتے کا بھی اعزاز بڑھا دیا جو بہری کا ایک وعظ ۴۶۹ ہجری میں جامع مصر کے اندر سنا وہ برسرِ منبر یہ فرما رہے تھے کہ جو شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے ان کی نیکی کا حصہ اس کو بھی ملتا ہے، دیکھو اصحابِ کہف کے کتے نے ان سے محبت کی اور ساتھ لگ لیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمایا۔

قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ابنِ عطیہؒ کی روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ جب ایک گتیا صحابہ اور اولیاء کی صحبت سے یہ مقام پاسکتا ہے تو آپ قیاس کر لیں کہ مؤمنین موحیدین جو اولیاء اللہ اور صالحین سے محبت رکھیں ان کا مقام کتنا بلند ہوگا، بلکہ اس واقعہ میں ان مسلمانوں کے لئے تسلی اور بشارت ہے جو اپنے اعمال میں کوتاہ ہیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت پوری رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے مسجد کے دروازے پر ایک شخص ملا، اور یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے (جو اس کے آنے کی جلدی کر رہے ہو) یہ بات سن کر یہ شخص دل میں کچھ شرمندہ ہوا اور پھر عرض کیا کہ میں نے قیامت کے لئے بہت نماز، روزے اور صدقات تو جمع نہیں کئے، مگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو رشتن لوگوں (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہو گئے جس سے محبت رکھتے ہو، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم یہ جملہ مبارکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکر اتنے خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد اس سے زیادہ خوشی کبھی نہ ہوئی تھی، اور اس کے بعد حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (الحمد للہ) میں اللہ سے اس کے رسولؐ سے، ابو بکر و عمر سے محبت رکھتا ہوں، اس لئے اس کا امیدوار ہوں کہ ان کے ساتھ ہوں گا (قرطبی)

اصحابِ کہف کو اللہ تعالیٰ لَوْ اَظْلَعْتَ عَلَيْهِمْ، ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب عام لوگوں کو ہو اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصحابِ کہف کا رعب نے ایسا رعب و جلال عطا فرمایا تھا جو دیکھے ہیبت کھا کر بھاگتا تھا، عام مخاطبین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چھا سکتا تھا، عام مخاطبین کو

فرمایا گیا ہے، اگر تم ان کو جہانک کر دیکھو تو ہیبت کھا کر بھاگ جاؤ اور ان کا رعب و ہیبت تم پر طاری ہو جائے۔

یہ رعب و ہیبت کس بنا اور کس اسباب کی وجہ سے تھا، اس میں بحث فضول ہے، اور اسی لہٰذا قرآن و حدیث نے اس کو بیان نہیں کیا، حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لئے ایسے حالات پیدا فرمادیئے تھے کہ ان کے بدن پر دھوپ نہ پڑے اور دیکھنے والا ان کو بیدار سمجھے اور دیکھنے والے پر ان کی ہیبت طاری ہو جائے کہ پوری طرح دیکھ نہ سکے، یہ حالات خاص اسباب طبیعہ کے راستہ سے ہونا بھی ممکن ہے، اور بطور کرامت خرقِ عادت کے طریق سے بھی جب قرآن و حدیث نے اس کی کوئی خاص وجہ متعین نہیں فرمائی، تو خالی قیاسات اور تخمینوں سے اس میں بحث کرنا بے کار ہے، تفسیر مظہری میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور تائید میں ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی نعیم کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہم نے روم کے مقابلہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ جہاد کیا، جو غزوۃ المصیق کے نام سے معروف ہے، اس سفر میں ہمارا گذر اس غار پر ہوا جس میں اصحابِ کفہ ہیں حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ اصحابِ کفہ کی تحقیق اور مشاہدہ کے لئے غار میں جائیں، ابن عباسؓ نے منع کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑی اور بہتر ہستی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مشاہدہ سے منع کر دیا ہے، اور یہی آیت پڑھیں **لَوْ اَنَّكُمْ عَلِمْتُمْ** اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک **لَوْ اَنَّكُمْ عَلِمْتُمْ** کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا، مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی رائے کو قبول نہیں کیا اور غالباً وجہ یہ ہوگی کہ انھوں نے آیت کا مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے عام مخاطبین کو قرار دیا ہو گا، یا یہ کہ یہ حالت قرآن نے اس وقت کی بیان کی ہے جس وقت اصحابِ کفہ زندہ تھے اور سو رہے تھے، اب ان کی وفات کو غرض ہو چکا ہے، ضروری نہیں کہ اب بھی وہی رعب و ہیبت کی کیفیت موجود ہو بہر حال حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی بات قبول کی اور چند آدمی تحقیق و مشاہدہ کے لئے بھیج دیئے، جب یہ لوگ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت گرم ہوا بھیج دی جس کی وجہ سے یہ کچھ نہ دیکھ سکے (مظہری)

وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ

اور اسی طرح ان کو جگادیا ہم نے کہ آپس میں پوچھنے لگے، ایک بولا ان میں کتنی دیر ٹھہرے تم

قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ

بولے ہم ٹھہرے ایک دن یا دن سے کم، بولے تمہارا رب ہی خوب جانے جتنی دیر تم رہے ہو

فَاتَّبِعُوا أَحَدًا كُمْ بِوَرِقِكُمْ هَذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرُوا أَيُّهَا

اب بھجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اپنا اس شہر میں پھر دیکھے کونسا کھانا

أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَسَلِّطْ وَلَا يَشْعُرَنَّ

تمہارا بت سولائے تمہارے پاس اس میں سے کھانا اور نرمی سے جائے اور بھانے دے

بِكُمْ أَحَدًا ۝ إِنَّمَا أَنْتُمْ بِأَنْظُرٍ وَأَعَلَيْكُمْ يَرْجِعُ مَوْكُمُ وَأُولَئِكَ

تمہاری خبر کسی کو ، وہ لگ اگر خبر پالیں تمہاری پھر وہوں سے مار ڈالیں تم کو یا تو مالیں تم کو

فِي مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوا إِذَا أَبَدًا ۝

اپنے دین میں اور تب تو بھلا نہ ہوگا تمہارا کہیں ۔

خلاصہ تفسیر

اور جس طرح ہم اپنی قدرت کاملہ سے ان کو اتنے زمانہ دراز تک سلایا ، اسی طرح اس طویل نیند کے بعد ہم نے ان کو جگا دیا تاکہ وہ آپس میں پوچھ پاتھ کریں تاکہ باہمی سوال و جواب کے بعد ان کو حق تعالیٰ کی قدرت اور حکمت منکشف ہو چنانچہ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ (اس نیند کی حالت میں) تم کس قدر رہے ہو گے (جواب میں) بعض نے کہا کہ (غالباً) ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم رہے ہوں گے ، دوسرے بعض نے کہا کہ (اس کی تفتیش کی کیا ضرورت ہے یہ تو (تھیک ٹھیک) تمہارے رب ہی کو خبر ہے کہ تم کس قدر (سوتے) رہے اب (اس فضول بحث کو چھوڑ کر ضروری کام کرنا چاہتے وہ یہ کہ) اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ (جو کہنے والے کے پاس ہوگا) کیونکہ یہ لوگ کچھ خرچ کے لئے رقم بھی لے کر چلے تھے ، غرض کہ کسی کو یہ روپیہ (دے کر شہر کی طرف بھجو پھر) وہ وہاں پہونچ کر (تحقیق کرے کہ کونسا کھانا حلال ہے (اس جگہ لفظ از کی کی تفسیر بروایت ابن جریر حضرت سعید بن جبیر سے یہی منقول ہے کہ مراد اس سے حلال کھانا ہے ، اور اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کی قوم بت پرست بکثرت اپنے بتوں کے نام ذبح کیا کرتی تھی اور بازار بکثرت یہی حرام گوشت بکتا تھا) تو وہ اس میں سے تمہارے پاس کچھ کھانے آدو اور کام خوش تدبیری سے کرے (کہ ایسی وضع ہیست سے جائے کہ کوئی اس کو پہچانے نہیں اور کھانے کی تحقیق کرنے میں بھی یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ بت کے نام کے ذبیحہ کو حرام سمجھتا ہے) اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے (کیونکہ) اگر وہ لوگ (یعنی اہل شہر جن کو اپنے خیال میں اپنے زمانے

کے مشترکین سمجھے ہوتے تھے، کہیں تمھاری خبر پا جائے گی تو تم کو یا پتھر اڑا کر کے مار ڈالیں گے یا اجبراً تم کو اپنے مذہب میں پھر داخل کر لیں گے اور ایسا ہوا تو تم کو کبھی فلاح نہ ہو گی۔

معارف و مسائل

گزشتہ لکے یہ لفظ تشبیہ و تمثیل کے لئے ہے، مراد اس جگہ دو واقعوں کی باہم تشبیہ بیان کرنا کہ ایک واقعہ اصحاب کہف کی نوم طویل اور زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا ہے، جس کا ذکر شروع قصے میں آیا ہے فَقَضَسْنَا بَنَاهُ إِذْ اِيخْتَمَ فِي الْكَهْفِ سِتِينَ عَدَدًا، دوسرا واقعہ اس زمانہ دراز کی نیند کے بعد صبح سالم اور باوجود غذائے پہونچنے کے قوی اور تندرست اٹھنے اور بیدار ہونے کا ہے، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آیات قدرت ہونے میں متماثل ہیں، اسی لئے اس آیت میں جو ان کے بیدار کرنے کا ذکر فرمایا تو لفظ كَذَلِكَ سے اشارہ کر دیا کہ جس طرح ان کی نیند عام انسانوں کی عادی نیند کی طرح نہیں تھی، اسی طرح ان کی بیداری بھی عام عادت طبی سے ممتاز تھی، اور اس کے بعد وَلْيَسَاءَ لَوَا فرمایا جس کے معنی ہیں ”تاکہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں کہ نیند کتنے زمانے رہی؟“ یہ ان کے بیدار کرنے کی علت نہیں، بلکہ عادی طور پر پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر ہے، اسی لئے اس کے لام کو حشرات منسٹرین نے لام عاقبت یا لام صیرورت کا نام دیا ہے (ابو حیان، قرطبی) خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ان کی نوم طویل ایک نشانی قدرت کی تھی، اسی طرح سینکڑوں سال کے بعد بغیر کسی غذا کے قوی، تندرست بیدار ہو کر بیٹھ جانا بھی قدرت کا ملکہ کی نشانی تھی، اور چونکہ قدرت کو یہ بھی منظور تھا کہ خود ان لوگوں پر بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ سینکڑوں برس سوتے رہو تو اس کی ابتداء باہمی سوالات سے ہوئی، اور انتہا اس واقعہ سے ہوئی جس کا ذکر اگلی آیت میں وَكَذَلِكَ اَعْرَضْنَا عَنْ اَيَّامِهِمْ پر ان کا راز کھل گیا، اور تعین مدت میں اختلاف کے باوجود زمانہ دراز تک غار میں سوتے رہنے کا سب کو یقین ہو گیا۔

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ، شروع قصہ میں جو بات اجمالاً کہی گئی تھی کہ غار میں رہنے کی مدت کے متعلق باہم اختلاف رائے ہوا، ان میں سے ایک جماعت کا قول صیح تھا، یہ اس کی تفصیل ہے کہ اصحاب کہف میں سے ایک شخص نے سوال اٹھایا کہ تم کتنا سوتے ہو، تو بعض نے جواب دیا کہ ایک دن یا دن کا ایک حصہ، کیونکہ یہ لوگ صبح کے وقت غار میں داخل ہوئے تھے، اور بیدار ہونے کا وقت شام کا وقت تھا، اس لئے خیال یہ ہوا کہ یہ وہی دن ہے جس میں ہم غار میں داخل ہوئے تھے، اور سونے کی مدت تقریباً ایک دن ہے، مگر انہی میں سے دوسرے لوگوں کو کچھ یہ احساس ہوا کہ شاید یہ وہ دن نہیں جس میں داخل ہوئے تھے، پھر معلوم نہیں کتنے دن ہو گئے، اس لئے اس کے علم کو

والہذا کیا، وَالَّذِیْ اَرْسَلْنَاکُمْ بِمَا کُنتُمْ فِیْہِ سَآئِلِیْنَ، اور اس بحث کو غیر ضروری سمجھ کر اصل کام کی طرف توجہ دلائی کہ شہر سے کچھ کھانا لانے کے لئے ایک آدمی کو بھیج دیا جائے۔

اِلٰی الْمَدِیْنَةِ، اس لفظ سے اتنا قوت ثابت ہوا کہ غار کے قریب بڑا شہر تھا، جہاں یہ لوگ رہتے تھے، اس شہر کے نام کے متعلق ابو حیان نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ جس زمانے میں اصحاب کھنڈ یہاں سے نکلے تھے، اس وقت اس شہر کا نام افسوس تھا، اور اب اس کا نام طرسوس ہے، قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ بت پرستوں کے اس شہر پر غلبہ اور جاہلیت کے زمانے میں اس کا نام افسوس تھا، جب اس زمانے کے مسلمان یعنی مسیحی اس پر غالب آئے تو اس کا نام طرسوس رکھ دیا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَمِعْنَا بِمَا کُنتُمْ فِیْہِ سَآئِلِیْنَ، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات غار میں آنے کے وقت اپنے ساتھ کچھ رقم روپیہ پیسہ بھی ساتھ لائے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ ضروری نفقہ کا اہتمام کرنا زہد و توکل کے خلاف نہیں رہے (بحر محیط)

اٰیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَمِعْنَا بِمَا کُنتُمْ فِیْہِ سَآئِلِیْنَ، اس سے معلوم ہوا کہ جس زمانے میں یہ لوگ شہر سے نکلے تھے، وہاں بتوں کے نام کا ذبیحہ ہوتا، اور وہی بازاروں میں فروخت ہوتا تھا، اس لئے جانے والے کو یہ تاکید کی کہ اس کی تحقیق کر کے کھانا لاتے کہ یہ کھانا حلال بھی ہے یا نہیں۔

مَسْئَلَةٌ، اس سے معلوم ہوا کہ جس شہر یا جس بازار، ہوٹل میں اکثریت حرام کھانے کی ہو وہاں کا کھانا بغیر تحقیق کے کھانا جائز نہیں۔

اَوْ یَرٰ جَمْعًا مِّنْہُمْ، رجم کے معنی سنگسار کرنے کے ہیں، بادشاہ نے غار میں جانے سے پہلے ان کو دھکی دی تھی کہ اگر اپنا یہ دین نہ چھوڑ دے تو قتل کر دیئے جاؤ گے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ان کے دین سے پھر جانے والے کی سزائے قتل بصورت سنگساری دی جاتی تھی تاکہ سب لوگ اس میں شریک ہوں، اور ساری قوم اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر کے قتل کر دی۔ شاید شریعت اسلام میں شادی شدہ مرد و عورت کے زنا کی سزا بھی جو سنگسار کے قتل کرنا تجویز کیا گیا ہے اس کا بھی منشاء یہ ہو کہ جس شخص نے حیا کے سائے پر دوں کو توڑ کر اس فعل قبیح کا ارتکاب کیا ہے اس کا قتل منظر عام پر سب لوگوں کی شرکت کے ساتھ ہونا چاہئے تاکہ اس کی رسوائی بھی پوری ہو، اور سب مسلمان عملاً اپنے غیظ و غضب کا اظہار کریں، تاکہ آئندہ قوم میں اس حرکت کا اعادہ نہ ہو سکے۔

فَاَبْعَثُوْا اَحَدًا مِّنْہُمْ، اس واقعہ میں جماعت اصحاب کہف نے اپنے میں سے ایک آدمی کو شہر بھیجنے کے لئے منتخب کیا، اور رقم اس کے حوالہ کی کہ وہ کھانا خرید کر لائے، قرطبی نے

بحوالہ ابن خوزمند فرمایا کہ اس سے چند فقہی مسائل حاصل ہوتے۔

چند مسائل | اول یہ کہ مال میں شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ رقم سب کی مشترک تھی، دوسری یہ کہ مال میں وکالت جائز ہے، کہ مشترک مال میں کوئی ایک شخص بحیثیت وکیل دوسروں کی اجازت سے تصرفات کرے، تیسرے یہ کہ چند رفیق اگر کھانے میں شرکت رکھیں یہ جائز ہے، اگرچہ کھانے کی مقداریں عادتاً مختلف ہوتی ہیں، کوئی کم کھاتا ہے کوئی زیادہ۔

وَكَذَلِكَ أَثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ

اور اسی طرح خبر ظاہر کر دی ہم نے ان کی تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت

لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِمُ

کے آنے میں دھوکہ نہیں، جب جھگڑا ہوا تھا آپس میں اپنی بات پر بھگنے لگے بناؤ ان پر

بُنْيَانًا رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ط قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ

ایک عمارت، اُن کا رب خوب جانتا ہے اُن کا حال، بولے وہ لوگ جن کا کام غالب تھا ہم بنائیں گے

لَنَتَّخِذَنَّهُمْ عَلَيْكُمْ مَسْجِدًا ۝۲۱

اُن کی جگہ پر عبادت خانہ۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم نے جس طرح اپنی قدرت سے ان کو مسلایا اور جگایا، اسی طرح ہم نے اپنی قدرت و حکمت سے اس زمانے کے (لوگوں کو ان کے حال) پر مطلع کر دیا تاکہ (منجملہ اور فوائد کے ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ) وہ لوگ (اس واقعہ سے استدلال کر کے) اس بات کا یقین (یا زیادہ یقین) کریں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اور وہ یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں رہے لوگ اگر پہلے سے قیامت میں زندہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے تو زیادہ یقین اس واقعہ سے ہو گیا، اور اگر قیامت کے منکر تھے تو اب یقین حاصل ہو گیا، یہ واقعہ تو اصحابِ کعبہ کی زندگی میں پیش آیا، پھر اُن صاحبوں نے وہیں غار میں وفات پائی، تو ان کے متعلق اہل عصر میں اختلاف ہوا جس کو آگے بیان فرمایا ہے کہ وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اس زمانے کے لوگ ان کے معاملے میں باہم جھگڑ رہے تھے،

اور وہ معاملہ اس غار کا منہ بند کرنا تھا تا کہ ان کی لاشیں محفوظ رہیں، یا ان کی یادگار قائم کرنا مقصود تھا، سو ان لوگوں نے کہا کہ ان کے (غار کے) پاس کوئی عمارت بنو اور پھر اختلاف ہوا کہ وہ عمارت کیا ہو، اس میں رائیں مختلف ہوتیں، تو اختلاف کے وقت، ان کا رب ان کے احوال مختلفہ کو خوب جانتا تھا (بالآخر) جو لوگ اپنے کام پر غالب تھے (یعنی اہل حکومت جو اس وقت دین حق پر قائم تھے) انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنادیں گے (تا کہ مسجد اس بات کی بھی علامت رہے کہ یہ لوگ خود عابد تھے معبود نہ تھے اور دوسری عمارتوں میں یہ احتمال تھا کہ آگے آنے والے انہی کو معبود بنالیں) :

معارف و مسائل

وَكَذٰلِكَ اَعْرَضْنَا عَنْ قَوْمِكَ اِنَّكَ كَانِمْ شَہْرًا مِّنْكُمْ مِّنْكَشَفَ مَوْجَانَا
اور اس کی حکمت عقیدۂ آخرت و قیامت کہ سب مردے دوبارہ زندہ ہوں گے اس پر ایمان لے لینا
حاصل ہونا بیان فرمایا ہے، تفسیر قرطبی میں اس کا مختصر قصہ اس طرح مذکور ہے کہ :-

اصحاب کہف کا حال | اصحاب کہف کے نکلنے کے وقت جو ظالم اور مشرک بادشاہ و قیادہ اس شہر پر
اہل شہر پر کھل جانا | مسلط تھا وہ مر گیا، اور اس پر صدیاں گزر گئیں، یہاں تک اس مہکت پر قبضہ

اہل حق کا ہو گیا جو توحید پر یقین رکھتے تھے ان کا بادشاہ ایک نیک صالح آدمی تھا جس کا نام
تفسیر منظر میں تاریخی روایات سے بیحد وسیع لکھا ہے، اس کے زمانے میں اتفاقاً قیامت
اور اس میں سب مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے مسئلے میں کچھ اختلافات پھیل گئے، ایک
فرقہ اس کا منکر ہو گیا کہ یہ بدن نکلنے سڑنے، پھر ریزہ ریزہ ہو کر ساری دنیا میں پھیل جانے
کے بعد پھر زندہ ہو جائیں گے، بادشاہ وقت بید و سیس کو اس کی فکر ہوتی کہ کس طرح ان کے
شکوہ و شبہات دور کئے جائیں جب کوئی تدبیر نہ بنی تو اس نے ٹاٹ کے کپڑے پہنے اور رکھ
کے ڈھیر پر بیٹھ کر اللہ سے دعا کی اور الحاج و زاری شروع کی، کہ یا اللہ آپ ہی کوئی ایسی صورت
پیدا فرمادیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو جائے اور یہ راہ پر آجائیں، اس طرف یہ بادشاہ گریہ و
زاری اور دعا میں مصروف تھا، دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کی قبولیت کا یہ سامان
کر دیا کہ اصحاب کہف بیدار ہوئے اور انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جس کا نام تمہینا بتلایا جاتا ہے
ان کے بازار میں بھیجا وہ کھانا خریدنے کے لئے دکان پر پہنچا اور تین سو برس پہلے بادشاہ و قیادہ
کے زمانے کا سکہ کھانے کی قیمت میں پیش کیا تو دکاندار حیران رہ گیا، کہ یہ سکہ کہاں سے آیا، کس
زمانے کا ہے، بازار کے دوسرے دکان داروں کو دکھلایا، سب نے یہ کہا کہ اس شخص کو کہیں پرانا

خزانہ ہاتھ آ گیا ہے اس میں سے یہ سکہ نکال کر لایا ہے، اس نے انکار کیا کہ نہ مجھے کوئی خزانہ ملا، نہ کہیں سے لایا یہ میرا پیارو پیہ ہے۔

بازار داروں نے اس کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا، یہ بادشاہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، ایک نیک صالح اللہ والا تھا، اور اس نے سلطنت کے پُرانے خزانے کے آثار قدیمہ میں کہیں وہ تختی بھی دیکھی تھی جس میں اصحاب کہف کے نام اور ان کے فرار ہو جانے کا واقعہ بھی لکھا ہوا تھا، بعض کے نزدیک خود غلام بادشاہ دقیانوس نے یہ تختی لکھوائی تھی، کہ یہ ہشتہاری مجرم ہیں، ان کے نام اور پتے محفوظ رہیں، جب کہیں ملیں گرفتار کر لئے جائیں، اور بعض روایات میں ہے کہ شاہی دفتر میں بعض ایسے نو من بھی تھے جو دل سے بت پرستی کو بُرا سمجھتے اور اصحاب کہف کو حق پر سمجھتے تھے، مگر ظاہر کرنے کی ہمت نہیں تھی، انہوں نے یہ تختی بطور یادگار کے لکھ لی تھی، اسی تختی کا نام رقیم ہے جس کی وجہ سے اصحاب کہف کو اصحاب رقیم بھی کہا گیا۔

الغرض اس بادشاہ کو اس واقعہ کا کچھ علم تھا، اور اس وقت وہ اس دعا میں مشغول تھا کہ کسی طرح لوگوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ مُردہ اجسام کو دوبارہ زندہ کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے کچھ بعید نہیں۔

اس لئے تمیلینا سے اس کے حالات کی تحقیق کی تو اس کو اطمینان ہو گیا کہ یہ اپنی لوگوں میں سے ہے اور اس نے کہا کہ میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر چکا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے ملا دے جو دقیانوس کے زمانے میں اپنا ایمان بچا کر بھاگے تھے؟ بادشاہ اس پر سرور ہوا اور کہا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی، اس میں لوگوں کے لئے شاید کوئی ایسی جنت ہو جس سے ان کو حشرِ اجساد کا یقین آجائے، یہ کہہ کر اس شخص سے کہا کہ مجھے اس غار پر لے چلو جہاں سے تم آئے ہو۔

بادشاہ بہت سے اہل شہر کے مجمع کے ساتھ غار پہنچا، جب غار قریب آیا تو تمیلینا نے کہا کہ آپ ذرا ٹھہریں میں جا کر اپنے ساتھیوں کو حقیقتِ معاملہ سے باخبر کر دوں کہ اب بادشاہ مسلمان ہو چکا ہے اور قوم بھی مسلمان ہے، وہ ملنے کے لئے آئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اطلاع سے پہلے آپ پہنچیں تو وہ سمجھیں کہ ہمارا دشمن بادشاہ چڑھا آیا ہے، اس کے مطابق تمیلینا نے پہلے جا کر ساتھیوں کو تمام حالات سُنا دیے تو وہ لوگ اس سے بہت خوش ہوئے، بادشاہ کا استقبالِ تعظیم کے ساتھ کیا، پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے، اور اکثر روایات میں یہ ہے کہ جس وقت تمیلینا نے ساتھیوں کو یہ سارا قصہ سُنا یا، اسی وقت سب کی وفات ہو گئی، بادشاہ سے ملاقات نہیں ہو سکی، بحرِ میط میں ابوحیان نے اس جگہ یہ روایت نقل کی ہے کہ ملاقات

کے بعد اہل غار نے بادشاہ اور اہل شہر سے کہا کہ اب ہم آپ سے رخصت چاہتے ہیں اور غار کے اندر چلے گئے، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کو وفات دیدی، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

بہر حال اب اہل شہر کے سامنے یہ واقعہ عجیبہ قدرت الہیہ کا واشگاف ہو کر آ گیا تو سب کو یقین ہو گیا کہ جس ذات کی قدرت میں یہ داخل ہے کہ تین سو برس تک زندہ انسانوں کو بغیر کسی عذرا اور سامان زندگی کے زندہ رکھے اور اس طویل عرصہ تک ان کو نیند میں رکھنے کے بعد پھر صحیح سالم، قوی، تندرست اٹھائے اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ مرنے کے بعد بھی پھر ان اجسام کو زندہ کر دے، اس واقعہ سے ان کے انکار کا سبب دور ہو گیا کہ حشر اجساد کو مستبعد اور خارج از قدرت سمجھتے تھے، اب معلوم ہوا کہ مالک الملکوت کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا خود جہالت ہے۔

اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا يَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا تَأْتِي بَعْدَ أَهْلِهَا، یعنی ہم نے اصحاب کہف کو زمانہ دراز تک سنانے کے بعد جگا کر بٹھا دیا تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ کا وعدہ یعنی قیامت میں سب مردوں کے اجسام کو زندہ کرنے کا وعدہ سچا اور قیامت کے آنے میں کوئی مشبہ نہیں۔

اصحاب کہف کی وفات کے بعد | اصحاب کہف کی بزرگی اور تقدس کے تو سب ہی قائل ہو چکے تھے، ان کی وفات کے بعد سب کا خیال ہوا کہ غار کے پاس کوئی عمارت لوگوں میں اختلاف رائے بطور یادگار کے بنائی جائے، عمارت کے بارے میں اختلاف رائے ہوا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل شہر میں اب بھی کچھ بہت پرست لوگ موجود تھے وہ بھی اصحاب کہف کی زیارت کو آتے تھے، ان لوگوں نے عمارت بنانے میں یہ رائے دی کہ کوئی رفاہ عام کی عمارت بنادی جائے، مگر ارباب حکومت اور بادشاہ مسلمان تھے، اور انہی کا غلبہ تھا، ان کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں مسجد بنادی جائے جو یادگار بھی رہے اور آئندہ بہت پرستی سے بچانے کا سبب بھی بنے، یہاں اختلاف رائے کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں مشرآن کا یہ جملہ ہے وَجِئْتُمْ أَهْلَهُمْ بِحَبْرٍ، یعنی ان کا رب ان کے حالات کو پوری طرح جانتا ہے، تفسیر بحر محیط میں اس جملے کے معنی میں دو احتمال ذکر کئے ہیں، ایک یہ کہ یہ قول انہی حضرات اہل شہر کا ہو، کیونکہ ان کی وفات کے بعد جب ان کی یادگار بنانے کی رائے ہوئی تو جیسا عمر مسافر یادگاری تعمیرات میں ان لوگوں کے نام اور خاص حالات کا کتبہ لکھا جاتا ہے جن کی یادگاریں تعمیر کی گئی ہیں تو ان کے نسب اور حالات کے بارے میں مختلف گفتگو میں ہونے لگیں، جب کسی حقیقت پر نہ پہنچے تو خود انہوں نے ہی آخر میں عاجز ہو کر کہہ دیا، وَجِئْتُمْ أَهْلَهُمْ بِحَبْرٍ اور یہ کہہ کر اصل کام یعنی یادگار بنانے کی طرف متوجہ ہو گئے، جو لوگ غالب تھے ان کی رائے مسجد بنانے کی ہو گئی۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کلام حق تعالیٰ کی طرف سے ہے جس میں اس زمانے کے باہم جھگڑا اور اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب تمہیں حقیقت کا علم نہیں، اور اس کے علم کے ذرائع بھی تمہارے پاس نہیں تو کیوں اس بحث میں وقت ضائع کرتے ہو، اور ممکن ہو کہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہودی وغیرہ جو اس واقعہ میں اسی طرح کی بے اصل باتیں اور بھیس کیا کرتے تھے، ان کو تنبیہ مقصود ہو، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

مسئلہ: اس واقعہ سے اتنا معلوم ہوا کہ اولیاء صلیاء کی قبور کے پاس نماز کے لئے مسجد بنادینا کوئی گناہ نہیں، اور جس حدیث میں قبور انبیاء کو مسجد بنانے والوں پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اس سے مراد خود قبور کو مسجد کہہ بنا دینا ہے، جو باتفاق شرک حرام ہو (مغلطی)

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّآئِهِمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ

اب یہی کہیں گے وہ تین ہیں اور چھان کا کتا اور یہ بھی کہیں گے وہ پانچ ہیں چھان کا

كَلْبُهُمْ وَجَمَابِ الْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ

تک بدون نشانہ دیکھے پھر چھان، اور یہ بھی کہیں گے وہ سات ہیں اور آٹھواں ان سے شت

قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ مَّا يَتْلُمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تَسَارِفْ فِيهِمْ

تو کہ میرا رب خوب جانتا ہے ان کی گنتی، ان کی خبر نہیں رکھتے مگر قلیل ہے لوگ، سو نہ جھگڑاؤں کی باتیں

إِلَّا مِرَآءَ ظَاهِرٍ أَمْرٍ وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ أَحَدًا (۲۲)

مگر میری جھگڑا، اور نہ تحقیق کر ان کا حال ان میں کسی سے

خلاصہ تفسیر

(جس وقت اصناف کلمہ کا قصہ بیان کریں گے تو) بعض لوگ تو کہیں گے وہ تین ہیں چھان کا

ان کا کتا ہے اور بعض کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں چھان ان کا کتا ہے (اور) یہ لوگ بے تحقیق باتیں

ہانک رہے ہیں اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے، آپ ان اختلاف

کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب (صحیح صحیح) جانتا ہے (کہ ان مختلف

اقوال میں کوئی قول صحیح بھی ہے یا سب غلط ہیں) ان کی تعداد (کو) صحیح صحیح بہت کم لوگ

جانتے ہیں اور چونکہ تعداد متعین کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، اس لئے آیت میں کوئی صریح فیصلہ نہیں فرمایا، لیکن روایات میں حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا انما من القلیل کا نوا سبعة یعنی میں بھی ان قلیل لوگوں میں داخل ہوں جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ کم لوگ جانتے ہیں وہ سب تھے، کذا فی الدر المنثور عن ابی حاتم وغیرہ، اور آیت میں بھی اس قول کی صحت کا اشارہ پایا جاتا ہے، کیونکہ اس قول کو نقل کر کے اس کو رد نہیں فرمایا، بخلاف پہلے دونوں قول کے کہ ان کے تردید میں رجحان الغیب فرمایا گیا ہے، واللہ اعلم، سو اس پر بھی اگر وہ لوگ اختلاف سے باز نہ آویں تو آپ اس معاملہ میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے، یعنی مختصر طور پر تو ان کے خیالات کا رد قرآن کی آیات میں آہی چکا ہے جو رجحان الغیب، قل ربی اعلم سے بیان کر دیا گیا ہے، پس سرسری بحث یہی ہے کہ آپ پر اکتفاء کریں، ان کے اعتراض کے جواب میں اس سے زیادہ مشغول ہونا اور اپنے دعوے کے اثبات میں زیادہ کاوش کرنا مناسب نہیں کہ یہ بحث ہی کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتی، اور آپ ان راہب کھت، کے بارے میں ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کچھ نہ پوچھتے جس طرح آپ کو ان کے اعتراض و جواب میں زیادہ کاوش سے منع کیا گیا، اسی طرح اس کی بھی ممانعت فرمادی کہ اب اس معاملہ کے متعلق کسی سے سوال یا تحقیق کریں، کیونکہ جتنی بات ضروری تھی وہ وہی میں آگنی فیہ ضروری سوالات اور تحقیقات شان انبیاء کے خلاف ہے۔

معارف و مسائل

اختلافی بحثوں میں | سَيَقُولُونَ، یعنی وہ لوگ کہیں گے، وہ کہنے والے کون لوگ ہیں، اس میں دو گفتگو کے آداب | احتمال ہیں، ایک یہ کہ مراد ان سے وہی لوگ ہوں جن کا باہم اختلاف صحابہ کرام کے زمانے میں ان کے نام و نسب وغیرہ کے متعلق ہوا تھا جس کا ذکر اس سے پہلے آیت میں آیا ہے، انہی لوگوں میں سے بعض نے عدد کے متعلق پہلا بعض نے دوسرا بعض نے تیسرا قول اختیار کیا تھا۔
 ذکرہ فی البحر عن الماوردی

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ سَيَقُولُونَ کی ضمیر نصاریٰ بخران کی طرف عائد ہو، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعداد کے بارے میں مناظرہ کیا تھا، ان کے تین فرقے تھے ایک فرقہ ملکانیہ کے نام سے موسوم تھا، اس نے تعداد کے متعلق پہلا قول کہا، یعنی تین کا عدد بتلایا، دوسرا فرقہ یعقوبیہ تھا، اس نے دوسرا قول یعنی پانچ ہونا اختیار کیا، تیسرا فرقہ نستوریہ تھا اس نے تیسرا قول کہا کہ سات تھے، اور بعض نے کہا کہ یہ تیسرا قول مسلمانوں کا تھا، اور بالاخر

کی اصاعت بھی ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت دوسرے جگہ میں یہ دی گئی ہے کہ وحی الہی کے ذریعہ سے قصہ اصحاب کہف کی جتنی معلومات آپ کو دیدی گئی ہیں ان پر قناعت فرمادیں کہ وہ بالکل کافی ہیں، زائد کی تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں، اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی جہالت یا نادانیت ظاہر کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جاتا ہے یہ بھی اخلاق انبیاء کے خلاف ہے، اس لئے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کر دیا گیا، یعنی تحقیق مزید کے لئے ہو یا مخاطب کی تمہیل و رسوائی کے لئے ہو۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝۲۷ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ

اور نہ کہنا کسی کام کو کہ میں کروں گا کل ۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے

وَ اِذْ کَرَّرَ رَبُّکَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰی اَنْ یَّجِدَ بَیْنَ رَبِّیْ اِلٰقَرَبَ

اور یاد کر لے اپنے رب کو جب بھول جائے اور کہہ امیر ہو کہ میرا رب مجھ کو دکھائے اس سے زیادہ

مِنْ هٰذَا اَرْشَدًا ۝۲۸ وَلَیْسُوْا فِیْ کَیْفِیْہُمْ ثَلٰثَ مِاۃٍ سِنِیْنَ

نزدیک راہ نیکی کی، اور مدت گزری ان پر اپنی کھوہ ہیں تین سو برس

وَ اِزْدَادًا وَاَنْتَ عَاۡلِمٌۢ بِمَا لَبِثُوْۤا ۝۲۹ لَّہٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ

اور ان کے اوپر نو ۔ تو کہہ اللہ خوب جانتا ہو جتنی مدت ان پر گزری اسی کے پاس ہیں جیسے

وَالْاَرْضِ طٰٓئِفَتَاۤیْہِہٖمَا وَاَسْمِعْ مَا لَہُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّلِیٍّ

بھید آسمان اور زمین کے، کیا عجیب دیکھتا ہو اور سنتا ہو، کوئی نہیں بندوں پر اس کے سوائے مختار،

وَلَا یُشْرِکْ لَکَ فِیْ حُکْمِہٖۤ اَحَدًا ۝۳۰

اور نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو۔

خلاصہ تفسیر

اور اگر لوگ آپ سے کوئی بات قابل جواب دریافت کریں اور آپ کا وعدہ کریں تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ ضرور ملا لیا کریں، بلکہ وعدہ کی بھی تخصیص نہیں، ہر ہر کام میں اس کا لحاظ رکھئے کہ آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہنا کیجئے کہ میں

اس کو (مثلاً) گل کر دوں گا مگر خدا کے چاہنے کو (اس کے ساتھ) ملا دیا کیجئے (یعنی انشاء اللہ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجئے، اور آئندہ ایسا نہ ہو جیسا اس واقعہ میں پیش آیا کہ آپ سے لوگوں نے روح اور اصحاب کہف اور ذوالہستین کے متعلق سوالات کئے، آپ نے بغیر انشاء اللہ کہے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ کر لیا، پھر پندرہ روز تک وحی نازل نہ ہوئی، اور آپ کو بڑا غم ہوا، اس ہدایت کے ساتھ ان لوگوں کے سوال کا جواب بھی نازل ہوا (کذا فی الباب عن ابن عباسؓ) اور جب آپ (راتفاقاً انشاء اللہ کہنا) بھول جاویں (اور پھر کبھی یاد آوے) تو اسی وقت انشاء اللہ کہہ کر اپنے رب کا ذکر کر دیا کیجئے اور (ان لوگوں سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ مجھ کو امید ہے کہ میرا رب مجھ کو نبوت کی دلیل بننے کے اعتبار سے) اس (قصہ) سے بھی نزدیک تر بات بتلا دے (مطلب یہ ہے کہ تم نے میری نبوت کا امتحان لینے کے لئے اصحاب کہف وغیرہ کے قصے دریافت کئے، جو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح وحی مجھے بتلا کر تمہارا اطمینان کر دیا، مگر اصل بات یہ ہے کہ ان قصوں کے سوال و جواب اثبات نبوت کے لئے کوئی بہت بڑی دلیل نہیں ہو سکتی، یہ کام تو کوئی غیر نبی بھی جو تاریخ عالم سے زیادہ واقف ہو وہ بھی کر سکتا ہے، مگر مجھے تو اللہ تعالیٰ نے میری نبوت کے اثبات کے لئے اس سے بھی بڑے قطعی دلائل اور ہجرات عطا فرمائے ہیں، جن میں سب بڑی دلیل تو خود قرآن ہے، جس کی ایک آیت کی بھی ساری دنیا مل کر نقل نہیں اتار سکی۔

اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے وہ واقعات ہزارہ وحی مجھے بتلا دیئے گئے ہیں جو زمانے کے اعتبار سے بھی بہ نسبت واقعہ اصحاب کہف و ذوالہستین کے زیادہ بعید ہیں، اور ان کا علم بھی کسی کے لئے بجز وحی کے ممکن نہیں ہو سکتا، خلاصہ یہ ہے کہ تم نے تو اصحاب کہف اور ذوالہستین کے واقعات کو سب سے زیادہ عجیب سمجھ کر اسی کو امتحان نبوت کے سوال میں پیش کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بھی زیادہ عجیب عجیب چیزوں کے علوم عطا فرمائے ہیں) اور جیسا اختلاف ان لوگوں کا اصحاب کہف کے عہد میں ہے، ایسا ہی ان کے سوتے رہنے کی مدت میں بھی بہت اختلاف ہے، ہم اس میں صحیح بات بتلاتے ہیں کہ وہ لوگ اپنے غار میں زمین کی حالت میں (تین سو برس تک رہے اور نو برس اوپر اور رہے) اور اگر اس میں بات کو سن کر بھی وہ اختلاف کرتے رہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ خدا تعالیٰ انکے (سوتے رہنے کی مدت کو) (تو تم سے) زیادہ جانتا ہے اس لئے جو اس نے بتلا دیا وہی صحیح ہو اور اس واقعہ کی کیا تخصیص اس کی شان تو یہ ہے کہ تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیبی اسی کو ہر وہ کیسا کچھ دیکھنے والا کیسا کچھ سننے والا ہے، ان کا خدا کے سوا کوئی بھی مانگا نہیں اور نہ اللہ کسی کو اپنے حکم میں شریک رکھا کرتا ہو (خلاصہ یہ ہے کہ نہ اس کا کوئی مزا ہم پر نہ شریک ایسی ذات عظیم کی مخالفت سے بہت ڈرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

مذکورہ قصہ چار آیتوں پر قصہ اصحاب کہف ختم ہو رہا ہے، ان میں سے پہلی دو آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ یا قرار کرنا ہو تو اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ کا کلمہ ملا لیا کرو، کیونکہ آئندہ کا حال کسی کو معلوم ہے کہ زندہ بھی ہے گایا نہیں، اور زندہ بھی رہا تو یہ کام کر کے نکھایا نہیں، اس لئے مومن کو چاہئے کہ اللہ پر بھروسہ دل میں بھی کرے اور زبان سے اس کا اقرار کرے کہ اگلے دن میں کسی کام کے کرنے کو کہے تو یوں کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں یہ کام کل کروں گا، یہی معنی ہیں کلمہ انشاء اللہ کے۔

تیسری آیت میں اس اختلافی بحث کا فیصلہ لیا گیا ہے جس میں زمانہ اصحاب کہف کے لوگوں کی رائیں بھی مختلف تھیں، اور موجودہ زمانے کے یہود و نصاریٰ کے اقوال بھی مختلف تھے، اپنی غلامیوں سے رنج کی مدت، اس آیت میں بتلادیا گیا کہ وہ تین سو نو سال تھے، گویا یہ اس حال کا بیان جو شروع قصہ میں بیان ہوا تھا، فَخَسِبْنَا عَلَىٰ اِذَا لَكُمْ فِي الْمُنَاقِبِ ذِكْرًا۔ اس کے بعد چوتھی آیت میں پھر اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ حقیقت حال کی تم کو خبر نہیں، اس کا جاننے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے جو آسمانوں اور زمین کے سب غائبات کو جاننے والا سمیع و بصیر ہے، اس نے جو مدت تین سو نو سال کی بتلادی اس پر مطمئن ہو جانا چاہئے۔ آئندہ کام کرنے پر اباب میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پہلی دو آیتوں کے شان نزول کے متعلق انشاء اللہ کہنا یہ نقل کیا ہے کہ جب اہل مکہ نے یہود کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ اصحاب کہف وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے ان سے کل جواب دینے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہے ہوئے کر لیا تھا۔ معترضین بارگاہ کی ادنیٰ سی کوتاہی پر تنبیہ ہو ا کرتی ہے، اس لئے پندرہ روز تک دسی نہ آئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برا غم ہوا، اور مشرکین مکہ کو ہنسنے اور مذاق اڑانے کا موقع ملا، پندرہ روز کے اس وقفہ کے بعد جب اس سورۃ میں سوالات کا جواب نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ دو آیتیں ہر ایت دینے کے لئے نازل ہوئیں کہ آئندہ کسی کام کے کرنے کو کہنا ہو تو انشاء اللہ کہہ کر اس کا اقرار کر لیا کریں کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے، ان دونوں آیتوں کو قصہ اصحاب کہف کے ختم پر لایا گیا ہے۔

مسئلہ: اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں انشاء اللہ کہنا مستحب ہے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اگر بھولے سے یہ کلمہ کہنے سے رہ جائے تو جب یاد آئے اس وقت کہہ

یہ حکم اس مخصوص معاملہ کے لئے ہے جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں، یعنی محض تبرک اور اقرارِ ہدایت کے لئے یہ کلمہ کہنا مقصود ہوتا ہے، کوئی تعلیق اور شرط لگانا مقصود نہیں ہوتا اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معاملات بیح و شریار اور معاہدات میں جہاں شرطیں لگائی جاتی ہیں، اور شرط لگانا طرفین کے لئے معاہدہ کا مدار ہوتا ہے وہاں بھی اگر معاہدہ کے وقت کوئی شرط لگانا بھول جائے تو پھر کبھی جب یاد آجائے جو چاہے شرط لگائے، اس مسئلے میں بعض فقہاء اختلاف بھی ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

تیسری آیت میں جو غار میں سونے کی مدت تین سو نو سال بتلائے ہیں، ظاہر نسقِ قرآن سے یہی ہے کہ یہ بیان مدت حق تعالیٰ کی طرف سے، ان کتب نے اسی کو جمہور مفسرین سلف و خلف کا قول متراویا ہے، ابو حیان اور قاضی وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، مگر حضرت قتادہ وغیرہ سے اس میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ تین سو نو سال کا قول بھی انہی اختلاف کرنے والوں میں سے بعض کا قول ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قول صرف وہ ہے جو بعد میں فرمایا یعنی اللَّهُ أَفَعَلَّ بِمَا لَبِئْتُمْ، کیونکہ پہلا قول تین سو نو کے متعین کرنے کا اگر اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے بعد اللَّهُ أَفَعَلَّ بِمَا لَبِئْتُمْ کہنے کا موقع نہ تھا، مگر جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہ دونوں جملے حق تعالیٰ کا کلام ہیں، پہلے میں حقیقت واقعہ کا بیان ہے اور دوسرے میں اس سے اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدت کا بیان آگیا تو اب اس کو تسلیم کرنا لازم ہے، وہی جانتے والا ہے، محض تخمینوں اور رایوں سے اس کی مخالفت بے عقلی ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بیان مدت میں پہلے تین سو سال بیان کئے اس کے بعد فرمایا کہ ان تین سو پر نو اور زیادہ ہو گئے، پہلے ہی تین سو نو نہیں فرمایا اس کا سبب حضرات مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں چونکہ شمسی سال کا رواج تھا اس کے حساب سے تین سو سال ہی ہوتے ہیں، اور اسلام میں رواج قمری سال کا ہے اور قمری حساب میں ہر سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لئے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے، ان دونوں سالوں کا مستیاز بتانے کے لئے عنزان تعبیر یہ اختیار کیا گیا ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کے معاملے میں خود ان کے زمانے میں، پھر عہد نبوی کے اندر یہود و نصاریٰ میں باتیں زیر اختلاف تھیں ایک اصحاب کہف کی تعداد دوسری غار میں ان کے سوتے رہنے کی مدت، قرآن نے ان دونوں کو بیان تو کر دیا، مگر اس فرق کے تحت کہ تعداد کا بیان صریح الفاظ میں نہیں آیا، اشارے کے طور پر آیا، کہ جو قول صحیح تھا اس کی تردید نہیں کی، اور مدت کی تیس کو صاف و صریح الفاظ میں بتلایا وَلَبِئْسُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَاتٍ

مِثْنَيْنِ وَأَنْبَدَا دَاوُدَ وَإِسْحَاقَ، عجیب یہ کہ قرآن نے اپنے اس اسلوب سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ تعداد کی بحث تو بالکل ہی فضول ہے، اس سے کسی دینیوی دینی مسئلہ کا تعلق نہیں، البتہ مدت و راز تک خلاف عادت انسانی سوتے رہنا اور بغیر غدار کے صحیح تندرست رہنا پھر اتنے عرصہ کے بعد صحت مند اور قوی اٹھ کر بیٹھ جانا ایک نظیر حشر و آشوب کی ہے، اس سے مسئلہ قیامت و آخرت پر استدلال ہو سکتا ہے، اس لئے اس کو بصراحت بیان کر دیا۔

جو لوگ حجرات اور خوارقِ عادات کے یا منکر ہیں یا کم از کم آجکل کے مستشرقین یہودی نصاریٰ کے اعتراضات سے مرعوب ہو کر ان میں تاویلیں کر نیچے غور ہو گئے ہیں انھوں نے اس آیت میں بھی حضرت قتادہ کی تفسیر کا سہارا لے کر تین سو نو سال کی مدت اپنی لوگوں کا قول قرار دے کر رد کرنا چاہا ہے، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ قرآن کے ابتدائی جملے میں جو لفظ مِثْنَيْنِ عَدَّ دَاوُدَ آیا ہے اس کو تو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی قول نہیں کہا جکتا، شریعت عادت اور کرامت کے ثبوت کے لئے اتنا بھی کافی ہے کہ ساٹھ سال کوئی سوتا رہے اور پھر صحیح تندرست زندہ اٹھ کر بیٹھ جائے، واللہ اعلم

وَأَتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مَبْدَلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ

اور پڑھو وہی جو تم کو میرے رب کی کتاب سے کوئی بدلے والا نہیں اس کی باتیں

وَلَكِنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۚ ۝۴۱ وَأَصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِينَ

اور کہیں نہ پائے گا تو اس کے سوائے چھپنے کو جگہ، اور رو کے رکھ لینے آپ کو ان کے ساتھ

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدُوَّةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ

جو بجاتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام طالب ہیں اس کے منہ کے اور نہ دور ہیں

عَيْنُکَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ

تیری آنکھیں انکو پھول کر تلاش میں رہو دنیا کی دنیا کی اور نہ کہا مان اس کا

أَغْفَلْنَا قُلُوبَهُ عَنْ ذِكْرِکَ يَا وَاتَّبِعْ هَوَاهُ ۚ وَكَانَ أَمْرًا فُرْطًا ۚ ۝۴۲

جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے، اور پیروی ہو اپنی خواہش کے اور اس کا نام اور حیرت نہ رہنا

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّکُمْ نَفْثَ شَیْءٍ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ

اور کہہ سچ بات جو تمھارے رب کی طرف سے جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے

تِلْكَ

فَيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَإِنَّا نَعْتَدُ لِلظَّالِمِينَ نَارًا ۖ أَحْطَأَ بِهِمُ مَسْرَادُ قَهَارِ ۖ وَإِن

نہ مانے ہم نے تیار کر رکھی ہے گنہگاروں کے واسطے آگ انگیر رہی یہاں کہ اس کی قاتیں . اور اگر

يَسْتَفِيدُونَ أَيَّامَهُمْ ابْسَاءً كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ طَبَسَ الشَّرَابِ ۖ

فریاد کریں گے تو ملے گا پانی جیسے پیپ بھون ڈالے گا کہ . کیا برا پینا ہے .

وَسَاءَ مَا كَرَّمْنَا تَقِيًّا ۚ إِنَّ الَّذِينَ سَنَّ أَفْعَالَهُمُ الصَّالِحِينَ إِنَّا

اور کیا برا آرام . بیشک جو لوگ نیکیں سنتے اور کہیں نیکیاں . ہم

لَا نُظِيمُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ

نہیں کھڑے بدلہ اس کا جس نے بہت کیا کام . انہوں کے واسطے باغ ہیں جس کے

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُدْرِكُونَ فِيهَا مِنْ آسَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ

بہت بہاؤں کے نیچے نہریں بہنا سے جائیں گے ان کو وہاں کنٹین سونے کے .

وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُندُسٍ ۖ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتكِينٍ

اور پہنیں گے کپڑے سبز باریک اور گانٹے ریشم کے تکیہ لگاتے ہیں

فَيَسْأَلُ عَلَى الْأَسْرَارِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۖ

ان میں تختوں پر کیا خوب بدلہ ہے اور کیا خوب آرام .

خلاصہ تفسیر

اور آپ کا کام صرف اس قدر ہے کہ آپ کے پاس جو آپ کے رب کی کتاب وحی کے ذریعے
آئی ہے وہ لوگوں کے سامنے پڑھ دیا کیجئے اس سے زیادہ اس کی فکر میں نہ پڑیں کہ دنیا کے
بڑے لوگ اگر اسلام کی مخالفت کرتے رہے تو دین کو ترقی کس طرح ہوگی . کیونکہ اس کا اللہ تعالیٰ
نے ثبوت و عہد فرمایا ہے اور اس کی باتوں کو (یعنی وعدوں کو) کوئی نہیں بدل سکتا یعنی ساری دنیا
کے مخالف بھی مل کر اللہ کو وعدہ پورا کرنے سے نہیں روک سکتے اور اللہ تعالیٰ خود اگرچہ تہدیل و
قدرت رکھتے ہیں مگر وہ تہدیل نہیں کریں گے . اور اگر آپ نے ان بڑے لوگوں کی دلی ہوائی اس
طرح کی جس سے احکام الہیہ ترک ہو جائیں تو پھر آپ خدا کے سوا کوئی پناہ نہ پائیں گے . اگرچہ
احکام الہیہ کا ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلائل شرعیہ محال ہے . یہاں مباغہ اور تاکید

کے لئے بغرضِ خیال یہ کیا گیا ہے اور جیسا کہ کفار کے امیروں اور رئیسوں سے آپ کو مستغنی رہنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح فقرا و مسکین کے حال پر مزید توجہ کا آپ کو حکم ہے پس آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھنے میں) مقید رکھائیے جو صبح و شام (یعنی علیٰ ادوام) اپنے رب کی عبادتِ نفسِ اس کی رضا جوئی کے لئے کھڑے ہیں (کوئی غرضِ دنیوی نہیں) اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پاویں (رونقِ دنیا کے خیال سے مراد یہ ہے کہ رئیس لوگ مسلمان ہو جاویں تو اسلام کی رونق بڑھے گی، اس آیت میں بتلادیا گیا کہ اسلام کی رونق مال و منافع سے نہیں بلکہ حسنِ واطاعت سے ہے وہ غریب فقیر لوگوں میں ہو تو بھی رونقِ اسلام کی بڑھے گی) اور ایسے شخص کا کھانا غریبوں کو مجلس سے ہٹا دینے کے متعلق (نہ ماننے جس کے قاب کو ہم نے) (اس کے غنا کی سزائیں) اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہوا اس کا یہ حال (یعنی اتباعِ ہوس) حد سے گزر گیا ہے اور آپ (ان رؤساء کفار سے صاف) کہہ دیجئے کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے، سو جس کا بھی چاہے ایمان لاوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے (ہمارا کوئی نفع نقصان نہیں بلکہ نفع نقصان خود اس کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) بیشک ہم نے ایسے ظالموں کے لئے (دوزخ کی) آگ تیار کر رکھی ہے کہ اس آگ کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی (یعنی وہ قناتیں بھی آگ ہی کی ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے) یہ لوگ اس گھیرے سے نہ نکل سکیں گے) اور اگر (پاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جاوے گی جو (مکر وہ صورت ہونے میں تو) تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو گا اور تیز گرم ایسا ہو گا کہ پاس لاتے ہی (مونہوں کو بھون ڈالے گا) یہاں تک کہ چہرے کی کھال اتر کر گر پڑے گی جیسا کہ حدیث میں ہے (کیا ہی بڑا پانی ہو گا اور وہ دوزخ بھی کیا ہی میسر جگہ ہو گی (یہ تو ایمان نہ لانے کا ضرر ہوا اور ایمان لانے کا نفع یہ ہے کہ) بیشک جو لوگ ایمان لاتے اور انہوں نے اچھے کام کئے تو ہم ایسوں کا اجر صالح نہ کریں گے جو انہی طرح کام کو کرے، ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں ان کے (مساکن کے نیچے) نہریں بہتی ہوں گی ان کو دہاں سونے کے کنگن پہنا دیے جائیں گے اور سبز رنگ کے کپڑے باریک اور دبیز ریشم کے پہنیں گے (اور) وہاں مہربوں پر بکھے لگائے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی اچھا سلسلہ ہے اور (جنت) کیا ہی اچھی جگہ ہے ۝

معارف و مسائل

دعوتِ تبلیغ کے	وَاصْبِرْ لَفَسَّاتٍ، اس آیت کے شان نزول میں چند واقعات مذکور ہیں جو سخت
خاص آداب	ہو کہ وہ سب ہی اس ارشاد کا سبب بنے ہوں، بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ

عقینہ بن حسن فارس کا رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے پاس حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جو فقراء صحابہ میں سے تھے، ان کا لباس خشن اور تنگ قدیہ اذنی اور اس طرح کے کچھ فقر اور بے بختی میں تھے، عقینہ نے کہا کہ میں آپ کے پاس آنے اور آپ کی بات سننے سے یہی لوگ مانع ہیں، ایسے خستہ حال لوگوں کے پاس ہم نہیں بیٹھ سکتے، آپ ان کو اپنی مجلس سے جٹا دیں، یا کم از کم ہمارے لئے علویہ مجلس بنادیں اور ان کے لئے الگ۔

ابن مردودہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ امیہ بن خلف بھی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا کہ غریب فقیر شکستہ حال مسلمانوں کو آپ اپنے قریب نہ رکھیں، بلکہ مکہ اور قریش کے سرداروں کو ساتھ لگائیں، یہ لوگ آپ کا دین قبول کر لیں گے تو دین کو ترقی ہوگی۔ اس طرح کے واقعات پر یہ ارشادِ ربانی نازل ہوا جس میں ان کا مشورہ قبول کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا، اور صرف یہی نہیں کہ ان کو اپنی مجلس سے جٹالیں نہیں، بلکہ حکم یہ دیا گیا کہ اَصْحَابِ نَفْسِکَ، یعنی آپ اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ باندھ کر رکھیں، اس کا یہ مفہوم نہیں کہ کسی وقت جدا نہ ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ تعلقات اور توجہات سب ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رہیں، معاملات میں انہی سے مشورہ لیں، انہی کی امداد و اعانت سے کام کریں، اور اس کی وجہ اور حکمت ان الفاظ سے بتلا دی گئی کہ یہ لوگ صبح شام یعنی ہر حال میں اللہ کو پکارتے اور اسی کا ذکر کرتے ہیں، ان کا جو عمل ہے وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہے، اور یہ سب حالات وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد کو کھینچتے ہیں، اللہ کی مدد ایسے ہی لوگوں کے لئے آیا کرتی ہے، پسند روز کی کس پرہیزی سے گجرائیں نہیں، انجام کار فتح و نصرت انہی کو حاصل ہوگی۔

اور وہ سب تشریحات کا مشورہ قبول کرنے کی محنت کیجئے کہ آخر آیات میں یہ بتلائی کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور ان کے سب کام اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہیں اور یہ حالات اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت سے ان کو دور کرنے والے ہیں۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ مشورہ تو قابلِ عمل تھا کہ ان کے لئے ایک مجلس علیحدہ کر دی جاتی، تاکہ ان کو اسلام کی دعوت پہنچانے میں اور ان لوگوں کو قبول کرنے میں ہمدست ہوتی، مگر اس طرح کی تقسیم میں سرکش مالداروں کا ایک خاص اعزاز تھا، جس سے غریب مسلمانوں کی دشمنی یا حوصلہ شکنی ہو سکتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گوارا نہ فرمایا، اور اصول دعوت و تبلیغ یہی قرار دیا کہ اس میں کسی کا کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیے، واللہ اعلم اہل جنت کے لئے زیور | یَحْتَوْنَ فِیْہَا، اس آیت میں اہل جنت مردوں کو بھی سدائے کائنات کے کھنگن پہننے کا ذکر ہے، اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ زیور پہننا تو مردوں کے لئے نہ لایا ہے، نہ کوئی

جمال اور زینت جنت میں اگر ان کو کنگن پہنا دیے گئے تو وہ ان کو بدہیئت کر دیں گے۔
جواب یہ ہے کہ زینت و جمال عرف و رواج کے تابع ہے، ایک ملک اور خطے میں جو چیز زینت و جمال بھی جاتی ہے دوسرے ملکوں اور خطوں میں بسا اوقات وہ قابل نفرت قرار دی جاتی ہے، اور ایسا ہی اس کے برعکس بھی ہے، اسی طرح ایک زمانہ میں ایک خاص چیز زینت ہوتی ہے دوسرے زمانے میں وہ عیب ہو جاتا ہے، جنت میں مردوں کے لئے بھی زیور اور ریشمی کپڑے زینت جمال قرار دیے جائیں گے تو وہاں اس سے کسی کو اجنبیت کا احساس نہ ہوگا، یہ صرف دنیا کا قانون ہے، کہ یہاں مردوں کو سونے کا کوئی زیور یہاں تک کہ انگوٹھی اور گھڑی کی چین بھی سونے کی استعمال کرنا جائز نہیں، اسی طرح ریشمی کپڑے مردوں کے لئے جائز نہیں، جنت کا یہ قانون ہوگا وہ اس سائے جہان سے الگ ایک عالم ہے اس کو اس بنا پر کسی چیز میں بھی قیاس نہیں لیا جاسکتا۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ

اور بتلا ان کو مثل دو مردوں کی کر دیو ہم نے ان میں سے ایک کیلئے دو باغ انگور کے

وَحَفَفْنَا بَيْنَهُمَا سَبْأَ رَعًا ۝۳۱ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ

اور گرد ان کے کھجوریں اور رکھی دونوں کے بیچ میں کھیتی، دونوں باغ لاتے ہیں اپنی

أَكْهُمَا وَلَمْ يُظْلِمُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ وَفَجَّرْنَا خِلْفَهُمَا نَهْرًا ۝۳۲ وَكَانَ

میوہ اور نہیں گھٹاتے اس میں سے کچھ اور بہاوی ہم نے ان دونوں کے بیچ نہر، اور ملا

لَهُ ثَمَرُ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَ

اس کو پھل پھر بولا اپنے ساتھی سے توب باتیں کرنے لگا اس سے میرے پاس زیادہ ہرچھ سے مال اور

أَعَزُّ نَفَرًا ۝۳۳ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ

آبرو کے لوگ، اور گیا اپنے باغ میں اور وہ بڑا کر رہا تھا اپنی جان پر بولا نہیں آتا بھوکھیا

أَنَّ تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ۝۳۴ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ

کہ خراب ہونے پر باغ کبھی، اور نہیں خیال کرتا ہوں کہ قیامت ہونیوالی ہے، اور اگر کبھی

شَرِدْتُ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنَّا مُنْقَلَبًا ۝۳۵ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ

پہنچا دیا گیا میں اپنے رب کے پاس پاؤں گا بہتر اس سے وہاں پہنچ کر، کہا اس کو دوسرے نے

وَهُوَ يَجْأُوذُكَ أَكْثَرُتِ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ شَرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ

جب بات کرنے لگا کیا تو منکر ہو گیا اس سے جس نے پیدا کیا تجھ کو مٹی سے پھر قطرہ سے

ثُمَّ سَوَّيْتُكَ رَجُلًا ۝ لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ۝

پھر پورا کر دیا تجھ کو مرد ۔ پھر میں تو بھی کہتا ہوں وہی اللہ ہے میرا رب ۔ اور میں انسا شریک بناؤں رب کا کسی کو

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ

اور جب تو آیا تھا اپنے باغ میں کیوں نہ کہا تو نے جو چاہا اللہ سو ہو، طاقت نہیں مگر جو دے اللہ

إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلُّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ۝ فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِي

اگر تو دیکھتا ہو کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں ۔ تو امید ہو کہ میرا رب دے مجھ کو

خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ

تیرے باغ سے بہتر اور بھیج دے اس پر لو کا ایک بھونکا آسمان سے پھر صبح کو رہ جائے

صَعِيدًا زَلَقًا ۝ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غُورًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا ۝

میدان صاف ، یا صبح کو ہو رہا اس کا پانی خشک پھر نہ لاسکے تو اس کو ڈھونڈا کر

وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأُصْبِحَ يُقْلِبُ كَفْيِهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ

اور سمیٹ لیا گیا اس کا سارا پھل پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نہ پاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا اور وہ گرا پڑا تھا

عَلَىٰ عُرْوَةٍ وَشِمَا وَلَقَوْلُ يَلِيَّتَنِي لَمْ أَشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ۝ وَلَمْ

اپنی پھرتیوں پر اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا اگر میں شریک نہ بناتا اپنے رب کا کسی کو ، اور نہ ہوتی

تَكُنْ لَهُ فِتْنَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ۝

اس کی جماعت کہ مدد کریں اس کی اللہ کے سوائے اور نہ ہوا وہ کہ خود بدلے لے سکے ،

هَٰذَا لَكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقُّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝

یہاں سب اختیار ہے اللہ سچے کا ، اسی کا انعام بہتر ہے اور اچھا ہے اسی کا دیا ہوا بدلہ ۔

خلاصہ تفسیر

اور آپ دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی پائیداری ظاہر کرنے کے لئے، دو شخصوں کا حال (جن میں باہم دوستی یا قرابت کا تعلق تھا) بیان کیے، تاکہ کفار کا خیال باطل ہو جائے اور مسلمانوں کو تسلی ہو۔ ان دو شخصوں میں سے ایک کو (جو کہ بدوین تھا) ہم نے دو باغ انگور کے درے رکھے تھے اور دونوں (باغوں) کا کھجور کے درختوں سے احاطہ ہوا تھا اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان میں کھیتی بھی لگا رکھی تھی (اور دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے، اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی) (بخلافت عام باغوں کے کہ کبھی کسی درخت میں اور کسی سال پر سے باغ میں پھل کم آتا ہے) اور ان دونوں (باغوں) کے درمیان نہر چلا رکھی تھی اور اس شخص کے پاس بھی مال داری کا سامان تھا سو (ایک دن) اپنے اس (دوست) ساتھی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور بیع بھی میرا زبردست ہے (مطلب یہ تھا کہ تو میرے طریقے کو باطل اور اللہ کے نزدیک ناپسند کہتا ہے تو اب تو دیکھ لے کہ کون اچھا ہے، اگر تیرا دعویٰ صحیح ہوتا تو معاملہ برعکس ہوتا، کیونکہ دشمن کو کوئی نوازا نہیں کرتا اور دوست کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا) اور وہ اپنے اس ساتھی کو ساتھ لے کر اپنے اوپر جسم (کفر) قائم کرتا ہوا اپنے باغ میں پہنچا، (اور) کہنے لگا کہ میرا تو خیال نہیں ہو کہ یہ باغ (میری زندگی میں) کبھی بھی برباد ہو گا (اس سے معلوم ہوا کہ وہ خراکے وجود اور ہر چیز پر اس کی قدرت کا قائل نہ تھا، بس ظاہری سامان حفاظت کو دیکھ کر اس نے یہ گفتگو کی) اور (اسی طرح) میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آدے گی اور اگر (بفرض محال قیامت آج بھی گئی اور) میں اپنے رب کے پاس پہنچا یا گیا (جیسا تیرا عقیدہ ہے) تو ضرور اس باغ سے بھی بہت زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی (کیونکہ جنت کی جگہوں کا دنیا سے اچھا اور بہتر ہونے کا تو تجھے بھی اقرار ہے اور یہ بھی تجھے تسلیم ہو کہ جنت اللہ کے مقبول بندوں کو ملے گی، میری مقبولیت کے آثار و علامات تو تو دنیا ہی میں رہا ہے اگر میں اللہ کے نزدیک مقبول نہ ہوتا تو باغات کیوں ملتے، اس لئے تمہارے اقرار و تسلیم کے مطابق بھی مجھے وہاں یہاں سے اچھے باغ ملیں گے) اس (کی یہ باتیں سن کر اس) سے اس کے ملاقاتی نے (جو کہ دیندار مگر غریب آدمی تھا) جواب کے طور پر کہا کیا تو (توحید اور قیامت سے انکار کر کے) اس ذات (پاک) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو (اول) مٹی سے (جو کہ تیرا مادہ بعید ہے) بواسطہ آدم علیہ السلام کے پیدا کیا پھر (تجھ کو) لطف سے (جو کہ تیرا مادہ قریب ہو رحم مادر میں بنایا) پھر تجھ کو صبح سالم آدمی بنایا اس کے باوجود تو توحید اور قیامت سے انکار اور کفر کرتا ہے تو کیا کر، لیکن میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ میرا رب

(حقیقی) ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مقرر کرتا اور جب اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت مطلقہ ہر چیز پر ثابت ہو، اور اس کے نتیجہ میں یہ کچھ عجیب نہیں کہ بارغ کی ترقی اور حفاظت کے تیرے سبب اسباب و سامان کسی وقت بھی بیکار اور محطول ہو جائیں اور بارغ برباد ہو جائے، اس لئے تجھے لازم تھا کہ سبب الاسباب پر نظر کرتا تو تجھ جس وقت اپنے بارغ میں پہونچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے (اور) بدون خدا کی مدد کے (کسی میں) کوئی قوت نہیں (جستگ اللہ تعالیٰ چاہے گا یہ بارغ قائم رہے گا اور جب چاہے گا دیران ہو جائے گا) اگر تو مجھ کو مال و اولاد میں کمتر دیکھتا ہے (اس سے بقلہ کو اپنے مقبول ہونے کا مشبہ پڑ گیا ہے) تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے بارغ سے اچھا بارغ دیدے (خواہ دنیا ہی میں یا آخرت میں) اور (اس (تیرے بارغ) پر کوئی قوت پر ہی آفت آسمان سے (یعنی بلا واسطہ) سبب طلوع کے، بھیج دے جس سے وہ بارغ دفعہ ایک صاف و چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا اس سے اس کا پانی (جو نہر میں جاری ہے) بالکل اندر زمین میں اتر کر خشک ہو جائے پھر تو اس کے دوبارہ لانے اور نکالنے کی کوشش بھی نہ کر سکے) یہاں اس دیندار ساتھی اس بے دین کے بارغ کا جواب دیدیا، مگر اولاد کے متعلق کچھ جواب نہیں دیا، شاید وجہ یہ ہے کہ اولاد کی کثرت جیسی پہلی معلوم ہوتی ہے جب اس کی پرورش کے لئے مال موجود ہو ورنہ وہ اُلساد بال جانا جاتی ہے، حاصل اس کلام کا یہ ہوا کہ تیرے بد عقیدہ ہونے کا سبب تھا کہ تجھ کو دنیا میں اللہ نے دولت دیدی اسکو تو نے اپنی مقبولیت کی علامت سمجھ لیا، اور میرے پاس دولت نہ ہونے سے مجھ کو غیر مقبول سمجھ لیا، تو دنیا کی دولت و ثروت کو مقبولیت عنہ اللہ کا مدار سمجھ لینا ہی بڑا دھوکا اور غلطی ہے، دنیا کی نعمتیں تو رب العالمین سانچوں بھجود اور بھیڑیوں اور بدکاروں بھیج دیتے ہیں، اصل مدار مقبولیت کا آخرت کی نعمتوں پر ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں اور دنیا کی نعمتیں سب زوال پذیر ہیں) اور اس گفتگو کے بعد واقعہ یہ پیش آیا کہ اس شخص کے سامان کو تو آفت نے آگیرا، پس اس نے جو کچھ بارغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ بارغ اپنی ٹٹیوں پر گر رہا ہوا پڑا تھا، اور کچھ لگا کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ مقرر کرتا اور اس سے معلوم ہوا کہ بارغ پر آفت آنے سے وہ یہ سمجھ گیا کہ یہ بال کفر و شرک کے سبب سے آیا ہے، اگر کفر نہ کرتا تو اول تو یہ آفت ہی شاید نہ آتی، اور ابھی جلتا تو اس کا بدلہ آخرت میں ملتا، اب دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے، مگر حسرت اتنی حسرت و افسوس سے اس کا ایمان ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ حسرت دنیا است تو دنیا کے نقصان کے وجہ سے ہوئی، آگے اللہ کی توحید اور قیامت کا اقرار جب تک ثابت نہ ہو اس کو تو من نہیں کہہ سکتے) اور اس کے پاس ایسا کوئی بھیج نہ ہوا جو خدا کے سوا اسکی

وَاخْتَلَفَ فِيهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ شَيْءٌ زُرْعًا وَرَوْحُ السَّرِيعِ وَكَانَ

پہرہ والا مخلوق اس کی وجہ سے زمین کا سبز پھوس کو ہر گھنٹہ لچر رہا ہوا میں اڑتا ہوا اور اللہ

اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرٌ ﴿۵۹﴾ الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ

کو ہے ہر چیز پر قدرت ، مال اور بیٹے رونق ہیں دنیا کی زندگی میں

الدُّنْيَا وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ

اور باقی رہنے والی نیکوں کا بہتر ہے تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر ہے

أَمَلًا ﴿۶۰﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ

تو قیامت اور ہم دن ام چلائیں پہاڑ اور تو دیکھے زمین کو نکلی ہوئی اور کھینچ لائیں ہم انکو

فَلَمَّا نَفَخْنَا مِنْهُمُ أَحَدًا ﴿۶۱﴾ وَنَحْنُ صَوَاعِقُ رَبِّكَ صَفًّا لَعَنَ

پھر نہ پھوکیں ان میں سے ایک کو اور سامنے آئیں تیرے رب کے صف باندھ کر آئیں

جِثْمًا ۚ وَالْمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَجْعَلَ لَكُمْ

تم ہمارے پاس جیسے کہ ہم نے بنایا تھا تم کو پہلی بار نہیں ، تم تو کہتے تھے کہ نہ مقرر کریں گے ہم

مَوْعِدًا ۚ إِنَّ أَوَّلَ وَصْفٍ الْأَكْثَبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا

تمہارے لئے کوئی وعدہ ، اور رک جاتے گا حساب کا کاغذ پھر تو دیکھے گنہگاروں کو ڈرتے ہیں اس سے

فِيهِ وَيَقُولُونَ يَوَيْلَتَنَا مَا لَ هَذَا الْكِتَابِ أَذْ صَغِيرَةً وَ

جو اس میں لکھا ہے ، اور کہتے ہیں ہائے خرابی کیا ہو یہ کاغذ نہیں چھوٹی اس سے چھوٹی بات اور

لَا كِبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهُ وَوَجَدُ مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظْلِمُ

نہ بڑی بات جو اس میں نہیں آگئی ، اور پائیں گے جو کچھ کیا ہو سامنے ، اور تیرا رب

رَبُّكَ أَحَدًا ﴿۶۲﴾

ظلم نہ کرے گا کسی پر۔

خلاصہ تفسیر

راس سے پہلے دنیوی زندگی اور اس کے سامان کی ناپائیداری ایک شخصی اور جزوی مثال سے بیان فرمائی تھی، اب یہی مضمون عام اور کلی مثال سے واضح کیا جاتا ہے، اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمائیے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو پھر اس (پانی سے) زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہوں پھر وہ (بعد اس کے) سرسبز و تروتازہ پھر خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے کہ اس کو ہوا اڑائے لئے پھرتی ہو، یہی حال دنیا کا ہے کہ آج ہری بھری نظر آتی ہے کل اس کا نام و نشان بھی نہ رہے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (جب چاہیں ایجاد کریں ترقی دیں اور جب چاہیں فنا کر دیں اور جب اس حیات دنیا کا یہ حال ہے اور مال و اولاد حیات دنیا کی ایک رونق (اور اس کے تواجح میں سے) ہے (تو خود مال و اولاد تو اور بھی زیادہ سریع الزوال ہے) اور جو اعمال صالحہ ہمیشہ ہمیشہ کو باقی رہنے والے ہیں وہ آپ کے رب کے نزدیک (یعنی آخرت میں اس دنیا سے) ثواب کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے اور امید کے اعتبار سے بھی (ہزار درجہ) بہتر ہے (یعنی اعمال صالحہ سے جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ آخرت میں ضرور پوری ہوں گی، اور اس کی امید سے بھی زیادہ ثواب ملے گا، بخلاف متاع دنیا کے کہ اس سے دنیا میں بھی انسانی امیدیں پوری نہیں ہوتیں، اور آخرت میں تو کوئی احتمال ہی نہیں) اور اس دن کو یاد کرنا چاہئے جس دن ہم پہاڑوں کو ران کی جگہ سے ہٹا دیں گے (یہ ابتداء میں ہو گا پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے) اور آپ زمین کو دیکھیں گے کہ ایک کھلا میدان پڑا ہے (کیونکہ پہاڑ درخت مکان کچھ باقی نہ رہے گا) اور ہم ان سب کو (قبروں سے اٹھا کر میدان حساب میں) جمع کر دیں گے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے (کہ وہاں نہ لایا جائے اور سب کے سب آپ کے رب کے روبرو یعنی موقف حساب میں) برابر کھڑے کر کے پیش کئے جائیں گے (یہ احتمال نہ رہے گا کہ کوئی کسی کی آڑ میں چھپ جائے اور ان میں جو قیامت کا انکار کرتے تھے ان سے کہا جائے گا کہ) دیکھو آخر تم پہاڑ پاس (دوبارہ پیدا ہو کر) آئے بھی جیسا ہم نے تم کو پہلی بار (یعنی دنیا میں) پیدا کیا تھا (مگر تم پہلی پیدائش کا مشاہدہ کر لینے کے باوجود اس دوسری پیدائش کے قائل نہ ہوئے) بلکہ تم یہی سمجھتے رہے کہ ہم تمہارے دوبارہ پیدا کرنے کے لئے کوئی وقت موعود نہ لائیں گے اور نامہ عمل (خود داسنے ہاتھ میں یا بائیں ہاتھ میں دیکر اس کے سامنے کھلا ہوا) رکھ دیا جائے گا (جیسا کہ دوسری آیت میں ہے) وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مِنْشَرًّا، تو آپ بھرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ (لکھا) ہو گا (اسکو دیکھ کر)

اس سے یعنی اس کی سزا سے اڑتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم جنتی اس ناک اعمال کی عجیب حالت ہو کہ بے قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا کتا، چھوٹا بڑا اور جو کچھ انھوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (لکھا ہوا) موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا کہ نہ کیا ہو آگناہ لکھ لے یا کی ہوئی نیکی جو شرائط کے ساتھ کی جائے اس کو نہ لکھے۔

معارف و مسائل

وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَاتُ، مسند احمد، ابن حبان اور حاکم نے بروایت حضرت ابوسعید خدری نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باقیات صالحات کو زیادہ سے زیادہ تسبیح کیا کرو، عرض کیا گیا کہ وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا سُبْحَانَ اللَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کہنا، حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اور حقیقی نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ یہی باقیات صالحات ہیں، یہی مضمون طبرانی نے بروایت حضرت سعد بن عبادہ بھی روایت کیا ہے، اور صحیح مسلم و ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کلمہ یعنی سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ میرے نزدیک ان تمام چیزوں کا زینہ محبوب ہے جن پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے، یعنی سارے جہان سے۔

اور حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کثرت پڑھا کرو کیونکہ یہ نشانہ ہے بیماری اور تکلیف کے دور کر دیتا ہے، جن میں سب سے کم درجہ کی تکلیف ہتم یعنی فکر و غم ہے۔ اسی لئے اس آیت میں لفظ باقیات صالحات کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ، عکرمہ، مجاہد نے یہی کی ہے کہ مراد اس سے یہی کلمات پڑھنا ہے، اور سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم نے فرمایا کہ باقیات صالحات سے پانچ نمازیں مراد ہیں۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آیت میں باقیات صالحات سے مراد مطلق اعمال صالحہ ہیں جن میں یہ کلمات مذکورہ بھی داخل ہیں پانچوں نمازیں بھی اور دوسرے تمام نیک اعمال بھی، حضرت قتادہؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے (مظہری)

الفاظِ مفسرِ قرآن کے مطابق بھی یہی ہے کیونکہ ان الفاظ کا لفظی مفہوم وہ اعمال صالحہ ہیں جو باقی رہنے والے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ سب ہی اللہ کے نزدیک باقی اور قائم ہیں ابن جریر طبری اور قرطبی نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

حضرت علی کریم اللہ وجہ نے فرمایا کہ کھیتی دو قسم کی ہوتی ہے، دنیا کی کھیتی تو مال و اولاد ہی اور آخرت کی کھیتی باقیات صالحات ہیں، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ باقیات صالحات انسان کی نیت اور ارادہ ہیں کہ اعمال صالحہ کی قبولیت اس پر موقوف ہے۔

اور عبید بن عمیر نے فرمایا کہ باقیات صالحات نیک لڑکیاں ہیں کہ وہ اپنے والدین کے لئے سب بڑا ذخیرہ ثواب ہیں، اس پر حضرت صدیقہ عائشہؓ کی ایک روایت دلالت کرتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنی امت کے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کو جہنم میں لے جانے کا حکم دیدیا گیا، تو اس کی نیک لڑکیاں اس کو چوت گئیں اور رونے اور شور کرنے لگیں، اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ یا اللہ انھوں نے دنیا میں ہم پر بڑا احسان کیا، اور ہماری تربیت میں منت اٹھائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرما کر بخش دیا (قرطبی)

نَعْدُ جَهَنَّمَ زَاكِمًا خَلَقْنَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ قِيَامَتِ كَے دن سب کو خطاب ہو گا کہ آج تم اسی طرح خالی ہاتھ بغیر کسی ساز و سامان کے ہمارے سامنے آئے ہو، جیسا تمہیں اوّل پیدائش کے وقت پیدا کیا تھا، بخاری، مسلم، ترمذی میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ اے لوگو! تم قیامت میں اپنے رب کے سامنے ننگے پاؤں ننگے بدن پیدل چلتے ہوئے آؤ گے، اور سب پہلے جس کو لباس پہنایا جائیگا وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے، یہ سن کر حضرت صدیقہ عائشہؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ کیا سب مرد و عورت ننگے ہونگے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس روز ہر ایک کو ایسا شغل اور ایسی فکر گھیرے رہے گی کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہ ملے گا، سب کی نظریں اوپر اٹھی ہوتی ہوں گی۔

قرطبی نے فرمایا کہ ایک حدیث میں جو آیا ہے کہ مردے برزخ میں ایک دوسرے سے اپنے کفنوں میں ملبوس ہو کر ملاقات کریں گے، وہ اس حدیث کے منافی نہیں، کیونکہ وہ حاملہ قبر اور برزخ کا ہے یہ میدان حشر کا، اور بعض روایات حدیث میں جو یہ منقول ہے کہ میت اپنے اسی لباس میں میدان حشر میں اٹھے گا جس میں اس کو دفن کیا گیا تھا، حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اپنی مردوں کے کفن اپنے بنایا کر دیکھو کہ وہ قیامت کے روز اسی کفن میں اٹھیں گے، اس کو بعض حضرات نے شہیدوں پر معمول کیا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حشر میں بعض لوگ بنو سں اٹھیں اور بعض ننگے، اس طرح دونوں قسم کی روایات جمع ہو جاتی ہیں (منظہری)

جزا رہین عمل ہے ﴿وَرَجُلٌ وَّامًا عَمِلُوا احْصٰی﴾، یعنی سب اہل حشر اپنے کئے ہوئے اعمال کو حاضر پائیں گے، اس کا مفہوم عام طور پر حضرات مغسین نے یہ بیان کیا ہے کہ اپنی

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ وَمَا كُنْتُمْ مُتَخِفِيْنَ

ان کو بنانا آسمان اور زمین کا اور نہ بنانا خود ان کا ، اور میں وہ نہیں کہ بناؤں

الْمُضِلِّيْنَ عَصٰدًا ۝۵۹ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا اَشْرَكَائِيَ الَّذِيْنَ

بھگانے والوں کو اپنا مددگار ، اور جس دن فرمائے گا پکارو میرے شریکوں کو جن کو تم

زَعَمْتُمْ فَاَنْتُمْ فَاَلَمْ يَسْتَجِبْ لَهُمُ الْاَسْمُ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝۶۰

ماتے تھے پھر پکاریں گے سو وہ جواب نہ دیں گے اُن کو اور کر دیں گے ہم انکے اور انکے بیچ مرنے کی جگہ

وَرَا السُّجْرَمُؤْنَ النَّارَ فَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدْ وَاَعْمٰهَا

اور دیکھیں گے گہنکار آگ کو پھر سمجھ لیں گے کہ ان کو پڑتا ہو اس میں اور نہ بدل سکیں گے اس سے

مَصْرَفًا ۝۶۱ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ

رستہ ، اور بیشک پھیر پھیر کر بھائی ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو ہر ایک مثل ،

وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرُ شَيْءٍ جَدَلًا ۝۶۲ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُؤْمِنُوْا

اور ہو انسان سب چیز سے زیادہ جھگڑالو ، اور لوگوں کو جو رہے گا اس بات سے کہ تین آئیں

اِذْ جَاۤءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّا اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةٌ

جب پہنچی ان کو ہدایت اور گناہ بخشو آئیں اپنے رب سے سو اسی انتظار نے کہ پہنچے ان پر رسم پہلوں

الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝۶۳ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ

کی یا اکھڑا ہو اُن پر عذاب سامنے کا ، اور ہم جو رسول بھیجتے ہیں سو

اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَيَجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ

خوش خبری اور ڈر سنانے کو ، اور جھگڑا کرتے ہیں کافر جھوٹا جھگڑا ،

لِيُذْهِبَ عَنْهُمُ الْحَقُّ وَاتَّخَذُوْا اٰیٰتِيْ وَمَا اُنْزِلُ رَوَافِقًا ۝۶۴

کہ مٹا دیں اس سے سچی بات کو اور ٹھہرایا انھوں نے میرے کلام کو اور جو ڈر سنا دیئے گئے ٹھٹھا ،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآٰیٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَلِيْسَ مَا

اور اس سے زیادہ ظالم کون جس کو بھایا گیا اس کے رب کے کلام سے پھر نہ پھیر لیا اس کی طرف اور بھول گیا جو

قَدْ مَتَّ يَدَاكَ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي

کھاتے بیچ چکے ہیں اس کے ہاتھ، ہم نے ڈال دیوہیں اُن کے دلوں پر پردہ کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے

اَذَانِهِمْ وَقَرَّأُوا وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا

کانوں میں ہے بوجھ، اور اگر تو ان کو بلاتے راہ پر تو ہرگز نہ آئیں راہ پر اس وقت

أَبَدًا ۝ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُ مَرِيضًا

کبھی، اور تیرا رب بڑا بخشنے والا ہے رحمت والا اگر ان کو پکڑے ان کے کئے

كَسَبُوا الْعَجَلَ لَهُمُ الْعَذَابُ أَبْطَلُ لَعَمْرُ مَوْعِدُ لَنْ يَجِدُوا مِنْ

پر تو جلد ڈالے اُن پر عذاب، پر اُن کے لئے ایک وعدہ ہے کہیں نہ پائیں گے

دَرِينِهِ مَوْعِدًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَ

اس کوڑے سرک جانے کی جگہ، اور یہ سب بستیاں ہیں جن کو ہم نے غارت کیا جب وہ ظالم ہو گئے اور

جَعَلْنَا لِمَنْ هَلَكَ مِنْهُمْ مَوْعِدًا ۝

مقرر کیا تھا ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وعدہ۔

خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کر دو تو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ جنات میں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم سے عدول کیا، (کیونکہ جنات کا عنصر غالب جس سے وہ پیدا کئے گئے ہیں آگ ہے، اور عنصر نار کا مقتضی پابند نہ رہنا ہے، مگر اس اقتضائے عنصری کی وجہ سے ابلیس معذور نہ سمجھا جائیگا کیونکہ اس تقاضائے عنصری کو خدا کے خوف سے مغلوب کیا جاسکتا تھا) تو کیا پھر بھی تم اس کو اور اس کی ذریت (اولاد اور توابع) کو دوست بناتے ہو مجھ کو چھوڑ کر (یعنی میری اطاعت چھوڑ کر اس کے کہنے پر چلتے ہو) حالانکہ وہ (ابلیس اور اس کی جماعت) تمہارے دشمن ہیں کہ ہر وقت تمہیں ضرر پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں) یہ (ابلیس اور اس کی ذریت کی دوستی) ظالموں کے لئے بہت بُرا بدل ہے (بدل اس لئے کہا کہ دوست تو بنانا چاہئے تھا مجھے، لیکن انہوں نے میرے برے شیطان کو دوست بنالیا، بلکہ دوست ہی نہیں اس کو خدائی کا شریک

بھی مان لیا حالانکہ، پہلے ان کو نہ تو آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے وقت اپنی مدد یا مشورے کے لئے بلایا، اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت (بلایا یعنی ایک کے پیدا کرنے کے وقت دوسرے کو نہیں بلایا) اور میں ایسا (عاجز) نہ تھا کہ (کسی کو بالخصوص) گمراہ کرنے والوں کو (یعنی شیاطین کو) اپنا دوست و بازو بناتا رہیں مدد کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو خود قادر نہ ہو) اور (تم یہاں ان کو شریک خدائی سمجھتے ہو قیامت میں حقیقت معلوم ہوگی) اس دن کو یاد کرو کہ حق تعالیٰ (مشرکین سے) فرمائے گا کہ جن کو تم ہمارا شریک سمجھا کرتے تھے ان کو (اپنی امداد کے لئے) پکارو تو وہ پکارینگے تو وہ ان کو جواب ہی نہ دیں گے اور ہم ان کے درمیان میں ایک آڑ کر دیں گے (جس سے بالکل ہی بالوگ ہو جائے ورنہ بغیر آڑ کے بھی ان کا مدد کرنا ممکن نہ تھا) اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے پھر یقین کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے اور ہم اس قرآن میں لوگوں کی ہدایت کے واسطے ہر قسم کے عمدہ مضامین طرح طرح سے بیان فرمائے ہیں، اور اس پر بھی مسنکر، آدمی جھگڑنے میں سب سے بڑھ کر ہے (جنت اور حیوانات میں اگرچہ شجورہ اور راک ہے مگر وہ ایسا جہال اور جھڑا نہیں کرتے) اور لوگوں کو بعد اس کے کہ ہدایت پہنچ چکی، (جس کا تقاضا تھا کہ ایمان لے آتے) ایمان لانے سے اور اپنے پروردگار سے (کفر و معصیت سے) منفریت مانگنے سے اور کوئی امر مانع نہیں جہیز اس کے کہ ان کو اس کا انتظار ہو کہ ان کے لوگوں کا سا معاملہ (ہلاکت اور عذاب کا) ان کو بھی پیش آجائے یا یہ کہ عذاب ان کے رو برو آکر آہو، (مطلب یہ ہے کہ ان کے حالات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عذاب ہی کا انتظار ہے ورنہ اور سب جہیز تو تمام ہو چکیں) اور رسولوں کو تو صرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا کرتے ہیں جس کے لئے معجزات وغیرہ کے ذریعہ کافی دلائل ان کے ساتھ کر دیئے جاتے ہیں اس سے زائد ان سے کوئی فریشتہ کرنا جہالت ہے، اور کافر لوگ ناسخ کی باتیں پکڑ پکڑ کر جھگڑتے نکالتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ حق بات کو بھلا دیں اور انھوں نے میری آیتوں کو اور جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا تھا اس کو دل لگی بنا رکھا ہے، اور اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جاوے پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور جو کچھ اپنے ہاتھوں (گناہ) سمیٹ رہا ہے اس (کے نتیجہ) کو بھول جائے، ہم نے اس (حق بات) کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اور اس کے سننے سے ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے اور اس وجہ سے ان کا حال یہ ہے کہ اگر آپ ان کو راہ راست کی طرف بلائیں تو ہرگز بھی راہ پر نہ آئیں، کیونکہ کانوں سے دعوت حق سنتے نہیں، دلوں سے سمجھتے نہیں، اس لئے آپ غم نہ کریں، اور تاخیر عذاب کی وجہ سے جو ان کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ عذاب آئے گا ہی نہیں تو

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا رب بڑا مغفرت کرنے والا بڑا رحمت والا ہے (اس لئے مہلت دے رکھی ہے کہ اب ان کو ہوش آجائے اور ایمان لے آئیں تو ان کی مغفرت کر دی جائے ورنہ ان کے اعمال تو ایسے ہیں کہ اگر ان سے ان کے اعمال پر دار و گیر کرنے لگتا تو ان پر فوراً ہی عذاب واقع کر دیتا (مگر ایسا نہیں کرتا) ان کے (عذاب کے) واسطے ایک معین وقت (ٹھہرا رکھا) ہے (یعنی روز قیامت) کہ اس سے اس طرف (یعنی پہلے) کوئی پناہ کی جگہ نہیں پاسکتے (یعنی اس وقت کے آنے سے پہلے کسی پناہ کی جگہ میں جا چمپیں اور اس سے محفوظ رہیں) اور (یہی قاعدہ پہلے کفار کے ساتھ برتا گیا چنانچہ یہ بستیوں جن کے قصے مشہور و مذکور ہیں) جب انھوں نے (یعنی ان کے بسنے والوں نے) شرارت کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے وقت معین کیا تھا (اسی طرح ان موجودہ لوگوں کے لئے بھی وقت معین ہے)۔

معارف و مسائل

ابلیس کے اولاد اور | ذُرِّيَّتَهُ | اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے کہ شیطان کے اولاد و ذریت ہے ذریت بھی ہے | اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس جگہ ذریت سے مراد معین و مددگار ہیں، یہ ضروری نہیں کہ شیطان کی صلابی اولاد بھی ہو، مگر ایک صحیح حدیث جسکو حمیدی نے کتاب الجمع بین النبیین میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ نصیحت فرمائی کہ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جو سب سے پہلے بازار میں داخل ہو جاتے ہیں یا وہ لوگ جو سب آخر میں بازار سے نکلتے ہیں، کیونکہ بازار ایسی جگہ ہے جہاں شیطان نے انڈے بچے دے رکھے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذریت اس کے انڈے سے پھیلی ہے، قرطبی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان کے مددگار اور لشکر ہونا تو قطعی دلائل سے ثابت ہے اولاد صلابی ہونے کے متعلق بھی ایک صحیح حدیث اور پر گزر چکی ہے، واللہ اعلم

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَعَلَ لَهَا سَارِيَ مَخْلُوقَاتٍ مِنْ سَبَبٍ مِنْ زِيَادَةِ جَعْلِهِ الْإِنْسَانُ واقع ہوا ہے، اس کی شہادت میں ایک حدیث حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک شخص کفار میں سے پیش کیا جائے گا اس کے سوال ہوگا کہ ہم نے جو رسول بھیجا تھا ان کے متعلق تمہارا کیا عمل رہا؟ وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! میں تو آپ پر بھی ایمان لایا آپ کے رسول پر بھی، اور عمل میں ان کی اطاعت کی، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تیرا اعمال نامہ سامنے رکھا ہے اس میں تو یہ کچھ بھی نہیں، یہ شخص کہے گا

کہ میں تو اس اعمال نامہ کو نہیں مانتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ ہمارے فرشتے تو تمہاری نگرانی کرتے تھے وہ تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں، یہ کہے گا کہ میں ان کی شہادت کو بھی نہیں مانتا، اور نہ ان کو پہچانتا ہوں، نہ میں نے ان کو اپنے عمل کے وقت دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو یہ لوح محفوظ سامنے ہے، اس میں بھی تیرا یہی حال لکھا ہے، وہ کہے گا کہ میرے پروردگار! آپ نے مجھے ظلم سے پناہ دی ہے یا نہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے بیشک ظلم سے تو ہماری پناہ میں ہے، تو اب وہ کہے گا کہ میرے پروردگار میں ایسی غیبی شہادتوں کو کیسے مانوں جو میری دیکھی بھالی نہیں، میں تو ایسی شہادت کو مان سکتا ہوں جو میرے نفس کی طرف سے ہو، اس وقت اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی، اور اس کے ہاتھ پاؤں اس کے کفر و شرک پر گواہی دیں گے، اس کے بعد اس کو آزاد کر دیا جائے گا، اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا اس وایت کا مضمون صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے منقول ہے، قرطبی

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو میں نہ ہٹوں گا جب تک پہنچ جاؤں جہاں ملتے ہیں دو دریا یا

أَمْضَىٰ حَقًّا ۖ فَلَمَّا بَلَغَا حَجْمَحَ بَيْنَهُمَا نَسِيَا حَوْثَهُمَا فَتَاخَذَ

چلا جاؤں مستروں، پھر جب پہنچے دونوں دریا کے ملاپ تک بھول گئے اپنی مچھلی پھر اس نے اپنی

سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۖ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ إِنِّي خِذْ زَكَ

راہ کر لی دریا میں سترنگ بنا کر، پھر جب آگے چلے کہا موسیٰ نے اپنے جوان کو لا بہار پاس ہمارا کھانا

لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا ۖ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا

ہم نے پائی اپنے اس سفر میں تکلیف، بولا وہ دیکھتا تو نے جب ہم نے جگہ پکڑی

إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحَوْتَ وَمَا أَنَسِيَهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ

اس پتھر کے پاس سو میں بھول گیا نچلی، اور یہ مجھ کو بھلا دیا شیطان ہی نے کہ

أَنَّا أَذْكُرُهُ وَآتَخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۖ قَالَ ذَلِكَ مَا

اگر ذکر کروں، اور اس نے کر لیا اپنا رستہ دریا میں عجیب طرح، کہا یہی ہے جو ہم

كُنَّا نَبْعَثُ فَأَرْتَدَّ عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ۖ فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ

جانتے تھے، پھر اُٹے پھرے اپنے پیر پہناتے، پھر پایا ایک بندہ

عِبَادِنَا اتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۝۶۵

ہمارے بندوں میں سے جس کو دی تھی ہم نے رحمت اپنے پاس سے اور سکھایا تھا اپنی پاس سے ایک علم۔

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَ مِن مِّمَّا عَلَّمْتَ رَسُولًا ۝۶۶

کہا اس کو موسیٰ نے کہ تو تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ جو تجھ کو سکھائی ہے پہلی بار۔

قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۶۷ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ

بولا تو نہ ٹھہر سکے گا میرے ساتھ ، اور کیونکر ٹھہر سکا دیکھ کر ایسی چیز کو کہ تیرے قابو

يَحْتَمِلُهُ خَبْرًا ۝۶۸ قَالَ سَجْدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي

میں نہیں اس کا سمجھنا ، کہا تو پائے گا اگر اللہ نے چاہا مجھ کو ٹھہرنے والا اور نہ ٹالوں گا تیرا

لَكَ أَمْرًا ۝۶۹ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ

کوئی حکم ، بولا پھر اگر میرے ساتھ رہنا ہی تو مت پوچھو مجھ سے کوئی چیز جب تک میں شروع نہ

لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝۷۰

کردوں تیرے آگے اس کا ذکر۔

خلاصہ تفسیر

ادروہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے (جن کا نام پوشح تھا رواہ البخاری) فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں رودریا آپس میں ملے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا اور وہ اس سفر کی یہ ہوتی تھی کہ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں وعظ فرمایا، تو کسی نے پوچھا کہ اس وقت آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا ”میں“ مطلب یہ تھا کہ ان علوم میں کہ جن کو قرب الی اللہ کی تحصیل میں دخل ہے میرے برابر کوئی نہیں، اور یہ فرمانا صحیح تھا، اس لئے کہ آپ نبی اولوا العزم تھے، آپ کے برابر دوسرے کو یہ علم نہیں تھا، لیکن ظاہر القضا مطلق تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو حسیات فی الکلام کی تعلیم دی جائے، غرض ارشاد ہوا کہ ایک ہمارا بندہ نوح البحرین میں تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ زیادہ ہے گو ان علوم کو قرب الہی میں دخل نہ ہو جیسا عنقریب واضح ہو گا، لیکن اس بناء

پر جواب میں مطلقاً تو اپنے کو اعلم کہنا نہ چاہتے تھے، غرض موسیٰ علیہ السلام ان کے ملنے کے مشتاق ہو کر اور پوچھا کہ ان تک پہنچنے کی کیا صورت ہے؟ ارشاد ہوا کہ ایک بے جان مچھلی اپنے ساتھ لے کر سفر کرو جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہ شخص وہیں ہے۔

اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع کو ساتھ لیا، اور یہ بات فرمائی، پس جب (چلتے چلتے) دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہنچے (وہاں کسی پتھر سے لگ کر سو رہے اور وہ مچھلی باذنہ تعالیٰ زندہ ہو کر دریا میں جا پڑی، یوشع علیہ السلام نے بیدار ہو کر مچھلی کو نہ پایا، ارادہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام جاگیں گے تو اس کا ذکر کر دوں گا، مگر ان کو مطلق یاد نہ رہا، شاید اہل و عیال اور وطن وغیرہ کے خیالات کا ہجوم ہوا، مگر جو ذکر کرنا بھول گئے، درنہ ایسی عجیب بات کا بھول جانا کم ہوتا ہے، لیکن جو شخص ہر وقت جزات دیکھتا ہو اس کے ذہن سے کسی ادنیٰ درجہ کی عجیب بات کا نکل جانا کسی خیال کے غلبہ سے عجیب نہیں، اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی پوچھنے کا خیال نہ رہا، اس طرح سے) اس اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے (اس کے قبل زندہ ہو کر) دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی، پھر جب دونوں (وہاں سے) آگے بڑھ گئے (اور دور نکل گئے) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ ہم کو تو اس سفر (یعنی آج کی منزل) میں بڑی تکلیف پہنچی (اور اس کے قبل کی منزلوں میں نہیں تنگے تھے، جس کی وجہ ظاہراً موقع مقصود سے آگے بڑھ آنا تھا) خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے عجیب بات ہوئی (جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے (اور سو گئے تھے) اس وقت اس مچھلی کا ایک قصہ ہوا اور میرا ارادہ آپ سے ذکر کرنے کا ہوا لیکن میں کسی دوسرے دھیان میں لگ گیا) سو میں اس مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا، اور (وہ قصہ یہ ہوا کہ) اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر اپنی راہ لی (ایک عجیب طور پر تو خود زندہ ہو جانا ہے دوسرا عجیب طور یہ کہ وہ مچھلی دریا میں جہاں کو گزری تھی وہاں کا بانی بطور خرق عادت کے اسی طرح سرنگ کے طور پر ہو گیا تھا غالباً پھر مل گیا ہوگا) موسیٰ (علیہ السلام) نے (یہ حکایت سن کر) فرمایا کہ یہ ہی وہ موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی (وہاں ہی لوٹنا چاہتے) سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اگلے لگے (غالباً وہ رستہ سڑک کا نہ ہو گا اس لئے نشان دیکھنے پڑے) سو (وہاں پہنچ کر) انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (یعنی خضر) کو پایا جن کو ہم نے اپنے خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی (مقبولیت کے معنی میں ولایت اور نبوت دونوں کا احتمال ہے) اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے (یعنی بلا واسطہ اسباب کتساب) ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا (مراد اس سے علم اسرار کو یہ ہے جیسا واقعات آئندہ

سے معلوم ہوگا، اور اس علم کو حصولِ قرب الہی میں کچھ دخل نہیں، جس علم کو قرب میں دخل ہے وہ علم اسرارِ الہیہ ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام بڑے ہوئے تھے، غرض، موسیٰ (علیہ السلام) نے ان کو سلام کیا اور ان سے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں یعنی آپ مجھے اپنی ساتھ رہنے کی اجازت دیجئے، اس شرط سے کہ جو علم مضید آپ کو (من جانب اللہ) سکھایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلا دیں، ان بزرگ نے جواب دیا آپ میرے ساتھ رہ کر میرے افعال پر صبر نہ ہوئے گا (یعنی آپ مجھ پر روک ٹوک کریں گے اور معلم پر تعلیم کے متعلق متعلم کی روک ٹوک کرنے سے مصاحبت مشکل ہے) اور (بھلا) ایسے امور پر روک ٹوک کرنے سے آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطہ واقفیت سے باہر ہیں (یعنی ظاہر میں) وہ امور بڑے منشاء معلوم ہونے کے خلاف شرع نظر آئیں گے اور آپ خلاف شرع امور پر سکوت نہ کر سکیں گے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (نہیں) اللہ! اللہ! آپ مجھ کو صابر (یعنی منابط) پائیں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلاف حکم نہ کروں گا (یعنی مشاۃً اگر روک ٹوک سے منع کر دیں گے میں روک ٹوک نہ کروں گا، اسی طرح اگر کسی بات میں بھی خلاف نہ کروں گا) ان بزرگ نے فرمایا کہ (چھا) تو اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو اتنا خیال رکھو کہ مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ اس کے متعلق میں خود ہی ابتداء ذکر نہ کروں۔

معارف و مسائل

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتٰتٰہٖ اِس واقعہ میں موسیٰ سے مراد مشہور پیغمبر موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں، فئات بکالی نے جو دوسرے کسی موسیٰ کی طرف اس واقعہ کو منسوب کیا ہے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے اس پر سخت رد منقول ہے۔

اور فئات کے لفظی معنی نوجوان کے ہیں، جب یہ لفظ کسی خاص شخص کی طرف منسوب کر کے استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا خادم مراد ہوتا ہے، کیونکہ خدمت گار اکثر قوی جوان دیکھ کر رکھا جاتا ہے جو ہر کام انجام دے سکے، اور نوکر و خادم کو جوان کے نام سے پکارنا اسلام کا حسنِ ادب ہے کہ نوکروں کو بھی غلام یا نوکر کہہ کر خطاب نہ کرو بلکہ اچھے لقب سے پکارو، اس جگہ فئات کی نسبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے، اس لئے مراد ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم، اور روایات حدیث میں ہے کہ یہ خادم یوشع بن نون ابن افراتیم بن یوسف علیہ السلام تھے، بعض روایات میں ہر کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے تھے، مگر اس میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، صحیح روایات سے ان کا نام یوشع بن نون ہونا تو ثابت ہے، باقی اوصاف و حالات کا ثبوت نہیں۔ (قرطبی)

جمع البحرین کے مغربی محسوس ہر وہ جگہ ہے جہاں دو دریا ملتے ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع دنیا میں بے شمار ہیں، اس جگہ مجمع البحرین سے کوئی جگہ مراد ہے، چونکہ قرآن و حدیث میں اس کو معین طور پر نہیں بتلایا، اس لئے آثار و قرائن کے اعتبار سے مفسرین کے اقوال اس میں مختلف ہیں، قتادہؒ نے فرمایا کہ بحر فارس و روم کے ملنے کی جگہ مراد ہے، ابن عطیہؒ نے آذربائیجان کے قریب ایک جگہ کو کہا ہے، بعض نے بحر اردن اور بحر قزقم کے ملنے کی جگہ بتلائی ہے، بعض نے کہا یہ مقام ملجہ میں واقع ہے، ابی بن کعبؓ سے منقول ہے کہ یہ افریقیہ میں ہے، سدی نے آرمینیہ میں بتلایا ہے، بعض نے بحر اندلس جہاں بحر محیط سے ملتا ہے وہ موقع بتلایا ہے، واللہ اعلم بہر حال اتنی بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ مقام معین کر کے بتلادیا تھا جس کی طرف ان کا سفر واقع ہوا ہے۔ (قرطبی)

قصہ حضرت موسیٰ اور | اس واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابی بن کعبؓ اس حضرت خضر علیہما السلام | طرح آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، تو لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا کہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں اپنے سے زیادہ علم والا کوئی تھا نہیں اس لئے) فرمایا کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں۔ (اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بارگاہ انبیاء کو خاص تربیت دیتے ہیں اس لئے یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ادب کا مقتضی یہ تھا کہ اس کو اللہ کے علم کے حوالے کرتے، یعنی یہ کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ساری مخلوق میں اعلم کون ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا، موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین پر ہے، وہ آپ سے زیادہ اعلم ہے، (موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ جب وہ مجھ سے زیادہ اعلم ہیں تو مجھے ان سے استفادہ کے لئے سفر کرنا چاہئے) اس لئے عرض کیا یا اللہ مجھے ان کا پتہ نشان بتلایا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لو، اور مجمع البحرین کی طرف سفر کرو، جس جگہ پہنچ کر یہ مچھلی گم ہو جائے بس وہی جگہ ہمارے اس بندے کے ملنے کی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے حکم کے مطابق ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لی اور چل دیئے، ان کے ساتھ ان کے خادم یوشع بن نون بھی تھے، دوران سفر ایک پتھر کے پاس پہنچ کر اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے، یہاں اچانک یہ مچھلی حرکت میں آگئی، اور زنبیل سے نکل کر دریا میں چلی گئی، اور مچھلی کے زندہ ہو کر دریا میں چلے جانے کے ساتھ ایک دوسرا حجرہ یہ ہوا کہ جس رستہ سے مچھلی دریا میں گئی اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا جسر یاں روک دیا اور اس جگہ

پانی کے اندر ایک مہرنگ جیسی ہو گئی، (یوشع بن نون اس عجیب واقعہ کو دیکھ رہے تھے، موسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے) جب بیدار ہوئے تو یوشع بن نون پھلی کا یہ عجیب معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بتلانا بھول گئے، اور اس جگہ سے پھر روانہ ہو گئے، پورے ایک دن ایک رات کا مزید سفر کیا، جب دو سکر روز کی صبح ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ اس سفر سے کافی تھکان ہو چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (بقضائے الہی) موسیٰ علیہ السلام کو اس سے پہلے تھکان بھی محسوس نہیں ہوا، یہاں تک کہ جس جگہ پہنچنا تھا اس سے آگے نکل آئے، جب موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ طلب کیا تو یوشع بن نون کو پھلی کا واقعہ یاد آیا اور اپنے بھول جانے کا عذر کیا کہ شیطان نے مجھے بھلا دیا تھا کہ اس وقت آپ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ کی، اور پھر بتلایا کہ وہ مردہ پھلی تو زندہ ہو کر دریا میں ایک عجیب طریقہ سے چلی گئی، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی تو ہمارا مقصد تھا (یعنی منزل مقصود وہی تھی جہاں پھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے)۔ چنانچہ اسی وقت واپس روانہ ہو گئے، اور ٹھیک اسی رستہ سے لوٹے جس پر پہلے چلے تھے تاکہ وہ جگہ مل جائے، اب جو یہاں اس پتھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ اس پتھر کے پاس ایک شخص سرست پاؤں تک چادر تانے ہوئے لیٹا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے (اسی حال میں) سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ اس (غیر آباد) جنگل میں سلام کہاں سے آگیا، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، تو حضرت خضر نے سوال کیا کہ موسیٰ بنی اسرائیل؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں موسیٰ بنی اسرائیل ہوں، اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے وہ خاص علم سکھلا دیں جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، اے موسیٰ! میری پاس ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے، وہ آپ کے پاس نہیں، اور ایک علم آپ کو دیا ہے جو میں نہیں جانتا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، اور میں کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کر دوں گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ چلنے ہی کو تیار ہیں تو کسی معاملہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں جب تک کہ میں خود آپ کو اس کی حقیقت نہ بتلاؤں۔

یہ کہہ کر دونوں حضرات دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے، اتفاقاً ایک کشتی آگئی تو کشتی والوں سے کشتی پر سوار ہونے کی بات چیت کی، ان لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور ان سب لوگوں کو بغیر کسی کرایہ اور اجرت کے کشتی میں سوار کر لیا، کشتی میں سوار ہوتے ہی خضر علیہ السلام نے ایک کھٹاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال ڈالا، حضرت موسیٰ

علیہ السلام سے نہ بایا، کہنے لگے کہ ان لوگوں نے بغیر کسی معاوضہ کے ہمیں کشتی میں سوار کر لیا آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی کشتی توڑ ڈالی، کہ یہ سب غرق ہو جائیں، یہ تو آپ نے بہت بُرا کام کیا، خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے غصہ کیا کہ میں اپنا وعدہ بھول گیا تھا، اس بھول پر آپ سخت گیر نہ کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراف خضر علیہ السلام پر بھول سے ہوا تھا اور دوسرا بطور شرط کے اور تیسرا قصداً اس اثنا میں، ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے دریا میں سے ایک چوہا بھر پانی لیا، خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا کہ میرا علم اور آپ کا علم دونوں مل کر بھی اللہ کے علم کے مقابلہ میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے جتنی اس چوہا کی چوہا کے پانی کو اس نندہ کے ساتھ ہے۔

پھر کشتی سے اتر کر دریا کے ساحل پر چلنے لگے، چنانکہ خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ وہ سکر لڑکوں میں کھیل رہا ہے، خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکے کا سر اس کے بدن سے الگ کر دیا، لڑکا مار گیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے ایک مصوم بچہ کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا، یہ تو آپ نے بڑا ہی گناہ کیا، خضر علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے، موسیٰ نے دیکھا کہ یہ معاملہ پہلے معاملہ سے زیادہ سخت ہے، اس لئے کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کوئی بات پوچھی تو آپ مجھے پھر ساتھ سے الگ کر دیجئے، آپ میری طرف سے غصہ کی حد پر پہنچ چکے ہیں۔

اس کے بعد کچھ چلنا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک گاؤں پر گزر ہوا، انھوں نے گاؤں والوں سے درخواست کی کہ ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھ لیجئے، انھوں نے انکار کر دیا، اس بستی میں ان لوگوں نے ایک دیوار کو دیکھا کہ گرا چاہتی ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو اپنے ہاتھ سے سیدھا کھڑا کر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے کہا کہ ہم نے ان لوگوں سے مہمانی چاہی تو انھوں نے انکار کر دیا، آپ نے اتنا بڑا کام کر دیا، اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت ان سے لے سکتے تھے، خضر علیہ السلام نے کہا کہ ہَذَا اِقْرَاقُ بَنِي إِسْرَافِيلَ اب تشری پوری ہو چکی، اس لئے ہماری اور آپ کی مفارقت کا وقت آ گیا ہے۔

اس کے بعد خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا کر کہا اِنَّكَ تَرٰوُنَّ مَا لَمْ تَشْهَدْ عَلَيْهِمْ صَبْرًا، یعنی یہ تو حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد

فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور کچھ صبر کر لیت تو ان دونوں کی اور کچھ خبریں معلوم ہو جاتیں (انتہی)

صحیح بخاری و مسلم میں یہ طویر حدیث اس طرح آئی ہے جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا موسیٰ بنی اسرائیل اور نوحوان سماعتی کا نام پر شیخ بن لون ہونا اور جسے ہند سے کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین کی طرف بھیجا گیا تھا ان کا نام مختصر ہونا تفسیر بخاری و ہند سے آگے آیات قرآن کے ساتھ ان کے مفہوم اور تفسیر کو دیکھئے۔

سفر کے بعض آداب اور | لَا أَبْرَأُكُمْ حَتَّىٰ آتَاكُمْ مَجْلِسَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَتَانِي خُطْبًا، یہ جملہ حضرت پیغمبرانہ عزم کا ایک نمونہ | موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر پر شیخ بن لون سے کہا، جس کا مطلب اپنے سفر کا رخ اور منزل مقصود رفیق کو بتانا تھا، اس میں بھی سن اوب ہے کہ سفر کی ضروری باتوں سے اپنے رفیق اور خادم کو بھی باخبر کر دینا چاہئے، مثلاً لوگ اپنے خادموں اور نوکروں کو نہ قابل خطاب سمجھتے ہیں نہ اپنے سفر کے متعلق ان کو کچھ بتاتے ہیں۔

خُطْبًا، حُفَّتِہ کی جمع ہے، اہل لغت نے کہا کہ عقبہ انبی سال کی مدت ہے، بعض نے اسے زیادہ کو عقبہ قرار دیا، صحیح یہ ہے کہ زمانہ دراز کو کہا جاتا ہے، تحدید و تعیین کچھ نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق کو یہ بتا دیا کہ مجھے مجمع البحرین کی اس جگہ پر پونپنا ہر جہاں کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا ہے، اور عزم یہ ہے کہ کتنا ہی زمانہ سفر میں گزر جائے، جب تک اس منزل مقصود پر نہ پہنچوں سفر مبارک یہ ہے گا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں پیغمبرانہ عزم ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا | فَسَمَّا بَيْنَنَا مَجْلِسَ بَيْنِ رُسُلَانَا فَمِنْهُمْ مَنْ جَاءَ أَتَانِي خُطْبًا | فی البَحْرَيْنِ بَآءُ قرآن و سنت کی تصریحات سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی کا خاص شرف اور ان کے محضر سے

ان کی مخصوص فضیلت ہے، اور حضرت خضر علیہ السلام کی تو نبوت میں بھی اختلاف ہے، اور نبوت کو تسلیم بھی کیا جائے تو مقام رسالت حاصل نہیں، نہ ان کی کوئی کتاب ہے نہ ان کوئی خاص امت، اس لئے بہر حال موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے بدرجہا افضل ہیں لیکن حق تعالیٰ اپنے مسترین کی ادنیٰ سی کمی اور کوتاہی کی اصلاح فرماتے ہیں، ان کی تربیت کے لئے ادنیٰ سی کوتاہی پر بھی سخت عتاب ہوتا ہے، اس کا تذکرک بھی ان سے اسی بیان پر کرایا جاتا ہے، یہ سارا قصہ اسی خاص انداز تربیت کا مظہر ہے، ان کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا

کہ میں سب سے زیادہ علم والا ہوں حق تعالیٰ کو یہ پسند نہ آیا تو ان کی تنبیہ کے لئے اپنے ایک ایسے بندے کا ان کو پتہ دیا گیا جن کے پاس اللہ کا دیا ہوا ایک خاص علم تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہیں تھا اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا علم ان کے علم سے درجہ میں بہت بڑھا ہوا تھا، مگر بہر حال وہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل نہ تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے طلب علم کا ایسا جذبہ عطا فرمایا تھا کہ جب یہ معلوم ہوا کہ کہیں اور بھی علم ہے، جو مجھے حاصل نہیں تو اس کے حاصل کرنے کے لئے طالب علمانہ سفر کے لئے تیار ہو گئے اور حق تعالیٰ ہی سے اس بندے (خضر علیہ السلام) کا پتہ پوچھا اب یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو خضر علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات یہیں آسانی سے کر دیتے، یا موسیٰ علیہ السلام ہی کو طالب علم بنا کر سفر کرانا تھا تو پتہ صاف بتا دیا جاتا جہاں پہونچنے میں پریشانی نہ ہوتی، مگر ہوا یہ کہ پتہ ایسا مبہم بتلایا گیا کہ جس جگہ پہونچ کر مری ہوئی پھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے اس جگہ وہ ہمارا بندہ ملے گا۔

صحیح بخاری کی حدیث سے اس پھلی کے متعلق اتنا ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ اس کی طرف سے یہ حکم ہوا تھا کہ ایک پھلی اپنی زنبیل میں رکھ لیں، اس سے زائد یہ کچھ معلوم نہیں کہ یہ پھلی کھانے کے لئے ساتھ رکھنے کا حکم ہوا تھا یا کھانے سے علاوہ دونوں احتمال ہیں، اسی لئے مفسرین میں سے بعض نے کہا کہ یہ بھوئی ہوئی پھلی کھانے کے لئے رکھی گئی تھی، اور اس سفر کے دونوں ساتھی دو دن سفر اس میں سے کھاتے بھی رہے، اس کا نصف حصہ کھایا جا چکا تھا، اس کے بعد بطور معجزہ یہ بھوئی ہوئی اور ادھی کھائی ہوئی پھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی گئی۔

ابن عطیہ اور بعض دوسرے لوگوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ پھلی بطور معجزہ کے پھر دنیا میں باقی بھی رہی اور بہت دیکھنے والوں نے دیکھا بھی کہ اس کی صرف ایک کروٹ ہے اور دوسری کھائی ہوئی ہے، ابن عطیہ نے خود بھی اپنا دیکھنا بیان کیا ہے (قرطبی) اور بعض مفسرین نے کہا کہ ناشتہ کھانے کے علاوہ ایک علاوہ زنبیل میں پھلی رکھنے کا حکم ہوا تھا، اس کے مطابق رکھی گئی تھی، اس میں بھی اتنی بات تو متعین ہو کہ پھلی مردہ تھی، زندہ ہو کر دریا میں چلا جانا ایک معجزہ ہی تھا۔

بہر حال حضرت خضر علیہ السلام کا پتہ ایسا مبہم دیا گیا کہ آسانی سے جگہ متعین نہ ہو ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا امتحان ہی تھا، اس پر مزید امتحان کی صورت یہ پیدا کی گئی کہ جب عین موقع پر یہ لوگ پہونچ گئے تو پھلی کو بھول گئے، آیت قرآنی میں یہ بھول حضرت موسیٰ اور ان کے رفیق دونوں کی طرف منسوب کی گئی ہے، یہ کیا معجزہ! لیکن حدیث بخاری سے جو قصہ ثابت ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت پھلی

کے زندہ ہو کر دریا میں جانے کا وقت آیا تو موسیٰ علیہ السلام سوئے ہوئے تھے، حضرت یوشع بن نون نے یہ واقعہ عجیب دیکھا اور ارادہ کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بیدار ہو جائیں تو ان کو بتلاؤں گا، مگر بیداری کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر نسیان مسلط کر دیا اور بھول گئے، تو یہاں دونوں کی طرف بھولنے کی نسبت ایسی ہو گئی جیسے قرآن میں یَحْجِجْ مِنْهُمْ مَخْلُوقًا وَآلَهُمْ جَنَّاتُ مِنْ دَرِیَاسٍ شِیرِیْنِ اور دریا شور و دونوں سے موتی اور مرجان نکلنے کا بیان آیا ہے، حالانکہ موتی مرجان صرف دریا سے شور سے نکلتے ہیں مگر محاورات میں تخلیباً ایسا لکھنا ایک عام بات ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ سے آگے سفر کرنے کے وقت تو بھلی کو ساتھ لینا دونوں ہی بزرگ بھولے ہوئے تھے، اس لئے دونوں کی طرف نسیان منسوب کیا گیا۔

بہر حال یہ ایک دوسری آزمائش تھی کہ منزل مقصود یہ پہنچ کر بھی کس کے زندہ ہو کر پانی میں گم ہو جانے سے حقیقت کھل جاتی ہے اور مقام متعین ہو جاتا ہے، مگر ابھی اس طالب حق کا کچھ اور بھی امتحان لینا تھا، اس لئے دونوں پر بھول مسلط ہو گئی، اور پورے ایک دن اور ایک رات کامزید سفر طے کرنے کے بعد بھوک اور تھکان کا احساس ہوا، یہ تیسرا امتحان تھا، کیونکہ عادت تھکان اور بھوک کا احساس اس سے پہلے ہو جانا چاہئے تھا، وہیں پہلی یاد آجاتی تو اتنی طویل سفر کی مزید تکلیف نہ ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ کو منظور یہی تھا کہ کچھ اور مشقت اٹھائے اتنا طویل سفر کر نیکی بعد بھوک پیاس کا احساس ہوا اور پہلا پہلی یاد آئی اور یہ معلوم ہوا کہ ہم منزل مقصود بہت آگے آگئے، اس لئے پھر اسی نشان قدم پر واپس لوٹے۔

بھلی کے دریا میں چلے جانے کا ذکر پہلی مرتبہ نو سر بآ کے الفاظ سے آیا ہے، سر ب کے معنی شرننگ کے ہیں، جو پہاڑوں میں رہتہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، ایسا شہروں میں زمین و در رہتہ بنانے کے لئے کھودی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھلی جب دریا میں گئی تو جس طرف کو جاتی پانی میں ایک شرننگ سی بنتی چلی گئی، کہ اس کے جانے کا رہتہ پانی سے کھلا رہا، جبکہ صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہوا، دوسری مرتبہ جب یوشع ابن نون نے موسیٰ علیہ السلام سے اس واقعہ کا ذکر سفر طویل کے بعد کیا وہاں وَاسْتَخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا اَلْفَاظ سے اس واقعہ کو بیان کیا، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ پانی کے اندر شرننگ بننے چلے جانا خود ایک واقعہ عجیب حشری عادت تھا۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات | قرآن کریم میں اگرچہ اس صاحب واقعہ کا نام مذکور نہیں، بلکہ دوران کی نبوت کا مسئلہ | حَبَسَ آتُونِ عِبَادِیْنَ اَکْبَرًا گیارہ بخاری کی حدیث میں ان کا

نام خضر بتلایا گیا ہے، خضر کے لفظی معنی ہرے کے ہیں، ان کا نام خضر ہونے کی وجہ عامہ مفسرین نے یہ بتلائی ہے کہ یہ جس جگہ بیٹھ جاتے تھے کیسی ہی زمین ہو وہاں گھاس آگ جاتی، اور

زمین سرسبز ہو جاتی تھی، مگر قرآن کریم نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ حضرت علیہ السلام کوئی پیغمبر تھے یا اولیاء اللہ میں سے کوئی فرد تھے، لیکن جہور علماء کے نزدیک ان کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے، کیونکہ حضرت علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں، ان میں سے بعض تو قطعی طور پر خلاف شرع ہیں اور حکم شریعت سے کوئی استثناء بجز وحی الہی کے ہو نہیں سکتا، جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے، ولی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں، مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی، ان کی بناء پر ظاہر شریعت کے کسی حکم کو بدل نہیں جاسکتا، اس لئے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حضرت علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، ان کو بذریعہ وحی الہی بعض خالص احکام وہ دیتے گئے تھے جو ظاہر شریعت کے خلاف تھے، انھوں نے جو کچھ کیا اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا، خود ان کی طرف سے اس کا انبار بھی قرآن کے اس جملے میں ہو گیا **وَمَا آتَوْنَاكَ مِنْ آيٍ مِّنْ دُونِهَا** (یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ امر الہی سے کیا) خلاصہ یہ ہو کہ جہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں، مگر ان کے کچھ کو نبی خدین بنام اللہ سپرد کی گئی تھیں اپنی کا علم دیا گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی، اسی لئے اس پر اعتراض کیا، تفسیر قرطبی، بحر محیط، ابوسیان اور اکثر تفسیر میں یہ مضمون بعنوانات مختلفہ مذکور ہے۔

کسی ولی کو ظاہر شریعت کے حکم | نہیں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ بہت سے جاہل غلو کار تصوف کے خلاف درزی حلال نہیں | کو بدنام کرنے والے صوفی جو کہنے لگے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور ہے، بہت سی چیزیں شریعت میں حرام ہوتی ہیں مگر طریقت میں جائز ہیں اس لئے کسی ولی کو صریح گناہ کبیرہ میں مبتلا دیکھ کر بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا، یہ کھلا ہوا زندہ اور باطل ہے، حضرت خضر علیہ السلام پر کسی دنیا کے ولی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ظاہر شریعت کے خلاف اس کے کسی فعل کو جائز کہا جاسکتا ہے۔

شگرد پر استاد کا | **هَلْ أَتَىكَ عَلَىٰ أَنْ تَعْلَمَ مِنْ مِّمَّا كُنْتُمْ تُشْكِكُونَ**، اس میں حضرت اتباع لازم سے | موسیٰ علیہ السلام نے باوجود نبی و رسول اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کے حضرت خضر سے تعظیم و تکریم کے ساتھ درخواست کی کہ میں آپ کا علم سیکھنے کے لئے ساتھ چلنا چاہتا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ تحصیل علم کا ادب یہی ہے کہ شاگرد اپنے استاذ کی تعظیم و تکریم اور اتباع کرے، اگرچہ شاگرد اپنے استاذ سے افضل و اعلیٰ بھی ہو (قرطبی، مظہری)۔

ظاہر شریعت کیلئے جائز نہیں کہ خلاف شرع امر پیغمبر کرے | **إِذْ لَوْ أَنَّ تَشْتَطِّعُ مَعِيَ صَبْرًا** وَ كَيْفَ تَصْبِرُ

عَلٰی مَا لَمْ يَحْطُ بِهٖ مُخْبِرًا ۝ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ میسر ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے اور کیسے صبر کریں گے جب کہ آپ کو حقیقت امر کی اطلاع نہ ہو، مطلب یہ تھا کہ مجھے جو علم عطا ہوا ہے اس کی نوعیت آپ کے علم سے مختلف ہے، اس لئے آپ کو میرے معاملات قبل اعتراض نظر آئیں گے جب تک کہ میں ان کی حقیقت سے آپ کو مطلع نہ کر دوں، آپ اپنے فرض منصبی کی بناء پر اس پر اعتراض کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس جانے اور ان سے علم سیکھنے کا حکم ہوا تھا، اس لئے یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی فعل درحقیقت خلاف شرع نہیں ہوگا، گو ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے، اس لئے صبر کرنے کا وعدہ کر لیا، ورنہ ایسا وعدہ کرنا بھی کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں، لیکن پھر شریعت کے بائے میں دینی غیرت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اس وعدہ کو بھول گئے۔

پہلا واقعہ تو زیادہ سنگین بھی نہیں تھا، صرف کشتی والوں کا مالی نقصان یا غرق ہونے کا صرف خطرہ ہی تھا جو بعد میں رفع ہو گیا، لیکن بعد کے واقعات میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ میں اعتراض نہیں کروں گا، اور جب لڑکے کے قتل کا واقعہ دیکھا تو شدت کے ساتھ اعتراض کیا اور اپنے اعتراض پر کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ اگر آئندہ اعتراض کروں تو آپ کو حق ہو گا کہ مجھے ساتھ نہ رکھیں، کیونکہ کسی نبی اور پیغمبر سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ خلاف شرع کام ہو تا دیکھ کر صبر کرے، البتہ چونکہ دوسری طرف بھی پیغمبر ہی تھے اس لئے بالآخر حقیقت کا انکشاف اس طرح ہوا کہ یہ واقعات جزئیہ خضر علیہ السلام کے لئے عام قواعد شرعیہ سے مستثنیٰ کر دیئے گئے تھے، انھوں نے جو کچھ کیا وہی الہی کے مطابق کیا (منظری) علم موسیٰ اور علم خضر یہاں ملتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی تہذیب کے میں ایک بنیادی فرق اور مطابق ان کو جو علم عطا ہوا تھا اس کی نوعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سے مختلف تھی، مگر جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے، تو ان دونوں کے احکام میں تضاد و اختلاف کیوں ہوا، اس کی تحقیق تنبیہ مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جو لکھی ہے وہ اقرب الی الصواب اور دل کو لگنے والی ہے، ان کی تقریر کا مطلب جو میں سمجھا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں جن کے سپرد اصلاح خلق کی خدمت ہوتی ہے، ان پر کتاب اور شریعت نازل کی جاتی ہے جن میں خلق خدا کی ہدایت اور اصلاح کے اصول و قواعد ہوتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر

فترآن کریم میں تبصریہ نبوت و رسالت آیا ہے وہ سب کے سب ایسے ہی تھے جن کے سپرد تشریعی اور اصلاحی خدمات تھیں، ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی، مگر دوسری طرف کچھ تکوینی خدمات بھی ہیں جن کے لئے عام طور سے ملائکہ اللہ مقرر ہیں، مگر زمرہ انبیاء میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لئے مخصوص کر لیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں، تکوینی خدمات واقعات جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں، کہ فلاں شخص ڈوبنے والے کو بچا لیا جائے یا فلاں کو ہلاک کر دیا جائے، فلاں کو ترقی دی جائے فلاں کو زہر کیا جائے ان معاملات کا نہ عام لوگوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ان کے احکام عوام سے متعلق ہوتے ہیں ایسے واقعات جزئیہ میں بعض وہ صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشرعی قانون کے خلاف ہے مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشرعی قانون سے مستثنیٰ کر کے اس شخص کے لئے جائز کر دیا گیا ہے جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے، ایسے حالات میں تشرعی قوانین کے علمبرار اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے اور وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور جو شخص تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جہاں یہ تضاد نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہوتا، بعض واقعات جزئیہ کا عام قانون شریعت سے استثناء ہوتا ہے، ابو حیان نے بحر محیط میں فرمایا الجسمہ ودر علی ان النخصہ نبی وکان علمہ مصرفہ لبواطن ذل اوحیت الیہ و علمہ موسیٰ الاحکام والفتیاء بالظاہر و بحر محیط ص ۱۴۷ ج ۱۲ اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استثناء بذریعہ وحی نبوت ہو، کسی ولی کا کشف و الہام ایسا استثناء کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں، اس لئے حضرت خضرؑ کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا ظاہر شریعت میں حرام تھا لیکن حضرت خضر تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کر کے مامور کئے گئے تھے، ان پر کسی غیر نبی کے کشف و الہام کو قیاس کر کے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نجدہ حروری (خارجی) نے ابن عباسؓ کو خط لکھا کہ خضر علیہ السلام نے لڑکے کو نابالغ کو کیسے قتل کر دیا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نابالغ کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے جواب میں لکھا کہ اگر کسی بچے کے متعلق تمہیں وہ علم حاصل ہو جائے، جو موسیٰ علیہ السلام کے علم (یعنی خضر علیہ السلام) کو حاصل ہوا تھا تو تمہارے لئے بھی نابالغ کا قتل جائز ہو جائے گا مطلب یہ تھا کہ خضر علیہ السلام کو تو بذریعہ وحی نبوت اس کا علم ہوا تھا، وہ اب کسی کو بھی

کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا جسکو بذریعہ وحی اس قسم کے واقعات کے متعلق کسی حکم خداوندی سے کسی خاص شخص کو مستثنیٰ کرنے کا علم ہو سکے (منظری) اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کسی شخص کو کسی حکم شرعی سے مستثنیٰ قرار دینے کا نبی صاحب وحی کے سوا کسی کو حق نہیں۔

فَانْطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۚ قَالَ اٰخَرُ قَوْمًا

پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب چڑھے کشتی میں اس کو بچھا ڈالا موسیٰ بولا کیا تو نے اس کو بچھا ڈالا

لِيُفْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا ۝۷۸ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ

کہڑا ہے اس کے لوگوں کو البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری بولایا میں نے نہ کہا تھا تو نے

لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۹ قَالَ لَا تُؤْخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا

تھمہر کے گا میرے ساتھ ، کہا مجھ کو نہ پکڑ میری بھول پر اور مت

تُرْهِقْنِي مِنْ اَمْرِي عَسَا ۝۸۰ فَاَنْطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا الْفَيَءُ عَلِمَ اَفْقَتَلَهُ

ڈال مجھ پر میرا کام مشکل ، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے تو اس کو مار ڈالا

۝۸۱ قَالَ اَقْتَلَتْ نَفْسًا نَّرَكِيَّةًۢ بَغِيْرَ نَفْسٍۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۝۸۲

موسیٰ بولا کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر غرض کسی جان کے بیشک تو نے کی ایک چیز نامقول

۝۸۳ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۸۴

بولایا میں نے تجھ کو نہ کہا تھا کہ تو نہ تھمہر کے گا میرے ساتھ ،

۝۸۵ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَ هٰذَا فَلَا تُصَحِّبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ

کہا اگر تجھ سے پوچھوں کوئی چیز اس کے بعد تو مجھ کو ساتھ نہ رکھو ، تو اتنا رچکا

مِنْ لَّدُنِّيْ عَذْرًا ۝۸۶ فَاَنْطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا آتٰ اَهْلَ قَرْيَةٍ

میری طرف سے الزام ، پھر دونوں چلے ، یہاں تک کہ جب پہنچے ایک گاؤں کے لوگوں تک

۝۸۷ اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا فَاَبَاۤءُ اَنْ يُصَيِّفُوْهُمَا فَرَجَدَا فِيْهَا حِدَارًا

کھانا چاہا وہاں کے لوگوں سے انھوں نے نہ مانا کہ ان کو نہاں رکھیں پھر پالی وہاں ایک دیوار

يُرِيدُ أَنْ يَمْلِكُنِي فَأَقَامَنِي قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَمَكَّنْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝

جو گرا چاہتی تھی اس کو سیدھا کر دیا، بولا (موسیٰ) اگر تو چاہتا تو بے لیتا اس پر مزدوری

قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ

کہا اب جدائی ہے میرے اور تیرے بیچ اب جتنا بے دیتا ہوں تجھ کو پھیران باتوں کا جس پر

عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

تو صبر نہ کر سکا۔

خلاصہ تفسیر

(غرض باہم قول و قرار ہو گیا) پھر دونوں (کسی طرف) چلے (نابالان کے ساتھ) یوحنا (علیہ السلام) بھی ہوں گے، مگر وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے تابع تھے اس لئے ذکر و ذکر کیا گیا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے کسی ایسے مقام پر پہنچے جہاں کشتی پر سوار ہونے کی ضرورت ہوئی) جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو ان بزرگ نے اس کشتی (کا ایک تختہ نکال کر اس) میں چھید کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ اس کے بیٹھنے والوں کو غرق کر دیں آپ نے بڑی بھاری (خطرہ کی) بات کی، ان بزرگ نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا (آخر وہی ہوا، آپ اپنے قول پر نہ رہے) موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ (میں بھول گیا تھا) آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے اس معاملہ (متابعت) میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے (کہ بھول چوک بھی معاف نہ ہو، بات گئی گزری ہو گئی) پھر دونوں کشتی سے اتر کر آگے، چلے یہاں تک کہ جب ایک (کم سن) لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اس کو مار ڈالا (موسیٰ (علیہ السلام) گھبرا کر) کہنے لگے آپ نے ایک بے گنا جان کو ہلاک کر دیا (اور وہ بھی) بغیر بدلے کسی جان کے بیشک آپ نے بڑی بے جا حرکت کی (کہ اول تو یہ نابالغ کا قتل ہے جس کو قصاص میں بھی قتل کرنا جائز نہیں پھر اس نے تو کسی کو قتل بھی نہیں کیا، یہ فعل پہلے فعل سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ اس میں یقینی نقصان تو صرف مال کا تھا، بیٹھنے والوں کے غرق کا اگرچہ خطرہ تھا، مگر اس کا انسداد کر دیا گیا، پھر لڑکا نابالغ ہر گناہ سے بری) ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا، موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا (کہ خیر اس مرتبہ اور درگزر کیجئے لیکن) اگر اس مرتبہ کے بعد میں آپ سے کسی امر کے متعلق پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر

رک انہما کو پہنچ چکے ہیں اس مرتبہ موسیٰ علیہ السلام نے نسیان کا عذر پیش نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال انہوں نے قصداً اپنی پیغمبرانہ حیثیت کے مطابق کیا تھا، پھر دونوں آگے چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا تو گاؤں والوں سے کھانے کو مانگا (کہ ہم مہمان ہیں) تو انہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرہی چاہتی تھی تو ان بزرگ نے اس کو رہا تھ کے اشارے سے بطور خرق عادت کے (سیدھا کر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام) پر اجرت ہی لے لیتے (کہ اس وقت کام بھی چلتا اور ان کی بدخلقی کی اصلاح بھی ہوتی) ان بزرگ نے کہا یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے (جیسا کہ آپ نے خود شرط کی تھی) اب میں ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا (جیسا کہ آیات آئندہ میں اس کا بیان آتا ہے)۔

معارف و مسائل

اَخْرَقَتْهَا لِنُفْسٍ اٰهْلَہَا، صحیحین کی حدیث میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے کلباڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال دیا تھا جس کی وجہ سے کشتی میں پانی بھر کر غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا، مگر تاریخی روایات میں ہے کہ پانی اس کشتی میں داخل نہیں ہوا، خواہ اس لئے کہ خضر علیہ السلام نے ہی پھر اس کی کچھ مرمت کر دی، جیسے بغوسی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس تختہ کی جگہ خضر علیہ السلام نے ایک شیشہ لگا دیا تھا یا بطور مجزہ پانی کشتی میں نہ آیا، اتنی بات خود قرآن کریم کے سیاق سے معلوم ہو رہی ہے، کہ اس کشتی کو غرقابی کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، جس سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے۔

حَتّٰی اِذَا الْفَيَآءُ غَلَامًا، لفظ غلام عربی زبان کے اعتبار سے نابالغ لڑکے کو کہا جاتا ہے، یہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے کہ وہ نابالغ تھا، اور آگے جو اس کے متعلق آیا نَفْسًا زَكِيَّةً اس سے بھی اس کے نابالغ ہونے کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ زکیہ کے معنی ہیں گناہوں سے پاک اور یہ صفت یا پیغمبر کی ہو سکتی ہے یا نابالغ بچے کی جس کے افعال و اعمال پر مواخذہ نہیں، اس کے نامہ اعمال میں کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا۔

اَهْلَ قَرْيَةٍ، یہ بستی جس میں حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا گزر ہوا اور اس کے

لوگوں نے ان کی مہمانی سے انکار کیا، حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں انطاکیہ اور ابن سیرین کی روایت میں ایک تھی، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ وہ اندلس کی کوئی بستی تھی (منظری) والشدائم

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَسَدَّتْ أَنْ

وہ جو کشتی تھی سو چند محتاجوں کی جو محنت کرتے تھے دریا میں سو میں نے چاہا کہ

أَعْيَبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ٢٩

اس میں عیب ڈال دوں اور ان کے پرے تھا ایک بادشاہ جو لیلیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا

اور وہ جو لڑکا تھا سو اس کے ماں باپ تھے ایمان والے پھر ہم کو ہند لیتے ہو کہ ان کو عاجز

طَعْنَانَا وَكُفْرًا ٣٠ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِيَ لَهُمَا زَهْرَ خَيْرٍ أَمِنَهُ

کر دے زبردستی اور کفر کر کر، پھر ہم نے چاہا کہ بدلہ دے ان کو ان کا رب بہتر اس سے

زَكَاةً وَأَقْرَبَ رَحْمًا ٣١ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ

پاکیزگی میں اور نزدیک تر شفقت میں، اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں

يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا

کی تھی اس شہر میں اور اس کے نیچے مال گڑھا تھا ان کا اور ان کا باپ تھا

صَالِحًا فَآسَأَ ادْرَبُكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا

نیک پھر چاہا تیرے رب نے کہ وہ پہنچ جائیں اپنی جوانی کو اور نکالیں اپنا مال

كَنْزَهُمَا بِرَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرٍ يُط

گڑھا ہوا مہمانی سے تیرے رب کی اور میں نے یہ نہیں کیا اپنے حکم سے

ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا تُسْطِعُ عَلَيْهِ صَبْرًا ٣٢

یہ ہی پھر ان چیزوں کا جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

خلاصہ تفسیر

اور وہ جو کشتی تھی سو چند غریب آدمیوں کی تھی (جو اس کے ذریعہ) دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے (اسی پران کی گزراوقات تھی) سر میں نے چاہا کہ اس میں عیب ڈال دوں اور وہ جو اس کی یہ تھی کہ ان لوگوں سے آگے کی طرف ایک (ظالم) بادشاہ تھا جو ہر (اچھی) کشتی کو زبردستی پھینک دیتا تھا اگر میں کشتی میں عیب ڈال کر بظاہر بیکار نہ کر دیتا تو یہ کشتی بھی پھینک لی جاتی اور ان غریبوں کی مزدوری کا سہارا بھی ختم ہو جاتا، اس لئے توڑنے میں یہ مصلحت تھی) اور رباوہ لڑکا کا سو اس کے باپ ایمان دار تھے (اور اگر وہ بڑا ہوتا تو کا فر ظالم ہوتا اور ماں کو اس سے محبت بہت تھی) سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر نہ ڈال دے (یعنی بیٹے کی محبت کے سبب وہ بھی بے دینی میں اس کا ساتھ نہ دینے لگیں) پس ہم کو یہ منظور ہوا کہ اس کا تو قصہ تمام کر دیا جائے پھر اس کے بدلے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے (خواہ لڑکا ہو یا لڑکی) جو کہ پاکیزگی (یعنی دین میں) اس سے بہتر ہو، اور (ماں باپ کے ساتھ) محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو، اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں (رہتے) ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا (جو ان کے باپ سے میراث میں پہنچا ہے) اور ان کا باپ رجو مر گیا (وہ) ایک نیک آدمی تھا اس کے نیک ہونے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اولاد کے مال کو محفوظ کرنا چاہا، اگر دیوار ابھی گر جاتی تو لوگ یہ مال ٹوٹ لے جاتے اور غالباً جو شخص ان یتیم لڑکوں کا سر پرست تھا اس کو اس خزانے کا علم ہو گا وہ یہاں موجود نہ ہو گا جو انتظام کر لیتا، اس لئے آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور اپنا دینیہ نکال لیں اور یہ سارے کام میں نے اللہ کے حکم سے کئے ہیں ان میں سے کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ صبر فرما سکا، (جس کو میں حسب وعدہ بتلا چکا ہوں) چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام منصر علیہ السلام سے رخصت ہو گئے) :-

معارف و مسائل

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ، یہ کشتی جن مسکینوں کی تھی ان کے متعلق کو احباب سے منقول ہے کہ وہ دن بھائی تھے جن میں پانچ اپنا بیج معذور تھے، پانچ محنت مزدوری کر کے سب کے لئے معاش کا انتظام کرتے تھے، اور مزدوری ان کی یہ تھی کہ دریا میں ایک کشتی

چلاتے اور اس کا کرایہ حاصل کرتے تھے۔

مسکین کی تعریف | بعض لوگوں نے یہ کی ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسکین کی صحیح تعریف یہ ہے کہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس کی حاجات اصلیہ ضروریہ سے زائد بقدر نصاب ہو جائے، اس سے کم مال ہو تو وہ بھی مسکین کی تعریف میں داخل ہے، کیونکہ جن لوگوں کو اس آیت میں مساکین کہا گیا ہے ان کے پاس کم از کم ایک کشتی تو تھی جس کی قیمت مقدار نصاب کم نہیں ہوتی، مگر چونکہ وہ حاجات اصلیہ ضروریہ میں مشغول تھے، اس لئے ان کو مساکین ہی کہا گیا (منظری)

مِثْلُ مَا أَخَذَ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا، بخوبی نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ یہ کشتی جس طرف جا رہی تھی وہاں ایک ظالم بادشاہ تھا جو ادھر سے گزرنے والوں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت خضر نے اس مصلحت سے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا کہ وہ ظالم بادشاہ اس کشتی کو شکستہ دیکھ کر چھوڑ دے، اور یہ مساکین اس مصیبت سے بچ جائیں، وائے روم نے خوب فرمایا۔

گر خضر در بحر کشتی را شکست : صدر درستی در شکست خضر بہت
وَأَنَّا الْغَالِمُ، یہ لڑکا جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا، اس کی حقیقت یہ بیان فرمائی کہ اس لڑکے کی طبیعت میں کفر اور والدین کے خلاف سرکشی تھی، والدین اس کے نیک اصلاح تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں خطرہ تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ان صالح ماں باپ کو مستنائے گا، اور تکلیف پہنچائے گا، اور کفر میں مبتلا ہو کر ماں باپ کے لئے بھی ایک فتنہ بنے گا، اس کی محبت میں ماں باپ کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

فَأَمَّا دُنَا أَنْ يَغِيْبَ لَهْمَا دَرَبُ مَا خَيْرُ آيَتِنَا زَكَاةً وَأَقْرَبَ رَحْمَةً، یعنی اس لڑکے ہم نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان صالح ماں باپ کو اس لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دیدے، جو اعمال و اخلاق میں پاکیزہ بھی ہو اور ماں باپ کے حقوق کو بھی پورا کرے۔

اس واقعہ میں خشینا اور آر دُنَا میں جمع مکمل کا صیغہ استعمال فرمایا، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ارادہ اور خشیت خضر علیہ السلام نے اپنی اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف منسوب کیا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود اپنی ہی طرف منسوب کیا ہو تو پھر آر دُنَا کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اللہ سے دعا کی، کیونکہ کسی لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا معاملہ اللہ ہی تعالیٰ کا فعل ہے، اس میں خضر یا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا۔

اور یہاں یہ شبہ کرنا درست نہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ لڑکا

کافر ہو گا، اور ماں باپ کو بھی گمراہ کرے گا، تو پختہ واقعہ علم الہی کے مطابق ایسا ہی واقعہ ہونا ضروری تھا، کیونکہ علم الہی کے خلاف کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

جواب یہ ہے کہ علم الہی میں اس تعلیق و شریک کے ساتھ تھا کہ یہ بائخ ہو گا تو کافر ہو گا اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی خطرہ بنے گا، پھر چونکہ وہ عمر بلوغ سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا تو جو واقعہ پیش آیا وہ اس علم الہی کے منافی نہیں (منظری)۔

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے بروایت عطیہ نعل کیا ہے کہ مقتول لڑکے کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ایک لڑکی عطا فرمائی جس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوا، اور ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ اس کے بطن سے دو نبی پیدا ہوئے، بعض روایات میں ہے کہ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی امت کو ہدایت فرمائی۔

وَحَفَّتْهُ كُنُزًا ثَمَنًا، یہ خزانہ جو یتیم بچوں کے لئے زبردیوار دفن تھا اس کے متعلق حضرت ابوالدرداءؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کیا ہے کہ وہ سونے اور چاندی کا ذخیرہ تھا (رداء الترمذی والحاکم وصحیحہ ازمنظری)۔

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر نصیحت کے مندرجہ ذیل کلمات لکھے ہوئے تھے، یہ روایت حضرت عثمان بن عفانؓ نے مرفوعاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی نقل فرمائی (قرطبی)۔

- ۱۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
- ۲۔ تعجب ہے اس شخص پر جو تقدیر پر ایمان رکھتا ہے پھر غمگین کیونکر ہوتا ہے۔
- ۳۔ تعجب ہے اس شخص پر جو اس پر ایمان رکھتا ہے کہ رزق کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے پھر ضرورت سے زیادہ مشقت اور فضول قسم کی کوشش میں کیوں لگتا ہے۔
- ۴۔ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر ایمان رکھتا ہے پھر خوش و خرم کیسے رہتا ہے۔
- ۵۔ تعجب ہے اس شخص پر جو حساب آخرت پر ایمان رکھتا ہے پھر غفلت کیسے برتا ہے۔
- ۶۔ تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کو اور اس کے انقلابات کو جانتا ہے پھر کیسے اس پر مطمئن ہو کر بیٹھتا ہے۔

۷۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

والدین کی نیکی کا فائدہ | وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا، اس میں اشارہ ہے کہ یتیم بچوں کے لئے مرفوع خزانہ اولاد و اولاد کو بھی پہنچا دی کی حفاظت کا سامان بذریعہ خضر علیہ السلام اس لئے کرایا گیا تھا کہ ان یتیم

پتوں کا باپ کوئی مرد صالح اللہ کے نزدیک مقبول تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مراد پوری کرنے اور اس کی اولاد کو فائدہ پہنچانے کا یہ انتظام فرمایا، محمد بن مسکد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بندے کی نیکی اور صلاحیت کی وجہ سے اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی اور اس کے آس پاس کے مکانات کی حفاظت فرماتے ہیں (مظہری)۔

قرطبی میں ہے کہ حضرت شبلی فرمایا کرتے تھے کہ میں اس شہر اور پورے علاقہ کے لئے امان ہوں، جب ان کی وفات ہو گئی تو ان کے دفن ہوتے ہی کفار و عیلم نے دریائے دجلہ کو عبور کر کے بغداد پر قبضہ کر لیا، اس وقت لوگوں کی زبان پر یہ تھا کہ ہم پر وہی مصیبت ہے یعنی شبلی کی وفات اور وعلیم کا قبضہ (قرطبی، ص ۲۹ ج ۱۱)۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لوگوں کو بھی علماء و علما کی اولاد کی رعایت اور ان پر شفقت کرنی چاہئے، جب تک کہ وہ بالکل ہی کفر و فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

آن تَلَحَّ أَشَدُّ هَمًّا، لَفْظاً أَشَدُّ شِدَّةً کی جمع ہے، مراد قوت ہے، اور وہ ہر جس میں انسان اپنی پوری قوت اور بھلے برے کی پہچان پر قادر ہو جاتا ہے، ابو حنیفہ کے نزدیک پچیس سال کی عمر ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ چالیس سال عمر ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے کہ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدُّكَ وَابَلَغَ آدُبُكَ مَسَنَّةً (مظہری)۔

پیغمبرانہ بلاغت اور رعایت اس مثال کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات سمجھ لی جی ضروری ہے کہ دنیا ادب کی ایک مثال میں کوئی اچھا یا بُرا کام اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا، شر و شر سب اس کی مخلوق اور اس کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں، جن امور کو شر یا بُرا سمجھا اور کہا جاتا ہے وہ خاص افراد اور خاص حالات کے اعتبار سے ضرور شر اور بُرا کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں، مگر مجموعہ عالم اور عالم دنیا کے مزاج کے لئے سب ضروری اور تخلیق الہی کے اعتبار سے شر ہی ہوتے ہیں، اور سب حکمت پر مبنی ہوتے ہیں کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

خلاصہ یہ ہے کہ جو آفت یا حادثہ دنیا میں پیش آتا ہے، خدا تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس لحاظ سے ہر شر و شر کی نسبت بھی حق تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی تخلیق کے اعتبار سے کوئی شر شر نہیں ہوتا، اس لئے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ شر کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہ کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلمات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَإِذَا مَرَّضْتُ فَهْوَ يَشْفِينِ

اسی تعلیم و ادب کا سبق دیتے ہیں کہ کھلانے پلانے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف فرمائی، پھر بیماری کے وقت شفا دینے کی نسبت بھی اسی کی طرف کی، درمیان میں بیمار ہونے کو اپنی طرف منسوب کر کے کہا **وَإِذَا أَقْرَبْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ**، لیکن جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے شفا عطا فرمادیتا ہے۔ یہاں نہیں کہا کہ جب وہ مجھے بیمار کرتے ہیں تو شفا بھی دیتے ہیں۔

اب حضرت خضر علیہ السلام کے کلام پر غور کیجئے، انھوں نے جب کشتی توڑنے کا ارادہ کیا تو وہ چونکہ ظاہر میں ایک عیب اور بُرائی ہے اس کے ارادہ کی نسبت اپنی طرف کر کے منہ مایا **أَسَدْتُ**، پھر لڑکے کو قتل کرنے اور اس کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دینے کا ذکر کیا تو اس میں قتل تو بُرائی تھی، اور بدلے میں بہتر اولاد دینا ایک بھلائی تھی، امر مشترک ہونے کی وجہ سے یہاں بصیغہ جمع منکلم فرمایا **أَسَدْنَا** یعنی ہم نے ارادہ کیا تاکہ اس میں جتنا ظاہری شر ہو وہ اپنی طرف اور جو خیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، تیسرے واقعہ میں دیوار کھڑی کر کے یتیموں کا مال محفوظ کر دینا سراسر خیر ہی خیر ہے، اس کی نسبت پوری حق تعالیٰ کی طرف کر کے فرمایا **فَأَرَادَ رَبُّكَ** یعنی آپ کے رب نے ارادہ کیا۔

خضر علیہ السلام زندہ ہیں | شرآن کریم میں جو واقعہ حضرت خضر علیہ السلام کا مذکور ہے اس کا اسس یا ان کی وفات ہو چکی | معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام اس واقعہ کے بعد وفات پا گئے یا زندہ رہے، اسی لئے قرآن و سنت میں اس کے متعلق کوئی صریح بات مذکور نہیں بعض روایات و آثار سے ان کا اب تک زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے، بعض روایات سے اس کے خلاف مستفاد ہوتا ہے، اسی لئے اس معاملے میں ہمیشہ سے علماء کی رائیں مختلف رہی ہیں، جو حضرات ان کی حیات کے قائل ہیں ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایک شخص سیاہ سفید راڑھی والے داخل ہوئے، اور لوگوں کے منہ کو چیرتے پھاڑتے اندر پیچھے اور رونے لگے، پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یہ کلمات کہے :-

إِنَّ فِي اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ قَبْرَ كُلِّ مُصِيبَةٍ
وَهُوَ مُتَأَمِّلٌ كُلِّ قَائِمٍ وَخَائِفٍ
قَبْرٌ كُلِّ هَالِكٍ فَإِلَى اللَّهِ
فَانِيبُوا إِلَى اللَّهِ فَاغْنُوا وَنَظَرُوا إِلَيْكُمْ
فِي الْبِلَادِ فَانْظُرُوا فَإِنَّمَا الِمْصَابُ
مَنْ لَمْ يُجَبَّرْ۔

”اللہ کی بارگاہ میں صبر ہے، ہر مصیبت سے اور بلا سے
ہر فوت ہو سوا لی چیز کا اور وہی قائم مقام ہے ہر ہلاک
ہونے والے کا اس نے اسی کی طرف رجوع کرو اسی کی
طرف رغبت کرو اور اس بات کو دیکھو کہ وہ ہیں مصیبت
میں مبتلا کر کے تم کو آزماتا ہے اصل مصیبت زدہ
وہ ہے جس کی مصیبت کی تلافی نہ ہو۔“

یہ آنے والے کلمات مذکورہ کہہ کر حضرت ابو بکر اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ حضرت علیہ السلام تھے، اس روایت کو جس زمری نے حسن حصین میں بھی نقل کیا ہے جن کی شرط یہ ہے کہ صرف صحیح السند روایات اس میں درج کرتے ہیں۔

اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ وہ جبال مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ تک پہنچے گا تو مدینہ سے ایک شخص اس کے مقابلہ کے لئے نکلے گا، جو اس زمانے کے سب انسانوں میں بہتر ہوگا، یا بہتر لوگوں میں سے ہوگا، ابواسحق نے فرمایا کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے (قرطبی) اور ابن ابی الدنیاء نے کتاب البیواتف میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تو حضرت علیہ السلام نے ان کو ایک دعا بتلائی کہ جو اس کو ہر نماز کے بعد پڑھا کرے اس کے لئے ثواب عظیم اور مغفرت و رحمت ہر وہ دعا یہ ہے :-

يَا مَنْ لَا يُغْلَبُ سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ
وَيَا مَنْ لَا تُغْلَبُ السَّائِلُ
وَيَا مَنْ لَا يَبْرَمُ مِنَ الْحَاجِ
الْمُلْتَخِنِ اِذْ قُنِيَ بَرْدُ عَفْوِكَ
وَحَلَاوَةٌ مَخِيفَتِكَ

(قرطبی)

”اے وہ ذات جس کو ایک کلام کا سننا دوسرے کلام کے سننے سے مانع نہیں ہوتا اور اے وہ ذات جس کو بیک وقت ہونے والے (لاکھوں کروڑوں) سوالوں میں کوئی مخالطہ نہیں لگتا، اور وہ ذات جو دعا میں الحاج واصرار کرنے اور بابا

کہنے سے ملول نہیں ہوتا، مجھے اپنے عضو و کرم کا ذائقہ چکھا دیجئے، اور اپنی مغفرت کی حلاوت نصیب فرمائیے“

اور سچا اسی کتاب میں اچینہ یہی واقعہ اور یہی دعا اور حضرت علیہ السلام سے ملاقات کا واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی نقل کیا ہے (قرطبی)

اسی طرح اولیاء ائمت میں حضرت خضر علیہ السلام کے بے شمار واقعات منقول ہیں۔ اور جو حضرات خضر علیہ السلام کی حیات کو تسلیم نہیں کرتے ان کا بڑا استدلال اس حدیث سے ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عشاء کی نماز اپنی آخر حیات میں پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپؐ کھڑے ہو گئے اور یہ کلمات ارشاد فرمائے :

اَرَأَيْتُمْ لَيْلَتَكُمْ هَذِهِ فَإِنَّ عَلَى
رَأْسِ مِائَةِ سَنَةٍ مِمَّنْ لَا يَبْقَى
مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ مِنْ أَحَدٍ

”کیا تم اپنی آج کی رات کو دیکھ رہے ہو
اس رات سو سال گزرنے پر کوئی شخص
ان میں زندہ نہ رہے گا جو آج زمین کے اوپر ہے“

حضرت ابن عمرؓ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس روایت کے بارے میں لوگ مختلف باتیں کرتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ سو سال پر یہ قرن ختم ہو جائے گا۔

یہ روایت مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے بھی تقریباً ایسی الفاظ کے ساتھ منقول ہے، لیکن علامہ قرطبیؒ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی حجت نہیں جو حیاتِ خضرؑ کو باطل کہتے ہیں، کیونکہ اس روایت میں اگرچہ تمام بنی آدم کے لئے عموم کے الفاظ ہیں اور عموم بھی مذکور کے لایا گیا ہے، مگر پھر بھی اس میں نص نہیں کہ یہ عموم تمام اولادِ آدم علیہ السلام کو شامل ہی ہو، کیونکہ اولادِ آدم میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں جن کی نہ وفات ہوئی اور نہ قتل کئے گئے، اس لئے ظاہر یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ علی الارض میں الف لام عہد کا ہے، اور مراد ارض سے ارضِ عرب ہے، پوری زمین جس میں ارض یا جوج و ماجوج اور بلادِ مشرق اور جزائر جن کا نام بھی عربوں نے نہیں سنا اس میں شامل نہیں، یہ علامہ قرطبی کی تحقیق ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے مسئلہ ختمِ نبوت کو حیاتِ خضر کے منافی سمجھا ہے، اس کا جواب بھی ظاہر ہے کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ختمِ نبوت کے منافی نہیں حضرت خضرؑ کی حیات بھی ایسی ہی ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات نے حیاتِ خضر پر یہ شبہ کیا ہے کہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود ہوتے تو ان پر لازم تھا کہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے تابع ہو کر اسلامی خدمات میں مشغول ہوتے، کیونکہ حدیث میں ارشاد ہے: لَوْ كَانَ مُوسَى حَيًّا لَمَّا وَسَّعَهُ إِلَّا اتَّبَاعِيٌّ۔ یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا کیونکہ میرے آنے سے دین موسوی منسوخ ہو چکا ہے۔ لیکن یہ کچھ بعید نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی اور ان کی نبوت عام انبیاء پر شریعت سے مختلف ہو، ان کو چونکہ تکوینی خدمات منجانب اللہ سپرد ہیں وہ ان کے لئے مخلوق سے الگ تھلگ اپنے کام پر مامور ہیں، رہا اتباعِ شریعت محمدیہ تو اس میں کوئی بُعد نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سے انھوں نے اپنا عمل شریعتِ محمدیہ پر شروع کر دیا ہو، واللہ اعلم۔

ابو حیان نے تفسیر بحر محیط میں متعدد بزرگوں کے واقعات حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے بھی نقل کئے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ:-

وَالْجَمْعُ مَوْسَى عَلَى آتِلَةِ مَاتِ

تجمعہ علماء اس پر ہیں کہ خضر علیہ السلام

کی وفات ہو گئی۔

(بحر محیط، ص ۱۴ ج ۶)

تفسیر منبری میں حضرت قاضی ثنار اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ تمام اشکالات کا حل

اس میں ہے جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکاشفے فرمایا وہ یہ کہ میں نے خود حضرت
خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالم کشف میں دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ میں اور ایسا علیہ السلام
ہم دونوں زندہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں
متشکل ہو کر لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم
یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی موت و حیات سے ہمارا کوئی اعتقاد
یا عملی مسئلہ متعلق نہیں، اسی لئے قرآن و سنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت و وضاحت نہیں
کی گئی، اس لئے اس میں زیادہ بحث و تحقیق کی بھی ضرورت نہیں، نہ کسی ایک جانب کا یقین رکھنا
ہمارے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ مسئلہ عوام میں چلا ہوا ہے اس لئے مذکورہ صدر تفصیلات
نقل کر دی گئی ہیں:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقَرْيَتَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوهُنَّ لَكُمْ مِّنْ ذِكْرٍ ۝۸۳

اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو کہہ اب پڑھتا ہوں تمہارے آگے اس کا کچھ احوال

إِنَّا مَكْنَانَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝۸۴ فَاتَّبِعْ

ہم نے اس کو چھپایا تھا ملک میں اور دیا تھا ہم نے اس کو ہر چیز کا سامان، پھر پیچھے پڑا

سَبِيلًا ۝۸۵ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ

ایک سامان کے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج ڈوبنے کی جگہ یا یا کہ وہ ڈوبتا ہے ایک دلدل کی

حِينَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يَا الْقَرْيَتَيْنِ إِنَّمَا أَنْتُمْ عَنِيبٌ

ندی میں اور پایا اس کے پاس لوگوں کو ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تو لوگوں کو تکلیف دے

وَأَمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝۸۶ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نَعْتَبُ بِهِ

اور یا رکھ ان میں خوبی، بولا جو کوئی ہو گا بے انصاف سو ہم اس کو سزا دیں گے،

ثُمَّ يَرْجُو إِلَىٰ رَبِّهِ فَيَعْتَبُ بِهِ عَذَابًا ۝۸۷ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ

پھر لوٹ جائے گا اپنے رب کے پاس وہ عذاب دیکھا اس کو بڑا عذاب، اور جو کوئی یقین لایا اور کیا اس نے بھلا

صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءُ الْحُسْنَىٰ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝۸۸

کام سوا اس کا بدلہ بھلائی ہے، اور ہم حکم دیں گے اس کو اپنے کام میں آسانی۔

خلاصہ تفسیر

ذوالقرنین کا پہلا سفر | اور یہ لوگ آپ ذوالقرنین کا حال پوچھتے ہیں اس پر چھنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تاریخ قریب قریب گم تھی، اور اسی لئے اس قصہ کے جو امور قرآن میں مذکور نہیں کہ وہ اصل قصہ سے زائد تھے، ان امور کے متعلق آج تک اصل تاریخ میں اختلافات شدید پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے قریش مکہ نے بمشورۃ یہود مدینہ اس قصہ کا سوال کے لئے انتخاب کیا تھا، اس لئے اس قصہ کی تفصیلات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی واضح دلیل ہے) آپ فرمادیجئے کہ میں اس کا ذکر ابھی تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں آگے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی حکایت شروع ہوئی کہ ذوالقرنین ایک ایسے جلیل القدر بادشاہ ہو گزرے ہیں کہ، ہم نے ان کو روئے زمین پر حکومت دی تھی اور ہم نے ان کو ہر قسم کا سامان رکافی دیا تھا (جس سے وہ اپنے شاہی منصوبوں کو پورا کر سکیں) چنانچہ وہ بارادۃ فتوحات ملک مغرب، ایک راہ پر ہوئے (اور سفر کرنا شروع کیا) یہاں تک کہ جب سفر کرتے کرتے درمیانی شہروں کو فتح کرتے ہوئے، غروب آفتاب کے موقع (یعنی جانب مغرب میں انتہائی آبادی) پر پہنچے تو آفتاب ان کو ایک سیاہ پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا (مراد اس سے ناالباسمند رہو کہ اس کا پانی اکثر جگہ سیاہ نظر آتا ہے، اور اگرچہ آفتاب حقیقتہً سمندر میں غروب نہیں ہوتا مگر سمندر سے آگے نگاہ نہ جاتی ہو تو سمندر ہی میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوگا) اور اس موقع پر انھوں نے ایک قوم دیکھی (جن کے کافر ہونے پر اگلی آیت اٹا من ظلم دلالت کرتی ہے) ہم نے (بصورت الہام یا اس زمانے کے پیغمبر کے واسطے سے) یہ کہا کہ اے ذوالقرنین اس قوم کے بارے میں دو اختیار ہیں، خواہ (ان کو ابتداء ہی سے قتل وغیرہ کے ذریعہ) سزا دے دو خواہ ان کے بارے میں نرمی کا معاملہ اختیار کر دو (یعنی ان کو ایمان کی دعوت دو پھر نہ مانیں تو قتل کر دو) بغیر تبلیغ و دعوت کے ابتداء ہی قتل کرنا اختیار شاید اس لئے دیا گیا ہو کہ ان کو اس سے پہلے کسی ذریعہ سے دعوت ایمان پہنچ چکی ہوگی، لیکن دوسری صورت یعنی پہلے دعوت پھر قتل کا بہتر ہونا اشارہ سے بیان کر دیا کہ اس دوسری صورت کو اتخاذ حسن سے تعبیر فرمایا) ذوالقرنین نے عرض کیا کہ میں دوسری ہی صورت اختیار کر کے پہلے ان کو دعوت ایمان دوں گا، لیکن (دعوت ایمان کے بعد) جو ظالم (یعنی کافر) رہے گا سو اس کو تو ہم لوگ (قتل وغیرہ کی) سزا دیں گے (اور یہ سزا تو دنیا میں ہوگی) پھر وہ (مرنے کے بعد) اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچا دیا جائے گا، پھر وہ اس کو (دوزخ کی) سخت سزا دے گا، اور جو شخص (دعوت ایمان کے بعد) ایمان لے آئے گا

اور نیک عمل کرنے کا تو اس کے لئے رآخرت میں بھی (برے میں بھلائی ملے گی اور ہم بھی (دنیا میں) اپنے برتاؤ میں اس کو آسان (اور نرم) بات کہیں گے (یعنی ان پر کوئی عملی سختی تو کیا کی جاتی رہانی اور قوی بھی کوئی سختی نہیں کی جائے گی)

معارف و مسائل

يَسْأَلُونَكَ رُبَّيْهِ وَهِيَ رُبَّيْهِ لَوْ كُنْتَ تَعْلَمُ اس سے سوال کرتے ہیں، یہ لوگ سوال کرنے والے کون ہیں روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قریش مکہ تھے، جن کو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور حقانیت کا امتحان کرنے کے لئے تین سوال بتلائے تھے، رُوح کے متعلق اور آسمان کا کہت اور ذوالعترین کے بارے میں، ان میں دو کا جواب آچکا ہے، اصحاب کہف کا قصہ ابھی گزرا ہے، اور رُوح کا سوال پچھلی سورۃ کے آخر میں گزر چکا ہے، یہ تیسرا سوال ہے کہ ذوالقرنین کون تھا اور اس کو کیا حالات پیش آئے (بحر محیط)

ذوالقرنین کون تھے؟ ذوالقرنین کا نام ذوالعترین کیوں ہوا، اس کی وجہ میں بے شمار کس زمانے اور کس ملک اقوال اور سخت اختلافات ہیں، بعض نے کہا کہ ان کی دو زنجیریں تھیں، اس لئے ذوالقرنین کہلائے، بعض نے کہا کہ مشرق و مغرب کے مالک پر حکمران ہوتے اس لئے ذوالقرنین نام رکھا گیا، کسی نے یہ بھی کہا کہ ان کے سر پر کچھ ایسے نشانات تھے جیسے سنگ کے ہوتے ہیں، بعض روایات میں ہے کہ ان کے سر پر دونوں جانب چوٹ کے نشانات تھے اس لئے ذوالقرنین کہا گیا، واللہ اعلم، مگر اتنی بات متعین ہے کہ قرآن نے خود ان کا نام ذوالعترین نہیں رکھا، بلکہ یہ نام یہود نے بتلایا ان کے یہاں اس نام سے ان کی شہرت ہوگی، واقعہ ذوالقرنین کا جتنا حصہ قرآن نے بتلایا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ:-

”وہ ایک صالح عادل بادشاہ تھے جو مشرق و مغرب میں پہنچے اور ان کے ممالک کو فتح کیا اور ان میں عدل و انصاف کی حکمرانی کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہر طرح کے سامان اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے عطا کر دیتے گئے تھے، انھوں نے فتوحات کرتے ہوئے تین اطراف میں سفر کئے، مغرب اقصیٰ تک اور مشرق اقصیٰ تک، پھر جانب شمال میں کوہستانی سلسلے تک اسی جگہ انھوں نے دو پہاڑوں کے درمیانی درے کو ایک عظیم الشان آہنی دیوار کے ذریعہ بند کر دیا جس سے یا جوج یا جوج کی تاخت و تاراج سے اس علاقہ کے لوگ محفوظ رہا۔“

یہ بڑے بڑے سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت اور نبوت کا امتحان کرنے کے لئے پیش کیا تھا، وہ اس جواب مطلق ہو گئے، انھوں نے مزید یہ سوالات نہیں کئے، کہ ان کا نام ذوالقرنین کیوں تھا، یہ کس ملک میں اور کس زمانے میں تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات کو خود یہود نے بھی غیر ضروری اور فضول سمجھا، اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تاریخ و قصص کا صرف اتنا حصہ ذکر کرتا ہے جس سے کوئی فائدہ دین یا دنیا کا تعلق ہو، یا جس پر کسی ضروری چیز کا سمجھنا موقوف ہو، اس لئے نہ قرآن کریم نے ان چیزوں کو بتلایا اور نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی یہ تفصیلات بیان کی گئیں، اور نہ قرآن مجید کی کسی آیت کا سمجھنا ان چیزوں کے علم پر موقوف ہے، اسی لئے صالحین صحابہ و تابعین نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اب معاملہ صرف تاریخی روایات کا یا موجودہ تورات و انجیل کا رہ گیا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ تورات و انجیل کو بھی مسلسل تحریفات نے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت میں نہیں چھوڑا، ان کا مقام بھی اب زیادہ سے زیادہ ایک تاریخ ہی کا ہو سکتا ہے، اور زمانہ قدیم کی تاریخی روایات زیادہ تر اسرائیلی قصوں کہانیوں سے ہی پُر ہیں، جن کی نہ کوئی سند ہو، نہ وہ کسی زمانے کے علماء و حکماء کے نزدیک قابل اعتماد بانی گئی ہیں، حضرات مفسرین نے بھی اس معاملہ میں جو کچھ لکھا وہ سب انہی تاریخی روایات کا مجموعہ ہے، اسی لئے ان میں اختلافات بے شمار ہیں، اہل یورپ نے اس زمانے میں تاریخ کو بڑی اہمیت دی، اس پر تحقیق و تفتیش میں بلاشبہ بڑی محنت و کاوش سے کام لیا، آثار قدیمہ کی کھدائی اور وہاں کے کتبات و غیرہ کو جمع کر کے ان کے ذریعہ قدیم واقعات کی حقیقت تک پہنچنے میں وہ کام انجام دیئے جو اس سے پہلے زمانہ میں نظر نہیں آتے، لیکن آثار قدیمہ اور ان کے کتبات سے کسی واقعہ کی تائید میں مدد تو مل سکتی ہے مگر خود ان سے کوئی واقعہ پورا نہیں پڑھا جاسکتا، اس کے لئے تو تاریخی روایات ہی بنیاد بن گئی ہیں، اور ان معاملات میں زمانہ قدیم کی تاریخی روایات کا حال ابھی معلوم ہو چکا ہے، کہ ایک کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، قدیم و جدید علماء تفسیر نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایات ایک تاریخی حیثیت ہی سے نقل کی ہیں، جن کی صحت پر کوئی شرعی مقصد موقوف نہیں، یہاں بھی اسی حیثیت سے بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے، اس واقعہ کی پوری تفتیش و تحقیق مولانا حفیظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب قصص قرآن میں لکھی ہے، تاریخی ذوق رکھنے والے حضرات اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ پوری دنیا پر سلطنت و حکومت کرنے والے چار بادشاہ ہوئے ہیں، دو مؤمن اور دو کافر، مؤمن بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین ہیں

اور کافر نمرود اور نخت نصر ہیں۔

ذوالقترین کے معاملہ میں یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس نام سے دنیا میں متعدد آدمی مشہور ہوئے ہیں، اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہر زمانے کے ذی القترین کے ساتھ لقب سکندر بھی شامل ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے ایک بادشاہ سکندر کے نام سے حروب مشہور ہے جس کو سکندر یونانی، مقدونی، رومی وغیرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا وزیر ارسلو تھا، اور جس کی جنگ دآرا سے ہوئی، اور اسے قتل کر کے اس کا ملک منسوخ کیا، سکندر کے نام سے دنیا میں معروف ہونے والا آخری شخص یہی تھا، اسی کے قصے دنیا میں زیادہ مشہور ہیں بعض لوگوں نے اس کو بھی قرآن میں مذکور ذوالقترین کہہ دیا، یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ یہ شخص آتش پرست مشرک تھا، قرآن کریم نے جس ذوالقترین کا ذکر کیا ہے، ان کے نبی ہونے میں تو علما کا اختلاف ہے، مگر مومن صالح ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اور خود قرآن کی نصوص اس پر شاہد ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں بحوالہ ابن عساکر اس کا پورا نسب نامہ لکھا ہے، جو اوپر جا کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ملتا ہے، اور فرمایا کہ یہی وہ سکندر ہے جو یونانی مصری مقدونی کے ناموں سے معروف ہے، جس نے اپنے نام پر شہر اسکندریہ آباد کیا، اور روم کی تاریخ اسی کے زمانے سے چلتی ہے، اور یہ سکندر ذی القترین اول سے ایک طویل زمانے کے بعد ہوا ہے، جو دو ہزار سال سے زائد بتلایا جاتا ہے، اسی نے دآرا کو قتل کیا اور شاہان فارس کو مغلوب کر کے ان کا ملک فتح کیا، مگر یہ شخص مشرک تھا، اس کو قرآن میں مذکور ذوالقترین قرار دینا سراسر غلطی ہے، ابن کثیر کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

فاما ذوالقترین الثانی فهو اسکندر بن فیلبس بن مصریم بن برس بن میطون بن روحی بن نعلی بن یونان بن یافث بن یونہ بن شخون بن روحی بن شخط بن توفیل بن روحی بن الاصغر بن یقز بن العیص بن اسحق بن ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کن انسیہ الحافظ ابن عساکر فی تاریخ المقدونی، الیونانی المصری بانی الاسکندریہ الذی یؤرخ بایامہ الروم وكان متأخراً عن الاول بدع طویل وكان هذا قبل المسيح بنحو من ثلثمائة سنة وكان ارطاطاليس الفيلسوف وزيرا وهو الذي قتل دارا واذل ملوك الفرس واطأ ارضهم وانما نبهنا عليه لان كثير من الناس يعتقد انما واحد وان المذكور في القرآن هو الذي كان ارطاطاليس وزيرا فيقع بسبب ذلك خطأ كبير وفساد عظيم طویل فان الاول كان عبداً مؤمناً صالحاً وملكاً

عاد لا وکان وزیرہ الخضر وقد کان نبیاً علی ما قرناہ قبل ہذا واما الثانی فکان مشرکاً کان وزیرہ فیلسوفاً وقد کان بین زمانیرعدا انزید من الفے سنتہ فاین ہذا من ہذا لا یتویان ولا یشترکوا الا علی غبی لا یعرف حقائق الامور البلیۃ والنبایۃ صلیہم
حدیث و تاریخ کے امام ابن کثیر کی اس تحقیق سے ایک تویہ مغالطہ رفع ہوا کہ یہ اسکندر جو
حضرت مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے گذرا ہے، اور جس کی جنگ دارا اور بلوکس فارس سے
ہوئی، اور بانی اسکندریہ ہے، یہ وہ ذوالعترین نہیں جس کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے، یہ مغالطہ
بعض اکابر مفسرین کو بھی لگا ہے، ابو حیان نے بحر محیط میں اور علامہ آوسی نے روح المعانی میں
اسی کو ذوالعترین مذکور فی القرآن کہہ دیا ہے۔

دوسری بات ذالہ گان نبیاً کے جملے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن کثیر کے نزدیک ان کا
نبی ہونا راجح ہے، اگرچہ جمہور کے نزدیک راجح وہ قول ہے جو خود ابن کثیر نے بروایت ابی الطفیل
حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہو کہ نہ وہ نبی تھے نہ فرشتہ بلکہ ایک نیک صالح مسلمان تھے
اسی لئے بعض علماء نے یہ توجیہ کی کہ ذالہ گان کی ضمیر ذوالعترین کی طرف نہیں خضر علیہ السلام
کی طرف راجع ہے، وہ والا قرب۔

اب مسئلہ یہ رہتا ہے کہ پھر وہ ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن میں ہے کون ہیں اور کس زمانے
میں ہوئے ہیں، اس کے متعلق بھی علماء کے اقوال بہت مختلف ہیں، ابن کثیر کے نزدیک ان کا
زمانہ اسکندریونانی مقتدونی سے دو ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم الخلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام
کا زمانہ ہے اور ان کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، ابن کثیر نے ابدایہ والنبایہ میں سلف صالحین
سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ذوالعترین پیادہ پا حج کے لئے پہنچے، جب حضرت ابراہیم
علیہ السلام کو ان کے آنے کا علم ہوا تو مکہ سے باہر نکل کر استقبال کیا، اور حضرت خلیل علیہ السلام
نے ان کے لئے دعا بھی کی اور کچھ وصیتیں اور نصیحتیں بھی ان کو فرمائیں (البدایہ ص ۲۷۰ ج ۲)
اور تفسیر ابن کثیر میں بحوالہ ازرقی نقل کیا ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ
طواف کیا، پھر قربانی دی۔

اور ابو ریحان بیرونی نے اپنی کتاب الآثار الباقیہ عن العتروں الخالیۃ میں کہا ہے کہ یہ
ذوالعترین جن کا ذکر قرآن میں ہے ابوبکر بن سہی بن عمر بن افریقیس حمیری ہے، جس نے زمین کے
مشارق و مغارب کو فتح کیا، اور مسیح حمیری بمبئی نے اپنے اشعار میں اس پر فخر کیا ہے کہ میرے
دادا ذوالعترین مسلمان تھے، ان کے اشعار یہ ہیں ۵

قد کان ذوالقرنین جندی مسلماً ۵ ملکاً علانی الارض غیر مبجّن

بَلَمَ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ يُسَبِّحُ ۖ أَسْبَابَ مُلْتَمَسٍ مِّنْ كُرْسِيِّ سَيِّدٍ

یہ روایت بحر محیط میں ابو حیان نے نقل کی ہے، ابن کثیر نے بھی الباریہ والہمایہ میں اس کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ یہ ذوالعترین تباہہ یمن میں سب سے پہلا شیعہ ہے، اور یہی وہ شخص ہے جس نے بیسج کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فیصلہ دیا تھا (الہدایہ ص ۱۰۵ ج ۲) ان تمام روایات میں ان کی شخصیت اور نام و نسب کے بارے میں اختلاف ہونے کے باوجود ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ بتلایا گیا ہے۔

اور مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اپنی کتاب قصص نبی کریم میں جو ذوالعترین کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکور فی القرآن فارس کا وہ بادشاہ ہے جس کو یہودی خورس، یونانی سائرس، فارسی گورنش اور عرب کینسہ کہتے ہیں جس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت بعد انبیاء بنی اسرائیل میں سے دانیال کا زمانہ بتلایا جاتا ہے جو سکندر مقدونی قاتل دارا کے زمانے کے قریب قریب ہو جاتا ہے، مگر مولانا موصوف نے بھی ابن کثیر وغیرہ کی طرح اس کا فساد سے انکار کیا ہے کہ ذوالعترین وہ سکندر مقدونی جس کا وزیر اسطو تھا وہ نہیں ہو سکتا، وہ مشرک آتش پرست تھا، یہ مؤمن صالح تھے۔

مولانا موصوف کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی سورہ بنی اسرائیل میں جو دو مرتبہ بنی اسرائیل کے شر و فساد میں مبتلا ہونے اور دونوں مرتبہ کی سزا کا ذکر تفصیل سے آیا ہے اس میں بنی اسرائیل کے پہلے فساد کے موقع پر جو قرآن کریم نے فرمایا ہے بَعَثْنَا عَلَيْكَ عِبَادًا لِّئَاُولٰٓئِیْیَ بَأْسٌ شَدِیْدٌ فَجَاسُوا لِخِلْقِیْ اِنَّیْ یَادِیْنِیْ تَحْمِلُ فِسَادَیْیَ نَزَاۤءِیْسٍ ہَمَّ مَسَاۤءُیْ کر دیں گے تم پر اپنے کچھ ایسے بندے جو بڑی قوت و شوکت والے ہوں گے وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑیں گے) اس میں یہ قوت و شوکت والے لوگ بخت نصر اور اس کے اعوان ہیں جنہوں نے بیت المقدس میں چالیس ہزار اور بعض روایات میں ستر ہزار بنی اسرائیل کو قتل کیا، اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو قید کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا، اور اس کے بعد جو قرآن کریم نے فرمایا اِنَّہُمْ رَدَدْنَا لَکُمُ الْاَنْکَرَةَ عَلَیْہُمْ رَیْحِنِیْ ہم نے پھر لوٹا دیا تھا، غلبہ کو ان پر، یہ واقعہ اسی کینسر و خورس بادشاہ کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا، یہ مؤمن صالح تھا، اس نے بخت نصر کا مقابلہ کر کے اس کے قیدی بنی اسرائیل کو اس کے قبضہ سے نکالا، اور دوبارہ فلسطین میں آباد کیا، بیت المقدس کو جو ویران کر دیا تھا اس کو بھی دوبارہ آباد کیا، اور بیت المقدس کے خزانے اور اہم سامان جو بخت نصر یہاں سے لے گیا تھا وہ سب

وایں بنی اسرائیل کے قبضہ میں دیئے، اس لئے یہ شخص بنی اسرائیل (یہود) کا نجات دہندہ ثابت ہوا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہود مدینہ نے جو امتحان نبوت کے لئے قریش مکہ کے واسطے سوالات متعین کئے ان میں ذوالعترین کے سوال کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ یہود اس کو اپنا نجات دہندہ مان کر اس کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اپنی اس تحقیق پر موجودہ تواریخ کے حوالہ سے انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں سے پھر تاریخی روایات سے اس پر کافی شواہد پیش کئے ہیں، جو صاحب مزید تحقیق کے درپے ہوں وہ اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں، میرا مقصد ان تمام روایات کے نقل کرنے سے صرف اتنا تھا کہ ذوالعترین کی شخصیت اور ان کے زمانے کے بارے میں علماء امت اور ائمہ تاریخ و تفسیر کے اقوال سامنے آجائیں، ان میں سے راجح کس کا قول ہے یہ میرے مقصد کا جز نہیں، کیونکہ جن امور کا نہ قرآن نے دعویٰ کیا نہ حدیث نے ان کو بیان کیا، ان کے معین و مبین کرنے کی ذمہ داری بھی ہم پر نہیں، اور ان میں جو قول بھی راجح اور صحیح قرار پائے مقصد قرآنی ہر حال میں حاصل ہے، واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم، آگے آیات کی تفسیر دیکھئے:

قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ ذِكْرًا، اس میں یہ قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ ذِکْرًا کا مختصر لفظ چھوڑ کر مَنَّةً ذِکْرًا کے دو کلمے کیوں اختیار کئے، غور کیجئے تو ان دو کلموں میں اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کا پورا قصہ اور اس کی تاریخ ذکر کرنے کا وعدہ نہیں کیا، بلکہ اس کے ذکر کا ایک حصہ بیان کرنے کے لئے فرمایا، جس پر حرف مَن میں اور ذِکْرًا کی تین بقواعد عربیت شاہد ہے، اور جو تاریخی بحث ذوالقرنین کے نام و نسب اور زمانے وغیرہ کی لکھی گئی ہے، قرآن کریم نے اس کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دینے کا پہلے ہی اظہار فرما دیا ہے۔

وَأَتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا، لفظ سبب عربی لغت میں ہر اس چیز کیلئے بولا جاتا ہے جس سے اپنے مقصد حاصل کرنے میں مدد مل جاتی ہے، جس میں آلات و وسائل مادی بھی شامل ہیں اور علم و بصیرت و تجربہ وغیرہ بھی (بحر محیط) اور مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کی ضرورت نظام سلطنت کے لئے ایک بادشاہ اور حکمران کو پیش آتی ہے، مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ذوالقرنین کو اپنی عدل گستری اور امنِ عالم کے قیام اور فتوحات ممالک کے لئے جس جس سامان کی ضرورت اس زمانے میں تھی وہ سب کے سب اُن کو عطا کر دیئے گئے تھے۔ فَأَتَيْنَاهُ سَبَبًا، مراد یہ ہو کہ سامان تو ہر قسم کے اور دنیا کے ہر خطہ میں پہنچنے کے ان کو دیر سے گئے تھے، انھوں نے سب سے پہلے جانبِ مغرب سفر کے سامان سے کام لیا۔

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ ۖ مَرَادٍ بِهِ هُوَ أَنَّ جَانِبَ مَغْرِبٍ فِيهِ أَسْ حَتَّىٰ يَكُونَ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ كَرَجٌ ۚ
آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔

فِي سِتِّينَ حَسْبَةً ۖ لَفْظُ حَسْبَةٍ کے لغوی معنی سیاہ ذلزل یا کچڑ کے ہیں، مراد اس سے وہ پانی ہے جس کے نیچے سیاہ کچڑ ہو جس سے پانی کا رنگ بھی سیاہ دکھائی دیتا ہو، اور آفتاب کو ایسے چشمے میں ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا مطلب یہ ہو کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ آفتاب اس چشمے میں ڈوب رہا ہے کیونکہ آگے آبادی یا کوئی خشکی سامنے نہیں تھی، جیسے آپ کسی ایسے میدان میں غروب کے وقت ہوا جہاں دور تک جانب مغرب میں کوئی پہاڑ درخت، عمارت نہ ہو تو دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب زمین کے اندر گھس رہا ہے۔

ذَوِ الْقُرْنَيْنِ ۖ هَا قَوْمًا، یعنی اس سیاہ چشمے کے پاس ذوالقرنین نے ایک قوم کو پایا آیت کے اگلے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کافر تھی، اس لئے اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اختیار دیا کہ آپ چاہیں تو ان سب کو پہلے ان کے کفر کی سزا دیدیں، اور چاہیں تو ان سے احسان کا معاملہ کریں، کہ پہلے دعوت و تبلیغ اور وعظ و پند سے ان کو اسلام و ایمان قبول کرنے پر آمادہ کریں، پھر ماننے والوں کو اس کی جزاء اور نہ ماننے والوں کو سزا دیں جس کے جواب میں ذوالقرنین نے دوسری ہی صورت کو تجویز کیا، کہ اول ان کو وعظ و نصیحت سے صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کریں گے، پھر جو کفر پر قائم رہے ان کو سزا دیں گے، اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اس کو اچھا بدلہ دیں گے۔

قُلْنَا يَا ذَا الْقُرْنَيْنِ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو حق تعالیٰ نے خود خطاب کر کے یہ ارشاد فرمایا ہے، اگر ذوالقرنین کو نبی قرار دیا جائے تب تو اس میں کوئی اشکال ہی نہیں کہ بذریعہ وحی ان سے کہہ دیا گیا، اور اگر ان کی نبوت تسلیم نہ کی جائے تو پھر اس قُلْنَا اور يَا ذَا الْقُرْنَيْنِ کے خطاب کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی پیغمبر کے واسطے سے یہ خطاب ذوالقرنین کو کیا گیا ہے، جیسا کہ روایات میں حضرت خضرؑ کا ان کے ساتھ ہونا مذکور ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وحی نبوت و رسالت نہ ہو، ایسی لغوی وحی ہو، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لئے قرآن میں ذَاوَحْنٰی کے الفاظ آئے ہیں، حالانکہ اُن کے نبی یا رسول ہونے کا کوئی احتمال نہیں، مگر ابوحیان نے بحر محیط میں فرمایا کہ ذوالقرنین کو جو یہاں حکم دیا گیا ہے، وہ اس قوم کے قتل و سزا کا حکم ہے اس طرح کا کوئی حکم بغیر وحی نبوت کے نہیں دیا جاسکتا، یہ کام نہ کشف الہام ہو سکتا ہو نہ بغیر وحی نبوت کے کسی اور ذریعہ، اس لئے اس کے سوا کوئی احتمال صحیح نہیں کہ یا تو ذوالقرنین کو خود نبی مانا جائے یا پھر کوئی نبی ان کے زمانے میں موجود ہوں ان کے ذریعہ ان کو خطاب ہوتا ہو، واللہ اعلم۔

ثُمَّ اتَّبَعَ سَبَبًا ۝۹۰ حَتَّىٰ إِذَا أَبْلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْمَعُ

پھر گ ایک سامان کے پیچھے، یہاں تک کہ جب پہنچا سورج نکلنے کی جگہ پایا اس کو کہ نکلتا ہے

عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ يَجْعَلْ لَهُم مِّنْ دُونِهَا سِتْرًا ۝۹۱ كَذٰلِكَ وَا

ایک قوم پر کہ نہیں بنا دیا ہم نے اُن کے لئے آفتاب سے دوسرے کوئی حجاب، یوں ہی ہو اور

قَدْ أَحْطَيْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝۹۱

ہم اے قابو میں آچکی ہو اس کے پاس کی خبر۔

خلاصہ تفسیر

پھر (مالکِ خربہ فتح کر کے مشرقی ممالک فتح کرنے کے ارادہ سے مشرق کی طرف) ایک راہ پر ہوئے یہاں تک کہ جب طلوعِ آفتاب کے موقع پر (یعنی جانبِ مشرق میں منہ تائی آبادی پر) پہنچے تو آفتاب کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جن کے لئے ہم نے آفتاب کے ادھر کوئی آڑ نہیں رکھی تھی (یعنی اس جگہ ایک ایسی قوم آباد تھی جو دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی مکان یا خیمہ وغیرہ بنانے کے عادی نہ تھے، بلکہ شاید لباس بھی نہ پہنتے ہوں، جانوروں کی طرح کھلے میدان میں رہتے تھے) یہ قصہ اسی طرح ہے، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ (سامان وغیرہ) تھا ہم کو اس کی پوری خبر ہے (اس میں امتحانِ نبوت کے لئے ذوالقرنین کو متعلق سوال کرنے والوں کو اس پر تنبیہ ہے کہ ہم جو کچھ بتلا رہے ہیں وہ علم و خبر کی بنیاد پر ہے، عام تاریخی کہانیوں کی طرح نہیں، تاکہ نبوتِ محمدیہ کی حقانیت واضح ہو جائے)

معارف و مسائل

ذوالقرنین نے مشرق کی جانب میں جو قوم آباد پائی، اس کا یہ حال تو قرآن کریم نے ذکر فرمایا کہ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی سامان، مکان، خیمہ، لباس وغیرہ کے ذریعہ نہ کرتے تھے، لیکن ان کے مذہب و اعمال کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اور نہ یہ کہ ذوالقرنین نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ لوگ بھی کافر ہی تھے، اور ذوالقرنین نے ان کے کتھا بھی وہی معاملہ کیا جو مغربی قوم کے ساتھ اور مذکور ہو چکا ہے، مگر اس کے بیان کرنے کی یہاں اس لئے ضرورت نہیں سمجھی کہ پچھلے واقعہ پر قیاس کر کے اس کا بھی علم ہو سکتا ہو (کذا فی بحر المحیط ص ۱۷۱)

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ إِذْ أَخْبَرَهُ بِآيَاتِنَا أَنْ نَبْلُوهُ هَلْ أَتَىٰكَ مِنَ الْإِنسَانِ مَا وَعَدُوكُمْ أَوْ كَذَّبُوا

پھر لگا ایک سامان کے چٹھے، یہاں تک کہ جب پچانو پہاڑوں کے زینے، پائے اُن سے درے ایسے

قَبْرًا وَلَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ۝۹۳ قَالُوا لَئِنْ الْقُرْآنُ تَنَزَّلَ

ایک جو کہے نہیں کہ ہمیں ایک بات ، پوئے اے ذوالقترین ! یہ

يَا جُودَ وَمَا جُودٌ مُفْسِدٌ وَنَ فِي الْأَرْضِ مِنْ قَبْلُ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا

یاجوج و ماجوج دھیم اٹھاتے ہیں ملک میں سوتو کہے تو ہم معتز کر دیں تیرے

عَلَى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۖ قَالَ مَا مَكْنِي فِيهِ رَبِّي

داسنے کی یہ مسلسل اس شرط پر کہ بناوے تو ہم میں اور ان میں ایک آڑ، بولا جو مقدمہ ردیا منجھ کو میرے رب نے ۵

خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۖ (٩٥) أَنُؤْمِنُ

بہتر ہے سیدہ کرد میری خدمت میں بنادوں تمھارے اور ان کے بیچ ایکٹیو اور موٹی، لادو مجھ کے

زُبَرَ الْحَدِيدَ حَتَّى إِذَا مَسَّ أَوَى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفِخُوا

تقریباً ۱۰۰ سال تک کہ جب برابر کر دیا دونوں پیمانوں تک پہنچا رکھی کہا دھونکی

حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا ۖ قَالَ اتُّوْنِي ۖ أَفَرِحَ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٧﴾ فَمَا اسْطَاعُوا

مہاراجکے جس کہ دماغ پر کہ آگ، کہا لاؤ مہرے پاس کہ ڈالوں اس پر گینا اٹھاتا نہا، پھر نہ چڑھ سکیں

أَنْ تَخْذَ وَكَوَمَا اسْتَمَاعُوا إِلَيْهِ نَفِيًّا ۝ قَالَ هَذَا أَسْرَ حَسَّةٌ

اس کے لئے کہ اس کی ساری دنیا میں ایک مہربانی ہو میرے

مِنْ رَّيِّجٍ فَأَذَىٰ أَضْمَارٍ وَعُدٌّ رَّيٍّ جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ

آپ کا نام ہے اب اس کو ڈھاکہ اور ہے دعوہ

رَبِّهِمْ مَا

میرے رب کا سچا -

خلاصہ تفسیر

پھر (مغرب و مشرق فتح کر کے) ایک اور راہ پر ہونے (قرآن میں اس سمت کا نام نہیں لیا مگر آبادی زیادہ جانب شمال ہی ہے، اس لئے مفسرین نے اس سفر کو شمالی ممالک کا سفر قرار دیا تاریخی شہادتیں بھی اس کی مؤید ہیں) یہاں تک کہ جب ایسے مقام پر جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا پہنچے تو ان پہاڑوں سے اس طرف ایک قوم کو دیکھا جو زبان اور لخت سے ناواقف و حشیہ زندگی کی وجہ سے، کوئی بات سمجھنے کے قریب بھی نہیں پہنچتے تھے (ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف زبان سے ناواقفیت نہ تھی، کیونکہ سمجھ بوجھ ہو تو غیر زبان والے کی باتیں بھی کچھ اشارے کنائے سے سمجھ جاسکتی ہیں، بلکہ وحشیانہ زندگی نے سمجھ بوجھ سے بھی دور رکھا تھا مگر پھر شاید کسی ترجمان کے واسطے سے) انہوں نے عرض کیا اے ذوالعترین قوم یا جوج و ماجوج (جو اس گھاٹی کے اس طرف رہتے ہیں ہماری) اس سرزمین میں (کبھی کبھی آکر) بڑا فساد مچاتے ہیں (یعنی قتل و غارتگری کرتے ہیں اور ہم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں) سو کیا ہم لوگ آپ کے لئے چندہ کر کے کچھ رقم جمع کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں کہ وہ اس طرف نہ آنے پائیں) ذوالعترین نے جواب دیا کہ جس مال میں میرے رب نے مجھ کو (صرف کرنے کا) اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (اس لئے چندہ جمع کرنے اور مال دینے کی تو ضرورت نہیں، البتہ) ہاتھ پاؤں کی طاقت (یعنی قیمت مزدوری سے میری مدد کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان خوب مضبوط دیوار بنا دوں گا) اچھا تو تم لوگ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ (قیمت ہم دیں گے، ظاہر یہ ہے کہ اس آہنی دیوار بنانے کے لئے اور بھی ضرورت کی چیزیں منگوائی ہوں گی، مگر یہاں وحشی ملک میں سب سے زیادہ کم یا ب چیز لوہے کی چادریں تھیں، اس لئے ان کے ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا، سب سامان جمع ہو جانے پر دونوں پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا، یہاں تک کہ جب (اس دیوار کے رُو سے ملاتے ملاتے، ان (دونوں پہاڑوں) کے دونوں سروں کے بیچ (کے خلاء) کو (پہاڑوں کے) برابر کر دیا تو حکم دیا کہ دھونکو (دھونکنا شروع ہو گیا) یہاں تک کہ جب (دھونکے دھونکے) اس کو لال انگارہ کر دیا تو حکم دیا کہ اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ (جو پہلے سے تیار کر لیا ہو گا) کہ اس پر ڈال دوں (چنانچہ یہ پگھلا ہوا تانبا لایا گیا اور آلات کے ذریعہ اوپر سے پھوڑ دیا گیا کہ دیوار کی تمام درزوں میں گھس کر پوری دیوار ایک ذات ہو جائے، اس کا طول و عرض خدا کو معلوم ہے) تو اس کی بلندی

اور چنانہٹ کے سبب) نہ تو یا جوج ماجوج اس پر چڑھ سکتے اور نہ اس میں رغابت استحکام کے سبب کوئی نقب لگا سکتے تھے، ذوالقترنین نے (جب اس دیوار کو تیار دیکھا جس کا تیار ہونا کوئی آسان کام نہ تھا تو بطور شکر کے) کہا کہ یہ میرے رب کی ایک رحمت ہے (مجھ پر بھی کہ میرے ہاتھوں یہ کام ہو گیا اور اس قوم کے لئے بھی جن کو یا جوج ماجوج ستاتے تھے) پھر جس وقت رب کا وعدہ آئے گا (یعنی اس کی فنا کا وقت آئے گا) تو اس کو ڈھا کر (زمین کے) برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے اور اپنے وقت پر ضرور واقع ہوتا ہے) ۝

معارف ومسائل

لغات مشکلہ کا حل | بَيْنَ السَّيِّئِينَ لفظ سَدَّ عربی زبان میں ہر اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے رکاوٹ بن جائے خواہ دیوار ہو یا پہاڑ اور قدرتی ہو یا مصنوعی، یہاں سَدِّین کے دو پہاڑ مراد ہیں، جو یا جوج ماجوج کے راستہ میں رکاوٹ تھے، لیکن ان دونوں کے درمیانی درے سے وہ حملہ آور ہوتے تھے جس کو ذوالقترنین نے بند کیا۔

زُبَرَ الْحَدِیْقِ، زبر، زبرہ کی جمع ہے، جس کے معنی تختی یا چادر کے ہیں، مراد یہ ہے کہ شجرے ہیں جن کو اس درہ کو بند کرنے والی دیوار میں اینٹ پتھر کے بجائے استعمال کرنا تھا۔

الْمَصْدَنَ قَتَنِ، دو پہاڑوں کی دو جانبیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل ہوں۔

قَطْرًا، قطا کے معنی اکثر مفسرین کے نزدیک پگھلے ہوئے تانبے کے ہیں، بعض نے پگھلے ہوئے لوہے یا رانگ کو بھی قطر کہا ہے (قرطبی)

دُكَّاءَ، یعنی ریزہ ریزہ ہو کر زمین کے برابر ہو جانے والی۔

یا جوج ماجوج کون ہیں اور کہاں ہیں؟ سَدِّ ذوالقرنین کس جگہ ہے؟

ان کے متعلق اسرائیلی روایات اور تاریخی کہانیوں میں بہت بے سرو پا عجیب غریب باتیں مشہور ہیں، جن کو بعض حضرات مسخّہ بن نے بھی تاریخی حیثیت سے نقل کر دیا ہے، مگر وہ خود ان کے نزدیک بھی قابل اعتماد نہیں، قرآن کریم نے ان کا مختصر سا حال اجمالاً بیان کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقدر ضرورت تفصیلات سے بھی امت کو آگاہ کر دیا، ایسا لانے اور اعتقاد رکھنے کی چیز صرف اتنی ہی ہے جو قرآن اور احادیث صحیحہ میں آگئی ہے، اس کے زائد تاریخی اور جغرافیائی حالات جو مفسرین محدثین اور مورخین نے ذکر کئے ہیں وہ صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی، ان میں جو اہل تاریخ کے اقوال مختلف ہیں وہ قرائن اور قیاسات

اور تخمینوں پر مبنی ہیں ان کے صحیح یا غلط ہونے کا کوئی اثر قرآنی ارشادات پر نہیں پڑتا۔
میں اس جگہ پہلے وہ احادیث نقل کرتا ہوں جو اس معاملے میں محدثین کے نزدیک صحیح یا قابل
اعتماد ہیں اس کے بعد بقدر ضرورت تاریخی روایات بھی لکھی جاویں گی۔

یا جوج ماجوج کے متعلق قرآن و سنت کی تصریحات سے اتنی بات تو بلاشبہ ثابت ہو کہ یا جوج ماجوج
روایات حدیث انسانوں ہی کی قومیں ہیں، عام انسانوں کی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد
میں سے ہیں، کیونکہ قرآن کریم کی نص صریح ہے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ، یعنی طوفان
نوح علیہ السلام کے بعد جتنے انسان زمین پر باقی ہیں اور رہیں گے وہ سب حضرت نوح علیہ السلام
کی اولاد میں ہوں گے، تاریخی روایات اس پر متفق ہیں کہ وہ یافت کی اولاد میں ہیں، ایک ضعیف
حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ان کے باقی حالات کے متعلق سب سے زیادہ تفصیلی اور صحیح
حدیث حضرت نو اس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی ہے جس کو صحیح مسلم اور تمام مستند کتب حدیث میں
نقل کیا گیا اور محدثین نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، اس میں خروج دجال، نزول عیسیٰ علیہ السلام پھر
خروج یا جوج ماجوج وغیرہ کی پوری تفصیل مذکور ہے، اس پوری حدیث کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-
حضرت نو اس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک دن صبح کے وقت دجال کا تذکرہ فرمایا، اور تذکرہ فرماتے ہوئے بعض باتیں اس کے
متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے اس کا حقیر و ذلیل ہونا معلوم ہوتا تھا (مثلاً یہ کہ وہ کانا ہے،
اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں کہ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا فتنہ سخت
اور عظیم ہے (مثلاً جنت و دوزخ کا اس کے ساتھ ہونا اور دوسرے خوارقِ عادات)۔
آپ کے بیان سے رہم پر ایسا خوف طاری ہوا کہ (گویا دجال کجوروں کے جھنڈ میں ہے) یعنی
قریب ہی موجود ہے (جب ہم شام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو
آپ نے ہمارے قلبی تاثرات کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ تم نے کیا سمجھا؟ ہم نے عرض کیا کہ
آپ نے دجال کا تذکرہ فرمایا اور بعض باتیں اس کے متعلق ایسی فرمائیں جن سے اس کا حقیر
حقیر اور آسان معلوم ہوتا تھا، اور بعض باتیں ایسی فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی
بڑی قوت ہوگی اس کا فتنہ بڑا عظیم ہے، ہمیں تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارے قریب ہی
وہ کجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے، تمہارے بارے
میں جن فتنوں کا مجھے خوف ہے ان میں دجال کی بہ نسبت دوسرے فتنے زیادہ قابلِ خوف ہیں،
یعنی دجال کا فتنہ اتنا عظیم نہیں جتنا تم نے سمجھ لیا ہے، اگر میری موجودگی میں وہ نکلا تو میں
اس کا مقابلہ خود کروں گا، (تمہیں اس کے فکر کی ضرورت نہیں)، اور اگر وہ میرے بعد آیا تو

ہر شخص اپنی ہمت کے موافق اس کو مغلوب کرنے کی کوشش کرے گا، حق تعالیٰ میری غیر موجودگی میں ہر مسلمان کا ناصر اور مددگار ہے، (اس کی علامت یہ ہے کہ وہ نو جوان سخت پیچھا رہا ہوں والا ہے، اس کی ایک آنکھ اوپر کو ابھری ہوئی ہے، اور دوسری آنکھ سے کانٹا ہے، جیسا کہ دوسری روایات میں ہے) اور اگر میں (اس کی قبیح صورت میں) اس کو کسی کے ساتھ تشبیہ دے سکتا ہوں تو وہ عبدالعزیزی بن قطن ہے (یہ زمانہ جاہلیت میں بنو خزاعہ قبیلہ کا ایک بد شکل شخص تھا) اگر تم میں سے کسی مسلمان کا دجال کے ساتھ سامنا ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ سورۃ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ لے، (اس سے دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا) دجال شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا، اور ہر طرف فساد مچائے گا، اے اللہ کے بندو! اس کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ زمین میں کس قدر مدت رہے گا، آپ نے فرمایا وہ چالیس دن رہے گا، لیکن پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا، اور دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ہوگا، اور تیسرا دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا، اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ جو دن ایک سال کے برابر ہوگا، کیا ہم اس میں صرف ایک دن کی (پانچ نمازیں) پڑھیں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ وقت کا اندازہ کر کے پورے سال کی نمازیں ادا کرنا ہوں گی، پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ زمین میں کس قدر مسرت کے ساتھ سفر کریگا فرمایا اس ابر کے مانند تیز چلے گا جس کے پیچھے موافق ہوا لگی ہوتی ہو پس دجال کسی قوم کے پاس سے گزرے گا ان کو اپنے باطل عقائد کی دعوت دے گا، وہ اس پر ایمان لائیں گے تو وہ بادلوں کو حکم دے گا تو وہ برسے لگیں گے، اور زمین کو حکم دے گا تو وہ سرسبز و شاداب ہو جائیگی اور ان کے مولیٰ اس میں چریں گے، اور شام کو جب واپس آئیں گے تو ان کے کوہان پہلے کی بہ نسبت بہت اونچے ہوں گے، اور تختن دودھ سے بھرے ہوتے ہوں گے، اور ان کی کوھیں پر ہوں گی، پھر دجال کسی دوسری قوم کے پاس سے گزرے گا اور ان کو بھی اپنے کفر و اضلال کی دعوت دے گا، لیکن وہ اس کی باتوں کو رد کر دیں گے، وہ ان سے مایوس ہو کر چلا جائے گا تو یہ مسلمان لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو جائیں گے، اور ان کے پاس کچھ مال نہ رہے گا، اور دیران زمین کے پاس سے اس کا گزر ہوگا، تو وہ اس کو خطاب کرے گا کہ اپنے خزانوں کو باہر لے آ، چنانچہ زمین کے خزانے اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے، جیسا کہ شہد کی مکھیاں اپنے سردار کے پیچھے ہوتی ہیں، پھر دجال ایک آدمی کو بلائے گا، جس کا شباب پورے زوروں پر ہوگا، اس کو توار مار کر دو ٹکڑے کر دے گا، اور دونوں ٹکڑے اس قدر فاصلہ پر کر دیئے جائیں گے جس قدر تیر مار نیوٹے اور نشانہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے، پھر وہ اس کو بلائے گا، وہ (زندہ ہو کر) دجال کی طرف

اس کے ان فعل پہ ہنسنا ہوا روشن چہرے کے ساتھ آجائے گا، دریں اثنا حق تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمائیں گے، چنانچہ وہ دو رنگ دار چادر یا پتہ ہونے و شق کی مشرقی جانب کے مغیب میں بارہ پر اس طرح نازل فرمائیں گے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو فرشتوں کے پردوں پر رکھتے ہوئے ہوں گے جب اپنے سر مبارک کو نیچے کریں گے تو اس سے پانی کے قطرات جھڑیں گے (جیسے کوئی ابھی غسل کر کے آیا ہو) اور جب سر کو اوپر کریں گے تو اس وقت بھی پانی کے متفرق قطرات جو موتیوں کی طرح صاف ہوں گے گریں گے، جس کا فر کو آپ کے سانس کی ہوا پیچنے کی وہ وہیں درجائے گا، اور آپ کا سانس ان قدر دور پہنچے گا جس قدر در آپ کی نگاہ جائے گی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے، یہاں تک کہ آپ اسے بابت اللہ پر جا پکڑیں گے (یہ بستی اب بھی بیت المقدس کے قریب اسی نام سے موجود ہے) وہاں اس کو قتل کر دیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کے پاس تشریف لائیں گے، اور دجلہ و شفق کے، ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے، اور جنت میں اعلیٰ درجات کی ان کو خوش خبری سنائیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی اسی حال میں ہوں گے کہ حق تعالیٰ کا کلم ہو گا کہ میں اپنے بندوں میں ایسے لوگوں کو نکالوں گا جن کے مقابلہ کی کسی کو طاقت نہیں، آپ مسلمانوں کو جمع کر کے کوہ طور پر چلے جائیں (چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کریں گے، اور حق تعالیٰ یا جوج یا جوج کو کھول دیں گے، تو وہ سر جنت سے کے سبب ہر بلندی سے اچھلتے ہوئے دکھائی دیں گے، ان میں سے پہلے لوگ بحیرہ طبریہ سے گزریں گے، اور اس کا سبب پانی پی کر ایسا کر دیں گے کہ جب ان میں سے دوسرے لوگ اس گبیہ سے گزریں گے تو دریا کی جگہ کو خشک دیکھ کر کہیں گے کہ کبھی یہاں پانی ہو گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کو کوہ طور پر پناہ لیں گے، اور دوسرے مسلمان اپنے قلعوں اور محفوظ جگہوں میں پناہ لیں گے، کھانے پینے کا سامان ساتھ ہو گا، مگر وہ کہہ رہے ہیں کہ تو ایک بیل کے سر کو سو دینار سے بہتر سمجھا جائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے مسلمان اپنی تکلیف دفع ہونے کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کریں گے (حق تعالیٰ دعا قبول فرمائیں گے) اور ان پر وہ بانی صورت میں ایک بیماری بھیجیں گے، اور یا جوج یا جوج تھوڑی دیر میں سب کے سب مرجائیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کوہ طور سے نیچے آئیں گے تو دیکھیں گے کہ زمین میں ایک ہاشت جگہ بھی ان کی لاشوں سے خالی نہیں (اور لاشوں کے مٹانے کی وجہ سے) سخت تعفن پھیلا ہو گا، (اس کیفیت کو دیکھ کر دوبارہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی حق تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ یہ مصیبت بھی دفع ہو، حق تعالیٰ قبول فرمائیں گے، اور بہت بھاری بھر کم پرندوں کو بھیجیں گے، جن کی گردنیں اونٹ

کی گردن کے مانند ہوں گی، وہ ان کی لاشوں کو اٹھا کر جہاں اللہ کی مرضی ہوگی وہاں پھینک دیے گئے۔
 بعض روایات میں ہے کہ دریا میں ڈالیں گے، پھر حق تعالیٰ بارش برسانے لگے، کوئی شہر اور جنگل ایسا
 نہ ہوگا جہاں بارش نہ ہوتی ہوگی، ساری زمین ڈھل جائے گی، اور شیشہ کے مانند صاف ہو جائیگی
 پھر حق تعالیٰ زمین کو حکم فرمائیں گے کہ اپنے پیٹ سے پھولوں اور پھولوں کو اگادے، اور زمینوں
 اپنی برکات کو ظاہر کر دے، چنانچہ ایسا ہی ہوگا اور اس قدر برکت ظاہر ہوگی کہ ایک انار
 ایک جماعت کے کھانے کے لئے کفایت کرے گا، اور لگے اس کے چھلکے کی چھتری بنا کر سایہ تسل
 کریں گے، اور دودھ میں اس قدر برکت ہوگی کہ ایک دغنی کا دودھ ایک بہت بڑی بشت
 کے لئے کافی ہوگا، اور ایک گائے کا دودھ ایک قبیلہ کے سب لوگوں کو کافی ہو جائے گا،
 اور ایک بکری کا دودھ پوری برادری کو کافی ہو جائے گا، (یہ غیر معمولی برکات اور امن و
 امان کا زمانہ چالیس سال رہنے کے بعد جب قیامت کا وقت آجائے گا تو) اس وقت
 حق تعالیٰ ایک خوش گوار جزا چلائیں گے، جس کی وجہ سے سب مسلمانوں کی ابدوں کے نیچے ایک
 خاص بیماری ظاہر ہو جائے گی، اور سب کے سب وفات پا جائیں گے، اور باقی صرف مشرے
 و کافر رہ جائیں گے، جو زمین پر ٹھام کھائے اور ام کاری جانوروں کی طرح کریں گے، ایسے ہی لوگوں
 پر قیامت آئے گی۔

اور حضرت عبدالرحمن بن یزید کی روایت میں یاجوج ماجوج کے قصہ کی زیادہ تفصیل
 آئی ہے، وہ یہ کہ بحیرہ طبریہ سے گزرنیکے بعد یاجوج ماجوج بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک
 پہاڑ جبل الفریق پہنچ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو سب کو قتل کر دیا ہے، اب
 اب ہم آسمان والوں کا خاتمہ کریں، چنانچہ وہ اپنے تیرے آسمان کی طرف پھینکیں گے، اور وہ تیرے
 حق تعالیٰ کے حکم سے خون آلود ہو کر ان کی طرف واپس آئیں گے، تاکہ وہ احمق یہ سمجھ کر خوش
 ہوں کہ آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیا،

اور دجال کے قصہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ
 بھی ہے کہ دجال مدینہ منورہ سے دور رہے گا، اور مدینہ کے راستوں پر بھی اس کا آنا ممکن نہ ہوگا
 تو وہ مدینہ کے قریب ایک شہر زمین کی طرف آئے گا، اس وقت ایک آدمی دجال کے پاس
 آئے گا، اور وہ آدمی اس وقت کے بہترین لوگوں میں سے ہوگا، اور اس کو خطاب کر کے کہے گا
 کہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
 خبر دی تھی (یہ سن کر) دجال کہنے لگے گا، لوگو! مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اس آدمی کو قتل کر دوں
 اور پھر اسے زندہ کر دوں تو میرے لئے اجر ہے یا نہیں؟ میں شک کر دوں گا، وہ جواب دیں گے، نہیں

چنانچہ وہ اس آدمی کو قتل کرے گا اور پھر اس کو زندہ کر دے گا۔ تو وہ دجال کو کہے گا کہ اب مجھے تیرے دجال ہونے کا پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا ہے۔ دجال اس کو دوبارہ قتل کرنے کا ارادہ کرے گا، لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکے گا۔ (صحیح مسلم)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی ذریت میں سے بعث الناس (یعنی جہنمی لوگ) اٹھائیے، وہ عرض کریں گے، اے رب وہ کون ہیں تو حکم ہوگا کہ ہر ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنمی ہیں صرف ایک جنتی ہے، صحابہ کرام سہم گئے اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ہم میں سے وہ ایک جنتی کونسا ہوگا، تو آپ نے فرمایا غم نہ کرو، کیونکہ یہ نو سو ننانوے جہنمی تم میں سے ایک اور یا جوج ماجوج میں سے ایک ہزار کی نسبت سے ہوں گے اور استدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے دس حصے کئے، ان میں سے نو حصے یا جوج ماجوج کے ہیں اور باقی ایک حصہ میں باقی ساری دنیا کے انسان ہیں (رد المحتار)

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان روایات کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ یا جوج ماجوج کی تعداد ساری انسانی آبادی سے بجز اذیہ ہے۔

مسند احمد اور ابوداؤد میں باسناد صحیح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد چالیس سال زمین پر رہیں گے، مسلم کی ایک روایت میں جو سات سال کا عرصہ بتایا ہے حافظ نے فتح الباری میں اس کو مؤول یا مزجوج قرار دے کر چالیس سال ہی کا عرصہ صحیح قرار دیا ہے، اور حسب تصریح احادیث یہ پورا عرصہ امن و امان اور برکات کے ظہور کا ہوگا، بعض روایات آپس میں قطعاً نہ رہے گا، کبھی دو آدمیوں میں کوئی جھگڑا یا عداوت نہیں ہوگی (روایت مسلم و احمد)

بخاری نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کا حج و عمرہ شروع یا جوج ماجوج کے بعد بھی جاری رہے گا (تفسیر ظہری)۔ بخاری و مسلم نے حضرت زینب بنت جحش ام المؤمنینؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک روز) نیند سے ایسی حالت میں بیدار ہوئے کہ چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا، اور آپ کی زبان مبارک پر یہ جملے تھے،

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، خرابی ہو
عرب کی شمشیر سے ہو قریب آچکا ہو،

لا الہ الا اللہ وین نصرب
من شر قد اختلف فتم الیوم

آج کے دن یا جوج و ما جوج کی روم یعنی
سڈ میں اتنا سوراخ کھل گیا ہے، اور

من ردم یا جوج و ما جوج مثل
هذه وحلق تسعين

آپ نے عقد تسعین یعنی انگوٹھے اور انگشت شہادت کو ملا کر حلق بنا کر دکھلایا۔
ام المؤمنین منبرماتی ہیں کہ اس ارشاد پر ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہم ایسے
حال میں ہلاک ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے اندر صالحین موجود ہوں؟ آپ نے فرمایا ہاں ہلاک ہو سکتے
ہیں، جبکہ خبیث (یعنی شر) کی کثرت ہو جائے (مثلاً فی التبعین عن ابی ہریرۃؓ، کذا فی البدایہ
والنہایہ لابن کثیر) اور ستر یا جوج میں بہت رسلہ سوراخ ہو جانا اپنے حقیقی معنی بھی ہو سکتا ہے
اور مجازی طور پر ستر و التبعین کے کمزور ہو جانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے (ابن کثیر، البوحیان،
مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یا جوج و ما جوج ہر روز ستر و التبعین کو کھودتے رہتے ہیں، یہاں
تک کہ اس آہنی دیوار کے آخری حصہ تک اتنے قریب پہنچ جاتے ہیں کہ دوسری طرف کی
روشنی نظر آنے لگے، مگر یہ کہہ کر ٹوٹ جاتے ہیں کہ باقی کو کھود کر پار کر دیں گے، مگر اللہ تعالیٰ
اس کو پھر ویسا ہی مضبوط درست کر دیتے ہیں، اور اگلے روز پھر نئی محنت اس کے کھودنے
میں کرتے ہیں، یہ سلسلہ کھودنے میں محنت کا اور پھر بجانب اللہ اس کی درستی کا اس وقت تک
چلتا رہے گا جس وقت تک یا جوج و ما جوج کو بند رکھنے کا ارادہ ہے، اور جب اللہ تعالیٰ
ان کو کھولنے کا ارادہ فرمائیں گے تو اس روز جب محنت کر کے آخری حد میں پہنچا دیں گے
اس دن یوں کہیں گے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم کل اس کو پار کر لیں گے (اللہ کے نام اور
اس کی مشیت پر موقوف رکھنے سے آج تو فیق ہو جاتے گی) تو اگلے روز دیوار کا باقی ماندہ
حصہ اپنی حالت پر ملے گا اور وہ اس کو توڑ کر پار کر لیں گے۔

ترمذی نے اس روایت کو بسند ابی حواء عن قتادہ عن ابی رافع عن ابی ہریرہؓ نقل
کر کے فرمایا: غریب لا یصح فیہ الا من ہذا الوجه، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس روایت
کو نقل کر کے فرمایا:۔

اسنادہ جید قوی ولکن متنبہ | اسناد اس کی جید اور قوی ہے، لیکن
فی رفعہ نکاسۃ | حضرت ابو ہریرہؓ سے اس کو مرفوع کرنا

یا اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں ایک نکالت واجنبیت
معلوم ہوتی ہے۔

اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ بات صحیح مان لیجائے

کہ یہ حدیث شریفہ نہیں بلکہ کعب اخبار کی روایت ہے تب تو بات صاف ہو گئی کہ یہ کوئی قابل اعتماد چیز نہیں اور اگر اس روایت کو ذہم راوی سے محفوظ قرار دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد قرار دیا جائے تو پھر مطلب اس کا یہ ہو گا کہ یا جوج ماجوج کا یہ سنہ کو کھودنے کا اس وقت شروع ہو گا جبکہ ان کے خروج کا وقت قریب آجائے گا، اور قرآنی ارشاد کہ اس دیوار میں نقب نہیں لگائی جاسکتی، یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ذوالقتر نہیں نے اس کو تعمیر کیا تھا، اس لیے کوئی تعارض نہ رہا، نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نقب سے مراد دیوار کا وہ رخہ اور سوراخ ہے جو آریار ہو جائے، اور اس روایت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ سوراخ آریار نہیں ہوتا (بایہ ص ۱۲۱) حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس حدیث کو عبد بن حمید اور ابن حبان کے حوالے سے بھی نقل کر کے کہا ہے کہ ان سب کی روایت حضرت قتادہ سے ہے، اور ان میں سے بعض کی سند کے رجال صحیح بخاری کے رجال ہیں، اور حدیث کے مرفوع قرار دینے پر بھی کوئی شبہ نہیں کیا، اور بحوالہ ابن عربی بیان کیا کہ اس حدیث میں تین آیات الہیہ یعنی جہیزات ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہنوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا، کہ سنہ کو کھودنے کا کام رات دن مسلسل جاری رکھیں، ورنہ اتنی بڑی قوم کے لئے کیا مشکل تھا کہ دن اور رات کی ڈیوٹیاں الگ الگ معسر کر لیتے، دوسرے ان کے ذہنوں کو اس طرف سے پیچہ دیا کہ اس سنہ کے اوپر چڑھنے کی کوشش کریں، اس کے لئے آلات سے مردیں حالانکہ وہ سب بن منبہ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صاحب زراعت و صنعت ہیں، ہر طرح کے آلات رکھتے ہیں، ان کی زمین میں درخت بھی مختلف قسم کے ہیں، کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اوپر چڑھنے کے ذرائع و مسائل پیدا کر لیتے، تیسرے یہ کہ ساری مدت میں ان کے قلوب میں یہ بات نہ آئے کہ انشاء اللہ کہہ لیں، صرف اس وقت یہ کلمہ ان کی زبان پر جاری ہو گا، جب ان کے نکلنے کا وقت منسخر آجائے گا۔

ابن عربی نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج ماجوج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے وجود اور اس کی مشیت و ارادے کو مانستے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہو کہ بغیر کسی عقیدے کے ہی ان کی زبان پر اللہ تعالیٰ یکلمہ جاری کر دے، اور اس کی برکت سے ان کا کام بن جائے، (اشراط الساعۃ للسیہ محمد، ص ۱۵۴) مگر ظاہر یہی ہے کہ ان کے پاس بھی انبیاء علیہم السلام کی دعوت پہنچ چکی ہے، ورنہ نفس شرانی کے مطابق ان کو جہنم کا عذاب نہ پہنچنا چاہئے، وَمَنْ كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا، معلوم ہوا کہ دعوت ایمان ان کو بھی پہنچی ہے، مگر یہ لوگ کفر پر جھکے رہے، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اللہ کے وجود

اور اس کے ارادہ و مشیت کے قائل ہوں گے، اگرچہ صرف اتنا عقیدہ ایمان کے لئے کافی نہیں جب تک رسالت اور آخرت پر ایمان نہ ہو، بہر حال الشاء اللہ کا کلمہ کہنا باوجود کفر کے بھی بعید نہیں۔

روایات حدیث سے مذکور الصدر احادیث میں یا جوج یا جوج کے متعلق جو باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) یا جوج یا جوج عام انسانوں کی طرح انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، پھر تیسری و چوتھی ان کو یافت ابن نوح علیہ السلام کی اولاد قرار دیتے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یافت ابن نوح کی اولاد نوح علیہ السلام کے زمانے سے ذوالقرنین کے زمانے تک دور دور تک مختلف قبائل اور مختلف قوموں اور مختلف آبادیوں میں پھیل چکی تھی، یا جوج یا جوج جن قوموں کا نام ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ سب سب ذوالقرنین کے پیچھے ہی تصور ہو گئے ہوں، ان کے کچھ قبائل اور قومیں سب ذوالقرنین کے اس طرف بھی ہوں گے، البتہ ان میں سے جو قتل و غارت گری کرنے والے وحشی لوگ تھے، وہ سب ذوالقرنین کے ذریعہ روک دیئے گئے، پھر چوتھی و چوتھی نام طور سے ان کو ترک اور مغول یا منگولین کہتے ہیں، مگر ان میں سے یا جوج یا جوج نام صرف ان وحشی غیر متقدم و متخلف لوگوں کا ہے جو تمدن سے آشنا نہیں ہوئے، انہی کی برادری کے مغول اور ترک یا منگولین جو تمدن ہو گئے وہ اس نام خارج ہیں۔

(۲) یا جوج یا جوج کی تعداد پوری دنیا کے انسانوں کی تعداد سے بدرجہا زائد کم از کم ایک اور دس کی نسبت سے ہے (حدیث نمبر ۲)

(۳) یا جوج یا جوج کی جو قومیں اور قبائل سب ذوالقرنین کے ذریعہ اس طرف آنے سے روک دیئے گئے ہیں وہ قیامت کے بالکل قریب تک اسی طرح تصور رہیں گے، ان کے نکلنے کا وقت مقرر ظہور مہدی علیہ السلام پھر خروج دجال کے بعد وہ ہوگا جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کر چکیں گے۔ (حدیث نمبر ۱)

(۴) یا جوج یا جوج کے کھلنے کے وقت سب ذوالقرنین منہم ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی، (آیت قرآن) اس وقت یہ یا جوج یا جوج کی بے پناہ قومیں بیک وقت پہاڑوں کی بلندیوں سے اترتی ہوئی سرعت رفتار کے سبب ایسی علوم ہوں گی کہ گویا یہ پھسل پھسل کر گر رہے ہیں، اور یہ لا تعداد وحشی انسان عام انسانی آبادی اور پوری زمین پر ٹوٹ پڑیں گے، اور ان کے قتل و غارت گری کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا، اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی باہر آئیں اپنے ساتھی مسلمانوں کو لے کر کوہ طور پر پناہ لیں گے، اور عام دنیا کی آبادیوں میں جہاں کچھ قلعے پختہ مقامات ہیں وہ ان میں بند ہو کر اپنی جانیں بچائیں گے، کھانے پینے کا سامان ختم ہونے کے بعد

نہ روایات زندگی اجتماعی گراں ہو جاتی گی، باقی انسانی آبادی کو یہ وحشی قومیں ختم کر ڈالیں گی، ان کے دریاؤں کو چاٹ جائیں گی (حدیث نمبر ۱)

(۱۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوران کے رفتہ رفتہ کی دھار سے پھر یہ ٹڈی دل قسم کی بے شمار قومیں بیک وقت ہلاک کر دی جائیں گی، ان کی لاشوں سے ساری زمین پٹ جاتے گی، ان کی بدبو کی وجہ سے زمین پر بسنا مشکل ہو جائے گا (حدیث نمبر ۱)

(۱۶) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوران کے رفتہ رفتہ ہی کی دھار سے ان کی لاشیں دریا بھر دیا غائب کر دی جائے گی اور عالمگیر بارش کے ذریعہ پوری زمین کو دھوکریاں کھا کر دنیا بیکار و بے آب (۱۷) اس کے بعد تقریباً چالیس سال امن و امان کا دور دورہ ہوگا، زمین اپنی برکات سے آغوش دے گی، کوئی مجلس محتاج نہ رہے گا کوئی کسی کو نہ سستاے گا، سکون و اطمینان آرام و راحت عام ہوگی (حدیث نمبر ۳)

(۱۸) اس امن و امان کے زمانے میں بیت اللہ کا حج و عمرہ جاری رہے گا (حدیث نمبر ۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور روضۃ اقدس میں دفن روایات حدیث سے ثابت ہے، اس کی بھی یہی صورت ہوگی کہ وہ حج یا عمرہ کے لئے حجاز کا سفر کریں گے رکما رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ، الترمذی، اس کے بعد مدینہ منورہ میں وفات ہوگی، روضۃ اقدس میں دفن کیا جائے گا۔

(۱۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں بذریعہ وحی خواب آپ کو دکھلایا گیا کہ ستر ذوالقترین میں ایک سوراخ ہو گیا ہے جس کو اپنے عرب کے لئے شہرِ فتنہ کی علامت قرار دی، اس دیوار میں سوراخ ہو جانے کو بعض محدثین نے اپنی حقیقت پر معمول کیا ہے، اور بعض نے اس کا مطلب بطور استعارہ اور مجاز کے یہ قرار دیا ہے کہ اب یہ ستر ذوالقترین کمزور ہو چکی ہے، خروج یا بروج کا وقت قریب آ گیا ہے اور اس کے آثار عرب قوم کا تنزل و انحطاط کے رنگ میں ظاہر ہوں گے۔ واللہ اعلم

(۲۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کا قیام زمین پر چالیس سال ہوگا، (حدیث نمبر ۲) ان سے پہلے حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ بھی چالیس سال رہے گا جس میں کچھ حصہ دونوں کے اجتماع و اشتراک کا ہوگا، سید شریعت برزنجی نے اپنی کتاب شرائط الساعۃ صفحہ ۱۴۵ میں لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا قیام قتل و جال اور امن و امان کے بعد چالیس سال ہوگا، اور مجموعہ قیام پینتالیس سال ہوگا، اور صفحہ ۱۱۲ میں ہے کہ مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سال سے اوپر کچھ سال پہلے ظاہر ہوں گے، اور ان کا مجموعہ زمانہ چالیس سال ہوگا، اس طرح پانچ یا سات سال تک دونوں حضرات کا اجتماع رہے گا، اور ان دونوں مانوں

کی یہ خصوصیت ہوگی کہ پوری زمین پر عدل و انصاف کی حکومت ہوگی، زمین اپنی برکات اور خزانے اگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، لوگوں کے آپس میں بغض و عداوت قطعاً نہ رہے گی، ہاں حضرت مہدی علیہ السلام کے آخری زمانے میں دجال اکبر کا فتنہ عظیم سوائے مکہ اور مدینہ اور بیت المقدس اور کچھ طور کے سوائے عالم پر چھا جائے گا، اور یہ فتنہ دنیا کے تمام فتنوں سے عظیم تر ہوگا، دجال کا قیام اور فساد صرف چالیس دن رہوگا، مگر ان چالیس دنوں میں سے پہلا دن ایک سال کا، دوسرا دن ایک مہینہ کا، تیسرا دن ایک ہفتہ کا ہوگا، باقی دن عام دنوں کی طرح کے ہوں گے جس کی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقتاً یہ دن اتنے طویل کر دیئے جائیں، کیونکہ اس آخر زمانے میں تقریباً سالے واقعات ہی خرقِ عادت اور معجزہ کے ہوں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن رات تو اپنے معمول کے مطابق ہوتے رہیں مگر دجال کا بڑا ساحر ہونا حدیث سے ثابت ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کے سحر کے اثر سے ہم مخلوق کی نظروں پر یہ دن رات کا تغیر و انقلاب ظاہر نہ ہو، وہ اس کو ایک ہی دن دیکھتے اور سمجھتے رہیں جیسا کہ اندر عام دنوں کے مطابق اندازہ لگا کر نمازیں پڑھنے کا حکم آیا ہے، اس سے بھی تاخیر اس کی ہوتی ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو دن رات بدل رہے ہوں گے، مگر لوگوں کے احساس میں یہ بدلنا نہیں ہوگا، اس لئے اس ایک سال کے دن میں تین سو ساٹھ دنوں کی نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر دن حقیقتاً ایک ہی دن ہوتا تو قواعد شرعیہ کی روش سے اس میں صرف ایک ہی دن کی پانچ نمازیں فرض ہوتیں، خلاصہ یہ ہے کہ دجال کا کل زمانہ اس طرح کے چالیس دن کا ہوگا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر دجال کو قتل کر کے اس فتنہ کو ختم کر دیں گے، مگر اس کے متصل ہی یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا جو پوری دنیا میں فساد اور قتل و غارتگری کریں گے، مگر ان کا زمانہ بھی چند ایام ہی ہوں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ سب بیک وقت ہلاک ہو جائیں گے، غرض حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانے کے آخر میں اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے شروع میں دو فتنے دجال اور یاجوج ماجوج کے ہوں گے جو تمام زمین کے لوگوں کو تہہ و بالا کر دیں گے، ان ایام محدودہ سے پہلے اور بعد میں پوری دنیا کے اندر عدل و انصاف اور امن و سکون اور برکات و ثمرات کا دور دورہ ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام کے سوا کوئی نکل و مذہب زمین پر نہ رہوگا، زمین اپنے خزانے و فتنے اگل دے گی، کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا، درندے اور زہریلے جانور بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں گے، یاجوج ماجوج اور سد ذوالعثرین کے متعلق یہ معلومات تو وہ ہیں جو قرآن اور احادیث نبویہ نے اُمت کو بتلا دیئے ہیں، اسی پر عقیدہ رکھنا ضروری اور مخالفت ناجائز ہے،

باقی رہی اس کی جغرافیائی بحث کہ سدر ذوالعترین کس جگہ واقع ہے، اور قوم یاجوج ماجوج کونسی قوم ہے، اور اس وقت کہاں کہاں بستی ہے، اگرچہ اس پر نہ کوئی اسلامی عقیدہ موقوف ہے، اور نہ قرآن کی کسی آیت کا مطلب سمجھنا اس پر موقوف ہے، لیکن مخالفین کی ہفوات کے جواب اور مزید بصیرت کے لئے علماء امت نے اس سے بحث فرمائی ہے، اس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

قرطبی نے اپنی تفسیر میں بحوالہ سدری نقل کیا ہے کہ یاجوج ماجوج کے بائیس قبیلوں میں سے اکیس قبیلوں کو سدر ذوالقرنین سے بند کر دیا گیا، ان کا ایک قبیلہ سدر ذوالعترین کے اندر اس طرف رہ گیا، وہ ترک ہیں، اس کے بعد قرطبی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک کے متعلق جو باتیں بتلائی ہیں وہ یاجوج ماجوج سے ملتی ہوئی ہیں، اور آخر زمانے میں مسلمانوں کی ان سے جنگ ہونا صحیح مسلم کی حدیث میں ہے، پھر فرمایا کہ اس زمانے میں ترک قوم کی بڑی بھاری تعداد مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے نکلی ہوئی ہے، جن کی صحیح اہداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، وہی مسلمانوں کو ان کے شر سے بچا سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی یاجوج ماجوج ہیں یا کم از کم ان کا امتداد ہے قرطبی، ص ۵۸ ج ۱۱ (قرطبی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری ہے جس میں فتنہ تاتار ظاہر ہوا، اور اسلامی خلافت کو تباہ و برباد کیا، ان کا عظیم فتنہ تاریخ اسلام

اور ستر و القتر میں اور ان کے محل و مقام کے متعلق جغرافیائی تحقیق اس طرح فرمائی ہے :-
 ”ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جو
 قنجاق اور چکر کے کہلاتے ہیں، اور مشرق کی جانب یاجوج ماجوج کی آبادیاں ہیں اور
 ان دونوں کے درمیان کوہ قافٹ سے فاصلہ ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں
 ہو چکا ہے، کہ وہ بحر محیط سے شروع ہوتا ہے، جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہو
 اور اس کے ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک پہنچا گیا ہے، اور پھر بحر محیط سے
 جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھٹتا ہوا پانچویں اقلیم کے
 نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، یہاں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے، یعنی
 ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے، اور یہاں پہنچ کر جنوب کے
 شمال مغرب کو ہوتا ہوا گیا ہے، اور اسی سلسلہ کوہ کے درمیان ستر سکندری
 واقع ہے، اور ساتویں اقلیم کے نویں حصہ کے وسط ہی میں وہ ستر سکندری ہے،
 جس کا ہم ابھی ذکر کر آئے ہیں اور جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے :-
 اور عبداللہ بن خرداذبہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واقع بالشد خلیفہ عباسی

مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بنائی ہیں، ان میں سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوار چین ہے، جس کا طول ابوحیان اندلسی دربار ایران کے شاہی مورخ نے بارہ سو میل بتلایا ہے، اور یہ کہ اس کا بانی فغفور بادشاہ چین ہے، اور اس کی بنا کی تاریخ مبسوط آدم علیہ السلام سے تین ہزار چار سو ساٹھ سال بعد بتلائی، اور یہ کہ اس دیوار چین کو مغل لوگ انگور وۃ اور ترک لوگ نورقورق کہتے ہیں، اور فرمایا کہ اسی طرح کی اور بھی متعدد دیواریں ستریں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں۔ ہمارے خواجہ تاس مولانا حفظ الرحمن سہواری نے اپنی کتاب قصص العتیران میں حضرت شیخ کے اس بیان کی تاریخی توثیق بڑی تفصیل و تحقیق سے لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: یاجوج ماجوج کی تاخت و تاراج اور شر و فساد کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم و ستم کا شکار تھے تو دوسری جانب بہت اور چین کے باشندے بھی ہر وقت ان کی زد میں تھے۔ انہی یاجوج ماجوج کے شر و فساد سے بچنے کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر متعدد دستہ تعمیر کی گئی، ان میں سب سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوار چین ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

دوسری ستر وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے، اور اس کے محل وقوع کا نام دربنڈ ہے، یہ ستر مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی، اور شاہ روم کے خاص ہمیشین سیلا برجر جرمی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے، اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کھانپو نے بھی اپنے سفر نامہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس جگہ سے گزرا ہے، وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی ستر موصوف کے اس راستہ پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان ہے (از تفسیر حواہ القرآن المفسر ص ۱۹۸) تیسری ستر روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے، یہ بھی دربنڈ اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے، یا قوت حموی نے معجم البلدان میں ادریسی نے جغرافیہ میں اور بتانی نے دائرة المعارف میں اس کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

”داغستان میں دربنڈ ایک روسی شہر ہے، یہ شہر بحر خزر (کاسپین) کے غری کنارے پر واقع ہے، اس کا عرض البلد ۳۳-۳۴ شمالاً اور طول البلد ۸۵-۸۶ شرقاً ہے اور اس کو دربنڈا نو شیرداں بھی کہتے ہیں، اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے۔“

چوتھی ستر اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے بہت بلند جھٹوں میں ہے، جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درہ دریاں کے نام سے مشہور ہے، اس جگہ یہ چوتھی ستر

جہ قفقاز یا جبل قاف یا کوہ قاف کی سید کہلاتی ہے، بستانی نے اس کے متعلق لکھا ہے:
 ”اور اسی کے (یعنی سید باب الابواب کے) قریب ایک اور سید ہے جو عربی جاب
 بڑھتی چلی گئی ہے، غالباً اس کو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر
 بنایا ہو گا، کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہو سکا، بعض نے اس کی
 نسبت سکندر کی جانب کر دی ہے، اور بعض نے کسریٰ و نوشیرواں کی طرف
 اور یا قوت کہتے ہیں کہ یہ تانبہ پگھلا کر اس سے تعمیر کی گئی ہے، (دامرة المعارف
 جلد ۱، ص ۱۶۵، معجم البلدان جلد ۱۸، ص ۲۹)“

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں ہیں، اور تعترینا ایک ہی ضرورت کے لئے بنائی
 گئی ہیں، اس لئے ان میں سے سید ذوالعترین کو منسب ہے، اس کے متعلق کرنے میں اشکال
 پیش آئے ہیں، اور بڑا اختلاط ان آخری دوستوں کے معاملہ میں پیش آیا، کیونکہ دونوں مقامات
 کا نام بھی درجند ہے اور دونوں جگہ سید بھی موجود ہے، مذکورہ صدر چار سیدوں میں دیوار چین
 جو سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ قدیم ہے، اس کی تعلق تو سید ذوالعترین ہونے کا کوئی قائل
 نہیں اور وہ بجائے شمال کے مشرق اقصیٰ میں ہے، اور قرآن کریم کے اشارہ سے اس کا شمال
 میں ہونا ظاہر ہے۔

اب معاملہ باقی تین دیواروں کا رہ گیا جو شمال ہی میں ہیں، ان میں سے تمام طور پر مورخین
 مستعدی، اقصیٰ، سموی وغیرہ اس دیوار کو سید ذوالعترین بتاتے ہیں جو داغستان یا
 کاکیشیا علاقہ باب الابواب کے درجند میں بحر خزر پر واقع ہے، بخارا و ترمذ کے درجند اور
 اس کی دیوار کو جن مورخین نے سید ذوالعترین کہا ہے وہ غالباً لفظ درجند کے اشتراک کی وجہ
 سے ان کو اختلاط ہوا ہے، اب تقریباً اس کا محل وقوع متعین ہو گیا کہ علاقہ داغستان کاکیشیا
 کے درجند باب الابواب میں یا اس سے بھی اوپر جبل قفقاز یا کوہ قاف کی بلندی پر ہے، اور
 ان دونوں جگہوں پر سید کا ہونا مورخین کے نزدیک ثابت ہے۔

ان دونوں میں سے حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ قدس سرہ نے عقیدۃ الاسلام
 میں کوہ قاف قفقاز کی سید کو ترجیح دی ہے کہ یہ سید ذوالعترین کی بنائی ہوئی ہے (عقیدۃ الاسلام ص ۲۹)
 سید ذوالعترین اس وقت تک | آجکل تائیخ و جغرافیہ کے ماہرین اہل یورپ اس وقت ان شمالی
 موجود ہیں اور قیامت تک رہیں گی | دیواروں میں سے کسی کا موجود ہونا تسلیم نہیں کرتے، اور نہ یہ
 یادہ ٹوٹ چکی ہے | تسلیم کرتے ہیں کہ اب بھی یا جوج ماجوج کا راستہ بند ہے،
 اس بنا پر بعض اہل اسلام مورخین نے بھی یہ کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے کہ یا جوج ماجوج

جن کے خروج کا قرآن و حدیث میں ذکر ہوا وہ ہو چکا ہے، بعض نے چھٹی صدی ہجری میں ملوفان بن کراٹھنے والی قوم تاتاری کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، بعض نے اس زمانے میں دنیا پر غالب آ جانے والی قوموں روس اور چین اور اہل یورپ کو یا جوج ماجوج کہہ کر اس معاملہ کو ختم کر دیا ہے، مگر بیسیا کہ اوپر ہوالہ روح المعانی بیان ہو چکا ہے کہ یہ سراسر غلط ہے، احادیث صحیحہ کے انکار کے بغیر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس خروج یا جوج ماجوج کو قرآن کریم نے بطور علامت قیامت بیان کیا، اور جس کے متعلق صحیح مسلم کی حدیث نو اس بن سمعان وغیرہ میں اس کی تصریح ہے کہ یہ واقعہ خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام اور قتل و قبال کے بعد پیش آئے گا وہ واقعہ ہو چکا، کیونکہ خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اب تک نہیں ہوا۔

البتہ یہ بات بھی قرآن و سنت کی کسی نص صریح کے خلاف نہیں ہے کہ سید ذوالقرنین اس وقت ٹوٹ چکی ہو، اور یا جوج ماجوج کی بعض قومیں اس طرف آچکی ہوں، بشرطیکہ اس کو تسلیم کیا جائے کہ ان کا آخری اور بڑا ہلہ جو پوری انسانی آبادی کو تباہ کرنے والا ثابت ہو گا وہ ابھی نہیں ہوا، بلکہ قیامت کی ان بڑی علامات کے بعد ہو گا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔

حضرت الاستاذ جتہ الاسلام علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اس معاملہ میں یہ ہے کہ اہل یورپ کا یہ کہنا تو کوئی دزن نہیں رکھتا کہ ہم نے ساری دنیا چھان ماری ہے، میں اس دیوار کا پتہ نہیں لگا، کیونکہ اول تو خود انہی لوگوں کی یہ تصریحات موجود ہیں کہ سیاست اور تحقیق کے انتہائی معراج پر پہنچنے کے باوجود آج بھی بہت سے جنگل اور دریا اور جزیرے ایسے باقی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہو سکا، دوسرے یہ بھی احتمال بعید نہیں کہ اب وہ دیوار موجود ہونے کے باوجود پہاڑوں کے گرنے اور باہم مل جانے کے سبب ایک پہاڑ ہی کی صورت اختیار کر چکی ہو، لیکن کوئی نص قطعی اس کے بھی منافی نہیں کہ قیامت سے پہلے یہ سہ ٹوٹ جائے، یا کسی دور دراز کے طویل راستہ سے یا جوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آسکیں۔

اس سید ذوالقرنین کے تا قیامت باقی رہنے پر بڑا استدلال تو قرآن کریم کے اس لفظ سے کیا جاتا ہے کہ **وَإِذَا الْجَحْتُمْ وَعْدَ رَبِّي جَعَلَهُ كَنَافَةٍ**، یعنی ذوالقرنین کا یہ قول کہ جب میرے رب کا وعدہ آجہو پئے گا (یعنی خروج یا جوج ماجوج کا وقت آجائے گا) تو اللہ تعالیٰ اس آہنی دیوار کو ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دیں گے، اس آیت میں **وَعْدَ رَبِّي** کا مفہوم ان حضرات نے قیامت کو قرار دیا ہے، حالانکہ الفاظ قرآن اس بارے میں قطعی نہیں، کیونکہ **وَعْدَ رَبِّي** کا صریح

مفہوم تو یہ ہے کہ یا جوج کا راستہ روکنے کا جو انتظام ذوالعترین نے کیا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمیشہ اسی طرح رہے، جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے کہ ان کا راستہ کھل جائے تو یہ دیوار منہدم و مسمار ہو جائے گی، اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالکل قیامت کے متصل ہو، چنانچہ تمام حضرات مفسرین و محدثین کے مفہوم میں دونوں احتمال ذکر کئے ہیں، تفسیر تخریص میں ہے وَالْوَعْدُ یَحْتَسِبُ اَنْ یَّرَادَ بِہِ یَوْمَ الْقِیَمَةِ اَنْ یَّرَادَ بِہِ وَقْتُ خُرُوجِ یَا جُوجَ مَّا جُوجَ۔

اس کا تحقیق یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دیوار منہدم ہو کر راستہ ابھی کھل گیا ہو، اور یا جوج و ماجوج کے حملوں کی ابتداء ہو چکی ہو، خواہ اس کی ابتداء چھٹی صدی ہجری کے فتنہ تاتار سے قرار دی جائے، یا اہل یورپ اور روس و چین کے غلبہ سے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان متمدن قوموں کے خروج اور فساد کو جو آئینی اور قانونی رنگ میں ہو رہا ہے وہ فساد نہیں قرار دیا جاسکتا جس کا پتہ لستراں و حدیث دے رہے ہیں کہ خالص قتل و غارت گری اور ایسی خوں ریزی کے ساتھ ہو گا کہ تمام انسانی آبادی کو تباہ و برباد کر دے گا، بلکہ اس کا حاصل پھر یہ ہو گا کہ انہی مفسد یا جوج ماجوج کی کچھ قومیں اس طرف آ کر متمدن بن گئیں، اسلامی ممالک کے لئے بلاشبہ وہ فساد عظیم اور فتنہ عظیمہ ثابت ہوئیں، مگر ابھی ان کی دشمنی قومیں جو قتل و خون ریزی کے سوا کچھ نہیں جانتیں وہ تقدیری طور پر اس طرف نہیں آئیں اور بڑی تعداد ان کی ایسی ہی ہے، ان کا خروج قیامت کے بالکل قریب میں ہو گا۔

دوسرا استدلال ترمذی اور مستدر احمد کی اس حدیث سے کیا جاتا ہے جس میں مذکور ہے کہ یا جوج ماجوج اس دیوار کو روزانہ کھودتے رہتے ہیں، مگر اول تو اس حدیث کو ابن کثیر نے معطل قرار دیا ہے، دوسرے اس میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں کہ جس روز یا جوج ماجوج انشاء اللہ کہنے کی برکت سے اس کو پار کر لیں گے وہ قیامت کے متصل ہی ہو گا، اور اس کی بھی اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں کہ سائے یا جوج ماجوج اسی دیوار کے پھپھڑکے ہوئے رہیں گے، اگر ان کی کچھ جماعتیں یا قومیں کسی دور دراز کے رستہ سے اس طرف آ جائیں، جیسا کہ آجکل کے طاقتور بحری جہازوں کے ذریعہ ایسا ہو جانا کچھ مستبعد نہیں، اور بعض مؤرخین نے لکھا بھی ہے کہ یا جوج ماجوج کو طویل بحری سفر کر کے اس طرف آنے کا راستہ مل گیا ہے، تو اس حدیث سے اس کی بھی نفی نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں کوئی ایسی دلیل صریح اور قطعی نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ ستر ذوالقرنین قیامت باقی رہے گی، یا ان کے ابتدائی اور معمولی حملے قیامت سے پہلے اس طرف کے انسانوں پر نہیں ہو سکیں گے، البتہ وہ انتہائی خوفناک اور تباہ کن حملہ

جو پوری انسانی آبادی کو برباد کر دے گا، اس کا وقت بالکل قیامت کے متعلق ہی ہو گا جس کا ذکر بار بار آچکا ہے، حاصل یہ ہے کہ قرآن و سنت کی نصیحت کی بنا پر نہ یہ قطعی فیصلہ کیا جکتا ہے کہ سہ یا جوج ماجوج ٹوٹ چکی ہے اور رہ سہ کھل گیا ہے، اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ از روئے قرآن و سنت اس کا قیامت تک قائم رہنا ضروری ہے، احتمال دونوں ہی ہیں واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي بَعْضٍ وَلَفِئْهُمُ الصُّورُ

اور چھوڑ دیں گے ہم خلق کو اس دن ایک دوسرے میں گھستے اور ہم تک ساری گئے صور میں

فَجَمَعْنَاهُمْ جُمُعًا ۝ وَعَرْضْنَا لَهُمْ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ

پھر جمع کر لائیں گے ہم ان سب کو، اور دکھلا دیں ہم روزئ اس دن کافروں کو

عَرْضَانَا ۝ اَلَّذِينَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِنَا وَكَانُوا

سائے، جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا تھا میری یاد سے اور نہ

لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ۝

نہ سنے تھے۔

خلاصہ تفسیر

اور ہم اس روز یعنی جب اس دیوار کے انہدام کو یوم النور آئے گا اور یا بروج کا نروج ہو گا تو اس روز ہم ان کی یہ حالت کریں گے کہ ایک میں ایک گڈڑ ہو جائیں گے، کیونکہ یہ کثرت سے ہوں گے اور بیک وقت نکل پڑیں گے اور سب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں ہوں گے اور یہ قیامت کے قریب زمانہ میں ہو گا، پھر بعد چندے قیامت کا سامان شروع ہو گا، ایک بار اول صبح بھونکا جائے گا جس سے تمام عالم فنا ہو جائے گا، پھر اس وقت (دوبارہ) بھونکا جائے گا، جس سے سب زندہ ہو جائیں گے، پھر ہم سب کو ایک ایک کر کے (میراث میں) میں (بت کر لیں گے اور دوزخ کو اس دوزخا فرد کے سامنے پیش کر دیں گے جن کی آنکھوں پر دیا ہیں) ہماری یاد سے (یعنی دین حق کے دیکھنے سے) پردہ پڑا ہوا تھا اور انہیں اپنی حق کو دیکھتے نہ تھے اس طرح اس کو (یعنی حق کو معلوم کرنے کے ذریعہ دیکھنے اور سننے کے سب راستے بند کر رکھے تھے) ۝

معارف و مسائل

بَعْضُهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي بَعْضٍ، بَعْضُهُمْ کی ضمیر میں ظاہر یہی ہے کہ یا جوج ماجوج کی طرف راجع ہے، اور ان کا جو حال اس میں بیان ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں گے، ظاہر یہ ہے کہ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ان کا راستہ کھلے گا، اور وہ زمین پر پہاڑیوں کی بندوبست سے جلد بازی کے ساتھ اتریں گے، مفسرین نے دوسرے احتمالات بھی لکھے ہیں۔
وَجَمَعْنَاهُمْ، جمعہ عام مخلوق جن وانس کی طرف راجع ہے، مراد یہ ہے کہ میدانِ حشر میں تمام مکلف مخلوق جن وانس کو جمع کر دیا جائے گا۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي

اب کیا سمجھتے ہیں منکر کہ تمہاری میرے بندوں کو میرے سوا

أَوْلِيَاءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا (۱۰۲) قُلْ هَلْ

سچائی ہم نے تیار کیا ہے دوزخ کو کافروں کی نہانی، تو کہہ ہم

نَسْتَعْتِبُكَ يَا أَخْسَرِينَ أَعْمَالًا (۱۰۳) الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي

بتائیں تم کو کس کا کیا ہوا کیا بہت اکارت، وہ لوگ جن کی کوشش بھٹکتی رہی

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۰۴)

دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے رہے کہ خوب بناتے ہیں کام

أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ فَبُطِئَتْ أَعْمَالُهُمْ

وہی ہیں جو منکر سمجھتے اپنے رب کی نشانیوں سے اور اس کے ملنے سے سو برباد کیا انکا کیا ہوا

فَلَا تُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا (۱۰۵) ذَلِكَ جَزَاءُ وَهُمْ جَهَنَّمُ

پھر نہ گھڑی کریں گے ہم ان کے واسطے قیامت کے دن تول، یہ بدلہ ان کا جو دوزخ اس

بِمَا كَفَرُوا وَأَتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا (۱۰۶) إِنَّ الَّذِينَ

پر کہ منکر ہوتے اور تمہاری باتوں اور میرے رسولوں کو ہنسا، جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَاَنْتُمْ لَعْنَةُ الْفِرْدَوْسِ نَزِلًا

ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں بھلے کام ان کے واسطے ہر ٹھنڈی جھاڑوں کے باغِ بہمانی،

خٰلِیْنَ فِیْہَا لَا یَخُوْنَ عَنْہَا حَوْلًا ﴿۱۰۸﴾

رہا کریں ان میں نہ چاہیں وہاں سے جگہ بدلتی۔

خلاصہ تفسیر

سیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ جہنم کو چھوڑ کر میرے بندوں کو (یعنی جو میرے مملوک نہ تھکوم ہیں) بہت سیارایا اضطراب ان کو، اپنا کارساز (یعنی مجھ اور جاہست روا) قرار دیں (جو شہر کی اور کفر کھلا ہوا ہے) ہم نے کافروں کی دعوت کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے (دعوت بطور تنبیہ و تمہکم کے فرمایا، اور اگر ان کو اپنے ان اعمال پر ناز ہو جن کو وہ حسد اور نیکی سمجھتے ہوں اور اس کے سبب وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ غدا سے محفوظ سمجھتے ہوں تو آپ ان سے) کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کرسی کرائی محنت (جو اعمال سنہ میں کی تھی) سب گئی گزری ہوئی اور وہ (بوجہ جہالت کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں (آگے ان لوگوں کا مصداق ایسے عنوان سے بتلاتے ہیں جس سے ان کی محنت ضائع ہونے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے، اور پھر اس جبط اعمال کی تصریح بھی بطریق تفریح کے فرماتے ہیں یعنی) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں کا اور اس سے ملنے کا (یعنی قیامت کا) انکار کر رہے ہیں (اس لئے) ان کے سارے (نیک) کام غارت گئے تو قیامت کے روز ہم ان کے نیک اعمال کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے (بلکہ) ان کی سزا دہی ہوگی (جو اوپر مذکور ہوئی) یعنی دوزخ، اس لئے کہ انھوں نے کفر کیا تھا اور اس کفر کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ (یہی آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا، آگے ان کے مقابلے میں اہل ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کی بہمانی کے لئے فردوس (یعنی بہشت) کے باغ ہوں گے، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (نہ ان کو کوئی نکالے گا) اور نہ وہ وہاں سے کہیں اور جانا چاہیں گے ۛ

معارف و مسائل

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ، تفسیر تخریص
 میں ہے کہ اس جگہ عبارت میں کفر ہے، یعنی فیجبن یسم نفعاً و ینتفعون بذلک الاختصاص،
 اور مطلب یہ ہے کہ کیا یہ کفر کرنے والے جنہوں نے میرے بجائے میرے بندوں کو اپنا معبود اور کارساز
 بنالیا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو معبود و کارساز بنالینا ان کو کچھ نفع بخشنے گا، اور وہ اس سے کچھ
 فائدہ اٹھائیں گے، اور یہ ہستہ نام انکاری ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسا سمجھنا غلط اور جہالت ہے
 عبادِ حق سے مراد اس جگہ فرشتے اور وہ انبیاء ہیں جن کی دنیا میں لوگوں نے پرستش کی
 اور ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا، جیسے حضرت عزیٰر اور مسیح علیہ السلام، فرشتوں کی عبادت
 کرنے والے بعض عرب تھے، اور عزیٰر علیہ السلام کو یہود نے، عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے
 خدا کا شریک قرار دیا، اس لئے الَّذِينَ كَفَرُوا سے اس آیت میں کفار کے یہی فرقے مراد ہیں،
 اور جن بعض مفسرین نے اس جگہ عبادِ حق سے مراد شیاطین کو لیا ہے کَفَرُوا سے کفار مراد ہوں گے جو جنات
 شیاطین کی پرستش کرتے ہیں، جس نے اس جگہ لفظ عبادِ حق کو مخلوق و مملوک کے معنی میں
 لے کر عام قرار دیا، جس میں سب مجبودات باطلہ ثبت، آگ، اور ستارے بھی داخل ہو گئے، خلیا
 تفسیر میں لفظ محکوم و مملوک سے اسی کی طرف اشارہ ہے، تخریص وغیرہ میں پہلی ہی تفسیر کو رائج
 قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

أَوْلِيَاءَ، ولی کی جمع ہے، یہ لفظ عربی زبان میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوتا
 ہے، اس جگہ اس سے مراد کارساز، حاجت روا ہے، جو معبود برحق کی خاص صفت ہے،
 مقصود اس سے ان کو معبود قرار دینا ہے۔

أَلَا خَسِرْتُمْ أَهْمًا لَّا، اس جگہ پہلی دو آیتیں اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے ہر اس منسرد
 یا جماعت کو شامل ہیں جو کچھ اعمال کو نیک سمجھ کر اس میں جدوجہد اور محنت کرتے ہیں، مگر اللہ
 کے نزدیک ان کی محنت برباد اور عمل ضائع ہے، قرطبی نے فرمایا کہ یہ صورت دو چیزوں سے
 پیدا ہوتی ہے، ایک فساد اعتقاد، دوسرے ریاکاری، یعنی جس شخص کا عقیدہ اور ایمان درست
 نہ ہو وہ عمل کتنے ہی اچھے کرے اور کتنی ہی محنت اٹھائے وہ آخرت میں بیکار اور ضائع ہو۔
 اسی طرح جس کا عمل مخلوق کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ہو وہ بھی عمل کے
 ثواب سے محروم ہے، اسی مفہوم عام کے اعتبار سے بعض حضرات صحابہ نے اس کا مصداق
 خواجہ کوثر بعض مفسرین نے معتزلہ اور دھن وغیرہ گمراہ منسرقوں کو مترادف دیا

مگر اگلی آیت میں یہ متعین کر دیا گیا ہے کہ اس جگہ مراد وہ کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات اور قیامت و آخرت کے منکر ہوں، اُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ، اس لئے قرطبی، ابو حیان، منطہری وغیرہ میں ترجیح اس کو دی گئی ہے کہ اصل مراد اس جگہ وہی کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ اور قیامت اور حساب و کتاب کے منکر ہوں، مگر صورتہ وہ لوگ بھی اس کے مفہوم عام سے بے تعلق نہیں ہو سکتے جن کے اعمال ان کے عقائد فاسدہ نے برباد کر دیئے، اور ان کی محنت رائیگاں ہو گئی لہذا صحابہ کرام حضرت علیؓ اور محدث سے جو ایسے اقوال منقول ہیں ان کا یہی مطلب ہے (قرطبی)

فَلَا نَقِيلُهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَنَرْنَا، یعنی ان کے اعمال جو ظاہر میں بڑے بڑے نظر آئیں گے مگر میزانِ حساب میں اُن کا کوئی وزن نہ ہوگا، کیونکہ یہ اعمال کفر و شرک کی وجہ سے بے کار اور بے وزن ہوں گے۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک آدمی قدا اور فرہ آئے گا جو اللہ کے نزدیک ایک پھر کے پھر کے برابر بھی وزن دار نہ ہوگا، اور پھر فرمایا کہ اگر اس کی تصدیق کرنا چاہا ہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو: فَلَا نَقِيلُهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَنَرْنَا

اور حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز ایسے ایسے اعمال لائے جائیں گے جو جسامت کے اعتبار سے ہتھامہ کے پہاڑوں کے برابر ہوں گے، مگر میزانِ عدل میں ان کا کوئی وزن نہ ہوگا۔ (تسطبی)

جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ، فردوس کے حنی سرسبز باغ کے ہیں، اس میں اختلاف ہے کہ یہ عربی لفظ ہے یا تہمی، جن لوگوں نے عجمی کہا ہے اس میں بھی فارسی ہے یا رومی یا سریانی مختلف اقوال ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ و افضل درجہ ہے اس کے اوپر عرشِ رحمن ہے، اور اسی سے جنت کی سب ہنریں نکلتی ہیں (قرطبی)

لَا يَخْرُجُونَ عَنْهَا حَتَّى لَا، مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنت کا یہ مقام ان کے لئے لازوال دائمی نعمت ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے یہ حکم جاری فرمادیا ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو گیا وہ وہاں سے کبھی نکالا نہ جائے گا، مگر یہاں ایک خطرہ کسی کے دل میں یہ گذر سکتا تھا کہ انسان کی فطری عادت یہ ہے کہ ایک جگہ رہتے رہتے اکتا جاتا ہے، وہاں سے باہر دوسرے مقامات پر جانے کی

خواب میں ہوتی ہے، اگر جنت سے باہر کہیں جانے کی اجازت نہ ہوتی تو ایک قید محسوس ہونے لگے گی اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا کہ جنت کو دوسرے مقامات پر قیاس کرنا بہالت ہے، جو شخص جنت میں جلا گیا پھر جو کچھ دنیا میں دیکھا اور برتا تھا جنت کی نعمتوں اور دلکش فضاؤں کے سامنے اس کو وہ سب چیزیں لٹو معلوم ہوں گی، اور یہاں سے کہیں باہر جانے کا کبھی کسی کے دل میں خیال بھی نہ آئے گا۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مَدًّا اَدَا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفَذَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ

تو کہہ اگر دریا سیاحی ہو کہ لکھے میرے رب کی باتیں بیشک دریا خراج ہو چکے ابھی نہ

تَنفَذَ كَلِمَاتِ رَبِّي وَلَوْ جَدْنَا بِمِثْلِهِ مَدًّا ۝۱۰۹ قُلْ اِنَّمَا اَنَا

پوری ہوں میرے رب کی باتیں اور اگر دریا لائیں ہم دلیا ہی اس کی لڑکوں، تو کہہ میں بھی

بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلٰى اَنْبَا الْهٰكُمِ الرَّالٰہُ وَاٰحِلُّہٗ فَمَنْ

ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ مجھ کو تمہارا ایک مجبور ہے، سو کھیر

كَانَ يَرْجُو اِلْقَاءَ رَبِّہٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ

جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سے سودہ کرے کچھ کام نیک اور شریک نہ کرے

۝۱۱۰ بِعِبَادَةِ رَبِّہٖ اَحَدًا ۝۱۱۰

اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔

خلاصہ تفسیر

آپے لوگوں سے فرمادیں گے کہ اگر میرے رب کی باتیں (یعنی وہ کلمات و عبارات جو اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور کمالات پر دلالت کرتے ہوں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف کو کوئی بیان کرنے لگے تو ایسے کلمات کو، لکھنے کے لئے سمندر کا پانی، روشنائی (کی جگہ) ہو اور اس سے لکھنا شروع کرے) تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا (اور سب باتیں احاطہ میں نہ آئیں گی) اگرچہ اس سمندر کے مثل ایک دو سمندر (اس کی) مدد کے لئے ہم نے آئیں (تب بھی وہ باتیں ختم نہ ہوں اور دو سمندر بھی ختم ہو جائے، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات غیر متناہی ہیں، اس کے سوا جن چیزوں کو کافروں نے اللہ کا شریک مانا ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، اس لئے الوہیت و ربوبیت [خدا ہونا اور رب ہونا] اسی کی

ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اس لئے ان لوگوں سے آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تو تم سب کی طرح بشر ہوں (نہ خدائی کا دعوے دار ہوں نہ فرشتہ ہونے کا ہاں) میرے پاس (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے (اور) تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور اس کا محبوب بننا چاہے) تو مجھ کو رسول مان کر میری شریعت کے موافق (نیک کام کرتا رہو) اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

معارف و مسائل

سورہ کہف کی آخری آیت میں ذَلَّا يُشِيرُ إِلَىٰ عَبْدٍ لَّهُ كَانَ فِي غُحٍّ مِّنْهُ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ مِّنْهُ، کا شان نزول جو روایات حدیث میں مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شرک سے مراد شرکِ خفی یعنی ریا ہے۔ امام حاکم نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے، اور اس کو صحیح علی شرط الشیخین فرمایا ہے، روایت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا، اس کے ساتھ اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ لوگوں میں اس کی بہادری اور غازیانہ عمل پہچانا جائے، اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاد میں ایسی نیت کرنے سے جہاد کا ثواب نہیں ملتا۔

اور ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاخلاص میں طاؤسؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ میں بعض اوقات کسی نیک کام کے لئے عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا قصد اس سے اللہ تعالیٰ ہی کی رضا ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ دل میں یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ لوگ میرے عمل کو دیکھیں، آپؐ نے یہ سن کر سکوت فرمایا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اور ابو نعیم اور تاج ابن عساکر میں بروایت ابن عباسؓ لکھا ہے کہ جندب بن جہشؓ صحابی جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے پھر دیکھتے کہ لوگ ان اعمال سے انکی تعریف و ثناء کر رہے ہیں تو اس سے ان کو خوشی ہوتی، اور اپنے اس عمل کو اور زیادہ کر دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

خلاصہ ان تمام روایات کا یہی ہے کہ اس آیت میں جس شرک سے منع کیا گیا ہے وہ ریا کاری کا شرک خفی ہے، اور یہ کہ عمل اگرچہ اللہ ہی کے لئے ہو مگر اس کے ساتھ کوئی نفسانی غرض شہرت و وجاہت کی بھی شامل ہو تو یہ بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے، جو انسان کے عمل کو ضائع بلکہ مضرت رسان بنادیتا ہے۔

لیکن بعض دوسری احادیث صحیحہ سے بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے، مثلاً ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات اپنے گھر کے اندر اپنے جائے نماز پر (نماز میں مشغول) ہوتا ہوں، اچانک کوئی آدمی آجائے تو مجھے یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مجھے اس حال میں دیکھا (تو کیا یہ ریا ہو گئی؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو ہریرہ خدا تعالیٰ تم پر رحمت فرمائے تمہیں اس وقت دو اجر ملتے ہیں، ایک خفیہ عمل کا جو پہلے سے کر رہی تھے دوسرا اعلانیہ عمل کا جو اس آدمی کے آجانے کے بعد ہو گیا (یہ ریا نہیں)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں فرمائیے کہ جو کوئی نیک عمل کرتا ہے، پھر لوگوں کو سنے کہ وہ اس عمل کی تعریف و مدح کر رہے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تَلَقَّ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ یعنی یہ تو مؤمن کے لئے نقد بشارت ہے (کہ اس کا عمل اللہ کے نزدیک قبول ہوا، اس نے اپنے بندوں کی زبانوں سے اس کی تعریف کرا دی)۔

تفسیر منطہری میں ان دونوں قسم کی روایتوں میں جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے اس کی تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ پہلی روایات جن کے بارے میں آیت نازل ہوئی اس صورت میں ہیں جب کہ انسان اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے ساتھ مخلوق کی رضا جوئی یا اپنی شہرت و جاہت کی نیت کو بھی شریک کرے، یہاں تک کہ لوگوں کی تعریف کرنے پر اپنے اس عمل کو اور بڑھا کر یہ بلاشبہ ریا اور شرک خفی ہے۔

اور بعد کی روایات ترمذی اور مسلم کی اس صورت سے متعلق ہیں جبکہ اس نے عمل خالص اللہ کے لئے کیا ہو لوگوں میں اس کی شہرت یا ان کی مدح و ثناء کی طرف کوئی التفات نہ ہو، پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو مشہور کر دیں اور لوگوں کی زبانوں پر اس کی تعریف جاری فرمادیں تو اس کا ریا سے کوئی تعلق نہیں، یہ مؤمن کے لئے نقد بشارت (قبول عمل کی) ہے۔

ریا کاری کے نتائج بد اور اس پر حضرت محمود بن لبیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی وعید شدید فرمائی کہ میں تمہارے بارے میں جس چیز پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ریا (رواہ احمد فی مسندہ)

اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس حدیث کو نقل کر کے اس میں یہ زیادتی بھی نقل کی ہے کہ قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی جزاء عطا فرمائیں گے تو ریاکار لوگوں سے

فرمادیں گے کہ تم اپنے عمل کی جزاء لینے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم نے یہ عمل کیا تھا، پھر دیکھو کہ ان کے پاس تمہارے لئے کوئی جزاء ہے یا نہیں۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں شرکار میں شریک ہونے سے غنی اور بالاتر ہوں جو شخص کوئی عمل نیک کرتا ہے پھر اس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر دیتا ہے تو میں وہ سارا عمل اسی شریک کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس عمل سے بری ہوں اس کو تو خالص اسی شخص کا کر دیتا ہوں جس کو میرے ساتھ شریک کیا تھا (رواہ مسلم)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے نیک عمل کو لوگوں میں شہرت کے لئے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں وہ حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے، (رواہ احمد و البیہقی فی شعب الایمان) از تفسیر مظہری

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت حسن بصریؒ سے اخلاص اور ریاء کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں اپنے نیک اور اچھے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب ہو اور برے اعمال کا پوشیدہ رہنا محبوب نہ ہو، پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال لوگوں پر ظاہر فرمادیں تو تم یہ کہو کہ یا اللہ یہ سب آپ کا فضل ہے احسان ہے میرے عمل اور کوشش کا اثر نہیں اور حکیم ترمذی نے صدیق اکبرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شرک کا ذکر فرمایا کہ هُوَ فَيْكُمْ اَخْفٰ مِنْ ذَنْبِ النَّمْلِ، یعنی شرک تمہارے اندر ایسے مخفی انداز سے آجاتا ہے جیسے چیونٹی کی رفتار بے آواز، اور فرمایا کہ میں تمہیں ایک ایسا کام بتلاتا ہوں کہ جب تم وہ کام کر لو تو شرک اکبر اور شرک اصغر (یعنی ریاء) سب سے محفوظ ہو جاؤ تم تین مرتبہ روزانہ یہ دعا کیا کرو، اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُ لِقَدْرِکَ

سورۃ کہف کے بعض فضائل اور خواص | حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورۃ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد رکھیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا (رواہ مسلم و احمد و ابوداؤد و النسائی)

اور امام احمد، مسلم، اور نسائی نے حضرت ابوالدرداءؓ سے ہی اس روایت میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ جس شخص نے سورۃ کہف کی آخری دس آیتیں یاد رکھیں وہ فتنہ دجال سے محفوظ رہے گا۔

اور حضرت انسؓ کی روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے سورہ کہف کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھ لیں تو اس کے لئے ایک نور ہو جائے گا، اس کے قدم سے لیکر سرتک اور جس نے یہ سورہ پوری پڑھی اس کے لئے نور ہوگا زمین سے آسمان تک (اخرجہ ابن السنی و احمد فی مسند) اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کے روز سورہ کہف پوری پڑھ لی، تو دوسرے جمعہ تک اس کے لئے نور ہو جائے گا (رواہ المحاکم و صحیحہ و البیہقی فی الدعوات) از منظرہ

اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے کہا کہ میں دل میں ارادہ کرتا ہوں کہ آخرت میں بیدار ہو کر نماز پڑھوں، مگر نیند غالب آجاتی ہے، آپ نے فرمایا کہ جب تم سونے کے لئے بستر پر جاؤ تو سورہ کہف کی آخری آیتیں قلّ تو کان الکتھم من اذّا سے آخر سورت تک پڑھ لیا کرو، تو جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرو گے اللہ تعالیٰ تمہیں اسی وقت بیدار کر دیں گے (رواہ شعبی) اور مسند دارمی میں ہے کہ زبیر بن جہشؓ نے حضرت عبدہ کو بتلایا کہ جو آدمی سورہ کہف کی یہ آخری آیتیں پڑھ کر سوئے گا تو جس وقت بیدار ہونے کی نیت کرے گا اسی وقت بیدار ہو جائے گا، عبد کہتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس کا تجربہ کیا بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک اہم نصیحت | ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ طبرطوسیؒ فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری عمر عزیز کے اوقات اپنے ہم عصروں سے مقابلے اور دوستوں سے میل جول ہی میں نہ گزر جائیں، دیکھو اللہ تعالیٰ نے اپنے بیان کو اس آیت پر ختم فرمایا ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُتَرَفِّعْ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا، یعنی جو شخص اپنے رب کے ملنے کی آرزو رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ عمل نیک کرے اور اللہ کی عبادت میں کسی کو حصہ دار نہ بنائے (قرطبی)

الحمد للہ حمد اکثر اطیباً مبارکاً فیہ، آج ۸ ذیقعدہ ۱۳۹۹ھ بروز جمعرات بوقت ضحیٰ سورہ کہف کی یہ تفسیر مکمل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہی ہے کہ اس وقت قرآن کریم کا نصف اول سے کچھ زائد پورا ہو گیا، جبکہ عمر کا چہتر واں سال چل رہا ہے اور ضعف طبعی کے ساتھ دو سال سے مختلف امراض نے بھی گھیرا ہوا ہے، اور افکار کا ہجوم بھی غیر معمولی ہے، کچھ عجب نہیں کہ حق تعالیٰ اپنے فضل سے باقی قرآن کی بھی تکمیل کرا دیں، و ما ذلک علی اللہ بعزیز:

جلد پنجم تمام شد